کشف المحجوب
تصنیف : حضرت سید علی بن عثمان ہجویری
مترجم : غلام معین الدین نعیمی اشرفی

کشف المحجوب

تصنیف

حضرت سیّد علی بن عثمان ہجویری رحمۃ اللہ علیہ

ترجمہ

غلام معین الدین نعیمی اشرفی

فہرست

عنوان	صفحہ نمبر

بسم اللہ الرحمن الرحیم

دیباچہ

از

ادیب شہیر حضرت شمس بریلوی رحمۃ اللہ علیہ

صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین نے رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت اور ہم نشینی سے جو شرف حاصل کیا تھا اور جس قدر شرف اندوز ہوئے تھے اور تزکیہ نفس کی جس منزل پر پہنچے تھے اس کی بشارت خود قرآن پاک نے دی اور ہم نشینی رسول خدا کے فیضان کو اس طرح ظاہر فرمایا "وَيُزَكِّيهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ" کتاب وحکمت ہی کی تعلیم کا یہ اثر تھا کہ خلفائے راشدین اور دیگر حضرات صحابہ میں سے ہر متنفس اور ہر ہستی پاکیزہ کردار اور اعلیٰ اخلاق سے متصف تھی اور ان میں سے ہر ایک کمالات انسانی کے منتہا کو پہنچ گیا تھا۔ اصحاب صفہ میں سے ہر ایک پاک دیدہ و پاک بیں، توکل و رضا کا پیکر اور صدق وصفا کا ایک مرقع تھا۔ تاریخ اسلام میں انہی نفوس قدسیہ کو صوفیائے کرام کا پہلا گروہ کہا جاتا ہے۔ یعنی تصوف اسلام کا پہلا دور انہی حضرات پر مشتمل تھا۔ تصوف کے بنیادی اصول یا ارکان تصوف استغراق عبادت (یادحق) توبہ، زہد، ورع، فقر، توکل اور رضا شریعت میں بھی اسی اہمیت کے حامل ہیں جس طرح طریقت میں تھے اور تصوف کے ابتدائی دور میں رہے۔

صحابہ کرام اور اصحابہ صفہ رضی اللہ عنہم میں سے ہر ہستی انہی اوصاف حمیدہ اور فضائل کی آئینہ دار تھی، حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کا ایثار تاریخ اسلام آج بھی فخر سے پیش کرتی ہے کہ گھر میں جس قدر اثاثہ تھا وہ تمام وکمال رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں پیش کر دیا اور جب رحمت عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اے صدیق اہل وعیال کے لئے کیا چھوڑا؟ تو

جواب دیا ان کے لئے اللہ اور اس کا رسول کافی ہے۔ اسی کا نام کمال ایثار اور کمال توکل ہے۔
آپ کے زہد و تقویٰ اور خوف ورجاء کا یہ حال تھا اور آپ کے فقر اختیاری کی صورت یہ تھی کہ آپ ہمیشہ یہ دعا فرماتے تھے اَللّٰهُمَّ ابْسُطْ لِي الدُّنْيَا وَزَهِّدْنِي عَنْهَا (اے اللہ دنیا کو میرے لئے فراخ فرما پھر مجھے اس سے بچا) آپ نے اپنی زندگی میں یہ پاکیزہ صفات حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات طیبہ سے اخذ کئے تھے اور معرفت خداوندی کے تمام اسرار ورموز آپ ہی سے سیکھے تھے۔ اسی بنا پر حضرت شیخ علی ہجویری قدس سرہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو مسلک تصوف کا امام گردانتے ہیں اور اکثر سلاسل تصوف آپ ہی پر منتہی ہوتے ہیں۔

یہی حال حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا تھا۔ زہد وفقر کی یہ حالت تھی کہ لوگوں نے آپ کے جسم مبارک پر کبھی کوئی ایسا کپڑا نہیں دیکھا۔ جو پیوند دار نہ ہو، دنیا کے بارے میں آپ کا مشہور مقولہ ہے "جس گھر کی بنیاد مصیبتوں پر رکھی گئی ہو اس کا بغیر مصیبت کے ہونا محال ہے"۔

صبر وتوکل میں حضرت عثمان رضی اللہ عنہ آپ اپنی مثال تھے۔ عظیم سے عظیم تر مصیبت پر بھی آپ نے صبر وتوکل کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑا۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے ایثار وانفاق فی سبیل اللہ کا بھی یہی حال تھا۔ مدینہ منورہ میں بیرِ عثمان آج بھی آپ کے اس افضل کی نشانی موجود ہے۔ آپ بارہ سال تک خلیفہ رہے۔ اس مدت کے ساٹھ ہزار درہم وظیفہ خلافت سے آپ نے ایک درہم بھی لینا قبول نہیں کیا۔

حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے ایثار کا یہ عالم تھا کہ شب ہجرت میں اپنی جان کا نذرانہ پیش کرنے کے لیے شب بھر بستر رسالت پر دراز رہے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی عزیز کو اپنی جان پر مقدم سمجھا۔ سادگی، فقر، رضائے الٰہی اور معرفت الٰہی میں بھی آپ بڑے ممتاز تھے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد گرامی اَنَا مَدِيْنَةُ الْعِلْمِ وَعَلِيٌّ بَابُهَا کی بنیاد پر تصوف کے بہت سے سلاسل آپ پر منتہی ہوتے ہیں چنانچہ سرخیل ارباب تصوف حضرت جنید بغدادی فرماتے ہیں شَيْخُنَا فِي الْاُصُوْلِ وَالْبَلَا عَلَى الْمُرْتَضٰى یعنی اصول معرفت اور آزمائش میں ہمارے مرشد (شیخ) علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ ہیں۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے استغراق عبادت کا یہ عالم تھا کہ جب آپ نماز پڑھتے تو آپ کو دنیا کی کچھ خبر نہیں رہتی، حضرت سیدنا شیخ عبدالقادر جیلانی رحمۃ اللہ علیہ غنیۃ الطالبین میں سورۃ الفتح کی ان آیات، محمد رسول اللہ والذین معہ...... تا

......اجراً عظیماًo کی تفسیر ارشاد فرماتے ہیں کہ یہ آیات حضرات عشرہ مبشرہ کی شان میں نازل ہوئی ہیں اور تراھمر رکعًا سے مراد حضرت علی کرم اللہ وجہ کی ذات والا ہے۔

خلفائے راشدین اور عشرہ مبشرہ کے بعد اصحاب صفہ ان صفات ستودہ کا مظہر کامل تھے۔ یہ وہ غریب و نادار حضرات تھے جو محض اللہ اور اس کے رسول کی محبت میں مکہ سے اپنا گھر بار چھوڑ کر دیارِ رسول میں آ گئے تھے۔ رہنے کا کہیں ٹھکانہ نہ تھا۔ رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے مسجد نبوی کے قریب ایک چبوترہ (صفہ) تعمیر کروا دیا تھا۔ اس چبوترے پر ان حضرات کے شب و روز تنگ دستی اور عسرت میں بسر ہوتے تھے اور یہ حضرات عبادت، ذکر الٰہی اور مجاہدہ نفس میں اپنے شب و روز بسر فرماتے تھے۔ قرآن پاک اور حدیث شریف میں ان کا ذکر بڑی تفصیل سے آیا ہے۔ یہی حضرات دور اول یا دور رسالت و خلافت راشدہ کے ارباب تصوف ہیں۔ خاص طور پر اصحاب صفہ کی زندگی تو صوفیائے کرام کی زندگی اور ان کے صوفیانہ خصائل کی صحیح تصویر تھی۔ یہی صوفیانہ خصائل و کردار بعد کے ارباب حال اور اصحاب تصوف کے لیے نمونہ تقلید بن گئے۔ رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے حالات کا مشاہدہ فرمانے کے بعد اس طرح ان کو خوشخبری اور بشارت دی۔

> ''اے اصحابِ صفّہ! تمہیں بشارت ہو، پس میری امت میں سے جو لوگ ان صفات سے متصف ہوں گے۔ جن سے تم متصف ہو اور ان پر رضامندی سے قائم رہیں گے تو وہ بے شک جنت میں میرے ہم نشین ہوں گے''۔

سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کی یہی بشارت اور حضرت والا کا یہی ارشادِ تصوّف کی عملی زندگی کا بنیادی نقطہ ہے۔ تصوف کے دور عروج تک صوفیائے کرام کی پاکیزہ زندگیاں اور ان کے پاکیزہ نفوس حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد گرامی کو منتہائے مقصود بناتے رہے ہیں یہی بے سروسامانی ان کا سرمایۂ زندگانی تھا اور الفقر فخری ان کا تاج شاہانہ۔

دور تابعین رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین:

تصوف کے دور اول کے سلسلہ میں مختصراً عرض کر چکا۔ تصوف کا دوسرا دور تابعین کا دور ہے۔ یہ دور تقریباً ایک سو سال کی مدت پر پھیلا ہوا ہے۔ یعنی ۴۳ھ سے ۱۵۰ھ ہجری تک اس دور

تابعین میں اصحابِ تصوّف میں دو (۲) بزرگ ہستیاں بہت نمایاں ہیں۔ایک حضرت اویس قرنی رضی اللہ تعالیٰ عنہ (جن سے سلوک میں نظریہ اویسی کی بنیاد پڑی) اور دوسری بزرگ ہستی حضرت حسن بصری رضی اللہ عنہ کی ہے۔حضرت اویس قرنی قرن کے رہنے والے تھے اور عہد رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم میں بحیات تھے۔لیکن شرف دیدار حاصل نہ کر سکے۔محبت رسول کا یہ عالم تھا کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا سلام پر عظمت حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے حج کے موقع پر آپ کو پہنچایا۔آپ کے متعلق بہت سے واقعات تاریخ تصوّف میں موجود ہیں۔محبت رسول اور یاد الٰہی میں آپ کی وارفتگی کا یہ عالم تھا کہ آپ جنگلوں اور ویرانوں میں پھرتے رہتے تھے۔جب لوگ روتے تھے تب آپ ہنستے تھے اور جب یہ لوگ ہنستے تھے تو آپ رونے لگتے تھے۔آپ مدتوں تک بادیہ گردی کرنے کے بعد کوفہ چلے گئے اور وہاں حضرت علی رضی اللہ کی فوج میں شامل ہو گئے۔ ۳۷ھ میں جنگ صفین میں جام شہادت نوش کیا۔(۲) حضرت حسن بصری رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا صحیح سال پیدائش تو تحقیق نہیں ہوسکا البتہ آپ کا سال وفات ۱۱۰ھ مطابق ۷۲۸ء ہے۔آپ مشہور تابعین سے ہیں۔آپ کو بھی بکثرت صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم کا فیض محبت حاصل ہوا۔ زہد، ورع، صبر اور خشت الٰہی آپ کے خاص اوصاف تھے۔خضوع وخشوع کا یہ عالم تھا کہ آپ فرماتے تھے جس نماز میں دل حاضر نہ ہو وہ نماز عذاب سے زیادہ قریب ہے۔تابعین میں آپ کے علاوہ اور بھی صوفیائے کرام موجود تھے لیکن تاریخی اعتبار سے مذکورہ حضرات زیادہ نمایاں شخصیت کے مالک ہیں۔تصوف کے بہت سے سلاسل آپ سے شروع ہوتے ہیں۔

دور تبع تابعین:

تبع تابعین میں جو صوفیائے کرام گزرے ہیں۔ان کا دور ۱۵۱ھ مطابق ۷۶۸ھ مطابق ۹۶۱ء تک متعین کیا گیا ہے۔اس دوصد سالہ دور میں اسلامی تصوف کو فروغ حاصل ہوا۔ یہاں تفصیل کی گنجائش نہیں مختصراً یہ کہ، یہ دور تصوف کا دور زریں کہلاتا ہے، اس دور کی نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ زہاد، عباد اور نساک حضرات کو صوفی کے لقب سے یاد کیا جانے لگا۔لفظ صوفی کا سب سے پہلے استعمال (صوفی) ابوالہاشم رحمۃ اللہ علیہ (المتوفی ۱۵۱ھ مطابق ۷۶۸ء) سے ہوا وہ دنیائے تصوف میں سب سے پہلے صوفی سے مخاطب کئے گئے۔حضرت ابو ہاشم رحمۃ اللہ

علیہ کوفہ کے رہنے والے تھے۔ لیکن ان کا انتقال شام میں ہوا۔

مسجدیں اس دور میں خونریزی اور سفاکی کی آماج گاہ بن گئی تھیں۔ سکونِ قلب اور خضوع وخشوع کے ساتھ ان مسجدوں میں ذکر الٰہی ممکن نہ تھا۔ اس لئے ابوالہاشم کوفی نے شام کے مقام رملہ میں عیسائیوں کے صومعہ کی طرح روحانی تربیت اور ذکر الٰہی کے لئے سب سے پہلے خانقاہ تعمیر کرائی۔ دنیائے تصوف میں یہ سب سے پہلی خانقاہ ہے۔ تبع تابعین کے دور میں نظری اور عملی تصوف میں بہت سی تبدیلیاں وجود میں آئیں۔ ترک دنیا کا مفہوم عہد رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم میں صرف اس قدر تھا کہ کُنْ فِی الدُّنْیَا کَاَنَّکَ غَرِیْبٌ اَوْعَابِرُ سَبِیْل لیکن اس کے ساتھ یہ حکم بھی موجود تھا کہ اَلدُّنْیَا مَزْرَعَةُ الْاٰخِرَة یعنی دنیا آخرت کی کھیتی ہے۔ گویا دست بکار ودل بہ یار! لیکن تبع تابعین کے دور میں ترک دنیا کا مفہوم یکسر بدل گیا۔ بادیہ پیمائی، صحرا نشینی اور ترک تعلقات کا نام ترک دنیا رکھا گیا اور اس کا سبب وہی ملکی انتشار اور سیاسی ابتری تھا۔

حب الٰہی کا نظریہ پہلے بالواسطہ تھا۔ یعنی اتباع رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو حب الٰہی کے حصول کا ذریعہ سمجھا جاتا تھا۔ جیسا کہ ارشاد ربانی ہے "قُلْ اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِیْ یُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ" (آپ فرمادیجئے کہ اگر تم اللہ کو دوست رکھنا چاہتے ہو تو تم میری اتباع اور پیروی کرو۔ اللہ تم سے محبت کرے گا)۔ اب یہ نظریہ بلا واسطہ ہو گیا۔ اب بذریعہ ذکر ومراقبہ اللہ تعالیٰ سے محبت کی جانے لگی۔ حضرت رابعہ عدویہ (متوفی ۱۸۵ھ مطابق ۸۰۱ء) سے یہ نظریہ وجود میں آیا۔ یہ محترمہ بھی بصرہ کی رہنے والی تھیں۔ حضرت ذوالنون مصری رحمتہ اللہ علیہ (متوفی ۲۴۵ھ مطابق ۸۵۹ء) نے نظریہ وحدت الوجود کو پیش کیا۔ حضرت بایزید بسطامی (المتوفی ۲۶۱ھ مطابق ۸۷۵ء) تبع تابعین کے دور کے مشائخ عظام میں شمار ہوتے ہیں۔ حضرت جنید بغدادی (متوفی ۲۹۷ھ مطابق ۹۱۰ء) تبع تابعین میں بڑے پایہ کے بزرگ تھے۔ حضرت داتا گنج بخش رحمتہ اللہ علیہ ان کو شیخ المشائخ طریقت میں اور امام الائمہ شریعت میں تسلیم کرتے ہیں، آپ بھی نظریہ وحدت الوجود کے زبردست ہم نوا تھے۔ حسین بن منصور حلاج (المتوفی ۳۰۹ھ مطابق ۹۳۶ء) یہ فارس کے شہر بیضا کے رہنے والے تھے۔ مدتوں مرشد کی تلاش میں سرگرداں رہے۔ آخر کار پھرتے پھراتے بغداد پہنچے اور حضرت جنید بغدادی رحمتہ اللہ علیہ

کے مرید ہوئے۔ نظریہ وحدت الوجود میں توغل اور انتہا پسندی کی بدولت ان کو ۹۳۶ء میں سولی پر چڑھا دیا گیا۔ حضرت ابو بکر شبلی (المتوفی ۳۳۴ھ مطابق ۹۴۹ء) تبع تابعین کے دور کے مشہور صوفی اور سر خیل سلاسل طریقت ہیں۔ آپ بھی حضرت جنید بغدادی رحمتہ اللہ علیہ کے مرید تھے اور نظریہ وحدت الوجود کے زبردست اور عظیم داعی تھے۔ دورِ تبع تابعین میں ان مشاہیر صوفیائے کرام کے علاوہ اور دیگر حضرات اور ان حضرات کے مریدین اطراف و اکناف ممالک اسلامیہ میں پھیلے ہوئے تعلیم طریقت اور اس کی اشاعت میں مصروف تھے۔

دورِ متاخرین:

تبع تابعین میں عملی تصوف نے علمی تصوف کی شکل بھی اختیار کر لی تھی۔ دورِ متاخرین میں بھی چند اکابرین صوفیاء ایسے پیدا ہوئے جنہوں نے اپنے مرشدین و اسلاف کرام کی طرح تصوف کے مشکل اور اہم نظریات کی علمی تشریح کی طرف خاص طور پر توجہ فرمائی اور ان علمی تشریحات کی بدولت (جن کو تصوف میں ان کی تصانیف کہنا چاہیے) ان کے نام تاریخ تصوف میں تابندہ پائندہ ہیں، دورِ متاخرین کے ایسے اکابر صوفیا میں حضرت شیخ علی بن عثمان جلابی ہجویری (متوفی ۴۶۵ھ مطابق ۱۰۷۳ء) حضرت امام غزالی رحمتہ اللہ علیہ (المتوفی ۵۰۵ھ مطابق ۱۱۱۱ء) حضرت شیخ محی الدین ابن اکبر رحمتہ اللہ علیہ (متوفی ۶۳۸ھ مطابق ۱۰۷۳ء) اور حضرت مولانا جلال الدین رومی رحمتہ اللہ علیہ (المتوفی ۶۷۲ھ) خاص طور پر بہت نمایاں ہیں اور ان کے علمی کارنامے دنیائے تصوف ہی میں نہیں بلکہ دنیائے اسلام میں ہمیشہ یادگار رہیں گے۔ یہاں میں حضرت شیخ علی بن عثمان ہجویری معروف بہ داتا گنج بخش رحمتہ اللہ علیہ کے سلسلہ میں کچھ عرض کرنا چاہتا ہوں۔ باقی حضرات کے سلسلہ میں انشاء اللہ کسی اور موقع پر تفصیل سے لکھوں گا۔ ان چند صفات میں حضرت علی بن عثمان الجلابی ہجویری رحمتہ اللہ علیہ کا تذکرہ، آپ کے نظریات اور آپ کے علمی شاہکار، کشف المحجوب کے بارے میں کچھ عرض کرنا ہی اس دیباچہ کی نگارش کا اصل مقصود ہے۔

حضرت شیخ علی ہجویری رحمتہ اللہ علیہ معروف بہ داتا گنج بخش قدس سرہ:

آپ کا اسم گرامی خود آپ کی تحریر کے مطابق "علی بن عثمان جلابی یا علی بن عثمان بن علی

الجلابی الغزنوی ہے۔آپ غزنیں (غزنی) کے قریب ہائے جلاب وہجویر کے رہنے والے تھے۔ اسی مناسبت سے کبھی آپ خود کو جلابی اور کبھی ہجویری تحریر فرماتے ہیں۔آپ نے "کشف المحجوب "میں متعدد جگہ اپنا نامی تحریر فرمایا ہے (اوراس کی توجیہ بھی فرمائی ہے، قارئین ترجمہ میں اس کی توجیہ ملاحظہ فرمائیں)۔اب برصغیر پاک وہند میں داتا گنج بخش کے لقب سے مشہور و معروف ہیں۔گنج بخش کا لقب حضرت خواجہ غریب نواز رحمۃ اللہ علیہ نے مزار فائز الانوار پر چلہ کشی کے بعد بوقت رخصت ایک الوداعی منقبت میں پیش کیا تھا۔

آپ کا سلسلہ نسب:

آپ کا سلسلہ نسب جس پر آپ کے اکثر سوانح نگاروں نے اتفاق کیا ہے یہ ہے:
حضرت علی ہجویری بن عثمان بن سید علی بن عبدالرحمن بن شجاع بن ابوالحسن اصغر بن زید رحمۃ اللہ علیہم بن حضرت امام حسن رضی اللہ عنہ بن حضرت علی رضی اللہ عنہ بن ابی طالب اس طرح آپ ہاشمی سید ہیں اور آپ کا سلسلہ نسب آٹھویں پشت میں حضرت علی کرم اللہ وجہٗ سے ملتا ہے۔

سال ولادت اور وطن:

کاش داتا صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے کشف المحجوب میں جس طرح اپنا مولدو مسکن اپنا اور اپنے والد وجد گرامی کے نام بیان فرمائے ہیں اور ان حضرات کے بعض احوال زندگی بھی ضمناً بیان فرمادیئے ہیں۔اسی طرح اپنا سال ولادت بھی جو آپ تک روایتاً یقیناً پہنچا ہوگا۔ بیان فرمادیتے تو آپ کی سال ولادت کے تعین میں جو اختلاف پایا جاتا ہے وہ ختم ہو جاتا۔ مستشرقین کا ہمیشہ سے دستور رہا ہے کہ وہ اس سلسلہ میں بھی تحقیق کا کوئی موقع ضائع نہیں کرتے اور تجسس کا کوئی پہلو فروگزاشت نہیں کرتے۔لیکن اس سلسلہ مین وہ بھی ناکام رہے ہیں۔عام طور پر آپ کا سال ولادت ۴۰۰ھ تسلیم کیا گیا ہے۔آپ کے مولود وطن کے سلسلے میں کوئی اختلاف نہیں ہے۔تمام سوانح نگار اس پر متفق ہیں کہ جلاب وہجویر جو غزنی کے قریبے یا محلے تھے۔آپ کا مولود ومسکن رہے ہیں۔ کچھ عرصہ آپ جلاب میں رہے اور کچھ مدت ہجویر میں۔ کشف المحجوب میں آپ نے اپنے اسم گرامی کے ساتھ وطن کی صراحت اس طرح فرمائی ہے"علی

بن عثمان بن علی الجلابی الغزنوی ثم الہجویری''۔

جلاب و ہجویر کے سلسلہ میں صاحب سفینۃ الاولیاء نے اس طرح تشریح کی ہے کہ ''جلاب و ہجویر غزنی کے دو محلے تھے۔ آپ پہلے جلاب میں مقیم تھے پھر ہجویر منتقل ہو گئے''۔

حضرت ہجویری قدس سرہ کے اساتذہ:

حضرت داتا گنج بخش قدس سرہ کے اساتذہ کرام کے سلسلہ میں مشرقی سوانح نگاران قدیم نے کسی خاص توجہ سے کام نہیں کیا۔ حضرت داتا گنج بخش قدس سرہ نے خود کشف المحجوب میں حضرت ابو العباس محمد شقانی رحمۃ اللہ علیہ کا ذکر کیا ہے تو بڑے ادب سے ان کا نام لیا ہے اور ان کی مہربانیوں اور عنایتوں کو یاد فرماتے ہوئے آپ سے اکتساب علم کا ذکر اس طرح فرمایا ہے کہ در بعضے علوم استاذ من بودہ۔ علوم اسلامی یعنی تفسیر و حدیث و فقہ پر آپ کو جو کامل دستگاہ تھی اور جس کا اظہار ''کشف المحجوب'' کے بلند پایہ علمی مقالات اور مباحث سے ہوتا ہے۔ وہ اس امر کے شاہد ہیں کہ آپ نے اپنے وقت کے بعض دوسرے صاحبان علم و فضل سے بھی استفادہ کیا ہوگا۔ اس لئے کہ آپ صرف عارف کامل ہی نہیں۔ بلکہ ایک بلند پایہ عارف و عالم ہیں۔ کشف المحجوب میں آپ جس طرح طریقت و شریعت کے مباحث پر بحث فرماتے ہیں اور استدلال لاتے ہیں اور قرآن و حدیث و خبر سے جس طرح سند پیش کرتے ہیں اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ آپ کو علوم متداولہ پر دستگاہ کامل حاصل تھی اور آپ علوم شریعت کے بھی شناور نہیں بلکہ غواص تھے اور علم تفسیر و حدیث پر آپ کو عبور حاصل تھا اور آپ ان علوم پر بھی گہری نظر رکھتے تھے اور یہ سب کچھ فیضان تھا آپ کے مرشد کامل کا۔ حضرت داتا قدس سرہ خود اپنے مرشد والا کے بارے میں فرماتے ہیں کہ میرے مرشد شیخ ابوالفضل محمد بن حسن الختلی رحمۃ اللہ علیہ ہیں جو علم تفسیر و روایات (حدیث) کے جید عالم تھے۔

پس جہاں ان شیخ طریقت کی نظر کیمیا اثر نے آپ کو طریقت میں اس بلندی پر پہنچایا وہ اگر علوم دینی یعنی تفسیر و حدیث میں بھی آپ کو ایسی بصیرت عطا کر دیں جو اقران و امثال سے ممتاز بنا دے تو کیا تعجب۔ حضرت ابوالفضل حسن الختلی رحمۃ اللہ علیہ کے علوم رتبت کے سلسلہ میں حضرت داتا گنج بخش قدس سرہ فرماتے ہیں کہ ''وہ صوفیائے متاخرین میں زینت اوتاد اور شیخ عباد

ہیں۔طریقت میں میری اقتدا (بیعت (ان ہی سے ہے۔تصوف میں حضرت جنید رحمتہ اللہ علیہ کا مذہب رکھتے تھے،حضرت شیخ حصری کے رازدار مرید تھے"۔

اپنے مرشد گرامی سے جو تعلق خاطر حضرت علی ہجویری رحمتہ اللہ علیہ کو تھا اس کا اندازہ اس امر سے ہوتا ہے کہ حضرت ابوالفضل الختلی رحمتہ اللہ علیہ کا جب وصال ہوا تو ان کا سر حضرت علی ہجویری قدس سرہ کی گود میں تھا اس سے یہ بھی ہوتا ہے کہ مرشد کو بھی اپنے مرید خاص سے کس درجہ محبت تھی۔

حضرت داتا گنج بخش رحمتہ اللہ علیہ کا شجرۂ طریقت:

آپ کا شجرہ طریقت اس طرح ہے، شیخ علی ہجویری مرید حضرت شیخ ابوالفضل الختلی رحمتہ اللہ علیہ مرید حضرت شیخ خصری رحمتہ اللہ علیہ مرید شیخ ابوبکر شبلی رحمتہ اللہ علیہ مرید حضرت جنید بغدادی رحمتہ اللہ علیہ مرید حضرت شیخ سری سقطی رحمتہ اللہ علیہ مرید حضرت داؤد طائی رحمتہ اللہ علیہ مرید حضرت حبیب عجمی رحمتہ اللہ علیہ مرید حضرت علی رضی اللہ عنہ۔

حضرت داتا گنج بخش قدس سرہ نے بھی عمر کا بڑا حصہ صحرا نوردی اور بادیہ پیائی میں بسر کیا عراق،شام،لبنان،آذربائیجان،خراسان وکرمان،خوزستان،طبرستان،ترکستان اور ماورا النہر کے شہروں اور قریوں میں تلاش حق کے لیے سرگرداں رہے۔تب کہیں دامن مقصود ہاتھ آیا۔ مگر یہ وضاحت کہیں نہیں ملتی کہ آپ اپنے مرشد والا مرتبت کے ساتھ کتنے عرصے رہے اور ان کی صحبت میں کن کن مقامات کی سیر کی۔

حضرت داتا گنج بخش رحمتہ اللہ علیہ کے ہمعصر مشائخ:

ارباب حقیقت وطریقت اپنے دل کی لگی بجھانے اور تشنگی باطن کو دور کرنے کے لیے شہروں اور قریہ بہ قریہ پھرا کرتے تھے۔اس کا ایک عظیم مقصد یہ بھی ہوتا تھا کہ ارباب حال کی صحبتوں میں پہنچ کر زندگی کے کچھ دن بسر کریں کہ ان کی صحبت کیمیا اثر بھی فیض سے خالی نہیں ہوتی۔حضرت داتا گنج بخش رحمتہ اللہ علیہ نے بھی اس سیر وسیاحت میں اپنے معاصرین کرام اور صوفیائے عظام کی صحبتوں سے استفادہ کیا۔ان معاصرین میں حضرت ابوالقاسم بن علی بن عبداللہ گرگانی،حضرت امام ابوالقاسم القشیری صاحب رسالہ القشیر یہ قدس سرہ،حضرت شیخ احمد حماری سرخسی قدس سرہ حضرت محمد بن مصباح،

حضرت ابوسعید ابوالخیر رحمۃ اللہ علیہ، شیخ ابواحمد المظفر بن احمد رحمۃ اللہ علیہ اور دیگر اکابرین شامل ہیں، ان معاصرین میں سے آپ حضرت ابوالقاسم بن علی گرگانی رحمۃ اللہ علیہ اور جناب امام ابوالقاسم القشیر ی کا ذکر بڑے اہتمام سے کرتے ہیں اور ان سے استفادہ کا بھی اعتراف فرماتے ہیں۔

حضرت داتا گنج بخش رحمۃ اللہ علیہ کا مسلک طریقت:

حضرت داتا صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے جس طرح اپنے پیر طریقت کے مسلک تصوف کے سلسلہ میں لکھا ہے کہ وہ تصوف میں حضرت جنید قدس سرہ کا مذہب رکھتے تھے۔ چنانچہ حضرت داتا صاحب تصوف و طریقت میں جنیدی مسلک کے متبع تھے۔ اسی طرح وہ شریعت میں سنی حنفی المذہب تھے۔ چنانچہ جہاں جہاں وہ حضرت امام اعظم رضی اللہ عنہ کا نام نامی لیتے ہیں وہ وہاں کمال احترام کو ملحوظ رکھتے ہیں۔ کشف المحجوب میں ایک جگہ امام اعظم رضی اللہ عنہ کا ذکر اس طرح کرتے ہیں "امامِ اماماں، مقتدائے سنیاں، شرف فقہا، اعزّ علماء ابوحنیفہ نعمان بن ثابت الخراز رضی اللہ تعالیٰ عنہ"۔ (کشف المحجوب)

حضرت داتا گنج بخش قدس سرہ کی ازدواجی زندگی:

حضرت کی ازدواجی زندگی کے سلسلہ میں "کشف المحجوب" یا کسی اور تذکرے میں کوئی صراحت نہیں ہے۔ کشف المحجوب سے صرف اس قدر ظاہر ہوتا ہے کہ آپ نے ایک شادی کی اور جب کچھ مدت کے بعد ان سے مفارقت ہوگئی تو پھر آپ نے تا زیست دوسری شادی نہیں کی۔

لاہور میں ورود مسعود اور اس کے پاکیزہ اثرات:

حضرت داتا گنج بخش قدس سرہ کی عمر کا کافی حصہ سیر و سیاحت میں بسر ہوا۔ آپ کا تجرد اور توکل اس سیاحت میں آپ کا ممد و معاون تھا۔ چنانچہ اسی سیاحت کے دوران اپنے مرشد کے اشارے پر یا اپنی طبیعت کے اقتضا سے آپ نے لاہور کا قصد فرمایا۔ اس سلسلہ میں بہت سی دلآویز حکایتیں ہیں۔ جن کی تردید کی بہت گنجائش ہے۔ اس سلسلہ میں بس اتنا کہا جاتا ہے کہ آپ نے جب لاہور میں ورود فرمایا تو سلطان مسعود بن سلطان محمود غزنوی (۴۲۱ھ) لاہور کا

حاکم تھا۔ لیکن سال ورود کا تعین دشوار ہے۔ آپ ورودِ مسعود نے لاہور کے قالب میں ایک نئی جان ڈال دی۔ آپ کے قیام کے دوران ہزاروں گم گشتگان بادیہ ضلالت و گمرہی نے آپ سے ہدایت پائی اور ہزاروں مشرکوں کے دلوں سے کلمہ توحید پڑھا کر زنگِ کفر و شرک کو دور فرمایا۔ حضرت داتا صاحب قدس سرہ نے لاہور میں ورود فرمانے کے بعد اپنا تمام وقت تبلیغ اسلام اور تصنیف و تالیف میں صرف فرمایا۔ دربار شاہی سے آپ کا کسی قسم کا تعلق نہیں تھا۔ تبلیغ اسلام کا جو کام آپ نے شروع فرمایا تھا اس کو بعد میں آنے والے اکابرین صوفیاء نے اپنے پاکیزہ اور اعلیٰ کردار سے اسلام کی سچی اور پاکیزہ تصویر پیش کر کے پایہ تکمیل کو پہنچایا۔

حضرت داتا گنج بخش رحمتہ اللہ علیہ کے علمی کارنامے:

حضرت داتا گنج بخش قدس سرہ جس طرح بحر طریقت کے شناور تھے اسی طرح آپ قرآن و حدیث اور فقہ پر بھی کامل دستگاہ رکھتے تھے اور رموز و اسرار شریعت سے بھی اسی طرح آگاہ تھے جیسا کہ میں اس سے قبل عرض کر چکا ہوں۔ اسلامی تصوف کے دور تبع تابعین میں نظری تصوف نے علمی تصوف کی شکل اختیار کر لی تھی۔ تصوف نے جب علم کی دنیا میں قدم رکھا تو رموز طریقت اور اسرار حقیقت پر بھی قلم اٹھایا گیا۔ لیکن اس دور میں اس موضوع پر جو کچھ لکھا گیا وہ عربی زبان میں تھا۔ حضرت داتا گنج بخش قدس سرہ کے معاصرین میں سے امام ابوالقاسم قشیری نے تصوف کے رموز پر جو رسالہ قشیریہ مرتب کیا اس کی زبان بھی عربی تھی۔ فارسی مفتوحین نے جب تصنیف کی دنیا میں قدم رکھا تو انہوں نے بھی اسی زبان عربی کو اختیار کیا جس کی تقدیس کا قرآن واحادیث کی زبان سے اندازہ ہو سکتا ہے۔ مذہبیات میں عربی کے سوا کسی اور زبان کو استعمال کرنا تقدیس کے منافی خیال کیا جاتا تھا۔ فارسی نژاد علماء وفضلائے اسلام کی گراں بہا تصانیف میرے اس دعوے پر شاہد ہیں۔ حضرت داتا گنج بخش رحمتہ اللہ علیہ کی مادری زبان بھی فارسی تھی۔ اگرچہ آپ کو عربی زبان پر بھی کامل عبور حاصل تھا لیکن کشف المحجوب عوام کے افادہ کے لئے آپ نے فارسی زبان میں تصنیف فرمائی۔ میں نہیں کہہ سکتا کہ آپ کی باقی تصانیف یعنی کتاب ۱۔ فنا و بقا، ۲۔ اسرار الخرق والمونات، ۳۔ الرعایت بحقوق اللہ تعالیٰ، ۴۔ کتاب البیان لاہلِ العیان، ۵۔ نحو القلوب، ۶۔ منہاج الدین، ۷۔ ایمان، ۸۔ شرح کلام

منصور حلاّج اور ۹۔ دیوان اشعار کس زبان میں تھیں۔ آج ان تصانیف میں سے کسی کا وجود نہیں ہے۔ صرف **کشف المحجوب** کی بدولت یہ نام باقی رہ گئے ہیں۔ **کشف المحجوب** زمانے کی دستبرد سے محفوظ ہے اور اس کے متعدد قلمی نسخے کتب خانوں میں موجود ہیں اور برصغیر پاک و ہند میں مطابع کے وجود میں آنے کے بعد اس کے ہزاروں مطبوعہ نسخے دلدادگان شریعت و طریقت کے لیے نظر فروز ہیں۔ **کشف المحجوب** کہاں لکھی گئی، لاہور میں یا ہجویر میں اور کب لکھی گئی یعنی سال تصنیف کیا ہے۔ اس کی نشان دہی بھی محال ہے۔ البتہ یہ کہا جاسکتا ہے کہ یہ بڑے پرسکون ماحول میں لکھی گئی ہے اور کشف المحجوب کی ایک وضاحت کی بنا پر یہ کہا جاسکتا ہے کہ اس کا تکملہ لاہور میں ہوا۔ یہ تعین کرنا بھی دشوار ہے کہ آپ کے رفیق و معاصر ہموطن ابوسعید ہجویری رحمتہ اللہ علیہ نے کب اور کہاں آپ سے یہ سوالات کئے تھے جن کے جوابات بصورت **کشف المحجوب** آپ نے دیئے۔ ان سوالات کے سلسلے میں حضرت داتا صاحب قدس سرہ صرف اتنا فرماتے ہیں کہ ''قال السائل وھو ابوسعید الہجویری بیان کن مرا اندر تحقیق طریقت و تصوف و ارباب تصوف و کیفیت مقامات ایشاں و بیان مذاہب و مقامات آں و اظہار رموز و اشارات ایشاں''۔

شیخ محمد اکرام مرحوم بڑے وثوق کے ساتھ تاریخ ملی میں علی ہجویری لاہوری کے تحت عنوان لکھتے ہیں کہ ''فارسی نثر کی سب سے پہلی مذہبی کتاب جو برصغیر پاک و ہند میں پایہ تکمیل کو پہنچی **کشف المحجوب** ہے اور حضرت داتا گنج بخش علی ہجویری قدس سرہ نے قبۂ اسلام لاہور میں مکمل کیا۔ (تاریخ ملی ص ۷) بہر حال **کشف المحجوب** اپنے موضوع اور مباحث کے اعتبار سے جس قدر بلند پایہ کتاب ہے وہ تعریف و توصیف سے مستغنی ہے۔ حضرت خواجہ نظام الدین اولیا قدس سرہ کا ارشاد گرامی اس سلسلہ میں ملاحظہ فرمائیے۔ فرماتے ہیں ''اگر کسی کا پیر نہ ہو تو ایسا شخص جب اس کتاب کا مطالعہ کرے گا تو اس کو پیر کامل جائے گا۔ میں نے اس کتاب کا مکمل مطالعہ کیا ہے۔ (ترجمہ): اور یہ حقیقت بھی ہے کہ **کشف المحجوب** آپ کا ایک ایسا شاہکار ہے جس کی بدولت برصغیر پاک و ہند میں صحیح اسلامی تصوف نے فروغ پایا اور اس وصف خاص کی بدولت آج بھی **کشف المحجوب** کی قدر و منزلت اتنی ہے جتنی آج سے نو سو برس پہلے تھی۔ **کشف**

المحجوب کے سلسلہ میں اسلامی ثقافت کے مشہور مورخ شیخ محمد اکرام مرحوم کہتے ہیں کہ:

"یہ کتاب آپ نے اپنے رفیق ابوسعید ہجویری رحمتہ اللہ علیہ کی خواہش پر جو آپ کے ساتھ غزنی چھوڑ کر لاہور آئے تھے، لکھی اور اس میں تصوف کے طریقے کی تحقیق، اہل تصوف کے مقامات کی کیفیت، ان کے اقوال اور صوفیانہ فرقوں کا بیان معاصر صوفیوں کے رموز و اشارات اور متعلقہ مباحث بیان کئے ہیں۔ اہل طریقت میں اس کتاب کو بڑا مرتبہ حاصل ہے"۔ "آبِ کوثر"

کشف المحجوب پر پروفیسر خلیق نظامی ان الفاظ میں تبصرہ کرتے ہیں:

"شیخ ہجویری رحمتہ اللہ علیہ کی اس کتاب نے ایک طرف تو تصوف سے متعلق عوام کی غلط فہمیوں کو دور کیا اور دوسری طرف اس کی ترقی کی راہیں کھول دیں" (تاریخ مشائخ چشت)

کشف المحجوب کی قبولیت کا اندازہ اس سے کیا جا سکتا ہے کہ صوفیائے کرام کے مشہور تذکرہ نگاروں مثلاً خواجہ فرید عطار رحمتہ اللہ علیہ، حضرت مولانا جامی قدس سرہ صاحب نفحات الانس، حضرت خواجہ محمد پارسا رحمتہ اللہ علیہ صاحب فصل الخطاب اور خواجہ بندہ نواز گیسودراز رحمتہ اللہ علیہ نے اپنے تذکروں میں اور تصانیف میں کشف المحجوب سے استفادہ کیا ہے اور مشائخ تصوف کے حالات اس سے اخذ کئے ہیں۔ آپ کے مقولوں اور آپ کی تحقیق کو بطور سند پیش کیا ہے۔

کشف المحجوب میں جو رموز طریقت اور جن حقائق معرفت کو منکشف کیا گیا ہے ان کی بنیاد حضرت داتا صاحب قدس سرہ نے اپنے مکاشفات پر نہیں رکھی ہے بلکہ ان کا ماخذ قرآن و سنت کو قرار دیا ہے۔ یادنیائے عرفان کی مستند کتابیں ہیں جن کا ذکر "کشف المحجوب" میں داتا صاحب قدس سرہ نے اپنی تصنیف لطیف میں کیا ہے اور یہی اس کی قبولیت کا راز ہے کہ آپ کے بعد کے بزرگانِ طریقت اور اربابِ تصوف کے لئے وہ ہمیشہ ماخذ کا کام دیتی رہی ہے۔ صاحب کشف المحجوب جس مسئلہ یا رمز طریقت پر قلم اٹھاتے ہیں اولاً وہ قرآن حکیم اور ارشاد نبوی (صلی اللہ علیہ وسلم) سے اس کی سند لاتے ہیں پھر اس کا استدلال آثار و اخبار سے کرتے ہیں۔ اگر وہ اس استدلال میں کامیاب نہیں ہوتے تو اکابرین ارباب

تصوف کے یہاں اس کی سند تلاش کرتے ہیں، آپ کشف المحجوب کا ترجمہ ملاحظہ فرمائیں تو آپ کو خود مصنف قدس سرہ کی جانب سے ان منابع اور مآخذ کی نشاندہی ملے گی۔

کشف المحجوب کی زبان اور اسلوب بیان

کشف المحجوب کے مذکورہ بالا ان چند پہلوؤں پر بحث کرنے کے بعد یہ بھی ضروری تھا کہ اس کی زبان اور اس کے اسلوب بیان پر بھی کچھ لکھا جاتا۔ لیکن یہ مقدمہ یا دیباچہ اس کے اردو ترجمے کے ساتھ پیش کیا جا رہا ہے۔ اس موقع پر کشف المحجوب کی فارسی زبان اور اس کے اسلوب کو بیان کرنا بے محل سی بات ہوگی۔ مختصراً صرف اتنا کہا جا سکتا ہے کہ حضرت داتا گنج بخش قدس سرہ نے کشف المحجوب کو تکلف اور تصنع سے بری نہایت آسان اور روزمرہ کی فارسی میں تحریر کیا ہے۔ انداز بیان ایسا صاف اور واضح ہے کہ مفہوم و معنی کے سمجھنے میں کہیں دقت پیدا نہیں ہوئی۔ افسوس کہ اب فارسی زبان عوام کے لئے ایک غیر اور بیگانہ زبان بن گئی۔ یہی سبب ہے کہ اصل متن کو شائع کرنے کے بجائے اس کا اردو ترجمہ شائع کیا جا رہا ہے تا کہ عوام اس سے استفادہ کر سکیں۔

کشف المحجوب اور اس کے اردو تراجم:

کشف المحجوب کی بلند پائیگی کا اندازہ اس امر سے بخوبی ہو سکتا ہے کہ صوفیائے عظام نے اس کو اپنی تصانیف میں مآخذ قرار دیا۔ تیرھویں صدی کے وسط تک فارسی زبان عوام کی زبان تھی۔ تحریر کی زبان بھی فارسی تھی۔ اس لئے اس وقت تک کشف المحجوب کے اردو ترجمے کی ضرورت ہی محسوس نہیں کی گئی۔ تیرھویں صدی کے اواخر اور چودھویں صدی کے اوائل میں جب فارسی زبان کا انحطاط بحد کمال پہنچ گیا اور اردو عوام کی زبان قرار پائی تو اس وقت سے فارسی زبان کی بہت سی بلند پایہ کتب کے اُردو میں تراجم ہونے لگے چنانچہ اس ضرورت کے تحت ''کشف المحجوب'' جیسی بلند پایہ اور گراں مایہ کتاب کے متعدد اردو تراجم ہوئے جو اپنے اپنے وقت پر شائع ہو کر اس عہد اور اس وقت کی ضرورت کو پورا کرتے رہے۔ اس وقت تک ۲۰ سے زیادہ اردو تراجم اس عظیم کتاب کے شائع ہو چکے ہیں۔

اولین تراجم کا انداز بالکل عامیانہ ہے اور زبان اپنے عہد کی ترجمان ہے۔ پھر کچھ کچھ ترتیب، تذہیب کا اہتمام ہونے لگا۔ لیکن سوانح مصنف پر کوئی خاص توجہ نہیں دی گئی۔

اس سلسلہ میں عظیم مستشرق پروفیسر نکلسن (مصنف تاریخ ادبیات عرب) کو داد نہ دینا ناانصافی ہوگی کہ جب انہوں نے ۱۹۱۱ء میں کشف المحجوب کا انگریزی ترجمہ شائع کیا تو وہ ہمارے اردو تراجم سے بہت بلند و قیع اور جامع تھا۔ انہوں نے سوانح نگاری میں تحقیق کا حق ادا کیا اور حضرت داتا گنج بخش قدس سرہ کی سوانح حیات کے ہر پہلو پر محققانہ بحث کی۔ کشف المحجوب کے منابع اور مآخذ کا پتہ چلایا۔ ان کے اساتذہ کرام، ان کے معاصرین عظام اور ان سے متعلق تاریخوں کی جستجو اور صحت کی تحقیق کی۔ مختصراً یہ کہ کشف المحجوب کے موضوع اور مباحث پر سیر حاصل تبصرہ کر کے کشف المحجوب کے صحیح مقام سے دنیائے ادب کو متعارف کرایا۔ پروفیسر نکلسن کی تحقیقات نے "کشف المحجوب" کے اردو مترجمین کو بہت سے نئے "راستوں" سے آشنا کیا۔ انہوں نے اس عظیم مستشرق کی تحقیقات سے پورا پورا فائدہ اٹھایا۔

پروفیسر نکلسن کے بعد ایک روسی ادیب پروفیسر ژوکوفسکی نے بڑی کاوش اور دقتِ نظر سے کشف المحجوب کے ایک قدیم نسخہ کی تصحیح کی اور اس کو اپنے ایک محققانہ مقدمہ (بزبان روسی) کے ساتھ لینن گراڈ سے شائع کیا۔ کچھ مدت بعد ایک ایرانی ادیب نے اس روسی مقدمہ کو فارسی (جدید فارسی) میں منتقل کیا اور اپنا مُترجمہ مقدمہ اس مصحح متن کے ساتھ شائع کر کے اس روسی ادیب کی کاوشوں سے ایرانیوں اور دوسرے دل دادگانِ کشف المحجوب سے روشناس کرایا۔ پروفیسر نکلسن کے ترجمے اور روسی ادیب کے مقدمہ اور تصحیح نے کشف المحجوب کے اردو تراجم میں ایک نئی جان ڈال دی اور حضرت داتا گنج بخش قدس سرہ کی سوانح حیات کے بہت سے پہلو پہلی مرتبہ عوام کے سامنے آئے۔ اس مختصر دیباچہ یا مقدمہ میں بھی ان معلومات سے استفادہ کیا گیا ہے۔

حضرت داتا گنج بخش قدس سرہ کی وفات اور آپ کا مزار:

نہایت افسوس کے ساتھ یہ کہنا پڑتا ہے کہ جس طرح حضرت قدس سرہ کی تاریخ ولادت پر آپ کے تذکرہ نگاروں کا اتفاق نہیں اسی طرح آپ کی تاریخ وفات بھی متفق علیہ نہیں

ہے۔ روسی مقدمہ نگار اور پروفیسر نکلسن بھی تاریخ ولادت کی طرح تاریخ وفات کے سلسلہ میں بھی کسی ایک سال کا تعین نہیں کر سکے۔ پروفیسر نکلسن ۴۵۶ھ تا ۴۶۵ھ کا کوئی درمیانی سال آپ کا سال وفات بتاتے ہیں۔ داراشکوہ بھی ''سفینۃ الاولیاء'' میں تذبذب کا شکار ہیں۔ بعض تذکرہ نگاروں نے ۴۶۵ھ کو صحیح سال وفات تسلیم کر کے لفظ سردار سے تاریخ وفات نکالی ہے۔ یعنی ''سال وصلش برآمد از سردار'' شیخ محمد اکرم مرحوم بھی آب کوثر میں کوئی ایک سال متعین نہیں کر سکے اور کہتے ہیں کہ آپ کی وفات ۴۶۵ھ مطابق ۱۰۷۲ء کے قریب واقع ہوئی۔ ڈاکٹر نور الدین اپنے محققانہ مقالہ ''تصوف اور اقبال'' میں آپ کا سال وفات وثوق کے ساتھ ۴۶۵ھ ہی قرار دیتے ہیں اور اسی پر اکثر تذکرہ نگاروں کا اتفاق ہے۔

مزار پرانوار:

آپ کا مزار پرانوار لاہور میں ہے۔ اسی نسبت سے لاہور کو داتا کی نگری بھی کہتے ہیں۔ لاہور کی سرزمین اس پر جتنا بھی فخر کرے وہ کم ہے کہ ایک ایسی برگزیدہ اور بلند پایہ ہستی یہاں آرام فرما ہے جس کی آمد نے ہند کے اس عظیم خطہ میں شمع ایمان فروزاں کی۔ یہی وہ قدسی بارگاہ ہے جہاں خواجہ غریب نواز رحمتہ اللہ علیہ بھی اکتساب فیض کے لئے مقیم رہے۔ یہاں کی خاک اکابرین صوفیا کے لیے سرمۂ بصیرت اور تاج عزت ہے۔ یہی وہ مقام ہے جو آج تک قبلہ اہل صفا بنا ہوا ہے اور جہاں انوار الٰہی ہر وقت برستے ہیں۔ یہاں عوام بھی حاضر ہوتے ہیں۔ صوفی اور عالم بھی۔ ہر ایک یکساں عقیدت کے ساتھ آتا ہے۔ یہاں کی فضا میں ہر وقت اور ہر لحہ ذکر خدا اور ذکر رسول صلی اللہ علیہ وسلم جاری وساری رہتا ہے اور داتا رحمتہ اللہ علیہ کے فیض سے جھولیاں بھرنے والوں کا ہر وقت ہجوم رہتا ہے۔ بقول شاعر مشرق علامہ اقبال رحمتہ اللہ علیہ!

خاکِ پنجاب از دم او زندہ گشت
صبح ما از مہر او تابندہ گشت

شمس بریلوی
ایئر پورٹ۔ کراچی
۱۵ فروری ۱۹۷۵ء

السلوك الیٰ المحبوب

فی ترجمۃ

کشف المحجوب

بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِ
نَحۡمَدُہٗ وَنُصَلِّی عَلٰی رَسُوۡلِهِ الۡكَرِيۡمِ

اے ہمارے رب! اپنی بارگاہ سے ہم پر رحمتیں نازل فرما اور ہمارے معاملہ میں ہمیں راہ راست کی توفیق عطا فرما۔ اللہ تعالیٰ ہر خوبی کا سزاوار ہے جس نے اپنے اولیاء پر اپنی بادشاہت کے اسرار کھولے اور اپنے اصفیاء کے لیے اپنی حیثیت و جبروت کے راز منکشف فرمائے اور اپنی شمشیر عظمت وجلال سے محبوبوں کا خون بہایا اور عارفین کو اپنے وصال کی چاشنی کا مزہ چکھایا۔ وہی اپنی بے نیازی اور کبریائی کے انوار کے ادراک سے مردہ دلوں کو زندگانی عطا فرماتا ہے اور اپنے اسماء کی مہک کے ساتھ معرفت الٰہی کی خوشبو سے انہیں لطف اندوز ہونے کے مواقع فراہم کرتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کے رسول محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم اور انکی آل واصحاب اور ازواجِ مطہرات رضی اللہ پر ہمیشہ ہمیشہ درود وسلام نازل ہو۔

ابتدائیہ:

اے طالب راہ حقیقت! اللہ تعالیٰ دونوں جہان کی سعادت مندی نصیب فرمائے۔ جب تم نے مجھے اپنے سوال کے ذریعہ اس کتاب کی درخواست کی تو میں نے استخارہ کیا اور خود کو دلی واردات اور باطنی القا کے حوالہ کر دیا (جب استخارہ میں اذن الٰہی حاصل ہو گیا) تو میں نے

تمہاری مقصد برآری کی خاطر اس کتاب کے لکھنے کا عزم صمیم کرلیا۔ اور اس نوشتہ کا نام کشف المحجوب رکھا امید ہے کہ ارباب فہم وبصیرت اس کتاب میں اپنے سوالات کا جواب علیٰ وجہ الکمال پائیں گے۔

بعدہٗ اللہ تعالیٰ سے استعانت توفیق کی استدعا ہے کہ وہ اس نوشتہ کو تمام وکمال کرنے میں مدد فرمائے۔ اظہار و بیان اور نوشت میں اپنی قوت و طاقت پر اعتماد پر بھروسہ کرنا درست نہیں۔ وباللہ التوفیق۔

اپنا نام تحریر کرنے کی وجہ:

شروع میں جو اپنا نام تحریر کیا ہے اس کی دو وجہ ہیں۔ ایک وجہ خاص حضرات کے لیے ہے اور دوسری وجہ عام لوگوں کے لیے۔ لیکن جو وجہ عام لوگوں کے لیے ہے کہ جب اس علم سے بے بہرہ و ناواقف کوئی ایسی نئی کتاب دیکھتے ہیں اور اس میں مصنف کا نام کسی جگہ نظر نہیں آتا تو وہ کتاب کو اپنی طرف منسوب کر لیتے ہیں (یعنی یہ کتاب میری تصنیف ہے) جس سے مصنف کا مقصد ناکام ہو جاتا ہے۔ حالانکہ مصنف کی تالیف وتصنیف کا مقصد یہی ہوتا ہے کہ اس کتاب کے ذریعہ اس کا نام زندہ پائندہ رہے اور پڑھنے والے طالبان حق مصنف کو دعائے خیر سے یاد کرتے رہیں۔ ایسا حادثہ میرے ساتھ دو مرتبہ پیش آ چکا ہے۔

پہلا حادثہ:

یہ ہوا کہ ایک صاحب میرے اشعار کا دیوان مستعار لے گئے۔ پھر انہوں نے واپس نہیں کیا۔ میرے پاس اس نسخہ کے سوا اور کوئی نسخہ نہیں تھا۔ ان صاحب نے میرے نام کو حذف کر کے اپنے نام سے اس دیوان کو مشہور کر دیا۔ اس طرح میری محنت انہوں نے ضائع کر دی۔ اللہ تعالیٰ انہیں معاف فرمائے۔

دوسرا حادثہ:

یہ پیش آیا کہ میں نے علم تصوف میں ایک کتاب لکھی تھی جس کا نام ''منہاج

العابدین'' رکھا تھا۔ ایک کمینہ خصلت، چرب زبان شخص نے جس کا نام میں ظاہر کرنا نہیں چاہتا اس نے شروع سے میرا نام چھیل کر اور اپنا نام درج کر کے عام لوگوں کو کہنا شروع کر دیا کہ یہ میری تصنیف ہے۔ حالانکہ اس کی عملیت اور قابلیت کے جاننے والے حضرات اس پر ہنستے تھے۔ بالآخر اللہ تعالیٰ نے اس شخص پر بے برکتی مسلط کر دی اور اپنی بارگاہ کے طالبوں کی فہرست سے اس کا نام خارج کر دیا۔

دوسری وہ وجہ:

خاص حضرت کے لیے یہ ہے کہ جب وہ کسی کتاب کو اپنے علم کے مطابق اس نظر سے ملاحظہ فرماتے ہیں کہ اس کا مصنف و مؤلف نہ صرف یہ کہ اس علم کا دانا ہے بلکہ وہ اس فن کا ماہر و محقق ہے تو اُس کتاب کی قدر کرتے اور اسے پڑھ کر یاد کرنے کی پوری کوشش کرتے ہیں۔ اس طرح وہ اپنا گوہر مقصود اُس کتاب سے حاصل کر لیتے ہیں۔

استخارہ کرنے کی وجہ:

اس تصنیف کو شروع کرنے سے پہلے استخارہ کی طرف اس لیے متوجہ ہوا کہ حق تعالیٰ کے حقوق اور اس کے آداب کی حفاظت پر عمل کیا جائے۔ چونکہ اللہ تعالیٰ نے اپنے حبیب سید عالم صلی اللہ علیہ وسلم کو اور آپ کے دوستوں کے لیے اس کا حکم فرمایا ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

فَإِذَا قَرَأْتَ الْقُرْآنَ فَاسْتَعِذْ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ

''اور جب تم قرآن کریم پڑھو تو شیطان مردود کی فریب کاریوں سے اللہ تعالیٰ کی پناہ مانگو۔'' (النحل:۹۸)

استعاذہ، استخارہ اور استعانۃ سب کے ایک ہی مفہوم و معنیٰ ہیں۔ مطلب یہ کہ اپنے تمام کام اللہ تعالیٰ کے سپرد و حوالہ کر کے ہر قسم کی آفتوں سے محفوظ رہنے کے لیے اس سے مدد حاصل کرو۔

صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین فرماتے ہیں کہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے

ہمیں استخارہ کرنا اسی طرح سکھایا جس طرح قرآن کریم کی تعلیم دی ہے۔ بندہ کو جب اس پر کامل یقین ہو جاتا ہے کہ تمام کاموں کی بھلائی کسب وتدبیر پر موقوف نہیں ہے بلکہ حق تعالیٰ کی مشیت ورضا پر موقوف ہے اور ہر نیک وبد اور خیر وشر اسی کی جانب سے مقدر ہوا ہے اور بندے کو بجز تسلیم ورضا کوئی چارہ کار نہیں ہے تو لامحالہ بندہ اپنے تمام کام اس کے سپرد کر کے اسی کی مدد چاہتا ہے تا کہ تمام افعال واحوال میں نفس کی شرارتوں اور شیطان کی دخل اندازیوں سے محفوظ رہے اور اس کے تمام کام خیر وخوبی اور راست روی سے انجام پائیں۔ اس لئے بندہ کے لیے یہی ضروری ومناسب ہے کہ تمام کاموں میں استخارہ کرے تا کہ اللہ تعالیٰ اس کے کاموں کو ہر زیان ونقصان اور خلل وآفت سے محفوظ رکھے۔ وباللہ التوفیق۔

باطنی القا کے حوالہ کرنے کی وجہ:

اب رہا میرا یہ کہنا کہ "میں نے خود کو دلی واردات اور باطنی القا کے حوالہ کر دیا"۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ جس کام میں نفسانی اغراض شامل ہوتی ہیں تو اس کام سے برکت جاتی رہتی ہے اور صراط مستقیم سے دل ہٹ کر کجروی اختیار کر لیتا ہے اور انجام بخیر نہیں ہوتا۔

نفسانی اغراض کی شکلیں:

نفسانی اغراض کی دو ہی صورتیں ممکن ہیں یا تو اس کی غرض پوری ہوگی یا نہ ہوگی؟ اگر اس کی غرض پوری ہوگئی۔ تو سمجھ لو کہ وہ ہلاکت میں پڑ گیا اس لئے کہ نفسانی اغراض کا حاصل ہونا دوزخ کی کنجی ہے۔ اور اگر اس کی نفسانی غرض پوری نہ ہوئی تو اللہ تعالیٰ پہلے ہی اس کے دل کو نفسانی غرض سے بے پروا کر دے گا اور ایسی خواہش کو دل سے دور کر دے گا کیونکہ اس میں اس کی نجات مضمر تھی اور یہی جنت کے دروازے کی کنجی بھی ہے جیسا کہ ارشاد حق تعالیٰ ہے کہ:

وَنَهَى النَّفْسَ عَنِ الْهَوٰى فَإِنَّ الْجَنَّةَ هِيَ الْمَاْوٰى

"اور بندے نے نفس کو خواہشات سے باز رکھا تو جنت ہی اس کا مسکن ہے۔" (النّٰزعٰت: ۴۰،۴۱)

کسی کام میں نفسانی دخل یہ ہے کہ بندہ اپنے کام میں حق تعالیٰ کی خوشنودی کو ملحوظ نہ رکھے اور وہ اس میں نفس کے فتنوں سے نجات پانے کی طلب نہ کرے۔ کیونکہ نفس کے فتنوں کی کوئی حدو غایت نہیں ہے اور نہ اس کی ہوس کاریوں کا کوئی شمار ہے۔ اس کا تفصیلی ذکر مناسب مقام پر آئے گا۔ (انشاء اللہ تعالیٰ)

جواب کے لیے عزم صمیم کی وجہ:

مدعائے نگارش یہ ہے کہ "تمہاری مقصد برآری کی خاطر اس کتاب کی نوشت کا عزم صمیم کرلیا"۔ تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ تم نے چونکہ مجھ سے سوال کر کے مجھے اس کا اہل اور صاحب علم و بصیرت جانا اور اپنے مقصود برآری کے لیے رجوع کر کے ایسے جواب کی استدعا کی جس سے پورا پورا فائدہ حاصل ہو سکے۔ اس لئے مجھ پر لازم ہو گیا کہ میں تمہارے سوال کا حق ادا کروں۔ جب استخارہ کے ذریعہ تمہارے سوال اور استدعا کا حق ہونا ظاہر ہو گیا تو میں نے عزم صمیم اور حسن نیت کے ساتھ کامل طور پر جواب دینے کا ارادہ کرلیا۔ تاکہ شروع سے آخر تک تکمیل جواب میں حسن نیت اور عزم و ارادہ شامل رہے۔ بندہ جب کسی کام کا ارادہ کرتا ہے تو ابتدائے عمل سے ہی نیت شامل ہوتی ہے۔ اگرچہ دوران عمل اسے کوئی خلل ہی واقع کیوں نہ ہو؟ لیکن بندہ اس میں معذور متصور ہوتا ہے۔ کیونکہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے "نیة المومن خیر من عمله" (مومن کی نیت اس کے عمل سے بہتر ہے)۔ لہٰذا ابتدائے عمل میں نیت کرنا اس سے بہتر ہے کہ بغیر نیت کئے عمل شروع کیا جائے۔ کیونکہ تمام کاموں میں نیت کو عظیم مرتبہ اور برہانِ صادق حاصل ہے۔ نیت میں جس قدر خلوص ہوگا اس عمل کا اجر و ثواب اتنا ہی زیادہ ہوگا۔ اس لیے کہ بندہ نیت ہی کے ذریعہ ایک حکم سے دوسرے حکم کی طرف منتقل ہوتا ہے۔ حالانکہ ظاہری عمل میں نیت کا اثر کوئی ظاہر نہیں ہوتا۔ اسے یوں سمجھو کہ ایک شخص نے دن بھر فاقہ کیا لیکن وہ اس فاقہ سے کسی ثواب کا مستحق نہ بنا۔ لیکن اگر اس نے روزہ کی نیت کر لی تو وہ ثواب کا بھی مستحق بن گیا۔ حالانکہ ظاہر عمل میں نیت کا کوئی اثر نظر نہیں آتا۔ اسی طرح اگر کوئی مسافر کسی شہر میں عرصہ دراز تک بود و باش رکھے تو بھی وہ وہاں کا باشندہ نہ کہلائے گا اور بدستور

مسافر ہی رہے گا۔ لیکن اگر اس نے (کم از کم پندرہ دن کی) اقامت کی نیت کر لی تو اب مقیم سمجھا جائے گا۔ شریعت مطہرہ میں اس قسم کی بے شمار مثالیں موجود ہیں۔ خلاصہ یہ کہ ہر عمل کی ابتداء میں نیک نیت کرنا ضروری ہے۔ واللہ تعالیٰ اعلم۔

وجہ تسمیہ:

اب رہا میرا یہ کہنا کہ اس نوشتہ کا نام کشف المحجوب (اردو ترجمہ کا نام السلوک الی المحبوب) رکھا۔ تو اس سے میری مراد یہ ہے کہ کتاب کے نام سے ہی معلوم ہو جائے کہ کتاب کے اندر کس قسم کے مضامین ہیں۔ خصوصیت کے ساتھ جب اہل علم و بصیرت کتاب کا نام سنیں گے تو سمجھ لیں گے کہ اس سے کیا مراد ہے اور اس میں کیسے مضامین ہیں۔

کشف حجاب کی تحقیق:

اے طالبان حق تمہیں معلوم ہونا چاہیے کہ اولیاء اللہ اور محبوبان بارگاہ ایزدی کے سوا سارا عالم لطیفۂ تحقیق سے محجوب و مستور ہے۔ چونکہ یہ کتاب راہ حق کے بیان، کلماتِ تحقیق کی شرح اور حجاب بشریت کے کشف میں ہے۔ لامحالہ اس کتاب کے لیے اس کے سوا اور کوئی نام موزوں و صحیح ہو سکتا ہی نہیں۔ چونکہ حقیقت کا منکشف ہونا در پردہ اور مستور اشیاء کے فنا ن و ناپید ہونے کا موجب ہوتا ہے۔ جس طرح موجود و حاضر کے لیے پردہ و حجاب میں ہونا موجب ہلاکت ہوتا ہے۔ یعنی نزدیک و قرب جس طرح دوری کی طاقت نہیں رکھتا اسی طرح دوری بھی نزدیک و قرب کی برداشت نہیں رکھتی۔ اسے اس طرح سمجھو کہ وہ کیڑے جو سرکہ میں پیدا ہوتے ہیں اگر انہیں سرکہ میں سے نکال کر کسی اور چیز میں ڈال دیے جائیں تو وہ مرجاتے ہیں یا وہ کیڑے جو کہیں اور پیدا ہوئے ہوں اگر ان کو سرکہ میں ڈال دیا جائے تو وہ مرجائیں گے۔ اسی طرح حقائق اشیاء کے معانی و مطالب اسی پر کھلتے اور منکشف ہوتے ہیں۔ جس کو خاص اسی لیے پیدا کیا گیا ہو۔ ان کے ماسوا کے لیے یہ ممکن نہیں ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے "کُلٌّ مُیَسَّرٌ لِمَا خُلِقَ لَہٗ" (بخاری

شریف) ہر مخلوق کے لیے وہی چیز ہے جس کے لیے اسے پیدا کیا گیا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ہر مخلوق کو جس چیز کے لیے پیدا کیا ہے اس کے حصول کی راہ اس پر آسان کر دی گئی ہے۔

حجابات رینی و غینی:

انسان کے لیے وہ پردے جو راہِ حق میں اس پر مانع اور حائل ہوتے ہیں دو قسم کے ہیں۔ ایک کا نام حجاب رینی ہے جو کسی حالت میں اور کبھی نہیں اٹھتا اور دوسرے کا نام حجاب غینی ہے اور یہ حجاب جلد تر اٹھ جاتا ہے۔ ان کی تفصیل یہ ہے کہ کچھ بندے ایسے ہوتے ہیں جن کے لیے اپنی ذات ہی راہِ حق میں پردہ و حجاب بن جاتی ہے۔ یہاں تک کہ ان کے نزدیک حق و باطل دونوں یکساں اور برابر ہو جاتے ہیں اور کچھ بندے ایسے ہوتے ہیں جن کے لیے ان کی اپنی صفتیں راہِ حق میں پردہ و حجاب ہوتی ہیں اور وہ ہمیشہ اپنی طبع و سرشت میں حق کے متلاشی اور باطل سے گریزاں رہتے ہیں۔ ذاتی حجاب کا نام رین جو کبھی زائل نہیں ہوتا۔

حجاب رین کے معنٰی:

رین جس کے معنٰی زنگ آلود ہونے اور ختم جس کے معنٰی مہر لگنے اور طبع جس کے معنٰی ٹھپہ لگنے کے ہیں۔ یہ تینوں لفظ ہم معنٰی اور ہم مطلب ہیں۔ جیسا کہ حق تعالیٰ نے فرمایا ہے:

كَلَّا بَلْ رَانَ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ مَّا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ.

"یہ لوگ ہرگز راہ حق قبول نہ کریں گے بلکہ ان کے دلوں پر رین یعنی حجاب ذاتی ہے، جو کچھ بھی وہ کرتے ہیں۔ (المطففین ۸۳)

اس کے بعد حق تعالیٰ ان کا حال ظاہر کرتے ہوئے فرماتا ہے:

اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا سَوَآءٌ عَلَيْهِمْ ءَاَنْذَرْتَهُمْ اَمْ لَمْ تُنْذِرْهُمْ لَا يُؤْمِنُوْنَ ۝

"بے شک وہ لوگ جنہوں نے کفر کیا ان پر برابر ہے خواہ آپ انہیں ڈرائیں یا نہ ڈرائیں وہ ایمان لانے والے نہیں ہیں۔" (البقرہ:٦)

پھر ظاہر حال بیان کرنے کے بعد حق تعالیٰ عدمِ قبول حق کی علت بیان فرماتا ہے کہ:

خَتَمَ اللّٰہُ عَلٰی قُلُوْبِهِمْ

''اللہ نے ان کے دلوں پر مہر لگا دی ہے۔'' (البقرہ:۷)

حجاب غین کے معنیٰ:

غین جس کے معنیٰ اوٹ اور ہلکے پردے کے ہیں یہ وصفی حجاب ہے۔ کسی وقت اس کا پایا جانا اور کسی وقت اس کا زائل ہونا دونوں جائز و ممکن ہیں۔ اس لئے کہ ذات میں تبدیلی شاذ و نادر بلکہ ناممکن و محال ہے اور غین یعنی صفات میں تبدیلی جائز و ممکن ہے۔

مشائخ طریقت رحمہم اللہ جائز اور ممکن الارتفاع صفات یعنی حجاب غینی کے بارے میں اور محال و ناممکن الارتقاع حجاب یعنی حجاب رینی جو کہ ذاتی ہے کے بارے میں لطیف اشارات سے بیان کرتے ہیں۔ چنانچہ سید الطائفہ حضرت جنید بغدادی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ:

الرین من جملة الوطنات والغین من جملة الخطرات

''رین وطنات کے قبیل سے ہے اور غین خطرات کے قبیل سے ہے۔''

وطنات، وطن کی جمع ہے جس کے معنیٰ قائم اور پائیدار رہنے کے ہیں اور خطرات، خطر کی جمع ہے جس کے معنیٰ عارضی اور ناپائیداری کے ہیں۔ اسے اس طرح سمجھو کہ پتھر کبھی آئینہ نہیں بن سکتا۔ اگرچہ اسے کتنا ہی صیقل اور صاف و شفاف کرنے کی کوشش کی جائے۔ لیکن اگر آئینہ زنگ آلود ہو جائے تو تھوڑا صاف کرنے سے وہ مجلیٰ اور مصفیٰ ہو جائے گا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ پتھر کے اندر تاریکی اور آئینہ کے اندر چمک اس کی ذاتی اور اصلی خوبی ہے۔ چونکہ ذات واصل قائم و پائیدار رہنے والی چیز ہوتی ہے اس لئے وہ کسی طرح زائل نہیں ہو سکتی۔ اور صفت چونکہ عارضی و ناپائیدار ہوتی ہے اور وہ قائم اور باقی رہنے والی چیز نہیں ہوتی اس لئے وہ جلد ہی زائل ہو جاتی ہے۔

میں نے یہ کتاب ان لوگوں کے زنگِ کدورت دور کرنے کے لیے لکھی ہے جو حجاب غینی یعنی پردہ صفاتی میں گرفتار ہیں اور ان کے دلوں میں نورِ حق کا خزانہ موجود ہے۔ تاکہ اس

کتاب کے پڑھنے کی برکت سے وہ حجاب اٹھ جائے اور حقیقی معنیٰ کی طرف انہیں راہ مل جائے۔ لیکن وہ لوگ جن کی سرشت و عادت ہی انکارِ حق ہو اور باطل پر قائم و برقرار رہنا ہی جن کا شعار ہو وہ مشاہدۂ حق کی راہ سے ہمیشہ محروم رہیں گے۔ ایسے لوگوں کے لیے یہ کتاب کچھ فائدہ مند نہ ہوگی۔ وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ عَلٰی نِعْمَةِ الْعِرْفَانِ.

مجیب کا فرض:

میں نے جو ابتداء میں یہ کہا ہے کہ "اس نوشتہ میں اپنے سوال کا جواب علی وجہ الکمال پاؤ گے" تو اس کا مطلب یہ ہے کہ میں نے تمہارے سوال کا مقصد اور اس کی غرض و غایت کو جان لیا ہے۔ اس لیے کہ مجیب کو جب تک سائل کے سوال کا مقصد اور اس کی غرض و غایت معلوم نہ ہوگی۔ اس وقت تک وہ اپنے جواب میں سائل کی تسلی و تشفی کیسے کرسکتا ہے؟ کیونکہ مشکل درپیش آنے پر ہی سوال کیا جاتا ہے اور جواب میں اس مشکل کا حل پیش کیا جاتا ہے۔ اگر جواب میں اسی اشکال کو حل نہ کیا جائے تو ایسا جواب سائل کو کیا فائدہ پہنچائے گا اور اشکال کا حل، بغیر معرفتِ اشکال ناممکن ہے؟

اور میرا یہ کہنا کہ "اپنے سوال کا جواب علیٰ وجہ الکمال پاؤ گے" تو اس کا مطلب یہ ہے کہ اجمالی سوال کے لیے اجمالی جواب ہوتا ہے اور جامع سوال کے لیے جامع جواب۔ لیکن جب سائل اپنے اجمالی سوال اور اس کے مراتب و درجات سے باخبر ہوتا ہے یا یہ کہ مبتدی کے لیے تفصیل کی حاجت ہوتی ہے تو مجیب کا فرض ہے کہ جواب میں اس کا پاس و لحاظ رکھے۔ اللہ تعالیٰ تمہیں سعادت عطا فرمائے۔ چونکہ تمہاری غرض یہی تھی کہ میں تفصیل کے ساتھ طریقت کے حدود و اقسام بیان کروں جو ہر شخص کے لیے فائدہ مند ثابت ہوں خواہ وہ مبتدی ہو یا متوسط و اعلیٰ۔ اس لئے میں نے تفصیل کو اختیار کر کے سوال کے جواب میں یہ کتاب مرتب کی ہے۔ وباللہ التوفیق۔

استعانت و توفیق کی حقیقت:

میں نے جو یہ کہا کہ "اللہ تعالیٰ سے استعانت کرتا ہوں اور اس سے توفیق کی استدعا

کرتا ہوں کہ وہ اس نوشتہ کو مکمل کرنے میں میری مدد فرمائے" تو اس سے میری مراد یہ ہے کہ بندے کے لیے اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی ناصر و مددگار نہیں ہے وہی ہر نیکی و بھلائی کا معین و مددگار ہے اور زیادہ سے زیادہ توفیق مرحمت فرماتا ہے۔

حقیقی توفیق یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ بندے کے ہر عمل میں بالفعل اپنی تائید فرمائے اور اس عمل پر اسے اجر و ثواب کا مستحق بنائے۔توفیق کی صحت و درستگی پر کتاب و سنت اور اجماع امت شاہد و ناطق ہے۔البتہ فرقہ معتزلہ اور قدریہ نے اس کا انکار کیا ہے۔یہ لوگ لفظ توفیق کو تمام معانی سے خالی کہتے ہیں۔گویا وہ اس لفظ کو بے معنیٰ اور مہمل تصور کرتے ہیں۔

مشائخ طریقت کی ایک جماعت کہتی ہے کہ توفیق اس قدرت کا نام ہے جو بوقت استعمال نیکیوں پر حاصل ہوتی ہے۔مطلب یہ ہے کہ بندہ جب اللہ تعالیٰ کا فرمانبردار ہوتا ہے تو حق تعالیٰ ہر حال میں اسے نیکیوں کی بیشتر توفیق و قوت عنایت فرماتا ہے جو اس سے قبل اسے حاصل نہ تھی۔باوجودیکہ عالم وجود میں بندے کا ہر حرکت و سکون اسی کے فعل و خلق سے واقع ہوتے ہیں۔یہاں صرف اتنا سمجھنا چاہیے کہ بندہ جو خدا کی عطا کردہ قوت سے طاعت و نیکی بجالاتا ہے اس کو توفیق کہتے ہیں۔کیونکہ یہ کتاب اس مسئلہ کی تفصیل بیان کرنے کا موضوع نہیں ہے کہ بتایا جاسکے کہ کون کونسی خاص حالت وقوت مراد ہے۔لہٰذا اسی پر اکتفا کر کے تمہارے سوال کے جواب کی طرف متوجہ ہوتا ہوں۔قبل اس کے کہ میں جواب میں اپنا کلام و بیان شروع کروں تمہارے سوال کو بعینہ نقل کردوں اور اس سوال سے اپنی کتاب کی ابتداء کروں۔وباللہ التوفیق۔

صورتِ سوال:

حضرت ابوسعید غزنوی رحمۃ اللہ علیہ نے یہ سوال کیا ہے کہ:

ع "مجھے تحقیقی طور پر بیان فرمایئے کہ طریقت و تصوف اور ان کے مقامات کی کیفیت اور ان کے مذاہب و اقوال اور رموز و اشارات کیا کیا ہیں؟ اور یہ کہ اہل طریقت و تصوف، اللہ تعالیٰ سے کس طرح محبت کرتے اور ان کے دلوں پر تجلیات ربانی کے اظہار کی کیفیت کیا ہوتی ہے؟ اور یہ کہ اس کی

ماہیت کی کنہ کے ادراک سے عقلیں حجاب میں کیوں ہیں اور نفوس انسانیہ
اس کی حقیقت سے کیوں منفرد ہیں؟ اور صوفیائے کرام کی ارواح کو اس کی
معرفت سے کیسے راحت و آرام ملتا ہے۔ نیز اس ضمن میں جن باتوں کا
جاننا ضروری ہے وہ بھی بیان فرمایئے؟''

الجواب بعون الملک الوہاب:

اے طالب حق! تمہیں معلوم ہونا چاہیے کہ ہمارے زمانہ میں خاص کر اس علاقہ کے لوگ درحقیقت علم طریقت سے دور ہو کر ہواؤ ہوس میں گرفتار ہو چکے ہیں۔ رضائے الٰہی سے کنارہ کش ہو کر علماء حق کے طریقے سے بھٹک چکے ہیں۔ آج جو لوگ طریقت و تصوف کے مدعی نظر بھی آتے ہیں تو وہ درحقیقت اصل طریقت کے برخلاف عمل کرتے اور طریقت کو بدنام کرتے ہیں۔ لہٰذا ایسی استعداد و صلاحیت پیدا کرنے کی ضرورت ہے کہ اس مقام تک رسائی حاصل ہو جائے جہاں تک اہل زمانہ کی دسترس نہیں ہے اور اس مقام پر وہی حضرات فائز ہوئے ہیں جو خاصان بارگاہِ حق ہیں اور تمام ارادتمندوں کی وہی مقصود و مراد رہی ہے اور وہ اس کے حصول کی خاطر ہر چیز سے کنارہ کش رہے ہیں۔ جس طرح کہ اہل معرفت، وجودِ حق کی معرفت میں ہمہ خاص و عام مخلوق سے بے نیاز رہے تھے۔ اس کے برعکس ان ظاہری مدعیان تصوف نے صرف ظاہری عبارتوں پر اکتفا کر رکھا ہے اور دل و جان سے حجاب کے خریدار بن کر اور تحقیق کی راہ چھوڑ کر اندھی تقلید کے خوگر بن گئے ہیں یہی وجہ ہے کہ تحقیق نے بھی اپنا چہرہ ان مدعیان ظاہری سے چھپا لیا ہے اور عوام اپنی موجودہ حالت میں مگن رہ کر کہہ رہے ہیں کہ ہم نے حق کو پہچان لیا ہے۔ اور خواص اسی میں خوش ہیں کہ ہمارے دل میں اس کی تمنا موجود ہے اور ہمارے نفس میں اس کی احتیاج اور سینوں میں اس کی محبت پائی جاتی ہے۔ اپنے اپنے مشاغل میں منہمک رہتے ہوئے کہتے ہیں کہ یہ سب رویتِ الٰہی کے شوق میں ہے اور دل میں جو اچھی خواہشات ابھرتی ہیں وہ محبتِ الٰہی کی تپش ہے۔ اسی طرح مدعیان سلوک اپنے ادعا کے سبب کلیۃً محروم ہو گئے ہیں، ارادتمندوں نے ریاضت و مجاہدے سے ہاتھ کھینچ لیا ہے اور اپنے فاسد

خیالات کا نام مشاہدہ رکھ لیا ہے۔

حضور سیدنا داتا گنج بخش رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ میں نے علم تصوف میں اس سے قبل بکثرت کتابیں لکھی ہیں۔ لیکن وہ سب کی سب ضائع ہو چکی ہیں اور جھوٹے دعویداروں نے ان کی بعض باتوں کو مخلوق خدا کا شکار کرنے کی خاطر چن لیا ہے اور باقی سب کو گم کر کے ان کا نام و نشان تک مٹا دیا ہے۔ چونکہ حاسدوں کا ہمیشہ یہی شیوہ رہا ہے۔ انہوں نے سرمایہ حسد و انکار کو ہی نعمت خداوندی جان رکھا ہے۔ چنانچہ ان میں سے کچھ لوگ تو ایسے ہیں جنہوں نے نقل تو کیا مگر پڑھ نہ سکے اور کچھ لوگ ایسے ہیں جنہوں نے پڑھ تو لیا مگر معانی و مطالب سے بے بہرہ رہے۔ انہوں نے صرف لفظ و عبارت کو پسند کیا اور اسی کو لکھتے اور یاد کرتے رہے۔ وہ کہتے ہیں کہ ہم علم تصوف و معرفت میں باتیں کر رہے ہیں۔ حالانکہ یہ لوگ انتہائی بدنصیبی اور محرومی میں گرفتار رہے ہیں۔ طبقات کا یہ تفاوت اس بنا پر ہے کہ علم تصوف اور معرفتِ الٰہی کبریت احمر (تانبے کو سونا بنانے والی سرخ اکسیر) کی مانند ہے جو سب کو عزیز و مرغوب ہے۔ کبریت احمر یعنی سرخ گندھک جب مل جاتی ہے تو وہ کیمیا ہوتی ہے۔ جس کی ایک چٹکی (ککھ) بہت سے تانبے کو خالص سونا بنا دیتی ہے۔ غرضیکہ ہر شخص ایسی دوا کا خواہشمند ہوتا ہے جو اس کے درد کا درماں بن سکے۔ اس کے سوا اس کی اور کوئی خواہش نہیں ہوتی۔ اسی مفہوم میں ایک بزرگ کا شعر ہے!

كُلُّ مَنْ فِيْ فُؤَادِهٖ وَجْعٌ

ہر وہ شخص جس کے دل میں درد ہے

يَطْلُبُ شَيْئًا يُوَافِقُ الْوَجْعَا

وہی چاہتا ہے جو درد کے موافق ہے

جس کی بیماری کی دوا کوئی حقیر ترین چیز ہو وہ مروارید و مرجان کی جستجو میں سرگرداں کیوں پھرے؟ اور جواہرات کی معجون یا دوالمسک بنانے کی کوشش کیوں کرے؟ علم طریقت و حقیقت تو اس سے کہیں زیادہ برتر ہے۔ ہر کہہ و مہہ کو یہ کیسے حاصل ہو سکتا ہے۔ اس سے قبل بکثرت جہّال نے بھی مشائخ طریقت کی علمی کتابوں کے ساتھ ایسا ہی سلوک کیا ہے۔ اسرار الٰہی

کے خزانے ان کے ہاتھوں میں پڑے تو وہ چونکہ اس کی حقیقت سے بے بہرہ تھے۔ گویا کلاہ دوز جاہلوں اور ناپاک وکمینہ جلد سازوں کی مانند ان کے ہاتھ لگ گیا۔ انہوں نے ٹوپیوں کے استر اور ابونواس کے شعروں کے دیوان اور فضول ولغو افسانوں اور کہانیوں کے مانند اَسرارِ الٰہی کے خزانوں کے ساتھ سلوک کیا۔ بلاشبہ جب بادشاہ کا باز کسی بوڑھی عورت کے جھونپڑے پر اترے گا تو وہ اپنے بال و پر ہی اکھڑوائیگا۔

اہلِ زمانہ کا شکوہ:

اللہ تعالیٰ نے ہمیں ایسے زمانہ میں پیدا فرمایا ہے کہ لوگوں نے اپنی خواہشات کا نام شریعت، حُبِّ جاہ کا نام عزت، تکبر کا نام علم اور ریاکاری کا نام تقوٰی رکھ لیا ہے۔ اور دل میں کینہ کو چھپانے کا نام حلم، مجادلہ کا نام مناظرہ، محاربہ و بیوقوفی کا نام عظمت، نفاق کا نام وفاق، آرزو تمنا کا نام زہد، ہذیانِ طبع کا نام معرفت، نفسانیت کا نام محبت، الحاد کا نام فقر، انکارِ وجود کا نام صفوت، بے دینی وزندقہ کا نام فنا اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی شریعت کو ترک کرنے کا نام طریقت رکھ لیا ہے۔ اور اہل دنیا کی آفتوں کو معاملہ کہنے لگے ہیں۔ اسی بنا پر اربابِ معانی اور عارفانِ حقیقت نے ان لوگوں سے کنارہ کشی اختیار کر رکھی ہے۔ اور گوشہ خلوت میں رہنا پسند کر لیا ہے۔ ان جھوٹے مدعیان جہان کا ایسا غلبہ ہو گیا ہے جس طرح خلافتِ راشدہ کے اختتام کے بعد اہل بیت اطہار رضوان اللہ علیہم اجمعین پر آلِ مروان کا غلبہ ہو گیا تھا۔ اس حقیقت کا انکشاف شہنشاہ اہل حقائق برہانِ تحقیق ودقائق حضرت ابوبکر واسطی رحمۃ اللہ علیہ نے کیا خوب کہا ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ:

اُبْتُلِيْنَا بِزَمَانٍ لَيْسَ فِيْهِ آدَابُ الْإِسْلَامِ وَلَا اَخْلَاقُ الْجَاهِلِيَّةِ وَلَا اَحْكَامُ ذِي الْمُرُوَّةِ

''ہم ایسے دور میں پھنس گئے جس میں نہ تو اسلام کے آداب ہیں اور نہ جاہلیت کے اخلاق ہیں اور نہ عام انسانی شرافت کے طور وطریق۔''

حضرت شبلی علیہ الرحمۃ فرماتے ہیں کہ عرب کے شاعر متنبی کا یہ شعر زمانہ حال کے

لوگوں کی بالکل صحیح تصویر ہے:

تَجَا اللهِ ذِیْ الدُّنْیَا مُنَاخًا لِرَاکِبِ

اللہ سے دنیا داروں کی تمنا اونٹ سوار کی منزل ہے

فَکُلٌّ بَعِیْدِ الْھَمِّ فِیْھَا مُعَذَّبٌ

تو جو بھی غم سے دور رہے وہی آخرت میں عذاب پانے والا ہے۔

دنیا مقام اَسرارِ الٰہی ہے:

اے طالب حق اللہ تعالیٰ تمہیں قوت عطا فرمائے۔ خوب سمجھ لو کہ میں نے اس جہان کو اسرار الٰہی کا محل اور کائنات عالم کو اس کا مقام اور اعیان ثابتہ کو لطائف و اسرار کی رہائش پایا ہے۔ جسے اللہ تعالیٰ کے اولیاء و محبین ہی خوب جانتے ہیں۔ یہ اغراض و جواہر، عناصر و اجرام اور تمام اجسام و طبائع ان اسرارِ الٰہی کے حجابات ہیں۔ مقام توحید میں ان کا اثبات شرک ہے۔ یہ بھی یاد رکھو کہ اللہ تعالیٰ نے اس جہان کو محل حجاب بنایا ہے تاکہ اپنے اپنے عالم میں ہر طبیعت حق تعالیٰ کے فرمان سے سکون و قرار حاصل کر سکے اور اپنے وجود کو اس کی توحید میں گم کر دے۔ چونکہ اس جہان میں روحیں اپنے جسموں کے ساتھ ملحق ہو کر مقام اخلاص سے ہٹ کر ایسی مغرور ہو گئی ہیں کہ ان کی عقلیں اسرار الٰہی کے ادراک سے عاجز اور وہ روحیں قرب حق سے مستور و محجوب ہو گئی ہیں جس کا انجام یہ ہوا کہ آدمی اپنی ہستی کے سبب غفلت کی تاریکی میں غرق ہو گیا اور مقامِ خصوصیت میں اپنی ہستی کے حجاب کے سبب عیب دار بن گیا۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے ارشاد میں اسی حقیقت کا اظہار فرمایا ہے:

وَالْعَصْرِ اِنَّ الْاِنْسَانَ لَفِیْ خُسْرٍ o

"قسم ہے زمانہ کی۔ بلاشبہ انسان گھاٹے میں ہے۔" (العصر:۱،۲)

اور فرمایا:

اِنَّهٗ کَانَ ظَلُوْمًا جَهُوْلًا

"بے شک انسان ظالم و نادان ہے۔" (الاحزاب:۷۲)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے "اللہ تعالیٰ نے مخلوق کو تاریکی میں پیدا فرمایا۔ پھر اس پر روشنی ڈالی" (ترمذی جلد۲) تو یہ حجاب اس جہان میں اس کے لیے اختیار طبع بن گئی کیونکہ اس نے اپنی طبیعت اور اپنی عقل سے اس میں تصرف کیا۔ حتیٰ کہ اس نے نہ صرف جہل و نادانی کو پسند کیا بلکہ ان حجابات کا وہ دل و جان سے خریدار و متوالا بن گیا۔ یہی وجہ ہے کہ وہ جمال کشف سے بے خبر اور اسرار الٰہی کی تحقیق سے بے پرواہ بن گیا۔ اور وہ عارضی مسکن میں خوش رہ کر اپنی فلاح و نجات سے غافل ہو گیا۔ اس طرح وہ توحید باری سے بے علم، جمالِ احدیت سے بے خبر اور ذائقہ توحید سے ناآشنا ہو گیا ہے۔ روح و جسم کے ترکب سے مشاہدہ حق کی تحقیق سے محروم ہے۔ اور دنیاوی حرص و طمع میں مبتلا ہو کر حق کی طرف رجوع و انابت سے بے بہرہ ہو گیا۔ اور نفس حیوانی نے جو حیاتِ حقیقی کے سوا ہے اس کے ناطقہ کو مجبور کر دیا۔ یہاں تک تمام حرکات و خواہشات نفسِ حیوانی کے تابع ہو کر رہ گئیں۔ پھر یہ حالت ہو گئی کہ سوائے کھانے پینے، سونے اور شہوانی خواہشات کے کسی چیز کا ہوش نہ رہا۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے محبوب اولیاء کو ان تمام باتوں سے بچنے کا حکم فرمایا ہے۔ ارشاد ہے:

ذَرْهُمْ يَأْكُلُوا وَيَتَمَتَّعُوا يُلْهِهِمُ الْأَمَلُ فَسَوْفَ يَعْلَمُونَ ۝

"اہل دنیا کو چھوڑ دو تا کہ وہ کھائیں، نفع اٹھائیں اور تمناؤں میں مگن رہیں۔ عنقریب پتہ چل جائے گا۔" (الحجر:۳)

اس لئے کہ ان کو خوبو اور عادت و طینت ہی یہ ہے کہ ان پر اسرار الٰہی مخفی رہیں۔ اور حق تعالیٰ کی توفیق و عنایت سے محروم رہ کر ہمیشہ ذلیل و خوار رہیں یہاں تک کہ وہ اس نفس امارہ کے جو ہمیشہ برائے کا حکم دیتا ہے، مطیع و تابع ہو جائیں۔ یاد رکھو یہ بہت بڑا حجاب ہے اور یہی ہر برائی و شر کا منبع اور سرچشمہ ہے۔ حق تعالیٰ کا ارشاد ہے:

إِنَّ النَّفْسَ لَأَمَّارَةٌ بِالسُّوءِ

"بیشک نفس ہر برائی کا زبردست حکم کرنے والا ہے۔" (یوسف:۵۳)

اس تمہیدی نصیحت کے بعد تمہارے سوال میں جو مقاصد ہیں ان کا بیان شروع کرتا

ہوں۔ وہ مقامات وحجابات ہیں ان کا بیان لطیف پیرایہ میں مرتب کرتا ہوں اور اہل علم وعرفان کی عبارتوں کو شرح کے ساتھ اور بقدر ضرورت اقوالِ مشائخ کو شامل کرتا ہوں نیز عجیب وغریب حکایتوں کو بیان کر کے فہم مقاصد میں تمہاری مدد کرتا ہوں۔ تا کہ تمہاری مقصد برآری ہو جائے اور ظاہری علوم کے علماء کو بھی معلوم ہو جائے کہ طریقہ تصوف کی جڑ مضبوط اور اس کی شاخیں میوہ دار ہیں اور وہ اس حقیقت سے روشناس ہو جائیں کہ طریقت کے تمام مشائخ، صاحبان علم ومعرفت تھے اور وہ اپنے مریدوں کو اس علم کے سیکھنے کا شوق دلاتے تھے اور اس پر قائم رہنے کا ذوق پیدا کرتے تھے۔ وہ کسی حالت میں لہو ولغو کا اتباع نہ کرتے تھے اور کبھی بھی یہ حضراتِ قدس کسی واہی تواہی میں نہیں پڑے بکثرت مشائخ طریقت اور علمائے معرفت نے تصوف وطریقت میں کتابیں تصنیف فرمائیں اور اسرار ربانی کو دلیل و برہان کے ساتھ لطیف عبارتوں سے ثابت کیا ہے وباللہ التوفیق۔

تحصیل علم کی فرضیت اور اس کی اہمیت

اللہ تعالیٰ نے علماء ربانی کی صفت میں ارشاد فرمایا ہے:

اِنَّمَا یَخْشَی اللّٰہَ مِنْ عِبَادِہِ الْعُلَمٰٓؤُا

"درحقیقت بندگانِ خدا میں سے علماء ہی خدا کا خوف رکھتے ہیں۔" (فاطر: ۲۸)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ "ہر مسلمان مرد وعورت پر تحصیل علم فرض ہے"۔ نیز فرمایا "علم حاصل کرو اگرچہ (دور دراز مقام) چین میں ہی کیوں نہ ہو"۔

اے طالب حق! تمہیں علم ہونا چاہیے کہ علم کی کوئی حد وغایت نہیں ہے اور ہماری زندگانی محدود ومختصر ہے۔ بنا بریں ہر شخص پر تمام علوم کا حصول فرض قرار نہیں دیا گیا۔ جیسے علم نجوم، علم حساب اور نادر وعجیب صنائع وغیرہ۔ لیکن ان میں سے اس قدر سیکھنا جتنا شریعت سے متعلق ہے ضروری ہے۔ مثلاً علم نجوم سے اتنا سیکھنا جس سے دن ورات کے اوقات (جن سے نماز وروزے کی ادائیگی درست طریقہ پر ہو سکے) لازم ہے۔ اسی طرح علم طب سے اتنا جس

سے ایام وعدت جان سکے۔ اور علم حساب سے اس قدر جس سے فرائض یعنی میراث وغیرہ کی تقسیم ہو سکے۔ غرض کہ عمل کے لیے جس قدر علم کی ضرورت ہے۔ اس کا حاصل کرنا فرض ولازم ہے۔ لیکن ایسے علوم جو کسی کو نفع نہ پہنچا سکیں اللہ تعالیٰ نے ایسے علوم کے تحصیل کی مذمت فرمائی ہے۔ ارشاد ہے:

وَيَتَعَلَّمُونَ مَايَضُرُّهُمْ وَلَا يَنفَعُهُمْ

''وہ ان باتوں کو سیکھتے ہیں جو انکو ضرر پہنچائے اور انہیں کوئی فائدہ نہ پہنچائے۔'' (البقرہ:۱۰۲)

رسول اللہ ﷺ نے ایسے بے منفعت علم سے پناہ مانگی ہے۔ آپ کا ارشاد ہے:

أَعُوذُبِكَ مِنْ عِلْمٍ لَا يَنْفَعُ

''اے خدا میں پناہ مانگتا ہوں ایسے علم سے جو نفع نہ پہنچائے۔''

یاد رکھو! علم کے ساتھ عمل بھی ضروری ہے۔ تھوڑے سے علم کے لیے بھی بہت زیادہ عمل درکار ہے۔ علم وعمل دونوں باہم لازم وملزوم ہیں۔ لہٰذا علم کے ساتھ عمل ہمیشہ پیوست رہنا چاہیے۔ اسی طرح بغیر علم کے عمل رائیگاں ہے۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:

اَلْمُتَعَبِّدُ بِلَافِقْهٍ كَالْحِمَارِ فِى الطَّاحُونَةِ

''بے علم عبادت گذار اس گدھے کی مانند ہے جو آٹے کی چکی سے بندھا ہے۔''

چکی سے بندھا ہوا گدھا اگرچہ دوڑتا بھاگتا اور چلتا ہے۔ لیکن وہ اپنے ہی محور میں گھومتا رہتا ہے اور کوئی مسافت طے نہیں کر پاتا۔ میں نے عام لوگوں کے ایک گروہ کو دیکھا ہے کہ وہ علم کو عمل پر فضیلت دیتے ہیں اور ایک گروہ ایسا بھی دیکھا کہ وہ عمل کو علم پر فوقیت دیتا ہے۔ حالانکہ ان دونوں گروہوں کے نظریے باطل ہیں۔ اس لیے کہ بغیر علم کے عمل کو حقیقت میں عمل کہا ہی نہیں جا سکتا۔ کیونکہ عامل جبھی عمل کرتا ہے جبکہ پہلے اسے اس کا علم ہوتا ہے۔ مطلب یہ کہ بندہ کو علم ہوتا ہے کہ اس عمل کے کرنے کا خدا نے اسے حکم دیا ہے۔ اس علم کے بعد بندہ اس پر عمل کرتا ہے جس سے وہ عمل کرنے کے ذریعہ اجر وثواب کا مستحق قرار پاتا۔ سمجھنا یوں چاہیے کہ نماز ایک عمل ہے جب تک بندے کو پہلے طہارت کے ارکان کا علم نہ ہو۔ اسی طرح پانی کی

شناخت کا علم، سمت قبلہ کا علم، کیفیت نیت کا علم، وقت نماز کا علم اور ارکانِ نماز کا علم پہلے سے نہ ہو وہ نماز صحیح کیسے ہو سکتی ہے۔ لہٰذا جب بغیر علم کے عمل سے بندہ بے علم ہو جاتا ہے تو جاہل کو اس سے کیسے جدا کر سکتے ہیں۔ اسی طرح اس گروہ کا حال ہے جو علم کو عمل پر فضیلت دیتا ہے۔ یہ نظریہ بھی باطل محال ہے کیونکہ عمل کے بغیر علم کام نہ آئے گا۔ ارشاد ہے:

نَبَذَ فَرِيْقٌ مِّنَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ كِتَابَ اللّٰهِ وَرَآءَ ظُهُوْرِهِمْ كَاَنَّهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ o

اہل کتاب کے ایک گروہ نے اللہ کی کتاب کو پس پشت ڈال دیا ہے (یعنی وہ کتاب پر عمل نہیں کرتے) گویا وہ لوگ جانتے ہی نہیں بے علم ہیں۔ (البقرہ:۱۰۱)

اللہ تعالیٰ نے اس آیۂ کریمہ میں عالم بے عمل کو علماء کے زمرے میں شمولیت کی نفی فرمائی ہے۔ اس لیے کہ سیکھنا، یاد کرنا، محفوظ کرنا یہ سب بھی تو عمل ہی کے قبیل سے ہیں اور اسی عمل کے ذریعہ ہی تو بندہ مستحق ثواب ہوتا ہے۔ اگر عالم کا علم اس کے اپنے کسب و فعل سے نہ ہو تو بھلا وہ کسی ثواب کا کیسے حقدار ہو سکتا ہے۔

ایسی باتیں وہی لوگ بناتے ہیں جو مخلوق میں دنیوی عزت و منزلت اور جاہ و حشمت کی خاطر علم حاصل کرتے ہیں۔ نفس علم سے انہیں کوئی لگاؤ اور سروکار نہیں ہوتا۔ ایسے لوگ یقیناً علم سے بے بہرہ ہیں۔ کیونکہ وہ عمل کو علم سے جدا کرتے ہیں۔ وہ نہ تو علم کی قدر ہی جانتے ہیں اور نہ عمل سے واقف ہیں۔ بعض جاہل تو یہاں تک کہ دیتے ہیں کہ یہ تو قال ہے۔ یعنی علم کی باتیں ہیں ہمیں علم نہیں چاہیے بلکہ حال یعنی عمل چاہیے۔ اور کوئی نادان یوں کہہ گزرتا ہے کہ عمل کی کیا ضرورت ہے؟ صرف علم ہی کافی ہے۔ حالانکہ جس طرح عمل کے بغیر علم فائدہ نہیں پہنچاتا۔ اسی طرح علم کے بغیر عمل سودمند نہیں ہے۔ یہ دونوں نظریے باطل ہیں۔ درحقیقت علم و عمل دونوں ہی لازم و ملزوم ہیں۔

علم بے عمل کی مثال:

حضرت ابراہیم ادہم رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ میں نے راستہ میں ایک پتھر پڑا

دیکھا۔اس پر لکھا تھا کہ مجھے پلٹ کر دیکھو جب میں نے پلٹ کر دیکھا تو لکھا تھا "اَنْتَ لَا تَعْمَلُ بِمَا تَعْلَمُ فَكَيْفَ تَطْلُبُ الْعِلْمَ مَالَا تَعْلَمُ" جب تم اپنے علم پر عمل نہیں کرتے تو اس کی تلاش کیوں کرتے ہو جس کا تمہیں علم نہیں۔ مطلب یہ ہے کہ جب تم علم پر عمل نہیں کر سکے تو اب یہ محال ہے کہ جن باتوں کا ابھی علم نہیں اس کو تم طلب کر سکو۔ لہٰذا پہلے اپنے علم پر عمل کرو تا کہ اس کے بعد اس کی برکت سے دیگر علوم کی راہیں تم پر کھل جائیں۔ حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ علماء کی ہمت درایت یعنی غور و خوض کرنے میں ہے اور نا سمجھوں کی ہمت روایت کرنے یعنی نقل کرنے میں ہے۔

لیکن وہ شخص جو علم کو دنیاوی عزت و جاہ کی غرض سے حاصل کرتا ہے۔ درحقیقت وہ عالم کہلانے کا ہی مستحق نہیں ہے کیونکہ دنیاوی عزت و جاہ کی خواہش کرنا بجائے خود از قبیل جہالت ہے۔ اس لئے کہ علم بذات خود بلند تر مرتبہ ہے۔ اس سے بڑھ کر اور کوئی مرتبہ ہے ہی نہیں۔ جب وہ اس ظاہری علم کے مرتبہ سے ہی نادان ہے تو بھلا وہ ربانی لطائف و اسرار کو کیسے جان سکے گا۔

علم کی اقسام:

اے طالب حق! یاد رکھو کہ علم دو قسم کے ہیں۔ ایک علم اللہ تعالیٰ کا ہے اور دوسرا علم مخلوق کا ہے۔

اللہ تعالیٰ کا علم اس کی صفت ہے جو اس کے ساتھ قائم ہے اور اس کے کسی صفت کی کوئی حد و انتہا نہیں ہے۔ اس کا علم موجودہ معدوم سب پر حاوی ہے۔ اور ہمارا علم یعنی مخلوق کا علم ہماری صفت ہے جو خدا کی عطا کردہ ہے اور ہمارے ساتھ قائم ہے۔ مخلوق کی تمام صفتیں متناہی اور محدود ہیں۔ مخلوق کا بمقابلہ علم الٰہی کوئی حقیقت و نسبت ہی نہیں رکھتا کیونکہ حق تعالیٰ فرماتا ہے:

وَمَآ اُوْتِيْتُمْ مِّنَ الْعِلْمِ اِلَّا قَلِيْلًا

""جس قدر تمہیں علم کا حصہ دیا گیا ہے درحقیقت بہت تھوڑا ہے۔" (بنی اسرائیل:۸۵)

غرضیکہ علم اوصاف مدح میں سے ہے اور اس کی تعریف، معلوم کو گھیرنا اور معلوم کا

اظہار و بیان ہے۔ لیکن سب سے بہترین تعریف یہ ہے کہ:

اَلْعِلْمُ صِفَةٌ یَصِیْرُ الْجَاهِلَ بِهَا عَالِماً

''علم ایسی صفت ہے جس کے ذریعہ جاہل، عالم بن جاتا ہے۔''

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے ''وَاللّٰهُ مُحِیْطٌ م بِالْکٰفِرِیْنَ'' اللہ کا علم کافروں کو گھیرے ہوئے ہے۔ (البقرہ:۱۹) نیز ارشاد ہے ''وَاللّٰهُ بِکُلِّ شَیْءٍ عَلِیْمٌ'' اور اللہ ہر شے کو جاننے والا ہے۔ (النور: ۳۵) اللہ تعالیٰ کا علم اس کی ذاتی صفت ہے۔ وہ ہر معدوم و موجود کو جانتا ہے۔ اس میں نہ کوئی مخلوق شریک ہے اور نہ اس کا علم متجزی و منقسم ہوسکتا ہے اور نہ اس سے منفک و جدا ہوسکتا ہے۔ اس کے علم پر دلیل اس کے فعل کا مرتب ہونا ہے۔ یعنی بحکم علم فاعل، فعل کا اقتضاء کرتا ہے۔ اس کا علم اسرار کے ساتھ لاحق اور اظہار کے ساتھ محیط ہے۔ طالب حق کو چاہیے کہ خدا کے مشاہدے میں عمل کرے۔ مطلب یہ کہ بندہ اعتقاد رکھے کہ وہ خدا کے علم میں ہے اور وہ اس کے افعال کو ملاحظہ فرما رہا ہے۔

معائنہ الٰہی کی مثال:

بصرہ میں ایک رئیس تھا۔ ایک دن وہ اپنے باغ میں گیا تو باغبان کی بیوی کے حسن و جمال پر اس کی نظر پڑ گئی۔ رئیس نے اس کے شوہر کو کسی بہانے سے باہر بھیج دیا اور عورت سے کہا دروازے بند کر دو۔ عورت نے آ کر کہا میں نے مکان کے تمام دروازے تو بند کر دیے ہیں لیکن ایک دروازہ میں بند نہیں کر سکتی ہوں۔ رئیس نے پوچھا وہ کونسا دروازہ ہے؟ عورت نے کہا وہ دروازہ ہمارے اور خدا کے درمیان کا ہے۔ رئیس شرمندہ اور پشیمان ہو کر توبہ و استغفار کرنے لگا۔

چار سبق آموز باتیں:

حاتم الاصم رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ جب سے مجھے چار باتوں کا علم حاصل ہوا ہے۔ میں عالم کے تمام علوم سے بے پرواہ ہو گیا ہوں۔ لوگوں نے دریافت کیا وہ کونسی چار باتوں کا علم ہے؟

انہوں نے فرمایا ایک یہ کہ میں نے جان لیا ہے کہ میرا رزق مقدر ہو چکا ہے۔ جس میں نہ کمی ہو سکتی ہے نہ زیادتی۔ لہٰذا زیادہ کی خواہش سے بے نیاز ہوں اور دوسری یہ کہ میں نے جان لیا ہے کہ خدا کا مجھ پر حق ہے۔ جسے میرے سوا کوئی دوسرا ادا نہیں کر سکتا۔ لہٰذا میں اس کی ادائیگی میں مشغول ہوں اور تیسری یہ کہ میرا کوئی طالب ہے۔ یعنی موت میری خواستگار ہے جس سے میں راہ فرار اختیار کر نہیں سکتا لہٰذا میں نے اسے پہچان لیا ہے اور چوتھی یہ کہ میں نے جان لیا ہے کہ میرا کوئی مالک ہے جو ہمہ وقت مجھے دیکھ رہا ہے۔ میں اس سے شرم کرتا ہوں اور نافرمانیوں سے باز رہتا ہوں۔ بندہ جب اس سے باخبر ہو جاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ اسے دیکھ رہا ہے تو وہ کوئی کام ایسا نہیں کرتا جس کی وجہ سے قیامت کے دن اسے شرمسار ہونا پڑے۔

فرض علوم:

ہر شخص پر لازم ہے کہ احکامِ الٰہی اور معرفتِ ربانی کے علم کے حصول میں مشغول رہے۔ بندے کا علم وقت کے ساتھ فرض کیا گیا ہے۔ یعنی جس وقت پر جس علم کی ضرورت ہو خواہ وہ ظاہر میں ہو یا باطن میں اس کا حاصل کرنا فرض کیا گیا ہے۔ اس علم کے دو حصے ہیں۔ ایک کا نام علم اصول ہے اور دوسرے کا نام علم فروع۔ ظاہر علم اصول میں کلمہ شہادت یعنی اشھد ان لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ وَاَشْھَدُ اَنَّ سَیِّدِنَا مُحَمَّدًا عَبْدُہٗ وَرَسُوْلُہٗ ہے اور باطن علم اصول میں تحقیق معرفت یعنی حق تعالیٰ کی معرفت میں کوشش کرنا ہے اور ظاہر علم فروع میں لوگوں سے حسن معاملہ اور باطن علم فروع میں نیت کا صحیح و درست رکھنا ہے۔ ان میں سے ہر ایک کا قیام بغیر دوسرے کے محال و ناممکن ہے۔ اس لیے کہ ظاہر حال، باطنی حقیقت کے بغیر نفاق ہے۔ اسی طرح باطن بغیر ظاہر کے زندقہ اور بے دینی ہے۔ ظاہر شریعت، بغیر باطن کے ناقص و نامکمل ہے اور باطن بغیر ظاہر کے ہوا و ہوس۔

علم حقیقت کے ارکان:

علم حقیقت یعنی باطن علم اصول کے تین رکن ہیں:

(۱) ذات باری تعالیٰ اور اس کی وحدانیت اور اس کے غیر سے مشابہت کی تنزیہہ ونفی کا علم۔

(۲) صفاتِ باری تعالیٰ اور اس کے احکام کا علم۔

(۳) افعالِ باری تعالیٰ یعنی تقدیر الٰہی اور اس کی حکمت کا علم۔

علم شریعت کے ارکان:

علم شریعت یعنی ظاہر علم اصول کے بھی تین رکن ہیں:

(۱) کتاب یعنی قرآن کریم۔

(۲) اتباع رسول یعنی سنت۔

(۳) اجماع امت۔

دلائل وبراہین:

اللہ تعالیٰ کی ذات وصفات اور اس کے افعال کے اثبات کے علم میں خود اسی کا ارشاد، دلیل وبرہان ہے۔ فرماتا ہے:

فَاعْلَمْ اَنَّهٗ لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ.

"جان لو یقیناً اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں۔" (محمد:۱۹)

ارشاد ہے:

فَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ مَوْلٰكُمْ

"جان لو یقیناً اللہ ہی تمہارا مولیٰ اور کارساز ہے۔" (الانفال:۴۰)

فرمان ہے:

اَلَمْ تَرَ اِلٰى رَبِّكَ كَيْفَ مَدَّ الظِّلَّ.

"کیا تم نے اپنے رب کی قدرت کی طرف نظر نہیں کی کہ اس نے سایہ کو کیسا دراز کیا۔"

(الفرقان:۴۵)

فرماتا ہے:

اَفَلَا یَنْظُرُوْنَ اِلَی الْاِبِلِ کَیْفَ خُلِقَتْ.

"کیا اونٹ کی طرف نظر نہیں کرتے کہ کیسا پیدا کیا گیا۔" (الغاشیہ: ۱۷)

اس قسم کی بکثرت آیات قرآنیہ ہیں جس میں اللہ تعالیٰ کے افعال پر غور وفکر کرنے سے اس کے صفات فاعلیہ کی معرفت حاصل ہوتی ہے۔

حضور اکرم سید عالم صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں۔

مَنْ عَلِمَ اِنَّ اللّٰہَ رَبُّہٗ وَاَنِّیْ نَبِیُّہٗ حَرَّمَ اللّٰہُ تَعَالٰی لَحْمَہٗ وَدَمَہٗ عَلَی النَّارِ.

"جس نے جان لیا کہ اللہ تعالیٰ ہی اس کا رب ہے اور یہ کہ میں اسی کا نبی ہوں تو اللہ تعالیٰ نے اس کے گوشت اور اس کے خون کو آگ پر حرام کر دیا ہے۔"

علم ذات باری کے شرائط:

ذات باری تعالیٰ کے علم کی شرط یہ ہے کہ ہر عاقل و بالغ یہ اعتقاد رکھے کہ حق تعالیٰ موجود، اپنی ذات میں قدیم بے حد و حدود ہے اور اس کا کوئی مکان اور جہت نہیں ہے۔ اس کی ذات کے لیے تغیر و تبدل ہے اور نہ کسی آفت کا صدور۔ کوئی مخلوق اس کی مانند نہیں ہے اور نہ اس کی بیوی بچے ہیں۔ تمہاری عقل و خیال میں جو صورت و شبیہ آئے وہ اس کی پیدا کردہ ہے۔ سب کا وہی خالق ہے وہی باقی ہے۔ ارشاد ہے:

لَیْسَ کَمِثْلِہٖ شَیْءٌ وَّھُوَ السَّمِیْعُ الْبَصِیْرُ.

"کوئی شے اس کی مثال نہیں وہی سننے دیکھنے والا ہے۔" (الشوریٰ: ۱۱)

علم صفات باری کے شرائط:

صفاتِ باری تعالیٰ کے علم کی شرط یہ ہے کہ عاقل و بالغ یہ اعتقاد رکھے کہ اس کی تمام صفتیں اسی کے ساتھ ہیں مطلب یہ کہ اس کی صفتیں نہ تو اس کی ذات ہیں اور نہ اس کا غیر۔ وہ اپنی

ہی صفات کے ساتھ دائم ہے۔ جیسے علم، قدرت، ارادہ، سمع، بصر، کلام اور بقاوغیرہ۔ چنانچہ فرماتا ہے:

(۱) اِنَّہٗ عَلِیْمٌ ۢ بِذَاتِ الصُّدُوْرِ بے شک وہی سینوں کے بھیدوں کو جاننے والا ہے۔ (الانفال:۴۳)

(۲) وَاللّٰہُ عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ اور اللہ ہر شے پر قادر ہے۔ (آل عمران:۲۹)

(۳) وَھُوَ السَّمِیْعُ الْبَصِیْرُ وہی سننے دیکھنے والا ہے۔ (الشوریٰ:۱۱)

(۴) فَعَّالٌ لِّمَا یُرِیْدُ جو چاہتا ہے کرتا ہے۔ (ھود:۱۰۷)

(۵) ھُوَ الْحَیُّ لَآ اِلٰـہَ اِلَّا ھُوَ وہی زندہ وباقی ہے اس کے سوا کوئی معبود نہیں۔ (المومن:۶۵)

(۶) قَوْلُہُ الْحَقُّ وَلَـہُ الْمُلْکُ اس کا کلام سچا ہے اور اسی کا ملک ہے۔ (الانعام:۷۳)

افعال باری تعالیٰ کا علم:

علم افعال باری تعالیٰ کے اثبات میں یہ ہے کہ بندہ اعتقاد رکھے کہ تمام مخلوق اور جو کچھ اس کائنات میں ہے سب کا پیدا کرنے والا اور ان کی تدبیر فرمانے والا وہی ہے۔ ارشاد حق ہے:

وَاللّٰہُ خَلَقَکُمْ وَمَا تَعْمَلُوْنَ

"اللہ نے تمہیں پیدا کیا اور ان سب کو جسے تم عملی جامہ پہناتے ہو۔"

یہ جہان ناپید و معدوم تھا۔ اسی کی تخلیق سے وجود میں آیا۔ اسی نے ہر خیر و شر نیک و بد کی تقدیر فرمائی اور وہی ہر نفع و نقصان کا پیدا کرنے والا ہے۔ جیسے کہ فرمایا "اَللّٰـــہُ خَالِقُ کُلِّ شَیْءٍ" اللہ ہر شے کا خالق ہے۔ (الزمر:۶۲)

احکام شریعت کا اثبات:

احکام شریعت کے اثبات کی دلیل یہ ہے کہ بندہ اعتقاد رکھے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے

ہماری جانب معجزات اور خوارقِ عادات کے ساتھ خدا کے بکثرت رسول مبعوث ہوئے ہیں اور ہمارے رسول احمد مجتبیٰ محمد مصطفیٰ علیہ التحیۃ والثنا خدا کے برحق رسول ہیں۔ آپ کے معجزات بہت ہیں اور آپ نے جو بھی غیب وظاہر کی باتیں بیان فرمائیں سب حق ہیں۔

شریعت اسلامیہ کا پہلا رکن کلام مجید ہے۔ اس کے بارے میں حق تعالیٰ فرماتا ہے:

مِنْهُ اٰيَاتٌ مُّحْكَمٰتٌ هُنَّ اُمُّ الْكِتٰبِ

''اس میں محکم آیتیں ہیں جو کتاب کی اصل ہیں۔'' (آل عمران:۷)

اور دوسرا رکن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت ہے۔ اس بارے میں حق تعالیٰ فرماتا ہے:

مَآ اٰتٰكُمُ الرَّسُوْلُ فَخُذُوْهُ وَمَا نَهٰكُمْ عَنْهُ فَانْتَهُوْا.

''یہ رسول جو تمہیں دیں اسے لے لو اور جس سے روکیں باز رہو۔'' (الحشر:۷)

اور تیسرا رکن اجماعِ امت ہے۔ اس بارے میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:

لَا تَجْمَعُ اُمَّتِیْ عَلَی الضَّلَالَةِ عَلَيْكُمْ بِالسَّوَادِ الْاَعْظَمِ

''میری امت گمراہی پر کبھی جمع نہ ہوگی۔ تم بڑی جماعت کے ساتھ رہو۔'' (ابن ماجہ)

اسی طرح حقیقت کے احکام بھی بکثرت ہیں۔ اگر ان سب کو کوئی یکجا کر کے لکھنا چاہیں تو ناممکن ہے اس لیے کہ اللہ تعالیٰ کے لطائف واسرار کی کوئی انتہا نہیں ہے۔

ملحد اور بے دینوں کی مذمت

یاد رہنا چاہیئے کہ ملحد اور بے دینوں کا ایک گروہ سوفسطائیہ ہے (اللہ کی لعنت ان پر)۔ ان کا مذہب یہ ہے کہ کسی قسم کا علم درست نہیں ہے اور علم بجائے خود کوئی شے نہیں ہے۔ اس کے جواب میں ہم ان سے دریافت کرتے ہیں کہ بتاؤ یہ جو تم نے جانا ہے کہ کسی چیز کا علم درست نہیں ہے یہ بات بھی اپنی جگہ صحیح ہے یا نہیں۔ اگر یہ جواب دو کہ یہ بات صحیح ہے تو تم نے خود علم کا اقرار

کرلیا اور اگر یہ کہو کہ یہ بھی صحیح نہیں ہے تو جو چیز بجائے خود صحیح و درست نہ ہو اس سے محاسبہ کرنا محال ہے۔ ایسے شخص سے بات کرنا بھی دانائی نہیں ہے۔ بے دینوں کا وہ گروہ جو اس نظریہ پر باتیں کرتا اور خیال رکھتا ہے کہ ہمارا علم کسی چیز میں صحیح نہیں ہے لہٰذا ہر چیز کے علم کو ترک کرنا اس کے ثابت کرنے سے زیادہ کامل ہے۔ تو ان کا یہ نظریہ و خیال ان کی حماقت و جہالت پر مبنی ہے۔ اس لئے کہ علم کا ترک کرنا دو باتوں سے خالی نہیں۔ یا تو وہ کسی علم سے ہوگا یا وہ جہل و نادانی سے۔ اگر کسی علم سے ترک کیا جائے تو علم نہ کسی علم کی نفی کرتا ہے اور نہ ضد و مقابلہ میں آتا ہے لہٰذا علم کے ذریعہ علم کی نفی و ترک محال ہے لامحالہ کسی علم کا ترک جہل و نادانی ہی سے ہوگا اگر یہ صحیح ہے تو اس سے علم کی نفی سراپا جہل ہے اور اس کا ترک کرنا سراسر حماقت و جہالت ہے۔ کیونکہ جہالت قابل مذمت اور قبیح صفت ہے اور یہ کہ جہل قرینہ کفر و باطل ہے۔ حق کو جہل سے کوئی علاقہ نہیں ہے۔ یہ بات تمام مشائخ طریقت کے برخلاف ہے جب عوام اس کی احمقانہ باتیں سنیں گے تو ان کو یہ کہنے کی جرأت ہوگی کہ تمام اہل تصوف کا مذہب یہی ہے اور یہ ہی ان کا عقیدہ ہے۔ اس طرح عوام کا اعتقاد متزلزل اور پراگندہ ہو جائے گا اور حق و باطل میں تمیز کی صلاحیت جاتی رہے گی لہٰذا ان کی باتوں کو خدا کے حوالہ کرتے ہیں تا کہ ملحد و بے دین اپنی گمراہی میں بھٹکتے رہیں اگر دین حق انہیں قابو میں لے کر ان کی گردن پکڑتا تو ان کی حالت اس سے بہتر ہوتی اور دین کی رعایت کے حکم کو ہاتھ سے نہ چھوڑتے۔ محبوبانِ خدا کو ناپسند و مکروہ نہ کہتے اور اپنی حالت کو بہتر بنانے کی کوشش کرتے۔

ملحدوں کا یہ گروہ جو ضد و اصرار میں مبتلا ہے اگر دین کے حسن و جمال کے ذریعہ اپنی آفتوں سے رستگاری پاتا اور عزت و منزلت کے سایہ میں اپنی زندگی گزارتا اور اہل حق کے ساتھ مکابرہ و مجادلہ سے پیش نہ آتا اور ان کی عزت و کرامت کو پائمال نہ کرتا تو ان کے لیے یہ کتنا اچھا ہوتا۔

سیدنا داتا گنج بخش رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ مجھے ایک ایسے شخص سے بحث کا اتفاق ہوا۔ جسے لوگ علم سے منسوب کر کے اہل علم خیال کرتے تھے حالانکہ وہ رعونت و تکبر کی کلاہ کا نام

علم اور نفسانی پیروی کا نام سنت اور شیطان کی موافقت کا نام ائمہ کی سیرت رکھے ہوئے تھا۔ اثنائے بحث میں اس نے کہا۔ ملحدین کے بارہ گروہ ہیں ان میں سے ایک گروہ صوفیاء کا ہے۔ میں نے جواب میں کہا اگر ایک گروہ اہل تصوف کا ہے تو باقی گیارہ گروہ تم میں سے ہوں گے۔ مگر ایک گروہ خود کو تم میں کے گیارہ گروہوں کے مقابلہ میں خوب اچھے طریقہ سے محفوظ رکھ سکتا ہے۔

یہ تمام آفت و فساد موجودہ زمانہ کی خرابی کا نتیجہ اور پیداوار ہے۔ بلاشک و شبہ اللہ تعالیٰ نے ہمیشہ اپنے اولیاء اور دوستوں کی ایک جماعت کو مخلوق سے چھپا کر رکھا ہے اور خلق کو ان کی خاطر ان سے جدا رکھا ہے۔ شیخ المشائخ حضرت علی ابن بندار صیرفی رحمتہ اللہ علیہ نے کیا خوب فرمایا ہے:

فَسَادُ الْقُلُوْبِ عَلٰى حَسْبِ فَسَادِ الزَّمَانِ وَاَهْلِهٖ

''دلوں کا فساد زمانہ اور اہل زمانہ کے فساد کے اعتبار پر ہے۔''

اب ہم مشائخ طریقت کے فیصلہ کن اقوال پیش کرتے ہیں تا کہ تمہیں معلوم ہو جائے کہ صوفیاء کرام پر اللہ کی کیسی صادق اور سچی عنایتیں رہی ہیں اور ان کے منکرین کیسے خائب و خاسر ہوئے ہیں۔ وباللہ التوفیق۔

اثبات علم میں اقوالِ مشائخ

(۱) حضرت محمد بن فضل علیہ الرحمۃ فرماتے ہیں کہ علوم تین طرح کے ہیں:

(۱) علم من اللہ (۲) (علم مع اللہ (۳) علم باللہ۔ اسی کو علم معرفت کہتے ہیں کیونکہ تمام انبیاء و اولیاء نے اسی سے اللہ تعالیٰ کی معرفت پائی ہے۔ جب تک انہیں اس کی معرفت نہ ہوئی منزل عرفان حاصل نہ ہوئی۔ اس لیے کہ محض کوشش و محنت کے ذریعہ حصولِ معرفت ذاتِ حق کے عرفان کے لیے منقطع ہے۔ کیونکہ بندہ کا علم، معرفتِ ذات حق کی علت نہیں بن سکتا۔ درحقیقت معرفتِ الٰہی کی علت، اللہ تعالیٰ ہی کی ہدایت اور اس کی عنایت ہے۔

علم من اللہ کا نام علم شریعت ہے۔ کیونکہ حق تعالیٰ نے ہماری طرف احکام نازل کر کے اس کی ادائی ہم پر لازم قرار دی ہے۔

علم مع اللہ کا نام، علمِ مقامات، علمِ طریق حق اور اولیاء کرام کے درجات کا بیان ہے۔ لہٰذا اس کی معرفت شریعت کی پیروی کے بغیر صحیح نہیں ہوتی اسی طرح شریعت کی پیروی اظہار مقامات کے بغیر درست نہیں ہے۔

(۲) حضرت ابوعلی ثقفی علیہ الرحمۃ فرماتے ہیں:

اَلْعِلْمُ حَیٰوۃُ الْقَلْبِ مِنَ الْجَھْلِ وَنُوْرُ الْعَیْنِ مِنَ الظُّلْمَۃِ

''جہالت اور تاریکی کے مقابلہ میں علم دل کی زندگی اور آنکھوں کا نور ہے۔''

مطلب یہ کہ جہالت کے خاتمہ سے دل کی حیات اور کفر کی تاریکی دور ہونے سے آنکھ کی روشنی یقینی ہے۔ جس کو معرفت کا علم نہیں اس کا دل جہل سے مردہ ہے اور جس کو شریعت کا علم نہیں اس کا دل نادانی کا مریض ہے۔ پس کافروں کے دل مردہ ہیں کیونکہ وہ خدا کی معرفت سے بے بہرہ ہیں۔ اہل غفلت کا دل بیمار ہے کیونکہ وہ اللہ کے فرمان سے بہت دور ہیں۔

(۳) حضرت ابوبکر وراق رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ:

''جس نے صرف علم کلام پر اکتفا کیا اور زہد نہ کیا وہ زندیق ہے اور جس نے علم فقہ پر قناعت کی اور تقویٰ اختیار نہ کیا تو وہ فاسق ہے۔''

ان کا مفہوم یہ ہے ک جس نے صرف توحید کی عبارتوں کا ہی علم اختیار کیا اور زہد نہ کیا وہ زندیق بن جاتا ہے اور جس نے بغیر پرہیز گاری کے علم فقہ و شریعت کو پسند کیا وہ فاسق و فاجر بن جاتا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ بغیر درستگی معاملہ و مجاہدہ مجرد توحید جبر ہے۔ ایسا موحد قول میں جبری اور فعل میں قدری کہلائے گا۔ جب تک قدر و جبر کے درمیان صحیح راہ اختیار نہ کیا جائے۔

یہ قول بھی حقیقۃً انہیں بزرگ کا ہے جسے ایک اور جگہ بیان فرمایا کہ ''التوحید دون الجبر و فوق القدر'' توحید کا مقام جبر سے پست اور قدر سے اونچا ہے۔ لہٰذا جس نے علم توحید کو درستگی

معاملہ کے بغیر محض اس کی عبارتوں کو اختیار کیا اور اس کے ضد ونفی کی طرف متوجہ نہ ہوا زہد کی روش پر نہ چلا۔ وہ زندیق ہو جاتا ہے۔

علم فقہ یعنی شریعت کی احتیاط کا نام تقویٰ ہے جو اسے بغیر ورع وتقویٰ کے پسند کرتا ہے اور رخصت وتاویل اور تعلق وشبہات کے درپے ہو کر مجتہدین عظام کے مذہب سے نکل جاتا ہے وہ جلد ہی بآسانی فسق کے گڑھے میں گر پڑتا ہے۔ ان باتوں کا ظہور بر بنائے غفلت ہوتا ہے۔

(۴) شیخ المشائخ حضرت یحییٰ بن معاذ رازی رحمۃ اللہ علیہ نے کیا خوب فرمایا ہے۔

''تین قسم کے لوگوں کی صحبت سے بچو ایک غافل علماء سے دوسرے مداہنت کرنے والے فقراء سے تیسرے جاہل صوفیاء سے۔''

غافل علماء وہ ہیں جنہوں نے دنیا کو اپنے دل کا قبلہ بنا رکھا ہے اور شریعت میں آسانی کے متلاشی رہتے ہیں۔ بادشاہوں کی پرستش کرتے، ظالموں کا دامن پکڑتے، ان کے دروازوں کا طواف کرتے ہیں۔ خلق میں عزت وجاہ کو اپنی محراب گردانتے ہیں، اپنے غرور وتکبر اور اپنی خود پسندی پر فریفتہ ہوتے ہیں، دانستہ اپنی باتوں میں رقت وسوز پیدا کرتے ہیں۔ ائمہ و پیشواؤں کے بارے میں زبان طعن دراز کرتے ہیں۔ بزرگان دین کی تحقیر کرتے ہیں اور ان پر زیادتی کرتے ہیں۔ اگر ان کے ترازو کے پلڑے میں دونوں جہان کی نعمتیں رکھ دو تب بھی وہ اپنی مذموم حرکتوں سے باز نہ آئیں گے۔ کینہ وحسد کو انہوں نے اپنا شعار مذہب قرار دے لیا ہے۔ بھلا ان باتوں کا علم سے کیا تعلق؟ علم تو ایسی صفت ہے جس سے جہل و نادانی کی باتیں، ارباب علم کے دلوں سے فنا ہو جاتی ہیں۔

اور مداہنت کرنے والے فقراء وہ ہیں جو ہر کام اپنی خواہش کے مطابق کرتے ہیں۔ اگرچہ وہ باطل ہی کیوں نہ ہو وہ اس کی تعریف ومدح کرتے رہیں گے اور جب کوئی کام ان کی خواہش کے خلاف ہوتا ہے چاہے وہ حق ہی کیوں نہ ہو تو وہ اس کی مذمت کرتے ہیں اور مخلوق سے ایسا سلوک کرتے ہیں جس میں جاہ ومرتبہ کی طمع ہوتی ہے اور عمل باطل پر خلق سے مداہنت

کرتے ہیں۔

جاہل صوفیاء وہ ہیں جن کا کوئی شیخ و مرشد نہ ہو اور کسی بزرگ سے انہوں نے تعلیم و ادب حاصل نہ کیا ہو۔ مخلوق خدا کے درمیان بن بلائے مہمان کی طرح خود بخود کود کر پہنچ گئے ہوں۔ انہوں نے زمانہ کی ملامت کا مزہ تک نہیں چکھا۔ اندھے پن سے بزرگ کے کپڑے پہن لیے اور بے حرمتی سے خوشی کے رستہ پڑ کر ان کی صحبت اختیار کر لی۔ غرض کہ وہ خودستائی میں مبتلا ہو کر حق و باطل کی راہ میں قوتِ امتیاز سے بیگانہ ہیں۔

یہ تین گروہ ہیں جن کو شیخ کامل ہمیشہ یاد رکھے اور اپنے مریدوں کو ان کی صحبت سے بچنے کی تلقین کرے۔ کیونکہ یہ تینوں گروہ اپنے دعاوی میں جھوٹے ہیں اور ان کی روش ناقص و نامکمل اور گمراہ کرنے والی ہے۔

(۵) حضرت ابو یزید بسطامی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

''میں نے تیس سال تک مجاہدہ کیا مگر مجھے علم اور اس کی پیروی سے زیادہ مشکل کوئی اور چیز نظر نہیں آئی۔''

ان کے فرمانے کا مطلب یہ ہے کہ طبیعت کے نزدیک علم کے مطابق عمل کرنے کے مقابلہ میں آگ پر پاؤں رکھنا زیادہ آسان ہے۔ اور جاہل کے دل پر ہزار بار پلصراط سے گزرنا اس سے زیادہ آسان ہے کہ ایک علمی مسئلہ سیکھے۔ فاسق کے لیے جہنم میں خیمہ نصب کرنا اس سے زیادہ محبوب ہے کہ وہ کسی ایک علمی مسئلہ پر عمل پیرا ہو۔

اے طالب راہِ حق! تمہیں لازم ہے کہ علم حاصل کر کے اس میں کمال حاصل کرو۔ بندہ کتنا ہی کامل علم حاصل کر لے علم الٰہی کے مقابلہ میں وہ جاہل ہی ہے۔ اس لئے اسے چاہیے کہ وہ ہمیشہ یہی سمجھے کہ میں کچھ نہیں جانتا کیونکہ بندہ بندگی کے علم کے سوا کچھ نہیں سیکھ سکتا اور بندگی راہِ خدا میں بہت بڑا حجاب ہے۔ اسی مفہوم میں شعر ہے:

اَلْعِجْزُ عَنْ دَرْكِ الْاِدْرَاكِ اِدْرَاكُ
وَالْوَقْفُ فِیْ طُرُقِ الْاَخْیَارِ اِشْرَاكُ

علم کے ادراک سے عاجز رہنا ہی علم وا دراک ہے
نیکوں کی راہ سے ہٹ جانا شرک کے برابر ہے

جو شخص تحصیل علم کی کوشش نہیں کرتا اور اپنے جہل پر مصر رہتا ہے ہمیشہ مشرک رہتا ہے اور جو سیکھتا ہے اور اپنے کمال علم میں اسے یہ معنیٰ ظاہر ہوں اور اس کی علمیت اسے یہ نصیحت کرے کہ اس کا علم اپنے نتیجہ کار میں بجز عاجزی کے کچھ نہیں ہے اور علم الٰہی پر معلومات کا کوئی اثر ہی نہیں پڑتا۔ اگر اس میں عجز کی خوبی پیدا ہوگئی تو درحقیقت علم کی تہ تک اس کی رسائی ہو سکتی ہے۔

فقر و درویشی

جاننا چاہیے کہ راہ حق میں درویشی کا عظیم مرتبہ ہے اور درویشوں کو بڑے خطرات کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

(۱) لِلْفُقَرَآءِ الَّذِيْنَ اُحْصِرُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ لَا يَسْتَطِيْعُوْنَ ضَرْبًا فِي الْاَرْضِ يَحْسَبُهُمُ الْجَاهِلُ اَغْنِيَآءَ مِنَ التَّعَفُّفِ

ان فقیروں کے لیے جو راہِ خدا میں روکے گئے ہیں زمین پر چل نہیں سکتے۔ نادان انہیں بچنے کے سبب تونگر سمجھتے ہیں۔ (البقرہ ۲۷۳)

(۲) ضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلًا عَبْدًا مَّمْلُوْكًا لَّا يَقْدِرُ عَلٰى شَيْءٍ (النحل: ۷۵)

اللہ نے ایک کہاوت بیان فرمائی ایک بندہ ہے دوسرے کے ملک، آپ کچھ مقدرت نہیں رکھتا۔

(۳) تَتَجَافٰى جُنُوْبُهُمْ عَنِ الْمَضَاجِعِ يَدْعُوْنَ رَبَّهُمْ خَوْفًا وَّطَمَعًا (السجدہ ۱۶)

ان کی کروٹیں خواب گاہوں سے جدا ہوتی ہیں اور اپنے رب کو پکارتے ہیں ڈرتے اور امید کرتے ہوئے۔

نبی کریم علیہ التحیۃ والتسلیم نے بھی فقر و توکل کو پسند و اختیار فرمایا چنانچہ ارشاد ہے:

اَللّٰھُمَّ اَحْیِنِیْ مِسْکِیْنًا وَّاَمِتْنِیْ مِسْکِیْنًا وَّاحْشُرْنِیْ فِیْ زُمْرَۃِ الْمَسَاکِیْنِ

اے خدا مجھے مسکینی زندگی عطا فرما اور مسکینی میں وفات دے اور مسکینوں کے زمرے میں اٹھا۔ (ترمذی)

سید عالم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ روز قیامت اللہ تعالیٰ ارشاد فرمائے گا:

"میرے محبوبوں کو میرے قریب لاؤ۔ فرشتے عرض کریں گے کون تیرے محبوب ہیں۔ اللہ تعالیٰ فرمائے گا وہ مسکین فقراء ہیں"۔

اس قسم کی بکثرت آیات و احادیث ہیں جو حدِ شہرت کو پہنچتی ہوئی ہیں۔ ان کے اثبات کی حاجت نہیں اور نہ دلائل صحت کی ضرورت کیونکہ ایک وقت ایسا بھی گزرا ہے کہ خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فقراء و مہاجرین میں جلوہ افروز تھے۔

صحابہ کرام کی ایک جماعت ایسی بھی تھی جنہوں نے اللہ کی عبادت اور بندگی اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر رہنے کے لیے سب سے کنارہ کش ہو کر تمام معاملات سے یکسوئی حاصل کر لی اور اپنا رزق اللہ تعالیٰ کی عطا پر چھوڑ کر مسجد نبوی شریف میں اقامت اختیار کر لی یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ نے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو ان اصحابہ کے ساتھ صحبت و قیام پر مامور فرمایا جیسا کہ حق تعالیٰ فرماتا ہے:

وَلَا تَطْرُدِ الَّذِیْنَ یَدْعُوْنَ رَبَّھُمْ بِالْغَدٰوۃِ وَالْعَشِیِّ یُرِیْدُوْنَ وَجْھَہٗ

"جو صحابہ صبح و شام اپنے رب کی عبادت کرتے اور اس کی رضا چاہتے ہیں انہیں نہ چھوڑیے۔" (الانعام ۵۲)

اور فرمایا:

وَلَا تَعْدُ عَیْنَاکَ عَنْھُمْ تُرِیْدُ زِیْنَۃَ الْحَیٰوۃِ الدُّنْیَا

"تمہاری آنکھیں دنیاوی حیات کی زینت کی خاطر انہیں چھوڑ کر کسی اور پر نہ پڑیں۔" (الکہف ۲۸)

اس کے بعد حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ معمول رہا کہ ان صحابہ میں سے کسی ایک کو جہاں

کہیں بھی دیکھتے تو آپ فرماتے یہ وہ حضرات ہیں جن کے لیے اللہ تعالیٰ نے مجھے تاکید فرمائی ہے۔

فقراء کا درجہ:

بارگاہِ احدیت میں فقراء کا بڑا مقام و درجہ ہے۔ خدا نے ان کو خاص منزلت و مرحمت سے نوازا ہے۔ یہ وہ لوگ ہیں جو اسبابِ ظاہری و باطنی سے ترک تعلق کر کے مکمل طور پر مسبب الاسباب پر قناعت کر کے رہ گئے ہیں اور اپنے آپ کو خدا کی ملازمت اور اس کی بندگی کے لیے وقف کر دیا ہے۔ ان کا یہ فخر ان کے لیے موجب فخر بن گیا ہے اور فقر کی دوری پر آہ و زاری اور اس کی آمد پر خوشی و مسرت کا اظہار کرتے ہیں۔ یہ حضرات فقر و مسکینی ہی سے ہمکنار رہتے ہیں اور اس کے سوا ہر چیز کو ذلیل و خوار جانتے ہیں۔

فقر و مسکینی کی نرالی شان ہے اور اس کی رسم عجیب ہے۔ حقیقی رسم و اضطرار ہے اس کی حقیقت اقبال اختیاری یعنی بخندہ پیشانی افلاس و اضطرار کو قبول کرنا ہے۔ جس نے اس مسلک و طریق کو دیکھا اور سمجھا اس نے اس سے آرام پایا۔ جب مراد پائی تو حقیقت سے ہمکنار ہو گئے اور جو حقیقت سے ہمکنار ہو گیا وہ موجودات سے دست کش ہو گیا۔ رویتِ کل میں فنائے کلی حاصل کر کے بقائے کلی سے سرفراز ہو گیا۔

مَنْ لَّمْ يَعْرِفْ سِوٰى رَسْمِهٖ لَمْ يَسْمَعْ سِوٰى اِسْمِهٖ

"جس نے اسے رسم کے سوا کچھ نہ جانا اس نے اس کے نام و اسم کے سوا کچھ نہ سنا۔"

فقیر درویش وہ ہے کہ اس کے پاس کچھ نہ اور کوئی چیز اسے خلل انداز نہ کرے نہ وہ اسبابِ دنیا کی موجودگی سے غنی ہو اور نہ اس کے نہ ہونے سے محتاج ہو۔ اسباب کا ہونا اور نہ ہونا دونوں اس کے فقر میں یکساں ہیں۔ بلکہ اسباب کی غیر موجودگی میں زیادہ خوش و خرم رہتا ہو۔ جواز کی ایک حالت یہ ہے اس لئے مشائخ نے فرمایا ہے کہ درویش جس قدر تنگ دست ہو گا اس کا حال اتنا ہی کشادہ ہو گا کیونکہ درویش کے نزدیک اسباب دنیاوی کا ظاہری وجود بھی تنگ دلی کا موجب ہوتا ہے حتیٰ کہ وہ کسی چیز کا دروازہ بند نہیں کرتا اگر بند کرے تو اتنا ہی اس کا دروازہ بند ہو جاتا ہے لہٰذا حق تعالیٰ کے اولیاء اور اس کے محبوبوں کی زندگیاں الطاف خفی میں چھپی ہوتی

ہیں اور حق تعالیٰ کے ساتھ روشن اسرار بہتر ہوتے ہیں نہ کہ دنیائے غدار کی مصاحبت۔ چونکہ یہ دنیا نافرمانوں کی جگہ ہے اس کے اسباب سے تعلق رکھنا صحیح نہیں ہوسکتا ہے اسی لیے یہ حضرات رضائے الٰہی کی راہ میں دنیاوی ساز وسامان سے کنارہ کشی کی تعلیم دیتے ہیں۔

حکایت:

کسی بادشاہ سے ایک درویش کی ملاقات ہوئی۔ بادشاہ نے کہا اگر تمہیں کوئی حاجت ہوتو بیان کرو۔ اس نے جواب دیا کہ میں اپنے غلاموں کے غلام سے کچھ نہیں مانگتا۔ بادشاہ نے پوچھا یہ کس طرح؟ درویش نے کہا میرے دو غلام ہیں اور یہ دونوں تیرے آقا ہیں۔ ایک حرص اور دوسرے امید وتمنا۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''اَلْفَقْرُ عِزٌّ لِاَهْلِہٖ'' (فقر اس کے اہل کے لیے موجب عزت ہے) اس لیے جو چیز اہل کے لئے موجب عزت ہوتی ہے وہ نااہل کے لیے باعث ذلت بن جاتی ہے۔ فقیر کی عزت اس میں ہے کہ وہ اپنے آپ کو ذلیل حرکتوں سے بچائے اور اپنے حال کو خلل سے محفوظ رکھے نہ بدن معصیت و ذلت میں مبتلا ہو اور نہ جان پر خلل و آفت کا گزر ہو۔ درویش کی ظاہری حالت، ظاہری نعمتوں میں مستغرق اور باطنی حالت، باطنی نعمتوں سے آراستہ ہوتی ہے تا کہ اس کا جسم روحانیت اور اس کا دل ربانی انوار کا منبع بن جائے نہ خلق سے اس کا تعلق ہو اور نہ آدمیت سے اس کی نسبت باطنی۔ یہاں تک کہ وہ خلق سے تعلق اور آدمیت کی نسبت سے بے نیاز ہوجائے اور اس جہان کی ملکیت اور آخرت میں درجات کی خواہش سے دل کو تونگری حاصل نہ ہو اور یہ جانے کہ اس کے فقر کی ترازو کے پلڑے میں دونوں جہان مچھر کے پر کے برابر بھی وزن نہیں رکھتے۔ درویش کی ایسی حالت کے بعد اس کا ایک سانس بھی دونوں جہان میں نہ سما سکے گا۔

فقر وغنا کی فضلیت میں بحث:

مشائخ طریقت رحمہم اللہ تعالیٰ کا اس میں اختلاف ہے کہ صفات خلق میں فقر وغنا

میں سے کون سی خوبی افضل ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ کی ایک صفت غنی ہے اور تمام صفات میں کامل ہونا اس کا خاصہ ہے چنانچہ متقدمین مشائخ میں سے حضرت یحییٰ بن معاذ رازی، احمد بن ابی الحواری، حارث المحاسبی، ابو العباس بن عطا، ابو الحسن بن شمعون اور متاخرین میں سے شیخ المشائخ ابوسعید فضل اللہ بن محمد المہینی رحمہم اللہ کا مذہب یہ ہے کہ فقر سے غنا افضل ہے۔ان تمام مشائخ کی دلیل یہ ہے کہ غنا حق تعالیٰ کی صفت ہے اس کے لیے فقر کی نسبت جائز نہیں ہے لہٰذا ایسا محبوب و دوست جس میں ایسی صفات مشترک ہو جو بندے اور معبود میں پائی جائے وہ محبوب و دوست ایسی صفت کے مقابلہ میں جس کی نسبت معبود کی نسبت جائز نہ ہو کامل ہوتا ہے۔اس کے جواب میں ہم کہتے ہیں کہ یہ اشتراک صرف لفظی اور اسمی ہے نہ کہ معنوی اور حقیقی۔ حالانکہ معنیٰ میں مماثلت و اشتراک درکار ہے(اور یہ محال ہے کیونکہ) اللہ تعالیٰ کی صفات قدیم ہیں اور مخلوق کی حادث۔لہٰذا یہ استدلال باطل ہے لیکن میں علی بن عثمان جلابی (سیدنا داتا گنج بخش رحمۃ اللہ علیہ) کہتا ہوں کہ یہ ایک بیکار بحث ہے۔غنی خدا کی صفت ہے اور وہی اس کا سزاوار ہے۔مخلوقات درحقیقت اس نام کی مستحق نہیں ہوسکتی انسان تو محتاج وفقیر پیدا ہی ہوا ہے اس کے لیے فقر کا نام ہی زیب دیتا ہے۔مجازی اعتبار سے خدا کے ماسوٰی کسی کو غنی کہلایا جائے تو جائز ہے۔ اللہ تعالیٰ اپنی ذات سے غنی ہے وہ مسبب الاسباب ہے۔اس کے غنا کے لیے نہ کوئی سبب ہے اور نہ اس کے لیے کسی سبب کی ضرورت ہے۔ بندے کو جو غنا حاصل ہوتا ہے وہ خدا کا عطا کردہ اور اسباب کا رہین منت ہے دونوں میں اشتراک و مماثلت کی یکسانیت باطل ہے۔ نیز جب عین ذات حق میں شرکت جائز نہیں ہے تو کسی کو اس کی کسی صفت میں بھی شرکت جائز نہیں ہے لہٰذا جب صفت میں اشتراک جائز نہیں تو اسم میں بھی جائز نہیں ہوسکتی۔

اب رہا لفظی اور اسمی اطلاق! تو نام رکھنا نشان وتعین کے لیے ہوتا ہے چونکہ خدا اور مخلوق کے درمیان ایک حدِ فاصل (حدوث وقِدم کی) اس لیے حق تعالیٰ کا غنا یہ ہے کہ اسے کسی کی پرواہ نہیں ہے وہ جو چاہتا ہے کرتا ہے نہ تو کوئی اس کے ارادہ کو روک سکتا ہے اور نہ کوئی اس کی

قدرت میں مانع ہوسکتا ہے وہ اعیان یعنی موجودات کو پلٹنے اور مختلف چیزوں کے پیدا کرنے پر قادر ہے وہ ہمیشہ سے اس صفت کا حامل رہا اور ہمیشہ رہے گا۔

مخلوق کا غنا یہ ہے کہ اس کی زندگی ہر آفت سے محفوظ عیش و آرام اور خوشی و مسرت کے ساتھ گزرے یا مشاہدہ الٰہی میں سرشار ہو کر چین و راحت میں گزرے۔ ان تمام باتوں میں حدوث و تغیر اور مشقت و حسرت کا سرمایہ اور عجز و تذلل کا مقام کارفرما ہے لہٰذا لفظ تمنا کا استعمال بندوں کے لیے بطور مجاز ہے اور اللہ تعالیٰ کے لیے حقیقی اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

(۱) یٰٓاَیُّھَا النَّاسُ اَنْتُمُ الْفُقَرَآءُ اِلَی اللّٰہِ وَاللّٰہُ ھُوَ الْغَنِیُّ الْحَمِیْدُ

''اے لوگو! تم خدا کے محتاج ہو اور اللہ ہی خوبیوں والا اور سراپا غنی ہے۔'' (فاطر: ۱۵)

(۲) وَاللّٰہُ الْغَنِیُّ وَاَنْتُمُ الْفُقَرَآءُ

''اور اللہ ہی غنی ہے اور تم محتاج و فقیر۔''

عوام کا ایک گروہ کہتا ہے کہ ہم تونگر کو درویش پر فضیلت دیتے ہیں اس لئے کہ اللہ تعالیٰ نے تونگر کو دونوں جہان میں سعید پیدا کیا ہے اور تونگری کا اس پر احسان کیا ہے ان لوگوں نے اس جگہ غنا سے دنیا کی کثرت، انسانی آرزوؤں کا برآنا اور بآسانی خواہشوں کا مل جانا مراد لیا ہے وہ دلیل میں کہتے ہیں کہ چونکہ خدا نے تونگری پر شکر گزاری اور مفلسی پر صبر و قناعت کا حکم دیا ہے اور یہ کہ ابتلا میں صبر و قناعت کی تلقین کی ہے اور نعمتوں میں شکر کا حکم دیا لہٰذا مصیبتوں سے نعمتیں افضل ہیں۔

اس کے جواب میں ہم کہتے ہیں کہ نعمت پر شکر گزاری کا حکم دیا اور شکر کو زیادتی نعمت کی علّت گردانا اور صبر کو زیادتی غربت کی علّت گردانا ہے۔ چنانچہ ارشاد ہے۔

''لَئِنْ شَکَرْتُمْ لَاَزِیْدَنَّکُمْ''

''اگر تم نے شکر کیا تو تم کو اور زیادہ دوں گا۔'' (ابراہیم: ۷)

اور صبر کے لیے فرمایا:

''اِنَّ اللّٰہَ مَعَ الصّٰبِرِیْنَ''

''بے شک اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے۔'' (البقرہ:۱۵۳)

مطلب یہ ہے کہ ہر وہ نعمت جس کی اصل غفلت ہے جب شکر بجالاتا ہے تو ہم غفلت کو اس کی غفلت پر اور زیادہ کر دیتے ہیں اور ہر وہ فقر جس کی اصل ابتلا ہے۔ جب صبر کرتا ہے تو ہم قربت کو اس کی قربت پر اور زیادہ کر دیتے ہیں۔

اہل طریقت کے نزدیک غنا کا مطلب:

مشائخ طریقت جس غنا کو فقر پر افضل کہتے ہیں اس سے عوام کی تونگری مراد نہیں ہے کیونکہ عوام تو اسے غنی و تونگر کہتے ہیں جسے دنیاوی نعمتیں حاصل ہوں۔ لیکن مشائخ کا غنا سے مراد منعم یعنی نعمت دینے والے خدائے قدوس کو پانا ہے۔ وصالِ الٰہی حاصل ہونا اور چیز ہے اور غفلت کا پانا اور چیز ہے۔

شیخ ابوسعید رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ ''فقیر وہی ہے جو اللہ کے ساتھ غنی ہو''۔ اس سے مراد ابدی کشف ہے جسے ہم مشاہدہ حق کہتے ہیں۔ مکاشفہ ممکن الحجاب ہے اگر ایسے مکاشفہ والے کو محجوب گردانیں تو وہ مشاہدات کا محتاج ہوگا یا نہیں؟ اگر یہ کہو کہ محتاج نہ ہوگا تو یہ محال ہے اور اگر کہو کہ محتاج ہوگا تو جب احتیاج پیدا ہوگئی تو غنا کا نام جاتا رہے گا۔

نیز غنا باللہ اس شخص کو ہوتا ہے جو قائم الصفات اور ثابت المراد ہو اور بشریت میں اقامت مراد اور اثبات صفات کے ساتھ غنا صحیح نہیں ہوسکتا اس لئے کہ ذات بشریت بجائے خود غنا کے لائق نہیں ہے۔ لہٰذا اَلْغَنِیُّ مَنْ اَغْنَاہُ اللّٰہُ (غنی وہ ہے جسے اللہ غنی کرے) میں غنی باللہ فاعل ہے اور اغنا اللہ مفعول ہے۔ کیونکہ فاعل از خود قائم ہوتا ہے اور مفعول کا قیام فاعل کے ذریعہ۔ نتیجہ برآمد ہوا کہ اقامت بخود، صفت بشریت ہے اور اقامت باللہ فنائے صفت ہے۔

لیکن میں علی بن عثمان جلابی (سیدنا داتا گنج بخش رحمۃ اللہ) کہتا ہوں کہ جب بندگی کی حالت میں یہ درست ہے کہ بقائے صفتِ بشریت پر غنائے حقیقی کا اطلاق نہیں ہوسکتا کیونکہ بقائے صفت، محل علت اور موجب آفت ہے چونکہ مذکورہ دلائل سے ثابت ہو چکا ہے کہ اپنی صفت کی فنا سے غنا باقی نہیں رہتا اسلئے کہ جو چیز بذات خود باقی نہ رہے اس کا نام نہیں ہوتا لہٰذا

فنائے صفت کا نام غنا رکھنا چاہیے اور جبکہ خود صفت ہی فانی ہے تو اسم ہی مقام نہ رہا۔ ایسے شخص پر نہ اسم فقر بولا جاسکتا ہے اور نہ اسم غنا لہٰذا صفت غنا حضرت حق جل مجدہ کے سوا کسی کے لیے جائز نہیں اور صفتِ فقر بندے کے ساتھ خاص ہے۔

پھر یہ کہ تمام مشائخ طریقت اور اکثر عوام کو غنا سے افضل مانتے ہیں کیونکہ قران و سنت اس کی فضیلت پر شاہد و ناطق ہے اور امت مسلمہ کی اکثریت کا اس پر اجماع ہے۔

حکایت:

ایک روز حضرت جنید بغدادی و ابن عطار حمہما اللہ کے درمیان اس مسئلہ میں بحث ہوئی۔ حضرت ابن عطا نے فرمایا کہ اغنیاء افضل ہیں کیونکہ روزِ قیامت نعمتوں کا حساب لیا جائے گا اور حساب دینے کے لیے بے واسطہ رب کے کلام کا سننا ہوگا چونکہ یہ محل عتاب ہے اور عتاب، دوست کا دوست کے ساتھ ہوتا ہے۔ حضرت جنید بغدادی نے جواب دیا کہ اگر اغنیاء سے حساب ہوگا تو فقراء اور درویشوں سے عذر خواہی ہوگی اور حساب سے عذر افضل ہے۔

اس جگہ ایک لطیفہ بیان کرتا ہوں وہ یہ کہ محبت کی تحقیق میں عذر بیگانگی ہے اور عتاب یگانگی کی ضد ہے حالانکہ خدا کے دوست تو ایسے مقام پر فائز ہوتے ہیں جہاں یہ دونوں چیزیں ان کے لیے آفت ظاہر کرتی ہیں اس لئے کہ عذر خواہی تو کسی ایسی کوتاہی پر ہوتی ہے جو دوست کے بارے میں اس کے فرمان کے خلاف کیا گیا ہو جب دوست اپنے حق کو اس سے طلب کرتا ہے تو یہ اس سے عذر خواہی کرتا ہے اور عتاب دوست کے فرمان میں کسی قصور کے سبب ہوتا ہے ایسی صورت میں دوست اس قصور کے سبب اس پر عتاب نازل کرتا ہے خدا کے دوستوں کے لیے یہ دونوں باتیں محال ہیں غرض کہ اہل طریق فقر کی ہر حالت میں صبر اور غنا کی حالت میں شکر بجالاتے ہیں۔ ایک بات یہ بھی ہے کہ دوستی کا اقتضاء تو یہ ہے کہ دوست اپنے دوست سے کسی چیز کا مطالبہ نہ کرے اور نہ دوست، دوست کے فرمان کو رائیگاں کرے۔ لہٰذا!

ظَلَمَ مَنْ سَمّٰى ابْنِ اٰدَمَ اَمِيرًا وَقَدْ سَمَّاهُ رَبُّهٗ فَقِيرًا۔

"اس نے ظلم کیا جس نے آدمی کا نام امیر رکھا حالانکہ اس کے رب نے

اس کا نام فقیر رکھا ہے۔"

کیونکہ حق تعالیٰ کی طرف سے اس کا نام فقیر ہے اگر چہ بظاہر وہ امیر و تونگر ہے لیکن حقیقت میں وہ فقیر ہی ہے۔ وہ شخص ہلاک ہو گیا جس نے خود پر گمان کیا کہ وہ امیر ہے۔

اگر چہ وہ شخص تخت حکومت پر موجود ہے اس لئے کہ امیر و غنی صاحب صدقہ ہیں اور فقراء صاحب صدق اور صاحب صدق، صاحب صدقہ نہیں ہو سکتا۔

علم حقیقت میں حضرت ایوب علیہ السلام کا فقر حضرت سلیمان علیہ السلام کے غنا کی مانند ہے۔ حضرت ایوب علیہ السلام کی پختگی صبر پر فرمایا ہے "نِعْمَ الْعَبْدُ" (کیا ہی اچھا بندہ ہے) اور حضرت سلیمان علیہ السلام سے ان کی حکومت کے وقت فرمایا "نِعْمَ الْعَبْدُ" (کیا ہی اچھا بندہ ہے) جب اللہ کی رضا حاصل ہو گئی تو اب فقر ایوب، غناء سلیمان علیہ السلام کے مانند بن گیا۔

حکایت:

مصنف فرماتے ہیں کہ استاد ابوالقاسم قشیری رحمۃ اللہ علیہ سے میں نے سنا وہ فرماتے ہیں کہ لوگ فقر و غنا میں بحث کرتے ہیں اور خود کو مختار خیال کرتے ہیں لیکن میرا طریق و مسلک یہ ہے کہ جو حق تعالیٰ میرے لیے اختیار فرمائے اور اسی کی میں حفاظت کرتا ہوں اگر وہ مجھے تونگر رکھے تو غافل نہیں ہوتا اگر وہ مفلس فقیر بنائے تو حریص و معترض نہیں ہوتا۔

خلاصہ یہ کہ غنا نعمت ہے لیکن اس میں غفلت برتنا آفت ہے اور فقر بھی نعمت ہے لیکن اس میں حرص و طمع کا داخل کرنا آفت ہے۔ معانی کے اعتبار سے تمام اعتبارات عمدہ ہیں لیکن سلوک و روش کے لحاظ سے معاملہ مختلف ہے۔ ماسوی اللہ سے دل کو فارغ رکھنے کا نام فقر ہے اور غیر میں مشغول رہنے کا نام غنا ہے۔ جب دل فارغ ہو تو اس وقت فقر غنا سے افضل ہے اور غنا فقر سے۔ ساز و سامان کی کثرت کا نام غنا نہیں ہے اور نہ اس کے نہ ہونے کا نام فقر ہے ساز و سامان تو خدا کی طرف سے ہے جب طالب ساز و سامان کی ملکیت سے جدا ہو گیا شرکت جاتی رہی اور وہ دونوں ناموں سے فارغ ہو گیا نہ اب فقر ہے نہ غنا۔

فقر وغنا میں چند رموز وکنایات:

مشائخ طریقت رحمہم اللہ سے فقر وغنا کے سلسلہ میں چند رموز منقول ہیں۔ حسب مقدرت ان کے اقوال درج کتاب کرتا ہوں:

(۱) مشائخ متاخرین میں سے ایک بزرگ فرماتے ہیں کہ:

''فقیر وہ نہیں جو ساز وسامان سے خالی ہو بلکہ فقیر وہ ہے جس کا دل آرزو وتمنا سے خالی ہو''۔

اگر اللہ تعالیٰ اسے مال و دولت دے تو اگر وہ مال کی حفاظت کی خواہش رکھے تو غنی کہلائے گا اور اگر مال کو ترک کرنے کی خواہش کرے تو بھی غنی کہلائے گا اس لئے کہ یہ دونوں حالتیں ملک غیر میں تصرف کرنے کے برابر ہیں حالانکہ ترکِ حفظ وتصرف کا نام فقر ہے۔

(۲) حضرت یحییٰ بن معاذ رازی فرماتے ہیں کہ:

''فقر کی علامت، فقر سے ڈرنا ہے''۔

مطلب یہ کہ صحتِ فقر کی علامت یہ ہے کہ بندہ کمالِ ولایت، قیامِ مشاہدہ اور فنائے صفت میں زوال اور قطع سے ڈرتا رہے۔ اس حال کا کمال اس حد تک پہنچ جائے کہ وہ قطع سے بھی ڈرے۔

(۳) حضرت صائم بن محمد رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ:

''فقیر کی تعریف یہ ہے کہ وہ اپنے اسرار کی حفاظت کرے اور اپنے نفس کو بچائے اور اس کے فریضہ کو ادا کرے''۔

مطلب یہ کہ فقیر اپنے اسرار باطنی کو اغراض دنیاوی سے بچائے اور اپنے نفس کو (حرص وتمنا میں) آفت سے محفوظ رکھے اور اس پر شریعت کے احکام وفرائض کو جاری کرے۔ غرض کہ جو کچھ اسرار پر گزرے اسے اظہار میں مشغول نہ کرے اور جو اظہار پر حالت ہو اسے اسرار میں مشغول نہ کرے ان احوال کے غلبہ کے وقت اوامر ونواہی کی ادائیگی میں پس وپیش نہ کرے یہ علامت صفاتِ بشری کے زائل ہونے کی ہوتی ہے اور بندہ مکمل طور پر ذاتِ باری

تعالیٰ میں جذب ہو جاتا ہے یہ معنیٰ بھی حق تعالیٰ ہی کی جانب سے ہوتے ہیں۔

(۴) حضرت بشر حافی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ:

"اَفْضَلُ الْمَقَامَاتِ اِعْتِقَادُ الصَّبْرِ عَلَی الْفَقْرِ"

سب سے افضل مقام یہ ہے کہ فقر پر صبر کو مضبوطی سے تھامے۔ فقر پر صبر واعتقاد رکھنا بندے کے مقامات میں سب سے افضل مقام ہے اور فقر فنائے مقامات کا نام ہے فقر پر صبر و اعتقاد کرنے کی علامت یہ ہے کہ درویش اعمال و افعال اور اوصاف کے فنا کے رخ کو ملحوظ رکھے۔ لیکن اس قول میں ظاہر معنیٰ غنا پر فقر کی فضیلت و اعتقاد رکھنے میں ہے کہ کسی حال میں راہِ فقر سے مونھ نہ موڑے۔

(۵) حضرت شبلی علیہ الرحمۃ فرماتے ہیں کہ:

"فقیر وہ ہے جو اللہ کی سوا کسی چیز میں راحت نہ پائے"۔

اس لئے درویش خدا کے سوا کسی سے کوئی واسطہ و علاقہ نہیں رکھتا۔ اس قول کا ظاہر مفہوم یہ ہے کہ درویش حق تعالیٰ کے سوا غنا و تونگری پائے گا ہی نہیں جب اسے پالے گا تو تونگر ہو جائے گا لہٰذا تمہارا وجود اس کے لیے غیر ہے اور جب تونگری ترکِ غیر کے بغیر حاصل ہونا ممکن نہیں تو تونگری حجاب بن گئی جب تم اس راہ پر گامزن ہو گے تو تونگر کیسے رہو گے یہ معنی بہت لطیف و عمیق ہیں۔ اہل حقیقت کے نزدیک مذکورہ جملہ کا مفہوم یہ نکلا کہ "اَلْفَقِیْرُ اَنْ لَا یَسْتَغْنِیْ عَنْہُ" فقیر وہ ہے جسے کبھی غنا نہ ہو یہ وہ معنی ہیں جسے شیخ طریقت حضرت خواجہ عبداللہ انصاری رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ ہمارا غم تو دائمی ہے کسی حال میں نہ تو ہم اپنی ہمت سے مقصود حاصل کر سکتے ہیں اور نہ کامل طور پر دنیا و آخرت میں اس سے نابود ہو سکتے ہیں اس لئے کہ حصولِ شے کے لیے مجانست ضروری ہے اور وہ جنس نہیں ہے اور موجود سے اعراض کے لیے غفلت درکار ہے لیکن درویش غافل نہیں ہوتا کیونکہ پیش آمدہ راہ، دشوار و مشکل ہے اور وہ دوست ایسا ہے کہ ریاضت و مجاہدے کے ذریعہ اس کا دیدار حاصل نہیں ہو سکتا اور نہ اس کا دیدار، مخلوق کی قدرت والی جنس کی قبیل سے ہے۔ اور فنا پر تبدل صورت نہیں اور بقا پر تغیر جائز نہیں اور نہ فانی

کبھی باقی ہے جسے حق کا وصال نصیب ہوگا اور نہ باقی کبھی فانی ہے کہ اس کا قرب و نزدیکی حاصل ہوگی لہٰذا اس کے دوست تو سراسر مشکل میں پڑے ہوئے ہیں دل کی تسلی کے لیے حسین عبارتیں بنادی گئی ہیں۔ اور تسکین روح کے لیے مقامات و منازل اور طریق ظاہر کر دیے ہیں ان کی عبارتیں اپنے وجود میں مزین اور ان کے مقامات اپنی جنسیت میں پراگندہ حق تعالیٰ مخلوق کے اوصاف و احوال سے پاک و منزہ ہے۔

(۶) حضرت ابوالحسن نوری رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ:

''فقیر کی تعریف یہ ہے کہ نہونے کے وقت خاموش رہے اور جب ہو تو سب کچھ خرچ کر دے اور یہ بھی فرمایا کہ موجودگی کے وقت مضطرب رہے''۔

مطلب یہ ہے کہ جب مال نہیں ہوتا تو وہ خاموش رہتا ہے اور جب مال ہوتا ہے تو وہ اپنے سے زیادہ دوسرے کو بہتر جان کر اس پر خرچ کرتا ہے لہٰذا وہ شخص جو ایک لقمہ کی حاجت رکھتا ہے جب اس کی حاجت پوری نہ ہو تو اس کا دل ساکن رہتا ہے اور جب وہ لقمہ مل جاتا ہے تو اپنے مقابلہ میں دوسرے کو بہتر جان کر اسے دے دیتا ہے یہ عظیم کارنامہ ہے۔

اس قول میں دو اشارے ہیں ایک یہ کہ وہ نہ ہونے کی حالت میں خاموش اور راضی برضا رہتا ہے اور موجود ہونے کی صورت میں پسند کرتا ہے کہ دوسرے پر خرچ کر دے کیونکہ راضی ہونا حصول خلعت کے لائق بناتا ہے یہی خلعت، قرب و نزدیکی کی علامت ہے اور محبّ و طالب، تارک خلعت ہے کیونکہ خلعت میں فرقت کا نشان ہے اور دوسرا اشارہ یہ ہے کہ وہ ساکن ہوتا ہے یعنی نہ ہونے کی حالت میں موجود ہونے کے انتظار میں خاموش رہتا ہے پھر جب موجود ہو جاتا ہے تو اس کا وجود چونکہ خدا کا غیر ہے وہ غیر سے راحت نہیں پاتا تو اسے اپنے سے جدا کر دیتا ہے یہی مفہوم شیخ المشائخ ابوالقاسم جنید بن محمد بن جنید رحمۃ اللہ کے اقوال کا ہے۔ فرماتے ہیں ''اَلْفَقْرُ خُلُوُّ الْقَلْبِ عَنِ الْاَشْکَالِ'' تمام شکلوں سے دل کا خالی کرنا فقر ہے دل میں جب شکل ہوتی ہے تو شکل چونکہ غیر ہے تو بجز نکال پھینکنے کے چارہ کار نہیں۔

(۷) حضرت شبلی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ:

"اَلْفَقْرُ بَحْرُ الْبَلَاءِ وَبَلَاؤُہٗ کُلُّہٗ عِزٌّ"

فقر ابتلاء کا سمندر ہے اور اس کی تمام بلائیں عزت ہیں اور عزت نصیب غیر ہے اس لئے کہ مبتلا تو عین بلا میں ہے اسے غیر سے کیا سروکار۔ اس وقت تو وہ ابتلا سے بھی میلان نہیں رکھتا۔ اس وقت اس کی بلا بتمامہ عزت ہوتی ہے اور اس کی عزت ہمہ وقت۔ اور اس کا وقت، سب محبت میں اور اس کی محبت تمام مشاہدے میں مرکوز ہوتی ہے تا کہ مطلوب و طالب کا پورا دماغ غلبۂ خیال سے محلِ دیدار بن جائے یہاں تک کہ بغیر آنکھ کے دیکھنے والا بغیر کان کے سننے والا ہو جاتا ہے تو ایسا بندہ صاحبِ عزت ہے کہ اس نے ابتلا کا بوجھ اٹھا رکھا ہے کیونکہ حقیقت میں ابتلاء عزت کی چیز ہے اور دنیاوی نعمتیں ذلت کی چیز اس لیے حقیقی عزت وہی ہے جس سے بندہ کی بارگاہِ حق میں حضوری ہو اور ذلیل و حقیر وہ شے ہے جس سے بندہ حق سے دور ہو اور فقر کی بلائیں حضوری کی علامت ہیں اور غنا و تونگری کی راحت دوری و غیبت کا نشان ہے۔ حاضر بحق صاحب عزت ہے اور غائب از حق ذلیل و خوار۔ جس ابتلاء کے معنیٰ مشاہدہ اور اس کے دیدار سے انس ہو اس سے جس طرح بھی تعلق ہو غنیمت ہے۔

(۸) سید الطائفہ حضرت جنید بغدادی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ:

"اے گروہ فقراء! تم لوگوں میں اللہ والوں کی حیثیت سے جانے جاتے ہو اور اللہ تعالیٰ سے تعلق رکھنے کی وجہ سے ہی تمہاری تعظیم کی جاتی ہے جب تم اللہ تعالیٰ کے ساتھ تنہائی میں ہو تو اپنا جائزہ لیا کرو کہ فی الواقع تعلق کا کیا حال ہے"۔

مطلب یہ ہے کہ جب خلق خدا تم کو درویش کہہ کر پکارے اور وہ تمہارا حق ادا کرے تو تم اپنی درویشی کے حق کا جائزہ لیا کرو کہ یہ حق کس طرح ادا ہو رہا ہے اور اگر خلق خدا تم کو تمہارے دعوے کے خلاف کسی اور نام سے پکارے تو ان کی یہ باتیں پسند نہ کرو تم بھی اپنے دعوے کے ساتھ انصاف و راستی سے کام لو کیونکہ لوگوں میں وہ شخص انتہائی پست اور ذلیل ہے کہ لوگ اسے درویش جانیں اور وہ خود ایسا نہ ہو! وہ شخص بہت اچھا ہے جسے لوگ درویش نہ کہیں لیکن وہ درویش ہو جس طرح کہ وہ شخص برا ہے جسے لوگ با خدا درویش کہیں حالانکہ وہ ایسا نہ ہو

اس کی مثال ایسی ہے کہ کوئی دعویٰ کرے کہ میں طبیب ہوں اور وہ بیماروں کا علاج کرنے لگے حالانکہ وہ علم طب میں کچھ درک نہ رکھتا ہو لوگوں کو اور زیادہ بیمار کردے جب خود بیمار ہو تو اپنا علاج کرنے سے عاجز رہے اور دوسرے طبیب کو اپنے علاج کے لیے تلاش کرے ایسا درویش جسے لوگ باخدا کہیں اور وہ باخدا ہو وہ ایسے طبیب کے مانند ہے جو بیماروں کا علاج کرسکے اور جب خود بیمار ہو تو کسی دوسرے طبیب کی اسے حاجت نہ ہو بلکہ خود ہی اپنا علاج کرلے۔ ایسا درویش جسے لوگ باخدا درویش نہ جانیں حالانکہ وہ باخدا درویش ہو وہ اس مردِ طبیب کے مانند ہے جو لوگوں کو اپنے طبیب ہونے کی خبر نہ کرے اور ان کے رجوعات سے فارغ ہو لیکن خود موافق غذاؤں مفرح شربتوں اور عمدہ و معتدل ہواؤں کا لحاظ رکھے تا کہ بیمار نہ ہوجائے ایسا درویش چشم خلائق سے پوشیدہ رہتا ہے۔

(۹) بعض مشائخ متاخرین فرماتے ہیں کہ:

"اَلْفَقْرُ عَدَمٌ بِلَا وُجُوْدٍ" بغیر وجود کے عدم کا نام فقر ہے۔

اس قول کی عبارت ناتمام و ناقص ہے اس کا مفہوم لفظوں میں بیان نہیں کیا جاسکتا۔ کیونکہ کوئی شے معدوم نہیں ہوتی۔ اور شے کے وجود کے بغیر بیان نہیں کیا جاسکتا اس عبارت سے مطلب یہ نکلتا ہے کہ فقر کوئی چیز نہیں ہے اور یہ کہ مذکورہ اقوال مشائخ اور تمام اولیاء اللہ کا اجماع و اتفاق بے اصل ہے کیونکہ وہ خود اپنی ذات میں فانی و معدوم ہیں اور اس عبارت سے عین کا عدم مراد نہیں بلکہ عین عدمِ آفت مراد ہے۔ حالانکہ آدمی کی تمام صفتیں آفت ہیں۔ جب آفت کی نفی ہوگئی تو وہ صفت کا فنا ہونا ہے اور فنائے صفت وصول و عدم وصول کے واسطہ کو ان کے سامنے سے ہٹاتا ہے اور ذات سے ان کے حال کو معدوم کرنا ذات کی نفی مراد پانا ہے اور اس میں اسے ہلاک کردینا ہے۔

(۱۰) مصنف رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ میں نے متکلمین کی ایک جماعت کو دیکھا جنہیں فقر کی حقیقت کی خبر نہ تھی اور وہ اس عبارت پر ہنستے تھے اور کہتے تھے کہ یہ کیسی نامعقول بات ہے اور میں نے مدعیانِ کاذب کی ایک جماعت دیکھی جو اس نامعقول بات کو تسلیم کرتے اور اس پر

اعتقاد واعتماد کرتے تھے اور اصل قصہ کا انہیں علم ہی نہ تھا وہ برملا کہتے تھے کہ "اَلْفَقْرُ عَدَمٌ بِلَا وُجُوْدٍ" بغیر وجود کے عدم کا نام فقر ہے۔ حالانکہ یہ دونوں غلطی پر ہیں ایک بر بنائے عدم علم، حق کا منکر ہوا اور دوسرے نے جہل و نادانی کو اپنا لیا اور ظاہری الفاظ میں الجھ کر رہ گیا۔

مشائخ طریقت کی عبارتوں میں عدم و فنا کا مطلب مذموم حرکات اور ناپسندیدہ صفات سے دور رہ کر پسندیدہ اور محمودہ صفات کی جستجو کرنا ہے آلات طلب و جستجو میں معدوم و ناپید ہونا مراد نہیں ہے۔

غرض کہ درویش کو تمام معانی فقر میں خالی ہونا اور ہر سبب سے بیگانہ ہونا چاہیے اب رہی یہ بات کہ اسرارِ ربانی میں بسر کرنا اسی سے اپنے امور حاصل کرنا اپنے فعل کو اس سے منسلک کرنا اور معانی و مقاصد کو اس سے اسناد کرنا، تو جب اس کے امور کسب و محنت کی بندش سے رہائی پا جائیں گے تو فعل کی نسبت اس سے جدا ہو جائے گی اس وقت اس پر جو حال گذرتا ہے وہ گذر جائے گا اس حال میں وہ کسی چیز کو نہ تو از خود اپنی طرف لاتا ہے اور نہ اپنے سے دور کرتا ہے سب کچھ منجانب اللہ سمجھتا ہے اور جو کچھ اس پر بیت جاتی ہے وہ اسے عین وحق سمجھتا ہے۔

(۱۱) حضرت مصنف رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ میں نے زبان دراز مدعیان (کاذب) کے ایک گروہ کو دیکھا جو قفس فقر میں نفی وجود کے قضیہ کے ادراک سے ان کے کمال کی نفی کا اظہار کر رہا تھا یہ بات بذاتِ خود سخت عزیز ہے اور میں نے دیکھا کہ وہ لوگ حقیقت فقر سے نفی کرنے سے مراد عین فقر میں نفی صفت ظاہر کر رہے تھے اور دیکھا کہ طلب حق و حقیقت کی نفی کو فقر و صفت کہہ رہے تھے اور دیکھا کہ اپنی ہوا و ہوس کو ثابت و برقرار رکھ کر نفی کل ظاہر کر رہے تھے اور وہ لوگ حجتِ فقر کے ہر درجہ میں پسماندہ تھے اس لیے کہ آدمی کے لیے اس بات کا ادراک کمالِ ولایت کی علامت اور اس بات کے سمجھنے کے درپے ہونا غایت درجہ کی ہمت ہے اور عین معنیٰ سے محبت کرنا محلِ کمال ہے لہٰذا طالب فقر و تصوف کے لیے اس کے سوا کوئی چارہ کار نہیں کہ ان کی راہ پر چلے اور ان کے مقامات کو طے کرے اور ان کی عبارات پر غور اور فکر کر کے سمجھنے کی کوشش کرے تا کہ محل خاص تاریکی میں نہ رہے اس لیے کہ تمام اصول، اصول سے اور تمام

فروع، فروع سے نکلتے ہیں۔ اگر کوئی رہگزر فروع سے رہ جائے تو اصول سے نسبت باقی رہتی ہے لیکن جب اصول ہی رہ جائے تو وہ کسی جگہ بیٹھنے کے لائق نہیں رہتا اور کسی سے نسبت نہیں رہتی۔ میں نے یہ تمام باتیں واضح طور پر اس لیے بیان کی ہیں کہ تم انہیں غور و فکر کر کے راہ حق کے آداب کی رعایت ملحوظ رکھو۔ اب میں مشائخ طریقت کے کچھ اصول و رموز اور ان کے وہ اشارات جو تصوف کے سلسلہ میں فرمائے ہیں بیان کرتا ہوں اس کے بعد مردانِ خدا کے اسماء گرامی اور مشائخ طریقت کے مذاہب کا اختلاف بیان کروں گا۔ بعد ازاں حقائق و معارف اور احکامِ شرائع بیان کر کے ان کے مقامات کے رموز و آداب حتی الامکان بیان کروں گا تا کہ تم پر اور ہر اس شخص پر جو اس کتاب کو پڑھے حقیقت واضح ہو جائے۔ وباللہ التوفیق۔

تصوف

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

وَعِبَادُ الرَّحْمٰنِ الَّذِيْنَ يَمْشُوْنَ عَلَى الْاَرْضِ هَوْنًا وَّاِذَا خَاطَبَهُمُ الْجٰهِلُوْنَ قَالُوْا سَلٰمًا

"رحمٰن کے وہی بندے ہیں جو زمین پر اخلاق و انکسار سے چلتے ہیں اور جب جاہل لوگ انہیں پکارتے ہیں تو وہ سلام کرتے ہیں۔"

(الفرقان:٦٣)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:

مَنْ سَمِعَ صَوْتَ اَهْلِ التَّصَوُّفِ فَلَا يُؤَمِّنْ عَلٰى دُعَائِهِمْ كُتِبَ عِنْدَ اللّٰهِ مِنَ الْغَافِلِيْنَ

"جو صوفیا کی آواز سنے اور ان کی دعا پر آمین نہ کہے تو وہ اللہ کے نزدیک غافلوں میں شمار ہوگا۔"

اہل علم حضرات نے اسم تصوف کی تحقیق میں بہت کچھ کہا ہے اور کتابیں تصنیف فرمائی

ہیں۔ چنانچہ اہل علم کی ایک جماعت کہتی ہے کہ صوفی کو اس لیے صوفی کہا جاتا ہے کہ وہ صوف (پشمینہ) کے کپڑے پہنتے ہیں اور بعض یہ کہتے ہیں کہ وہ اول صف میں ہوتے ہیں اور ایک جماعت یہ کہتی ہے کہ یہ اصحاب صفہ کی نیابت کرتے ہیں۔ بعض نے کہا کہ یہ نام، صفا سے ماخوذ ہے۔ غرض کہ ہر وجہ تسمیہ میں طریقت کے بکثرت لطائف ہیں لیکن اگر لغوی معنیٰ کا اعتبار کیا جائے تو معنیٰ بعید از مفہوم ہو جاتا ہے چونکہ ہر حالت میں ظاہر و باطن کی صفائی محمود و پسندیدہ ہے اور اس کی ضد کدورت سے اجتناب کرنا مقصود ہے جیسا کہ سید عالم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے "ذَهَبَ صَفْوُ الدُّنْيَا وَبَقِيَ كَدْرُهَا" (بخاری شریف) (دنیا کی پاکیزگی جاتی رہی اور اس کی کدورت باقی رہ گئی) گویا صوفی میں لطیف و پاکیزہ چیزوں کے نام سے اس کی صفائی مراد ہے۔ چونکہ صوفیاء کرام اپنے اخلاق و معاملات کو مہذب و پاکیزہ بنا کر طبعی آفتوں سے نفرت کرتے ہیں اس بناء پر انہیں صوفی کہا جاتا ہے۔ صوفیاء کی جماعت کے لیے یہ نام اسماء اعلام یعنی مخصوص و معین ناموں میں سے ہے اس لیے کہ ان کے خطرات ان کے ان معاملات کے مقابلہ میں جسے وہ مخفی رکھتے ہیں بہت بڑے ہیں تاکہ ان کا نام اسی سے ماخوذ سمجھا جائے۔

موجودہ زمانے میں حق تعالیٰ نے تصوف اور صوفیاء کرام کی مقدس ہستیوں کو اکثر پردے میں رکھا ہے اور تصوف کے لطائف کو ان کے دلوں سے پوشیدہ کیا ہے تاکہ کوئی تو یہ سمجھے کہ یہ لوگ ظاہری اصلاح کے لیے ریاضتیں کرتے ہیں اور باطنی مشاہدات سے خالی ہیں اور کوئی یہ سمجھے کہ اصل و حقیقت کے بغیر یہ ایک رسم ہے حتیٰ کہ وہ اس کے انکار پر اتر آتے ہیں۔ چنانچہ مسخرے اور ظاہر بیں علماء جو کلی طور پر اس کے منکر ہوں تصوف کے حجاب میں خوش رہتے ہیں ان کی دیکھا دیکھی عوام بھی ان کی ہاں میں ہاں ملانے لگے ہیں اور انہوں نے باطن کی صفائی کی جستجو و طلب کو دل سے محو کر کے سلف صالحین اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے مسلک و مذہب کو بھلا دیا ہے۔

اِنَّ الصَّفَاصِفَةُ الصِّدِّيْقِ   اِنْ اَرَدْتُ صُوْفِيًا عَلَى التَّحْقِيْقِ

"حق و صداقت کی راہ میں اگر تم صوفی بننا چاہو تو جان لو کہ صوفی ہونا

حضرت صدیق کی صفت ہے۔"

صفائے باطن کے لیے کچھ اصول اور فروع ہیں۔ایک اصل تو یہ ہے کہ دل کو غیر سے خالی کرے اور فروع یہ ہے کہ مکر وفریب سے بھر پور دنیا کو دل سے خالی کردے یہ دونوں صفتیں سیدنا ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی ہیں اسی لیے آپ طریقت کے رہنماؤں کے امام ہیں آپ کا قلب مبارک اغیار سے خالی تھا۔حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے وصال کے بعد جب تمام صحابہ کرام بارگاہِ معلیٰ میں دل شکستہ ہو کر جمع ہوئے تو سیدنا فاروق اعظم عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ تلوار سونت کر کھڑے ہو گئے اور فرمانے لگے کہ جس نے بھی یہ کہا کہ اللہ کے رسول کا انتقال ہو گیا ہے میں اس کا سر قلم کر دوں گا اس وقت سیدنا ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ تشریف لائے اور بلند آواز سے خطبہ دیا کہ:

اَلَا مَنْ كَانَ يَعْبُدُ مُحَمَّدًا فَاِنَّ مُحَمَّدًا قَدْمَاتَ وَمَنْ عَبَدَ رَبَّ مُحَمَّدٍ فَاِنَّهٗ حَیٌّ لَا یَمُوْتُ، (بخاری شریف) خبردار! جو حضور کی پرستش کرتا تھا وہ جان لے کہ حضور کا وصال ہو چکا ہے اور جو حضور کے رب کی عبادت کرتا ہے تو آگاہ ہو کہ وہ زندہ ہے جسے موت نہیں ہے۔اس کے بعد آیہ کریمہ تلاوت فرمائی۔

وَمَا مُحَمَّدٌ اِلَّا رَسُوْلٌ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ اَفَاِنْ مَّاتَ اَوْ قُتِلَ انْقَلَبْتُمْ عَلٰٓی اَعْقَابِكُمْ الایه

"اور حضور تو اللہ کے رسول ہی ہیں بے شک آپ سے پہلے بہت سے رسول گزر چکے ہیں تو کیا اب حضور انتقال فرما جائیں یا شہید کر دیے جائیں تو اپنی ایڑیوں کے بل پلٹ جاؤ گے؟" (آل عمران ۱۴۴)

مطلب یہ تھا کہ اگر کوئی یہ سمجھے بیٹھے تھا کہ حضور معبود تھے تو جان لے کہ حضور کا وصال ہو چکا ہے اور اگر وہ حضور کے رب کی عبادت کرتا تھا تو وہ زندہ ہے۔ ہرگز اس پر موت نہیں آئی ہے یعنی جس کا دل فانی سے پیوستہ ہوتا ہے تو وہ فانی تو فنا ہوتا ہے اور اس کا رنج باقی رہ جاتا ہے لیکن جس کا دل حضرت حق سبحانہ سے لگا ہوا ہو تو جب نفس فنا ہو جاتا ہے تو وہ بقائے باقی دل کے

ساتھ باقی رہتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ جس نے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو بشریت کی آنکھ سے دیکھا (اور آپ کو اپنا جیسا بشر سمجھا) تو جب آپ دنیا سے تشریف لے جائیں گے تو آپ کی وہ تعظیم جو اس کے دل میں ہے جاتی رہے گی اور جس نے آپ کو حقیقت کی آنکھ سے دیکھا تو اس کے لیے آپ کا تشریف لے جانا یا موجود رہنا دونوں برابر ہیں اس لئے کہ اس نے آپ کی موجودگی اور حالتِ بقا کو حق تعالیٰ کی بقا کے ساتھ اور آپ کے تشریف لے جانے کو حق تعالیٰ سے واصل وفنا ہونے اور پلٹنے اور فنا ہونے والی چیزوں سے روگرداں ہو کر پلٹانے اور فنا کرنے والی ذات کی طرف متوجہ ہونے کو دیکھا۔ گویا اس نے قیام محول (پلٹنے والے وجود کو) محوِل (پلٹانے والی ذات) کے ساتھ قائم دیکھا۔ حق تبارک وتعالیٰ کی جس طرح تعظیم وتکریم کی جاتی ہے اسی طرح اس نے وجودِ واصل کی تعظیم اور توقیر کی لہٰذا دل کی راہیں کسی مخلوق کے لیے نہ کھولے اور اپنی نظریں کسی غیر کی طرف نہ پھیلائے۔ کیونکہ:

مَنْ نَظَرَ اِلَی الْخَلْقِ هَلَكَ وَمَنْ رَجَعَ اِلَی الْحَقِّ مَلَكَ

"جس نے مخلوق پر نظر ڈالی وہ ہلاک ہوا اور جس نے حق کی طرف رجوع کیا وہ مالک ہوا۔"

حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کی دوسری شان کہ آپ کا قلب مبارک دنیائے غدار سے خالی تھا اس کی کیفیت یہ ہے کہ آپ کے پاس جتنا مال ومنال اور غلام و بردے وغیرہ تھے سب کو راہِ خدا میں دے کر ایک کمبل اوڑھ کر بارگاہِ رسالت میں حاضر ہو گئے۔ اس وقت حضور نے دریافت فرمایا:

مَاخَلَّفْتَ لِعَيَالِكَ فَقَالَ اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ.

"اے صدیق تم نے اپنے گھر والوں کے لیے کیا چھوڑا۔ فرمایا اللہ اور اس کا رسول۔"

یعنی حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے دریافت کیا تم نے اپنے مال میں سے اپنے گھر والوں کے لیے کیا چھوڑا۔ انہوں نے عرض کیا بہت بڑا خزانہ اور بے حد ونہایت مال ومنال چھوڑا ہے۔

فرمایا وہ کیا؟ عرض کیا ایک تو اللہ کی محبت اور دوسرے اس کے رسول کی متابعت۔

جب بندہ کا دل دنیاوی صفات سے آزاد ہو جاتا ہے تو اللہ تعالیٰ دنیاوی کدورتوں سے اسے پاک و صاف کر دیتا ہے یہ تمام صفتیں صوفی صادق کی ہیں ان کا انکار در حقیقت حق کا انکار اور اس سے کھلا مکابرہ وعناد ہے۔

میں کہتا ہوں کہ صفا کدورت کی ضد ہے اور کدورت صفاتِ بشری میں سے ہے حقیقۃً صوفی وہ ہے جو بشری کدورتوں سے گزر جائے جیسا کہ مصر کی عورتوں نے حضرت یوسف علیہ السلام کا جب مشاہدہ کیا اور آپ کے حسن و جمال کے لطائف میں غرق ہوئیں تو ان پر بشریت غالب آ گئی پھر جب وہ منعکس ہو کر واپس آئے اور اس کی انتہا حد کمال تک پہنچی اور اس سے گزر کر بشریت کے فنا پر نظر پڑی تو کہنے لگیں۔ ''مَاهٰذَا بَشَرٌ'' (یہ تو بشر ہے ہی نہیں) حالانکہ انہوں نے اپنے کلام کا نشانہ بظاہر انہیں بنایا لیکن انہوں نے اس طرح اپنا حال ظاہر کیا تھا۔ اسی لیے مشائخ طریقت فرماتے ہیں کہ:

لَيْسَ الصَّفَا مِنْ صِفَاتِ الْبَشَرِ لِاَنَّ الْبَشَرَ مَدَرٌ وَالْمَدَرُ لَايَخْلُوْا مِنَ الْكَدَرِ.

''حالت صفا، بشری صفات میں سے نہیں ہے اس لیے کہ بشر تو ایک مٹی کا تودہ ہے اور مٹی کا تودہ کدورت سے خالی نہیں ہوتا۔''

لہٰذا بشری حالت میں برقرار رہ کر کدورت سے نجات پانا ممکن نہیں اس لیے صفا کی مثال، افعال سے نہ ہوگی اور محض ریاضت و مجاہدہ سے بشریت زائل نہ ہوگی کیونکہ صفتِ صفا افعال و احوال سے منسوب نہیں ہے اور نہ نام و القاب سے اس کو کوئی علاقہ ہے اس لیے کہ:

اَلصَّفَاصِفَةُ الْاَحْبَابِ وَهُمْ شُمُوْسٌ بِلَاسِحَابِ

''صفا تو محبوبوں کی شان ہے وہ تو آفتاب تاباں ہیں جس پر کوئی ابر نہیں۔''

مطلب یہ کہ صفا دستوں کی صفت ہے یہ دوست وہ ہیں جو اپنی صفت فنا کر کے اپنے دوست، حق تعالیٰ کی صفت کے ساتھ باقی ہو گئے ہیں۔ اربابِ حال کے نزدیک دوست وہی ہوتا ہے جن کے احوال مثل آفتاب کے ظاہر ہوں۔ چنانچہ حبیب خدا محمد مصطفیٰ علیہ التحیۃ والثناء

سے صحابہ کرام نے حضرت حارثہ کے بارے میں دریافت کیا تو آپ نے فرمایا "عَبْدٌ نَوَّرَ اللّٰهُ قَلْبَهٗ بِالْإِیْمَانِ" وہ ایسا بندہ ہے جس کے دل کو اللہ تعالیٰ نے ایمان سے منور فرمایا ہے۔ یہاں تک کہ اس کا چہرہ اس کی تاثیر سے تاباں اور نورِ ربانی سے درخشاں ہے۔ کسی بزرگ نے کیا خوب فرمایا ہے:

ضِیَاءُ الشَّمْسِ وَالْقَمَرِ اِذَا اشْتَرَكَا
نُمُوْذَجٌ مِّنْ صَفَاءِ الْحُبِّ وَالتَّوْحِیْدِ اِذَا اشْتَكَیَا

جب آفتاب و ماہتاب کے نور باہم مل جاتے ہیں تو اس کی مثال محبت و توحید کی صفائی ہے جب کہ یہ دونوں پیوست ہو جائیں۔

حق تعالیٰ کی توحید و محبت جس جگہ ایسے مقام پر مل جائے کہ ایک کی نسبت دوسرے کی طرف ہونے لگے تو آفتاب و ماہتاب کے نور کی حیثیت وہاں کیا ہے؟ چونکہ دنیا میں ان دونوں کے نور سے زیادہ روشن کوئی شے نہیں جو وصفِ کمال اور نوری برہان میں اس سے بڑھ کر ہو کیونکہ آنکھیں آفتاب و ماہتاب کے نور کو دیکھنے سے عاجز رہتی ہیں البتہ ان دونوں کے نور کے غلبہ سے آسمان کو دیکھ لیتے ہیں اسی طرح قلب مومن و مخلص، معرفت و توحید اور محبت کے نور سے عرشِ الٰہی کو دیکھ لیتا ہے اور دنیا میں عقبیٰ کے حالات سے باخبر ہو جاتا ہے۔

تمام مشائخ طریقت کا اس پر اجماع ہے کہ بندہ جب مقامات کی بندشوں سے آزاد ہو جاتا ہے اور احوال کی کدورتوں سے خالی ہو کر تغیر و تلون کے حدود سے نکل جاتا ہے تو وہ تمام احوال محمودہ سے متصف ہو جاتا ہے اور وہ تمام بشری صفات کی کدورتوں سے نجات پا جاتا ہے یعنی بندہ جب دل میں اپنی کسی تعریف و توصیف سے نہ لطف اندوز ہوتا ہے اور نہ اپنے میں کسی صفت کو دیکھ کر متعجب ہوتا ہے ایسے بندوں کے احوال کو عام عقلیں سمجھنے سے قاصر ہیں اور وہم و گمان کے تصرف سے ان کی زندگی پاک و صاف ہوتی ہے۔ نہ ان کے حضور کو زوال ہے اور نہ ان کے وجود کے لیے اسباب کی حاجت۔

لِاَنَّ الصَّفَا حُضُوْرٌ بِلَا ذِهَابٍ وَ وُجُوْدٌ بِلَا اَسْبَابٍ.

''اس لیے کہ صفا کے لیے بلا زوال حضور اور بلا سبب وجود ضروری ہے۔''

لیکن اگر غیبوبت کا اس پر غلبہ ہو جائے تو حضور نہیں رہ سکتا۔ اسی طرح اگر اس کے وجود کے لیے سبب و علت ہو تو وہ وجدانی ہو جائے گا واجد نہ رہے گا اور جن احکامِ ربانی کی حفاظت دشوار ہوتی ہیں وہ آسان ہو جاتی ہیں چنانچہ حضرت حارث رضی اللہ عنہ جب بارگاہِ رسالت میں حاضر ہوئے تو ان سے حضور اکرم نے دریافت فرمایا ''اے حارث کس حال میں تم نے صبح کی؟ انہوں نے عرض کیا، اللہ کی حقانیت پر ایمان رکھتے ہوئے رات کٹی۔ حضور نے فرمایا اے حارث تم غور کرو کیا کہہ رہے ہو؟ کیونکہ ہر شے کی ایک حقیقت ہوتی ہے تمہارے ایمان کی حقیقت و برہان کیا ہے؟ انہوں نے عرض کیا میں نے اپنے آپ کو دنیا سے قطع تعلق کر کے اپنے رب کو پہچانا ہے۔ اس کی علامت یہ ہے کہ اب پتھر، سونا، چاندی اور مٹی میرے نزدیک سب برابر ہیں کیونکہ دنیا سے بیزار ہو کر عقبیٰ سے لو لگا رکھی ہے میرا حال یہ ہے کہ رات کو بیدار رہتا ہوں اور دن کو بھوکا پیاسا (یعنی روزے رکھتا ہوں) اب میری کیفیت یہ ہو گئی ہے کہ گویا میں اپنے رب کے عرش کو واضح طور پر دیکھ رہا ہوں (ایک روایت میں یہ ہے کہ ملاقات کرتے جنت میں دیکھ رہا ہوں اور یہ کہ جہنمیوں کو آگ میں ایک دوسرے سے کشتی کرتے بھی دیکھ رہا ہوں (ایک روایت میں یہ ہے کہ شرمسار دیکھ رہا ہوں) اس پر حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا **''فالزم''** اے حارثہ تم نے ایمان کی حقیقت پالی اب اس پر قائم رہو۔ آپ نے اسے تین مرتبہ فرمایا۔

اولیاء کاملین کا نام:

اولیاء کاملین اور عرفاء محققین کا نام صوفی ہے یہ گروہ باصفا اسی نام سے پکارا جاتا ہے۔

ایک بزرگ نے فرمایا ہے کہ:

مَنْ صَفَاهُ الْحُبَّ فَهُوَ صَافٍ وَمَنْ صَفَاهُ الْحَبِيْبَ فَهُوَ صُوْفِيٌّ

''جس کی محبت پاک و صاف ہے وہ صافی ہے اور جو دوست میں مستغرق ہو کر اس کے غیر سے بری ہو وہ صوفی ہے۔''

لہٰذا با اعتبار لغت اس کے معانی مشتقات کسی چیز کے ساتھ صحیح نہیں بنتے کیونکہ اس لفظ کے یہ معنیٰ لغوی تعریف سے بہت بلند وارفع ہیں اس معنیٰ کی کوئی جنس نہیں ہے جس سے اس کو ماخوذ قرار دے دیا جائے اس لئے کہ کسی چیز کا کسی چیز سے ماخوذ و مشتق ہونا جنسیت کا متقاضی ہوتا ہے اور جس میں کدورت ہو وہ صاف وشفاف کی ضد ہوتی ہے اور کسی چیز کو ضد سے مشتق نہیں کرتے۔ لہٰذا عرفاء کے نزدیک یہ معنیٰ اظہر من الشمس ہیں اس کے لیے نہ کسی تعبیر کی ضرورت ہے نہ کسی اشارہ کی۔ "لِاَنَّ الصُّوْفِیَّ مَمْنُوْعٌ عَنِ الْعِبَارَۃِ وَالْاِشَارَۃِ" اس لیے کہ صوفی کے معنیٰ کے لیے عبارت واشارہ کی ممانعت ہے۔

محققین کے نزدیک جب یہ بات ثابت ہوگئی کہ صوفی کی تعریف عبارات سے کرنا ممنوع ہے اور عالم کی ہر شے اس کی تعبیرات ہیں خواہ انہیں اس کا علم ہو یا نہ ہو لہٰذا حصول معنیٰ کے لیے اس نام کی لفظوں میں تعریف کی مطلق حاجت نہیں ہے۔ (فہم وادراک کے لیے اتنا جان لو کہ) مشائخ طریقت اور عارفان حقیقت کو صوفی کہتے ہیں اور مریدین و متعلقین اور سالکین معرفت کو متصوف۔

تصوف کی تعریف:

کلمۂ تصوف باب تفعل سے ہے جس کا خاصہ ہے کہ بہ تکلف فعل کا متقاضی ہو اور یہ اصل کی فرع ہے لغوی حکم اور ظاہری معنیٰ میں اس لفظ کی تعریف کا فرق موجود ہے۔

اَلصَّفَاءُ وَلَایَۃٌ وَلَهَا اٰیَۃٌ وَرِوَایَۃٌ وَالتَّصَوُّفُ حِکَایَۃٌ لِلصَّفَاءِ بِلَاشِکَایَۃٍ

صفا ولایت کی منزل ہے اور اس کی نشانیاں ہیں اور تصوف صفا کی ایسی حکایت و تعبیر ہے جس میں شکوہ وشکایت نہ ہو۔

صفا کے ظاہری معنیٰ تاباں ہیں اور تصوف اس معنیٰ ومفہوم کی تعبیر وحکایت ہے۔

تصوف کی قسمیں:

تصوف کے ماننے والوں اور اس پر عمل کرنے والوں کی تین قسمیں ہیں ایک کو صوفی،

دوسرے کو متصوف اور تیسرے کو مستصوف کہتے ہیں۔

(۱) صوفی وہ ہے جو خود کو فنا کر کے حق کے ساتھ مل جائے اور خواہشاتِ نفسانیہ کو مار کر حقیقت سے پیوستہ ہو جائے۔

(۲) متصوف وہ ہے جو ریاضت و مجاہدے کے ذریعے اس مقام کی طلب کرے اور وہ اس مقام کی طلب و حصول میں صادق و راستباز رہے۔

(۳) مستصوف وہ ہے جو دنیاوی عزت و منزلت اور مال و دولت کی خاطر خود کو ایسا بنا لے اور اسے مذکورہ منازل و مقامات کی کچھ خبر نہ ہو ایسے نقلی صوفیوں کے لیے عرفاء کا مقولہ ہے کہ "اَلْمُسْتَصُوِفُ عِنْدَ الصُّوْفِيَّةِ كَالذُّبَابِ وَعِنْدَ غَيْرِهِمْ كَالذِّيَابِ" صوفیاء کرام کے نزدیک نقلی صوفی مکھی کی مانند ذلیل و خوار ہے وہ جو کرتا ہے محض خواہش نفس کے لیے کرتا ہے اور دوسروں کے نزدیک بھیڑیے کی مانند ہے جس طرح بھیڑیا اپنی تمام قوت و طاقت مردار کے حاصل کرنے میں صرف کرتا ہے یہی حال اس نقلی صوفی کا ہے گویا صوفی صاحبِ وصول ہے اور متصوف صاحبِ اصول اور مستصوف صاحبِ نقول اور فضول۔

جسے وصل نصیب ہو گیا وہ مقصود کو پانے اور مراد کو حاصل کرنے میں اپنے نفسانی قصد و ارادہ سے بے نیاز ہو گیا اور جو منزل اصول کا نصیبہ ور ہو گیا وہ احوالِ طریقت پر فائز اور لطائف معرفت پر مستحکم ہو گیا اور جس کے نصیب میں فضول ہے اور وہ صوفی ہے وہ حقیقت و معرفت کی منزل سے محروم رہ کر محض رسم و رواج کی چوکھٹ پر بیٹھ گیا ہے اس کے لیے یہی ظاہری رسم و رواج اور طور و طریق معنیٰ و کنہ سے محجوب و مستور بن گیا ہے کیونکہ وصلِ واصل سے حجاب میں رہنا معیوب ہے اسی سلسلے میں مشائخ طریقت کی بہت رمز و رموز ہیں اس جگہ ان کا تمام و کمال کا بیان کرنا تو دشوار ہے البتہ کچھ رمز و کنائے بیان کرتا ہوں۔ وباللہ التوفیق۔

صوفیائے کرام کے اوصاف حمیدہ

(۱) حضرت ذوالنون مصری رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ "اَلصُّوفِیُّ اِذَا نَطَقَ بَانَ نُطْقَہٗ مِنَ الْحَقَائِقِ وَاِنْ سَکَتَ نَطَقَتْ عَنْہُ الْجَوَارِحِ بِقَطْعِ الْعَلَائِقِ" صوفی وہ ہے کہ جب بات کرے تو اس کا بیان اپنے حال کے حقائق کے اظہار میں ہو۔ مطلب یہ کہ وہ کوئی ایسی بات نہیں کہتا جو خود اس میں موجود نہ ہو اور جب خاموش رہے تو اس کا معاملہ اور سلوک اس کے حال کو ظاہر کرے اور علائق سے کنارہ کشی اس کے حال پر ناطق ہو یعنی اس کا بولنا بوقت کلام اصول طریقت پر صحیح ہو اور اس کا کردار بوقتِ سکوت مجرد محض ہے اور یہ دونوں حالتیں درست ہوں۔ جب بولے تو اس کی ہر بات حق ہو اور جب خاموش رہے تو اس کا ہر فعل فقر ہو۔

(۲) حضرت جنید بغدادی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ "اَلتَّصَوُّفُ نَعْتٌ اُقِیْمَ الْعَبْدِ فِیْہِ قِیْلَ نَعْتٌ لِلْعَبْدِ اَمْ لِلْحَقِّ فَقَالَ نَعْتُ الْحَقِّ حَقِیْقَۃٌ وَنَعْتُ الْعَبْدِ رَسْمٌ" تصوف ایسی خوبی ہے جس میں بندے کو قائم کیا گیا ہے۔ کسی نے پوچھا یہ حق کی صفت ہے یا بندے کی۔ آپ نے فرمایا اس کی حقیقت حق کی صفت ہے اور اس کی ظاہری رسم و حالت بندے کی صفت ہے مطلب یہ ہے کہ اس کی حقیقت بندگی کی صفت کی فناء چاہتا ہے اور صفت بندگی کی فنا حق کے ساتھ بقا کی صفت ہے اور یہ صفت حق ہے اور اس کی ظاہری رسم و حالت بندے کی دائمی ریاضت و مجاہدے کی مقتضی ہے اور دائمی مجاہدہ یہ بندے کی صفت ہے اور جب دوسرے معنیٰ میں دیکھنا چاہو تو یوں سمجھو کہ توحید کی حقیقت کسی بندے کی صفت میں صحیح نہیں ہو سکتی اس لیے کہ بندے کی صفات میں ہمیشگی دوام نہیں اور خلق کی صفت بجز رسم و ظاہر کے کچھ نہیں کیونکہ خلق کی صفت میں بقا نہیں ہے بلکہ وہ حقیقۃً حق کا فعل ہے لہٰذا ان صفات کی حقیقت حق کے ساتھ ہوگی۔ اس مفہوم کو یوں سمجھو کہ حق تعالیٰ نے بندے کو روزہ

رکھنے کو فرمایا۔ روزہ رکھنے کی وجہ سے بندہ روزہ دار کہلایا یہ روزہ از روئے رسم ظاہری بندہ کی صفت ہوگی۔ لیکن از روئے حقیقت روزے کی حقیقت حق تعالیٰ کے ساتھ ہے چنانچہ حق تعالیٰ نے اپنے حبیب صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ ہمیں خبر دی کہ "اَلصَّوْمُ لِیْ وَاَنَا اَجْزِیْ بِہٖ" (بخاری شریف) روزہ میرے لیے ہے اور میں ہی اس کی جزا دوں گا۔ مطلب یہ ہے کہ روزہ میری وجہ سے ہے اور جو کچھ ان کے مفعولات سے ہے وہ سب اس کی ملکیت ہے۔ لیکن تمام عبادتوں اور چیزوں کی نسبت بندے کی نسبت بطریق رسم ومجاز ہوگی نہ کہ حقیقۃً۔

(۳) حضرت ابوالحسن نوری رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ "اَلتَّصَوُّفُ تَرْکُ کُلِّ حَظٍّ لِلنَّفْسِ" تصوف تمام نفسانی لذات وحظوظ سے دستکشی کا نام ہے۔ اس کی دو قسمیں ہیں ایک رسم یعنی مجاز دوسرے حقیقت۔ اس کا مفہوم یہ ہے کہ بندہ اگر نفسانی لذتوں کو چھوڑ چکا ہے تو ترک لذت بھی تو ایک لذت ہے اسی کو رسم ومجاز کہا جاتا ہے اور اگر وہ اس کا بھی تارک ہے تو یہ فنائے لذت وحظ کہلاتی ہے اس معنیٰ کا تعلق حقیقت ومشاہدے سے ہے لہٰذا ترک حظ ولذت بندہ کا فعل ہے اور فنائے حظ و لذت، حق تعالیٰ کا فعل ہے لہٰذا بندے کے فعل کو رسم ومجاز اور حق کے فعل کو حقیقت کہا جائے گا اس قول سے پہلا قول جو حضرت جنید بغدادی رحمۃ اللہ علیہ کا ہے خوب واضح ہوجاتا ہے۔

(۴) حضرت ابوالحسن نوری رحمۃ اللہ علیہ کا قول ہے کہ "اَلصُّوْفِیَّۃُ ھُمُ الَّذِیْنَ صَفَّتْ اَرْوَاحُھُمْ فَصَارُوْا فِیْ صَفِّ الْاَوَّلِ بَیْنَ یَدَیِ الْحَقِّ" صوفیائے کرام کا گروہ وہ ہے جن کی زندگیاں کدورتِ بشری سے آزاد اور آفتِ نفسانیہ سے پاک وصاف ہوکر آرزو اور تمناؤں سے بے نیاز ہوگئے ہیں۔ یہاں تک کہ حق تعالیٰ کے حضور بلند درجے اور صفِ اول میں آرام گستر ہیں اور ماسوٰی اللہ کے سب سے قطعاً کنارہ کش ہوچکے ہیں۔

(۵) وہ یہ بھی فرماتے ہیں کہ "اَلصُّوفِی الَّذِیْ لَایَمْلِکُ وَلَا یُمْلَکُ" صوفی وہ ہے جس کے قبضہ میں کچھ نہ ہو اور نہ خود کسی کے قبضہ میں ہو۔ یہ عبارت عینِ فنا کی ہے کہ فانی الصفت نہ مالک ہوتا ہے نہ مملوک کیونکہ صحت ملک موجودات پر درست آتی ہے اس قول شریف کا مطلب یہ ہے کہ صوفی دنیاوی ساز و سامان اور اخروی زیب و زینت میں سے کسی چیز کا مالک نہیں ہوتا کیونکہ وہ خود بھی تو کسی کی ملکیت میں ہے وہ اپنے نفس کے حکم کا پابند نہیں ہوتا ہے اس لیے کہ غیر کی خواہش و ارادہ کے غلبہ سے وہ خود کو گھلا چکا ہوتا ہے حتیٰ کہ وہ غیر کو بھی بندگی کی طمع سے فنا کر چکا ہوتا ہے یہ قول مبارک دقیق ولطیف ہے اس منزل کو گروہ صوفیاء "فنائے کل" سے تعبیر کرتے ہیں۔ ہم ان کے غلط مقامات کی اس کتاب میں انشاءاللہ نشاندہی کریں گے۔

(۶) حضرت ابن جلالی دمشقی علیہ الرحمۃ فرماتے ہیں کہ "اَلتَّصَوُّفُ حَقِیْقَةٌ لَارَسْمَ لَهٗ" تصوف سراپا حقیقت ہے جس میں رسم ومجاز کا دخل نہیں ہے کیونکہ معاملات و افعال میں رسم ومجاز کا دخل ہے اور اس کی حقیقت حق تعالیٰ کے ساتھ خاص ہے جب کہ تصوف خلق سے کنارہ کشی کا نام ہے تو اس کے لیے رسم ومجاز کا دخل ممکن ہی نہیں۔

(۷) حضرت ابو عمر دمشقی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ "اَلتَّصَوُّفُ رُؤْیَةُ الْکَوْنِ بِعَیْنِ النَّقْصِ بَلْ غُضُّ الطَّرْفِ عَنِ الْکَوْنِ" جہان کو نقص وعیب کی آنکھ سے دیکھنے کا نہیں بلکہ دنیا سے منہ پھیر لینے کا نام تصوف ہے۔ مطلب یہ ہے کہ جہان کو عیب و نقص سے بھرپور دیکھو کیونکہ یہ دلیل بقائے صفت کی ہے بلکہ جہان سے آنکھوں کو بند کر لو کیونکہ یہ دلیل فنائے صفت کی ہے اس لیے کہ جب کائنات پر نظر ہوگی تو حد نظر کے بعد نظر کی منزل بھی ختم ہو جائے گی اور دنیا سے آنکھیں بند کر لینے میں ربانی بصیرت کی بقا ہے یعنی جو شخص اپنے سے نابینا ہوگا وہ حق کو دیکھ سکے گا کیونکہ ہستی سے باہر نکلنے کی اسے کوئی راہ نہیں ملتی۔ الغرض ایک وہ ہوتا ہے جو خود کو تو دیکھتا ہے لیکن اسے ناقص نظر آتا ہے اور دوسرا وہ ہے جو اپنی طرف سے نظر کو بند کر لیتا ہے اسے نہیں

دیکھتا تو وہ شخص جو خود کو دیکھ لیتا ہے اگر چہ خود میں اسے نقص و عیب نظر آتے ہیں مگر یہی نظارہ ایک حجاب ہے اور جو دیکھتا ہے وہ نظر میں در پردہ رہتا ہے اور جو اپنی ہستی کو دیکھتا ہی نہیں وہ نابینائی میں محجوب نہیں ہوتا۔ اہل معانی اور عرفا کے نزدیک یہ مفہوم و مراد اصل قوی ہے مگر یہ قیام اس کی شرح کا نہیں ہے۔

(۸) حضرت ابوبکر شبلی علیہ الرحمۃ فرماتے ہیں کہ "اَلتَّصَوُّفُ شِرْكٌ لِاَنَّهٗ صِيَانَةُ الْقَلْبِ عَنْ رُؤْيَةِ الْغَيْرِ وَلَا غَيْرَ" تصوف میں شرک ہے اس لیے کہ دل کو غیر کی رویت سے بچاتا حالانکہ غیر کا وجود ہی نہیں ہے مطلب یہ کہ اثبات توحید میں غیر کی رویت شرک ہے جب دل میں غیر کی کوئی قدر و قیمت نہیں ہے تو دل کو غیر کے ذکر سے بچانا محال ہے۔

(۹) حضرت حصری رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ "اَلتَّصَوُّفُ صَفَاءُ السِّرِّ مِنْ كُدُوْرَةِ الْمُخَالِفَةِ" دل کو مخالفت کی کدورت سے پاک وصاف رکھنے کا نام تصوف ہے مطلب یہ کہ باطن کو حق تعالیٰ کی مخالفت سے محفوظ رکھو کیونکہ دوستی موافقت کا نام ہے اور موافقت مخالفت کی ضد ہے۔ دوست کو لازم ہے کہ سارے جہان میں دوست کے احکام کی حفاظت کرے اور جب مطلوب و مراد ایک ہو تو مخالفت کی گنجائش نہیں ہے۔

اخلاق:

(۱۰) حضرت محمد بن علی بن امام حسین بن علی مرتضٰی سلام اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین فرماتے ہیں کہ "اَلتَّصُوُّفُ خُلُقٌ فَمَنْ زَادَ عَلَيْكَ فِي الْخُلُقِ زَادَ عَلَيْكَ فِي التَّصَوُّفِ" پاکیزہ اخلاق کا نام تصوف ہے۔ جس کے جتنے پاکیزہ اخلاق ہوں گے اتنا ہی زیادہ وہ صوفی ہوگا۔

پاکیزہ اخلاق کی دو قسمیں ہیں۔ ایک حق تعالیٰ کے ساتھ دوسرے خلق کے ساتھ۔ حق تعالیٰ کے ساتھ نیک خوئی یہ ہے کہ اس کی قضاء وقدر پر راضی رہے اور خلق کے ساتھ نیک خوئی یہ

ہے کہ حق تعالیٰ کی رضا کی خاطر مخلوق کی صحبت کا بار برداشت کرے یہ دونوں قسمیں طالب ہی کی طرف راجع ہوتی ہیں کیونکہ حق کی صفت استغناء یعنی وہ طالب کی ناراضگی ورضا دونوں سے بے نیاز ہے یہ دونوں وصف نظارۂ توحید سے وابستہ ہیں۔

(۱۱) حضرت ابومحمد مرتعش رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ "اَلصُّوْفِیُّ لَا یَسْبِقُ ھِمَّتُہٗ خَطْوَتَہٗ اَلْبَتَّۃَ" یعنی صوفی وہ ہے کہ اس کا باطن اس کے قدم کے ساتھ برابر ہو مطلب یہ کہ دل مکمل طور پر حاضر رہے۔

یعنی دل وہاں ہو جہاں قدم ہو اور قدم وہاں ہو جہاں دل ہو ایک قول یہ ہے کہ قدم وہاں ہو جہاں قول ہو یہ حضوری کی علامت بغیر غیوبت کے ہے اس کے برخلاف کچھ لوگ یہ کہتے ہیں کہ خودی سے غائب ہو کر حق کے ساتھ ظاہر ہو حالانکہ یہ کہنا چاہیے تھا کہ حق کے ساتھ ظاہر ہو کر خودی سے حاضر ہو یہ جمع الجمع کے قبیل کی عبارت ہے کیونکہ جس وقت خود بخود رویت ہوگی تو خودی سے غیبت نہ رہے گی جب رویت اٹھ جائے گی تو حضوری بے غیبت کے ہوگی اس معنی کا تعلق حضرت شبلی علیہ الرحمۃ کے اس قول سے ہے کہ:

(۱۲) اَلصُّوْفِیُّ لَا یَرٰی فِی الدَّارَیْنِ مَعَ اللّٰہِ غَیْرُ اللّٰہِ

"صوفی وہ ہے جو دونوں جہان میں بجز ذاتِ الٰہی کے کچھ نہ دیکھے"۔

کیونکہ بندے کی پوری ہستی غیر ہے اور جب وہ غیر کو نہ دیکھے گا تو خود کو بھی نہ دیکھے گا اور اپنی نفی اور اثبات کے وقت وہ خود سے مکمل طور پر فارغ ہوگا۔

تصوف کی بنیادی خصلتیں:

(۱۳) حضرت جنید بغدادی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ تصوف کی بنیاد آٹھ حصوں پر ہے۔ سخاوت، رضاء، صبر، اشارہ، غربت، گدڑی، سیاحت اور فقر۔ یہ آٹھ نبیوں کی اقتداء میں ہیں۔ سخاوت حضرت خلیل علیہ السلام سے۔ کیونکہ آپ نے فرزند کو فدا کیا اور رضا حضرت اسمٰعیل علیہ السلام سے کیونکہ بوقت ذبح اپنی رضا دی اور اپنی جان عزیز کو بارگاہ خداوندی میں پیش کر دیا۔ صبر حضرت ایوب علیہ السلام سے کہ آپ نے بے

حد و غایت مصائب پر صبر فرمایا اور خدا کی فرستادہ ابتلا و آزمائش پر ثابت قدم رہے اور اشارہ حضرت زکریا علیہ السلام سے کہ حق تعالٰی نے فرمایا "اَلَّا تُكَلِّمَ النَّاسَ ثَلٰثَةَ اَيَّامٍ اِلَّا رَمْزًا" (آل عمران ۴۱) آپ نے تین دن لوگوں سے اشارہ کے سوا کلام نہ فرمایا اور اسی سلسلہ میں ارشاد ہے کہ "اِذْ نَادٰى رَبَّهٗ نِدَآءً خَفِيًّا" (مریم:۳) انہوں نے اپنے رب کو آہستہ پکارا اور غربت حضرت یحییٰ علیہ السلام سے کہ وہ اپنے وطن میں مسافروں کے مانند رہے اور خاندان میں رہتے ہوئے اپنوں سے بیگانہ رہے اور سیاحت حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے کہ آپ نے یکہ و تنہا مجرد زندگی گزاری ہے اور بجز ایک پیالہ و کنگھی کے کچھ پاس نہ رکھا جب انہوں نے دیکھا کہ کسی نے اپنے دونوں ہاتھوں کو ملا کر پانی پیا ہے تو انہوں نے پیالہ بھی توڑ دیا اور جب کسی کو دیکھا کہ انگلیوں سے بالوں میں کنگھی کر رہا ہے تو کنگی بھی توڑ دی اور گدڑی یعنی صوف کا لباس حضرت موسیٰ علیہ السلام سے کہ انہوں نے پشمینی کپڑے پہنے اور فقر سید عالم صلی اللہ علیہ وسلم سے ہے کہ جنہیں روئے زمین کے تمام خزانوں کی کنجیاں عنایت فرمادی گئی تھیں اور ارشاد ہوا کہ آپ خود کو مشقت میں نہ ڈالیں بلکہ آپ ان خزانوں کو استعمال کریں، آرائش اختیار فرمائیں لیکن بارگاہ الٰہی میں آپ نے عرض کیا! اے خدا مجھے اس کی حاجت نہیں ہے میری خواہش تو یہ ہے کہ ایک روز شکم سیر ہوں تو دو روز فاقہ کروں تصوف کی یہ آٹھ اصولی خصائل ہیں جو افعال و کردار میں محمود ہیں۔

(۱۴) حضرت خصری علیہ الرحمۃ فرماتے ہیں کہ "اَلصُّوْفِيُّ لَا يُوْجَدُ بَعْدَ عَدَمِهٖ وَلَا يَعْدِمُ بَعْدَ وُجُوْدِهٖ" صوفی معدوم ہونے کے بعد ہستی کی تمنا نہیں کرتا اور موجود ہونے کے بعد معدوم ہونے کی خواہش نہیں کرتا۔ مطلب یہ ہے کہ وہ جو کچھ بھی پاتا ہے اسے کسی حال میں گم نہیں کرتا اور جو چیز گم ہو جائے اس کو کسی حال میں بھی حاصل کرنے کی کوشش نہیں کرتا اس کے دوسرے معنی یہ ہیں کہ اس کی یافت کسی طرح

نایافت نہ ہوگی اور اس کی نایافت کسی طرح یافت نہ ہوگی تا کہ اثبات بے نفی اور نفی بغیر اثبات کے ہوجائے اس قول کا مقصد یہ ہے کہ صوفی کی بشریت کامل طور پر فنا ہو کر اس کے جسمانی شواہد اس کے حق سے جاتے رہیں اور اس کی نسبت سب سے منقطع ہوجائے تا کہ بشریت کا بھید کسی کے حق میں ظاہر نہ ہو یہاں تک کہ یہ فرق اپنے عین میں جمع ہو کر اپنے آپ قیام پا جائیں یہ صورت حال دو نبیوں میں ظاہر ہوئی ہے ایک حضرت موسیٰ علیہ السلام میں کہ جن کے وجود میں عدم نہیں تھا یہاں تک کہ دعا کی "رَبِّ اشْرَحْ لِیْ صَدْرِیْ وَیَسِّرْ لِیْ اَمْرِیْ" (طٰہٰ:۲۵،۲۶) میرے رب مجھے شرح صدر عطا فرما اور میرا معاملہ مجھ پر آسان کردے اور دوسری ذات مبارک ہمارے رسول مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ہے کہ آپ کے عدم میں وجود نہ تھا جیسا کہ ارشاد ہوا ہے:

اَلَمْ نَشْرَحْ لَکَ صَدْرَکَ (الم نشرح:۱) کیا ہم نے آپ کے لیے شرح صدر نہ فرمایا۔

ایک نبی نے آرائش و زینت کی درخواست کی اور دوسرے کو حق تعالیٰ نے خود آرائش و زینت سے مزین فرمایا اور انہوں نے اس کی دعا نہیں کی۔

(۱۵) حضرت علی بن بندار صیرفی نیشاپوری رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا: "اَلتَّصَوُّفُ اَسْقَاطُ الرُّؤْیَۃِ لِلْحَقِّ ظَاھِرًا وَّبَاطِنًا" تصوف یہ ہے کہ صوفی اپنے ظاہر و باطن میں حق کی خاطر خود کو نہ دیکھے چنانچہ جب تم ظاہر پر نظر ڈالو گے تو ظاہر میں توفیق کا نشان پاؤ گے اور جب تم غور کرو گے تو ظاہری معاملات کو توفیق حق کے مقابلہ میں دیکھو گے تو مچھر کے پر کے برابر وزن نہ دو گے اور ظاہری دیکھنا چھوڑ دو گے اور جب باطن پر نظر ڈالو گے تو باطن میں تائید حق کے نشان پاؤ گے لہٰذا باطن کے دیکھنے کو بھی ترک کر کے سراسر حق کا مشاہدہ کرو گے جب حق کا مشاہدہ کرو گے تو خود کو بھی نہ دیکھ سکو گے۔

(۱۶) حضرت محمد عمر بن احمد مقری رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ "اَلتَّصَوُّفُ اِسْتِقَامَۃُ الْاَحْوَالِ مَعَ الْحَقِّ" حق تعالیٰ کے ساتھ احوال کی استقامت کا نام تصوف ہے

مطلب یہ کہ صوفی کے احوال کسی اور حال سے نہ بدلیں گے اور وہ کسی کجروی میں مبتلا نہ ہوگا اس لیے کہ جس کا دل گردش احوال سے محفوظ ہے وہ درجۂ استقامت سے نہیں گرتا اور نہ وہ حق تعالیٰ سے دور رہتا ہے۔

صوفیاء کے معاملات

(۱) حضرت ابو حفص حداد نیشا پوری رحمۃ اللہ علیہ صوفیاء کرام کے معاملہ کے سلسلہ میں فرماتے ہیں کہ:

''تصوف سراسر ادب ہے ہر وقت ہر مقام اور ہر حال کے لیے متعین آداب و احکام ہیں جس نے ان آداب کی پابندی کو ان کے اوقات میں لازم رکھا وہ مردانِ خدا۔ کے درجہ پر فائز ہو گئے اور جس نے ان آداب کی پابندی کو ملحوظ خاطر نہ رکھا اور اسے رائیگاں کر دیا وہ قرب حق کے خیال اور قبولِ حق کے گمان سے محروم رہ کر مردود بن گیا''۔ اس معنیٰ میں

(۲) حضرت ابوالحسن رحمۃ اللہ علیہ کا ارشاد ہے کہ "لَيْسَ التَّصَوُّفُ رُسُوْمًا وَلَا عُلُوْمًا وَلٰكِنَّهٗ اَخْلَاقٌ" رسم و علم کا نام تصوف نہیں ہے بلکہ وصف و اخلاق کا نام ہے مطلب یہ ہے کہ اگر رسم کا نام تصوف ہوتا تو ریاضت و مجاہدے سے حاصل ہو جاتا اور اگر علم کا نام تصوف ہوتا تو تعلیم سے تکمیل کی جا سکتی مگر یہ تو سراپا اخلاق ہے حتیٰ کہ اگر اس کے حکم اپنی ہستی میں جاری نہ کرو اور اس کے معاملات کو اپنے وجود میں نافذ نہ کرو اور اس کے انصاف کو اپنے اوپر نہ استعمال کرو تو ہر گز تصوف حاصل نہ ہوگا۔

رسم و اخلاق کا فرق:

رسوم و اخلاق کے درمیان فرق یہ ہے کہ رسم ایسا فعل ہے جو تکلیف و محنت اور اسباب ذرائع سے حاصل ہو جاتا ہے مثلاً ایسا عمل جو باطن کے برخلاف ظاہری طور پر کیا جائے اور وہ فعل و عمل باطنی معنیٰ سے خالی ہو اور اخلاق ایسا فعلِ محمود ہے جو بے تکلیف و محنت اور بغیر اسباب

وذرائع کے باطن کے موافق ظاہر میں کیا جائے اور وہ دعوے سے خالی ہو۔

نیک خصائل:

(۳) حضرت مرتعش رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ "اَلتَّصَوُّفُ حُسْنُ الْخُلُقِ" نیک خصائل کا نام تصوف ہے اس کی تین قسمیں ہیں:

(۱) یہ کہ حق تعالیٰ کے اوامر و نواہی کو بغیر سمع وریا کے ادا کیا جائے۔

(۲) یہ کہ بڑوں کی عزت و تعظیم اور چھوٹوں پر شفقت و مہربانی اور برابر والوں سے حق و انصاف پر قائم رہتے ہوئے کسی عوض و بدلے کا طالب نہ ہو۔

(۳) یہ تیسری قسم اپنی ذات سے متعلق ہے وہ یہ کہ وہ نفس و شیطان کی متابعت نہ کرے۔

جس نے اپنی ذات کو ان تینوں خصلتوں سے مزین کرلیا وہ تمام نیک خصلتوں کا خوگر بن گیا یہ خصائل اس حدیث سے ماخوذ ہیں جو حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے ان سے کسی نے عرض کیا کہ ہمیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اخلاق شریفہ کی تعلیم فرمایے۔ آپ نے فرمایا قرآن کریم پڑھو۔ اللہ تعالیٰ نے اس میں آپ کے اخلاقِ حمیدہ بیان فرمائے ہیں۔ یہ دلیل پہلی قسم کی ہے لیکن دوسری اور تیسری قسم کی دلیل یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا "خُذِ الْعَفْوَ وَاْمُرْ بِالْعُرْفِ وَاَعْرِضْ عَنِ الْجٰهِلِيْنَ" (الاعراف:۱۹۹) درگزر کو اختیار کرو اور نیکی کا حکم دو اور جاہلوں سے دور رہو۔

حضرت مرتعش فرماتے ہیں کہ "هٰذَا مَذْهَبٌ كُلُّهٗ جِدٌّ فَلَا تُخَالِطُوهُ بِشَيْءٍ مِنَ الْهَزْلِ" یہ نکھری ہوئی تصوف کی راہ ہے اس میں بالکل آمیزش نہ کرو۔ اور نقلی صوفیوں کے معاملات کو نہ ملاؤ اور رسوم کے پابند لوگوں سے اجتناب کرو۔

جب زمانہ کے دنیا دار لوگوں نے دیکھا کہ نقلی صوفی پاؤں پر تھرکتے، گانا سنتے اور بادشاہوں کے دربار میں جا کر ان سے مال و منال کے حصول میں حرص و لالچ کا مظاہرہ کرتے ہیں درباری دیکھتے ہیں تو وہ ان سے نفرت کرتے اور تمام صوفیوں کو ایسا ہی سمجھ کر سب کو برا کہنے لگتے ہیں کہ ان کے یہی طور و طریق ہوتے ہیں اور پچھلے صوفیاء کا حال بھی ایسا ہی تھا حالانکہ وہ

حضرات ایسی لغویتوں سے پاک وصاف تھے۔ وہ اس پر غور وتفحص نہیں کرتے یہ زمانہ دین میں سستی وغفلت کا ہے۔

بلاشک وشبہ جب بادشاہ وحکام پر حرص کا غلبہ ہوتا ہے تو وہ اسے ظلم وستم پر آمادہ کردیتا ہے اور اہل زمانہ طمع و نافرمانی اور زنا وفسق میں مبتلا ہوجاتے ہیں، ریا کاری زاہد کو نفاق میں جھونک دیتی ہے اور ہوائے نفسانی صوفی کو پاؤں پر کوداتی ہے، اور گانا سننے پر ابھارتی ہے، خبردار ہوشیار! طریقت کے جھوٹے مدعی ہی تباہ ہوتے ہیں نہ کہ اصلِ طریقت۔ خوب یاد رکھو کہ اگر مسخروں کی جماعت اپنی مسخرگی کو بزرگوں کی ریاضت ومجاہدے کے اندر ہزار بار پوشیدہ رکھے تو بزرگوں کی ریاضت ومجاہدہ مسخرگی نہیں بن سکتی۔

(۴) حضرت ابوعلی قزوینی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ "اَلتَّصَوُّفُ هُوَ الْاَخَلَاقُ الرَّضِيَّةُ" پسندیدہ اور محمودہ افعال واخلاق کا نام تصوف ہے یعنی بندہ ہر حال میں اللہ تعالیٰ سے راضی وخوش رہے رضیہ اور رضیٰ کے معنیٰ راضی وخوش ہونے کے ہیں۔

(۵) حضرت ابوالحسن نوری رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ "اَلتَّصَوُّفُ هُوَ الْحُرِّيَّةُ وَالْفُتُوَّةُ وَتَرْكُ التَّكَلُّفِ وَالسَّخَآءُ وَبَذْلُ الدُّنْيَا" یعنی نفس اور حرص وہوا کی غلامی سے آزادی پانے، باطل کے مقابلہ میں جرأت ومردانگی دکھانے، دنیاوی تکلفات کو ترک کردینے، اپنے مال کو دوسروں پر صرف کردینے اور دنیا کو دوسروں کے لیے چھوڑ دینے کا نام تصوف ہے۔

فتوت یہ ہے کہ اپنی جوانمردی ومردانگی کے دیکھنے سے آزاد ہو، ترک تکلف یہ ہے کہ متعلقین کے ساتھ حسن سلوک کرے اور تقدیر سے راضی رہے اور سخاوت یہ ہے کہ دنیا کو دنیاداروں کے لیے چھوڑ دے۔

(۶) حضرت ابوالحسن فوشنجہ علیہ الرحمۃ فرماتے ہیں کہ "اَلتَّصَوُّفُ الْيَوْمَ اِسْمٌ وَلَا حَقِيْقَةٌ وَقَدْ كَانَ حَقِيْقَةٌ" آج بے حقیقت چیز کا نام تصوف سمجھ لیا گیا ہے۔ ورنہ اس سے قبل بغیر نام ایک حقیقت تھی مطلب یہ ہے کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اور

سلف صالحین کے زمانہ میں یہ نام تو نہ تھا مگر اس کے معنی موجود تھے اب نام تو ہے مگر معنی کا وجود نہیں۔ یعنی معاملات و کردار تو معروف تھے لیکن دعوٰی مجہول تھا اب دعوٰی عروف ہے لیکن معاملات مجہول ہیں۔

تصوف کے معاملات، معانی و حقائق کے اظہار و بیان میں مشائخ طریقت کی مذکورہ ارشادات طالبِ حق کی رہنمائی کے لیے کافی ہیں لیکن جو تصوف کے منکر ہیں ان سے دریافت کیا جائے کہ تصوف کے انکار سے تمہاری کیا مراد ہے اور اگر محض اس کے نام سے انکار ہے تو کچھ مضائقہ نہیں ہے لیکن اس طرح اس کے معانی و حقائق سے انکار لازم نہیں آتا پھر بھی اگر اس کے معانی و حقائق سے انکار ہے تو یہ انکار کل شریعتِ اسلامیہ کا انکار بن جائے گا یہی نہیں بلکہ یہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے اخلاق حمیدہ اور خصائلِ جمیلہ اور اسوۂ حسنہ کا انکار بھی کہلائے گا اور اس انکار کے بعد پورا دین ریاکاری بن جاتا ہے میں دعا کرتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ تمہیں ایسا فرمانبردار اور سعید بنائے جس طرح اپنے دوستوں کو بنایا ہے اور میں وصیت کرتا ہوں کہ خدا کے ان دوستوں، ولیوں اور حق نیوش صوفیوں کے ساتھ حق و انصاف کو ہمیشہ ملحوظ رکھنا، دعوٰی کم کرنا اور اہل اللہ سے حسنِ اعتقاد رکھنا۔ وباللہ التوفیق۔

صوفیائے کرام کا لباس یعنی گدڑی

پشم اور اون وصوف کا مخصوص وضع قطع کا لباس جسے گدڑی کہتے ہیں صوفیاء کرام کا شعار ہے اور یہ لباس سنت کے موافق ہے کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ "عَلَيْكُمْ بِلُبْسِ الصُّوْفِ تَجِدُوْنَ حَلَاوَةَ الْاِيْمَانِ فِيْ قُلُوْبِكُمْ" پشمینی لباس اختیار کرو کیونکہ اس سے اپنے دلوں میں ایمان کی شیرینی پاؤ گے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ایک صحابی کا ارشاد ہے کہ آپ صوف (پشمین) کا لباس زیبِ تن فرماتے اور دراز گوش (گدھے) پر سواری فرمایا کرتے تھے نیز رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے فرمایا "لَا تُضَيِّعِي الثَّوْبَ حَتّٰى تُرَقِّعِيْهِ"

کپڑے کو ضائع نہ کرو جب تک کہ پیوند لگنے کی گنجائش ہو۔ سیدنا فاروق اعظم عمر بن الخطاب رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے بارے میں مروی ہے کہ آپ کے پاس ایک گدڑی ایسی تھی کہ جس میں تیس پیوند لگے تھے نیز منقول ہے کہ سب سے بہتر لباس وہ ہے جس میں آسانی سے محنت کی جاسکے۔

سیدنا امیر المومنین علی مرتضیٰ کرم اللہ وجہہٗ کے پاس ایک پیرہن ایسا تھا جس کی آستینیں انگلیوں تک آتی تھیں اگر کسی پیرہن کی آستینیں انگلیوں سے بڑھ جاتی تھیں تو زائد حصے کو ترشوا دیا کرتے تھے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے اپنے حبیب صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم دیا "وَثِیَابَکَ فَطَهِّرْ اَیْ فَقَصِّرْ" آپ اپنے لباس کو ترشوا کر موزوں زیب تن فرمائیں۔

حضرت حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ میں نے سات بدری صحابیوں کو دیکھا ہے جو پشمینہ کا لباس پہنتے تھے۔ سیدنا صدیق اکبر رضی اللہ عنہ خلوت میں صوف کا لباس زیب تن فرماتے تھے۔ حضرت حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ میں نے حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ کو ایک گدڑی پیوند لگی پہنے دیکھا ہے۔ سیدنا امیر المومنین عمر بن الخطاب، سیدنا امیر المومنین علی مرتضیٰ اور ہرم بن حیان رضی اللہ عنہم بیان فرماتے ہیں کہ ہم نے حضرت اویس قرنی رحمۃ اللہ علیہ کو پشمینہ کا لباس پہنے دیکھا جس میں پیوند لگے ہوئے تھے۔

حضرت حسن بصری، مالک بن دینار اور حضرت سفیان ثوری رحمہم اللہ یہ سب گدڑی زیب تن کیا کرتے تھے۔ امام عالم سیدنا امام ابوحنیفہ کوفی رحمۃ اللہ علیہ کے بارے میں محمد بن علی حکیم ترمذی اپنی کتاب تاریخ مشائخ میں نقل فرماتے ہیں کہ حضرت امام اعظم نے ابتداء میں گدڑی پہن کر خلوت نشینی کا ارادہ فرمایا اس وقت آپ کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا خوب میں دیدار ہوا حضور نے ارشاد فرمایا تمہیں لوگوں کے درمیان رہنا چاہیے یعنی خلوت نشینی کے ارادے کو چھوڑ کر خلق اللہ کے سامنے آ جاؤ کیونکہ تمہارے ذریعہ سے میری سنتیں زندہ ہوں گی۔ چنانچہ آپ نے خلوت کا ارادہ ترک فرمادیا اور قیمتی لباس کبھی نہ پہنا۔

حضرت داؤد طائی رحمۃ اللہ علیہ جو محققین صوفیاء میں سے ہیں ہمیشہ گدڑی پہنا کرتے

تھے۔ ایک مرتبہ حضرت ابراہیم ادہم گدڑی پہنے حضرت امام اعظم رحمتہ اللہ علیہ کی مجلس میں آئے تو لوگوں نے ان کو بہ نظر حقارت دیکھا۔ امام اعظم رحمتہ اللہ علیہ نے فرمایا یہ ابراہیم ادہم ہمارے سردار ہیں جو تشریف لائے ہیں۔ لوگوں نے عرض کیا اے امام عالی مرتبت! آپ کی زبان کبھی لغویات سے آلودہ نہیں ہوئی یہ سیادت و سرداری کے کیسے مستحق بن گئے امام صاحب نے فرمایا انہوں نے خدمت کر کے سیادت پائی ہے یہ ہمہ وقت اللہ تعالیٰ کی خدمت و عبادت میں مشغول رہتے ہیں اور ہم اپنی نفس پروری میں مصروف رہتے ہیں اس لئے یہ ہمارے سردار ہیں، آج کچھ لوگ گدڑی پہن کر جاہ و عزت حاصل کر لیتے ہیں مگر ان کے دل ظاہر کے مطابق نہیں ہیں تو کیا مضائقہ۔ ہر لشکر میں بہادر و شجاع چند ہی ہوتے ہیں۔ اژدحام میں محقق کم ہوتے ہیں لیکن سب کی نسبت ان کی طرف کر دی جاتی ہے۔ کیونکہ صوفیاء کا یہ مسلک مذکورہ عملی مثالوں اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے مذکورہ ارشادات کے علاوہ آپ کے اس ارشاد پر بھی مبنی ہے کہ "مَنْ تَشَبَّهَ بِقَوْمٍ فَهُوَ مِنْهُمْ" (ابوداؤد) جس کی مشابہت جو اختیار کرے خواہ وہ مشابہت قول و فعل میں ہو یا اعتقاد میں وہ اسی قوم کا فرد شمار کیا جاتا ہے۔

صوفیاء کرام کے دیکھنے والوں کے طبقات مختلف ہیں:

(۱) کوئی تو ان کے ظاہری معاملات اور ان کی خصلتوں پر نظر ڈالتا ہے۔

(۲) اور کوئی ان کی باطنی صفائی دل کی جلاء، خفیہ اسرار، طبعی لطافت، اعتدال مزاج اور دیدار ربانی کے اسرار میں صحتِ مشاہدہ کو دیکھتا ہے تا کہ محققین کا قرب اور ان کی رفعت کبریٰ کو دیکھے اور ان سے شرف نیاز مندی بجالا کر ان کے مقام سے وابستہ ہو جائے اور تعلق خاطر پیدا کر کے بصیرت حاصل کرے کیونکہ ان کے حال کی ابتداء کشف احوال اور خواہشات نفسانی اور اس کی لذتوں سے اعراض و کنارہ کشی پر مبنی ہوتی ہے۔

(۳) ایک طبقہ ایسا ہے جو جسم کی درستگی، دل کی پاکیزگی اور قلب کی سکون و سلامتی کو ان کے ظاہر حال میں دیکھنا چاہتا ہے تا کہ وہ شریعت پر عمل کرنے اور اس کے مستحبات و

آداب کی حفاظت اور باہم معاملات میں حسن عمل کو دیکھ سکے اور ان کی صحبت اختیار کر کے اصلاح حال کر سکے، اس طبقہ کے حال کی ابتداء ریاضت و مجاہدہ اور حسنِ معاملہ پر مبنی ہے۔

(۴) ایک طبقہ ایسا ہے جو انسانی اخلاق و مروت و برتاؤ، طریق صحبت و مجالست اور ان کے افعال میں حسنِ سیرت کی جستجو کرتا ہے تا کہ ان کی ظاہری زندگانی میں مروت، برتاؤ کی خوبی، بڑوں کی تعظیم، چھوٹوں پر شفقت و مہربانی اور عزیزوں اور ہمسروں کے ساتھ حسنِ سلوک، رواداری کو دیکھ کر ان کی قناعت کا اندازہ لگائے اور ان کی طلب و بے نیازی سے قربت حاصل کر کے ان کی صحبت اختیار کر لے اور آسان زندگی بسر کرے اور خود کو بندگان صالحین کی خدمت کے لیے وقف کر دے۔

(۵) ایک طبقہ ایسا ہے جسے طبیعت کی کاہلی، نفس کی بڑائی، جاہ طلبی اور بغیر فضیلت کے علوِ مقام کی خواہش اور بے علم ہونے کے باوجود اہل علم کے خصائص کی جستجو نے سرگرداں کر رکھا ہے وہ خوب جانتے ہیں کہ ان میں اس ظاہری دکھاوے کے سوا کچھ بھی نہیں ہے وہ محض ظاہری طمع میں ان کی صحبت اختیار کرتے ہیں اور مداہنت کے طریقہ پر ان کے ساتھ اخلاق و کرم کا مظاہرہ کرتے ہیں اور ''صلح کلی'' بن کر ان کے ساتھ زندگانی بسر کرتے ہیں۔ اسی بناء پر ان کے دلوں پر حقانی باتوں کا کچھ اثر نہیں ہوتا اور ان کے جسموں پر حصولِ طریقت کے مجاہدوں کی کوئی علامت پیدا نہیں ہوتی باوجود یہ کہ وہ خواہشمند ہوتے ہیں کہ محققوں کی مانند لوگ ان کی تعظیم و تکریم کریں اور ان سے ویسے ہی خوف کھائیں جیسے اللہ تعالیٰ کے مخصوص اولیاء کرام سے عوام خائف رہتے ہیں وہ چاہتے ہیں ان کی اپنی آفتیں ان کی صلاح میں پوشیدہ رہیں ایسے لوگ ان صوفیائے کرام جیسی وضع و قطع اختیار کرتے ہیں حالانکہ ان کا لباس ان کے معاملہ کی درستگی کے بغیر ان کے مکر و فریب کا پردہ چاک کرتا ہے ایسے مکر و فریب کا لباس، روزِ قیامت حسرت و ندامت کا موجب ہوگا۔ ایسے ہی لوگوں کے بارے میں

حق تعالیٰ کا ارشاد ہے "مَثَلُ الَّذِیْنَ حُمِّلُوا التَّوْرٰةَ الخ" (الجمعہ: ۵) ان لوگوں کی مثال جنہوں نے تورات پر عمل نہیں کیا اس گدھے کی مانند ہیں جو کتابوں کا بوجھ اٹھائے ہوئے ہو۔ کتنی بری مثال ہے اس قوم کی جس نے اللہ کی آیتوں کو جھٹلایا اللہ تعالیٰ ظالم قوموں پر ہدایت کے دروازے بند کر دیتا ہے۔

موجودزمانہ میں اس قسم کے لوگ بکثرت ہیں لہٰذا جہاں تک ہو سکے ایسوں سے بچنے کی کوشش کرو اور ان کی طرف قطعاً توجہ نہ دو اس لیے کہ ایسے نقلی صوفیوں سے اگر تم نے ہزار بار سلوک وطریقت حاصل کرنے کی کوشش کی تو ایک لمحہ کے لیے بھی طریقت کا دامن تمہارے ہاتھ نہ آئے گا یہ راہ محض گدڑی پہننے سے طے نہیں ہوتی بلکہ یہ منزل ریاضت ومحنت سے ملتی ہے جو شخص طریقت سے آشنا اور اس سے واقف ہو گیا اس کے لیے تونگری والا لباس بھی فقیرانہ عبا ہے اور جو اس سے بیگانہ و نا آشنا ہے اس کے لیے فقیرانہ گدڑی نحوست وادبار کی نشانی ہے اور آخرت میں باعثِ بدبختی وشقاوت ہے۔ ایک بزرگ کا واقعہ ہے کہ انہوں نے کسی سے دریافت کیا کہ:

"لِمَ لَا تَلْبَسُ الْمُرَقَّعَةَ قَالَ مِنَ النِّفَاقِ اَنْ تَلْبَسَ
لِبَاسَ الْفِتْیَانِ وَلَا تَدْخُلُ فِیْ حَمْلِ اَثْقَالِ الْفُتُوَّةِ"

آپ گدڑی کیوں نہیں پہنتے؟ انہوں نے فرمایا نفاق کے ڈر سے۔ اس لیے کہ مردانِ خدا کا لباس پہننے سے ان کے معاملات کا بوجھ اُٹھانے کی طاقت نہیں آ جاتی مردانِ خدا کا لباس پہننا اور ان کا بوجھ نہ اٹھانا کذب ونفاق ہے۔

اور اگر یہ لباسِ فقراء تم اس لیے پہنتے ہو کہ اللہ تعالیٰ تمہیں پہچانے کہ تم اس کے خاص بندے ہو تو وہ بغیر لباس کے بھی جانتا ہے اور اگر اس لیے پہنتے ہو کہ لوگ تمہیں پہچانیں کہ تم خدا کے خاص بندے ہو اگر واقعی تم ایسے ہو تب بھی یہ ریاکاری ہوگی۔

حقیقت یہ ہے کہ یہ راہ بہت دشوار اور پرخطر ہے اور اہلِ حق اس سے برتر ہیں کہ وہ کوئی خاص لباس اختیار کریں۔

"الصفا من اللہ تعالیٰ انعام و اکرام و الصوف لباس الانعام"

تزکیہ نفس اور باطنی صفائی اللہ تعالیٰ کی جانب سے بندے پر فضل و کرم ہے ورنہ صوف یعنی اون تو چوپاؤں کا لباس ہے۔

لباس تو ایک حیلہ و بہانا ہے ایک طبقہ نے لباس ہی کو قرب اختصاص کا ذریعہ جان رکھا ہے اور وہ اس کو پہن کر اپنے ظاہر کو آراستہ کرتے ہیں اور توقع رکھتے ہیں کہ وہ انہیں میں سے ہو جائیں گے اس طبقہ کے صوفیاء اپنے مریدوں کو ایسا لباس پہننے اور گدڑی کے استعمال کی تاکید کرتے ہیں اور خود بھی سیر و سیاحت کرتے رہتے ہیں تاکہ وہ مشہور و معروف ہو جائیں اس طرح مخلوق خدا (ان کے فریب میں آ کر) ان کی نگہبان اور محافظ بن جاتی ہے۔ جب بھی ان سے کوئی ایسی حرکت سرزد ہوتی ہے جو شریعت و طریقت کے خلاف ہے تو لوگ ان پر طعن و تشنیع شروع کر دیتے ہیں اگر وہ چاہیں کہ یہ لباس پہن کر مرتکب گناہ ہوں تو خلق سے شرم محسوس کرتے ہیں۔

بہر حال گدڑی اولیاء اللہ کی زینت ہے عوام اس سے عزت حاصل کرتے اور خواص اس سے کمتری کا احساس دلاتے ہیں۔ عوام تو یوں عزت حاصل کرتے ہیں کہ جب وہ اس لباس کو پہنتے ہیں تو مخلوق خدا ان کی عزت کرتی ہے اور خواص اس طرح کمتری کا احساس دلاتے ہیں کہ جب وہ گدڑی پہنتے ہیں تو لوگ انہیں عوام الناس میں سے جان کر انہیں ملامت کرتے ہیں لہٰذا یہ لباس "النعم للعوام و جوشن البلاء للخواص" عوام کے لیے نعمت ہے اور خواص کے لیے پیرہن ابتلاء کیونکہ اکثر عوام حقیقت کی پہچان میں سرگرداں رہتے ہیں چونکہ یہ مقام و درجہ ان کی دسترس اور ان کے فہم سے بالاتر ہے اور وہ اس کے حصول کا سامان بھی نہیں رکھتے جس سے وہ رئیس بن جائیں محض اسی سبب کو جمع نعمت کا ذریعہ خیال کرتے ہیں لیکن خواص ریا و نمود اور ریاست کو چھوڑ کر عزت پر ذلت کو نعمت پر ابتلا کو اس لیے ترجیح دیتے ہیں کہ ظاہری نعمتیں عوام کے لیے ہی موجب عزت ہیں مگر وہ اپنے لیے بلا و مصیبت کو باعثِ افتخار جانتے ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ صوفیاء کے لیے گدڑی وفا کا لباس ہے اور مغروروں کے لیے خوشی کی پوشاک اس لیے کہ صوفیاء اسے پہن کر دونوں جہان سے کنارہ کش ہو جاتے ہیں اور طبعی مرغوبات کو چھوڑ کر ان سے ترک تعلق اختیار کر لیتے ہیں لیکن مغرور لوگ اس لباس کے سبب حق سے محجوب ہو کر احوال کی درستگی سے محروم رہتے ہیں۔ بہتر حال یہ لباس ہر ایک کے لیے فلاح کا موجب ہے اور ہر ایک کو اس سے اپنی مراد حاصل ہو جاتی ہے کسی کو مرتبۂ صفا ملتا ہے تو کسی کو بخشش و عطا کسی کے لیے حجاب و پردہ ہے تو کسی کے لیے پائمالی اور پسپائی کسی کے لیے رضا ہے تو کسی کے لیے رنج و تعب۔ میں امید رکھتا ہوں کہ باہمی محبت اور حسنِ صحبت سے سب کے سب نجات پا جائیں گے کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے "مَنْ اَحَبَّ قَوْمًا فَهُوَ مِنْهُمْ" جو جس گروہ سے محبت رکھے گا وہ انہیں میں سے ہوگا۔ قیامت کے دن ہر گروہ کے دوستوں کو انہیں کے ساتھ اٹھایا جائے گا اور وہ انہیں کے زمرے میں شامل ہوں گے لیکن یہ لازمی ہے کہ اپنے باطن کو حقیقت کی طلب میں سرگرم رکھے اور دکھاوے کی رسوم سے اجتناب کرے اس لیے کہ جو شخص ظاہری چیزوں کو پسند کرتا ہے وہ حقیقت تک کبھی نہیں پہنچ سکتا اور یہ بھی واضح ہے کہ وجود آدمیت، قرب ربوبیت کے لیے حجاب ہے اور اس حجاب کو احوال کی گردش اور مقامات کی ریاضت و مجاہدہ ہی فنا و معدوم کرتے ہیں۔ وجود آدمیت کی صفائی اور حجابات بشری کو دور کرنے کا نام فنا ہے اور جو فانی صفات ہو جائے وہ لباس اختیار نہیں کرتا اور زیب و زینت میں الجھ کر قربِ حق اور فنائے بشریت کا حصول ناممکن ہے جو آدمی فانی صفت ہو گیا اور اس سے فنائے بشریت کی آفتیں دور ہو گئیں آپ اسے خواہ صوفی کہہ کر پکاریں یا کسی اور نام سے یاد کریں اس کے نزدیک سب یکساں ہے۔

گدڑی پہننے کی شرائط:

درویش کے لیے گدڑی پہننے کے کچھ شرائط ہیں جو یہ ہیں کہ وہ اسے آسانی و فراغت کے خیال سے تیار کرے اور جب تک اصل کپڑا سالم رہے اس میں پیوند نہ لگائے اور جب کہیں سے پھٹ جائے تو اس پر پیوند لگاتا جائے پیوند لگانے کے سلسلہ میں مشائخ طریقت کے دو قول

ہیں ایک یہ کہ پیوند لگانے میں ترتیب اور آرائش کا خیال نہ رکھنا چاہیے بلکہ جہاں سے بھی سوئی نکلے سیتا چلا جائے اس میں تکلف نہ کرے اور دوسرا قول یہ ہے کہ پیوند لگانے میں ترتیب اور درستی کا خیال رکھنا شرط ہے تا کہ مناسبت برقرار رہے اور اسے بے تکلف درست کرنا بھی فقر کے معاملات سے تعلق رکھتا ہے اور معاملات کا صحیح رکھنا صحتِ اصل کی دلیل ہے۔

سیدنا داتا گنج بخش رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ میں نے حضرت شیخ المشائخ ابوالقاسم گرگانی رحمۃ اللہ سے مقام طوس میں دریافت کیا کہ درویش کے لیے کم سے کم کونسی چیز درکار ہے جو فقر کے لائق و مناسب ہو؟ انہوں نے فرمایا تین چیزیں درویشی کے لیے ضروری ہیں ان سے کم پر نامِ فقر زیبا نہیں۔ ایک یہ کہ گدڑی میں پیوند کی درست سلائی کرے دوسری یہ کہ سچی بات سننا پسند کرے اور تیسری یہ کہ زمین پر پاؤں ٹھیک رکھے (یعنی تفاخر و تکبر اور اترانے کی چال نہ چلے) جس وقت ان سے یہ باتیں معلوم ہوئیں تو صوفیاء کی ایک جماعت ان کے پاس بیٹھی تھی ان سب کی موجودگی میں انہوں نے یہ باتیں بیان فرمائیں جب ہم ان کی محفل مبارک سے باہر نکلے تو ہر ایک نے بحث و مباحثہ شروع کر دیا اور جاہلوں کے ایک طبقہ کو ان باتوں میں لذت و شیرینی محسوس ہونے لگی وہ کہنے لگے کہ بس انہیں تین باتوں کا نام فقر ہے چنانچہ بہتوں نے بہت سے پیوند لگائے اور زمین پر داہنا پاؤں مارنے کو مشغلہ بنالیا ہر ایک یہ خیال کرنے لگا کہ ہم طریقت کی باتیں اچھی طرح سمجھتے ہیں چونکہ مجھے حضرت شیخ کی باتوں سے لگاؤ تھا مجھے ان کی باتوں کا اس طرح ضائع و برباد ہونا گوارہ نہ ہوا میں نے ان سے کہا آؤ اور ہم سب مل کر ان باتوں پر تبادلہ خیالات کریں اور ہر ایک اپنی اپنی فہم و عقل کے مطابق ان کی تشریح و وضاحت کرے چنانچہ جب میری باری آئی تو میں نے کہا کہ گدڑی میں درست پیوند لگانے کا مطلب یہ ہے کہ فقر کے لیے پیوند لگایا جائے نہ کہ زیب و زینت کی خاطر جب فقر کے لیے پیوند لگا ہوگا تو وہ پیوند اگرچہ بظاہر درست نہ ہو تب بھی فقر میں درست ہوگا اور سچی بات سننے کا خوگر ہونے کا مطلب یہ ہے کہ وہ حال کے لیے ہوں نہ کہ اپنے وجود و مرتبہ کے لیے اور وجد کی خاطر اس میں تصرف کرے نہ کہ کھیل کود اور عیش پسندگی کے لیے اور زمین پر ٹھیک پاؤں رکھنے کا مطلب یہ

ہے کہ وجد کی خاطر زمین پر پاؤں رکھے نہ کہ کھیل کود لہو ولعب کے لیے۔

کچھ لوگوں نے میری یہ تشریح وتوضیح حضرت شیخ ابوالقاسم رحمۃ اللہ سے نقل کر دی اس پر آپ نے فرمایا "اصاب علی خیرہ اللہ" علی یعنی داتا گنج بخش نے صحیح ودرست بات کہی اللہ تعالیٰ اسے پسند فرمائے۔

دراصل صوفیاء کرام کا گدڑی پہننے سے مقصد یہ ہے کہ دنیاوی محنت ومشقت میں کمی ہو اور اللہ تعالیٰ سے فقر واحتیاج میں صدق واخلاص پیدا ہو، احادیث صحیحہ میں منقول ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے پاس ایک گدڑی تھی جسے وہ اپنے ساتھ آسمان پر لے گئے ایک بزرگ فرماتے ہیں کہ میں نے انہیں خواب میں دیکھا ہے کہ ان کی گدڑی کے ہر پیوند سے نور درخشاں تھا۔ میں نے عرض کیا اے حضرت مسیح علیہ السلام! آپ کی گدڑی سے یہ انوار کیسے درخشاں ہیں؟ فرمایا یہ میرے اضطرار و پریشانی کے انوار ہیں کیونکہ میں نے ہر پیوند کو انتہائی ضرورت واحتیاج کے وقت سیا تھا۔ اللہ تعالیٰ نے میرے ہر رنج وکلفت کے بدلے مجھے ایک نور عطا فرمایا۔

نیز میں نے ماوراء النہر میں ملامتی گروہ کے ایک آدمی کو دیکھا کہ انسان جو چیز کھاتا اور پہنتا ہے وہ آدمی ان میں سے کچھ نہیں کھاتا اور نہ پہنتا تھا وہ صرف وہی چیزیں کھاتا تھا جسے لوگ پھینک دیتے تھے مثلاً خراب ککڑی، کڑوا کدو، بے کار گاجر وغیرہ اور وہ ایسی گدڑی پہنتا تھا جس کے چیتھڑے راستہ میں اکٹھا کر کے پاک کئے جاتے تھے اور پھر ان سے وہ گدڑی بنائی جاتی تھی۔

میں نے سنا ہے کہ شہر مرادالرود میں ایک بزرگ ایسے تھے جن کا شمار متاخرین اربابِ معانی میں تھا جس کا حال عمدہ اور خصلت نیک تھی ان کی گدڑی اور جائے نماز میں بے ترتیب پیوند لگے ہوئے تھے اور بچھوؤں نے اس میں بچے دے رکھے تھے۔

میرے پیرومرشد رضی اللہ عنہ نے اکیاون (۵۱) سال تک ایک ہی گدڑی زیب تن رکھی وہ اس میں بے ترتیب پیوند لگاتے رہتے تھے۔

اہلِ عراق کی ایک حکایت میں پڑھا ہے کہ دو درویش تھے جن میں ایک تو صاحبِ مشاہدہ تھا اور دوسرا صاحب مجاہدہ وہ درویش جو صاحبِ مشاہدہ تھا اس نے اپنی تمام عمر ایسی پھٹی گدڑی پہنی جیسی کے بوقتِ سماع پھٹی ہوئی گدڑی درویش پہنتے ہیں اور وہ درویش جو صاحبِ مجاہدہ تھا اس نے تمام عمر ایسی دریدہ گدڑی پہنی جیسی کی استغفار و آمرزش کی حالت میں ہوتی ہے اور اس حال میں اپنے لباس کو بوسیدہ کرلیا کرتا تھا تا کہ اس کی ظاہری حالت اس کی باطنی کیفیات کے مطابق ہو جائے یہ کیفیت اپنے حال کی حفاظت کے لیے ہوتی تھی۔

حضرت شیخ محمد بن خفیف رحمۃ اللہ نے بیس سال تک انتہائی سخت و درشت ٹاٹ پہنا وہ ہر سال چار چلہ کرتے اور ہر چالیس دن میں علوم و حقائق کی باریکیوں پر ایک کتاب تصنیف فرماتے تھے ان کے زمانہ میں محمد بن زکریا جو طریقت و حقیقت کے علماء میں اپنا مقام رکھتے ہیں ان کی حالت یہ تھی کہ وہ چیتے کی کھال پر بیٹھتے اور کبھی گدڑی تک نہ پہنتے تھے۔

حضرت شیخ محمد بن خفیف رحمتہ اللہ علیہ سے لوگوں نے پوچھا کہ گدڑی پہننے کے شرائط کیا ہیں؟ اور اس کی حفاظت کس پر لازم ہے؟ انہوں نے جواب دیا گدڑی پہننے کی شرط یہ ہے کہ محمد بن زکریا جیسے بزرگ اپنے عمدہ سفید لباس کی جگہ گدڑی پہنیں اور ان جیسے بزرگ اس لباس کی حفاظت فرمائیں۔

صوفیاء کے لباس میں مسلک اعتدال:

صوفیائے کرام میں ترک عادات کا طریقہ ان کے شرائط میں سے نہیں ہے موجودہ زمانہ میں جو اُونی لباس کمتر پہنتے ہیں اس کی دو وجہ ہیں۔ ایک یہ کہ آج کل اون گندی اور خراب ملتی ہے کیونکہ جانور ناپاک اور گندی جگہوں پر اٹھتے بیٹھتے ہیں دوسری یہ کہ اہل بدعت و ہوا اور نقلی صوفیاء نے اونی لباس کو اپنا شعار بنالیا ہے مبتدعین کے شعار کے خلاف عمل کرنا اگر چہ وہ سنت ہی کیوں نہ ہو درست ہے۔

لیکن گدڑی کے پہننے میں تکلف کو اس بناء پر جائز رکھا گیا ہے کہ ان کا مرتبہ لوگوں میں بلند و برتر ہے اور ہر شخص صوفیاء کی مشابہت اختیار کرنے کی کوشش کرتا ہے اور ان سے

خلاف شریعت وطریقت حرکات کا صدور ہوتا ہے ایسے نااہل لوگوں کی صحبت سے ان کو رنج ہوتا ہے اس لیے انہوں نے ایسے لباس کو اختیار کیا ہے جس میں بجز ان کے اور کوئی اس طرح کے پیوند نہیں لگا سکتا ایسی گدڑی کو اپنے اور غیروں کے درمیان امتیازی نشان بنا رکھا ہے ایک درویش کسی بزرگ کے پاس حاضر ہوا اس نے جو پیوند لگا رکھے تھے وہ کچھ کشادہ تھے۔ اس بزرگ نے اس کو اپنے پاس سے دور کر دیا اور اس کی گدڑی ادھیڑ ڈالی اس لیے کہ صفاء کا مطلب تو یہ ہے کہ اصل طبع کو نرم اور مزاج کو لطیف بنایا جائے بلاشبہ طبع کی درشتی اچھی نہیں ہے جس طرح کہ غیر موزوں شعر طبیعت پر گراں گزرتا ہے اسی طرح ناموزوں فعل طبیعت پر گراں ہوتا ہے۔

ایک طبقہ ایسا بھی ہے جس نے لباس کے ہونے یا نہ ہونے میں تکلف نہیں کیا اگر اللہ نے انہیں گدڑی دی تو زیب تن کر لی اگر قبا دی تو بھی پہن لیا اور اگر برہنہ رکھا تو برہنگی میں بھی صبر وشکر کیا۔

حضرت داتا گنج بخش رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ میں نے اسی مسلک اعتدال کو اختیار کر رکھا ہے اور لباس کے پہننے میں اسی طریقہ کو پسند کرتا ہوں۔

حضرت احمد بن خضرویہ رحمۃ اللہ علیہ جس وقت حضرت بایزید بسطامی رحمۃ اللہ علیہ کی زیارت کو آئے تو وہ قبا زیب تن کئے ہوئے تھے اور جب حضرت شاہ شجاع ابو حفص ملاقات کرنے آئے تو وہ بھی قبا پہنے ہوئے تھے مقررہ لباس ان کے جسم پر نہ تھا کیونکہ وہ اکثر اوقات گدڑی پہنا کرتے تھے اور بسا اوقات وہ پشمینی پیرہن یا سفید قمیض پہن لیا کرتے تھے۔ غرض کہ جو لباس بھی میسر آ جاتا اسی کو زیب تن فرماتے تھے چونکہ آدمی کا نفس عادی اور خو پسند ہوتا ہے جیسی خو اور عادت ڈالی جائے وہ اسی کا غلام ہو جاتا ہے جب نفس کو کوئی عادت پڑ جاتی ہے تو یہ حجاب بن جاتا ہے اسی بناء پر حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا "خَيْرُ الصِّيَامِ صَوْمُ أَخِيْ دَاوُدُ عَلَيْهِ السَّلَامُ" (بخاری شریف) بہترین روزے میرے بھائی حضرت داؤد علیہ السلام کے تھے۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے عرض کیا یا رسول اللہ وہ کیسے روزے رکھا کرتے تھے؟ آپ نے فرمایا وہ ایک دن روزہ رکھتے تھے اور ایک دن افطار سے رہا کرتے تھے تا کہ نفس

کوروزہ رکھنے یا نہ رکھنے کی عادت نہ پڑ جائے اور وہ حجاب نہ بنے۔

یہی عادت حضرت ابو حامد دوستاں مروزی کی تھی کہ ان کو جو لباس بھی مریدین پہنا دیا کرتے تھے وہی پہن لیتے تھے پھر جب کسی کو اس کپڑے کی ضرورت ہوتی تو اتار کر اسے دے دیا کرتے تھے حضرت ابو حامد پہنانے والے سے کچھ دریافت نہ فرماتے کہ کیوں پہنایا اور کیوں اتارا۔ ہمارے زمانہ میں بھی ایسے بزرگ غزنی میں موجود ہیں جن کا لقب مؤید ہے جو اپنے لیے لباس میں پسندیدگی اور عدم پسندیدگی کو ملحوظ نہیں رکھتے اس لحاظ سے یہ طریقہ درست ہے۔

لباس میں رنگوں کے مصلحت:

اکثر سلف صالحین صوفیا کرام کا لباس بایں وجہ نیلگوں رہتا تھا کہ وہ اکثر سیر و سیاحت میں رہتے تھے چونکہ سفید لباس حالتِ سفر میں گرد و غبار وغیرہ سے جلد میلا ہو جاتا ہے اور اس کا دھونا بھی دشوار ہوتا ہے اس وجہ کو خاص طور پر ملحوظ رکھتے تھے دوسری وجہ یہ ہے کہ نیلگوں رنگ مصیبت زدہ اور غمزدوں کا شعار ہے یہ دنیا چونکہ مصائب و آلام کا گھر اور غم واندوہ کی خندق اور غم خانہ فراق اور ابتلاء کا گہوارہ ہے جب اہل ارادت نے دیکھا کہ اس دنیا میں مقصود برآری ممکن نہیں تو انہوں نے یہ لباس پہننا شروع کر دیا اور وصل کے غم میں سوگوار بن گئے۔

صوفیا کا ایک طبقہ ایسا بھی ہے کہ جب انہیں معاملات تصوف میں قصور اور کوتاہی اور دل میں خرابی کے سوا کچھ نظر نہ آیا اور دنیا میں ضیاع وقت کے سوا کچھ نہ پایا تو سوگواری اختیار کر لی اسلئے کہ وقت ضائع کرنا کسی کی موت سے زیادہ سخت ہے کسی نے اپنے کسی عزیز کی وفات پر سوگ منایا اور کسی نے مقصود کے فوت ہونے پر سوگواری کی۔

کسی مدعی علم نے کسی درویش سے پوچھا یہ سوگواری کیوں اختیار کر رکھی ہے؟ انہوں نے جواب دیا چونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تین چیزیں چھوڑی ہیں ایک فقر، دوسرا علم، تیسرا تلوار۔ تلوار تو بادشاہوں نے لے لی مگر انہوں نے اسے بے محل استعمال کیا اور علم علماء نے اختیار کیا لیکن انہوں نے اس کو صرف پڑھنے پڑھانے تک محدود رکھا اور فقر کو فقراء کے گروہ نے اختیار کر لیا مگر انہوں نے اسے تونگری اور مالداری کا نعم البدل بنالیا میں نے ان تینوں مصیبتوں

پر سوگواری کا یہ لباس اختیار کر رکھا ہے۔

حضرت مرتعش رحمۃ اللہ علیہ سے منقول ہے کہ وہ ایک دن بغداد کے ایک محلّہ سے گزر رہے تھے کہ انہیں پیاس لگی ایک دروازہ پر جا کر دستک دی اور پانی مانگا ایک عورت پانی کا برتن لے کر حاضر ہوئی انہوں نے پانی لے کر پیا جب پانی پلانے والی پر نظر پڑی تو ان کا دل اس کے حسن و جمال پر فریفتہ ہو گیا اور وہیں بیٹھ گئے یہاں تک کہ صاحبِ خانہ باہر آیا اس سے حضرت مرتعش نے کہا اے خواجہ! میرا دل ایک گھونٹ پانی کا پیاسا تھا تمہارے گھر سے جو عورت پانی لے کر آئی اور مجھے پانی پلایا وہ میرا دل لے گئی ہے صاحبِ خانہ نے کہا وہ میری بیٹی ہے میں نے اسے تمہارے نکاح میں دے دیا اس کے بعد مرتعش دل طلب کی خاطر گھر کے اندر چلے گئے اور اس سے نکاح کر لیا۔ یہ صاحبِ خانہ امیر آدمی تھا اس نے انہیں حمام بھیجا اور عمدہ لباس پہنا کر گدڑی اتروادی۔ جب رات ہوئی تو حضرت مرتعش نماز میں مشغول ہو گئے اور خلوت میں جا کر درود وظیفہ پڑھنے لگے اسی اثنا میں انہوں نے آواز دی "ھاتوا رقعتی" میری گدڑی لاؤ۔ لوگوں نے پوچھا کیا ہوا؟ انہوں نے فرمایا ایک غیبی آواز نے مجھے کہا کہ اے مرتعش! تم نے ایک نظر ہمارے غیر پر ڈالی تو ہم نے اس کی سزا میں صلاحیت کا لباس اور ظاہر سے گدڑی اتار لی اب اگر تم دوسری بار نگاہ ڈالو گے تو ہم تمہارے باطن سے قرب و معرفت کا وہ لباس بھی اتار لیں گے جس کے پہننے سے اللہ تعالیٰ کی رضا اور اس کے محبوبوں اور اولیاء کی محبت حاصل ہوتی ہے اور جس پر برقرار رہنا مبارک ہوتا ہے اگر تم حق تعالیٰ کے ساتھ ایسی زندگی گزار سکتے ہو تو کرو ورنہ تمہیں اپنے دین کی حفاظت کرنی چاہیے اور اولیاء کرام کے لباس میں خیانت نہ کرنی چاہیے تا کہ تم حقیقی اور سچی مسلمان بن سکو اور کوئی دعویٰ نہ کرو یہ اس سے بہتر ہے کہ جھوٹ پر دل کو مائل کیا جائے۔ یہ گدڑی انہیں زیب دیتی ہے جو تارک الدنیا یا سالکِ راہِ حق ہیں۔

تربیت مرید کا طریقہ:

مشائخ طریقت کی عادت ہے کہ جب کوئی طالب و مرید تارک الدنیا ہو کر ان سے وابستہ ہوتا ہے وہ اسے تین سال تک تین معنی میں مودب اور خوگر بناتے ہیں، گر وہ اس میں قائم

و مستحکم رہا تو بہتر ہے ورنہ اس سے کہتے ہیں کہ مسلک طریقت میں تمہاری گنجائش نہیں ہے ایک سال تک تو اسے خدمت خلق میں مصروف رکھتے ہیں اور دوسرے سال اسے حق تعالیٰ کی خدمت یعنی ریاضت و مجاہدہ کراتے ہیں اور تیسرے سال اپنے دل کی حفاظت کراتے ہیں۔ خلق کی خدمت اس طرح کرائی جاتی ہے کہ وہ خود کو سب کا خادم اور ان کو اپنے مخدوم کی مانند سمجھے مطلب یہ کہ بلا استثنا سب کو اپنے سے بہتر جانے اور ان کی خدمت کو اپنے اوپر واجب جانے اس صورت کی کسی طرح گنجائش نہیں ہے کہ لوگوں کی خدمت کرتے کرتے اپنے آپ کو ان سے بہتر و بالاتر سمجھنے لگو ایسی حالت بادشاہوں اور تونگروں کی ہوتی ہے جو درحقیقت آفتِ زمانی ہے۔

اسی طرح حق تعالیٰ کا حق اس وقت ادا کرسکتا ہے جب وہ دنیا و آخرت کی تمام خواہشوں سے خود کو محفوظ رکھے اور سب سے قطع تعلق کر کے یکسو ہو کر اس کی عبادت میں منہمک رہے کیونکہ جب تک حق تعالیٰ کی عبادت کسی اور شئے کے لیے کرتا ہے تو وہ گویا اپنی پرستش کرتا ہے نہ کہ خدا کی اور دل کی حفاظت اس وقت کرسکتا ہے جب کہ اپنے دل کو مضبوط کر کے پوری دلجمعی اور تمام غم و افکار سے پاک و صاف کر کے غفلت کے وقت حضور قلب کے ساتھ مشغول ہو جب مرید حق کوش میں یہ تینوں خصلتیں پیدا ہو جاتی ہیں تب اس کے لیے گدڑی کا پہننا ضروری ہوتا ہے۔

لیکن جب شیخ کامل اپنے کسی مرید کو گدڑی پہننے کی اجازت مرحمت فرمانے لگے تو اس وقت شیخ کو لازم ہے کہ وہ مرید میں یہ دیکھے کہ یہ اب مستقیم الحال ہو کر طریقت کے تمام نشیب و فراز سے گزر چکا ہے یا نہیں؟ اور یہ کہ اس نے احوال کی لذت اور اعمال کے گھونٹ کی چاشنی چکھ کر قہر جلال اور لطف جمال سے آشنا ہوا ہے یا نہیں؟ نیز شیخ طریقت یہ بھی ملاحظہ فرمائے کہ یہ مرید احوال کی کس منزل تک رسائی حاصل کر سکے گا اور یہ کہ واپس ہونے والوں میں سے ہوگا یا واقع ہونے والوں یا کاملوں میں سے ہوگا اب اگر اس مرید کے واپس ہونے کا خطرہ ہو تو اسے شروع ہی سے مرید نہ کرے۔ اور اگر درمیان میں رہ جانے کا اندیشہ ہو تو اسے

آگے بڑھانے کی کوشش کرے اور اگر کامیاب ہونے کی توقع ہو تو اس کی تربیت کرے کیونکہ مشائخ طریقت دلوں کے طبیب ہوتے ہیں جب طبیب کو بیمار کی بیماری کی خبر نہیں ہو تو ایسا طبیب بیمار کو ہلاک کر دے گا کیونکہ وہ اس کے معالجہ کو نہیں جانتا خطرے کے مواقع کو نہیں پہچانتا اور مرض کے خلاف غذا و دوا کا استعمال کراتا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ "اَلشَّیْخُ فِیْ قَوْمِہٖ کَالنَّبِیِّ فِیْ اُمَّتِہٖ" اپنی قوم میں شیخ ایسا ہوتا ہے جیسے کہ اپنی امت میں نبی۔ انبیاء علیہم السلام نے جو اپنی قوم کو دعوت و تبلیغ فرمائی وہ امت کے حالات سے واقف ہو کر فرمائی اور ان کو بالکل ان کے مزاج کے موافق دوا دی تاکہ دعوت کا مقصد پورا ہو جائے لہٰذا ولایتِ ربانی میں کمال کے لیے ان تین سال کے ریاضت و مجاہدے کے بعد شیخ طریقت اس کی آگے تربیت فرمائے ایسی ریاضت میں جب کامل ہو جائے تو اس وقت گدڑی پہننے کی اجازت دینا مناسب ہوگا۔

گدڑی پہننے کی شرط بالکل کفن پہننے کی شرط کی مانند ہے جس طرح کہ مردہ زندگانی کی لذتوں سے محروم ہو جاتا ہے اور حیاتِ دنیاوی کی خوشیوں سے کنارہ کشی اختیار کر لیتا ہے اسی طرح جب مرید گدڑی پہن لیتا ہے تو وہ اپنی تمام زندگانی کو حق تعالیٰ کے حقوق کی ادائیگی اور اس کی خدمت میں اپنی تمام زندگی وقف کر دیتا ہے نفسانی خواہشوں سے کنارہ کش ہو جانا ضروری ہو جاتا ہے جب مرید میں یہ کیفیات پیدا ہو جاتی ہیں تب شیخ طریقت گدڑی پہننے کی اجازت دیتا ہے تاکہ وہ اس کا حق ادا کر سکے اور کسی قسم کی خواہش دل میں نہ لا سکے۔

خلاصہ یہ کہ گدڑی پہننے کے سلسلے میں مشائخ طریقت نے بکثرت ہدایات و اشارات فرمائے ہیں چنانچہ حضرت ابو عمر اصفہانی رحمۃ اللہ نے اس باب میں ایک کتاب مستقل تصنیف فرمائی ہے لیکن بناوٹی صوفیوں کو گدڑی پہننے میں بہت اصرار اور غلو ہے چونکہ اس کتاب کا مقصد مشائخ طریقت کے اقوال کا تحریر کرنا نہیں ہے بلکہ سلوک و معرفت کی عقدہ کشائی اور مشکلات کا حل بیان کرنا ہے بایں ہمہ مرقعہ پوشی میں سب سے بہتر اشارہ یہ ہے کہ گریبان صبر کا ہو، دونوں آستینیں خوف و امید کی، دونوں دامن قبض و بسط کے، کمر، نفس کے خلاف کرنے اور دوکری

صحت یقین اور فراخی اخلاص سے مرکب ہو۔

اس سے زیادہ عمدہ اشارہ یہ ہے کہ گدڑی کا گریبان محبت کی قباء سے دونوں آستینیں حفاظت وعصمت سے، دونوں دامن فقر وصفا سے، کمر مشاہدے میں قائم رہنے سے، کرسی بارگاہ الٰہی میں مامون رہنے سے اور کشادگی مقامِ وصل میں قرار پانے سے مرکب ہو جب تم نے باطن کے لیے ایسی گدڑی تیار کر لی تو ظاہر کے لیے بھی ایسی ہی گدڑی بنا سکتے ہو اس باب میں میری ایک مستقل کتاب ہے جس کا نام ''اسرار الخرق والمؤنات'' ہے طالب راہ حق کے لیے اس کتاب کا پڑھنا ضروری ہے۔

لیکن جب مرید نے اس گدڑی کو نہ پہنا اور سلطانِ وقت کے قہر وجلال اور غلبۂ حال سے ڈر کر اس نے گدڑی کو چاک کر دیا تو اسے مجبور ومعذور سمجھنا چاہیے اور جب با اختیار وتمیز اس نے گدڑی کو چاک کیا تو طریقت کے شرائط میں سے ہے کہ پھر اس کے لیے واجب ہو گیا کہ وہ گدڑی نہ رکھے اور نہ اسے پہنے اگر اس نے گدڑی رکھی تو گویا وہ ایسا ہے جیسا کہ زمانہ ساز صوفی ظاہر داری میں بغیر صفائے باطن گدڑی پہنتے ہیں۔ گدڑی چاک کرنے کی حقیقت یہ ہے کہ جب سالکِ طریقت کا ایک مقام سے دوسرے مقام کی طرف انتقال ہوتا ہے تو وہ اظہار شکر میں لباس سے باہر آ جاتا ہے اس مقام کے لیے اور کپڑے ہوتے ہیں لیکن گدڑی طریقت اور فقر وصفا کے ہر مقام میں ایک جامع اور مکمل لباس ہے اور سب سے باہر آنے کا مطلب یہ ہے کہ وہ ہر ایک سے کنارہ کش ہو گیا ہے یہ جگہ اس مسئلہ کے بیان کرنے کی نہیں ہے کیونکہ یہ خرقہ اور کشف ''حجاب السماع'' میں بیان کرنا چاہیے تھا تاہم میں نے اس جگہ ہی اشارہ کر دیا تا کہ خلط مبحث نہ ہو جائے یہ مسئلہ اپنی جگہ تفصیل سے آئے گا۔

یہ بھی منقول ہے کہ گدڑی پہنانے والے شیخ کو طریقت میں اتنا تصرف واختیار حاصل ہو کہ جب کسی غیر کو پہنائے تو شفقت ومہربانی کے ساتھ اس کو آشنائے معرفت کر دے اور جب کسی گنہگار کو پہنائے تو اسے اولیاء اللہ کے گروہ میں شامل کر لے۔

ایک مرتبہ میں اپنے شیخ کے ساتھ آذربائیجان گیا تو خرمنِ گندم میں دو تین گدڑی

پوشوں کو کھڑے دیکھا جو گدڑی کے دامن کو پھیلائے ہوئے تھے۔ مزارع نے گندم کے تھوڑے سے دانے ان کی جھولی میں ڈال دیے شیخ نے ان کی طرف متوجہ ہو کر یہ آیۂ کریمہ پڑھی:

''اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ اشْتَرَوُا الضَّلٰلَةَ بِالْهُدٰى فَمَا رَبِحَتْ تِّجَارَتُهُمْ وَمَا كَانُوْا مُهْتَدِيْنَ''

''یہی وہ لوگ ہیں جنہوں نے ہدایت کے بدلے گمراہی خریدی تو انہیں ان کی تجارت نے نفع نہ دیا اور وہ ہدایت یافتہ نہ ہوئے۔'' (البقرہ:۱۶)

میں نے عرض کیا اے شیخ یہ لوگ کس بنا پر اس بے عزتی میں مبتلا ہیں کہ برسرِ عام ذلیل و خوار ہوتے ہیں؟ شیخ نے فرمایا ان کے پیروں کو مریدوں کے جمع کرنے کا لالچ ہے اور ان مریدوں کو دنیاوی مال جمع کرنے کی ہوس ہے کسی کی حرص دوسرے کی حرص سے بہتر نہیں ہے اور بغیر امرِ حق دعوت دینا خواہشات کی پرورش کرنا ہے۔

حضرت جنید بغدادی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ میں نے باب الطلق کے بازار میں ایک آتش پرست کو دیکھا جو نہایت حسین و خوبصورت تھا میں نے بارگاہِ الٰہی میں مناجات کی کہ خدایا اسے میری طرف پھیر دے تو نے اسے کتنا خوبصورت پیدا کیا ہے۔ کچھ عرصہ بعد وہ آتش پرست میرے پاس آیا اور مجھ سے کہنے لگا اے شیخ! مجھے کلمۂ شہادت پڑھایئے اور مسلمان کر کے درجہ ولایت پر فائز کیجئے۔

حضرت شیخ ابو علی صباح سے کسی شخص نے دریافت کیا کہ گدڑی پہننا کسے درست ہے۔ انہوں نے جواب دیا اس شخص کے لیے ہے جو خدا کی ساری مملکت میں مشرف ہوتے ہوئے بھی سارے جہان کے کوئی حکم اور کسی حالت سے بے خبر نہ ہو۔

گدڑی صالحین کی نشانی، نیکوں کی علامت اور فقراء و صوفیا کا لباس ہے اور فقر و صفائی کی حقیقت کا بیان پہلے گذر چکا ہے اب اگر کوئی اولیاء کرام کے لباس کو دنیا جمع کرنے کا ذریعہ بنائے اور اس لباس کو اپنی معصیت کا سبب بنائے تو اس لباس کے جو اہل ہیں ان کا کوئی زیادہ نقصان نہیں ہوتا۔ ہدایت کے لیے اسی قدر کافی ہے۔ وباللہ التوفیق۔

فقر وصفوۃ کے معانی میں اختلاف مشائخ عظام

طریقت کے اہل علم مشائخ عظام کا فقر وصفوۃ کی تفصیل میں اختلاف ہے۔ ایک جماعت فرماتی ہے کہ بہ نسبت صفوۃ کے فقر زیادہ کامل ہے اور ایک جماعت کہتی ہے کہ بہ نسبت فقر کے صفوۃ زیادہ کامل ہے۔ اول جماعت کا استدلال یہ ہے کہ فقر چونکہ فنائے کل اور انقطاع اسرار کا نام ہے اور صفوت اس کے مقامات میں سے ایک مقام ہے جب فنائے کل حاصل ہو جاتا ہے تو تمام مقامات ناپید ہو جاتے ہیں یہ مسئلہ فقر وفنا کی طرف رجوع کرتا ہے پہلے اس کا بیان کیا جا چکا ہے اور دوسری جماعت کا استدلال یہ ہے کہ چونکہ فقر ایک شے موجود ہے جس کا نام بھی ہے اور صفوت اس حالت کا نام ہے جو تمام موجودات سے پاک وصاف ہو اور یہ کہ صفا عین فنا ہے اور فقر عین بقا لہٰذا فقر اس کے مقامات میں سے ایک مقام کا نام ہے اور صفوت اس کے کمالات میں سے ایک کمال کا نام۔ اس مسئلہ میں طویل بحث ہے موجودہ زمانے میں ہر شخص تعجب خیز باتیں کرتا ہے اور ایک سے ایک بڑھ کر حیرت انگیز گفتگو کرتا ہے حالانکہ فقر وصفوت کی تفصیل وتقدیم میں اختلاف ہے محض باتیں ہی بنانا باتفاق نہ فقر ہے نہ صفوت بعض نے بیان کو مذہب بنا کر اس پر طبع آرائی اور نکتہ سنجی شروع کر دی اور ادراک معانی سے طبیعت کو خالی کر کے حق بات کو چھوڑ دیا اور خواہشات کی نفی کو عین نفی اور اثبات مراد کو عین اثبات کہنے لگے ہیں یہی وجہ ہے کہ وہ اپنی خواہشات کی نفی کو عین نفی اور اثبات مراد کو عینِ اثبات کہنے لگے ہیں یہی وجہ ہے کہ وہ اپنی خواہشات نفسانی کے قیام میں موجود ومفقود اور منفی ومثبت میں محو ہو کر رہ گئے ہیں حالانکہ ان مدعیوں کی طریقت لغویات سے پاک وصاف ہے۔

الغرض اولیاء کرام اس مقام تک فائز ہوتے ہیں جہاں کوئی مقام نہیں رہتا اور درجات ومقامات سب کے سب فنا ہو جاتے ہیں اور ان معانی کو الفاظ کا جامہ ہرگز نہیں پہنایا جا سکتا چنانچہ اس وقت نہ پندار رہتا ہے نہ لذت، نہ مع نہ قہر، نہ ہوش نہ بے ہوشی ہر شخص اس کیفیت معانی کو ایسے ناموں سے تعبیر کرنے کی کوشش کرتا ہے جو اس کے نزدیک بزرگ تر ہوں اس

بنیاد پر تقدیم و تاخیر کرنا اور اعلیٰ ادنیٰ کہنا جائز نہیں ہے کیونکہ تقدیم و تاخیر اور اعلیٰ و ادنیٰ تو مسمیات و موجودات کے لیے ہے لہٰذا کسی جماعت کو اسم فقر، مقدم و افضل معلوم ہوا اور ان کے نزدیک یہی نام بزرگ تر اور مشرف معلوم ہوا کیونکہ اس سے منسوب کرنا شکستگی و تواضع کا مقتضی ہے اور کسی جماعت کو صفوت مقدم و افضل معلوم ہوا انہیں یہی نام اچھا لگا کیونکہ اس سے علاقہ رکھ کر کدورتیں دور ہوتی ہیں اور فنا و آفات قریب ہو جاتے ہیں اور چونکہ ان کی مراد و مقصود کا اظہار ان ہی دونوں ناموں سے ہو سکتا تھا (اسلئے ہر ایک نے ایک ایک نام منتخب کرلیا ورنہ) ان معانی کے نشان و علامات ان تعبیرات سے جدا تھیں یہ نام اختیار کرنے کی اس لیے ضرورت پیش آئی کہ باہم ان اشارات میں بات کرسکیں اور اپنے کشف ذاتی کو ان ناموں کے ذریعہ بیان کرسکیں اس طبقہ کو اس سے کوئی اختلاف نہیں ہے کہ خواہ وہ اس معنیٰ کو فقر سے تعبیر کریں یا صفوت سے دوسرے یہ کہ تعبیر کرنے والے صاحبِ زبان لوگ چونکہ ان کے معانی سے نا آشنا اور بے خبر ہوتے ہیں۔ اس لیے وہ لفظی بحثوں میں الجھ کر رہ گئے کسی نے کسی کو مقدم و افضل جانا اور کسی نے کسی کو حالانکہ یہ دونوں تعبیرات ہیں نہ کہ اصل و حقیقت لہٰذا اہل حق تو معانی کی تحقیق اور حقیقت و معرفت کی تلاش میں منہمک رہے اور یہ لوگ تعبیرات کی تاریکیوں میں پھنس کے رہ گئے۔ خلاصہ یہ کہ جب کسی کو معنیٰ حاصل ہو جائے اور وہ اسے دل کا قبلہ بنالے تو ایسے درویش کو خواہ فقیر کہو خواہ صوفی دونوں نام اضطراری ہیں اہل معرفت ناموں کے چکر میں نہیں پڑتے۔

یہ اختلاف حضرت ابوالحسن سمنون باز رحمۃ اللہ علیہ کے وقت سے چلا آرہا ہے کیونکہ وہ جب ایسے کشف میں ہوتے جو بقا سے تعلق رکھتا ہے تو فقر کو صفوت پر مقدم و افضل کرتے تھے جسے اس وقت کے ارباب معانی و اہلِ معرفت جو سمجھتے تھے انہوں نے ان سے دریافت کیا کہ ایسا کیوں ہے؟ تو انہوں نے جواب دیا کہ جب طبیعت کو فنا و نگونساری میں لطفِ تام حاصل ہوتا ہے اور بقاء علوی میں بھی تو اس وقت جب ایسے مقام میں ہوتا ہوں جو فنا سے تعلق رکھتا ہے تو صفوت کو فقر پر افضل کہتا ہوں اور جب ایسے مقام پر ہوتا ہوں جس کا تعلق بقا و علو سے ہو تو فقر کو صفوت پر مقدم و افضل کہتا ہوں کیونکہ فقر بقا ہی کا نام ہے اور صفوت فنائے کل کا اس طرح خود

سے بقا کی رویت کو فنا کرتا ہوں اور فنا میں خود سے فنا کی رویت کو فنا کر دیتا ہوں تا کہ اپنی طبیعت فنا سے بھی فانی ہو جائے اور بقا سے بھی فانی۔

یہ رموز لفظی اعتبار سے عمدہ ہیں لیکن فنا کو فنا نہیں ہوتا اور بقا کو بھی فنا نہیں ہے کیونکہ وہ باقی جو فانی ہو وہ تو از خود فانی ہوتا ہے اور جو فانی کے باقی ہو وہ از خود باقی ہوتا ہے اور فنا نام ہی اس حالت کا ہے جس میں مبالغہ محال و ممتنع ہو یہ اس لیے ہے کہ کوئی یہ نہ کہہ سکے کہ فنا ہو گیا کیونکہ یہ کہنا اس معنیٰ کے اثر وجود کی نفی سے مبالغہ کرنا ہوگا کہ فنا میں کوئی اثرِ وجود رہ گیا ہے جو ابھی فنا نہیں ہوا حالانکہ جب فنا حاصل ہو گئی تو فنا کی فنا کچھ نہ ہوگی ایسا کہنا بجز عبارت میں بے معنی تعجب خیزی کے اور کچھ نہیں ہے۔

اہل زبان کی یہ لغویتیں ہیں جو مفہوم و مراد کی تعبیر کے وقت پیدا ہوتی جاتی ہیں اور ہمارا ابقا و فنا لکھنا کلام کی اسی جنس سے تعلق رکھتا ہے جو بچپنے کی خواہش اور احوال کی تیزی کے وقت ہوتا ہے جس کا احتیاطاً ہم نے کچھ تذکرہ کر دیا ہے۔

فقر و صفوت کے درمیان معنوی فرق ہے لیکن معاملات کے اعتبار سے فقر و صفوت دنیا سے کنارہ کشی کا نام ہے اور یہ کنارہ کشی بجائے خود ایک چیز ہے اور اس کی حقیقت فقر و مسکینی میں مضمر ہے۔

فقر و مسکینی کا فرق:

مشائخ کی ایک جماعت کہتی ہے کہ مسکینی سے فقیری افضل ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

لِلْفُقَرَآءِ الَّذِیْنَ اُحْصِرُوْا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ لَا یَسْتَطِیْعُوْنَ ضَرْبًا فِی الْاَرْضِ الایه

''یہ ان فقراء کے لیے ہے جو راہِ خدا میں روکے گئے اور وہ زمین میں پھرنے کی طاقت نہیں رکھتے۔'' (البقرہ:۲۷۳)

یہ افضلیت اس لیے ہے کہ مسکین صاحبِ مال ہوتا ہے اور فقیر تارکِ مال اور یہ کہ فقیر

عزیز ہوتا ہے اور مسکینت حقیر اور یہ کہ طریقت میں صاحب مال ذلیل ہوتا ہے کیونکہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے ''درہم و دینار اور نئے پرانے کپڑے والوں کو کمینہ سمجھ'' اسی لیے مال و دولت سے کنارہ کشی کرنے والے عزیز ہیں کیونکہ تونگر کو مال پر اعتماد ہوتا ہی اور تہی دست کو خدا پر توکل ہوتا ہے۔

مشائخ طریقت کی ایک جماعت کا نظریہ مسکینی ہے اس لیے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی دعا میں اس کی مناجات کی ہے۔

اَللّٰھُمَّ اَحْیِنِیْ مِسْکِیْنًا وَاَمِتْنِیْ مِسْکِیْنًا وَاحْشُرْنِیْ فِیْ زُمْرَۃِ الْمَسَاکِیْنِ.

''اے خدا مجھے مسکین زندہ رکھ اور مسکینی کی موت دے اور مسکینوں میں حشر فرما۔''

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جب فقر کو یاد فرمایا تو اس طرح ارشاد فرمایا ''کاد الفقران یکون کفرا'' بسا اوقات فقیری کفر میں مبتلا کر دیتی ہے۔

یہ فرق اس لیے ہے کہ فقیر وہ ہے جو سبب سے تعلق رکھتا ہے اور مسکین وہ ہوتا ہے جو اسباب سے ترک تعلق کر لے۔ شریعت میں فقہاء کی ایک جماعت کے نزدیک فقیر وہ ہے جو ایک وقت کا کھانا رکھتا ہو اور مسکین وہ ہے جو یہ بھی نہ رکھے اور ایک جماعت کے نزدیک مسکین وہ ہے جو صاحب توشہ ہو اور فقیر وہ ہے جو یہ بھی نہ رکھے اسی لحاظ سے اہل طریقت مسکین کو صوفی کہتے ہیں یہ اختلاف فقہا کے اختلاف کے مطابق ہے جن کے نزدیک فقیر وہ ہے جو کچھ نہ رکھے اور مسکین وہ ہے جو ایک وقت کا توشہ رکھے ان کے نزدیک صفوت سے فقر افضل ہے صفوت و فقر ان کے اختلاف کا بیان بر سبیل اختصار ہے۔ واللہ اعلم بالصواب۔

ملامتی طبقہ

مشائخ طریقت کی ایک جماعت نے ملامت کا طریقہ پسند فرمایا ہے کیونکہ ملامت میں خلوص و محبت کی بہت بڑی تاثیر اور لذت کامل پوشیدہ ہے اور اہل حق مخلوق کی ملامت کے لیے مخصوص ہیں خاص کر بزرگانِ ملت اور رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کہ آپ اہل حق کے مقتداء و

امام ہیں آپ سے قبل بھی تمام محبوبانِ خدا پر جب تک برہانِ حق نازل نہیں ہوئی اور ان کو وحی سے سرفراز نہیں کیا گیا تھا اس وقت مخلوقِ خدا میں وہ نیک نام اور بزرگ سمجھے جاتے تھے مگر جب ان کے فرقِ مبارک پر دوستی کی خلعت رکھی گئی تو خلق نے ان کے حق میں زبانِ ملامت دراز کر دی چنانچہ کسی نے کاہن، کسی نے شاعر، کسی نے مجنون اور کسی نے کاذب تک کہا۔ (نعوذ باللہ من ھذہ الخرافات)

اللہ تعالیٰ نے اہلِ حق اور مومنین کی تعریف میں فرمایا ہے:

وَلَا يَخَافُونَ لَوْمَةَ لَآئِمٍ ذٰلِكَ فَضْلُ اللّٰهِ يُؤْتِيْهِ مَنْ يَّشَآءُ وَاللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِيْمٌ ٥

"بفضل خدا یہ زبان درازوں کی ملامت سے نہیں ڈرتے وہ جسے چاہے عطا فرمائے اور اللہ کا علم وسیع ہے۔" (المائدہ:۵۴)

حق تعالیٰ کا دستور ایسا ہی ہے کہ جس نے حق کی بات منہ سے نکالی سارے جہان نے ملامت کی کیونکہ ایسے بندے کے اسرار، ملامت میں مشغول ہونے کے باعث مخفی رہتے ہیں یہ حق تعالیٰ کی غیرت ہے کہ وہ اپنے دوستوں کو دوسروں کے دیکھنے سے محفوظ رکھتا ہے تا کہ ہر شخص کی آنکھ اس کے دوست کے حال کے جمال پر نہ پڑے اور بندے کو اس سے بھی محفوظ رکھتا ہے کہ وہ اسے دیکھنے کی کوشش کرے اور وہ خود بھی اپنا جمال نہ دیکھ سکے کیونکہ وہ غرور اور تکبر کی مصیبت میں مبتلا ہو جائے گا اسی وجہ سے خلق کو ان پر ملامت کے لیے مقرر فرمایا اور نفسِ لوامہ (ملامت کرنے والی خصلت) کو ان کے اندر پنہاں کر دیا تا کہ وہ جو بھی کرے وہ اس پر ملامت کرتا رہے اگر وہ بدی کرے تو اسے بدی پر ملامت کرے اور اگر نیکی کرے تو کوتاہی پر راہِ خدا میں یہی وہ اصل قول ہے جس میں کوئی آفت اور حجاب نہیں ہے۔ اور طریقت میں جو دشوار تر ہے اس لیے کہ بندہ اپنے آپ کی غرور میں نہ پھنس جائے۔

عجب و غرور کی بنیاد:

عجب و غرور دراصل دو چیزوں سے پیدا ہوتا ہے (۱) خلق کی عزت افزائی اور ان کی

مدح و ستائش سے اور (۲) یہ کہ اپنے ہی افعال پر کوشش ہونے سے اول صورت میں لوگ چونکہ بندے کے افعال کو پسند کرنے لگتے ہیں اور اس پر اس کی مدح و ستائش کرتے ہیں اس لیے انسان میں غرور پیدا ہو جاتا ہے دوسرے انسان کو اپنی برائیوں میں بھی حسن نظر آتا ہے اس لیے وہ غرور و خود پرستی میں مبتلا ہو جاتا ہے۔

اللہ تعالیٰ اپنے فضل سے اپنے دوستوں پر ان دروازوں کو بند کر دیتا ہے تا کہ ان کے معاملات اگرچہ نیک ہوں پھر بھی اس کو اپنی طاقت وقوت کے مقابلہ میں ہیچ ہی نظر آتا ہے اور وہ اسے پسند نہیں کرتا جس کی بنا پر غرور سے محفوظ رہتا ہے لہٰذا ہر شخص جو پسندیدۂ حق ہوگا خلق اسے پسند نہیں کرے گی اور جو اپنے جسم کو ریاضت و مجاہدے کے ذریعہ مشقت میں مشغول رکھے گا حق تعالیٰ اسے تکلیف نہیں دے گا چنانچہ شیطان کو باوجود یہ کہ لوگوں نے پسند کیا اور فرشتوں نے بھی مانا اور اس نے خود بھی اپنے آپ کو پسند کیا مگر چونکہ حق تعالیٰ نے اسے پسند نہیں فرمایا اس لیے یہ سب کچھ اس کے لیے لعنت کا سبب بن گیا حضرت آدم علیہ السلام کو نہ فرشتوں نے پسند کیا نہ ابلیس ملعون نے اور نہ انہوں نے خود ہی اپنے آپ کو پسند کیا مگر اللہ تعالیٰ نے ان کو پسند فرمایا فرشتوں نے ناپسندیدگی کا اظہار کرتے ہوئے کہا "اَتَجْعَلُ فِيْهَا مَنْ يُّفْسِدُ فِيْهَا وَيَسْفِكُ الدِّمَآءَ" (البقرہ:۳۰) اے خدا کیا تو زمین میں ایسے کو خلیفہ بناتا ہے جو اس میں فساد کرے گا اور خونریزی کرے گا۔ ابلیس معلون نے کہا "انا خیر منه خلقتنی من نار وخلقته من طین" میں آدم سے بہتر ہوں تو نے مجھے آگ سے پیدا کیا اور اسے مٹی سے۔ حضرت آدم علیہ السلام نے اپنے بارے میں کہا "رَبَّنَا ظَلَمْنَآ اَنْفُسَنَا" (الاعراف:۲۳) اے ہمارے رب ہم نے اپنے اوپر ظلم کیا لیکن جب حق تعالیٰ نے حضرت آدم علیہ السلام کو پسند فرمایا تو ان کے حق میں فرمایا "فَنَسِيَ وَلَمْ نَجِدْ لَهٗ عَزْمًا" (طٰہٰ:۱۱۵) تو ان سے بھول ہو گئی ہم نے ان کی طرف سے ارادۂ نافرمانی نہ پائی اس طرح حضرت آدم علیہ السلام کو خلق کی ناپسندیدگی کا ثمرہ، خدا کی رحمت کی شکل میں مل گیا تا کہ کائنات ہی کی مخلوق جان لے کہ ہمارا مقبول خلق کا مہجور ہوتا ہے اور جو خلق کا مقبول ہو وہ ہمارا مہجور ہوتا ہے اور یقینی طور پر سب کو پتہ چل جائے کہ

خدا کے دوستوں کی غذا خلق کی ملامت ہوتی ہے کیونکہ اس میں قبولیت کے آثار ہیں۔ اولیاء اللہ کا مذہب ہے کہ ملامت ہی قرب و اختصاص کی نشانی ہے۔ جس طرح لوگ قبول خلائق سے خوش ہوتے ہیں اسی طرح وہ ملامت سے بھی خوش رہتے ہیں۔

حدیث قدسی میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بواسطہ حضرت جبریل علیہ السلام اللہ تعالیٰ کا ارشاد نقل فرمایا کہ "اولیائی تحت قبائی لا یعرفھم غیری الا اولیائی" میرے اولیاء میری رحمت کی چادر میں ہوتے ہیں جنہیں میرے ساتھ میرے اولیاء ہی پہچانتے ہیں۔

ملامت کی قسمیں:

ملامت کی تین قسمیں ہیں۔ ایک یہ کہ وہ سیدھا چلے دوسرے یہ کہ وہ قصد کرے، تیسرے یہ کہ وہ ترک کرے۔ پہلی قسم کی صورت یہ ہے کہ ایک شخص کام کرتا ہے اور امور دینیہ میں کامل احتیاط برتتا ہے اور معاملات میں مراعات سے کام لیتا ہے مگر خلق پھر بھی اس پر ملامت کرتی ہے کیونکہ لوگوں کی یہ عام عادت ہے مگر وہ شخص کسی کی پرواہ نہیں کرتا دوسرے یہ کہ کوئی شخص لوگوں میں صاحب عزت و شرف ہونے کے ساتھ ان میں مشہور بھی ہو اور اس کا دل عزت کی طرف مائل بھی ہو اس کے باوجود وہ یہ چاہے کہ ان سے جدا ہو کر یاد الٰہی میں محو ہو جائے اور قصداً ایسی راہ اختیار کرے جس سے مخلوق اس پر ملامت کرے اور ایسے عمل سے شریعت میں بھی خلل نہ واقع ہو مگر لوگ اس سے نفرت کرنے لگیں اور اس سے متنفر ہو کر جدا ہو جائیں اور تیسری قسم یہ ہے کہ دل میں تو کفر و ضلالت سے طبعی نفرت بھری ہو بظاہر شریعت کی متابعت نہ کرے اور خیال کرے کہ ملامتی طریقہ پر ایسا کر رہا ہوں اور یہ ملامت کا طریقہ اس کی عادت بن جائے اس کے باوجود وہ دین میں مضبوط اور راست رو ہو لیکن ظاہر طور پر بغرض ملامت، نفاق و ریا کے طور و طریق پر دین کی خلاف ورزی کرے اور مخلوق کی ملامت سے بے خوف ہو وہ ہر حال میں اپنے کام سے کام رکھے خواہ لوگ اسے جس نام سے چاہیں پکاریں۔

حکایت:

حضرت شیخ ابو طاہر حراقی رحمۃ اللہ علیہ ایک دن گدھے پر سوار بازار سے گزر رہے تھے ایک مرید لگام تھامے ہوئے ساتھ تھا کسی نے پکارا دیکھو یہ پیر زندیق آ رہا ہے جب مرید نے یہ بات سنی تو اس کی ارادت و غیرت نے جوش مارا اور اسے مارنے کے لیے دوڑا بازار والے جوش میں آ گئے حضرت شیخ نے مرید کو آواز دی اور فرمایا اگر تم نے خاموشی اختیار کی تو ایک نصیحت آموز چیز دکھاؤں گا تاکہ تم اس سختی سے باز رہو مرید خاموش ہو گیا جب قیام گاہ پر واپس آئے تو مرید سے فرمایا فلاں صندوق اٹھا لاؤ وہ لایا اس میں بکثرت خطوط تھے جن کو لوگوں نے حضرت شیخ کے نام لکھے تھے انہوں نے ان کو نکالا اور مرید کے آگے رکھ کر فرمایا پڑھو کیا لکھا ہے۔ جن لوگوں نے خطوط بھیجے تھے انہوں نے ان میں ہر نامہ پر القاب میں کسی نے شیخ الاسلام کسی نے زکی، کسی نے شیخ زاہد، کسی نے شیخ الحرمین وغیرہ لکھا تھا۔ شیخ نے فرمایا یہ سب القاب و خطاب ہیں میرا نام نہیں ہے حالانکہ میں کچھ بھی نہیں ہوں ہر شخص نے اپنے اعتقاد کے بموجب مجھے مخاطب کیا ہے اگر اس بیچارے نے اپنے اعتقاد کے بموجب کوئی بات کہہ دی اور کوئی القاب دیئے تو بگڑنے یا ناراض ہونے کی کوئی ضرورت نہیں ہے اس طرح اگر ملامت میں قصداً کوئی ایسا طریقہ اختیار کرنا چاہے اور عزت و منزلت اور اس جاہ و حشم کے چھوڑنے کا ارادہ کرے جس کے وہ لائق ہے تو اس کی صورت یہ ہے کہ۔

حکایت:

ایک دن امیر المومنین سیدنا عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ کھجوروں کے باغ سے اس حال میں تشریف لا رہے تھے کہ لکڑیوں کا گٹھا آپ کے سرِ مبارک پر رکھا ہوا تھا حالانکہ آپ چار سو غلام رکھتے تھے کسی نے عرض کیا اے امیر المومنین یہ کیا حال ہے؟ آپ نے فرمایا "ارید ان اجرب نفسی" میں نے کہا کہ اپنے نفس کا تجربہ کروں اگرچہ یہ کام میرے غلام بھی کر سکتے تھے مگر میں نے چاہا کہ اپنے نفس کی آزمائش کروں تاکہ لوگوں میں جو رتبہ ہے اس کی وجہ سے یہ

نفس کسی کام سے مجھے باز نہ رکھے۔

یہ اثر صحابہ، اثباتِ ملامت میں واضح اور صریح ہے اسی معنیٰ میں ایک اور واقعہ ہے جو حضرت امام اعظم سیدنا ابوحنیفہ رضی اللہ عنہ سے منسوب ہے اس کا تذکرہ امام اعظم رحمۃ اللہ علیہ کے بیان میں آئے گا۔ انشاء اللہ تعالیٰ۔

حضرت ابویزید بسطامی رحمۃ اللہ علیہ کا واقع ہے کہ وہ حج کر کے واپس آ رہے تھے کسی شہر میں غلغلہ بلند ہوا کہ حضرت بایزید آ رہے ہیں اس شہر کے تمام لوگ استقبال کے لیے نکل آئے کہ اعزاز و اکرام کے ساتھ اپنے شہر میں لائیں حضرت بایزید نے جب لوگوں کی خاطر و مدارات کو ملاحظہ فرمایا تو ان کا دل بھی مشغول ہو گیا اور وہ یادِ حق سے باز رہنے میں پریشان خاطر ہو گئے جب بازار میں آئے تو قبا کی آستین سے ایک روٹی نکال کر وہیں کھانے لگے یہ دیکھ کر تمام لوگ ان سے برگشتہ ہو گئے اور انہیں تنہا چھوڑ کر چلے گئے چونکہ یہ واقعہ رمضان المبارک میں ہوا تھا اور خود چونکہ مسافر تھے (اور مسافر کو روزہ نہ رکھنے کی اجازت ہے) اس وقت اپنے ہمراہی مرید سے فرمایا دیکھا شریعت کے ایک مسئلہ میں لوگوں نے مجھے کاربند نہ دیکھا تو سب چھوڑ کر چلے گئے۔

سیدنا داتا گنج بخش رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اس زمانہ میں ملامت کی روش اختیار کرنے کے لیے کسی زبوں عمل کرنے کی ضرورت ہوتی تھی اور ایسی بات ظاہر کرنی پڑتی تھی جو عوام کے منشاء و مزاج کے خلاف ہو لیکن اگر آج کوئی چاہے کہ اسے ملامت کی جائے تو دو رکعت نفل شروع کر کے اسے خوب طول دے دے یا پورے دین کی مکمل پیروی شروع کر دے تاکہ تمام لوگ اسے ریاکار اور منافق کہنے لگیں۔

لیکن جو ترک کے طریقہ پر ملامت اختیار کرے اور کوئی کام خلاف شریعت کر کے یہ کہے کہ یہ عمل میں نے حصولِ ملامت کے لیے کیا ہے تو یہ کھلی ہوئی ضلالت و گمراہی ہے ظاہری آفت اور سچی ہوس پرستی ہے کیونکہ آج کل ایسے لوگ بکثرت ہیں جو ردِ خلق کی صورت میں قبولِ خلق کے خواستگار ہیں اس لیے اس کی ضرورت ہے کہ وہ پہلے خلق میں مقبول ہوں پھر اپنے کسی

فعل سے اس کی نفی کر دیں تا کہ لوگ انہیں مردود قرار دیں نا مقبول شخص کے لیے رد کرنے کا قصد کرنا قبولیت کے لیے ایک بہانہ ہوتا ہے۔

حضرت مصنف رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ مجھے مدعیان باطل کی مجلس میں بیٹھنے کا اتفاق ہوا ان میں سے ایک آدمی سے کوئی نازیبا حرکت سرزد ہوگئی مگر اس نے یہ عذر کیا کہ میرا یہ عمل ملامت کے لیے تھا اس پر کسی نے کہا یہ عذر و بہانہ بیہودہ ہے میں نے اسے دیکھا کہ غیظ و غضب سے اس کا سانس پھول گیا ہے تب میں نے اس سے کہا اے شخص اگر ملامت میں تیرا دعوٰی درست تھا تو اس آدمی کے اعتراض پر چیں بجبیں ہونا کیا معنی؟ یہ تو تیرے مذہب کو مضبوط کرتا ہے جب وہ تیرے ساتھ تیری راہ میں موافقت کرتا ہے تو تیرا اس سے جھگڑا ہی کیا؟ تجھے کیوں غصہ آتا ہے اور جو شخص امر حق کی دعوت دے اس کے لیے دلیل و حجت درکار ہے اور وہ دلیل رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت کی حفاظت ہے جب میں ظاہر میں تجھے فرائض کا تارک دیکھتا ہوں حالانکہ تو لوگوں کو اس کی طرف بلانا چاہتا ہے تو تیرا یہ عمل تجھے اسلام کے دائرے سے باہر کر دیتا ہے۔

لطائف در ملامت

واضح رہنا چاہیے کہ طریقت میں ملامتی مذہب کو شیخ زمانہ حضرت ابوحمدون قصار رحمۃ اللہ علیہ نے پھیلایا ہے ملامت کے سلسلے میں ان سے بکثرت لطیفے منسوب ہیں چنانچہ ان کا ایک قول یہ ہے کہ "الملامة ترك السلامة" سلامتی سے کنارہ کشی اختیار کرنے کا نام ملامت ہے جب کوئی شخص قصداً سلامتی کے ترک کا دعوٰی کرتا اور بلاؤں میں خود کو مبتلا کر کے عیش و راحت اور خوش ذائقہ چیزوں کو چھوتا ہے تو اس کی غرض یہ ہوتی ہے کہ جلالت کا ظہور ہو اور اس کی امید بر آئے اور لوگ اس کی عادت سے بیزار ہو کر اس سے دور ہو جائیں اور اس کی طبیعت لوگوں کی محبت سے خالی ہو جائے اس حال میں جس قدر وہ خود کو گھلائے گا اتنا ہی وہ حق سے واصل ہوگا اور جس سلامتی کی طرف لوگ رغبت کرتے اور اس کی طرف مائل ہوتے ہیں یہ اس سلامتی سے

اتنا ہی نفرت و بیزاری کرتا ہے اس طرح ایک دوسرے کے عزائم میں تضاد و تقابل پیدا ہو جاتا ہے اور وہ اپنی صفتوں میں کامیاب ہو جاتا ہے۔

احمد بن فاتک حسین بن منصور رحمتہ اللہ علیہ سے روایت کرتے ہیں کہ کسی نے ان سے پوچھا صوفی کون ہیں؟ انہوں نے فرمایا "واجدون الذات" یعنی وہ لوگ ہیں جنہوں نے ذات باری تعالیٰ کو پالیا۔

نیز حضرت ابوحمدون رحمتہ اللہ علیہ سے کسی نے دریافت کیا تو آپ نے یہ فرمایا یہ راستہ عام لوگوں کے لیے بہت دشوار اور تنگ ہے لیکن اتنا بتائے دیتا ہوں کہ "رجاء المرجیتہ رخوف القدریة" مرجیوں کی امید اور قدریوں کا خوف ملامتیوں کی صفت ہے۔

یادرکھنا چاہیے کہ ملامتیوں کی طبیعت اللہ تعالیٰ کی چیز سے اتنی نفرت نہیں کرتی جتنی لوگوں میں عزت و منزلت پانے سے انہیں نفرت ہوتی ہے یہ ان لوگوں کی خصلت ہے کہ وہ لوگوں کی تعریف و توصیف سے بہت زیادہ خوش ہوتا ہے اور پھولا نہیں سماتا اسی بنا پر وہ قرب الٰہی سے دور تر ہی ہو جاتا ہے خوف خدا رکھنے والا شخص ہمیشہ یہی کوشش کرے گا کہ خطرے کی جگہ سے دور رہے کیونکہ اس میں اس کے لیے دو خطرے لاحق ہوتے ہیں ایک یہ کہ وہ حق تعالیٰ سے حجاب میں نہ آ جائے دوسرا یہ کہ وہ ایسا فعل کرنے سے بچے جس سے لوگ گناہگار ہوں اور اس پر طعن و تشنیع کرنے لگیں ان کا یہ مقصود نہیں ہوتا کہ ان میں عزت پانے سے راحت محسوس کریں اور نہ یہ کہ ملامت کرانے سے انہیں گناہگار بنائیں اس لیے ملامتی کو سزاوار ہے کہ پہلے دنیاوی جھگڑوں اور لوگوں کی اخروی علاقوں سے خود کو جدا کرے اس کے بعد لوگ اسے کچھ بھی کہیں دل کی نجات کے لیے ایسا فعل کرے جو شریعت میں نہ گناہِ کبیرہ ہو نہ صغیرہ تا کہ لوگ اس سے برگشتہ ہو کر اسے چھوڑ دیں یہاں تک احتیاط برتے کہ معاملات میں اس کا خوف، قدریوں کے خوف کی مانند ہو اور معاملہ کنندگان سے ایسی امید رکھے جیسے مرجیہ امید رکھتے ہیں حقیقت میں ملامت سے بہتر کسی چیز سے محبت و دوستی نہ ہو اس لیے کہ دوست کی ملامت کا دوست کے دل پر اثر نہ ہوگا اور دوست کا گزر دوست کی گلی ہی میں ہوگا اور دوست کے دل میں اغیار کا خطرہ نہ ہوگا

جب ایسی حالت ہوجائے گی تو اپنی خواہش میں ملامت کی سب سے بڑھ کر لذت پائیں گے اس لیے کہ ملامت عاشقوں کا باغ، محبوں کی تازگی، مشتاقوں کی راحت اور مریدوں کی خوشی کا نام ہے یہ لوگ دل کی سلامتی کی خاطر جن وانس کا ہدف بننا پسند کرتے ہیں۔ اور کوئی مخلوق خواہ وہ مقربوں میں سے ہو یا کروبیوں میں سے یا روحانیوں میں سے، ان کے درجہ کو نہیں پہنچ سکتی گزشتہ امتوں کے زہاد اور عباد اور سالکان وطالبان حق میں سے بھی کوئی ان کے رتبہ تک نہیں پہنچا بجز اس امت کے ان حضرات کے جو طریقت کے سالک ہیں اور دل کو منقطع کر چکے ہیں۔

سیدنا داتا گنج بخش رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ میرے نزدیک ملامت کی خواہش عین ریا ہے اور ریا کاری عین نفاق ہے اس لیے کہ ریا کار قصداً ایسی راہ پر چلتا ہے جس سے وہ مخلوق میں مقبول ہو اور ملامتی بھی قصداً ایسی روش اختیار کرتا ہے جس سے لوگ اس سے نفرت کریں یہ دونوں طبقے خلق ہی میں سرگرداں رہتے ہیں ان سے گزرنے کی انہیں راہ ہی نہیں ملتی ایک اس راہ پر ہولیا دوسرا دوسرے راستے پر حالانکہ درویش کے دل میں مخلوقات کے گزر کی گنجائش کہاں؟ جب دل کے آئینہ سے خلق کی تصویر محو ہو چکی ہو تو وہ دونوں راستوں سے جدا ہو جاتا ہے (یعنی نہ ریا کاری رہتی ہے اور نہ نفاق کا خطرہ) اور وہ کسی چیز میں گرفتار نہیں رہتا۔

ایک دن ماوراء النہر میں ایک ملامتی سے ملاقات ہوئی جب وہ خوش ہوا تو اسی لحہ میں نے پوچھا اے بھائی! ان افعالِ بد سے تیری کیا مراد ہے؟ اس نے جواب دیا لوگوں سے گلو خلاصی چونکہ میں نے دل میں خیال کیا کہ یہ مخلوق تو بہت ہے اور تیری عمر تھوڑی ہے ان سب سے اپنا پیچھا چھڑانا دشوار ہے اگر تو خلقت سے اپنا پیچھا چھڑانا چاہتا ہے تو ان سب کو چھوڑ دے تا کہ ان سب کی مصروفیتوں سے خود کو محفوظ رکھ سکے۔

ایک طبقہ ایسا بھی ہے جو خلقت میں مشغول ہوتے ہوئے بھی سمجھتا ہے کہ لوگ خود ہی ن کی طرف متوجہ ہیں اور کوئی تجھ کو نہیں دیکھتا اب تو خود اپنے آپ کو مت دیکھ جب تیرے حال پر مصیبت تیری اپنی ہی نظر سے ہے تو تجھے غیر سے کیا سروکار اگر کسی کو پرہیز سے شفا حاصل ہو جائے تو مداوائے غذائی حاصل کرنا مردانگی نہیں ہے۔

ایک طبقہ ایسا بھی ہے جو ریاضت کے لیے نفس کو ملامت کرتا ہے تا کہ خلقت میں رسوائی سے یا پھٹے کپڑوں میں ہونے کی ذلت سے ان کا نفس ادب سیکھے اس سے وہ داد کے خواہش مند ہوتے ہیں کیونکہ اس سے وہ بہت خوش ہوتے ہیں جن میں نفس کی خواری اور رسوائی پائیں۔

حضرت ابراہیم ادہم رحمۃ اللہ علیہ سے کسی نے دریافت کیا کہ کبھی آپ نے اپنے مقصد میں کامیابی دیکھی ہے؟ انہوں نے فرمایا ہاں دو مرتبہ ایک اس وقت جب میں کشتی میں سوار تھا اور کسی نے مجھے نہیں پہچانا کیونکہ میں پھٹے پرانے کپڑے پہنے ہوئے تھا اور بال بھی بڑھ گئے تھے ایسی حالت تھی کہ کشتی کے تمام سوار میرا مذاق اڑا رہے تھے ان میں ایک مسخرہ اتنا جری تھا کہ وہ میرے پاس آ کر سر کے بال نوچنے لگا اور میرا مذاق اڑانے لگا اس وقت میں نے اپنی مراد پائی اور اس خراب لباس اور شکستہ حالی میں مسرت محسوس ہوئی یہاں تک کہ میری یہ مسرت بایں سبب انتہا کو پہنچی کہ وہ مسخرہ اٹھا اور اس نے مجھ پر پیشاب کر دیا اور دوسری مرتبہ اس وقت جب کہ میں ایک گاؤں میں تھا اور وہاں شدید بارش ہوئی سردی کا موسم تھا گدڑی بھیگ گئی اور ٹھنڈک نے بے حال کر دیا میں نے مسجد کی طرف رخ کیا لوگوں نے وہاں ٹھہرنے نہیں دیا دوسری مسجد کی طرف گیا وہاں بھی امان نہ ملی پھر تیسری مسجد کی طرف گیا وہاں بھی یہی سلوک ہوا سردی میری قوتِ برداشت سے باہر ہو گئی آخر کار میں حمام کی بھٹی کے آگے آیا اور اپنے دامن کو آگ پر پھیلا دیا اس کے دھوئیں سے میرے کپڑے اور چہرہ سیاہ ہو گیا اس رات بھی میں اپنی مراد کو پہنچا۔

سیدنا داتا گنج بخش رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ مجھے بھی ایک مشکل درپیش آئی میں نے اس مشکل سے خلاصی پانے کی کوشش کی مگر کامیاب نہ ہو سکا اس سے قبل بھی مجھ پر ایسی ہی مشکل پڑی تھی تو میں نے حضرت شیخ بایزید رحمۃ اللہ علیہ کے مزار شریف پر حاضری دی تھی اور میری وہ مشکل آسان ہو گئی تھی اس مرتبہ بھی میں نے ارادہ کیا کہ وہاں حاضری دوں بالآخر تین ماہ تک مزار مبارک پر چلہ کشی کی تا کہ میری یہ مشکل حل ہو جائے ہر روز تین مرتبہ غسل

اور تیس مرتبہ وضو کرتا۔اس امید پر کہ مشکل آسان ہو مگر پریشانی دور نہ ہوئی تو خراسان کے سفر کا ارادہ کیا۔

اس ولایت میں ایک رات ایک گاؤں میں پہنچا وہاں ایک خانقاہ تھی جس میں صوفیوں کی ایک جماعت فروکش تھی میرے جسم پر کھردری اور سخت قسم کی گدڑی تھی مسافروں کی مانند میرے ساتھ کچھ سامان نہ تھا صرف ایک لاٹھی اور لوٹا تھا اس جماعت نے مجھے حقارت کی نظر سے دیکھا اور کسی نے مجھے نہ پہچانا وہ اپنے رسم ورواج کے مطابق باہم گفتگو کرتے اور کہتے کہ یہ ہم میں سے نہیں ہے اور یہ درست بھی تھا کہ میں ان میں سے نہیں تھا لیکن مجھے چونکہ وہاں رات گزارنی ضروری تھی گنجائش نہ ہونے کے باوجود میں ٹھہر گیا اور انہوں نے مجھے دریچہ میں بٹھا دیا اور وہ لوگ اس سے اونچی چھت پر چلے گئے میں زمین پر رہا انہوں نے میرے آگے ایک سوکھی اور پھپھوندی لگی ہوئی روٹی ڈال دی میں ان خوشبوؤں کو سونگھ رہا تھا جو وہ لوگ خود کھا رہے تھے وہ لوگ مجھ پر برابر آوازیں کس رہے تھے جب وہ کھانے سے فارغ ہوئے تو خربوزے کھانے لگے اور دل لگی سے اس کے چھلکے میرے سر پر پھینک کر میری تحقیر وتوہین کرتے رہے اور میں اپنے دل میں کہہ رہا تھا کہ خداوندا، اگر میں تیرے محبوبوں کا لباس پہننے والوں میں سے نہ ہوتا تو میں ان لوگوں سے کنارہ کش ہو جاتا پھر جتنی بھی مجھ پر ان کی طعن وتشنیع زیادہ ہوتی رہی میرا دل مسرور ہوتا گیا یہاں تک کہ اس واقعہ کا بوجھ اٹھانے سے میری مشکل حل ہو گئی اس وقت مجھ پر یہ حقیقت منکشف ہوئی کہ مشائخ کرام جاہل لوگوں کو اپنے ساتھ کیوں گوارہ کرتے ہیں اور کیوں ان کی سختیاں جھیلتے ہیں یہ ہیں کامل تحقیق کے ساتھ ملامت کے احکام وباللہ التوفیق۔

صحابہ کرام میں اہلِ طریقت کے مشائخ عظام

اب میں ان ائمہ کرام کے احوال کا کچھ تذکرہ کرتا ہوں جو صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین میں سے مشائخ عظام کے پیش روِ طریقت اور ذات وصفات اور احوال میں ان کے امام وقائد ہیں جن کا مرتبہ انبیاء کرام علیہم السلام کے بعد ہے جو اولین سابقین اور مہاجرین وانصار

میں سے ہیں ہمارے اور تمہارے۔

تذکرۂ خلفائے راشدین

(۱) حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ:

صحابہ کرام میں سے شیخ الاسلام بعد از انبیاء خیر الانام علیہم السلام خلیفہ و امام تارکین دنیا کے سردار، صاحبان خلوت کے شہنشاہ آفاتِ دنیاوی سے پاک وصاف، امیر المومنین سیدنا ابوبکر عبداللہ بن عثمان بن ابی قحافہ صدیق اکبر رضی اللہ عنہ ہیں آپ کی کرامتیں اور بزرگیاں مشہور ہیں۔ اور معاملات وحقائق میں آپ کے نشانات ودلائل واضح ہیں تصوف کے سلسلہ میں آپ کے کچھ حالات کتابوں میں مذکور ہیں مشائخ طریقت نے ارباب مشاہدہ اور صاحبان علم و عرفان میں آپ کو مقدم رکھا ہے چونکہ آپ کی مرویات بہت کم ہیں اسی طرح حضرت فاروق اعظم سیدنا عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ کو اربابِ مجاہدہ میں مقدم رکھا ہے کیونکہ آپ کے معاملات اور حق پر صلابت، صحیح روایتوں میں مرقوم اور اہل علم کے درمیان معروف ہیں چنانچہ حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ رات میں تلاوتِ قرآن کریم نماز میں کرتے تو نرم وآہستہ آواز میں کرتے اور حضرت فاروقِ اعظم رضی اللہ عنہ نماز پڑھتے تو بلند آواز سے کرتے تھے ایک مرتبہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے سیدنا ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ سے دریافت فرمایا کہ تم کس وجہ سے نرم وآہستہ آواز میں تلاوت کرتے ہو؟ انہوں نے عرض کیا "اسمع من اناجیه" جس سے مناجات کرتا ہوں وہ خوب سنتا ہے چونکہ میں جانتا ہوں وہ مجھ سے دور نہیں ہے اور اس کی سماعت کے لیے نرم یا بلند آواز سے پڑھنا دونوں برابر ہیں اور جب حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ سے دریافت فرمایا تو آپ نے عرض کیا "اوقظ الوسنان ای النائم و اطرد الشیطان" سوتے ہوئے کو جگاتا ہوں اور شیطان کو بھگاتا ہوں یہ مجاہدے کی علامت ہے اور وہ مشاہدے کا نشان مجاہدے کا مقام مشاہدے کے پہلو میں ایسا ہے جیسے قطرہ دریا میں یہ اس لیے ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "هل انت الاحسنة من حسنات ابی

بکر" اے عمر! تم ابوبکر کی نیکیوں میں سے ایک نیکی ہو جب کہ سیدنا فاروق اعظم رضی اللہ عنہ جیسے بطلِ جلیل جن سے اسلام کو عزت و رفعت ملی حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی نیکیوں میں سے ایک نیکی ہیں تو غور کرو کہ سارے جہان کے لوگ کس درجہ میں ہوں گے۔

سیدنا ابوبکر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ "دار نافانیته واحوالنا عارية وانفاسنا معدودة وكسلنا موجودة" ہمارا گھر فانی ہے، ہمارے احوال عاری ہیں، ہمارے سارے سانس گنتی کے ہیں اور سستی و کاہلی موجود ہ ظاہر ہے لہٰذا فانی گھر کی تعمیر کرنا جہالت، عاریتی حال پر اعتماد کرنا نادانی، گنتی کے سانسوں پر دل لگانا غفلت اور کاہلی کو دین سمجھ لینا سراسر نقصان و خسارہ ہے اس لیے کہ جو چیز عاریۃً لی جاتی ہے اسے واپس کرنا ہوتا ہے اور جو چیز واپس جانے والی ہوتی ہے وہ باقی نہیں رہتی اور جو چیز گنتی میں آئے وہ محدود ہوتی ہے اور سستی و کاہلی کا تو کوئی علاج ہی نہیں اس ارشاد میں آپ نے ہمیں تلقین فرمائی کہ یہ دنیا اور اس کی ہر چیز فنا ہونے والی ہے اس کے جانے کا اندیشہ نہ کرنا چاہیے اور نہ اس کی خاطر اس سے دل لگانا چاہیے کیونکہ جب تم فانی سے دل لگاؤ گے تو باقی سے پوشیدہ اور حجاب میں رہ جاؤ گے حالانکہ یہ دنیا اور یہ نفس، طالب حق اور اس کے محبوبوں کے لیے حجاب و پردہ ہے وہ دونوں سے اجتناب کرتے ہیں جب یہ بات معلوم ہوگئی کہ یہ دنیا اور اس کا تمام ساز و سامان سب عارضی اور عاریت کی چیزیں ہیں ان کو اپنی ملک سمجھ کر ان میں مالکِ حقیقی کی اجازت اور اس کی منشاء کے خلاف تصرف کرنا کتنی نادانی ہے۔

حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ اپنی مناجات میں عرض کیا کرتے تھے کہ "اللهم ابسط لي الدنيا وزهدني عنها" اے خدا دنیا کو میرے لیے کشادہ فرما لیکن مجھے اس میں مبتلا ہونے سے محفوظ رکھ دنیا کی فراخی کی دعا کے بعد اس سے محفوظ رکھنے کی التجا میں ایک لطیف اشارہ ہے وہ یہ کہ دنیا دے تا کہ شکر بجالاؤں پھر یہ توفیق دے کہ اسے تیری راہ میں اپنے ہاتھ سے خرچ کروں اور اپنا رخ تیری طرف پھیروں تا کہ شکر اور انفاق فی سبیل اللہ کا درجہ پاؤں اور مقامِ صبر بھی حاصل کروں تا کہ فقر میں پریشان نہ ہوں اور فقر پر میرا اختیار ہو اس مفہوم سے اس

قول کی تردید بھی ہو جاتی ہے کہ جس نے یہ کہا ہے کہ جس کا فقر اضطراری ہو وہ فقرِ اختیاری سے زیادہ کامل ہوتا ہے اگر اضطراری ہو تو یہ فقر کی صفت ہے اگر اختیاری ہو تو یہ فقر بندے کی صفت ہے جب اس کا عمل کششِ فقر سے منقطع ہو جائے تو اس سے بہتر ہے کہ تکلف سے اپنا درجہ بنائے۔

سیدنا داتا گنج بخش رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ صفتِ فقر کا اس وقت زیادہ ظہور ہوتا ہے جبکہ تونگری کی حالت میں اس کے دل پر فقر کا ارادہ ہو پھر وہ ایسا عمل کرے جو اسے ابنِ آدم کی محبوب چیزوں سے یعنی دنیاوی مال و متاع سے دست کش کر دے نہ کہ فقر کی حالت میں اس کا دل تونگری کی خواہش سے بھرپور ہو اور ایسے عمل کا ارتکاب کرے جس کی بناء پر تونگروں، بادشاہوں اور درباریوں کے دروازوں پر جانا پڑے۔

صفتِ فقر تو یہ ہے کہ انسان تونگری چھوڑ کر فقر اختیار کرے نہ یہ کہ فقر میں مال و منال اور جاہ و حشم کا طالب ہو۔

سیدنا صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کا رتبہ انبیاء علیہم السلام کے بعد ساری مخلوق سے افضل و مقدم ہے اور یہ جائز نہیں ہے کہ کوئی ان سے آگے قدم رکھے اور معنوی اعتبار سے مقدم ہو جائے کیونکہ آپ نے فقرِ اختیاری کو فقر اضطراری پر مقدم و افضل رکھا ہے یہی تمام مشائخ طریقت کا مذہب ہے۔

حضرت زہری رضی اللہ عنہ آپ کے بارے میں فرماتے ہیں کہ جب حضرت صدیق رضی اللہ عنہ نے بیعت خلافت لی تو آپ نے منبر پر کھڑے ہو کر خطبہ میں ارشاد فرمایا:

واللہ ما کنت حریصا علی الامارۃ یوما ولا لیلۃ ولا کنت فیھا راغبا. ولا سألتھا اللہ قط فی سر وعلانیۃ ومالی فی الامارۃ من راحۃ

''خدا کی قسم ایک دن یا ایک رات کے لیے بھی میں امارت کا خواہاں نہیں ہوا اور نہ مجھے اس کی رغبت ہے اور نہ ظاہر و باطن میں خدا سے اس کا

سوال کیا ہے اور نہ میرے لیے امارت میں راحت ہے۔"

اللہ تعالیٰ جب بندہ کو کمال صدق پر فائز کرتا اور عزت و منزلت کے مقام پر متمکن فرماتا ہے تو بندہ صادق منتظر رہتا ہے کہ حق تعالیٰ کی طرف سے کیا حکم ہوتا ہے جیسا بھی اس پر حکم وارد ہوتا ہے وہ اس پر قائم رہتا ہے اس میں وہ اپنے تصرف و اختیار کو کام میں نہیں لاتا یہی صورتِ حال حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کی تھی آپ نے ابتداء میں بھی ویسی ہی تسلیم و رضا کو اختیار فرمایا جس طرح انتہا میں اختیار فرمایا۔ صوفیاء کرام نے ترک دنیا اور حرص و منزلت کے چھوڑنے کو فقر پر اور ترکِ ریاست کی تمنا کو اس لیے پسند کیا کہ دین میں حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ تمام مسلمانوں کے امامِ عام ہیں اور طریقت میں آپ تمام صوفیا کے امام خاص۔

(۲) سیدنا عمر فاروق رضی اللہ عنہ:

دوسرے خلیفہ راشد، سرہنگ اہل ایمان، مقتدائے اہل احسان، امام اہل تحقیق، دریائے محبت کے غریق سیدنا ابو حفص عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ ہیں آپ کے فضائل و کرامات اور فراست و دانائی مشہور و معروف ہیں آپ فراست و صلابت کے ساتھ مخصوص ہیں طریقت میں آپ کے متعدد لطائف و دقائق ہیں اسی معنیٰ و مراد میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد ہے کہ "اَلْحَقُّ یَنْطِقُ عَلٰی لِسَانِ عُمَرَ" (ابن ماجہ) حق عمر کی زبان پر بولتا ہے۔ یہ بھی فرمایا کہ "قَدْ کَانَ فِی الْاُمَمِ مُحَدَّثُوْنَ فَاِنْ یَّکُ مِنْھُمْ فِیْ اُمَّتِیْ فَعُمَرُ" (بخاری شریف) گزشتہ امتوں میں محدثین گزرے ہیں اگر میری امت میں کوئی محدث ہے تو وہ عمر رضی اللہ عنہ ہیں۔ طریقت کے بکثرت رموز و لطائف آپ سے مروی ہیں اس کتاب میں ان سب کا جمع کرنا دشوار ہے البتہ ان میں سے ایک یہ ہے آپ نے فرمایا "العزلة راحة من خلطاء السوء" بدوں کی ہمنشینی سے گوشہ نشینی میں چین و راحت ہے۔

گوشہ نشینی کے دو طریق:

گوشہ نشینی دو طریقہ سے ہوتی ہے ایک خلقت سے کنارہ کشی کرنے پر، دوسرے ان

سے تعلق منقطع کرنے سے۔ خلقت سے کنارہ کشی کی صورت یہ ہے کہ ان سے منہ موڑ کر خلوت میں بیٹھ جائے اور ہم جنسوں کی صحبت سے ظاہری طور پر بیزار ہو جائے اور اپنے اعمال کے عیوب پر نگاہ رکھنے سے راحت پائے خود کو لوگوں کے ملنے جلنے سے بچائے اور اپنی برائیوں سے ان کو محفوظ رکھے اور دوسرا طریقہ یہ کہ خلقت سے تعلق منقطع کرے اس کی صورت یہ ہے کہ اس کے دل کی کیفیت یہ ہو جائے کہ وہ ظاہر سے کوئی علاقہ نہ رکھے۔ جب کسی کا دل خلق سے منقطع ہو جاتا ہے تو اسے کسی مخلوق کا اندیشہ نہیں رہتا اور اُسے کوئی خطرہ نہیں رہتا کہ کوئی اس کے دل پر غلبہ پا سکے گا اس وقت ایسا شخص اگرچہ خلقت کے درمیان ہوتا ہے لیکن وہ خلقت سے جدا ہوتا ہے اور اس کے ارادے ان سے منفرد ہوتے ہیں یہ درجہ اگرچہ بہت بلند ہے لیکن بعید از قیاس نہیں مگر یہی طریقہ سیدھا اور مستقیم ہے۔ سیدنا فاروق اعظم رضی اللہ عنہ اسی مقام پر فائز تھے ظاہر میں تو سریر آرائے خلافت اور خلقت میں ملے جلے نظر آتے تھے لیکن حقیقت میں آپ کا دل عزلت و تنہائی سے راحت پاتا تھا یہ دلیل واضح ہے کہ اہلِ باطن اگرچہ بظاہر خلق کے ساتھ ملے جلے ہوتے ہیں لیکن ان کا دل حق کے ساتھ وابستہ ہوتا ہے اور ہر حال میں خدا ہی کی طرف رجوع ہوتا ہے اور جس قدر وقت خلق سے ملنے جلنے میں صرف ہوتا وہ اسے حق کی جانب سے بلاء و امتحان شمار کرتے ہیں وہ خلق کی ہم نشینی سے حق تعالیٰ کی طرف بھاگتے ہیں وہ خیال کرتے ہیں کہ دنیا خدا کے محبوبوں کے لیے ہرگز پاک و صاف نہیں ہوتی کیونکہ احوالِ دنیا مکدر ہوتے ہیں جیسا کہ حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ نے فرمایا "**دار اسست وعلی البلوٰی بلا بلوٰی محال**" دنیا ایسا گھر ہے جس کی بنیاد بلاؤں پر رکھی گئی ہے محال ہے کہ بغیر بلا کے وہ رہ سکے۔

حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم کے مخصوص صحابہ میں سے ہیں اور بارگاہِ الٰہی میں آپ کے تمام افعال مقبول ہیں حتیٰ کہ ابتداً جب مشرف باسلام ہوئے تو جبریل علیہ السلام نے بارگاہِ رسالت میں حاضر ہو کر عرض کیا "**قد استبشر یا محمد اھل السمآء باسلام عمر**" یارسول اللہ آسمان والے آج عمر کے مشرف باسلام ہونے پر بشارت و

تہنیت دیتے ہیں اور وہ خوشیاں منا رہے ہیں۔ صوفیاء کرام گدڑی پہنتے اور دین میں صلابت و سختی اختیار کرنے میں آپ کی پیروی کرتے ہیں اس لیے کہ آپ تمام امور میں سارے جہان کے امام ہیں۔

(۳) حضرت عثمان ذوالنورین رضی اللہ عنہ:

تیسرے خلیفہ راشد، مخزن حیاء اعبد اہل صفا، متعلق بدرگاہِ رضا، متحلی بطریق مصطفیٰ، سیدنا ابوعمر عثمان بن عفان ذوالنورین رضی اللہ عنہ ہیں۔ ہر لحاظ سے آپ کے فضائل واضح اور آپ کے مناقب ظاہر ہیں۔

حضرت عبداللہ بن رباح اور حضرت ابوقتادہ رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ جس دن بلوائیوں نے آپ کے گھر کا محاصرہ کیا ہم امیر المومنین سیدنا عثمان ذوالنورین رضی اللہ عنہ کے پاس موجود تھے بلوائی جب دروازے کے سامنے جمع ہوگئے تو آپ کے غلاموں نے ہتھیار اٹھا لیے آپ نے فرمایا جو ہتھیار نہ اٹھائے وہ میری غلامی سے آزاد ہے راوی بیان کرتے ہیں کہ ہم اپنے خوف کے سبب باہر نکل آئے اثنائے راہ میں حضرت امام حسن ابن علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہم آتے ہوئے ملے ہم ان کے ہمراہ پھر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے پاس آگئے تاکہ دیکھیں امام حسنِ مجتبیٰ رضی اللہ عنہ کیا کرتے ہیں جب امام حسن مجتبیٰ رضی اللہ عنہ اندر داخل ہوئے تو سلام عرض کیا پھر بلوائیوں کی حرکت پر اظہارِ افسوس کرتے ہوئے کہا، اے امیر المومنین، میں آپ کے حکم کے بغیر مسلمانوں پر تلوار بے نیام نہیں کرسکتا آپ امام برحق ہیں آپ حکم دیجئے تاکہ آپ سے اس قوم کو دور کروں۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے جواب میں فرمایا:

یا ابن اخی ارجع واجلس فی بیتك حتیٰ یاتی اللہ بامرہٖ فلاحاجة لنا فی اھراق الدماء

''اے میرے بھائی علی رضی اللہ عنہ کے فرزند جاؤ اپنے گھر آرام کرو یہاں تک کہ اللہ کا کوئی حکم وارد ہو ہمارے لیے لوگوں کے خون بہانے کی ضرورت نہیں۔''

مقام خلت و دوستی میں، بلاو مصیبت کے درمیان، تسلیم و رضا کی یہ روشن علامت ہے آپ کا یہ طرز عمل حضرت ابراہیم خلیل اللہ علیہ السلام کے اس طرز عمل کے بالکل مماثل ہے جو ان سے آتش نمرود کی آزمائش کے وقت ظہور میں آیا تھا چنانچہ نمرود ملعون نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کا خاتمہ کرنے کے لیے آگ جلائی اور ان کو گھوپھن (منجنیق) میں رکھا گیا تو جبریل علیہ السلام آئے اور عرض کیا "هل لك من حاجة" کیا آپ کو کوئی حاجت ہے؟ حضرت خلیل علیہ السلام نے فرمایا "امام اليك فلا" بندہ سراپا محتاج ہے لیکن تم سے کوئی حاجت نہیں جبریل علیہ السلام نے عرض کیا پھر اللہ تعالیٰ سے عرض کیجئے، فرمایا "حسبی من سوالی علمه بحالی" حق تعالیٰ میرے سوال سے بے نیاز ہے وہ میری حالت کو جانتا ہے مطلب یہ کہ مجھے اپنا حال عرض کرنے کی کیا ضرورت ہے۔ وہ جانتا ہے کہ مجھ پر کیا بیت رہی ہے وہ میرے معاملہ کو مجھ سے بہتر سمجھتا ہے وہ خوب جانتا ہے کہ میری درستگی و صلاح کس چیز میں ہے۔ حضرت عثمان ذوالنورین کا معاملہ بھی بالکل اسی کے مشابہ اور وہ حضرت خلیل علیہ السلام کو منجنیق میں رکھے جانے کے مقام پر تھے اور بلوائیوں کا اجتماع، آتش نمرود کے قائم مقام اور امام حسن مجتبیٰ، حضرت جبریل علیہ السلام کی جگہ تھے لیکن ان دونوں واقعہ میں فرق یہ ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کو اس بلا میں نجات ملی تھی اور حضرت عثمان ذوالنورین رضی اللہ عنہ اس بلا میں شہید ہوئے تھے کیونکہ نجات کا تعلق بقا سے ہے اور ہلاکت کا تعلق فنا سے فنا و بقا کا ذکر پہلے بیان کر چکے ہیں۔

الغرض صوفیاء کرام جو مال و جان خرچ کرتے ہیں اور بلاؤں میں تسلیم و رضا اور عبادت میں اخلاص برتتے ہیں، وہ سب انہیں کی اقتداء میں ہے۔ درحقیقت آپ حقیقت و شریعت کے امام برحق ہیں اور آپ کی طریقت میں تربیت یا تربیت درستی میں ظاہر ہے۔

(۴) حضرت علی مرتضیٰ کرم اللہ وجہہ:

چوتھے خلیفہ راشد، اخیِ مصطفیٰ، غریق بحر بلا، حریق نار ولا، مقتدائے جملہ اولیاء و اصفیاء، سیدنا ابوالحسن رضی اللہ عنہ علی بن ابی طالب کرم اللہ وجہہ ہیں۔ طریقت میں آپ کی شان عظیم اور مقام رفیع ہے اصول حقائق کی تشریح و تعبیر میں آپ کو کمال دسترس حاصل تھی یہاں

تک کہ حضرت جنید بغدادی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ "شیخنا فی الاصول والبلاء علی المرتضیٰ" اصول و بلاء میں ہمارے رہنما و پیشوا حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ ہیں اور آپ علمِ طریقت اور اس کے معاملات میں ہمارے امام ہیں علم طریقت کو اہلِ طریقت اصول کہتے ہیں، معاملاتِ طریقت دراصل بلاؤں کا تحمل ہے۔

منقول ہے کہ کسی نے حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ سے عرض کیا اے امیر المومنین! مجھے کوئی وصیت فرمایئے۔ آپ نے فرمایا:

لا تجعل اکبر شغلك باھلك وولدك فان یکن اھلك وولدك من اولیاء اللہ تعالیٰ فان اللہ لا یضیع اولیائہ وان کانو اعداء اللہ فما ھمك وشغلك لا عداء سبحانہ.

"اپنے اہل و عیال سے انہماک تیرا سب سے مشغلہ نہ بن جائے اگر تیرے اہل وعیال اولیاء میں سے ہیں تو اللہ تعالیٰ اپنے ولیوں کو ضائع نہیں کرتا اور اگر وہ دشمنِ خدا ہیں تو اس کے دشمن سے تجھے کیا سروکار؟"

یہ مسئلہ "من دون اللہ" سے دلی انقطاع و علٰحدگی سے متعلق ہے وہ اپنے بندوں کو جیسا چاہتا ہے رکھتا ہے چنانچہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اپنی اہلیہ کو جو کہ حضرت شعیب علیہ السلام کی دختر تھیں انتہائی نازک (دردِزہ) میں چھوڑ کر تسلیم و رضائے الٰہی اختیار فرمائی اور حضرت ابراہیم علیہ السلام اپنی بی بی حضرت ہاجرہ اور اپنے فرزند حضرت اسماعیل علیہ السلام کو بے آب وگیاہ میدان میں چھوڑ کر رضائے الٰہی پر شاکر ہوگئے انہوں نے ان کو اپنا سب سے بڑا مشغلہ نہ جانا اور ہمہ تن ہو کر دل کو حق سے واصل کر لیا بالآخر انہیں دونوں جہان میں سرفرازی حاصل ہوئی۔

حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ سے ایک اور موقعہ پر کسی نے دریافت کیا کہ سب سے اچھا عمل کونسا ہے؟ آپ نے فرمایا "غناء القلب باللہ تعالیٰ" اللہ تعالیٰ کے ساتھ دل تونگر بنانا جو دل خدا کے ساتھ غنی ہوتا ہے اسے نہ تو دنیا کی نیستی پریشان کرسکتی ہے اور نہ دنیا کی ہستی خوش

کرسکتی ہے درحقیقت یہ فقر وصفوت کی طرف لطیف اشارہ ہے جس کا ذکر کیا جاچکا ہے۔

لہٰذا اہلِ طریقت کو چاہیے کہ عبادات کے حقائق، اشارات کے دقائق، دنیا و آخرت کے مال سے انقطاع اور تقدیرِ الٰہی کے نظارہ میں آپ کی اقتداء کرے۔

ائمہ طریقت از اہلِ بیتِ اطہار

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اہلِ بیت وہ حضرات ہیں کہ جن کی طہارت ازل سے مخصوص ہے ان میں کا ہر فرد طریقت میں جامع و مکمل تھا مشائخ طریقت اور صوفیاء کے ہر عام و خاص فرد کے یہ امام رہے ہیں ان میں چند حضرات کا مختصر تذکرہ کرتا ہوں:

(۱) سیدنا امام حسنِ مجتبیٰ رضی اللہ عنہ:

ائمہ اہلِ بیت اطہار میں سے جگر بند مصطفیٰ، ریحان دلِ مرتضیٰ، قرۃ العین سیدہ زہراء، ابو محمد سیدنا امام حسن بن علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہما ہیں طریقت میں آپ کی نظر کامل اور تعبیرات حقائق میں اعلیٰ درجہ کی دسترس حاصل تھی۔ یہاں تک کہ آپ نے اپنی وصیت میں فرمایا:

علیکم بحفظ السرائر فان اللہ تعالیٰ مطلع علی الضمائر

”تم اسرار ربانی کی حفاظت میں محکم رہنا کیونکہ اللہ تعالیٰ دلوں کے بھیدوں سے واقف ہے۔“

اس کی حقیقت یہ ہے کہ بندہ اسرارِ ربانی کی حفاظت ایسی ہی کرتا ہے جس طرح دلوں کے بھیدوں کو وہ دوسروں سے پوشیدہ رکھتا ہے لہٰذا حفظ اسرار یہ ہے کہ غیروں کی طرف متوجہ نہ ہو اور حفظ ضمائر یہ ہے کہ اس کے اظہار میں حیاء مانع ہو۔

علم طریقت کے حقائق و لطائف میں بلند مرتبہ کا اندازہ اس واقعہ سے لگایا جاسکتا ہے کہ جب فرقہ قدریہ کو عروج ہوا اور معتزلہ کا مذہب پھیلا تو حضرت حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت امام حسنِ مجتبیٰ رضی اللہ عنہ کی خدمت میں بدیں مضمون خط لکھا:

بسم الله الرحمٰن الرحیم o
السلام علیکم یا ابن رسول الله
وقرة عینیه ورحمة الله وبرکاته.
اما بعد فانکم معاشر بنی هاشم
کالفلك الجاریته فی بحر لجی
ومصابیح الدجیٰ راعلام الهدٰی
والائمة القادة الذین من تبعهم

نجی کسفینة نوح المشحونته
التی یؤل الیها المومنون وینجو
فیها المتمسکون فماقولك یا
ابن رسول الله صلی الله علیه
وسلم عند حیرتنا فی القدر
واختلافنا فی الا لستطاعة
لتعلمنا بما تأکد علیه رأیك
فانکم ذریته بعضها من بعض
بعلم الله علمتم وهو الشاهد
علیکم وانتم شهداء الله علی
الناس. والسلام

اللہ کے نام سے جو رحمٰن و مہربان ہے آپ پر
خدا کا سلام اور اس کی رحمت و برکت ہو اے
رسول صلی اللہ علیہ وسلم خدا کے فرزند اور ان کی
چشمانِ مبارک کی راحت، آپ گروہ بنی ہاشم
میں اس کشتی کی مانند ہیں جو گہرے و
اندھیرے سمندر میں چل رہی ہو آپ ہدایت
کے روشن چراغ اور اس کی نشانیوں میں سے
ہیں اور
آپ ان ائمہ دین کے سرخیل و قائد ہیں کہ
جس نے ان کی پیروی کی وہ اس طرح نجات
پائے گا جس طرح کشتی نوح علیہ السلام میں
سوار ہونے والے مسلمانوں نے نجات پائی
اے فرزندِ رسول آپ کا کیا ارشاد ہے جو قدر و
استطاعت (جبر و قدر) کے مسئلہ میں ہمیں
پریشانی لاحق ہے آپ ہماری رہنمائی فرماتے
ہوئے بتائیے تا کہ اس مسئلہ میں ہمیں معلوم
ہو جائے کہ آپ کی روش کیا ہے؟ کیونکہ آپ
فرزندِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔ اللہ تعالیٰ
نے آپ حضرات کو علم خصوصی سے نوازا ہے
وہ آپ سب کا محافظ ہے اور آپ تمام لوگوں
پر خدا کی طرف سے محافظ و نگہبان ہیں
والسلام

حضرت امام حسن مجتبیٰ سلام اللہ علیہ نے اس مضمون کا جواب مرحمت فرمایا:

بسم الله الرحمٰن الرحيم ٥ اما بعد فقد انتهىٰ الى كتابك عند حيرتك وحيره من زعمت من امتنا والذي عليه رائي ان من لم يؤمن بالقدر خيره وشره من الله تعالىٰ فقد كفرو من حمل المعاصي على الله فقد فجر، ان الله لا يطاع باكراه ولا يعصي

اللہ کے نام سے جو رحمٰن و رحیم ہے مکتوب تمہارا مجھے موصول ہوا جس میں تم نے اپنی اور امت کے دوسرے لوگوں کی پریشانی کا تذکرہ کیا ہے اس مسئلہ میں میری جو رائے ہے وہ یہ ہے کہ جو شخص نیک و بد اور تقدیر پر ایمان نہیں رکھتا وہ کافر ہے اور جو اپنے گناہوں کا ذمہ دار خدا کو ٹھہراتا ہے وہ بے ایمان ہے اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کو شتر بے مہار نہیں چھوڑا ہے

بغلبة ولا يهمل العباد في ملكه لكنه المالك لما يملكهم والقادر على ماعليه قدرهم فان ايتم وابالطاعة لم يكن لهم اختيار ولالهم عنها مشبعا، وان اتوا بالمعصية وشاء ان يمن عليهم فيحول بينهم وبينها فعل وان لم يفعل فليس هو عملهم عليها اجبارا ولا الزمهم اكراهاً ايا ها باحتجاجه عليهم ان عرفهم ومكنهم وجعل لهم السبيل خذوا ما دعاهم اليه

نہ وہ جبراً اطاعت کراتا ہے اور نہ جبراً گناہ لیکن بندوں کی تمام ملکیتوں اور ان کی تمام قوت و طاقت کا حقیقی مالک اللہ تعالیٰ ہے اگر بندوں کو اطاعت پر مجبور کر دیا جاتا تو ان کے لیے کوئی اختیار نہ ہوتا اور انہیں طاعت کے سوا کوئی چارہ کار نہ رہتا اور اگر بندے اس کی معصیت کریں اور خدا کی مشیت ان پر احسان کرنا چاہے تو ان کے اور ان کے گناہ کے درمیان کوئی فعل حائل کر دیتا ہے اب اگر وہ ارتکاب معاصی نہ کر سکیں تو یہ بات نہیں ہے کہ خدا نے انہیں مجبور کر دیا تھا اور نہ جبر سے وہ فعل ان پر لازم کر دیا تھا یہ ان پر دلیل د

واتر کوا ما نھم عنه و لله الحجه البالغه. والسلام

حجت کے طور پر ہے اگر انہیں اس کی معرفت ہو۔ اللہ تعالیٰ نے ان کے لیے راہِ ہدایت بنا دی ہے لہٰذا جس کے کرنے کا حکم دیا ہے اسے کرو اور جس سے بچنے کا حکم دیا ہے اس سے بچو اور اللہ ہی کے لیے حجت بالغہ ہے۔

والسلام

اس سے معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ نے بندے کو جس قدر توفیق مرحمت فرمائی ہے بندہ عمل میں اسی قدر مختار ہے ہمارا دین جبر وقدر کے درمیان ہے اگر چہ اس خط کے تمام مضمون سے ایک یہی جملہ ہمارا مقصود تھا لیکن فصاحت وبلاغتِ کلام کے اعتبار سے ہم نے پورا خط نقل کر دیا ہے اور یہ کہ تمہیں اندازہ ہو جائے کہ حضرت امام حسن رضی اللہ عنہ مجتبےٰ علم حقائق واصول میں کیسی مہارت تامہ رکھتے تھے حضرت حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ کمالِ علم وفضل کے باوجود حضرت امام حسن مجتبیٰ رضی اللہ عنہ کے علم وفضل کے مقابلے میں دسویں درجے پر تھے۔

حضرت امام حسن مجتبیٰ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے تحمل و بردباری کا اندازہ اسی واقعہ سے لگایا جاسکتا ہے کہ ایک روز حضرت امام حسن مجتبیٰ کوفہ کے دار الخلافہ کے دروازے پر تشریف فرما تھے صحرا سے ایک دیہاتی آیا اور اس نے آتے ہی آپ کو اور آپ کے والدین کو گالیاں دینا شروع کر دیں آپ نے اس سے پوچھا کیا تو بھوکا پیاسا ہے یا تجھ پر کوئی مصیبت پڑی ہے اس نے پھر کہا آپ ایسے ہیں اور آپ کے والدین ایسے ہیں حضرت امام حسن رضی اللہ عنہ نے اپنے غلام سے فرمایا طشت میں چاندی بھر کر لاؤ اور اسے دے دو پھر فرمایا اے دیہاتی ہمیں معذور سمجھنا گھر میں اس کے سوا کچھ اور نہ تھا ورنہ اس کے دینے سے انکار نہ ہوتا جب دیہاتی نے آپ کا یہ صبر وتحمل دیکھا تو کہنے لگا میں گواہی دیتا ہوں کہ یقیناً آپ فرزندِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ تمام مشائخ واولیاء کی یہ صفت آپ کے اتباع میں ہے کیونکہ ان

کے نزدیک بھی لوگوں کا برا بھلا کہنا برابر ہے اور ان کے ظلم وستم اور سب وشتم سے وہ کوئی اثر نہیں لیتے۔

(۲) حضرت امام حسین گلگلوں قبا رضی اللہ عنہ:

ائمہ اہل بیت اطہار میں سے شمعِ آل محمد صلی اللہ علیہ وسلم، تمام دنیاوی علائق سے پاک وصاف اپنے زمانہ کے امام وسردار، ابوعبداللہ سیدنا امام حسین بن علی مرتضٰی رضی اللہ عنہما ہیں آپ اہل ابتلا کے قبلہ ورہنما اور شہید دشتِ کرب وبلا ہیں اور تمام اہلِ طریقت آپ کے حال کی درستگی پر متفق ہیں اس لیے کہ جب تک حق ظاہر وغالب رہا آپ حق کے فرمانبردار رہے اور جب حق مغلوب ومفقود ہوا تو تلوار کھینچ کر میدان میں نکل آئے اور جب تک راہِ خدا میں اپنی جان عزیز قربان نہ کردی چین وآرام نہ لیا آپ میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی بیشتر نشانیاں تھیں جن سے آپ مخصوص ومزین تھے چنانچہ سیدنا عمر فاروق رضی اللہ عنہ بیان فرماتے ہیں کہ میں ایک روز حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی بارگاہ میں حاضر ہوا تو دیکھا کہ امام حسین رضی اللہ تعالٰی عنہما کو آپ نے اپنی پشت مبارک پر سوار کر رکھا ہے ڈوری کا ایک حصہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے ہاتھ میں لے رکھا اور دوسرا حصہ امام حسین رضی اللہ تعالٰی عنہ کے ہاتھ میں ہے امام حسین رضی اللہ عنہ آپ کو چلاتے ہیں اور حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم زانو کے ذریعہ چلتے رہے میں نے جب یہ حال دیکھا تو کہا **"نعم الجمل جملك يا ابا عبدالله"** اے ابوعبداللہ کتنی اچھی سواری ہے آپ کی حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے آپ سے فرمایا **"نعم الراكب"** یا عمر! یہ سوار بھی تو کتنا عمدہ ہے۔

سیدنا امام حسین رضی اللہ عنہ سے طریقت میں بکثرت کلامِ لطیف اور اس کے رموز ومعاملات منقول ہیں چنانچہ آپ نے فرمایا **"اشفق الاخوان عليك دينك"** تمہارے لیے سب سے زیادہ رفیق ومہربان تمہارا دین ہے اس لیے کہ بندے کی نجات دین کی پیروی میں ہے اور اس کی ہلاکت، اس کی مخالفت میں ہے صاحبِ عقل وخرد وہی شخص ہے جو مہربان کے حکم کی پیروی کرے، اور اس کی شفقت کو ملحوظ رکھے اور کسی حالت میں اس کی متابعت سے روگردانی

نہ کرے برادر مشفق وہی ہوتا ہے جو اس کی خیر خواہی کرے اور شفقت و مہربانی کا دروازہ اس پر بند نہ کرے۔

ایک روز ایک شخص نے حاضر ہو کر آپ سے عرض کیا کہ اے فرزندِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم! میں ایک مفلس و نادار شخص ہوں میں صاحبِ اہل و عیال ہوں مجھے اپنے پاس سے رات کے کھانے میں سے کچھ عنایت فرمایئے حضرت امام حسین رضی اللہ عنہ نے فرمایا بیٹھ جاؤ میرا رزق ابھی راہ میں ہے کچھ دیر بعد حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کے پاس سے دیناروں کی پانچ تھیلیاں آئیں ہر تھیلی میں ایک ہزار دینار تھے لانے والوں نے عرض کیا کہ حضرت امیر معاویہ معذرت خواہ ہیں اور عرض کرتے ہیں کہ فی الحال ان کو اپنے خدام پر خرچ فرمائیں مزید پھر حاضر کیے جائیں گے حضرت امام حسین رضی اللہ عنہ نے اس نادار و مفلس شخص کی طرف اشارہ فرمایا اور پانچوں تھیلیاں اسے عنایت کرتے ہوئے معذرت کی کہ تمہیں بہت دیر انتظار کرنا پڑا صرف اتنا ہی کمتر عطیہ تھا اگر میں جانتا کہ اتنی قلیل مقدار ہے تو تمہیں انتظار کی زحمت نہ دیتا مجھے معذور سمجھنا ہم تو اہلِ ابتلاء سے تعلق رکھتے ہیں ہم نے تو تمام دنیاوی ضرورتوں کو چھوڑ کر اپنی راحتوں کو فنا کر دیا ہے دوسروں کی بھلائی کے لیے آپ کے فضائل و مناقب اس قدر مشہور ہیں کہ کوئی امتی اس سے بے خبر نہیں ہے۔

(۴) حضرت سجاد زین العابدین رضی اللہ عنہ:

ائمہ اہل بیت اطہار میں سے وارثِ نبوت، چراغ امت، سیدِ مظلوم، زین العباد، شمعِ اوتاد، سیدنا ابوالحسن علی المعروف بہ زین العابدین بن امام حسین رضی اللہ عنہما ہیں آپ اپنے زمانہ کے سب سے بڑے زاہد و عبادت گزار اور کشف و حقائق و نطق دقائق میں مشہور ہیں کسی نے آپ سے دریافت کیا دنیا و آخرت میں سب سے زیادہ نیک بخت و سعید کون شخص ہے۔ آپ نے فرمایا "من اذا رضی لم یحمله رضاه علی الباطل واذا سخط لم یخرجه سخطه من الحق" وہ شخص جب راضی ہو تو اس کی رضا اسے باطل پر آمادہ نہ کرے اور جب ناراض ہو تو اس کی ناراضگی اسے حق سے نہ بھٹکنے دے یہ وصف، راست رو لوگوں کے اوصاف

کمال میں سے ہے اس لیے کہ باطل سے راضی ہونا بھی باطل ہے اور غصہ کی حالت میں حق کو ہاتھ سے چھوڑنا بھی باطل ہے مومن کی یہ شان نہیں ہے کہ وہ اپنے آپ کو باطل میں مبتلا کرے۔

آپ کے بارے میں منقول۔ ہے کہ میدانِ کربلا میں جب حضرت امام حسین رضی اللہ عنہ کو اپنے اہل وعیال اور رفقاء سمیت شہید کر دیا گیا اور حضرت زین العابدین کے سوا مستورات حرم کا محافظ ونگہبان کوئی نہ بچا آپ اس وقت بیمار وعلیل تھے چنانچہ اہلِ بیت اطہار کو اونٹوں کی ننگی پشت پر سوار کر کے دمشق لے جایا گیا۔ یزید بن امیر معاویہ (علیہ مایستحقہ اخزاہ اللہ دون ابیہ) کے دربار میں کسی نے آپ سے پوچھا "کیف اصبحت یا علی ویا اھل بیت الرحمۃ" اے علی رضی اللہ عنہ اے رحمت کے گھر والو، کس حال میں ہو؟ "قال اصبحنا من قومنا بمنزلۃ قوم موسیٰ من اٰلِ فرعون. یذبحون ابناء ھم ویستحیون نسآء ھم فلا ندری صبا حنا من مساء نامن حقیقۃ بلاء نا" آپ نے فرمایا ہماری حالت اپنی قوم کے ہاتھوں ایسی ہے جیسے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی قوم کی حالت فرعونیوں کے ہاتھوں ہوئی تھی کہ وہ ان کے فرزندوں کو قتل کرتے اور ان کی عورتوں کو چھوڑ دیتے تھے لہٰذا ہم نہیں جانتے کہ اس امتحان گاہ میں ہمارے صبح، ہماری شام کے مقابلہ میں کیا حقیقت رکھے گی ہم خدا کی نعمتوں پر شکر بجالاتے ہیں اور اس کی ڈالی ہوئی مصیبتوں پر صبر کرتے ہیں۔

حکایت:

ایک سال ہشام بن عبدالملک بن مروان حج کے لیے آیا طواف کعبہ کر رہا تھا اور چاہتا تھا کہ حجر اسود کو بوسہ دے لیکن اژدحام میں وہاں تک پہنچنے کی راہ نہ ملتی تھی جب وہ منبر پر خطبہ دینے کھڑا ہوا تو حضرت زین العابدین رضی اللہ عنہ مسجد حرام میں اس جاہ وجلال سے داخل ہوئے کہ آپ کا چہرہ درخشاں رخسار مبارک تاباں اور لباس مبارک معطر تھا جب آپ طواف کرتے ہوئے حجر اسود کے قریب پہنچے تو آپ کے احترام وتعظیم میں حجرِ اسود کے گرد سے تمام لوگ ہٹ کر کھڑے ہو گئے تا کہ آپ حجرِ اسود کو بوسہ دے سکیں شامیوں نے جب آپ کی یہ شان وشوکت دیکھی تو وہ ہشام سے کہنے لگے اے امیر المومنین! لوگوں نے تمہیں حجر اسود کو بوسہ

دینے کی راہ نہیں دی باوجود یہ کہ تم امیر المومنین تھے لیکن یہ خوبرو نوجوان کے آتے ہی سب لوگ حجرِ اسود کے پاس سے ہٹ گئے اور انہیں راستہ دے دیا ہشام نے از راہ تجاہل عارفانہ کہا میں نہیں جانتا کہ یہ شخص کون ہے؟ اس انکار کا مقصد یہ تھا کہ شامی لوگ انہیں پہچان نہ سکیں اور کہیں ان کی پیروی اختیار نہ کرلیں جس سے اس کی امارت خطرے میں پڑ جائے فرزوق شاعر اس وقت وہیں کھڑا تھا اس اہانت سے اس کی غیرت ایمانی جوش میں آئی اور بیانگِ دہل کہنے لگا میں انہیں خوب جانتا ہوں شامیوں نے پوچھا اے ابوفراش! بتاؤ یہ کون ہے؟ اس سے بڑھ کر پروقار اور دبدبہ والا نوجوان ہم نے نہیں دیکھا فرزوق شاعر نے کہا کہ کان کھول کر سن لو میں ان کے اوصاف بتاتا ہوں اور ان کے نسبت کو بیان کرتا ہوں اس کے بعد فی البدیہہ یہ قصیدہ موزوں کر کے پڑھا۔

قصیدہ مدحیہ درشان امام زین العابدین رضی اللہ عنہ

هٰذَا الَّذِیْ تَعْرِفُ الْبَطْحَا وَ طَأْتَهٗ — وَالْبَیْتُ یَعْرِفُهٗ وَالْحِلُّ وَالْحَرَمُ

یہ وہ شخص ہے جس کے نشان قدم کو اہلِ حرم پہچانتے ہیں

خانہ کعبہ اور حلِ وحرم سب اسے جانتے ہیں

هٰذَا ابْنُ خَیْرِ الْعِبَادِ کُلِّهِمْ — هٰذَا التَّقِیُّ النَّقِیُّ الطَّاهِرُ الْعَلَمُ

یہ خدا کے بندوں میں سے بہترین بندے کا فرزند ہے

سب سے زیادہ متقی، پاک وصاف اور بے داغ نشان والا ہے۔

هٰذَا ابْنُ فاطمة الزهرا ان کنت جاهلهٗ — بجده انبیاء الله قد ختم

اگر تو نہیں جانتا تو سن یہ فاطمہ زہرا کے جگر گوشہ ہیں

ان کے نانا پر اللہ نے نبیوں کا سلسلہ ختم فرمایا ہے

یبین نور الدجیٰ عن نور طلعته — کالشمس ینجاب عن اشراقها الظُّلَم

ان کی منور پیشانی سے نور ہدایت اس طرح جلوہ فگن ہے

جیسے آفتاب کی روشنی سے تاریکیاں چھٹ جاتی ہیں

یغضی حیاء ویغضی مہابتہ فما یکلم الا حین یتبسم

یہ اپنی آنکھیں حیاء سے نیچی رکھیں اور لوگ ہیبت سے ان کی طرف

آنکھیں اونچی نہیں کر سکتے

اور جب بات کریں تو منہ سے پھول جھڑیں----------

اذا رأتہ قریش قال قائلہا الی مکارم ھذا اینتھی الکرم

جب کوئی قریش انہیں دیکھتا ہے تو وہ بول اٹھتا ہے

کہ ان پر تمام خوبیاں تمام ہو چکی ہیں-------

ینمی الیٰ ذروۃ العزالتی قصرت عن نیلہا عرب الاسلام والعجم

یہ عزت ومنزلت کی ایسی بلندی پر فائز ہیں

کہ عرب وعجم کا کوئی مسلمان ان سے ہمسری نہیں کر سکتا

من جدہ دان فضل الانبیاء لہ وفضل امتہ وانت لہ الامم

ان کے نانا تمام نبیوں سے افضل اور ان کی امت تمام

امتوں سے افضل ہے اور تو بھی ان کی امت کا ایک فرد ہے

یکاد یمسکہ عرفان راحتہ رکن الحطیم اذا ملجاء یستلم

جب حجر اسود کو بوسہ دینے قریب ہوں تو ممکن ہے وہ ان کی

انگلیوں کی راحت پہچان کر انہیں تھام لے

فی کفہ خیز ران ریحہ عبق من کفہ اروع فی عرنینہ شمم

ان کے دستِ مبارک میں چھڑی ہے جس کی خوشبو دلنواز ہے

ان کی ہتھیلی کی خوشبو ہر طرف پھیل رہی ہے

سہل الخلیقۃ لا یخفیٰ برادرہ یزینہ اثنان حسن الخلق والشیم

یہ نرم خو ہیں خفگی وغصہ کا ان سے کوئی اندیشہ نہیں

یہ اپنی دو خوبیوں سے یعنی حسن اخلاق اور پاکیزہ خصلت سے آراستہ ہیں

مشتقة عن رسول الله بنعته طابت عناصره والخیم والشیم

ان کے اوصاف حمیدہ اللہ کے رسول سے ماخوذ ہیں۔
ان کے عناصر اور ان کی خوبو پاکیزہ ہے

فلیس قولك من هذا بضائره العرب تعرف من انکرت والعجم

اے ہشام! تیرا انکار کرنا انہیں کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتا
انہیں تو عرب وعجم سب پہچانتے ہیں-------

کلتا یدیه غیاث عم نفعهما تستو کفان ولا یعروهما العدم

ان کے دونوں ہاتھ ایسے ہیں جن کا فیض بارش کی مانند عام ہے
ان کی بخشش ہر وقت جاری ہے حتیٰ کہ تنگدستی میں بھی ختم نہیں ہوتی

عم البریته بالاحسان فَانْقَشَعَتْ عنها الغیابة والا ملاق والظلم

خدا کی تمام مخلوق پر ان کا احسان عام ہے
جس سے گمراہی، تنگدستی اور ظلم وزیادتی پراگندہ ہو کر رہ گئے ہیں

لا یستطیع جواد بعد غایتهم ولا یدانیهم قوم وان کرم

کسی سخی کی سخاوت ان کی بخشش کی حد تک نہیں پہنچ سکتی
اور کوئی قوم ان کے برابر نہیں پہنچ سکتی اگر چہ شمار میں کتنی ہی زیادہ کیوں نہ ہو

هم الغیوث اذا ما ازمة ازمت والا سد اسد الشریٰ والناس مختلم

یہ حضرات قحط سالی کے زمانہ میں بارش کی مانند سیراب کرتے ہیں
یہ شیر ببر ہیں جب کہ لوگ جنگ کی بھٹی میں جل رہے ہیں

من معشر جبهم دین وبغضهم کفرٌ وقربهم منجا ومعتصم

یہ اس گروہ سے ہیں جن سے محبت کرنا دین اور ان سے بغض رکھنا
کفر اور ان سے وابستہ رہنا نجات اور پناہ دینے والا ہے

ان عدَّ اھل التقیٰ کانوا ائمتھم　　　وقیل من خیر اھل الارض قیل ھم

اگر تمام اہل تقویٰ کو جمع کیا جائے تو یہ ان سب کے امام ہوں گے

اگر اہل زمین سے اچھے لوگوں کے بارے میں پوچھا جائے تو سب کہیں گے کہ یہی ہیں

سَیَّانِ ذَالِکَ اِنْ اَثْرُوْا وَاِنْ عَدَمُوْا　　　لَا یَنْقُضُ الْعُسْرُ بَسْطًامِنْ اَکُفِّھِمْ

ان کے لیے تونگری و مفلسی دونوں برابر ہیں

تنگدستی ان کے ہاتھوں کی فراخی کو کم نہیں کرتی

اَللہُ فَضَّلَہٗ کَرَمًا وَشَرَّفَہٗ　　　جَرٰی بِذَالِکَ لَہٗ فِی اللَّوْحِ وَالْقَلَمِ

اللہ نے انہیں فضیلت دی اور ان کو شرافت و بزرگی سے نوازا

اور لوح و قلم میں ان کے لیے یہی حکم نافذ ہو چکا ہے

مُقَدَّمٌ بَعْدَ ذِکْرِ اللہِ ذِکْرُھُمْ　　　فِیْ کُلِّ بَدْوٍ مَخْتُوْمٌ بِہِ الْکَلِمِ

ان کا ذکر، ذکرِ خدا کے بعد مقدم ہے

ہر میدان میں ان کے کلمات ثبت ہیں

اَیُّ الْقَبَائِلِ لَیْسَتْ فِیْ رِقَابِھِمْ　　　لِاَوَّلِیَّۃِ ھٰذَا اَوْلَہٗ نِعَمٌ

وہ کونسا قبیلہ ہے جن کی گردنوں پر ان کا اور ان کے

آباؤ اجداد کے احسان کا بوجھ نہیں ہے

مَنْ یَعْرِفِ اللہَ یَعْرِفْ اَوَّلِیَّتَہٗ　　　وَالدِّیْنُ مِنْ بَیْتِ ھٰذَا نَالَہُ الْاُمَمُ

جسے خدا کی معرفت ہے وہ ان کی برتری کو پہچانتا ہے

چونکہ ان کے گھر سے دین ساری امت کو پہنچا ہے

فرزوق شاعر نے حضرت زین العابدین رضی اللہ عنہ کی منقبت میں اشعار کہنے کے علاوہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور اہلِ بیت اطہار کی تعریف و توصیف میں اور بھی اشعار کہے ہیں جس پر ہشام بہت برافروختہ ہوا اور فرزوق کو گرفتار کر کے عسفان کے جیل خانہ میں قید کر دیا جو کہ مکہ مکرمہ اور مدینہ منورہ کے درمیان واقع ہے۔ (ہشام کی یہ پہلی جرأت ہے کہ بلاثبوت و

مقدمہ کسی کو قید کیا حالانکہ اسلام میں اس کا کہیں جواز نہیں ہے۔ مترجم) حضرت امام کو جب اس واقعہ کی اطلاع ملی تو فرزدق کی جرأت ایمان کی تحسین فرمائی اور دلجمعی کے لیے بارہ ہزار درہم و دینار اس پیغام کے ساتھ بھجوائے کہ ہمیں معذور سمجھنا اگر اس سے زیادہ ہمارے پاس ہوتے تو اس میں بھی دریغ نہ کرتے فرزدق نے وہ مال واپس کرتے ہوئے عرض کیا کہ اے فرزندِ رسول! میں نے بادشاہوں اور امیروں کی شان میں بکثرت قصیدے کہے ہیں اگر ان کے کفارہ میں کچھ اشعار فرزندانِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت میں عرض کر دیے تو کیا کمال کیا ہے؟ میں نے اپنی ایمانی غیرت کا ثبوت دیا ہے کسی مال و منال کی طمع میں نہیں کہا ہے اس کا اجر خدا سے ہی چاہتا ہوں اور خدا کے رسول کی اہل بیت سے محبت و دوستی کا طلبگار ہوں۔ حضرت امام رضی اللہ عنہ کو جب یہ پیغام پہنچا تو آپ نے وہ رقم واپس کر کے کہلوایا کہ اے ابوالفراش! اگر تم ہم سے محبت رکھتے ہو تو جو ہم نے بھیجا ہے اس کو قبول کر لو کیونکہ ہم نے رضائے الٰہی کے لیے اپنی ملک سے نکال کر تمہاری ملک میں دے دیا ہے اس وقت فرزدق شاعر نے وہ عطیہ لے لیا اور احسان مندی کا اظہار کیا حضرت امام زین العابدین رضی اللہ عنہ کی تعریف و توصیف اس سے کہیں زیادہ ہے جتنی کی جائے کم ہے۔

(۴) حضرت امام ابو جعفر محمد باقر صادق رضی اللہ عنہ:

ائمہ اہل بیت اطہار میں سے، طریقت میں دلیل و حجت، اربابِ مشاہدہ کے برہان امام اولاد نبی صلی اللہ علیہ وسلم، برگزیدہ نسل علی، سیدنا امام ابو جعفر صادق بن علی بن حسین بن علی مرتضٰی الملقب بہ الامام باقر رضی اللہ عنہم ہیں۔ بعض کہتے ہیں کہ آپ کی کنیت ابوعبداللہ تھی، علوم کی باریکیوں اور کتابِ الٰہی کے رموز و اشارات اور اس کے لطائف واضح طور پر بیان کرنے میں آپ کو کمالِ دسترس تھی آپ کی کرامتیں اور روشن دلائل اور دلائل قاطعہ زبان زد خاص و عام ہیں بادشاہِ وقت نے آپ کو شہید کرنے کے ارادے سے کسی کے ذریعہ بلوایا۔ جب اس کے قریب پہنچے تو وہ معذرت کرنے لگا اور تحائف پیش کر کے عزت و احترام کے ساتھ واپس کیا درباریوں نے حیرت و تعجب سے پوچھا آپ نے تو انہیں شہید کرنے کے لیے بلایا تھا لیکن

سلوک اس کے برعکس کیا؟ بادشاہ نے جواب دیا جب وہ میری قریب آئے تو میں نے دو شیروں کو ان کے داہنے اور بائیں کھڑے دیکھا اور وہ زبانِ حال سے گویا تھے کہ اگر تو نے امام کے ساتھ بدسلوکی کی تو ہم تجھے مار ڈالیں گے منقول ہے کہ آپ نے آیۂ کریمہ "فَمَنْ يَّكْفُرْ بِالطَّاغُوْتِ وَيُؤْمِنْ بِاللّٰهِ" (جس نے طاغوت کا انکار کیا اور اللہ پر ایمان رکھا) کی تفسیر میں فرمایا" من شغلك عن مطالعة الحق فهو طاغوتك" جو تجھے حق تعالیٰ کے مطالعہ سے غافل کرے وہی تیرا طاغوت ہے۔

تو اے طالب حق! اب تمہیں یہ دیکھنا چاہیے کہ کون سی چیز حجاب بنی رہی ہے جو معرفت الٰہی میں مانع ہے اور یادِ خدا۔ سے تمہیں غافل بنا رہی ہے اسے ترک کر دو تا کہ مکاشفہ ربانی حاصل ہو اور کوئی حجاب و مانع درمیان میں حائل نہ رہے کیونکہ کسی ممنوع و محجوب شخص کو زیب نہیں دیتا کہ وہ قرب کا دعویٰ کرے۔ آپ کے ایک خادم خاص بیان کرتے ہیں کہ جب رات کا ایک پہر گزر جاتا ہے اور آپ درود و وظائف سے فارغ ہو جاتے ہیں تو بلند آواز سے مناجات کرتے ہیں اور کہتے ہیں" اے میرے خدا، اے میرے مالک! رات آ گئی ہے اب بادشاہوں کا تصرف و اختیار ختم ہو چکا ہے آسمان پر ستارے جھلملانے لگے ہیں خلقت گھروں میں جا چکی ہے اور لوگ سو چکے ہیں، آوازیں سکوت میں ڈوب چکی ہیں خلقت لوگوں کے دروازوں سے ہٹ چکی ہے، بنوامیہ بھی محوِ خواب و خور ہیں انہوں نے اپنے خزانوں کو مقفل کر کے پہرے دار کھڑے کر دیے ہیں جو لوگ ان سے طمع و لالچ رکھتے تھے وہ بھی ان سے دور ہو چکے ہیں اے خدا تو زندہ و پائندہ اور دیکھنے اور جاننے والا ہے تیرے لیے خواب بیداری برابر ہے جو تجھے ایسا نہ جانے وہ کسی نعمت کا مستحق نہیں ہے۔ اے خداوند کریم! تجھ کو کوئی چیز کسی چیز سے روک نہیں سکتی اور رات و دن تیری بقا میں اثر انداز نہیں ہوتے تیری رحمت کے دروازے ہر دعا کرنے والے کے لیے کھلے ہوئے ہیں اور تیرے خزانے تیری حمد و ثنا کرنے والوں کے لیے وقف ہیں تو ایسا مالک حقیقی ہے کہ کسی سائل کو محروم رکھنا تیری شایانِ شان نہیں ہے تو ہر مومن کی دعا قبول فرماتا ہے کسی کی دعا رد نہیں کرتا اور زمین و آسمان میں کسی سائل کو محروم نہیں رکھتا

اے میرے خدا! جب موت، قبر، حساب اور حشر کو یاد کرتا ہوں تو دنیا میں یہ دل کسی طرح چین و قرار نہیں پاتا لہٰذا جو بھی حاجت مجھے لاحق ہوتی ہے میں تجھی سے عرض کرتا ہوں اور تجھی کو فریاد رس جان کر تجھی سے مانگتا ہوں اب میری عرض یہ ہے کہ بوقت موت، عذاب سے محفوظ رکھنا اور بوقت حساب، بے عتاب راحت عطا فرمانا، آپ کا معمول تھا کہ اس دعا میں تمام رات گزار دیتے اور برابر آہ وفغان میں مشغول رہا کرتے تھے ایک رات میں نے عرض کیا اے میرے اور میرے ماں باپ کے آقا! یہ گریہ زاری کا اور سینہ فگاری کا سلسلہ کب تک جاری رہے گا؟ آپ نے فرمایا اے دوست! حضرت یعقوب علیہ السلام کے ایک فرزند حضرت یوسف علیہ السلام نظروں سے روپوش ہوئے تھے اس پر وہ اتنا روئے تھے کہ ان کی آنکھوں کی بصارت جاتی رہی تھی۔ اور آنکھیں سفید ہوگئی تھیں لیکن میرے اب وجد کے خاندان کے ۱۸ نفوس حضرت امام حسین رضی اللہ عنہ کی رفاقت میں میدان کربلا کے اندر گم ہوئے ہیں یہ غم کیا اس سے کچھ کم ہے میں ان کے غم وفراق میں اپنے رب کے حضور فریاد کر کے کیوں آنکھیں سفید نہ کروں۔

یہ مناجات عربی میں بہت فصیح ہے طوالت کے لحاظ سے صرف ترجمہ پر اکتفا کیا گیا ہے۔

(۵) امام جعفر بن محمد صادق رضی اللہ عنہما:

ائمہ اہلِ بیت اطہار میں سے، یوسفِ سنت، جمالِ طریقت، معبر معرفت، مزین صفوت سیدنا ابو محمد امام جعفر بن محمد صادق الملقب بہ امام باقر بن علی بن حسین بن علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہم اجمعین ہیں۔

آپ کا حال بلند، سیرت پاکیزہ، ظاہر و باطن آراستہ و پیراستہ اور شمائل وخصائل شستہ و منور تھے آپ کے اشارات تمام علوم میں خوبی اور رقتِ کلام کی بنا پر مشہور ہیں اور مشائخ طریقت میں باعتبار لطائف و معانی معروف ہیں جن سے کتابیں بھری پڑی ہیں آپ کا ارشاد ہے کہ "من عرف اللہ اعرض عما سواہ" جسے اللہ کی معرفت حاصل ہوگئی وہ ماسوا اللہ سے کنارہ کش ہوگیا اس لیے کہ جو شخص خدا سے واصل ہوجاتا ہے اس کے دل میں کسی غیر کی کوئی

قدر و منزلت نہیں رہتی۔

دراصل خدا کی معرفت اس کے غیر سے دستکش ہونے ہی کا نام ہے اور اسی علیٰحدگی سے ہی معرفت الٰہی واصل ہوتی ہے۔ جب تک غیر اللہ سے لگاؤ اور تعلق رہے گا معرفت الٰہی سے وہ محروم ہی رہے گا۔ چنانچہ عارف باللہ، مخلوق اور اس کی فکر سے بے نیاز ہوتا ہے اور اس کا دل ماسوٰی اللہ سے جدا ہو کر خدا کے ساتھ واصل ہو جاتا ہے اس کے دل میں مخلوق کی کوئی قدر و منزلت نہیں رہتی نہ وہ کسی حال میں ان کی طرف التفات کرتا ہے اور نہ ان سے کوئی علاقہ رکھتا ہے۔

آپ کا یہ بھی ارشاد ہے کہ **"لا تصح العبادة الا بالتوبته لان الله تعالیٰ قدم التوبته علی العبادة قال الله تعالیٰ التائبون العابدون" الآیه** توبہ کے بغیر عبادت صحیح نہیں ہوتی اس لیے کہ اللہ تعالیٰ نے توبہ کو عبادت پر مقدم فرمایا چنانچہ فرماتا ہے توبہ کرنے والے ہی عبادت کرنے والے ہوتے ہیں کیونکہ توبہ مقامات کی ابتداء اور عبودیت اس کی انتہا ہے اللہ تعالیٰ نے جب گناہ گار بندوں کا ذکر فرمایا تو توبہ کے حکم سے یاد کیا چنانچہ فرمایا:

تُوْبُوْآ اِلَى اللّٰهِ جَمِيْعاً اَيُّهَا الْمُؤْمِنُوْنَ (النور:۳۱)

''خدا کی بارگاہ میں تمام گناہوں سے توبہ کرو اے مسلمانو!''

لیکن اللہ تعالیٰ نے جب اپنے حبیب سید عالم صلی اللہ علیہ وسلم کو یاد فرمایا تو عبودیت و بندگی سے یاد کیا چنانچہ فرمایا:

فَاَوْحٰى اِلٰى عَبْدِهٖ مَآ اَوْحٰى (النجم:۱۰)

''ہم نے اپنے بندہ خاص پر جو وحی چاہی نازل فرمائی۔''

حکایت:

ایک مرتبہ حضرت داؤد طائی رحمۃ اللہ علیہ آپ کی خدمت میں آئے اور عرض کیا کہ اے فرزندِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم! مجھے کوئی نصیحت فرمائیے؟ میرا دل سیاہ ہو گیا ہے۔ آپ نے فرمایا اے ابا سلیمان! تم تو اپنے زمانہ کے مشہور عابد و زاہد ہو تمہیں میری نصیحت کی حاجت ہی

کیا؟ انہوں نے عرض کیا اے فرزند رسول! آپ کو ساری مخلوق پر فضیلت حاصل ہے اور آپ پر سب کی نصیحت فرمانا واجب ہے آپ نے فرمایا اے ابا سلیمان! میں ہمیشہ اس بات سے خائف رہتا ہوں کہ کل روز قیامت میرے جد کریم علیہ التحیۃ والتسلیم اس پر میری گرفت نہ فرمائیں کہ تم نے کیوں میری اتباع کا حق ادا نہ کیا کیونکہ اتباع نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کا تعلق نہ نسب صحیح سے ہے اور نہ نسبتِ قوی سے بلکہ پیروی کرنے سے ہی متعلق ہے یہ سن کر حضرت داؤد طائی رحمۃ اللہ رو کر عرض کرنے لگے خداوندا! جس شخص کا خمیر ہی نبوت کی خاک سے ہے اور جس کی طبع نشو ونما اپنے جدِ کریم علیہ السلام کے برہان و حجت کے اصول سے ہے اور جس کی مادر معظمہ بتول الزہرا ہیں جن کا نام نامی سیدہ فاطمہ رضی اللہ عنہا ہے وہی جب بذات خود اس حیرانی و پریشانی میں ہیں تو داؤد کس گنتی وشمار میں ہے وہ زہد وورع پر کیسے بھروسہ کرسکتا ہے۔

حکایت:

ایک دن آپ اپنے غلاموں کے ساتھ تشریف فرما تھے آپ نے ان سے فرمایا! آؤ ہم سب مل کر عہد و پیان کریں کہ ہم میں سے جو بھی بخشا جائے وہ روزِ قیامت دوسرے کی شفاعت کرے تمام غلام عرض کرنے لگے اے فرزندِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم! آپ کو ہماری شفاعت کی کیا حاجت ہے؟ آپ کے جد کریم علیہ السلام تو خود ساری مخلوق کے شفیع ہوں گے آپ نے فرمایا! میں اپنے رب تعالیٰ پر شرمسار ہوں اور روز قیامت اپنے جد کریم علیہ السلام کے روبرو کھڑے ہونے کی طاقت نہیں رکھتا۔

آپ کی یہ کیفیت اپنے نفس کی عیب گیری پر مبنی تھی کیونکہ یہ صفت اوصافِ کمال سے متعلق ہے اور اسی صفت پر خدا کے تمام مقبول بندے ہیں خواہ وہ انبیاء و مرسلین ہوں یا اولیاء و اصفیاء کیونکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے!

اِذَا اَرَادَ اللّٰهُ بِعَبْدِهٖ خَيْرًا اَبْصَرَهٗ بِعُيُوْبِ نَفْسِهٖ

اللہ تعالیٰ جب اپنے کسی بندے پر بھلائی کا ارادہ فرماتا ہے تو اس کو اس کے نفس کے عیوب دکھا دیتا ہے۔

جو بندہ بارگاہِ صمدیت میں تواضع و بندگی سے سر جھکاتا ہے اللہ تعالیٰ اسے دونوں جہان میں سربلند رکھتا ہے اگر ہم تمام اہلِ بیت اطہار کا اسی طرح تذکرہ کریں اور ان کے فضائل ومناقب شمار کرائیں تو یہ کتاب اس کی متحمل نہیں ہو سکتی لہٰذا اسی پر اکتفا کیا جاتا ہے۔

اصحابِ صفہ

خلفائے راشدین اور چند ائمہ اہلِ بیت اطہار کے بعد دربارِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کے اصحابِ صفہ کا تذکرہ اختصاراً کرتا ہوں اگرچہ اس سے قبل کی تصنیف "منہاج الدین" میں نام بنام تفصیل کے ساتھ بیان کر چکا ہوں اس جگہ ان کے اسماء وکنیت اور مختصر حال بیان کرتا ہوں تا کہ مقصد برآری میں معاون ثابت ہو۔ وباللہ التوفیق۔

واضح رہنا چاہیے کہ امتِ مسلمہ کا اس پر اجماع ہے کہ حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ کرام کی ایک جماعت مسجدِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم میں ہمہ وقت مصروفِ عبادت رہتی تھی اور انہوں نے کسبِ معاش سے کنارہ کشی اختیار کر رکھی تھی۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو ان کی طرف خصوصی توجہ فرمانے کا حکم دیا۔ چنانچہ ارشاد ہے!

وَلَا تَطْرُدِ الَّذِیْنَ یَدْعُوْنَ رَبَّھُمْ بِالْغَدٰوةِ وَالْعَشِیِّ یُرِیْدُوْنَ وَجْھَهٗ (الانعام:۵۲)

"جو لوگ دن رات اپنے رب کی عبادت کرتے اور اس کی رضا چاہتے ہیں
آپ ان پر توجہ خاص مبذول فرمائیں۔"

اصحابِ صفہ کے فضائل ومناقب میں بکثرت آیاتِ قرآنی اور احادیث نبوی صلی اللہ علیہ وسلم ناطق وشاہد ہیں ان میں سے چند باتوں کا اس جگہ ذکر کرتا ہوں۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ ایک دن رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم کا گزر اصحابِ صفہ کی طرف ہوا اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ملاحظہ فرمایا کہ وہ فقر ومجاہدے کے باوجود خوش وخرم ہیں آپ نے ان سے فرمایا اے اصحابِ صفہ! تم کو اور میری امت کے ہر اس شخص کو جو تمہاری صفت پر خوش دلی سے قائم ہو بشارت دی گئی ہے کہ تم جنت میں میرے رفقا

ہو گے۔

(۱) ان اصحابِ صفہ میں سے ایک صحابی حضرت بلال بن رباح رضی اللہ عنہ ہیں جو بارگاہِ جبروت کے منادی یعنی مؤذن اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پسندیدہ تھے۔

(۲) دوسرے صحابی حضرت ابوعبداللہ سلمان فارسی رضی اللہ عنہ ہیں جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے محبوب اور محرمِ اسرار تھے۔

(۳) تیسرے صحابی حضرت ابوعبیدہ عامر بن عبداللہ بن جراح رضی اللہ عنہ ہیں جو مہاجر و انصار کے جرنیل تھے اور رضائے الٰہی کے ہر وقت طالب تھے۔

(۴) چوتھے صحابی حضرت ابوالیقظان عمارہ بن یاسر رضی اللہ عنہ ہیں جو برگزیدہ اور محبوبانِ خدا کی زینت تھے۔

(۵) پانچویں صحابی حضرت ابومسعود عبداللہ بن مسعود ہزلی رضی اللہ عنہما ہیں جو علم و حلم کے مخزن ہیں۔

(۶) چھٹے صحابی حضرت عتبہ بن مسعود برادر حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہما ہیں جو پاک طینت اور درگاہ حرمت کے متمسک تھے۔

(۷) ساتویں صحابی حضرت مقداد بن الاسود رضی اللہ عنہ ہیں جو گوشۂ تنہائی کی راہ کے سالک اور ہر عیب و ذلت سے کنارہ کشی کرنے والے تھے۔

(۸) آٹھویں صحابی حضرت خباب ابن الارت رضی اللہ عنہ ہیں جو مقام تقویٰ کی دعوت دینے والے اور بلاؤ مصیبت پر راضی رہنے والے تھے۔

(۹) نویں صحابی حضرت صہیب بن سنان رضی اللہ عنہ ہیں جو درگاہِ رضا کے قاصد اور بارگاہِ بقا اندر فنا کے طالب تھے۔

(۱۰) دسویں صحابی حضرت عتبہ بن غزوان رضی اللہ عنہ ہیں جو سعادت کے موتی اور بحر قناعت کے شناور تھے۔

(۱۱) گیارہویں صحابی حضرت زید بن الخطاب رضی اللہ عنہ ہیں جو حضرت فاروق اعظم

رضی اللہ عنہ کے بھائی تھے دونوں جہان اور تمام مخلوق سے منہ موڑ ایک خدا کے ہو کر رہ گئے۔

(۱۲) بارہویں صحابی حضرت ابو کبشہ رضی اللہ عنہ ہیں جو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے محبوب اور مشاہدات کی طلب میں مشقتیں جھیلنے والے تھے۔

(۱۳) تیرھویں صحابی حضرت ابو مرثد کنمانہ الحصین عدوی رضی اللہ عنہ ہیں جو معزز و تواب اور تمام مخلوق سے منہ موڑ کر خدا کی طرف رجوع کرنے والے تھے۔

(۱۴) چودھویں صحابی حضرت سالم جو حضرت حذیفہ یمانی رضی اللہ عنہما کے مولی ہیں وہ راہِ تواضع کی تعمیر کرنے والے اور حجتِ قطعیہ کی راہ طے کرنے والے تھے۔

(۱۵) پندرھویں صحابی حضرت عکاشفہ بن الحصین رضی اللہ عنہ ہیں جو عذابِ الٰہی سے ڈرنے والے اور گمراہی سے دور رہنے والے تھے۔

(۱۶) سولھویں صحابی حضرت مسعود بن ربیع القاری رضی اللہ عنہ ہیں جو قبیلہ بنی قار کے سردار اور مہاجر و انصار کی زینت تھے۔

(۱۷) سترھویں صحابی حضرت ابوذر بن جنادہ غفاری رضی اللہ ہیں جن کا زہد حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے مشابہ اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کی مانند تھا اور جو دیدارِ الٰہی کے مشتاق تھے۔

(۱۸) اٹھارھویں صحابی حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما جو حضور کے تمام قول و فعل کے محافظ اور ہر خوبی سے متصف تھے۔

(۱۹) انیسویں صحابی حضرت صفوان بن بیضاء رضی اللہ عنہ ہیں جو مقام استقامت پر قائم اور متابعتِ شریعت پر گامزن تھے۔

(۲۰) بیسویں صحابی حضرت ابوالدرداء عویم بن عامر رضی اللہ عنہ ہیں جو صاحب ہمت اور ہر تہمت سے مبرا اور پاک تھے۔

(۲۱) اکیسویں صحابی حضرت ابولبابہ بن عبدالمنذر رضی اللہ عنہ ہیں جو حضور اکرم صلی اللہ

علیہ وسلم کے برگزیدہ صحابی اور بارگاہِ رجا سے تعلق رکھنے والے تھے۔

(۲۲) بائیسویں صحابی حضرت عبداللہ بن بدر جہنی رضی اللہ عنہ ہیں جو کیمیائے بحرِ شرف اور توکل کے صدف کے موتی تھے۔

اگر تمام اصحاب صفہ کے اسماء بیان کئے جائیں تو کتاب بہت طویل ہو جائے گی۔ شیخ ابو عبدالرحمٰن محمد بن الحسین سلمٰی رحمۃ اللہ نے جو مشائخ عظام کے کلام و اقوال کے جامع و ناقل ہیں ایک کتاب، خاص اہل صفہ کے لیے تصنیف فرمائی ہے جس میں ہر ایک کے مناقب و فضائل اور اسماء گرامی ان کی کنیتوں کے ساتھ علیٰحدہ علیٰحدہ بیان کئے ہیں یہ کتاب قابلِ دید ہے۔

(۲۳) حضرت مسطح بن ثابت بن عباد بدری رضی اللہ عنہ کو بھی اصحابِ صفہ میں شمار کیا جاتا ہے مگر میں دل سے ان کو دوست نہیں رکھتا چونکہ ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا پر لگائی جانے والی جھوٹی تہمت کی ابتدا ان ہی سے ہوئی تھی۔

(۲۴) حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ

(۲۵) حضرت ثوبان رضی اللہ عنہ

(۲۶) حضرت معاذ بن الحارث رضی اللہ عنہ

(۲۷) حضرت دستان رضی اللہ عنہ

(۲۸) حضرت خلاب رضی اللہ عنہ

(۲۹) حضرت ثابت بن ودیعہ رضی اللہ عنہ

(۳۰) حضرت ابو عیسیٰ رضی اللہ عنہ

(۳۱) حضرت عویم بن ساعد رضی اللہ عنہ

(۳۲) حضرت سالم بن عمر بن ثابت رضی اللہ عنہ

(۳۳) حضرت ابو اللیث رضی اللہ عنہ

(۳۴) حضرت کعب بن عمر رضی اللہ عنہ

(۳۵) حضرت ذہب بن معقل رضی اللہ عنہ

(۳۶) حضرت عبداللہ بن انیس رضی اللہ عنہ

(۳۷) حضرت حجاج بن عمر اسلمی رضی اللہ عنہم اجمعین کو بھی انہیں اصحاب صفہ میں شمار کیا جاتا ہے لیکن کبھی کبھی انہوں نے اپنے متعلقین کی طرف بھی توجہ کر لی تھی۔

طبقہ صحابہ رضی اللہ عنہم کی افضلیت:

تمام صحابہ کرام مرتبہ صحابیت میں یکساں ہیں ان کا زمانہ سب زمانوں سے ہر لحاظ سے افضل تھا درحقیقت صحابہ کرام کا زمانہ ہی خیر القرون تھا اللہ تعالیٰ نے ان کو اپنے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت سے سرفراز فرمایا اور ان کے دلوں کو تمام عیبوں سے محفوظ رکھا تھا۔

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے "خَیْرُ الْقُرُوْنِ قَرْنِیْ ثُمَّ الَّذِیْنَ یَلُوْنَھُمْ الحدیث" (بخاری شریف) سب سے بہتر زمانہ میرا زمانہ ہے۔ اس کے بعد وہ زمانہ جو اس سے متصل ہے پھر وہ جو اس کے بعد آئے گا۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

وَالسّٰبِقُوْنَ الْاَوَّلُوْنَ مِنَ الْمُھٰجِرِیْنَ وَالْاَنْصَارِ وَالَّذِیْنَ اتَّبَعُوْھُمْ بِاِحْسَانٍ الآیه (التوبۃ:۱۰۰)

"سب سے پہلے ایمان میں سبقت کرنے والے مہاجرین و انصار ہیں اور وہ لوگ جو بھلائی کے ساتھ ان کے بعد ایمان لائے۔"

طبقہ تابعین کے ائمہ طریقت کا تذکرہ

اب میں بعض تابعین کے تذکرے کو شامل کتاب کرتا ہوں تاکہ مکمل فائدہ حاصل ہو کیونکہ ان کا زمانہ صحابہ کرام کے زمانہ سے متصل و قریب تھا۔

(۱) حضرت اویس قرنی رضی اللہ عنہ:

طبقہ تابعین کے ائمہ طریقت میں سے آفتاب امت، شمع دین و ملت حضرت اویس قرنی رضی اللہ عنہ ہیں آپ اہلِ تصوف کے مشائخ کبار میں سے ہیں آپ نے رسول اکرم صلی

اللہ علیہ وسلم کا زمانہ حیات ظاہری اور عہد مبارک پایا ہے لیکن دو چیزوں نے دیدارِ جمال جہاں آراء سے آپ کو روکے رکھا ایک آپ کا غلبہ حال دوسرا آپ کی والدہ کا حق۔

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کرام سے فرمایا ''قرن میں ایک اویس نامی مردِ خدا ہے جس کی شفاعت سے قیامت کے دن قبیلہ ربیعہ اور قبیلہ مضر کے بھیڑوں کے بالوں کی تعداد کے برابر میری امت جنت میں داخل ہوگی۔

اس کے بعد حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ اور حضرت علی مرتضٰی رضی اللہ عنہما کی طرف متوجہ ہو کر فرمایا جب تم اس سے ملاقات کرو گے تو پستہ قد، لانبے بال اور داہنی جانب روپے کے برابر سفید نشان پاؤ گے یہ سفیدی برص کی نہ ہوگی ایسا ہی نشان اس کے ہاتھ کی ہتھیلی پر ہوگا وہ ربیعہ و مضر کی بکریوں کی تعداد کے برابر میری امت کی شفاعت کرے گا جب تم اس سے ملو تو میرا اسلام پہنچا کر کہنا کہ میری امت کے لیے دعا کریں چنانچہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی رحلت کے بعد حضرت عمر فاروق جب حضرت علی مرتضٰی رضی اللہ عنہما کے ساتھ مکہ مکرمہ آئے تو حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے دورانِ خطبہ ارشاد فرمایا ''اے نجد کے رہنے والو کھڑے ہو جاؤ'' جب وہ لوگ کھڑے ہو گئے تو فرمایا تم میں سے کوئی قرن کا رہنے والا شخص ہے؟ جب قرن کے لوگ آئے تو ان سے حضرت اویس کے بارے میں استفسار فرمایا انہوں نے بتایا وہ تو دیوانہ آدمی ہے وہ نہ تو آبادی میں آتا ہے اور نہ کسی سے ملتا جلتا ہے عام طور پر لوگ کھاتے ہیں وہ نہیں کھاتا حتیٰ کہ وہ غم و خوشی تک کو نہیں جانتا جب لوگ ہنستے ہیں تو وہ روتا ہے اور جب لوگ روتے ہیں تو وہ ہنستا ہے حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ نے فرمایا میں اس سے ملاقات کرنا چاہتا ہوں لوگوں نے کہا وہ جنگل میں ہمارے اونٹوں کے پاس رہتا ہے چنانچہ حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ اور حضرت علی مرتضٰی رضی اللہ عنہ دونوں اٹھ کر چل دیے یہاں تک کہ دونوں حضرت اویس قرنی کے پاس پہنچے وہ نماز میں مصروف تھے انتظار میں بیٹھ گئے جب وہ نماز سے فارغ ہوئے تو سلام عرض کیا اور دونوں نے ان کی ہتھیلی اور پہلو پر نشان دیکھے اور جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی بیان کردہ نشانیوں کو پہچان لیا تو دعا کے خواستگار ہو کر حضور اکرم

صلی اللہ علیہ وسلم کا سلام اور امت کے لیے دعا کی وصیت پہنچائی۔ کچھ دیر یہ دونوں ان کے پاس بیٹھے رہے پھر حضرت اویس رضی اللہ عنہ نے کہا آپ نے بڑی تکلیف و زحمت فرمائی اب جایئے قیامت نزدیک ہے وہاں ہمیں ایسا دیدار نصیب ہوگا جو کبھی منقطع نہ ہوگا اب میں قیامت کا راستہ بنانے اور اسے صاف کرنے میں مشغول ہوں ان دونوں امیروں کی ملاقات سے اہلِ قرن کو معلوم ہوگیا کہ بظاہر یہ دیوانہ آدمی کون ہے؟ چنانچہ وہ لوگ ان کی بہت عزت اور قدر و منزلت کرنے لگے اس واقعہ کے بعد حضرت اویس قرنی وہاں سے کوچ کر کے کوفہ چلے گئے کوفہ میں انہیں صرف ہرم بن حبان نے ایک مرتبہ دیکھا یہاں تک کہ جنگ صفین حضرت علی مرتضیٰ کی حمایت میں جہاد کے لیے نکلے اور لڑتے ہوئے جام شہادت نوش فرمایا۔ "عاش حمیداً او مات شهیداً" پسندیدہ زندگی گزاری اور شہادت کی موت پائی۔

حضرت اویس قرنی رضی اللہ عنہ کا ارشاد ہے کہ "السلامة في الوحدة" وحدت میں سلامتی ہے اس لیے کہ جس کا دل تنہا ہو وہ غیر کے فکر واندیشہ سے بے پرواہ ہر حال میں مخلوق سے کنارہ کش اور ان آفتوں سے محفوظ رہتا ہے لیکن اگر یہ سمجھے کہ تنہائی کی زندگی گزارنا محال ہے تو وہ جان لے کہ اس کے دل پر شیطان کا تسلط ہے اور اس کے سینہ میں نفس کا غلبہ ہے حالانکہ جس وقت دنیا و آخرت کی فکر اور خلق کا اندیشہ اس کے دماغ میں موجود ہے اس وقت تک وحدت و تنہائی سے ہمکنار نہیں ہوسکتا اس لیے کہ کسی خاص چیز سے راحت پانا اور اس کی فکر رکھنا ایک ہی چیز ہے جسے خلوت گزینی اور تنہائی کی عادت ہوگئی وہ اگرچہ مجلس میں بیٹھا ہو مگر اس کی وحدت میں کوئی خلل واقع نہیں ہوتا اور جو شخص کسی اور خیال میں غرق ہوا گرچہ وہ خلوت میں ہو تو یہ خلوت اسے فارغ نہیں کرتی معلوم ہوا کہ انسانوں سے جدا ہونا محبت الٰہی نہیں ہے لیکن جسے محبت الٰہی حاصل ہو جائے اس کے لئے انسانوں سے ملنا جلنا ضروری نہیں ہے اور جسے انسانوں سے محبت ہے اس کے دل میں خدا کی دوستی کا گزر نہیں ہوتا بلکہ اسے محبت الٰہی کی ہوا تک نہیں لگتی "لان الوحدة صفة عبد صافٍ" اس لیے کہ وحدت صاف دل بندہ کی صفت ہے۔ سنو اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

"اَلَیْسَ اللّٰہُ بِکَافٍ عَبْدَہٗ"

"کیا اللہ بندے کے لیے کافی نہیں۔"

(۲) حضرت ہرم بن حیان رضی اللہ عنہ:

طبقۂ تابعین کے ائمہ طریقت میں سے منبع صفا، معدن وفا حضرت ہرم بن حیان رضی اللہ عنہ ہیں جو اکابر طریقت میں سے ہیں آپ کو طریقت و معرفت میں کمال دسترس حاصل تھی صحابہ کرام کی مجلسوں میں رہتے ہیں آپ نے جب حضرت اویس قرنی رضی اللہ عنہ سے ملاقات کرنے کا ارادہ کیا تو قرن پہنچے لیکن وہ وہاں سے کوچ کر کے جا چکے تھے نا امید ہو کر واپس آ گئے پھر پتہ چلا کہ کوفہ میں ہیں تو کوفہ پہنچے مگر طویل عرصہ تک ملاقات نہ ہو سکی مایوس ہو کر بصرے جانے کا ارادہ کیا تو اچانک فرات کے کنارے جبہ پہنے وضو کرتے مل گئے دیکھتے ہی پہچان لیا جب کنارۂ فرات سے باہر آ کر ریش مبارک میں کنگھی کی تو حضرت ہرم بن حیان نے آگے بڑھ کر سلام عرض کیا۔ انہوں نے جواب دیا "وعلیك السلام یاھرم بن حیان" حضرت ہرم بن حیان رضی اللہ عنہ نے دریافت کیا آپ نے مجھے کیسے پہچانا؟ انہوں نے کہا "عرفت روحی روحك" میری روح نے تمہاری روح کو پہچان لیا، کچھ عرصہ قیام کے بعد انہیں واپس کر دیا۔

حضرت ہرم رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ حضرت عمر اور حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہما سے میری اکثر باتیں ہوئی ہیں حضرت اویس قرنی رضی اللہ عنہ نے مجھے بروایت حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ حدیث سنائی کہ:

اِنَّمَا الْاَعْمَالُ بِالنِّیَّاتِ وَلِکُلِّ امْرِئٍ مَّانَوٰی (بخاری شریف) آخر تک یعنی حقیقت یہ ہے کہ ہر عمل کا مدار نیتوں پر ہے اور ہر شخص کو وہی ثمرہ ملتا ہے جو نیت کرے جس نے خدا اور رسول کی طرف ہجرت کی تو اس کی ہجرت خدا اور رسول ہی کی طرف ہوگی اور جس نے دنیا کی طرف ہجرت کیا سے وہی ملے گی اگر بیوی کی خواہش کی تو اس سے نکاح کرلے گا اس کی ہجرت اس کے لیے ہے جس کی وہ نیت کرے اس کے بعد حضرت اویس قرنی نے مجھے نصیحت کی کہ

"عـلـيك بـقـلبك" تم پر فرض ہے کہ اپنے دل کی نگہداشت کرو تا کہ کسی غیر کی فکر میں مبتلا نہ ہو جاؤ۔

دلوں کی حفاظت کا طریقہ:

اس نصیحت کے دو معنی ہیں ایک یہ کہ دل کو ریاضت و مجاہدے کے ذریعہ حق تعالیٰ کی اطاعت پر لگائے رکھے دوسرے یہ کہ خود کو دل کے تابع کرو یہ دونوں اصول قوی ہیں دل کو حق کے تابع کرنا ارادتمندوں کا کام ہے تا کہ خواہشات کی کثرت اور ہوائے نفس کی محبت سے دل محفوظ رہے اور تمام ناموافق خطرات اور اندیشے دل سے نکال پھینکے اور اس کی درستگی و حفاظت کی تدبیر میں مشغول ہو کر حق تعالیٰ کے نشانِ قدرت پر نظر رکھے تا کہ دل خدا کی محبت کی آماجگاہ بن جائے اور خود کو دل کے تابع کرنا کاملوں کا کام ہے کیونکہ حق تعالیٰ ان کے دلوں کو نورِ جمال سے منور کر کے تمام اسباب علل سے پاک و صاف بنا کر مقام بلند اور درجہ رفیعہ پر فائز کر دیتا ہے اور ان کے جسموں کو خلعتِ قرب سے نواز دیتا ہے اور اپنے لطائف و تجلیات کی روشنی سے انہیں منور کر دیتا ہے اور مشاہدۂ قرب سے سرفراز کرتا ہے جس وقت کامل کی ایسی حالت ہو جائے اس وقت اسے خود کو دل کے تابع اور اس کے موافق کر دینا چاہیے گویا پہلی صفت کے حضرات، صاحب القلوب، مالک القلوب اور باقی الصفت، مغلوب القلوب اور فانی الصفت ہوتے ہیں اس مسئلہ کی اصل و حقیقت یعنی دلیل و حجت میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ "اِلَّا عِبَادَكَ مِنْهُمُ الْمُخْلَصِيْنَ" (الحجر: ۴۰) (مگر یہ کہ ان میں سے تیرے مخلص بندے) اس میں دو قرأت ہیں ایک یہ کہ مخلصین لام کے زیر سے اور دوسری مخلصین لام کے زبر سے۔ مخلِص اسم فاعل ہے جو کہ باقی الصفت ہیں اور مخلَص اسم مفعول ہے جو کہ فانی الصفت ہیں انشاء اللہ کسی اور مقام پر اس مسئلہ کو بیان کروں گا۔

وہ حضرت جو فانی الصفت ہیں وہ زیادہ جلیل القدر ہیں اس لیے کہ انہوں نے خود کو دل کے تابع اور اس کے موافق بنا رکھا ہے اور ان کے دل حق تعالیٰ کے سپرد ہیں اور ان میں حق تعالیٰ ہی جلوہ گر ہے وہ اس کے مشاہدہ میں قائم ہیں لیکن وہ حضرات جو باقی الصفت ہیں وہ دل کو بکوشش

امر حق کے موافق بناتے ہیں اس مسئلہ کی بنیاد ہوش و مستی اور مشاہدہ و مجاہدہ پر ہے۔ واللہ اعلم۔

حضرت حسن بصری رضی اللہ عنہ:

طبقۂ تابعین کے ائمہ طریقت میں سے، امامِ عصر، یگانہ زمانہ، حضرت ابوعلی الحسن بصری رضی اللہ عنہ ہیں۔ بعض علماء ان کی کنیت ابومحمد بتاتے ہیں اور بعض ابوسعید اہلِ طریقت کے درمیان آپ کی بڑی قدر و منزلت ہے علم سلوک میں آپ کے لطیف اشارات ہیں۔

حکایت:

ایک مرتبہ حضرت حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ نے ایک دیہاتی کے سوال پر فرمایا! صبر دو طرح پر ہوتا ہے ایک مصیبت و بلا پر صبر کرنا اور دوسرا ان پر صبر کرنا جن کے نہ کرنے کا حکم حق تعالیٰ نے دیا ہے جن چیزوں کے پیچھے چلنے سے حق تعالیٰ نے ہمیں منع کیا ہے انہیں نہ کریں اس پر دیہاتی نے کہا "انت زاهد مارأيت ازهد منك" آپ سراپا زاہد ہیں میں نے آپ سے بڑھ کر کسی زاہد کو نہیں دیکھا حضرت حسن بصری نے فرمایا اے بندہ خدا! میرا زہد مرغوب چیزوں میں ہے اور میرا صبر اضطرار و بے قراری میں ہے دیہاتی نے کہا اس ارشاد کی وضاحت فرمائیں کیونکہ میرا اعتقاد متزلزل ہو گیا ہے آپ نے فرمایا! بلاؤں پر میرا صبر کرنا اور خدا کے منع کردہ چیزوں سے کنارہ بربنائے اطاعت ہے اس لیے کہ یہ آتش دوزخ کے خوف سے ہے اور اضطرار و بے قراری ہے اور دنیا میں جو میرا زہد ہے وہ آخرت کی رغبت کی وجہ سے ہے اور یہ عین رغبت ہے خوشی و مسرت کا موجب تو یہ ہے کہ دنیا میں اپنے نصیب پر قناعت کرے اور اسی کو حاصل کرے تاکہ اس کا صبر حق تعالیٰ کے لیے ہو نہ یہ کہ اپنے جسم کو آتشِ دوزخ سے بچانے کے لیے ہو اور اپنا زہد خالص اللہ تعالیٰ کے لیے ہو نہ یہ کہ جنت میں جانے کی خواہش کے لیے ہو یہ صحتِ اخلاص کی نشانی و علامت ہے۔

بدوں کی صحبت سے پرہیز:

حضرت حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ "ان الصحبت الاشرار تورث

سوء الظن بالاخیار" بدوں کی صحبت، نیکوں سے بدگمانی پیدا کرتی ہے یہ نصیحت بالکل صحیح و درست ہے اور موجودہ لوگوں کے حال کے عین مطابق ہے مقبولانِ بارگاہ کے تمام منکروں پر صادق ہے۔ عام بدظنی وانکار کی وجہ یہی ہے کہ لوگ نقلی صوفیوں کی صحبت اختیار کرتے ہیں اور جب ان سے خیانت، جھوٹ اور غیبت وغیرہ کا صدور ہوتا ہے وہ کھیل کود اور بیہودہ پن کے شائق ہوتے ہیں لغویات وخواہشات اور شہوتوں کے دلدادہ ہوتے ہیں اور حرام ومشتبہ مال کے جمع کرنے میں حریص ہوتے ہیں تو لوگ یہی سمجھنے لگتے ہیں کہ تمام صوفی ایسے ہی ہوتے ہوں گے اور تمام صوفیوں کا یہی مذہب ہوگا حالانکہ یہ بات بالکل غلط ہے بلکہ صوفیاء کے تمام افعال طاعتِ الٰہی میں ہوتے ہیں اور محبتِ الٰہی سے بھرپور ان کی زبانوں پر کلمہ حق ہوتا ہے ان کے قلوب، محبت الٰہی کی جگہ ان کے کان کلام حق سننے کا مقام اور ان کی آنکھیں مشاہدہ جمالِ الٰہی کی جگہ ہوتی ہیں جو کوئی خیانت کا مجرم ہوتا ہے وہ اس کا مواخذہ دار ہوگا یہ نہیں کہ جہاں بھر کے بزرگوں اور اکابر کو ایک سا سمجھا جائے جو بدوں کی صحبت اختیار کرتا ہے دراصل خود اس میں ہی بدی کے جراثیم ہوتے ہیں اگر اس کے دل میں نیکی وبھلائی کا مادہ ہوتا تو وہ نیکوں کی صحبت اختیار کرتا۔ اس لیے وہی شخص مستحق ملامت ہے جو نالائق اور نااہلوں کی صحبت اختیار کرتا ہے۔ ایک وجہ انکار یہ بھی ہوتی ہے کہ جب صوفیاء کو اپنی خواہش نفس کے خلاف پاتے ہیں تو ان کے مقاماتِ بلند سے انکار کرنے لگتے ہیں یا منکروں کے ہمزباں ہوجاتے ہیں۔ اہلِ معرفت، صوفیاء کرام کے انکار کرنے والے لوگ مخلوقِ خدا میں شریر تر اور غایت درجہ ذلیل وکمینہ ہوتے ہیں کیونکہ صوفیا کا طریقہ جہان بھر میں برگزیدہ ہے اور ان کی برکتوں سے دونوں جہان کی مرادیں حاصل ہوتی ہیں یہ حضرات تمام جہان میں ممتاز ہیں۔ اسی معنی میں یہ شعر ہے!

فلا تحقرن نفسی وانت حبیبها
فکل امرءٍ یصیب الیٰ من یجانس

تم میرے نفس کو حقیر نہ جانو، وہ تمہارا محبوب ہے
ہر شخص کو اپنے ہی ہم جنسوں سے مراد حاصل ہوتی ہے

(۴) حضرت سعید ابن المسیب رضی اللہ عنہ:

طبقہ تابعین کے ائمہ طریقت میں سے رئیس العلماء، فقیہ الفقہا، حضرت سعید ابن المسیب رضی اللہ عنہ عظیم المرتبت، رفیع المنزلت، ہر دلعزیز اور سیرت و خصائل میں عمدہ ترین تھے۔ تفسیر، حدیث، فقہ، لغت، شعر، توحید، نعت اور علم حقائق میں آپ کا بڑا مرتبہ ہے وہ ظاہر میں ہوشیار اور طبیعت میں نیک سیرت تھے یہ خوبی تمام مشائخ کے نزدیک محمود و مسعود ہے آپ فرماتے ہیں "**ارض بالیسر من الدنیا مع سلامۃ دینك كما رضی قوم بكثیرها مع ذهاب دینهم**" اے مردِ مسلمان! اپنی اسی تھوڑی سی دنیا پر جو تجھے دین کی سلامتی کے ساتھ حاصل ہوئی ہے اس پر قناعت کر۔ جس طرح عام لوگ اپنا دین کھو کر مال کی زیادتی پر خوش ہوتے ہیں اگر فقر میں دین کی سلامتی ہے تو یہ اس تونگری سے بہتر ہے جس میں غفلت بھی ہو اور دین بھی جاتا رہے اس لیے کہ سلامتی ایمان کے ساتھ جب فقیر اپنے دل کی طرف خیال کرتا ہے تو مال دنیا سے اسے خالی پاتا ہے اور جو میسر آتا ہے اسی پر قناعت کرتا ہے اور تونگر جب اپنے دل کی طرف خیال کرتا ہے تو اسے ہر دم مال کی طمع و زیادتی میں فکر مند پاتا ہے اور وہ حصول دنیا کی خاطر ہر طرف ہاتھ پاؤں مارتا ہے لہٰذا محبوبان خدا کی ہر آن نظر حق تعالیٰ کی رضا پر رہتی ہے اور غافلوں کی نظر ہمیشہ اس دنیا پر رہتی ہے جو غرور و آفت سے بھرپور ہے حسرت و ندامت، ذلت و معصیت سے بہتر ہے۔ غافلوں پر جب بلا و مصیبت نازل ہوتی ہے تو کہتے ہیں کہ ہمارے جسم محفوظ رہے اور جب محبوبانِ خدا پر آتی ہے تو وہ کہتے ہیں کہ الحمد للہ ہمارے دین پر نہیں آئی اس کی وجہ یہ ہے کہ جب جسم پر بلا کا نزول ہو اور دل میں بقا ہو تو وہ جسم پر نزولِ بلا سے خوش ہوتے ہیں اور اگر دل میں غفلت ہے اگرچہ جسم عیش و عشرت میں ہو تو یہ موجب ذلت ہے درحقیقت مقام رضا یہ ہے کہ کم دنیا کو زیادہ اور زیادہ دنیا کو کم سمجھے اس لے کہ اس کی کمی اس کی زیادتی کی مانند ہے۔

حضرت سعید ابن المسیب ایک مرتبہ مکہ مکرمہ میں تھے کسی نے آ کر پوچھا مجھے ایسا حلال بتایئے جس میں حرام کا شائبہ نہ ہو اور ایسا حرام بتایئے جس میں حلال کا شائبہ نہ ہو تو۔ آپ

نے جواب دیا "ذكر الله حلال ليس فيه حرام و ذكر غيره حرام ليس فيه حلال" "ذکر الٰہی ایسا حلال ہے جس میں کسی حرام کا شائبہ نہیں اور غیر اللہ کا ذکر ایسا حرام ہے جس میں ذرہ بھر حلال نہیں" اسی لیے ذکر اللہ میں نجات ہے اور ذکر غیر میں ہلاکت ہے۔ وباللہ التوفیق۔

طبقۂ تبع تابعین اور دیگر متقدمین کے ائمہ طریقت

(۱) حضرت حبیب عجمی رحمتہ اللہ علیہ:

ائمہ طریقت میں سے شجاع طریقت متمکن در شریعت حضرت حبیب عجمی رحمۃ اللہ علیہ ہیں، آپ بلند ہمت، مردِ خدا اور صاحبِ کمال بزرگ ہیں۔ آپ نے حضرت حسن بصری رضی اللہ عنہ کے ہاتھ توبہ پر فرمائی۔ اس سے قبل آپ میں ریا وفساد بہت تھا مگر اللہ تعالیٰ نے سچی توبہ کی توفیق عطا فرمائی آپ نے عرصہ تک حضرت حسن بصری رضی اللہ عنہ سے علم وطریقت کی تحصیل فرمائی چونکہ آپ عجمی تھے عربی زبان پر عبور حاصل نہ ہوا مگر اللہ تعالیٰ نے آپ کو مقرب بنا کر متعدد کرامتوں سے سرفراز فرمایا۔ ایک رات حضرت حسن بصری رحمتہ اللہ علیہ کا ان کی خانقاہ کی طرف گزر ہوا۔ آپ اقامت کہہ کر نماز مغرب شروع کر چکے تھے حضرت حسن بصری نے ان کی اقتداء میں نماز نہ پڑھی کیونکہ صحیح تلفظ اور درست مخارج کے ساتھ تلاوت قرآن کریم پر آپ کو قدرت حاصل نہ تھی۔ حضرت حسن بصری جب رات کو سوئے تو دیدارِ الٰہی حاصل ہوا۔ آپ نے بارگاہِ الٰہی میں عرض کیا رب العالمین تیری رضا کس چیز میں ہے؟ حق تعالیٰ نے فرمایا اے حسن! تو نے میری رضا تو پائی لیکن اس کی قدر نہ کی۔ آپ نے عرض کیا پروردگار وہ کونسی رضا ہے؟ حق تعالیٰ نے فرمایا اگر تو حبیب عجمی کی اقتدا میں نماز پڑھ لیتا تو صحتِ نیت اور معتب عبادت کے انکار کے خطرے سے محفوظ رہتا اور تجھے رضائے الٰہی حاصل ہو جاتی۔

مشائخ طریقت میں یہ بات مشہور ہے کہ جب حضرت حسن بصری رضی اللہ عنہ حجاج کے ظلم سے بھاگ کر حضرت حبیب عجمی کی خانقاہ میں تشریف لائے اور حجاج کے سپاہی تعاقب کرتے ہوئے اندر گھس آئے تو سپاہیوں نے پوچھا اے حبیب! تم نے حسن بصری کو کہیں دیکھا

ہے؟ فرمایا ہاں۔ سپاہیوں نے پوچھا کس جگہ ہے؟ فرمایا میرے حجرے میں ہیں۔ وہ آپ کے حجرے میں گھس گئے لیکن وہاں کسی کو نہ پایا۔ سپاہیوں نے سمجھا کہ حبیب عجمی نے مذاق کیا ہے۔ اس پر انہوں نے درشت کلامی کے ساتھ پوچھا سچ بتاؤ وہ کہاں ہیں؟ انہوں نے قسم کھا کر فرمایا میں سچ کہتا ہوں وہ میرے حجرے میں ہیں۔ سپاہی دو تین بار اندر گئے آئے مگر وہ حسن بصری کو نہ دیکھ سکے۔ بالآخر وہ چلے گئے۔ جب حسن بصری حجرے سے باہر تشریف لائے تو فرمایا اے حبیب میں سمجھ گیا کہ حق تعالیٰ نے آپ کی برکت سے ان ظالموں کے پنجہ سے محفوظ رکھا۔ لیکن اس کی وجہ بتائیے کہ آپ نے یہ کیوں فرمایا کہ وہ اس حجرے میں ہیں۔ حضرت حبیب عجمی نے جواب دیا۔ اے میرے مرشدِ برحق! اللہ تعالیٰ نے آپ کو میری برکت کی وجہ سے ظاہر نہیں کیا۔ بلکہ سچ بولنے کی وجہ سے خدا نے ان سے مخفی رکھا۔ اگر جھوٹ کہتا تو اللہ تعالیٰ مجھے اور آپ کو دونوں کو رسوا کرتا اس قسم کی بکثرت کرامتیں آپ سے منسوب ہیں۔

حضرت حبیب عجمی رحمۃ اللہ علیہ سے لوگوں نے پوچھا کس چیز میں رضائے الٰہی ہے؟ آپ نے فرمایا "فی قلب لیس فیہ غبار النفاق" ایسے دل میں جہاں نفاق کا غبار تک نہ ہو۔ کیونکہ نفاق، وفاق کے خلاف ہے اور رضا، عینِ وفاق ہے اور یہ کہ محبت کو نفاق سے دور کا بھی علاقہ نہیں ہے اور نہ وہ محل رضا ہے۔ محبانِ الٰہی کی صفت رضا ہے اور دشمنانِ خدا کی صفت نفاق۔ اس کی تفصیل انشاء اللہ دوسری جگہ آئے گا۔

(۲) حضرتِ مالک بن دینار رحمۃ اللہ علیہ:

ائمہ طریقت میں سے ایک بزرگ، امامِ طریقت، نقیب اہل محبت، جن و انس کی زینت حضرت مالک بن دینار رحمۃ اللہ علیہ ہیں۔ آپ حضرت حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ کے مصاحب و مرید ہیں طریقت میں آپ کا بلند مقام ہے۔ آپ کی کرامتیں اور ریاضتیں مشہور و معروف ہیں آپ کے والد کا نام دینار تھا جو کہ غلام تھے آپ غلامی کی حالت میں پیدا ہوئے تھے۔ آپ کی توبہ کا واقعہ یہ ہے کہ ایک رات آپ ایک جماعت کے ساتھ محفلِ رقص و سرود میں تھے جب تمام لوگ سو گئے تو اس طنبورہ سے جسے بجایا جا رہا تھا آواز آئی "یامالک مالک ان

تتوب" اے مالک کیا بات ہے توبہ میں دیر کیوں ہے؟ آپ نے اپنے تمام دوست واحباب کو چھوڑ کر اور حضرت حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت میں حاضر ہوکر سچی توبہ کی اور اپنا حال درست کر کے ثابت قدم رہے اس کے بعد آپ کی شان اس قدر بلند ہوئی کہ ایک مرتبہ جب آپ کشتی میں سفر کر رہے تھے ایک تاجر کا موتی کشتی میں گم ہوگیا باوجود یہ کہ آپ کو علم تک نہ تھا لیکن تاجر نے آپ پر سرقہ کی تہمت لگائی آپ نے آسمان کی طرف منہ اٹھایا اسی لحہ دریا کی تمام مچھلیاں منہ میں موتی دبائے سطح آب پر ابھر آئیں آپ نے ان میں سے ایک موتی لے کر اس تاجر کو دے دیا اور خود دریا میں اتر گئے اور پانی پر گزر کر کنارے پر پہنچ گئے۔

ایک مرتبہ آپ نے فرمایا "**احب الاعمال علی الاخلاص فی الاعمال**" میرے نزدیک سب سے زیادہ محبوب عمل میں اخلاص ہے کیونکہ اخلاص کے ساتھ عمل کرنا ہی تو واقعی عمل ہے اس لیے کہ عمل کے لیے اخلاص کا درجہ ایسا ہے جیسے جسم کے لیے روح جس طرح بغیر روح کے جسم پتھر و جماد ہے اسی طرح بغیر اخلاص کے عمل ریت کا تودہ ہے اخلاص باطنی اعمال کے قبیل سے ہے اور طاعات ونیکیاں ظاہری اعمال کے قبیل سے۔ ظاہری اعمال کی تکمیل باطنی اعمال کی موافقت پر موقوف ہیں اور اعمالِ باطنہ، ظاہری اعمال کے ساتھ ہی قدر و قیمت رکھتے ہیں اگر کوئی شخص ہزار برس تک دل سے مخلص رہے جب تک اخلاص کے ساتھ عمل کو نہ ملائے وہ مخلص نہیں ہوسکتا اسی طرح اگر کوئی شخص ہزار برس تک ظاہری عمل کرتا رہے لیکن جب تک وہ ظاہری عمل کے ساتھ اخلاص نہ ملائے گا وہ عمل نیکی نہیں بن سکتا۔

(۳) حضرت حبیب بن اسلم راعی رحمۃ اللہ علیہ:

ائمہ طریقت میں سے ایک بزرگ، فقیر کبیر، تمام ولیوں کے امیر، ابوحلیم حضرت حبیب بن اسلم راعی رحمۃ اللہ علیہ ہیں۔ مشائخ کبار میں آپ کی بڑی قدر ومنزلت ہے تصوف کے تمام احوال میں بکثرت دلائل وشواہد مذکور ہیں۔ آپ حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ کے مصاحب ہیں آپ سے ایک حدیث مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "**نیتہ المومن خیر من عملہ**" مومن کی نیت اس کے عمل سے افضل ہے۔

آپ بکریاں پالتے تھے اور فرات کے کنارے چرایا کرتے تھے آپ کا مسلک خلوت گزینی تھا ایک بزرگ بیان کرتے ہیں کہ ایک مرتبہ میرا گذر اس طرف ہوا تو کیا دیکھتا ہوں کہ آپ تو نماز میں مشغول ہیں اور بھیڑیا ان کی بکریوں کی رکھوالی کر رہا ہے۔ میں ٹھہر گیا کہ اس بزرگ کی زیارت سے مشرف ہونا چاہیے جن کی بزرگی کا کرشمہ آنکھوں سے دیکھ رہا ہوں بڑی دیر تک انتظار میں کھڑا رہا یہاں تک کہ جب وہ نماز سے فارغ ہوئے تو میں نے سلام عرض کیا۔ آپ نے جوابِ سلام کے بعد فرمایا کس کام سے آئے ہو؟ میں نے عرض کیا بغرض زیارت۔ فرمایا "جزاك الله" اس کے بعد میں نے عرض کیا یا حضرت! آپ کی بکریوں سے بھیڑیے کو ایسا لگاؤ ہے کہ وہ ان کی حفاظت کر رہا ہے فرمایا اس کی وجہ یہ ہے کہ بکریوں کے چرواہے کو حق تعالیٰ سے دلی ربط ہے۔ یہ فرما کر آپ نے لکڑی کے پیالے کو پتھر کے نیچے رکھ دیا۔ پتھر سے دو چشمے جاری ہوئے۔ ایک دودھ کا اور دوسرا شہد کا۔ پھر فرمایا نوش کرو۔ میں نے عرض کیا آپ نے یہ مقام کس طرح پایا؟ آپ نے جواب دیا سید عالم صلی اللہ وسلم کی متابعت کے ذریعہ اے فرزند! حضرت موسیٰ علیہ السلام، حضور سید عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے درجہ میں نہ تھے جب کہ میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ایک فرمانبردار ہوں تو یہ پتھر مجھے دودھ اور شہد کیوں نہ دے گا کیونکہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم موسیٰ علیہ السلام سے افضل ہیں۔ پھر میں نے عرض کیا مجھے کچھ نصیحت فرمایئے۔ آپ نے فرمایا "لا تجعل قلبك صدوق الحرص وبطنك وعاء الحرام" یعنی اپنے دل کو حرص کی کوٹھری اور اپنے پیٹ کو حرام کی گٹھری نہ بنانا کیونکہ لوگوں کی ہلاکت انہیں دو چیزوں میں مضمر ہے اور ان کی نجات ان سے دور رہنے میں ہے۔

حضرت شیخ مذکور کے اور بھی بکثرت احوال و روایات ہیں اس وقت اسی پر اکتفا کرتا ہوں کیونکہ جب میں ملتان کے علاقہ بہنور میں دشمنوں کے چنگل میں محصور تھا تو میری کتابیں غزنی میں رہ گئی تھیں۔

(۴) حضرت ابو حازم مدنی رحمۃ اللہ علیہ:

تبع تابعین میں سے ایک بزرگ، امام طریقت، پیر صالح حضرت ابو حازم مدنی رحمۃ

اللہ علیہ ہیں آپ مشائخ کرام کے پیشوا اور سلوک و معرفت میں کامل دسترس رکھتے ہیں فقر میں بزرگ اور صادق قدم تھے۔ مجاہدات میں بڑی محنت و مشقت برداشت کیا کرتے تھے حضرت عمرو بن عثمان مکی رحمۃ اللہ علیہ کو آپ کی صحبت کا شرف حاصل ہے آپ کا کلام مقبول اور تمام کتابوں میں مذکور ہے یہی حضرت عمرو بن عثمان روایت کرتے ہیں کہ کسی نے آپ سے پوچھا "مـالك" یعنی آپ کی پونجی کیا ہے؟ "قال الرضا عن الله والغنیٰ عن الناس" فرمایا میری پونجی خدا کی رضا اور لوگوں سے بے نیازی ہے، بلاشبہ جو شخص حق تعالیٰ سے راضی ہوگا وہ لوگوں سے مستغنی ہو جائے گا۔ کیونکہ اس کے لیے سب سے بڑا خزانہ تو خدا کی رضا ہی ہے۔ غنا سے ان کی مراد حق تعالیٰ سے غنا ہے جو شخص حق تعالیٰ سے مستغنی ہو جاتا ہے وہ غیروں سے بے پرواہ ہو جاتا ہے وہ اس کے در کے سوا کسی اور در کو جانتا ہی نہیں اور ظاہر و باطن کسی حالت میں خدا کے سوا کسی کو پکارتا ہی نہیں۔

ایک بزرگ بیان کرتے ہیں کہ میں ان کی خدمت میں حاضر ہوا تو میں نے ان کو سوتا پایا چنانچہ میں انتظار میں بیٹھ گیا جب وہ بیدار ہوئے تو فرمایا میں نے خواب میں اس وقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت کی ہے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے تمہارے لیے مجھے پیغام دیا ہے کہ ماں کے حق کی حفاظت کرنا حج کرنے سے بہتر ہے لوٹ جاؤ ماں کو خوش رکھو، میں واپس آ گیا اور مکہ مکرمہ حاضر نہ ہوا۔ میں نے اس سے زیادہ ان کے اقوال نہیں سنے۔

(۵) حضرت محمد بن واسع رحمۃ اللہ علیہ:

تبع تابعین میں سے ایک بزرگ، امام طریقت، داعیِ اہلِ مجاہدہ، قایم اندر مشاہدہ حضرت محمد بن واسع رحمۃ اللہ علیہ ہیں۔ آپ یگانہ روزگار، بکثرت تابعین کے صحبت یافتہ تھے اور اکثر مشائخ متقدمین نے بھی آپ سے ملاقات کی ہے اور آپ سے طریقت کے حقائق، انفاس عالیہ اور اشاراتِ کاملہ بکثرت منقول ہیں چنانچہ آپ نے فرمایا "مارأیت شیئا الا ورأیت الله فیــــہ" یعنی میں نے کوئی چیز ایسی نہیں دیکھی جس میں مجھے خدا کا جلوہ نظر نہ آیا ہو یہ مقام مشاہدہ کا ہے کیونکہ بندہ فاعلِ حقیقی کی محبت میں اس حد تک فائز ہو جاتا ہے کہ وہ جب بھی کسی

فعل کو دیکھتا ہے تو اسے فعل نظر نہیں آتا بلکہ فاعل ہی نظر آتا ہے جس طرح کوئی شخص تصویر کو دیکھ کر تصویر بنانے والے کے کمال کو دیکھتا ہے اس کلام کی اصل وحقیقت حضرت ابراہیم خلیل اللہ علیہ السلام کے اس قولِ مبارک پر ہے جبکہ انہوں نے چاند ستارے اور آفتاب کو دیکھ کر کہا تھا "ھٰذا رَبّی" یہ میرا رب ہے یہ آپ کے غلبہ شوق الٰہی کا حال ہے کہ انہوں نے جو کچھ بھی دیکھا اس میں محبوب ہی کی صفت کا جلوہ دیکھا اس لیے کہ محبوبانِ خدا، جب کسی چیز پر نظر ڈالتے ہیں تو انہیں جہان کی ہر چیز اس کے قہر کا مقہور اور اس کے غلبہ کا اسیر نظر آتی ہے اور ہستی کے وجود کو اس کے فاعل کی قدرت کے پہلو میں پراگندہ دیکھتے ہیں وہ مفعول کو نہیں دیکھتے بلکہ فاعل کو دیکھتے ہیں اور تکوین کی حالت میں ناچیز نظر آتے ہیں جب حالتِ اشتیاق میں اس پر نظر پڑتی ہے تو ان کی نظر مقہور یعنی کائنات پر نہیں پڑتی بلکہ قاہر یعنی کائنات کے بنانے والے ہی کا جلوہ نظر آتا ہے اس لیے ان کی نظر مفعول پر نہیں ہوتی بلکہ فاعل ہی کے مشاہدے میں ہوتی ہے مخلوق نظر ہی نہیں آتی بلکہ خالق کا جلوہ سامنے ہوتا ہے مزید تفصیل انشاء اللہ تعالیٰ مشاہدے کے باب میں آئے گی۔

ایک گروہ سے اس مقام میں غلطی واقع ہوئی ہے وہ "رأیت اللہ فیہ" کا مفہوم یہ لیتے ہیں کہ میں نے اس میں اللہ کو دیکھا ان کا یہ مفہوم لینا مکان اور تجزی یعنی جز وحلول کا اقتضا کرتا ہے حالانکہ یہ صریحی کفر ہے اس لیے کہ مکان اور جو مکان میں ہو دونوں ایک جنس کے ہوتے ہیں اگر کوئی یہ فرض کرے کہ مکان مخلوق ہے تو لازم ہے کہ جو مکان میں ہوگا وہ بھی مخلوق ہی ہوگا اور اگر یہ فرض کیا جائے کہ جو مکان میں متمکن ہے وہ قدیم ہے تو لازم ہے کہ وہ مکان بھی قدیم ہی ہوگا بہر طور دونوں نظریات فاسد ہیں خواہ مخلوق کو قدیم کہا جائے یا خالق کو حادث یہ دونوں باتیں کفر ہوں گی۔ لہٰذا کسی چیز میں اس کی رویت اسی معنیٰ میں ہے جسے ابتداء میں بیان کر دیا گیا ہے اس میں اور لطائف ہیں جو کسی اور جگہ لکھے جائیں گے۔ انشاء اللہ۔

(۶) امام اعظم ابو حنیفہ نعمان بن ثابت رضی اللہ عنہ:

تبع تابعین میں سے امام طریقت امام الائمہ مقتدائے اہل سنت، شرف فقہا، عز علماء

سیدنا امام اعظم ابو حنیفہ نعمان بن ثابت خزازی رضی اللہ عنہ ہیں آپ عبادات و مجاہدات و طریقت کے اصول میں عظیم الشان مرتبہ پر فائز ہیں ابتدائی زندگی میں آپ نے لوگوں کے اژدہام سے کنارہ کش ہو کر گوشہ نشینی کا قصد فرمایا تا کہ لوگوں میں عزت و حشمت پانے سے دلوں کو پاک و صاف رکھیں اور دن و رات اللہ تعالیٰ کی عبادت میں مصروف و منہمک رہیں مگر ایک رات آپ نے خواب میں دیکھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے استخوان مبارک کو جمع کر رہے ہیں اور بعض کو بعض کے مقابلہ میں انتخاب کر رہے ہیں اس خواب سے آپ بہت پریشان ہوئے اور حضرت محمد بن سیرین رضی اللہ عنہ کے ایک مصاحب سے اس خواب کی تعبیر دریافت کی انہوں نے جواب دیا کہ آپ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے علم مبارک اور آپ کی سنت کی حفاظت میں ایسے بلند درجہ پر فائز ہوں گے۔ گویا آپ ان میں تصرف کر کے صحیح و سقیم کو جدا جدا کریں گے دوسری مرتبہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو خواب میں دیکھا حضور نے فرمایا اے ابوحنیفہ! تمہیں میری سنت کے زندہ کرنے کے لیے پیدا کیا گیا ہے۔ تم گوشہ نشینی کا خیال دل سے نکال دو۔

آپ بکثرت مشائخ متقدمین کے استاذ ہیں چنانچہ حضرت ابراہیم بن ادہم فضیل بن عیاض، داؤد طائی اور حضرت بشر حافی وغیرہ رحمہم اللہ نے آپ سے اکتساب فیض کیا ہے علماء کے درمیان یہ واقعہ مشہور ہے کہ آپ کے زمانہ میں ابو جعفر المنصور خلیفہ تھا اس نے یہ انتظام کیا کہ چار علماء میں سے کسی ایک کو قاضی بنا دیا جائے۔ ان چاروں میں امام اعظم رحمۃ اللہ کا نام بھی شامل تھا بقیہ تین فرد، حضرت سفیان ثوری، صلہ بن الشیم اور شریک رحمہم اللہ تھے یہ چاروں بڑے متبحر عالم تھے۔ فرستادہ کو بھیجا کہ ان چاروں کو دربار میں لے کر آئے۔ چنانچہ جب یہ چاروں یکجا ہو کر روانہ ہوئے تو راہ میں امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا میں اپنی فراست کے مطابق ہر ایک کے لیے ایک ایک بات تجویز کرتا ہوں سب نے کہا آپ جو تجویز فرمائیں گے درست ہی ہوگا آپ نے فرمایا میں تو کسی حیلہ سے اس منصب قضا کو خود سے دور کر دوں گا۔ صلہ بن الشیم خود کو دیوانہ بنالیں، سفیان ثوری بھاگ جائیں اور شریک قاضی بن جائیں چنانچہ حضرت سفیان

ثوری نے اس تجویز کو پسند کیا اور راستے ہی سے بھاگ کھڑے ہوئے ایک کشتی میں گھس کر کہنے لگے مجھے پناہ دو لوگ میرا سر کاٹنا چاہتے ہیں اس کہنے میں ان کا اشارہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد کی طرف تھا کہ "مَنْ جُعِلَ قَاضِیًا فَقَدْ ذُبِحَ بِغَیْرِ سِکِّیْنٍ" (ابن ماجہ) جسے قاضی بنایا گیا اسے بغیر چھری کے ذبح کر دیا گیا۔ ملاح نے انہیں کشتی کے اندر چھپا دیا بقیہ تینوں علماء کو منصور کے روبرو پہنچا دیا گیا۔ ملاح نے انہیں کشتی کے اندر چھپا دیا۔ بقیہ تینوں علماء کو منصور کے روبرو پہنچا دیا گیا منصور نے امام اعظم کی طرف متوجہ ہو کر کہا آپ منصب قضا کے لیے بہت مناسب ہیں امام اعظم نے فرمایا اے امیر! میں عربی نہیں ہوں اس لیے سردارِ عرب میرے حاکم بننے پر راضی نہ ہوں گے منصور نے کہا اول تو یہ منصب نسبت و نسل سے تعلق نہیں رکھتا یہ علم و فراست سے تعلق رکھتا ہے چونکہ آپ تمام علمائے زمانہ سے افضل ہیں اس لیے آپ ہی اس کے لیے زیادہ موزوں و لائق ہیں۔ امام اعظم نے فرمایا میں اس منصب کے لائق نہیں پھر فرمایا میرا یہ کہنا کہ میں اس منصب کے لائق نہیں اگر سچ ہے تو میں اس کے لائق نہیں اور اگر جھوٹ ہے تو جھوٹے کو مسلمانوں کا قاضی نہیں بنانا چاہیے چونکہ تم خدا کی مخلوق کے حاکم ہو تو تمہارے لیے ایک جھوٹے کو اپنا نائب بنانا اور لوگوں کے اموال کا معتمد اور مسلمانوں کے ناموس کا محافظ مقرر کرنا مناسب نہیں ہے اس حیلہ سے آپ نے منصب قضا سے نجات پائی۔

اس کے بعد منصور نے حضرت صلہ بن اشیم کو بلایا انہوں نے خلیفہ کا ہاتھ پکڑ کر فرمایا اے منصور تیرا کیا حال ہے اور تیرے بال بچے کیسے ہیں؟ منصور نے کہا یہ تو دیوانہ ہے اسے نکال دو اس کے بعد حضرت شریک کی باری آئی ان سے کہا آپ کو منصب قضا ملنا چاہیے انہوں نے فرمایا میں سودائی مزاج کا آدمی ہوں اور میرا دماغ بھی کمزور ہے منصور نے جواب دیا اعتدالِ مزاج کے لیے شربت و شیرے وغیرہ استعمال کرنا تا کہ دماغی کمزوری دور ہو کر عقل کامل حاصل ہو جائے غرض کہ منصب قضا حضرت شریک کے حوالہ کر دیا گیا اور امام اعظم نے انہیں چھوڑ دیا اور پھر کبھی بات نہ کی اس واقعہ سے آپ کا کمال دو حیثیت سے ظاہر ہے ایک یہ کہ آپ کی فراست اتنی ارفع و اعلیٰ تھی کہ آپ پہلے ہی سب کی خصلت و عادت کا جائزہ لے کر صحیح اندازہ

لگالیا کرتے تھے اور دوسرے یہ کہ سلامتی کی راہ پر گامزن رہ کر خود کو مخلوق سے بچائے رکھنا تا کہ مخلوق میں ریاست و جاہ کے ذریعہ نخوت نہ پیدا ہو جائے یہ حکایت اس امر کی قوی دلیل ہے کہ اپنی صحت و سلامتی کے لیے کنارہ کشی بہتر ہے حالانکہ آج حصولِ جاہ و مرتبہ اور منصب قضا کی خاطر لوگ سرگرداں رہتے ہیں کیونکہ لوگ خواہش نفسانی میں مبتلا ہو کر راہ حق وصواب سے دور ہو چکے ہیں اور لوگوں نے امراء کے دروازوں کو قبلہ حاجات بنا رکھا ہے اور ظالموں کے گھروں کو اپنا بیت المعمور سمجھ لیا ہے اور جابروں کی مسند کو ''قاب قوسین اوادنیٰ'' کے برابر جان رکھا ہے۔ جو بات بھی ان کی مرضی کے خلاف ہو وہ اس سے انکار کر دیتے ہیں۔

حکایت:

غزنی میں ایک مدعیٔ علم و امامت سے ملاقات ہوئی اس نے کہا کہ گدڑی پہننا بدعت ہے، میں نے جواب دیا حشیشی اور دبیقی لباس جو کہ خالص ریشم کا ہوتا ہے جسے شریعت نے حرام قرار دیا ہے اس کو پہننا اور ظالموں کی منت وسماجت اور تملق و چاپلوسی کرنا تا کہ اموالِ حرامِ مطلق مل سکے کیا یہ جائز ہے؟ کیا شریعت نے اسے حرام نہیں کیا ہے؟ اسے بدعت کیوں نہیں کہتے؟ بھلا وہ لباس جو حلال ہو اور حلال مال سے بنا ہو وہ کیسے حرام ہو سکتا ہے اگر تم پر نفس کی رعونت اور طبیعت کی ضلالت مسلط نہ ہوتی تو تم اس سے زیادہ پختہ بات کہتے کیونکہ ریشمی لباس عورتوں کے لیے حلال ہے اور مردوں پر حرام اور جو دیوانے اور پاگل ہیں جن میں عقل و شعور نہیں ان کے لیے وہ مباح ہے۔ اگر ان دونوں باتوں کے قائل ہو کر خود کو معذور گردانتے ہو تو افسوس کا مقام ہے۔

حکایت:

سیدنا امام اعظم ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ جب حضرت نوفل بن حبان رضی اللہ عنہ کا انتقال ہوا تو میں نے خواب میں دیکھا کہ قیامت برپا ہے اور تمام لوگ حساب گاہ میں کھڑے ہیں میں نے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا کہ آپ حوضِ کوثر کے کنارے کھڑے

ہیں اور آپ کے دائیں بائیں بہت سے بزرگ موجود ہیں میں نے دیکھا کہ ایک بزرگ جن کا چہرہ نورانی اور بال سفید ہیں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے رخسار مبارک پر اپنا رخسار رکھے ہوئے ہیں اور ان کے برابر حضرت نوفل موجود ہیں جب حضرت نوفل نے مجھے دیکھا تو وہ میری طرف تشریف لائے اور سلام کیا میں نے ان سے کہا مجھے پانی عنایت فرمائیں انہوں نے فرمایا میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے اجازت لے لوں پھر حضور نے انگشت مبارک سے اجازت مرحمت فرمائی اور انہوں نے مجھے پانی دیا اس میں سے کچھ پانی تو میں نے پیا اور کچھ اپنے رفقاء کو پلایا لیکن اس پیالہ کا پانی ویسا کا ویسا ہی رہا کم نہیں ہوا پھر میں نے حضرت نوفل سے پوچھا حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی داہنی جانب کون بزرگ ہیں؟ فرمایا یہ حضرت ابراہیم خلیل اللہ علیہ السلام ہیں اور حضور کی بائیں جانب حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ ہیں اسی طرح میں معلوم کرتا رہا یہاں تک کہ سترہ بزرگوں کی بابت دریافت کیا جب میری آنکھ کھلی تو ہاتھ کی انگلیاں سترہ عدد پر پہنچ چکی تھیں۔

حکایت:

حضرت یحییٰ بن معاذ رازی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ میں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو خواب میں دیکھا تو میں نے عرض کیا "یا رسول اللہ این اطلبك" اے اللہ کے رسول آپ کو (روز قیامت) کہاں تلاش کروں؟ "قال عند علم ابی حنیفة" فرمایا ابوحنیفہ کے علم میں (یا) ان کے جھنڈے کے پاس۔ حضرت امام اعظم رضی اللہ عنہ کا ورع اور آپ کے فضائل ومناقب اس کثرت سے منقول ومشہور ہیں کہ ان سب کے بیان کی یہ کتاب متحمل نہیں ہوسکتی۔

حضرت داتا گنج بخش رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ میں ملکِ شام میں مسجد نبوی شریف کے موذن حضرت بلال حبشی رضی اللہ عنہ کے روضہ مبارک کے سرہانے سویا ہوا تھا خواب میں دیکھا کہ میں مکہ مکرمہ میں ہوں اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم ایک بزرگ کو آغوش میں بچے کی طرح لیے ہوئے بابِ شیبہ سے داخل ہو رہے ہیں میں نے فرط محبت میں دوڑ کر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے قدم مبارک کو بوسہ دیا میں اس حیرت وتعجب میں تھا کہ یہ بزرگ کون ہیں۔ حضور صلی اللہ علیہ

وسلم کو اپنی معجزانہ شان سے میری باطنی حالت کا اندازہ ہوا تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا یہ تمہارے امام ہیں جو تمہارے ہی ولایت کے ہیں یعنی ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ۔ اس خواب سے یہ بات منکشف ہوئی کہ آپ کا اجتہاد حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی متابعت میں بے خطا ہے اس لیے کہ وہ حضور کے پیچھے خود نہیں جا رہے تھے بلکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم خود انہیں اٹھائے لیے جا رہے تھے۔ کیونکہ وہ باقی الصفت یعنی تکلف و کوشش سے چلنے والے نہیں تھے بلکہ فانی الصفت اور شرعی احکام میں باقی و قائم تھے جس کی حالت باقی الصفت ہوتی ہے وہ خطا کار ہوتا ہے یا راہ یاب لیکن جب انہیں لے جانے والے حضور صلی اللہ علیہ وسلم خود ہیں تو وہ فانی الصفت ہو کر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی صفتِ بقا کے ساتھ قائم ہوئے چونکہ حضور سے خطا کے صدور کا امکان ہی نہیں اس لیے جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ قائم ہوا اس سے خطا کا امکان نہیں یہ ایک لطیف اشارہ ہے۔

حکایت:

حضرت داؤد طائی رحمۃ اللہ علیہ جب حصول علم سے فارغ ہو گئے اور ان کا شہرہ آفاق میں پھیل گیا اور یگانہ روزگار عالم تسلیم کیے گئے تب وہ حضرت امام اعظم رحمۃ اللہ کی خدمت میں اکتساب فیض کے لیے حاضر ہوئے اور عرض کیا کہ اب کیا کروں؟ امام اعظم رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا "علیك بالعمل فان العلم بلا عمل كالجسد بلا روح" یعنی اب تمہیں اپنے علم پر عمل کرنا چاہیے کیونکہ بلا عمل کے علم ایسا ہے جیسے بلا روح کے جسم ہوتا ہے عالم جب تک باعمل نہیں ہوتا اسے صفائے قلب اور اخلاص حاصل نہیں ہوتا جو شخص محض علم پر ہی اکتفا کر لے وہ عالم نہیں ہے عالم کے لیے لازم ہے کہ وہ محض علم پر قناعت نہ کرے کیونکہ عین علم کا اقتضا یہی ہے کہ باعمل بن جائے جس طرح کہ عین ہدایت، مجاہدے کی مقتضی ہے اور جس طرح مشاہدہ بغیر مجاہدے کے حاصل نہیں ہوتا اسی طرح علم بغیر عمل کے سودمند نہیں ہوتا کیونکہ علم عمل کی میراث ہے علم میں نور و وسعت اور ان کی منفعت عمل ہی کی برکت کا ثمرہ ہوتا ہے کسی صورت سے بھی علم عمل سے جدا نہیں کیا جا سکتا جیسے کہ آفتاب کا نور کہ وہ عین آفتاب سے ہے

اس سے جدا نہیں ہوسکتا یہی حال علم وعمل کے مابین ہے ابتدائے کتاب میں علم وعمل پر کچھ بحث کی جاچکی ہے۔ وباللہ التوفیق۔

(۷) حضرت عبداللہ بن مبارک مروزی رحمتہ اللہ علیہ:

تبع تابعین میں سے امام طریقت، سید زہاد، قائداوتاد، حضرت عبداللہ بن المبارک مروزی رحمتہ اللہ علیہ ہیں۔ آپ مشائخ طریقت میں بڑی قدر ومنزلت والے اور اپنے وقت میں طریقت وشریعت کے اسباب واحوال اور اقوال کے عالم وامامِ زمانہ تھے اکابر مشائخ طریقت کے صحبت یافتہ صاحبِ تصانیف کثیرہ اور تمام علوم وفنون کے ماہر تھے آپ کی کرامتیں بکثرت مشہور ہیں آپ کی توبہ کا واقعہ عجیب وعبرتناک ہے آپ ایک حسین وجمیل باندی کے عشق میں مبتلا ہو گئے ایک رات اپنے ایک دوست کو لے کر اپنی معشوقہ کی دیوار کے نیچے جاکر کھڑے ہو گئے وہ معشوقہ بھی چھت پر آ گئی۔ صبح تک یہ دونوں ایک دوسرے کے نظارے میں مست رہے جب فجر کی اذان ہوئی تو آپ نے گمان کیا کہ عشاء کی اذان ہوئی ہے لیکن جب دن چڑھا تو سمجھے کہ تمام رات اس کے حسن کے نظارے میں بیت گئی ہے یہی بات آپ کی تنبیہ کا موجب بنی دل پر چوٹ پڑی تو کہنے لگے کہ اے مبارک کے بیٹے تجھے شرم کرنی چاہیے کہ نفس کی خواہش کے پیچھے ساری رات ایک پاؤں پر کھڑے کھڑے گزاردی اسی پر تو اعزاز و بزرگی کا خواستگار ہے۔ اگر امام نماز میں کسی سورۃ کو طول دے دے تو تو گھبرا جاتا ہے اس پر بھی تو مومن ہونے کا دعویٰ کرتا ہے اسی وقت آپ نے صدق دل سے توبہ کی اور تحصیل علم اور اس کی طلب میں مشغول ہو گئے اور ایسی زہد ودین داری کی زندگی اختیار کی کہ ایک روز اپنی والدہ کے باغ میں سو رہے تھے آپ کی والدہ نے دیکھا کہ ایک سانپ منہ میں ریحان کی ٹہنی لیے آپ کے چہرے سے مکھی اور مچھر اڑا رہا ہے۔

آپ نے مرو چھوڑ کر عرصہ دراز تک بغداد میں اقامت فرمائی اور بکثرت مشائخ طریقت کی صحبت میں رہے اس کے بعد کچھ عرصہ تک مکہ مکرمہ میں بھی رہے پھر اپنے وطن مرو واپس تشریف لے آئے اور تعلیم وتدریس میں مشغول ہو گئے شہر کی نصف آبادی کی ظاہر حدیث

پرعمل کرتی اور شہر کی نصف آبادی راہِ طریقت پر چلتی تھی چونکہ شہر کے دونوں فریق آپ کو اپنا بزرگ مانتے تھے اور آپ سے راضی و متعلق رہتے تھے اس بنا پر آپ کو "رضی الفریقین" کے لقب سے سب پکارتے تھے آپ نے اس جگہ دو کمرے بنائے۔ایک متبعین احادیث کے لیے اور ایک اہل طریقت کے لیے یہ دونوں کمرے آج تک انہیں قدیم بنیادوں پر قائم ہیں اس کے بعد آپ وہاں سے حجاز آ گئے اور یہیں پر سکونت اختیار کر لی۔

آپ سے لوگوں نے پوچھا آپ نے کونسی عجیب و غریب چیز دیکھی ہے؟ فرمایا میں نے ایک راہب کو دیکھا جس کا بدن ریاضت و مجاہدے سے لاغر و نحیف ہو گیا تھا اور اس کی کمر دوہری ہو چکی تھی میں نے اس سے پوچھا اے راہب! خدا تک رسائی کی کونسی راہ ہے؟ اس نے کہا "لو عرفت الله لعرفت الطریق الیه" اگر تم اللہ کو جانتے ہو تو اس تک رسائی کی راہ بھی جانتے ہو گے؟ پھر کچھ دیر بعد اس نے کہا مجھے دیکھو میں اسے نہیں جانتا لیکن اس کی عبادت میں میں نے اپنا یہ حال بنالیا ہے۔تم اسے جانتے ہو لیکن تم اس سے دور ہو مطلب یہ کہ معرفت کا اقتضاء یہ ہے کہ اس کی خشیت دل میں ہمہ وقت رہے لیکن میں دیکھ رہا ہوں کہ تم اس سے بے خوف ہو اور میں کفر و جہالت میں مبتلا ہونے کے باوجود اس سے خوفزدہ ہوں حضرت عبداللہ بن المبارک رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ میں نے راہب کی یہ نصیحت گرہ میں باندھ لی ہے اس نے مجھے بہت سے ناجائز افعال سے باز رکھا ہے آپ کا ایک قول یہ ہے کہ "السکون حرام علیٰ قلوب اولیائه" خدا کے دوستوں کا دل ہرگز ساکن نہیں ہوتا وہ ہمیشہ بے قرار رہتے ہیں کیونکہ اس طبقہ پر سکون و آرام حرام ہے اس کی وجہ یہ کہ چونکہ وہ دنیا میں حصول مقصد کی خاطر بے قرار ہوتے ہیں اور آخرت میں منزل مقصود حاصل ہونے کی خوشی میں کیونکہ دنیا میں حق تعالیٰ سے غائب ہونے کی وجہ سے ان پر سکون و آرام جائز نہیں ہوتا اور عقبیٰ میں بارگاہِ حق میں اس کی تجلی و رویت کی وجہ سے انہیں قرار نہیں آتا ان کے لیے دنیا عقبیٰ کی مانند اور عقبیٰ دنیا کی مانند ہے کیونکہ دل کو سکون یا تو مقصود و مراد کو پالینے سے حاصل ہوتا ہے یا اپنے مقصود و مراد سے بے خبر و غافل ہونے سے اللہ تعالیٰ کے دوستوں کے لیے اپنے مقصود و مراد سے بے خبری و غفلت

دنیا و آخرت دونوں جگہ جائز نہیں اس لیے محبت کی وارفتگی سے دل کو قرار کیسے حاصل ہو؟ و باللہ اعلم۔

(۸) حضرت فضیل بن عیاض رحمۃ اللہ علیہ:

طریقت کے اماموں میں ایک، واصلین حق کے سردار، مقربین بارگاہ کے بادشاہ حضرت ابوعلی فضیل بن عیاض رحمۃ اللہ علیہ ہیں۔ فقرا میں آپ کا بڑا مرتبہ ہے طریقت میں آپ کو کامل مہارت اور پورا شغف حاصل تھا مشائخ طریقت کے درمیان آپ بہت مشہور و معروف ہیں آپ کے احوال صدق و صفا سے معمور تھے آپ ابتداء عمر میں جرائم پیشہ آدمی تھے مرو اور ماورد کے درمیان رہزنی کا مشغلہ تھا اس کے باوجود آپ کی طبیعت ہر وقت مائل بہ اصلاح رہتی تھی چنانچہ جس قافلہ میں کوئی عورت ہوتی تو اس کے قریب تک نہ جاتے جس کے پاس مال تھوڑا ہوتا اس سے تعرض نہ کرتے اور ہر شخص کے پاس کچھ نہ کچھ مال ضرور چھوڑ دیتے تھے آپ کی توبہ کا واقعہ بڑا عجیب ہے ایک سوداگر مرو سے ماورد جا رہا تھا مرو کے لوگوں نے اس سوداگر سے کہا مناسب ہے کہ ایک سرکاری حفاظتی دستہ ساتھ لے کر چلو کیونکہ راہ میں فضیل راہزنی کرتا ہے سوداگر نے جواب دیا میں نے سنا ہے کہ وہ رحم دل اور خداترس آدمی ہے سوداگر نے حفاظتی دستہ کی بجائے ایک خوش آواز قاری کو اجرت پر لے کر اونٹ پر بٹھا دیا اور روانہ ہو گیا قاری دن و رات راستہ میں تلاوت قرآن کرتا رہا یہاں تک کہ یہ قافلہ اس مقام تک پہنچ گیا جہاں یہ گھات لگائے بیٹھے تھے اتفاق سے قاری نے یہ آیت تلاوت کی "اَلَمْ یَاْنِ لِلَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اَنْ تَخْشَعَ قُلُوْبُهُمْ لِذِكْرِ اللّٰهِ وَمَا نَزَلَ مِنَ الْحَقِّ" یعنی کیا ابھی تک مومنوں کے لیے وہ وقت نہیں آیا کہ وہ ذکر الٰہی اور حق کی طرف سے نازل کیے ہوئے احکام کے آگے اپنے دلوں کو جھکائیں حضرت فضیل نے جب یہ سنا تو ان کے دل پر رقت طاری ہو گئی فضیل کے دل پر فضلِ خدا نے غلبہ دکھایا اور اسی لمحہ انہوں نے رہزنی سے توبہ کر لی جن جن کے مال لوٹے تھے ان کے نام لکھ رکھے تھے ان سب کو راضی کیا اس کے بعد مکہ مکرمہ چلے گئے اور عرصہ تک وہاں مقیم رہے اور بکثرت اولیاء اللہ سے ملاقاتیں کیں پھر وہ کوفہ آ گئے اور حضرت امام اعظم ابوحنیفہ رضی اللہ عنہ کی

مجلس مبارک میں مدت تک رہے ان سے بکثرت روایات مروی ہیں جو محدثین کے نزدیک بہت مقبول ہیں۔

حضرت فضیل بن عیاض رحمۃ اللہ علیہ تصوف کے حقائق و معرفت میں اعلیٰ درجہ کی گفتگو کرتے تھے چنانچہ آپ کا قول ہے کہ "من عرف اللہ حق معرفتہ' عبدہ بکل طاقۃ" جسے اللہ تعالیٰ کی کما حقہ معرفت حاصل ہوگئی وہ مقدور بھر اس کی عبادت میں مشغول ہو گیا اس لیے کہ اس کی معرفت، اس کے احسان و کرم کی پہچان کی وجہ سے حاصل ہوتی ہے اور جب اس کے احسان و کرم کی پہچان ہو جائے تو اس نے اس کو دوست بنالیا اور جب اسے دوست بنالیا تو گویا اس نے مقدور بھر طاعت و عبادت کرلی کیونکہ دوست کا کوئی حکم مشکل و دشوار نہیں ہوتا اسی بنا پر جتنی دوستی زیادہ ہوگی اتنا ہی طاعت و عبادت کا ذوق بڑھتا جائے گا اور دوستی کی زیادتی ہی معرفت کی حقیقت ہے چنانچہ ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ ایک رات حضور اکرم صلی اللہ علی وسلم میرے پاس سے اٹھے پھر آپ میری نظروں سے اوجھل ہو گئے مجھے خیال گزرا کہ شاید کسی دوسرے حجرے میں تشریف لے گئے ہیں میں اٹھی اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پیچھے چل دی یہاں تک کہ میں نے دیکھا کہ آپ مسجد میں نماز پڑھ رہے ہیں اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی آنکھوں سے آنسو جاری ہیں پھر حضرت بلال رضی اللہ عنہ آئے اور انہوں نے صبح کی اذان دی اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم بدستور نماز میں مشغول رہے نماز صبح ادا فرمانے کے بعد حضور صلی اللہ علیہ وسلم حجرے میں تشریف لائے تو میں نے دیکھا کہ آپ کے قدم مبارک پر ورم تھا اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی انگلیوں سے خون جاری تھا میں نے رو کر عرض کیا یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اللہ تعالیٰ نے آپ کو مغفور فرمایا اس بشارت کی موجودگی میں اتنی مشقت کیوں برداشت فرماتے ہیں ایسا تو وہ کرے جس کی آخرت محفوظ نہ ہو آپ نے فرمایا یہ اللہ تعالیٰ کا فضل و احسان ہے "اَفَلَا اَکُوْنُ عَبْدًا شَکُوْرًا" کیا میں خدا کا شکر گزار بندہ نہ ہوں اللہ تعالیٰ تو مجھے ایسی بشارت دے اور تم یہ چاہتی ہو کہ میں اس کی بندگی نہ کروں اور مقدور بھر شکر گزاری بھی نہ کروں۔

نیز حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے شب معراج پچاس نمازیں قبول فرمائی تھیں اور آپ نے انہیں گراں نہ جانا تھا لیکن حضرت موسیٰ علیہ السلام کے بار بار عرض کرنے پر دوبارہ جا جا کر پانچ نمازیں کرائیں اس کی وجہ یہ بھی ہے کہ آپ کی سرشت میں فرمان الٰہی کی مخالفت کا شائبہ بھی نہ تھا۔ "لان المحبة هى الموافقه" اس لیے کہ محبت نام ہی موافقت کا ہے۔

نیز آپ کا ارشاد ہے:

"الدنيا دار المرضىٰ والناس فيها مجانين، وللمجانين فى دار المرضىٰ الغل والقيد"

"یہ دنیا بیماری کا گھر ہے اور لوگ اس پر دیوانے ہیں اور دیوانوں کو بیمارستان میں طوفان وسلاسل سے مقید رکھا جاتا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ ہماری خواہشیں ہماری زنجیریں اور ہمارے گناہ ہماری قید ہیں۔"

حکایت:

حضرت فضل بن ربیع بیان فرماتے ہیں کہ میں خلیفہ ہارون رشید کے ساتھ حج کے لیے مکہ مکرمہ گیا حج سے فارغ ہونے کے بعد ہارون رشید نے مجھ کہا اگر مردانِ خدا میں سے کوئی یہاں موجود ہو تو ہم اس کی زیارت کے لیے جائیں گے میں نے کہا ہاں اس جگہ حضرت عبدالرزاق صنعانی ہیں۔ اس نے کہا مجھے ان کے پاس لے چلو جب ہم ان کے پاس پہنچے تو بہت دیر گفتگو ہوتی رہی رخصت کے وقت ہارون رشید نے مجھ سے کہا ان سے دریافت کرو کہ کیا ان کے ذمہ کچھ قرضہ ہے؟ انہوں نے کہا ہاں قرضہ ہے ہارون رشید نے مجھ سے کہا ان کا قرضہ ادا کردو جب ہم وہاں سے واپس آئے تو اس نے کہا اے فضل! میرا دل کسی اور بزرگ سے بھی ملنے کا متمنی ہے میں کہا یہاں حضرت سفیان بن عیینہ بھی جلوہ گر ہیں۔ اس نے کہا ان کے پاس بھی لے چلو چنانچہ جب حاضر ہوئے تو دیر تک گفتگو ہوتی رہی واپسی کے وقت خلیفہ نے مجھے اشارہ کیا کہ میں ان سے بھی قرض کے بارے میں دریافت کروں میں نے پوچھا تو فرمایا ہاں قرض ہے خلیفہ نے مجھے حکم دیا کہ ان کا قرض بھی ادا کردوں باہر آکر خلیفہ نے مجھ سے کہا اے فضل! ابھی

میرا دل سیر نہیں ہوا کسی اور بزرگ سے بھی ملاقات کراؤ میں نے کہا مجھے یاد آیا یہاں حضرت فضیل بن عیاض بھی تشریف فرما ہیں پھر ہم ان کی خدمت میں حاضر ہوئے وہ اوپر ایک گوشہ میں بیٹھے قرآن کریم کی تلاوت کرر ہے تھے میں نے دستک دی اندر استفسار ہوا کون ہے؟ میں نے جواب دیا امیر المومنین آئے ہیں انہوں نے فرمایا "مالی ولا میر المومنین" مجھے امیر المومنین سے اور نہیں مجھ سے کیا سروکار؟ میں نے کہا سبحان اللہ! کیا حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد نہیں ہے کہ!

لَیْسَ لِلْعَبْدِ اَنْ یَّذِلَّ نَفْسَہٗ فِیْ طَاعَةِ اللّٰہِ. (ابن ماجہ)

"کسی بندے کو لائق نہیں کہ طاعت الٰہی میں خود کو ذلیل کرے۔"

آپ نے فرمایا حضور کا ارشاد حق ہے "اما الرضا فعز عند اھلہ" لیکن رضائے الٰہی اس کے حضور میں دائمی عزت ہے تم میری اس حالت کو ذلیل گمان کرتے ہو حالانکہ میں طاعتِ الٰہی میں اپنی عزت جانتا ہوں اس کے بعد نیچے آ کر دروازہ کھول دیا اور چراغ بجھا دیا اور مکان کے ایک کونے میں جا کر کھڑے ہو گئے مصافحہ کے وقت ہارون رشید کا ہاتھ ان کے ہاتھ سے مس ہوا تو حضرت فضیل نے فرمایا افسوس ہے کہ اتنا نرم و نازک ہاتھ دوزخ میں جلے گا کاش کہ یہ ہاتھ خدا کے عذاب سے محفوظ رہتا ہارون رشید یہ سن کر رونے لگے اور اتنا رویا کہ بیہوش ہو کر گر پڑا جب ہوش آیا تو کہنے لگا اے فضیل! مجھے کوئی نصیحت فرمایئے؟ آپ نے فرمایا اے امیر المومنین تیرا باپ، حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا چچا تھا انہوں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے درخواست کی کہ مجھے اپنی قوم پر امیر بنا دیجئے حضور نے فرمایا اے چچا! میں نے تم کو تمہاری جان پر امیر بنا دیا کیونکہ ایک سانس اگر طاعتِ الٰہی میں گزرے تو وہ اس سے بہتر ہے کہ لوگ ہزار سال تک تمہاری فرمانبرداری کریں۔ "لان الامارة یوم القیٰمة الندامة" اس لیے کہ امیری سے قیامت کے دن بجز ندامت و شرمندگی کے کچھ حاصل نہ ہوگا۔

ہارون رشید نے کہا کچھ اور بھی نصیحت فرمایئے حضرت فضیل نے فرمایا جب حضرت عمر بن عبدالعزیز رضی اللہ عنہ کو لوگوں نے خلافت پر فائز کرنا چاہا تو انہوں نے سالم بن عبداللہ،

رجاء بن حَیوۃ اور محمد بن کعب قرظی کو بلایا اور ان سے کہا لوگوں نے مجھے اس بلا و مصیبت میں پھنسا دیا ہے مجھے کیا تدبیر کرنی چاہیے کیونکہ امارت کو میں بلا سمجھتا ہوں اگر چہ لوگ اسے نعمت خیال کرتے ہیں ان میں سے ایک نے کہا! اے عمر بن عبدالعزیز! اگر آپ چاہتے ہیں کہ روز قیامت عذابِ الٰہی سے رستگاری ہو تو مسلمان بزرگوں اور بوڑھوں کو اپنے باپ کی مانند اور جوانوں کو بھائی اور بچوں کو اپنی اولاد کی مانند سمجھیں اور ان سب کے ساتھ وہی سلوک کیجئے جو خاندان کا سربراہ باپ اپنے بھائیوں اور فرزندوں اور دیگر عیال کے ساتھ کرتا ہے۔ کیونکہ یہ مما لک اسلامیہ ایک گھر کی مانند ہیں اور ان میں رہنے والے اہل وعیال، "زرابــاك واكـرم اخــاك و احســن عـلـى ولـدك" اپنے بڑوں کی زیارت کرو اور بھائیوں کی عزت کرو اور چھوٹوں سے پیار و محبت کرو اس کے بعد حضرت فضیل رحمتہ اللہ علیہ نے فرمایا اے امیر المومنین مجھے اندیشہ ہے کہ کہیں تمہارا یہ خوبصورت چہرہ دوزخ کی آگ میں نہ جھلسایا جائے خدا کا خوف رکھو اور اس کا حق بہترین طریق پر ادا کرو اس کے بعد ہارون رشید نے عرض کیا آپ پر کچھ قرض ہے؟ حضرت فضیل نے جواب دیا ہاں خدا کا قرض میری گردن پر ہے وہ اس کی اطاعت ہے میں فکر مند ہوں کہ اس وجہ میں میری گرفت نہ ہو جائے۔ ہارون رشید نے عرض کیا بار قرض سے میری مراد لوگوں کا قرض ہے؟ آپ نے فرمایا اللہ عز و جل کا شکر و احسان ہے اس نے مجھے بہت کچھ نعمت دے رکھی ہے مجھے کوئی شکوہ نہیں ہے کہ لوگوں سے بیان کرتا پھروں۔ ہارون رشید نے ایک ہزار اشرفیوں کی تھیلی آپ کے آگے رکھ دی اور عرض کیا اسے اپنی ضرورتوں پر خرچ فرمایئے حضرت فضیل نے فرمایا اے امیر المومنین میری اتنی نصیحتوں نے تم پر کچھ اثر نہیں کیا اور ابھی تک ظلم واستبداد کی روش پر قائم ہو؟ ہارون رشید نے کہا میں نے آپ پر کیا ظلم واستبداد کیا ہے فرمایا میں تمہیں نجات کی طرف بلاتا ہوں اور تم مجھے ابتلاء میں ڈالنا چاہتے ہو کیا یہ ظلم و جفا نہیں ہے؟ یہ سن کر ہارون رشید اور فضل بن ربیع دونوں رونے لگے اور روتے ہوئے باہر آگئے اس کے بعد ہارون رشید نے مجھے کہا اے فضل بن ربیع! بادشاہ درحقیقت حضرت فضیل ہیں اور یہ سب ان کے دبدبہ کی دلیل ہے جو دنیا اور دارالآخرت میں انہیں حاصل ہے دنیا کی تمام زیب و زینت

ان کی نظر میں بے وقعت اور حقیر ہیں اہل دنیا کی خاطر تواضع کرنی بھی انہوں نے اسی لیے ترک کر رکھی ہے۔

آپ کے فضائل و مناقب اس سے کہیں زیادہ ہیں جتنے کہ لکھے جاسکتے ہیں۔ واللہ اعلم بالصواب۔

(۹) حضرت ذوالنون مصری رحمۃ اللہ علیہ:

طریقت کے اماموں میں سے ایک بزرگ سفینۂ تحقیق و کرامت، صمصام شرف اندر ولایت حضرت ابوالفیض ذولنون ابن ابراہیم مصری رحمۃ اللہ علیہ ہیں۔ آپ کا نام ثوبان تھا اور ثوبی نژاد تھے اہلِ معرفت اور مشائخ طریقت میں آپ بڑے برگزیدہ تھے ریاضت و مشقت اور طریق ملامت کو پسند کر رکھا تھا مصر کے تمام رہنے والے آپ کے مرتبہ کی عظمت کے پہچاننے میں عاجز رہے اور اہل زمانہ آپ کے حال سے ناواقف رہے یہاں تک کہ مصر میں کسی نے بھی آپ کے حال و جمال کو انتقال کے وقت تک نہ پہچانا جس رات آپ نے رحلت فرمائی اس رات ستر لوگوں نے حضور سید عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی خواب میں زیارت کی آپ نے ان سے فرمایا خدا کا ایک محبوب بندہ دنیا سے رخصت ہو کر آ رہا ہے میں اس کے استقبال کے لیے آیا ہوں جب حضرت ذوالنون مصری رحمۃ اللہ علیہ نے وفات پائی تو ان کی پیشانی پر یہ لکھا گیا "ھٰذا حبیب اللہ مات فی حب اللہ قتیل اللہ" یہ اللہ کا محبوب ہے اللہ کی محبت میں فوت ہوا یہ خدا کا شہید ہے لوگوں نے جب آپ کا جنازہ کاندھوں پر اٹھایا تو فضا کے پرندوں نے پرے باندھ کر جنازہ پر سایہ کیا ان واقعات کو دیکھ کر اپنے کئے ہوئے ظلم و جفا پر لوگ پشیمان ہوئے اور صدق دل سے توبہ کرنے لگے۔

طریقت و حقیقت اور علوم معرفت میں آپ کے کلمات نہایت عمدہ ہیں آپ نے فرمایا "العارف کل یوم اخشع لانہ فی کل ساعۃ من الرب اقرب" خشیت الٰہی میں عارف کا ہر لحظہ بڑھ کر ہے اس لیے کہ اس کی ہر گھڑی رب سے زیادہ قریب ہے۔ کیونکہ بندہ جتنا زیادہ قریب ہوگا اس کی حیرت و خشوع اور زیادہ ہوگی چونکہ وہ بارگاہِ حق کے دبدبہ کا زیادہ شناسا ہوتا

ہے اور اس کے دل پر جلال حق غالب ہوتا ہے جب وہ خود کو اس سے دور دیکھے گا تو اس کے وصال میں اور کوشش کرے گا اس طرح خشوع بر خشوع کی حالت میں اضافہ ہوتا رہے گا جیسا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے مکالمت کے وقت عرض کیا "**یا رب این اطلبك قال عند المنكسرة قلوبهم**" خدایا تجھے کہاں تلاش کروں! حق نے فرمایا شکستہ دل اور اپنے صفائے قلب سے مایوس شدہ لوگوں کے پاس۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے عرض کیا۔ اے میرے رب! مجھ سے زیادہ شکستہ دل اور ناامید شخص اور کون ہوگا؟ فرمایا میں وہیں ہوں جہاں تم ہو۔ معلوم ہوا کہ ایسا مدعی معرفت جو بے خوف و خشوع ہو وہ جاہل ہے عارف نہیں ہے کیونکہ معرفت کے حقیقت کی علامت صدق ارادت ہے اور صدق ارادت خدا کے سوا ہر سبب کے فنا کرنے والی اور تمام نسبتوں کو قطع کرنے والی ہوتی ہے۔

حضرت ذوالنون مصری رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا "**الصدق سيف الله فى ارضه ماوضع على شئ الاقطعه**" خدا کی سرزمین میں سچائی اس کی تلوار ہے جس چیز پر یہ پڑتی ہے اسے کاٹ دیتی ہے اور صدق یہ ہے کہ مسبب الاسباب کی طرف نظر ہو نہ کہ عالم اسباب کی طرف کیونکہ جب تک سبب قایم و برقرار ہے اس وقت تک صدق ساقد و بعید ہے۔

حکایت:

ایک مرتبہ آپ اپنے ساتھیوں کے ساتھ کشتی میں سوار دریائے نیل میں سفر کر رہے تھے سامنے سے ایک کشتی آرہی تھی جس میں لوگ گا بجا کر خوب خوشیاں منا رہے تھے اور ایک ہنگامہ برپا کر رکھا تھا۔ آپ کے رفقاء نے آپ سے عرض کیا اے شیخ! دعا کیجئے اللہ تعالیٰ ان سب کو غرق کردے تاکہ ان کی نحوست سے مخلوقِ خدا پاک ہو حضرت ذوالنون مصری رحمۃ اللہ علیہ کھڑے ہوگئے اور ہاتھ اٹھا کر دعاء مانگی کہ خدایا جس طرح تو نے دنیا میں آج ان کو خوشی و شادمانی بخشی اسی طرح اس جہان میں ان کو خوشی مسرت عطا فرما۔ آپ کے رفقاء اس دعا کو سن کر حیران رہ گئے جب وہ کشتی آمنے سامنے ہوئی اور لوگوں کی نظریں حضرت ذوالنون مصری رحمۃ اللہ علیہ پر پڑیں تو رو کر معذرت کرنے لگے اور اپنے آلاتِ موسیقی کو توڑ کر دریا میں پھینک

دیا اور تائب ہو کر حق کی طرف متوجہ ہو گئے۔ حضرت ذوالنون مصری رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے رفقاء سے فرمایا اس جہان کی خوشی و مسرت اس جہان میں توبہ کرنے سے حاصل ہوتی ہے دیکھ لو سب کی مرادیں حاصل ہو گئیں تمہاری بھی اور ان کی بھی اور کسی کو کوئی رنج و تکلیف بھی نہ پہنچی یہ واقعہ آپ کی اس شفقت و مہربانی پر دلالت کرتا ہے جو کہ آپ کو مسلمانوں کے ساتھ تھی آپ کی یہ خوبی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اتباع میں تھی کیونکہ کافروں نے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر ظلم و ستم روا رکھنے میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی تھی اس کے باوجود آپ کی صفت رحمت میں کبھی فرق نہ آیا اور کبھی بد دعا نہیں فرمائی بلکہ ہر بار یہی دعا کہ کہ "اَللّٰهُمَّ اهْدِ قَوْمِيْ فَاِنَّهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ" خدایا میری قوم کو ہدایت دے کیونکہ وہ نادان ہیں۔

حضرت ذوالنون مصری رحمۃ اللہ علیہ نے ایک واقعہ اپنے رشد و ہدایت کے بارے میں خود بیان فرمایا ہے۔ کہ میں بیت المقدس سے مصر کی طرف آ رہا تھا مجھے ایک شخص آتا ہوا دکھائی دیا میں نے دل میں یہ خیال کیا کہ اس سے کچھ پوچھنا چاہیے جب قریب آیا تو میں نے دیکھا کہ وہ کبڑی کی بوڑھی عورت ہے پشم کا جبہ پہنے اور ہاتھ میں عصا و لوٹا لیے ہوئے تھی۔ میں نے اس سے پوچھا کہ "من این" کہاں سے آ رہی ہو؟ "قالت من الله" اس نے کہا خدا کی طرف سے۔ "قلت الی این" میں نے کہا اب کدھر کا ارادہ ہے۔ "قالت الی الله" اس نے کہا خدا کی طرف۔ میرے پاس ایک دینار تھا اسے دینا چاہا اس نے ایک طمانچہ میرے رخسار پر مار کر کہا اے ذوالنون! تو نے جو مجھے سمجھا ہے وہ تیری نافہمی ہے میں خدا کے لیے ہی کام کرتی ہوں اسی کی عبادت کرتی ہوں اور اسی سے مانگتی ہوں کسی دوسرے سے کچھ نہیں لیتی یہ کہا اور آگے بڑھ گئی۔

اس واقعہ میں لطیف رمز و اشارہ ہے وہ یہ کہ اس بوڑھی نے کہا "میں خدا کے لیے ہی کام کرتی ہوں" جو صدق و محبت کی دلیل ہے کیونکہ لوگوں کا سلوک دو طرح کا ہوتا ہے۔ ایک یہ کہ وہ جو کام کرتے ہیں اس کے بارے میں یہ گمان رکھتے ہیں کہ اسی کے لیے کیا ہے؟ حالانکہ وہ اپنے ہی لیے کرتے ہیں اگر اس عمل میں خواہشِ نفس کا دخل نہ ہو لیکن یہ خواہش تو بہر حال ہوتی

ہے کہ اس جہان میں اس کا اجر وثواب ملے گا دوسرے یہ کہ وہ اس جہان کے اجر وثواب کی خواہش اور اس جہان میں ریا وسمع کے دخل سے اپنے عمل کو مبرا رکھتے ہیں۔ جو شخص ایسا عمل کرے گا وہ خالص اللہ تعالیٰ کے فرمان کی عظمت اور اس کی محبت کے اقتضاء پر مبنی ہوگا اور اس کے فرمان کی بجا آوری میں اجر وثواب کی طمع نہ ہوگی۔ اول گروہ کی یہ حالت ہے کہ وہ ہر عمل خیر پر گمان رکھتے ہیں کہ اس کے لیے کیا ہے حالانکہ وہ زادِ آخرت کے لیے ہوتا ہے اگر چہ یہ جائز ہے لیکن اسے پہلے تو یہ معلوم ہونا چاہیے کہ فرمانبردار کی طاعت کا اجر اس شخص سے زیادہ ہے جو معصیت میں مبتلا ہو کیونکہ معصیت میں خوشی کچھ دیر کی ہوتی ہے اور طاعت کی خوشی دائمی ہے۔ رب بے نیاز کو مخلوق کے مجاہدے سے کوئی فائدہ نہیں پہنچتا اور نہ ان کے نہ کرنے سے اس کا کچھ نقصان ہے اگر سارا جہان حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے صدق کے ہم پلہ ہو جائے تو اس کا فائدہ انہیں کو ہوگا نہ کہ خدا کو اور اگر سارا جہان فرعون کے مانند خدا کو جھٹلانے لگے تو اس کا نقصان انہیں کو پہنچے گا نہ کہ خدا کو۔ جیسا کہ حق تعالیٰ کا ارشاد ہے "اِنْ اَحْسَنْتُمْ اَحْسَنْتُمْ لِاَنْفُسِكُمْ وَاِنْ اَسَأْتُمْ فَلَهَا" (بنی اسرائیل ۷) اگر تم نیک عمل کرتے ہو تو اپنے لیے ہی اچھا کرتے ہو اور اگر برے عمل کرو تو وہ بھی تمہارے ہی لیے ہے۔ فرمانِ الٰہی ہے "وَمَنْ جَاهَدَ فَاِنَّمَا يُجَاهِدُ لِنَفْسِهٖ اِنَّ اللّٰهَ لَغَنِيٌّ عَنِ الْعٰلَمِيْنَ" (العنکبوت:٦) جو مجاہدہ کرتا ہے وہ اپنے ہی لیے مجاہدہ کرتا ہے کیونکہ اللہ سارے جہان سے بے نیاز ہے۔ لوگ عافیت کے لیے اطاعت کرتے ہیں اور وہ گمان کرتے ہیں کہ خدا کے لیے کر رہے ہیں لیکن اپنے محبوب کی راہ پر چلنا اور ہی چیز ہے ایسے لوگوں کی نگاہیں کسی اور طرف نہیں اٹھتیں۔ واللہ علم۔

(۱۰) حضرت ابراہیم بن ادہم رحمۃ اللہ علیہ:

طریقت کے اماموں میں سے ایک بزرگ، امیر الامراء، سالک طریقت لقا، حضرت ابو اسحاق ابراہیم بن ادہم منصور رحمۃ اللہ علیہ ہیں۔ آپ اپنے زمانہ اور اپنے سلوک میں منفرد اور سید اقران تھے۔ آپ حضرت خضر علیہ السلام کے مرید تھے آپ نے بکثرت قدمائے مشائخ کی صحبت پائی اور حضرت خضر علیہ السلام نے امام اعظم ابوحنیفہ رضی اللہ عنہ کی مجلس میں حاضر ہو کر

تحصیل علم کیا۔ ابتدائے حال یہ ہے کہ آپ بلخ کے امیر تھے ایک دن شکار کے لیے نکلے ایک ہرن کے تعاقب میں گھوڑا ڈال دیا اور لشکر سے بچھڑ گئے اللہ تعالیٰ نے ہرن کو قوتِ گویائی عطا فرمائی اور اس نے بزبانِ فصیح کہا "الھٰذا خلقت ام بھٰذا امرت" اے ابراہیم کیا تم اسی کام کے لیے پیدا کئے گئے ہو؟ یہ بات آپ کی توبہ کا سبب بنی اور آپ نے اسی وقت دنیا سے کنارہ کشی اختیار کر کے زہد و ورع کی زندگی اپنالی اور حضرت فضیل بن عیاض اور حضرت سفیان ثوری کی خدمت میں حاضر ہو کر ان کی صحبت اختیار کی توبہ کے بعد اپنے ہاتھ کمائی کے سوا کچھ نہ کھایا۔ طریقت و معرفت میں آپ کے اشارات ظاہر اور کرامتیں مشہور ہیں۔ تصوف کے حقائق میں آپ کے کمالات نہایت لطیف و نفیس ہیں حضرت جنید بغدادی رحمۃ اللہ علیہ نے آپ کے بارے میں فرمایا "مفاتیح العلوم ابراھیم" حضرت ابراہیم ادہم طریقت و معرفت کے علوم کی کنجیاں ہیں۔

حضرت ابراہیم بن ادہم رحمۃ اللہ نے فرمایا "اتخذ اللہ صاحبا وذر الناس جانبا" اللہ تعالیٰ کی صحبت اختیار کر کے لوگوں کو ایک طرف چھوڑ دو۔ مطلب یہ ہے کہ حق تعالیٰ کے ساتھ جب بندہ کا تعلق خاطر درست ہو اور اس کی محبت میں اخلاص ہو تو حق تعالیٰ سے یہ صحیح تعلق، خلق سے کنارہ کشی کا مقتضی ہوتا ہے اس لیے کہ خلق سے صحبت رکھنا خالق کی باتوں سے جدا ہونا ہے اور اللہ تعالیٰ سے صحبت اسی صورت میں ممکن ہے جب کہ اخلاص کے ساتھ اُس کے احکام کی اطاعت کی جائے اور اطاعت میں اخلاص جب ہی پیدا ہوتا ہے جبکہ محبتِ الٰہی میں خلوص ہو اور حق تعالیٰ سے محبت میں خلوص جب پیدا ہوتا ہے جبکہ وہ نفسانی خواہشات کا دشمن بن جائے۔ جو شخص کہ نفسانی خواہشات کا تابع بنا وہ خدا سے جدا ہو گیا اور جس نے نفسانی خواہشات کو نکال پھینکا وہ رحمتِ الٰہی سے بہرہ ور ہو گا گویا کہ تم اپنے وجود سے خود ہی تمام خلق ہو جب تم نے اپنی ذات سے اعراض کر لیا تو گویا ساری خلقت سے کنارہ کشی اختیار کر لی لیکن وہ شخص جو خلقت سے کنارہ کشی اختیار کر لے مگر اپنی نفسانی خواہش کا غلام بنا رہے تو یہ ظلم ہے کیونکہ ساری خلقت جس حالت میں ہے وہ تو حکم و تقدیر سے ہے مگر تمہارا معاملہ تمہارے ساتھ

ہے۔

استقامتِ ظاہر و باطن:

طالبِ حق کی ظاہری و باطنی استقامت دو چیزوں پر ہے۔ ایک علم سے متعلق ہے دوسری عمل سے۔ جو علم سے متعلق ہے وہ نیک و بد تقدیر کا جاننا ہے اس لیے عالم میں کوئی شخص متحرک کو ساکن اور ساکن کو متحرک نہیں کر سکتا اس لیے کہ ہر چیز کو اور اس میں حرکت و سکون کو اللہ ہی نے پیدا کیا ہے اور جو عمل سے متعلق ہے وہ فرمانِ الٰہی کا بجا لانا ہے۔ معاملہ کی صحت، مکلفاتِ احکامِ الٰہیہ کا تحفظ اور ہر وہ حال جو تقدیرِ الٰہی سے متعلق ہو فرمانِ الٰہی کے ترک کے لیے حجت نہیں بن سکتا لہٰذا خلق سے کنارہ کشی اس وقت تک صحیح نہیں ہو سکتی جب تک کہ وہ خود سے کنارہ کش نہ ہو جائے جب خود سے کنارہ کش ہو جاؤ گے تو تمام خلق سے کنارہ کشی حاصل ہو جائے گی اور یہی حاصلِ مراد ہے جب حق تعالیٰ سے لگاؤ پیدا ہو گیا تو امرِ حق کی اقامت کے لیے ثابت قدمی میسر آ جائے گی معلوم ہوا کہ خلق کے ساتھ کسی حال میں چین و راحت پانا جائز نہیں ہے اگر حق کے سوا کسی غیر سے چین و راحت چاہو گے تو یہ غیر کے ساتھ راحت پانا ہو گا اور یہ بات توحید کے منافی ہے اور اپنی ذات سے آرام پانا تو سراسر نکمہ پن ہے اسی وجہ سے حضرت شیخ ابوالحسن سالبہ رحمۃ اللہ علیہ اپنے مریدوں سے فرمایا کرتے تھے کہ بلی کا حکم ماننا اپنے نفس کی پیروی سے بہتر ہے اس لیے کہ اس سے محبت برائے خدا ہے اور اپنے نفس کی محبت اور اس کی پیروی خواہشات نفسانیہ کی پرورش ہے۔ مزید تفصیل دوسری جگہ آئے گی۔ انشاءاللہ۔

حکایت:

حضرت ابراہیم بن ادہم رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ جب میں بیابان میں پہنچا تو ایک بوڑھے نے مجھ سے کہا اے ابراہیم تم جانتے ہو یہ کونسا مقام ہے جہاں بغیر توشہ کے سفر کر رہے ہو؟ میں نے سمجھ لیا کہ یہ شیطان ہے (جو غیر کی طرف مجھے پھیرنا چاہتا ہے) میرے پاس اس وقت چار سکے تھے جو اس زنبیل کی قیمت کے تھے جسے میں نے کوفہ میں خود فروخت کر

کے حاصل کیا تھا انہیں جیب سے نکال کر پھینک دیا اور عہد کیا کہ ہر میل پر چار سو (۴۰۰) رکعت نماز پڑھوں گا۔ میں چار سال بیابان میں رہا لیکن اللہ تعالیٰ نے ہر وقت بے مشقت مجھے روزی عطا فرمائی اسی اثناء میں حضرت خضر علیہ السلام کی صحبت حاصل ہوئی اور مجھے اسم اعظم کی تعلیم دی اس وقت میرا دل یکدم غیر سے خالی ہو گیا۔ وباللہ التوفیق۔

(۱۱) حضرت بشر بن حافی رحمۃ اللہ علیہ:

طریقت کے اماموں میں سے ایک بزرگ، سریرآرائے معرفت، تاجِ اہل معاملت حضرت بشر بن حافی رحمۃ اللہ علیہ ہیں۔ آپ مجاہدے میں عظیم الشان اور برہانِ کبیر تھے۔ معاملات طریقت میں کامل مہارت رکھتے تھے۔ آپ نے حضرت فضیل بن عیاض رحمۃ اللہ کی صحبت پائی اور اپنے ماموں حضرت علی بن حشرم رحمۃ اللہ علیہ سے بیعت ارادت کی۔ آپ علم اصول وفروع کے عالم تھے۔ ابتداء کا واقعہ یہ ہے کہ آپ ایک دن نشہ کی حالت میں گھر سے نکلے راستہ میں ایک کاغذ کا پرزہ پڑا ملا جس پر "بسم اللہ الرحمٰن الرحیم" تحریر تھا۔ تعظیم سے اٹھا کر خوشبو سے معطر کر کے پاک جگہ میں رکھ دیا اسی رات آپ نے خواب میں دیکھا کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ "یا بشر طیبت اسمی فبعزتی لاطیبن اسمک فی الدنیا والاخرۃ" اے بشر تم نے میرے نام کو خوشبو میں بسایا قسم ہے مجھے اپنی عزت کی میں تمہارے نام کی خوشبو کو دنیا وآخرت میں پھیلاؤں گا یہاں تک کہ جو بھی تمہارا نام لے گا یا سنے گا اس کے دل کو راحت نصیب ہوگی۔ خواب سے بیدار ہوتے ہی توبہ کی اور مضبوطی کے ساتھ طریقۂ زہد پر گامزن ہو گئے۔

حق تعالیٰ کے مشاہدہ کا غلبہ اس حد تک شدید تھا کہ ہمیشہ ننگے پاؤں رہے لوگوں نے برہنہ پا رہنے کی وجہ دریافت کی تو فرمایا زمین خدا کا فرش ہے میں جائز نہیں سمجھتا کہ فرش پر چلوں کہ میرے پاؤں اور اس کے فرش کے درمیان کوئی چیز حائل ہو۔ آپ کی معرفت کا یہ عجیب معاملہ ہے کہ جوتوں کو بھی حجاب سمجھ لیا۔

آپ فرماتے ہیں کہ "من اراد ان یکون عزیزا فی الدنیا وشریفا فی

الآخرة فلیجتنب ثلاثا لا یسأل احد احاجة ولا یذکر احداً بسوءٍ ولا یجیب احداً الی الطعام" جو یہ چاہتا ہے کہ وہ دنیا میں عزت والا اور آخرت میں شرافت والا ہوا سے لازم ہے کہ تین باتوں سے اجتناب کرے۔ ایک یہ کہ کسی سے اپنی ضرورت بیان نہ کرے دوسرے یہ کہ کسی کو برا نہ کہے اور تیسرے یہ کہ کسی کے کھانے کی دعوت قبول نہ کرے کیونکہ جسے اللہ تعالیٰ کی معرفت ہوگی اسے مخلوق کی احتیاج نہ ہوگی چونکہ خلق کی احتیاج عدمِ معرفت کی دلیل ہے اگر وہ خدا کو قاضی الحاجات جانتا تو کسی غیر سے احتیاج برآری نہ چاہے گا۔ "لان استعانة المخلوق الی المخلوق کاستعانة المسجون الی المسجون" اس لیے کہ مخلوق کا مخلوق سے طالب امداد ہونا ایسا ہی ہے جیسے قیدی کا قیدی سے مدد مانگنا۔ کسی کو برا نہ کہنے کی وجہ یہ ہے کہ وہ خدا کے حکم میں تصرف کرتا ہے اس لیے کہ وہ شخص اور اس کا فعل بد دونوں خدا کی مخلوق ہیں اس کی پیدا کردہ چیز کو برا کہنا خدا کی طرف مراجعت کرتا ہے۔ کسی فعل میں عیب ڈالنا یا فاعل میں عیب نکالنا برابر ہے سوائے اس کے کہ خدا نے جسے برا کہا اس کی موافقت میں برا کہا جائے۔ جیسے فساق وفجار اور کفار وغیرہ اسی طرح کسی کے کھانے کی دعوت قبول نہ کرنے کہ وجہ یہ ہے کہ روزی رساں حق تعالیٰ ہے اگر وہ مخلوق کو تیری روزی کا ذریعہ بنائے تو مخلوق کو نہ دیکھو بلکہ یہ دیکو کہ یہ وہ روزی ہے جسے خدا نے تیرے پاس پہنچایا ہے نہ یہ کہ کسی مخلوق نے روزی دی ہے اگر روزی دینے والا بندہ یہ سمجھے کہ یہ روزی اس کی طرف سے ہے اور اس بنا پر تجھ سے احسان جتاتا ہے تو اسے قبول نہ کرو۔ اس لیے کہ روزی میں کسی کا کسی پر احسان نہیں ہے البتہ اہلسنت و جماعت کے نزدیک روزی غذا ہے (جسے خدا نے ان کو ذریعہ بنا کر بھیجا لہٰذا اس کی سپاس وشکر گزاری ضروری ہے) اور معتزلہ کے نزدیک روزی غذا نہیں بلکہ اشیاء میں سے ہے اور یہ کہ اللہ تعالیٰ ہی مخلوق کو غذا کے ذریعہ پالتا ہے نہ کہ کسی مخلوق کا ذریعہ مجازی سبب ہو اس کی اور بھی وجوہات ہیں۔ واللہ اعلم

(۱۲) حضرت بایزید بسطامی رحمۃ اللہ علیہ:

طریقت کے اماموں میں سے ایک بزرگ، معرفت و محبت کے آسمان حضرت

ابو یزید طیفور بن عیسیٰ بسطامی رحمۃ اللہ علیہ ہیں۔آپ تمام مشائخِ طریقت میں جلیل القدر ہیں۔ آپ کا حال سب سے رفیع تر ہے آپ کی جلالت شان کے بارے میں حضرت جنید بغدادی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ "ابو یزید منا بمنزلۃ جبرئیل من الملائکۃ"صوفیاء کرام میں ابو یزید کی شان ایسی ہے جیسے فرشتوں میں جبریل علیہ السلام کی ہے۔

آپ کے آباؤ اجداد بسطام کے رہنے والے مجوسی تھے لیکن آپ کے دادا نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ایسی حدیثیں روایت کی ہیں جن کا مقام بہت بلند ہے۔تصوف میں جو دس (۱۰) امام گزرے ہیں ان میں سے ایک آپ ہیں۔حقائق و معرفت میں آپ سے بڑھ کر کسی کو دسترس اور قوتِ انبساط نہیں ہے طریقت و شریعت کے تمام علوم اور ان کے احوال کے آپ بہت بڑے عالم اور ان سے محبت کرنے والے تھے ملحدین کا وہ مردود گروہ جو خود کو آپ کی وضع و طریق کا پابند بتاتا ہے آپ کا حال ان کے بالکل خلاف تھا آپ کا ابتدائی زمانہ مجاہدے اور تحصیلِ علم طریقت میں گزراتھا آپ خود ہی فرماتے ہیں کہ "عملت فی المجاھدۃ ثلثین سنتہ فما وجدت شیأ اشد علی من العلم ومتابعتہ ولو لا اختلاف العلمآء لبقیت واختلاف العلماء رحمۃ الافی تجرید التوحید" میں نے تیس سال مجاہدے میں گزارے لیکن علم اور اس کی متابعت سے زیادہ سخت و دشوار کوئی چیز مجھ پر نہیں گزری اگر ہر مسئلہ میں علماء کا اختلاف نہ ہوتا تو میں رہ جاتا اور دین حق کی معرفت نہ ہوسکتی حقیقت یہ ہے کہ علماء کا اختلاف رحمت ہے مگر توحید خالص میں اختلاف مضر ہے چونکہ انسانی طبیعت جہل کی طرف زیادہ مائل ہے کیونکہ بے علم آدمی بوجہ جہالت بہت سے کام بے رنج و تعب کر گزرتا ہے لیکن علم کے ساتھ ایک قدم بھی بغیر دشواری کے نہیں چل سکتا۔شریعت کی راہ جہان کی تمام راہوں سے زیادہ باریک و پر خطر ہے ہر حال میں بندے کے لیے یہی سزاوار ہے کہ اگر بلند مقامات اور احوالِ رفیعہ سے گزرنا مشکل ہو تو میدان شریعت میں اتر جائے اس لیے کہ اگر اس سے ہر چیز گم ہو جائے تو وہ شریعت کے دائرے میں تو قائم رہے گا۔مرید کے لیے سب سے بڑی آفت سلوک کے معاملات کا ترک ہے اور مدعیان کاذب کے تمام دعوے

میدانِ شریعت میں پراگندہ ہوجاتے ہیں اور شریعت کے مقابلے میں تمام زبانیں گنگ اور خاموش ہوجاتی ہیں۔

حضرت بایزید بسطامی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ "الجنۃ لا خطرلھا لاھل المحبۃ واھل المحبۃ محجوبون بمحبتھم" اہلِ محبت کے نزدیک جنت کی کوئی قدر و قیمت نہیں وہ تو اپنی محبت میں ہی مستغرق و شیدا رہتے ہیں۔ کیونکہ جنت ایک مخلوق شے ہے اگرچہ وہ بلند عزت ہے لیکن حق تعالیٰ کی محبت ایسی صفت ہے جو غیر مخلوق ہے جو شخص غیر مخلوق سے ہٹ کر مخلوق کی طرف دھیان رکھے گا وہ علائق دنیا میں پھنس کر سبک ہوگا خدا کے محبوبوں کے نزدیک مخلوق کی کوئی عزت و منزلت نہیں ہوتی وہ خدا کی محبت ہی میں مگن رہتے ہیں اس لیے کہ وجود اور ہستی دوئی کو چاہتی ہے اور اصل توحید میں دوئی ناممکن ہے محبوبانِ خدا کا راستہ وحدانیت سے وحدانیت کی طرف ہے اور محبت کی راہ محبت کی علت ہے۔

اگر کوئی مرید اللہ تعالیٰ سے محبت دوستی اس خیال سے کرے کہ وہ مرید ہوجائے یا مراد بن جائے اگرچہ وہ مریدِ حق ہو یا مرادِ بندہ، یا مرادِ حق ہو یا مریدِ بندہ، بہر صورت یہ خیال اس کے لیے آفت ہے اس لیے کہ اگر مریدِ حق ہوکر مرادِ بندہ ہوجائے تو مرادِ حق میں ہستی بندہ ثابت ہوگئی اور اگر مرید بندہ ہوکر مرادِ حق کا طالب ہو تو مخلوق کی ارادت کی وہاں گنجائش نہیں دونوں حالتوں میں یہ آفت ہے کیونکہ محبت میں ہستی کا ثبوت ہے۔ لہٰذا وہی شخص محبِ صادق ہے جو بقائے محبت میں کامل طور سے فنا ہوجائے کیونکہ اس کی فنا ہی میں محبت کی بقا ہے۔

حضرت بایزید بسطامی خود فرماتے ہیں کہ پہلی مرتبہ جب مکہ مکرمہ میں حاضر ہوا تو خالی مکان دیکھ کر میں نے گمان کیا کہ حج مقبول نہیں ہوا کیونکہ میں نے ایسے پتھر تو دنیا میں بہت دیکھے ہیں اور جب دوسری مرتبہ حاضر ہوا تو خانہ کعبہ کو بھی دیکھا اور صاحبِ خانہ کو بھی اس وقت میری سمجھ میں آیا کہ ابھی میں حقیقت توحید سے دور ہوں اور جب تیسری بار حاضر ہوا تو صاحبِ خانہ ہی نظر آیا گھر نظر نہیں آیا اس وقت غیب سے ندا آئی اے بایزید جب تم نے اپنے آپ کو نہ دیکھا اور سارے عالم کو دیکھا تو تم مشرک نہ ہوئے لیکن جب تم نے سارے عالم کو نہ دیکھا اور

اپنے آپ پر نظر رکھی تو اب تم مشرک ہو گئے اسی وقت اس خیال سے توبہ کی۔ بلکہ میں نے توبہ کی اور اپنی ہستی کی رویت سے بھی توبہ کی۔ یہ واقعہ آپ کی درستگی حال میں بہت اہم ولطیف ہے اور صاحبانِ حال کے لیے یہ عمدہ نشانی ہے۔

(۱۳) حضرت حارث محاسبی رحمۃ اللہ علیہ:

طریقت کے اماموں میں سے ایک بزرگ، امامِ فنون جاسوس ظنون، حضرت ابو عبداللہ الحارث اسد محاسبی رحمۃ اللہ علیہ ہیں۔ آپ علم اصول وفروع کے عالم اور اپنے وقت کے تمام اہل عل کے مرجع تھے۔ علم تصوف میں رغائب نامی کتاب آپ ہی کی تصنیف ہے۔ اس کے سوا بکثرت تصانیف ہیں۔ آپ ہر فن میں بلند مرتبہ اور بلند ہمت تھے۔ اپنے زمانہ میں آپ بغداد میں شیخ المشائخ کہلاتے تھے۔ آپ کا ارشاد ہے "**العلم بحر كات القلوب في مطالعة الغيوب اشرف من العمل بحر كات الجوارح**" دل کی حرکتوں کا علم محل غیب میں اس عمل سے زیادہ مشرف ہے جو اعضاء کی حرکتوں سے حاصل کیا جائے۔ اس سے آپ کا مطلب یہ ہے کہ علم محلِ کمال ہے اور جہل مقام طلب اور علم حضوری اس سے بہتر ہے کہ جہل کی چوکھٹ پر کھڑا رہے کیونکہ آدمی کو علم، درجہ کمال تک پہنچاتا ہے اور جہالت تو چوکھٹ سے بھی گزرنے نہیں دیتی۔ درحقیقت علم عمل سے افضل ہے۔ علم ہی کے ذریعہ حق تعالیٰ کی معرفت حاصل ہو سکتی ہے لیکن صرف عمل سے اسے نہیں پا سکتے۔ اگر بغیر علم کے عمل اسے اس تک پہنچا سکتا تو نصاریٰ اور راہب اپنے ریاضت ومجاہدے کی شدّت کی وجہ سے مشاہدے تک پہنچ چکے ہوتے اور مسلمان قلت علم کی بنا پر غیوبت میں نافرمان و نامراد ہوتے۔ معلوم ہوا کہ عمل بندہ کی صفت ہے اور علم خدا کی صفت۔ بعض ناقلوں نے آپ کے مقولہ میں دونوں جگہ عمل کو بیان کیا ہے جو کہ غلط اور محال ہے کیونکہ بندہ کا عمل حرکاتِ قلب سے تعلق نہیں رکھتا اور اگر اس سے فکر اور احوالِ باطن کا مراقبہ مراد ہو تو یہ بذاتِ خود نادر ہے کیونکہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:

تَفَكُّرُ سَاعَةٍ خَيْرٌ مِنْ عِبَادَةِ سِتِّيْنَ سَنَةً

"ایک گھڑی دین میں غور وفکر کرنا ساٹھ سال کی عبادت سے بہتر ہے۔"

درحقیقت اعمال باطن، اعمالِ جوارح یعنی ظاہری عمل سے افضل ہے اور احوال و اعمالِ باطن کی تاثیر درحقیت اعمال ظاہری سے مکمل و جامع ہے۔ بزرگوں کا ارشاد ہے:

"نوم العالم عبادة و سهر الجاهل معصية"

''عالم کا سونا عبادت اور جاہل کا جاگنا معصیت ہے۔''

اس کی وجہ یہ ہے کہ سونے اور جاگنے میں جب اس کا باطن مغلوب ہوتا ہے تو ظاہر یعنی جسم بھی مغلوب ہوجاتا ہے اس لیے غلبہ حق سے باطن کا مغلوب ہونا اس نفس سے بہتر ہے جو مجاہدے کے ظاہری حرکتوں پر نفس کا غلبہ حاصل کرلیتا ہے۔

حکایت:

حضرت مجابی رحمۃ اللہ علیہ نے ایک دن ایک درویش سے فرمایا۔ "کـــن لله الا فلاتکن" خدا کے ہو کے رہو ورنہ خود نہ رہو۔ مطلب یہ کہ حق کے ساتھ باقی رہو اور اپنے وجود سے فانی ہوجاؤ یعنی صفائے باطن کے ساتھ خاطرِ جمع رہو یا فقر سے پراگندہ۔ گویا اپنی ہستی کو فنا کرکے حق کے ساتھ باقی رہو یا اس صفت پر قائم رہو جیسا کہ خدا نے فرمایا:

اسجدو الادم ''آدم کے لیے سجدہ کرو۔''

یا اس فرمانِ الٰہی کی صفت بن جاؤ:

هَلْ اَتٰى عَلَى الْاِنْسَانِ حِيْنٌ مِّنَ الدَّهْرِ لَمْ يَكُنْ شَيْئًا مَّذْكُوْرًا (الدھر:۱)

''کیا انسان پر ایسا وقت نہیں آیا جب کہ وہ قابل ذکر شے نہ تھا۔''

لہٰذا اگر تم اپنے اختیار سے حق کے ساتھ ہوگئے تو روز قیامت اپنی خودی کے ساتھ ہوگے اور اگر اپنے اختیار سے حق کے ساتھ نہ ہوگے بلکہ اختیار کو فنا کردو گے تو قیامت میں حق کے ساتھ ہوگے۔ یہ معنی بہت دقیق ولطیف ہیں۔ واللہ اعلم

(۱۴) حضرت داؤد طائی رحمۃ اللہ علیہ:

طریقت کے اماموں میں سے ایک بزرگ وہ ہیں جو لوگوں سے کنارہ کشی اور حصولِ

جاہ ومرتبہ سے بے نیاز ہیں یعنی حضرت ابوسلیمان داؤد ابنِ طائی رحمۃ اللہ آپ اکابر مشائخ طریقت اور ساداتِ اہل تصوف میں اپنے عہد کے بے نظیر تھے۔امام اعظم ابوحنیفہ رضی اللہ عنہ کے شاگرد اور حضرت فضیل رحمۃ اللہ علیہ اور ابراہیم ادہم رحمۃ اللہ علیہ کے ہمعصر اور حبیب راعی رحمۃ اللہ علیہ کے مرید تھے۔تمام علوم میں کمالِ مہارت اور علم فقہ میں فقیہ الفقہا کہلاتے تھے۔ گوشہ نشینی اختیار کر کے ہر جاہ ومرتبہ سے بے نیاز ہو گئے تھے۔کمالِ زہد وتقوی کے مالک تھے آپ کے فضائل ومناقب اور معاملات عالم میں بہت مشہور ہیں حقائق ومعرفت میں کامل دسترس حاصل تھی آپ نے ایک مرید سے فرمایا:

''ان اردت السلامة سلم علی الدنیا وان اردت الکرامة کبر علی الآخرة''

''اے فرزند اگر تو سلامتی چاہتا ہے تو دنیا کو چھوڑ دے اور اگر بزرگی چاہتا ہے
تو آخرت کے انعام واکرام کی خواہشوں کے گلے پر چھری پھیر دے۔''

کیونکہ یہ دونوں مقام حجاب کے ہیں اور تمام خواہشیں انہی دونوں چیزوں میں مستور ہیں جو شخص جسم سے فارغ ہونا چاہے اس سے کہو کہ دنیا سے کنارہ کش ہو جائے اور جو شخص روح سے فراغت چاہے اس سے کہو کہ آخرت کی خواہش کو دل سے نکال دے۔

آپ حضرت محمد بن حسن رحمۃ اللہ علیہ کی صحبت میں بکثرت رہا کرتے تھے اور حضرت امام ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ کے قریب تک نہ پھٹکتے تھے لوگوں نے ان سے پوچھا یہ دونوں شخص بہت بڑے عالم ہیں کیا وجہ ہے کہ ایک کو تو آپ عزیز رکھتے ہیں اور دوسرے کو قریب تک نہیں آنے دیتے؟ آپ نے فرمایا وجہ یہ ہے کہ حضرت امام محمد بن حسن نے دنیاوی مال دے کر علم حاصل کیا ہے اور ان کا علم، دین کی عزت اور دنیا کی ذلت کا موجب ہے اور امام ابو یوسف نے درویشی ومسکینی دے کر علم حاصل کیا اور اپنے علم کو عزت ومنزلت کا ذریعہ بنایا ہے اس لیے امام محمد ابن حسن ان کے ہم پلہ نہیں ہیں۔

حضرت معروف کرخی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ میں نے حضرت داؤد طائی کی مانند دنیا کو حقیر وکم تر جاننے والا کسی کو بھی نہیں دیکھا اس لیے کہ وہ دنیا اور اہلِ دنیا کو ذلیل وحقیر

جانتے اور فقراء کو چشم کمال سے دیکھتے تھے اگرچہ وہ پر آفت ہو آپ کے مناقب بکثرت ہیں۔
واللہ اعلم

(۱۵) حضرت سری سقطی رحمۃ اللہ علیہ:

طریقت کے اماموں میں سے ایک بزرگ، شیخ اہل طریقت، منقطع از جملہ علائق، حضرت ابوالحسن بن مغلس السقطی رحمۃ اللہ علیہ ہیں۔ آپ حضرت جنید بغدادی رحمۃ اللہ علیہ کے ماموں تھے۔ تصوف کے تمام علوم میں آپ کی بڑی عظمت وشان تھی سب سے پہلے جس نے باطنی مقامات کی ترتیب اور بسط احوال میں غور وخوض کیا ہے وہ آپ ہی تھے عراق کے بکثرت مشائخ آپ کے مرید تھے آپ نے حضرت حبیب راعی کو دیکھا اور ان کی صحبت پائی اور حضرت معروف کرخی رحمۃ اللہ علیہ کے مرید ہوئے۔

آپ بغداد کے بازار میں سقط (کباڑ) فروشی کرتے تھے۔ کسی وجہ سے جب بغداد کا یہ بازار جل گیا تو لوگوں نے خبر دی کہ آپ کی دوکان بھی جل گئی ہے۔ آپ نے فرمایا میں اس کی فکر سے آزاد ہو گیا۔ جب لوگوں نے دیکھا کہ ان کی دوکان محفوظ ہے اور اس کے اردگرد کی تمام دوکانیں جل گئی ہیں تو آپ کو اس کی خبر دی آپ دکان پر تشریف اسے سلامت دیکھ کر اس کا تمام مال واسباب فقراء میں تقسیم کر دیا اور تصوف کی راہ اختیار کر لی۔

لوگوں نے جب ابتدائے حال کی بابت دریافت کیا تو آپ نے فرمایا ایک دن حضرت حبیب راعی رحمۃ اللہ علیہ میری دوکان کے آگے سے گزرے تو میں نے روٹی کا ٹکڑا انہیں دیا جس طرح تمام فقیروں کو دیا جاتا ہے۔ انہوں نے مجھے یہ دُعا دی کہ "خیرك اللہ" یعنی اللہ تجھے خیر کی توفیق دے۔ جب سے میرے کان نے یہ دعا سنی ہے میں دنیاوی مال سے بے زار ہو گیا اور اس سے نجات پانے کی تدبیر کرنے لگا۔

آپ یہ دعا بکثرت مانگا کرتے تھے "اللھم مھما عذبتنی بہ من شی فلا تعذبنی بذل الحجاب" خدایا جب کبھی تو مجھے کسی چیز کا عذاب دینا چاہے تو مجھے حجاب کی ذلت کا عذاب نہ دینا اس لیے کہ جب میں حجاب میں نہ ہوں گا تو تیرا عذاب و بلا میرے لیے

تیرے ذکر و مشاہدے کا ذریعہ آسان ہو جائے گا اور جب میں حجاب میں ہوں گا تو اس حجاب کی ذلت میں تیری یہ نعمتیں ہی مجھے ہلاک کر دیں گی۔ معلوم ہوا کہ جو بلا مشاہدے کی حالت میں واقع ہوتی ہے وہ بلا نہیں ہوتی لیکن وہ نعمت جو حجاب کی حالت میں ہو وہ ابتلا ہے۔ دوزخ میں حجاب سے بڑھ کر کوئی عذابِ شدید و سخت تر نہ ہوگا۔ کیونکہ اگر دوزخ میں دوزخی، اللہ تعالیٰ کے مشاہدے اور مکاشفہ میں ہوں تو گناہ گار مسلمان جنت کو ہرگز یاد نہ کرتے اسلئے کہ دیدار الٰہی جسموں میں خوشی و مسرت کی ایسی لہر دوڑا دیتا ہے کہ جسم پر بلاؤ عذاب کا ہوش ہی نہیں رہتا اور جنت میں کشف و مشاہدہ الٰہی سے بڑھ کر کوئی نعمت نہیں ہے کیونکہ جنت کی تمام نعمتیں بلکہ اس سے مزید سو گنا نعمتیں میسر ہوں لیکن حق تعالیٰ کے مشاہدے سے حجاب میں ہوں تو یہ ان کے دلوں کے لیے موجب ہلاکت ہے لہٰذا اللہ تعالیٰ کی عادت کریمہ ہے کہ وہ اپنے دوستوں اور محبوبوں کے دلوں کو ہر حال میں بینا رکھتا ہے تاکہ وہ تمام بشری مشقت و ریاضت کو برداشت کر سکیں ایسی حالت میں یقیناً ان کی دعا یہی ہونی چاہیے کہ تیرے حجاب کے مقابلہ میں ہر قسم کا عذاب پیارا ہے جب تک ہمارے دلوں پر تیرا جمال ظاہر و منکشف ہے۔ بلاؤ ابتلاء کا کوئی اندیشہ نہیں۔ واللہ اعلم

(۱۶) حضرت شفیق بن ابراہیم ازدی رحمۃ اللہ علیہ:

طریقت کے اماموں میں سے ایک بزرگ، سرِ فہرست اہل بلا و بلوٰی، مایۂ زہد و تقوٰی حضرت ابو علی شفیق بن ابراہیم ازدی رحمۃ اللہ علیہ ہیں۔ آپ صوفیاء کرام کے مقتداء اور رہنما اور جملہ علومِ شرعیہ کے عالم اور حقیقت و معرفت کی دانا تھے۔ علم تصوف میں آپ کی تصانیف بکثرت ہیں۔ حضرت ابراہیم بن ادہم رحمۃ اللہ علیہ کی صحبت میں رہے۔ بکثرت مشائخ عظام سے ملاقات کی اور ان کی مجالس میں حاضر رہے۔ آپ کا ارشاد ہے کہ:

جعل اللہ اھل طاعۃ احیاء فی مماتھم واھل المعاصی امواتا فی حیوٰتھم

''اللہ تعالیٰ نے اپنے فرمانبرداروں کی موت کو بھی زندگی قرار دی ہے

اور نافرمانوں کی زندگی کو مردہ قرار دیا ہے۔"

یعنی مطیع اگرچہ مردہ ہو مگر زندہ ہے کیونکہ فرشتے ان کی اطاعت پر قیامت تک آفریں کہتے رہتے ہیں اور ان کا اجر وثواب بڑھتا رہتا ہے۔ معلوم ہوا کہ وہ موت کی فنا کے بعد بھی بقا کے ساتھ وہ باقی ہیں اور اجر وثواب لیتے رہیں گے۔

ایک بوڑھا شخص آپ کے پاس آیا اور اس نے کہا! اے شیخ میں بہت گناہ گار ہوں توبہ کے قصد سے حاضر ہوا ہوں۔ آپ نے فرمایا تم دیر سے آئے ہو۔ بوڑھے نے کہا نہیں جلدی ہی آیا ہوں۔ فرمایا وہ کیسے؟ اس نے کہا جو شخص مرنے سے پہلے چاہے کچھ دیر سے ہی پہنچے جلد ہی آتا ہے۔

آپ کی توبہ کا ابتدائی واقعہ یہ ہے کہ ایک سال بلخ میں شدید قحط پڑا لوگ ایک دوسرے کو کھانے لگے سب لوگ غمزدہ اور پریشان حال تھے ایک غلام کو دیکھا کہ بازار میں ہنستا اور خوشی مناتا پھر رہا تھا لوگوں نے اس سے کہا تجھے شرم نہیں آتی کہ تو ہنسی خوشی پھر رہا ہے جبکہ تمام مسلمان غمزدہ اور پریشان حال ہیں۔ اس نے جواب دیا کہ مجھے کوئی غم واندیشہ نہیں ہے میں اس کا غلام ہوں جو اس شہر کا مالک ہے اس نے میرے دل سے ہر پریشانی کو دور کر دیا ہے۔ حضرت شقیق رحمۃ اللہ علیہ نے غلام کی یہ بات گوشِ دل سے سن کر بارگاہِ الٰہی میں عرض کیا کہ اے خدا! یہ غلام جس کا آقا صرف ایک شہر کا مالک ہے وہ اس قدر خوش ہے تو تُو مالک الملک ہے اور ہمارے رزق کا ضامن پھر بھلا ہم اس قدر فکر منداور پریشان کیوں ہیں؟ اس خیال کے آتے ہی آپ نے دنیاوی مشاغل سے منہ موڑ لیا اور راہِ حق میں لگ گئے پھر کبھی روزی کا فکر وغم نہ کیا۔ آپ ہمیشہ یہی کہتے رہے کہ میں اس غلام کا شاگرد ہوں اور جو کچھ میں نے پایا ہے اسی سے پایا ہے آپ کا یہ کہنا از راہِ تواضع تھا۔ آپ کے مناقب بہت مشہور ہیں۔

(۱۷) حضرت عبدالرحمٰن عطیہ درانی رحمۃ اللہ علیہ:

طریقت کے اماموں میں سے ایک بزرگ، اپنے وقت کے شیخ، راہِ حق میں یگانہ حضرت ابوسلیمان عبدالرحمٰن عطیہ درانی رحمۃ اللہ علیہ ہیں۔ آپ صوفیاء کے محبوب ان کے دلوں

کے پھول تھے۔آپ نے شدید ریاضت ومجاہدے کیے،علمِ وقت کے عالم،آفاتِ نفس اوراس کی گھاتوں کی معرفت سے باخبر تھے۔سلوک میں آپ کے اقوال لطیف ہیں۔آپ نے دلوں کی حفاظت اوراعضاء کی نگہداشت کے بارے میں بہت کچھ بیان فرمایا ہے۔آپ کاارشاد ہے:

اذا غلب الرجاء علی الخوف فسد الوقت.

''جب خوف پرامید غالب آجاتی ہےتو وقت میں خلل واقع ہوجاتا ہے۔''

اس لیے کہ وقت حال کا نگہبان ہوتا ہے جب تک بندہ حال کی رعایت کرتا ہےتو اس کا خوف دل پر غالب رہتا ہےاور جب وہ خوف جاتا رہتا ہےتو وہ رعایت کوترک کر کے اپنے وقت میں خلل انداز ہوجاتا ہےاگر امید پرخوف کو غالب کرےتو اس کی توحید باطل ہوتی ہے کیونکہ خوف کا غلبہ، نا امیدی اور مایوسی سے ہوتا ہےاور حق تعالیٰ سے مایوس ونا امید ہونا شرک ہےلہٰذا توحید کاتحفظ،امید کی صحت پرموقوف ہےاوروقت کاتحفظ،اس کے خوف کے تحفظ میں، جب دونوں برابر ہوں گےتو توحیداوروقت دونوں محفوظ رہیں گے۔توحید کی حفاظت سے بندہ مومن بنتا ہےاوروقت کی حفاظت سے بندہ مطیع ہوجاتا ہےاس کاتعلق خاص مشاہدے سے ہے اسی میں مکمل اعتماد وبھروسہ ہےاورخوف کاتعلق خاص مجاہدے سے ہے کہ اس میں مکمل اضطراب وپریشانی ہے۔مشاہدہ مجاہدے کی میراث ہےاور یہ وہ مراد ہے کہ سب امیدیں ناامیدی سے ظاہر ہوتی ہیں۔جوشخص اپنےعمل کےسبب اپنی نجات سے ناامید ہوتوایسی ناامیدی حق تعالیٰ کی جانب سے اسے نجات کاثمرہ دے گی اوراسے ایسی راہ دکھائے گی جس سے خوشی کے دروازے کھل جائیں گے اوراس کا دل طبعی آفتوں سے محفوظ رہے گا اور تمام اسرار منکشف ہوجائیں گے۔

حضرت احمد بن الحواری رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ میں نے ایک رات تنہائی میں نماز پڑھی۔مجھے اس میں بڑا سرور ولطف آیا دوسرے دن اس کا تذکرہ،حضرت ابوسلیمان سے کیا۔آپ نے فرمایا تم ابھی کمزور ہو کیونکہ تمہارے دل میں ابھی تک لوگوں کا خیال موجود ہے اسی وجہ سے خلوت میں تمہاری اور حالت ہوتی ہےاور ظاہر میں کچھ اور حالانکہ دونوں حالتوں

میں کچھ فرق نہ ہونا چاہیے بندے کے لیے کوئی چیز حق تعالیٰ سے حجاب کا موجب نہ بنے۔ کیونکہ دولھا کی مجمع عام میں جلوہ نمائی کرائی جاتی ہے تا کہ خاص و عام کی نظر دولھا پر پڑھے اس نمائش میں دولھا کی عزت افزائی ہوتی ہے۔ (یہی حال عارف باللہ کا ہوتا ہے) لیکن عارف باللہ کے لیے یہ مناسب نہیں کہ اپنے مقصود حقیقی کے سوا کسی اور طرف نظر ڈالے، کیونکہ غیر کی طرف نظر اٹھانا اس کی ذلت کا موجب ہے اگر ساری مخلوق اس مطیع عارف باللہ کی کیفیت کو دیکھے تو اس کی عزت میں فرق نہیں آتا لیکن اگر وہ عارف اپنی عزت کی طرف نظر ڈالے اور اپنے وجود کو دیکھنے لگے تو وہ ہلاک ہو جائے گا۔ عیاذاً باللہ تعالیٰ۔

(۱۸) حضرت معروف کرخی رحمۃ اللہ علیہ:

طریقت کے اماموں میں سے ایک بزرگ، متعلق درگاہِ رضا، پروردۂ حضرت علی رضی اللہ عنہ بن موسیٰ رضا، ابو المحفوظ حضرت معروف بن کرخی رحمۃ اللہ علیہ ہیں۔ آپ متقدمین سادات مشائخ میں سے تھے۔ جوانمردی، انکساری اور ورع و تقویٰ میں معروف و زبان زد تھے آپ کا تذکرہ پہلے آنا چاہیئے تھا لیکن دو بزرگوں کی موافقت کی وجہ سے موخر ہو گیا ان میں سے ایک تو صاحب نقل ہیں اور دوسرے صاحب تصرف یعنی ایک بزرگ تو شیخ مبارک ابو عبدالرحمٰن سلمٰی ہیں انہوں نے اپنی کتاب میں اسی ترتیب سے ذکر فرمایا اور دوسرے استاذ ابوالقاسم قشیری رحمۃ اللہ علیہما ہیں انہوں نے بھی اپنی کتاب کے شروع میں آپ کا ذکر اسی طرح پر کیا ہے میں نے بھی انہیں کی پیروی میں یہ ترتیب برقرار رکھی۔ اس لیے کہ آپ حضرت سری سقطی رحمۃ اللہ علیہ کے استاذ اور حضرت داؤد طائی رضی اللہ عنہ کے مرید تھے۔

حضرت معروف کرخی رحمۃ اللہ علیہ پہلے غیر مسلم تھے۔ حضرت امام علی بن موسیٰ رضا رضی اللہ عنہ کے دستِ حق پرست پر مشرف بہ اسلام ہوئے۔ حضرت امام علی بن موسیٰ رضا رضی اللہ عنہ آپ کو بہت محبوب رکھتے تھے۔ آپ نے ان کی بڑی تعریف فرمائی ہے حضرت معروف کرخی کے فضائل و مناقب فنون علم میں بکثرت ہیں۔ آپ کا ارشاد ہے:

للفتیان ثلث علاماتٍ وفاء بلاخلاف ومدح بلاجود عطاء بلا سوال

''مردانِ باخدا کی تین نشانیاں ہیں ہر لحظہ وفا پر عمل کرے بغیر طمع کے
تعریف کرے اور بغیر مانگے دے۔''

ہر لحظہ وفاء پر عمل کرنے کا مطلب یہ ہے کہ بندہ اپنی بندگی میں احکام کی مخالفت اور فرمانِ خدا کی معصیت کو اپنے اوپر حرام کرلے بغیر طمع کے تعریف کرنا یہ ہے کہ جس کسی کی بھلائی نہ دیکھی ہو پھر بھی اس کی تعریف کرے اور بغیر مانگے دینا یہ ہے کہ جب مال ہو تو اس کی تقسیم میں کوتاہی نہ کرے اسے جب کسی کی احتیاج معلوم ہو جائے تو اسے سوال کرنے کی ذلت کا موقع نہ دے یہ اخلاق اگرچہ ہر مسلمان میں ہونے چاہئیں لیکن لوگ ان خوبیوں سے ناآشنا اور بیگانہ ہیں یہ تینوں صفتیں اللہ تعالیٰ کی ہیں وہ اپنے بندوں کی ساتھ ایسا ہی کرتا ہے اس لیے کہ اس کی یہ صفات حقیقی ہیں اللہ تعالیٰ دوستوں کے ساتھ فیاضی میں کمی نہیں کرتا خواہ بندہ وفاء کرنے میں کتنا ہی ناحق شناس ہو اللہ تعالیٰ کی وفا کی نشانی یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ ازل میں اپنے بندوں کو قبل اس کے کہ ان سے کوئی عمل خیر ہو مخاطب فرماتا ہے اور انہیں یاد فرماتا ہے اور آج دنیا میں ان کے افعال کے باوجود انہیں نظر انداز نہیں کرتا اور مدح بلا جود تو اس کے سوا کوئی کر ہی نہیں سکتا کیونکہ وہ کسی بندے کے فعل کا محتاج نہیں اس کے باوجود بندے کے قلیل حمد وثناء پر اس کی تعریف کرتا ہے یہی حال عطائے بے سوال کا ہے اس کے سوا کوئی ایسا کر ہی نہیں سکتا اس لیے کہ وہ کریم ہے اور ہر ایک کے حال کا واقف وعلیم ہے اور ہر ایک کے مقصد کو بغیر سوال کے پورا کرتا ہے لہٰذا اللہ تعالیٰ اپنے کسی بندے کو معزز ومکرم کرنا چاہتا ہے تو اسے بزرگی عنایت فرماتا ہے اور اپنے قربِ خاص سے نوازتا ہے اور اپنی تینوں مذکورہ صفات کو استعمال فرماتا ہے جو بندہ اپنی مقدور بھر ان صفات واخلاق کے ساتھ سلوک کرتا ہے اصلاحِ تصوف میں اسے ''فتوۃ'' یعنی جوانمرد کہا جاتا ہے اور جوانمردوں کی فہرست میں اس کا نام درج کیا جاتا ہے یہ تینوں صفتیں حضرت ابراہیم خلیل اللہ علیہ السلام میں بدرجۂ اتم موجود تھیں۔ مزید تفصیل انشاء اللہ آگے آئے گی۔

(۱۹) حضرت حاتم بن اصم رحمۃ اللہ علیہ:

طریقت کے اماموں میں سے ایک بزرگ، زین عباد، جمال اوتاد حضرت ابو عبدالرحمٰن

حاتم بن عنوان الاصم رحمۃ اللہ ہیں۔ آپ بلخ کے برگزیدہ مشائخ اور خراسان کے اکابر میں سے ہیں آپ حضرت شقیق رحمتہ اللہ علیہ کے مرید تھے اور حضرت احمد خضرویہ رحمۃ اللہ علیہ کے استاد تھے۔ ابتداء سے انتہاء تک ایک قدم صدق وطریقت کے خلاف نہ رکھا۔ حضرت جنید بغدادی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ "صدیق زماننا حاتم الاصم" ہمارے زمانے کے صدیق حضرت حاتم الاصم ہیں۔ رویتِ الٰہی، آفاتِ نفس اور رعونت طبع کے دقائق میں آپ کا کلام بہت ارفع ہے۔ علم تصوف میں آپ کی بکثرت تصانیف ہیں۔ آپ کا ارشاد ہے:

"الشهوة ثلاثة شهوة فی الاكل، وشهوة فی الكلام، وشهوة فی النظر، فاحفظ الاكل بالثقته واللسان بالصدق والنظر بالعبرة"

"تین قسم کی شہوتیں یعنی نفسانی خواہشات ہیں ایک شہوت کھانے کی ہے دوسری شہوت گفتگو کی ہے اور تیسری شہوت نظر یعنی آنکھ کی ہے لہٰذا ان کی حفاظت اس طرح کرو کہ اپنے رزق کے لیے خدا پر بھروسہ کرو زبان سے سچ بولو اور آنکھ سے عبرت حاصل کرو۔"

جس نے خوراک میں توکل کیا وہ لذتِ طعام کے فتنہ سے محفوظ رہا اور جس نے زبان کو سچائی کا عادی بنالیا وہ زبان کے فتنہ سے محفوظ رہا اور جس نے آنکھ سے درست کام لیا وہ نظر کے فتنہ سے دور رہا۔ توکل کی اصل وحقیقت، صدق واخلاص میں ہے اس لیے کہ جب ہر معاملہ میں صدق واخلاق سے کام لے گا اور خدا کی روزی رسانی پر اعتماد رکھے گا اور زبان کو عبادت میں اور نظر کو اس کی معرفت میں مشغول رکھے گا تو بندہ جو کھائے گا اور پئے گا وہ درستی کے ساتھ ہوگا اور جو بات کرے گا وہ بھلائی کے ساتھ ہوگی جب خدا کو سچا مانے گا تو اس کا ذکر زبان پر ہوگا اور جب سچ دیکھے گا تو اسی کو دیکھے گا یہ اس لیے کہ اس کے عطیہ نعمت کو اس کی اجازت کے بغیر کھانا حلال نہیں اور اس کے ذکر کے سوا زبان پر کسی اور کا ذکر لانا سچائی نہیں اور اس کے جمال کے سوا موجودات میں کسی اور پر نظر ڈالنا جائز نہیں ہے جب اس سے لے کر اس کی اجازت

سے کھائے گا تو اس میں اس کی خواہش کا دخل نہ ہوگا لیکن جب اپنی خواہش سے کھائے گا اگرچہ وہ شے حلال ہی کیوں نہ ہو تو یہ شہوت کہلائے گی اسی طرح جب اپنی خواہش سے بولے گا اگر اسی کا ذکر ہو تو یہ جھوٹ اور شہوت ہوئی اور جب اپنی خواہش سے دیکھے گا چاہے وہ صفات الٰہی کے استدلال ہی میں ہو تو وبال و شہوت ہوگی۔ واللہ اعلم۔

(۲۰) حضرت امام محمد بن ادریس شافعی رحمۃ اللہ علیہ:

طریقت و شریعت کے اماموں میں سے ایک بزرگ، امام مطلبی حضرت ابو عبداللہ محمد بن ادریس شافعی رحمۃ اللہ علیہ ہیں۔ آپ اپنے زمانہ کے اکابرین میں تھے اور تمام علوم کے مشہور و معروف امام گزرے ہیں۔ فتوۃ، ورع اور تقوٰے میں آپ کے فضائل مشہور اور کلام ارفع ہے جب تک مدینہ منورہ میں رہے امام مالک رحمۃ اللہ علیہ سے تلمذ رہا اور جب عراق تشریف لائے تو امام محمد بن حسن رضی اللہ عنہ کی صحبت میں رہے آپ کی طبیعت ہمیشہ گوشہ نشینی کی طرف مائل رہی اور طریقت کے حقائق کی جستجو میں مشغول رہے یہاں تک کہ لوگ آپ کے گرد جمع ہو کر آپ کی اقتداء کرنے لگے۔ حضرت امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ بھی ان ہی میں سے ہیں۔

آپ ہر حال میں خصائل حمیدہ کے حامل رہے۔ ابتداء میں صوفیاء کے زمرے میں رہے مگر دل میں کرختگی رہی لیکن جب حضرت شیبان راعی سے ملاقات ہوئی اور ان کی صحبت اختیار کی تو جہاں کہیں رہے طالبِ صادق رہے۔ آپ کا ارشاد ہے:

اذا رأیت العالم یشتغل بالرخص والتاویل فلن یحیی منه بشیٔ

"جب تم ایسے عالم کو دیکھو جو رخصت و تاویل کا متلاشی رہتا ہے تو تم اس سے کچھ بھی حاصل نہ کر سکو گے۔"

مطلب یہ کہ علماء چونکہ مخلوقات کے پیش رو ہیں اس لیے انہیں عزیمت کی راہ پر گامزن رہنا چاہیے (اگر غیر عالم میں عزیمت پائی گئی تو عمل میں غیر عالم آگے بڑھ جائے گا) حالانکہ کسی کو یہ جائز نہیں ہے کہ (کوئی غیر عالم) ان سے آگے بڑھ کر قدم رکھے خواہ کسی معنیٰ میں ہو راہِ حق کا اصول، احتیاط اور مجاہدے میں مبالغہ کے بغیر ممکن نہیں اور عالم میں رخصت یہ

ہے کہ ایسا کام کرے جس میں آسانی ہو اور مجاہدے سے فرار کی راہ مل سکے لہٰذا رخصت کی جستجو تو عوام کا درجہ ہے تا کہ دائرہ شریعت سے باہر نہ نکل جائے اور جب خواص یعنی علماء ہی عوام کے درجہ میں اتر آئیں اور رخصت پر عمل کرنے لگیں تو پھر ان سے کیا حاصل ہوگا اس کے ماسوا ایک بات یہ بھی ہے کہ رخصت کے درپے ہونے میں فرمانِ الٰہی کا استخفاف بھی ہے علماء چونکہ اللہ تعالیٰ کے دوست ہیں اور کوئی دوست اپنے دوست کے حکم کا استخفاف کرسکتا ہے نہ اس کو سبک کرسکتا ہے اور نہ علماء حق ہی عوام کے درجہ میں آنا گوارا کر سکتے ہیں بلکہ وہ ہر حال میں احتیاط اور عزیمت کو ہی اختیار کرنا پسند کریں گے۔

ایک بزرگ بیان کرتے ہیں کہ میں نے ایک رات رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو خواب میں دیکھا میں نے عرض کیا یا رسول اللہ! مجھے ایک روایت پہنچی ہے کہ زمین میں اللہ تعالیٰ کے اوتاد اولیاء اور ابرار ہیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا راوی نے میری یہ حدیث تم تک صحیح پہنچائی ہے۔ میں نے عرض کیا یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! پھر تو مجھے ان میں سے کسی کو دکھایا جائے؟ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا محمد بن ادریس ان میں سے ایک ہیں۔

(۲۱) حضرت امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ:

طریقت و شریعت کے اماموں میں سے ایک بزرگ، شیخ سنت، قاطعِ بدعت حضرت ابو محمد احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ ہیں۔ آپ ورع، تقویٰ اور حافظ حدیث نبوی ہونے میں مخصوص ہیں۔ تمام مشائخِ طریقت اور علماء شریعت آپ کو مقتداء مانتے ہیں آپ نے مشائخ کبار میں حضرت ذوالنون مصری، بشر حافی، سری سقطی اور معروف کرخی رحمہم اللہ کی صحبتیں پائی ہیں آپ ظاہر الکرامت اور صحیح الفراست تھے آج کچھ مشتبہ لوگ ان سے اپنا تعلق ظاہر کرتے ہیں لیکن وہ مفتری اور کذاب ہیں آپ تمام اتہامات سے پاک و مبرا ہیں اصولِ دین و مذہب میں آپ کے وہی معتقدات ہیں جو تمام علماء اہل سنت کے نزدیک مختار ہیں جب بغداد میں معتزلہ کا غلبہ و تسلط ہوا تو انہوں نے ارادہ کیا کہ آپ کو اتنی اذیت و تکلیف پہنچائی جائے کہ آپ قرآن کو مخلوق کہنے پر مجبور ہو جائیں باوجود یہ کہ آپ ضعیف العمر اور کمزور اور لاغر ہو چکے تھے پھر بھی آپ کے

ہاتھوں کو کندھے سے کھینچ کر باندھ دیا گیا اور آپ کے جسم پر ایک ہزار کوڑے مارے گئے لیکن آپ نے ان کی موافقت میں اپنے علم وضمیر کے خلاف کہنا گوارا نہ فرمایا اس دوران آپ کا ازار بند کھل گیا چونکہ آپ کے دونوں ہاتھ بندھے ہوئے تھے ایک غیبی ہاتھ نمودار ہوا اور اس نے آپ کے ازار بند کو باندھ دیا جب ان لوگوں نے آپ کی حقانیت کی یہ دلیل دیکھی تو آپ کو چھوڑ دیا انہیں کوڑوں کے زخموں کے نتیجہ میں آپ کا انتقال ہوا آخر وقت میں آپ سے کچھ لوگوں نے دریافت کیا کہ ان لوگوں کے بارے میں کیا خیال ہے جنہوں نے آپ پر کوڑے برسائے۔ آپ نے فرمایا میں کیا کہہ سکتا ہوں بجز اس کے کہ انہوں نے خدا کی راہ میں اس گمان پر کوڑے مارے ہیں کہ (معاذ اللہ) میں باطل پر ہوں اور وہ حق پر ہیں میں محض زخمی ہونے پر قیامت کے دن ان سے جھگڑا نہیں کروں گا یہ آپ کے علم و بردباری اور تفویض الی اللہ کا عالم تھا رضی اللہ عنہ۔ طریقت وسلوک میں آپ کا کلام بہت ارفع و بلند ہے آپ سے جو بھی کوئی مسئلہ دریافت کرتا اگر وہ سلوک اور طریقت سے متعلق ہوتا تو جواب عنایت فرما دیتے اور اگر حقائق و معرفت سے تعلق رکھتا تو حضرت بشر حافی رحمۃ اللہ علیہ کے پاس بھیج دیتے تھے چنانچہ ایک دن کسی نے آپ سے دریافت کیا کہ "ما الاخلاص" اخلاص کیا ہے؟ آپ نے فرمایا "الاخلاص هو الخلاص من آفات الاعمال" اخلاص یہ ہے کہ تم اعمال کی آفتوں سے محفوظ رہو۔ مطلب یہ ہے کہ عمل ایسا ہونا چاہیے جو سمع وریا سے خالی ہو اور وہ آفت رسیدہ نہ ہو۔ پھر اس نے سوال کیا کہ "ما التوکل" رضا کیا ہے؟ آپ نے فرمایا "الثقة بالله" روزی رسانی میں اللہ تعالیٰ پر مکمل اعتماد و بھروسہ رکھنا۔ پھر اس نے سوال کیا کہ "ما الرضا" رضا کیا ہے؟ آپ نے فرمایا "تسلیم الامور الی الله" تمام کاموں کو خدا کے حوالہ کرنا اور راضی برضا رہنا۔ پھر اس نے سوال کیا "ما المحبة" محبت کیا ہے؟ آپ نے فرمایا یہ بات حضرت بشر حافی سے دریافت کرو جب تک وہ حیات ہیں میں اس کا جواب نہیں دوں گا۔

امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ کی تمام زندگی معتزلہ کی طعن و تشنیع اور ان کے ظلم و ستم میں گزری اور بعد وفات مشبہ کے افتراء و اتہام کا نشانہ بنے رہے یہاں تک کہ اہل سنت و

جماعت آپ کے احوال پر کما حقہ واقف نہ ہو سکے اور عدم واقفیت کی وجہ سے ان پر اتہام رکھے گئے حالانکہ وہ اس سے بری ہیں۔ واللہ اعلم۔

(۲۲) حضرت احمد بن ابی الجواری رحمۃ اللہ علیہ:

طریقت کے اماموں میں سے ایک بزرگ، سراج وقت، متحمل آفات حضرت ابوالحسن احمد بن ابی الجواری رحمۃ اللہ علیہ ہیں طریقت اور صحیح احادیث نبویہ کی روایات کے تمام علوم وفنون اوران کے اشارات میں آپ کا کلام بلند ولطیف ہے تمام علوم میں علمائے وقت آپ سے رجوع کرتے رہے ہیں آپ حضرت ابوسلیمان کے مرید تھے اور حضرت سفیان بن عیینہ اور مروان بن معاویہ قاری رحمہم اللہ کے صحبت یافتہ تھے آپ نے ادب کے ہر مسئلہ میں ہر ایک سے استفادہ کیا ہے۔

آپ کا ارشاد ہے:

الدنیا مزبلۃ ومجمع الکلاب، واقل من الکلاب من عکف علیھا فان الکلب یأخذمنھا حاجتہ وینصرف والمحب لھا لایزول عنھا ولا یترکھا مجالٍ

یہ دنیا گندگی کا ڈھیر اور کتوں کے جمع ہونے کی جگہ ہے وہ شخص کتے سے بھی کمتر ہے جو اس پر جم کر بیٹھ جائے کیونکہ کتا اس ڈھیر سے اپنی حاجت پوری کر کے چلا جاتا ہے لیکن دنیا سے محبت کرنے والا اس سے کبھی جدا نہیں ہوتا اور نہ کسی حالت میں اسے چھوڑتا ہے

آپ کا یہ ارشاد اس بات کی دلیل ہے کہ آپ دنیا پرستوں سے کنارہ کش رہتے تھے۔ اہل طریقت کے لئے دنیا میں آزردہ رہنا موجب مسرت وانبساط ہے آپ نے ابتداء میں تحصیل علم کیا اور درجہ امامت تک پہنچے پھر اپنی کتابوں کو اٹھا کر دریا برد کرا دیا، اور فرمایا:

نعم الدلیل انت واما الاشتغال بالدلیل بعد الوصول الی المدلول محال

اے خدا تو بذات خود دلیل ہے مدلول کے پالینے کے بعد دلیل ہی میں مشغول رہنا محال ہے

کیونکہ دلیل تو اس وقت تک کام دیتی ہے جب تک سالک، حصولِ مقصد کی راہ میں ہوتا ہے حصول مقصد کے بعد دلیل کی کیا حاجت ہے؟ اس کے بعد فرماتے ہیں "وصلت فقد فصل" مجھے وصول الی اللہ ہو گیا اب میں دلیل کے جھنجھٹ سے آزاد ہو گیا اس کے بعد راہ سے چمٹے رہنا محض مشغولیت ہے اب فراغت ہی فراغت ہے فراغت و شغل کے اصول میں ایک قاعدہ اور ایک نسبت ہے اور یہ دونوں بندے کی صفتیں ہیں اور فصل و وصل اور عنایت حق اور اس کا ازلی ارادہ، بندے کے لئے یہ خیر خواہی ہے جو شغل و فراغت کے دوران بندے کو حاصل نہیں ہوتا کیونکہ خدا کا وصل بندے کی کرامت اور اس کی عزت افزائی ہے اور اس سے جدائیگی، اس کی اہانت و تذلیل ہے اس کے صفات کا تغیر جائز نہیں ہے۔

حضور سیدنا داتا گنج بخش رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اس ارشاد میں لفظ وصول سے ان بزرگ کی مراد، وصولِ راہ حق ہے اس لئے کہ طریقت کی کتابوں میں اس کی تعبیر راہِ حق سے بھی کی گئی ہے جب راہ واضح ہو گئی تو عبارت یعنی دلیل مُنقطع ہو جاتی ہے کیونکہ دلیل و عبارت کی اب چنداں حاجت باقی نہیں رہتی عبارت کی تو اس وقت تک ضرورت رہتی ہے جب تک کہ مقصود مخفی ہو جب مشاہدہ حاصل ہو گیا تو عبارت کی احتیاج مفقود ہو گئی جب معرفت کی صحت میں زبانیں گنگ ہیں تو کتابوں کی عبارتیں بدرجہ اولیٰ بیکار ہیں ان کے سوا دیگر بعض مشائخ نے بھی اسی طرح کتابوں کو ضائع کیا ہے جیسے شیخ المشائخ ابوسعید فضل اللہ بن محمد مہینی وغیرہ اور کچھ ایسے بھی رسمی نقال ہیں جنہوں نے اپنی جہالت کے باوجود ان آزاد شیوخ کی تقلید کی ہے بلاشبہ ان مقدس آزاد بزرگوں نے انقطاع علائق، ترک التفات اور ماسویٰ اللہ سے دل کو فارغ کر کے کمال حاصل کیا ان کی یہ کیفیت، سکرؔ کی حالت کی ہے۔ مبتدی اور نو آموز آدمی کو ایسا نہیں چاہیے کیونکہ متمکن یعنی مقام رفیع پر فائز ہونے والے کے لئے جب دونوں جہان حجاب نہیں بنتے تو کاغذ کے پرزے اس کے لئے کیا حجاب بنیں گے؟ جب دل ہی علائق سے جدا ہو گیا تو کاغذ کے پرزے کی کیا قدر و قیمت ہے لیکن کتابوں کو دریا برد سے ان کی مراد تحقیق معنیٰ سے عبارت کی نفی ہے جیسا کہ ہم نے بیان کیا لہٰذا سب سے بہتر یہی ہے کہ عبارت کو زبان سے ادا نہ کیا جائے اس لئے

کہ جو کتاب میں مکتوب ہے اور جو عبارت زبان پر جاری ہے یہ عبارت اس عبارت سے زیادہ بہتر نہیں ہے مجھے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ حضرت احمد بن ابی الجواری رحمتہ اللہ علیہ نے اپنے غلبہ حال میں کسی کو اسے کے سننے کے قابل نہیں پایا اور اپنے حال کی وضاحت وتشریح کاغذوں پر تحریر فرمائی جب بہت جمع ہو گئے اور کسی کو اس کا اہل نہ پایا تو اس کو منتشر کرنے کے لئے دریا برد کر دیا، اور فرمایا "نعم الدلیل انت" الخ لیکن ان کا یہ فرمانا کہ "مدلول کے پالینے کے بعد دلیل میں ہی مشغول رہنا محال ہے۔" تو یہ قول بھی محتمل ہے ممکن ہے ان کے پاس بکثرت کتابیں جمع ہو گئی ہوں اور وہ کتابیں ان کو اوراد و وظائف سے باز رکھتی ہوں تو انہوں نے اس شغل کو اپنے سامنے سے ہٹا دیا ہو اس طرح دل کی فراغت چاہی ہوتا کہ عبارت کو چھوڑ کر اس کے معنی کی طرف رجوع ہو جائیں۔ واللہ اعلم بالصواب

(۲۳) حضرت احمد بن خضرویہ بلخی رحمتہ اللہ علیہ:

طریقت کے اماموں میں سے ایک بزرگ سرفہرست جوانمرداں، آفتاب خراساں حضرت ابو حامد احمد بن خضرویہ بلخی رحمتہ اللہ علیہ ہیں۔ آپ حال کی بلندی اور وقت کی بزرگی کے اعتبار سے مخصوص ہیں اپنے زمانہ میں اہل طریقت کے مقتداء اور محبوب خاص و عام تھے طریق ملامت کو پسند کرتے اور فوجی لباس زیب تن رکھتے تھے آپ کی زوجہ فاطمہ حاکم بلخ کی دختر تھیں ان کا مقام بھی طریقت میں عظیم تھا جب انہیں توبہ کی توفیق میسر ہوئی تو کسی کو حضرت احمد بن خضرویہ کے پاس بھیجا کہ وہ اپنا پیام میرے والد کے پاس بھیجیں لیکن آپ نے منظور نہ کیا دوبارہ پھر کسی کو بھیجا اور کہلوایا کہ اے احمد! میں آپ کو اس سے زیادہ مردِ خدا جانتی تھی کہ آپ ایک عورت کی راہ حق میں رہبری کریں گے نہ کہ رہزنی اس کے بعد آپ نے امیر بلخ کے پاس فاطمہ کے لئے پیغام بھیجا اس نے اسے برکت جان کر قبول کر لیا اور فاطمہ ان کی زوجیت میں آ گئیں اور فاطمہ نے دنیاوی مشاغل ترک کر کے حضرت احمد بن خضرویہ کے ساتھ گوشہ نشینی اختیار کر لی آپ اکثر بایزید بسطامی رحمتہ اللہ علیہ سے ملاقات کرنے جایا کرتے تھے اور فاطمہ بھی ان کے ساتھ جایا کرتی تھیں پہلی مرتبہ جب فاطمہ اپنے شوہر کے ساتھ حضرت بایزید رحمتہ اللہ علیہ سے

ملنے کے لئے گئیں تو چہرے سے نقاب اٹھا کر گستاخانہ کلام شروع کر دیا۔ احمد رحمتہ اللہ علیہ نے اس حرکت پر بڑا تعجب کیا اور طیش میں آ کر کہا اے فاطمہ! حضرت بایزید کے ساتھ یہ کیسی گستاخی ہے؟ تمہاری اس بداخلاقی کی وجہ مجھے معلوم ہونی چاہئے۔ فاطمہ نے کہا اس کی وجہ یہ ہے کہ آپ میری طبیعت کے محرم ہیں اور حضرت بایزید میری طریقت کے محرم ہیں، میں آپ سے اپنی خواہش کے تحت رسم و راہ رکھتی ہوں اور ان سے خدا کے لئے یہ مجھے خدا سے ملاتے ہیں۔ غرض یہ کہ فاطمہ حضرت بایزید کے ساتھ ہمیشہ شوخ چشم رہیں اتفاق سے ایک دن حضرت بایزید بسطامی رحمتہ اللہ علیہ نے نگاہ اوپر اٹھائی تو فاطمہ کے ہاتھ میں مہندی کا رنگ لگا دیکھا، حضرت بایزید نے کہا تم نے اپنے ہاتھوں میں مہندی کیوں لگائی ہے؟ فاطمہ نے کہا اے بایزید! جب تک تم نے میرے ہاتھوں میں مہندی کیوں لگائی ہے؟ فاطمہ نے کہا اے بایزید! جب تک تم نے میرے ہاتھوں کو اور اس کی مہندی کو نہ دیکھا تھا تو مجھے تم سے خوشی تھی اب جبکہ تم نے مجھ پر نظر اٹھائی تو اب تمہاری صحبت مجھ پر حرام ہوگئی اس کے بعد دونوں وہاں سے کوچ کر کے نیشا پور چلے آئے اور یہیں قیام کر لیا۔ نیشا پور کے مشائخ اور عام لوگ حضرت احمد سے بہت خوش ہوئے حضرت یحییٰ بن معاذ رازی رحمتہ اللہ علیہ بلخ جاتے ہوئے نیشا پور آئے تو حضرت احمد نے ان کی دعوت کا ارادہ کیا اور اس سلسلہ میں اپنی زوجہ فاطمہ سے مشورہ کیا کہ کیا کیا سامان ہونا چاہئے؟ انہوں نے کہا اتنی گائیں، اتنی بھیڑیں، اتنی شمعیں، اتنا عطر، اتنا سامان اور ان کے علاوہ اتنے گدھے بھی ذبح کرنے کے لئے منگوا لیں، حضرت احمد رحمتہ اللہ علیہ نے پوچھا اس سامان کے ساتھ گدھوں کی کیا ضرورت؟ فاطمہ نے کہا جب کوئی کریم کسی کریم کے یہاں مہمان ہوتا ہے تو محلے کے کتے بھی آ جاتے ہیں انہیں بھی کھلانا چاہئے۔ فاطمہ کی انہیں خوبیوں کی وجہ سے حضرت بایزید رحمتہ اللہ علیہ نے فرمایا کہ "من اراد ان ینظر الی رجل من الرجال مختو تحت لباس النسوان فلینظر الی فاطمة" جو خواہش رکھتا ہے کہ کسی مرد خدا کو نسوانی لباس میں ملبوس دیکھے اسے چاہئے کہ وہ فاطمہ کو دیکھے۔

حضرت ابو حفص حداد رحمتہ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ:

"لولا احمد بن خضرویه ماظهرت الفتوة" اگر احمد بن خضرویہ نہ ہوتے تو جوانمردی ظاہر ہی نہ ہوتی۔

حضرت احمد بن خضرویہ رحمتہ اللہ علیہ کا کلام بلند اور انفاس مہذب ہیں طریقت اور آدابِ طریقت کے ہر فن میں آپ کی تصانیف مشہور اور حقائق میں آپ کے نکات معروف ہیں چنانچہ آپ فرماتے ہیں کہ

الطریق واضح والحق لایح	راہ ظاہر، حق آشکار اور نگہبان خوب سننے والا
والراعی قد اسمع فما التحیر	ہے اس کے بعد متحیر اور پریشان رہنا بجز
بعدها الامن العمٰی	اندھے پن کے کچھ نہیں۔

مطلب یہ ہے کہ راہ کی تلاش کے کیا معنیٰ وہ تو روز روشن کی طرح واضح ہے تو اپنے آپ کو تلاش کر تو خود کہاں بھٹک رہا ہے جب تو نے اپنے آپ کو پالیا تو تو راہِ حق پر لگ جائے گا کیونکہ راہِ حق اس سے زیادہ ظاہر ہے جتنا طالب کی طلب کے تحت آئے۔ آپ کا ارشاد ہے:

استر عز فقرك عن الخلق	اپنے فقر کی عزت کو لوگوں سے پوشیدہ رکھو

یعنی لوگوں سے یہ کہتے نہ پھرو کہ میں درویش ہوں تا کہ تمہارا بھید نہ کھل جائے اس لئے کہ یہ اللہ تعالیٰ کی بہت بڑی نعمت اور اس کا اکرام ہے۔ آپ ایک واقعہ مثال میں بیان فرماتے ہیں کہ ایک درویش نے ماہِ رمضان میں کسی تونگر کی دعوت کی حالانکہ اس کے گھر میں صرف ایک سوکھی ہوئی روٹی تھی، چنانچہ وہ روٹی اس نے تونگر کے سامنے رکھ دی جب تونگر واپس گیا تو اس نے اشرفی کی ایک تھیلی اس درویش کے پاس بھیجی، درویش نے تھیلی واپس کر کے کہلوایا کہ یہ اس کی سزا ہے جو اپنے بھید کو ناجنسوں پر کھولتا ہے۔ یہی ان کے فقر کی صداقت کی دلیل ہے۔ واللہ اعلم

(۲۴) حضرت عسکر بن حسین نخشبی رحمتہ اللہ علیہ:

طریقت کے اماموں میں سے ایک بزرگ، امام متوکلاں، برگزیدہ اہلِ زماں ابو تراب حضرت عسکر بن الحسین نخشبی نفی رحمتہ اللہ علیہ ہیں آپ خراسان کے بزرگ ترین سادات

مشائخ اور مشہور جوانمردوں میں سے تھے۔ آپ کا زہد و تقویٰ مشہور و معروف تھا آبادی وصحرا میں ہر جگہ آپ کی بکثرت کرامتیں اور بے شمار عجائب دیکھے گئے صوفیاء اور سالکوں میں آپ بہت دانشور تھے جنگلوں میں بسیرا رکھتے، حتیٰ کہ بصرے کے جنگل ہی میں آپ کی وفات ہوئی چند سال کے بعد جب مسلمانوں کا ایک قافلہ اس طرف سے گزرا تو آپ کو روبقبلہ قیام میں مردہ پایا آپ کا جسم خشک ہو چکا تھا، آگے لوٹا رکھا ہوا تھا اور عصا ہاتھ میں تھا اس اثناء میں نہ کوئی درندہ ان کے قریب گیا اور نہ کسی انسان کے نشانِ قدم پائے گئے۔ آپ کا ارشاد ہے:

الفقیر قوتہ ماوجدٗ ولباسہ ماستر ومسکنہ حیث نزل

درویش کی غذا وہی ہے جو اسے مل جائے اور اس کا پہناوا وہی ہے جس سے ستر پوشی ہو جائے اور اس کا مکان وہی ہے جہاں ٹھہر جائے۔

مطلب یہ ہے کہ درویش کی غذا میں اس کی اپنی کوئی پسند نہیں ہوتی اور لباس میں بھی اس کی پسند کا کوئی دخل نہیں ہوتا اور مکان بھی وہی ہوتا ہے جہاں وہ ٹھہر جائے کوئی خاص جگہ یا ٹھکانا نہیں ان تینوں باتوں میں تصرف کرنا مشغولیت ہے سارے جہان کی بلائیں ان ہی تین چیزوں میں ہیں جبکہ وہ اس میں تصرف کرے یہ بات معاملہ سے متعلق ہے ورنہ از روئے تحقیق درویش کی غذا وجد ہے اور اس کا لباس تقویٰ اور اس کا مسکن غیب ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

وان لو استقاموا علی الطریقۃ لاسقینا ھم ماءً غدقاً

اگر وہ طریقت پر استقامت رکھیں تو ہم یقیناً انہیں شیریں اور ستھرا پانی پلائیں گے۔

اور فرمایا:

وَلِبَاسُ التَّقْوٰی ذٰلِكَ خَيْرٌ

اور تقویٰ کا لباس ہی بہتر ہے۔

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ:

الفقر وطن الغیب

فقر غیب کا وطن ہے۔

معلوم ہوا کہ درویش کا کھانا پینا، شرابِ قربت اور اس کا لباس تقویٰ و مجاہدہ اور اس کا

وطن غیب اور انتظار وصل ہے لہٰذا طریقت کی راہ واضح اور اس کا معاملہ ظاہر و روشن ہے اور یہی کمال کا درجہ ہے۔

(۲۵) حضرت یحییٰ بن معاذ رازی رحمۃ اللہ علیہ:

طریقت کے اماموں سے ایک بزرگ، محبت و وفا کی زبان، ولایت و طریقت کی زینت حضرت ابوزکریا یحییٰ بن معاذ رازی رحمۃ اللہ علیہ ہیں۔ آپ کا حال بلند، نیک خصلت اور حقیقت میں حق تعالیٰ کی امید پر کامل ثابت قدم تھے۔ حضرت حضرمی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے دو یحییٰ پیدا فرمائے ہیں ایک انبیاء میں جو حضرت یحییٰ بن زکریا علیہ السلام ہیں اور دوسرے اولیاء میں جو حضرت معاذ رازی رحمۃ اللہ علیہ ہیں۔ حضرت یحییٰ علیہ السلام خوف الٰہی کی راہ پر اس طرح گامزن رہے کہ تمام مدعیانِ خوف، نجات سے ناامید ہو گئے اور حضرت یحییٰ بن معاذ رحمۃ اللہ علیہ حق تعالیٰ کی امید پر ایسے قائم رہے کہ تمام مدعیانِ امید ہاتھ باندھے کھڑے رہے لوگوں نے حضرت حضرمی سے دریافت کیا کہ حضرت یحییٰ بن زکریا علیہ السلام کا حال تو معلوم ہے لیکن حضرت یحییٰ بن معاذ رازی رحمۃ اللہ علیہ کا حال کس طرح معلوم ہوا؟ انہوں نے جواب دیا مجھے معلوم ہے کہ وہ کسی حالت میں بھی اللہ تعالیٰ سے غافل نہیں رہے اور نہ کبھی کسی گناہِ کبیرہ کا ارتکاب کیا معاملات طریقت اور اس کے مجاہدے میں اتنے کامل تھے کہ ایسی طاقت کوئی دوسرا نہیں رکھتا تھا حضرت یحییٰ بن معاذ رحمۃ اللہ علیہ سے کسی محبّ نے دریافت کیا کہ اے شیخ! آپ کا مقام تو مقامِ رجا یعنی امید ہے لیکن آپ کا سلوک تو خائفوں جیسا ہے؟ آپ نے فرمایا اے فرزند سنو! بندگی کو چھوڑنا ضلالت و گمراہی ہے اور خوف و رجا ایمان کے دو ستون ہیں یہ محال ہے کہ کوئی شخص اپنے مجاہدے میں کسی رکن ایمان کو ضلالت و گمراہی میں ڈال دے خائف اپنے خوف کو دور کرنے کے لئے عبادت و بندگی کرتا ہے اور امیدوار وصال الٰہی کی امید میں جب تک عبادت نہ ہو تو نہ خوف کا وجود درست اور نہ رجا کا اور جب عبادت موجود ہو تو یہ خوف و رجا سب عبادت بن جاتا ہے جہاں محض عبادت ہو تو ایسی عبادت سود مند نہیں ہوتی۔

آپ کی بکثرت تصانیف ہیں اور آپ کے نکتے اور اشارات انوکھے ہیں۔ خلفائے

راشدین کے بعد صوفیاء کرام میں سے آپ ہی نے منبر پر وعظ و نصیحت فرمائی میں ان کے کلام کو بہت پسند کرتا ہوں چونکہ طبیعت میں رقت اور ساعت میں لذت پیدا کرنے والا اور اصل میں دقیق اور عبارت میں مفید ہوتا ہے۔ آپ کا ارشاد ہے کہ:

الدنیا دار الاشتغال والآخرة دار الاھوال ولایزال العبد بین الاشغال والاھوال حتّٰی یستقربه القرار اما الی الجنة واما الی النار.	یہ دنیا مشغولیتوں کی جگہ ہے اور آخرت ہول وحشت کا مقام اور بندہ ان دونوں کے درمیان ہمیشہ رہتا ہے یہاں تک کہ کسی ایک جگہ وہ قرار حاصل کرلے خواہ وہ جنت ہو یا دوزخ

خوشی و مسرت کے مقام میں وہ دل ہے جو دنیا میں مشغولیتوں سے اور آخرت میں ہولناکیوں سے محفوظ رہا ہے اور دونوں جہان سے توجہ ہٹا کر واصل بحق ہو گیا۔

آپ کا مذہب تونگری کو مفلسی پر ترجیح دینا تھا جب شہر رے میں آپ پر بار قرض زیادہ ہو گیا تو خراسان کا قصد فرمایا اور جب بلخ پہونچے تو وہاں کے لوگوں نے آپ کو روک لیا تاکہ کچھ عرصہ وعظ و نصیحت فرمائیں، وہاں کے لوگوں نے ایک لاکھ کی تھیلی پیش کی آپ وہ تھیلی لے کر بار قرض اتارنے کے لئے شہر رے کی طرف واپس ہوئے راستہ میں ڈاکوؤں نے ڈاکہ ڈال کر تمام روپیہ چھین لیا آپ خالی ہاتھ نیشاپور آ گئے وہیں آپ نے وفات پائی آپ ہر حال میں صاحب عزت اور وجیہہ و باوقار تھے۔ واللہ اعلم۔

(۲۶) حضرت عمر بن سالم حدادی نیشاپوری رحمتہ اللہ علیہ:

اماموں میں سے ایک بزرگ، خراسان کے شیخ المشائخ زمین و زمان کے نادر حضرت ابو حفص عمر بن سالم حدادی رحمتہ اللہ علیہ ہیں۔ آپ صوفیاء کے بزرگ و سردار اور تمام مشائخ کے ممدوح تھے۔ حضرت ابو عبداللہ دینوری کے صحبت یافتہ اور حضرت احمد خضرویہ کے رفیق تھے کرمان سے شاہ شجاع آپ کی زیارت کے لئے حاضر ہوا تھا۔

آپ جب بغداد میں وہاں کے مشائخ سے ملاقات کرنے تشریف لائے تو عربی

زبان سے ناواقف تھے اس لئے مریدوں کے واسطے سے گفتگو کی مگر خیال کیا کہ یہ بڑے عیب کی بات ہے کہ خراسان کے شیخ المشائخ کے لئے ترجمان کی ضرورت ہو چنانچہ جب آپ مسجد شونیز میں پہنچے تو بغداد کے تمام مشائخ کو ملاقات کی دعوت دی اور ان سے عربی میں فصیح گفتگو فرمائی، یہاں تک کہ تمام مشائخ آپ کی فصاحت پر ششدرہ گئے بغداد کے مشائخ نے آپ سے سوال کیا کہ "ما الفتوۃ" جوانمردی کیا ہے؟ آپ نے فرمایا بہتر یہ ہے کہ پہلے آپ میں سے کوئی صاحب اپنی رائے ظاہر فرمائیں چنانچہ حضرت جنید بغدادی رحمتہ اللہ علیہ نے فرمایا:

الفتوة عندی ترك الرؤية واسقاط النسبة	میرے نزدیک جوانمردی یہ ہے کہ جو عمل کیا جائے اسے نہ خود دیکھے اور نہ اس کو اپنی طرف منسوب کرے۔

اس پر حضرت ابو حفص رحمتہ اللہ علیہ نے فرمایا:

مااحسن ماقال الشیخ ولکن الفتوة عندی اداء الانصاف وترك مطالبة الانصاف	شیخ نے نہایت عمدہ بات فرمائی ہے لیکن میرے نزدیک جوانمردی یہ ہے کہ خود تو دوسروں کے ساتھ انصاف کرنے میں کوتاہی نہ کرے مگر دوسروں سے اپنے لئے انصاف کا خواہاں نہ ہو۔

یہ سن کر حضرت جنید بغدادی رحمتہ اللہ علیہ نے فرمایا "قوموا یااصحابنا فقد زاد ابوحفص علی آدم وذریة "اے میرے ہمراہیو! اٹھو یقیناً ابوحفص آدم اور ان کی اولاد پر بازی لے گئے ہیں۔

آپ کی ابتدائے توبہ کا واقعہ بڑا ہی عجیب ہے عالم شباب میں ایک لونڈی پر آپ فریفتہ ہو گئے ہر چند منانے کی تدبیریں کیں مگر کوئی تدبیر کارگر نہ ہوئی لوگوں نے بتایا کہ نیشاپور میں ایک یہودی رہتا ہے جو سحر و عمل کے ذریعہ اس کام کو آسان کر سکتا ہے ابو حفص اس کے پاس پہنچے اور اس سے اپنا حال بیان کیا۔ یہودی نے کہا اے ابو حفص! تمہیں چالیس دن نماز چھوڑنی ہوگی اور اس

اثناء میں نہ تو زبان دل پر خدا کا نام لانا ہوگا اور نہ نیکی کا کوئی کام اگر اس پر راضی ہو تو میں جنتر منتر پڑھتا ہوں تا کہ تمہاری مراد بر آئے حضرت ابو حفص نے یہودی کی یہ شرط مان لی اور چالیس دن اس طرح گزار دیئے۔ یہودی نے اپنا سحر و عمل کیا مگر ان کی مراد بر نہ آئی یہودی کہنے لگا غالباً تم نے شرط پوری نہیں کی، ضرور تم سے کوئی خلاف ورزی ہوئی ہے اور نیکی کا کوئی کام کیا ہے ذرا سوچ کر بتاؤ؟ ابو حفص نے کہا میں نے کوئی نیکی نہیں کی اور نہ ظاہر و باطن میں کوئی عمل خیر کیا البتہ ایک دن میں نے راستہ میں پتھر پڑا دیکھا اس خیال سے اسے پاؤں سے ہٹا دیا کہ کسی کو ٹھوکر نہ لگ جائے۔ اس پر یہودی کہنے لگا افسوس ہے تم پر کہ تم نے چالیس دن تک اس کے حکم کی نافرمانی کی اور اسے فراموش کیے رکھا لیکن خدا نے تیرے ایک عمل کو بھی ضائع نہیں جانے دیا یہ سن کر حضرت ابو حفص رحمتہ اللہ علیہ نے صدق دل سے توبہ کی اور وہ یہودی بھی اسی وقت مسلمان ہو گیا۔

حضرت ابو حفص آہنگری کا پیشہ کرتے تھے جب بیاورد پہنچے تو حضرت ابو عبداللہ باوردی سے ملاقات کی اور ان سے بیعت کی جب نیشا پور واپس آئے تو ایک دن بازار میں ایک نابینا کو قرآن کریم کی تلاوت کرتے دیکھا آپ اپنی دکان میں بیٹھے سنتے رہے ان پر اتنی محویت اور وجد کی کیفیت طاری ہوئی کہ بے خودی میں بغیر دست پناہ کے بھٹی سے گرم و سرخ لوہا ہاتھ ڈال کر نکال لیا شاگردوں نے استاد کی یہ محویت و استغراق دیکھا تو ان کے ہوش اڑ گئے جب آپ کا استغراق ختم ہوا تو اس پیشہ کو چھوڑ دیا پھر کبھی دکان پر نہیں گئے۔ آپ فرماتے ہیں کہ:

ترکت العمل ثم رجعت الیہ ثم ترکنی العمل فلم ارجع الیہ.	میں نے ایک مرتبہ اپنے پیشہ کو چھوڑ کر دوبارہ اسے اختیار کیا لیکن پھر اس پیشہ نے مجھے چھوڑ دیا اس کے بعد میں پھر کبھی ادھر متوجہ نہ ہوا

بندے کو جو چیز ہنر اور دستکاری سے حاصل ہو اس کے کرنے سے بہتر ہے کہ اسے چھوڑ دیا جائے کیونکہ تمام اکتسابات آفتوں کے محل ہیں قابل قدر اور لائق اعتنا تو وہ چیز ہے جو غیب سے بلا تکلف آئے اور جس جگہ بھی بندے کا دخل و اختیار شامل ہوگا وہاں اس سے حقیقت کے لطائف

زائل ہو جائیں گے اس لئے بندہ پر کسی کام کے کرنے یا نہ کرنے کا از خود اختیار نہیں ہے کیونکہ عطا و زوال اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہے اور اسی کی تقدیر سے ہے جب عطا ہوتی ہے تو اسی کی طرف سے لینا بھی ہوتا ہے اور جب زوال ہو تو اسی کی طرف سے ترک بھی ہے جب ایسی حالت ہو جائے تو اسی کی قدر و قیمت ہوتی ہے کیونکہ اخذ و ترک کا قیام اسی کی طرف سے ہے نہ یہ کہ بندہ اپنی کوشش سے نفع یا دفع کرتا ہے معلوم ہوا کہ اگر مرید ہزار برس قبول حق کی کوشش کرے تو یہ ممکن نہیں ایک لمحہ کے لئے بھی حق تعالیٰ قبولیت کا شرف دیدے اس لئے کہ اس کی قبولیت تو ازل سے مقرر ہے اور دائمی مسرت پہلے ہی سے شامل ہے بندے کے لئے تو بجز خلوص کے کوئی راہ رکھی ہی نہیں اس لئے وہی بندہ صاحب عزت ہے جو عالم اسباب کی نسبت کو چھوڑ کر مسبب الاسباب سے لو لگائے۔

(۲۷) حضرت حمدون بن احمد بن قصار رحمتہ اللہ علیہ:

طریقت کے اماموں میں سے ایک بزرگ، طبقۂ ملامتیہ کے سردار، گرفتارِ بلا و ملامت، حضرت ابو صالح حمدون بن احمد بن عمارۃ القصار رحمتہ اللہ علیہ ہیں۔ آپ مشائخ متقدمین میں متورع اور علم فقہ میں بدرجہ اتم عالم تھے۔ حضرت امام ثوری رحمتہ اللہ علیہ کے مذہب کے متبع اور طریقت میں حضرت ابو تراب نخشی کے مرید تھے آپ علی نصر آبادی کے خاندان سے تھے سلوک کے ہر معاملہ میں آپ کے اشارات اور مجاہدے کی تمام اقسام میں آپ کے اشارات موجود ہیں چونکہ آپ کا علمی مرتبہ بہت بلند تھا اس لئے نیشاپور کے تمام اکابرین آپ کے رشد و ہدایات کے منتظر رہتے لیکن آپ سب کو یہی جواب دیتے کہ ابھی میرا دل دنیا اور حصولِ مرتبت سے خالی نہیں ہوا ہے اس حال میں میرا وعظ فرمانا سود مند نہ ہوگا اور نہ دلوں پر اثر انداز ہوگا جو بات دلوں پر اثر نہ کرے اس میں علم کا استخفاف اور شریعت کا استہزاء ہے۔ وعظ کرنا اس پر واجب ہے جس کی خاموشی دین میں خلل انداز نہ ہو اور جب کچھ کہے تو خلل دور ہو جائے علماء نے سوال کیا کہ ہمارے وعظ کے مقابلہ میں اسلاف کا وعظ کس وجہ سے دلوں پر زیادہ اثر انداز ہوتا تھا؟ فرمایا ''لانهم تكلموا العز الاسلام ونجات النفوس ورضاء الرحمن ونحن نتكلم لعز النفس وطلب الدنيا وقبول الخلق'' اس کی وجہ یہ ہے کہ اسلاف

اسلام کی بہتری، لوگوں کی نجات اور اللہ تعالیٰ کی خوشنودی کے لئے وعظ کہتے تھے اور ہم اپنی ذات کی عزت، دنیا اور مقبولِ خلائق ہونے کے لئے وعظ کرتے ہیں لہٰذا جو شخص رضائے الٰہی کے لئے بات کرتا ہے اس کی زبان سے حق بات نکلتی ہے اور اس میں دبدبہ وجلال ہوتا ہے کہ شر پسندوں کے دل بھی متاثر ہو جاتے ہیں اور جو شخص اپنی ذات کو سامنے رکھ کر بات کرتا ہے اس میں رسوائی اور ذلت کے سوا کچھ بھی نہیں ہے ایسی باتوں سے لوگوں کو کوئی فائدہ نہیں پہنچتا۔ اس کے کہنے سے نہ کہنا ہی بہتر ہے کیونکہ وہ حقانیت سے خالی بات ہوتی ہے۔

(۲۸) حضرت منصور بن عمار رحمتہ اللہ علیہ:

طریقت کے اماموں میں سے ایک بزرگ، شیخ باوقار، مشرف خواطر واسرار حضرت ابوالسری منصور بن عمار رحمتہ اللہ علیہ ہیں آپ درجہ ومرتبہ کے اعتبار سے مشائخ کبار میں سے ہیں، عراق کے اکابر میں سے آپ مقبول اہل خراسان تھے پندونصائح میں حسن کلام اور نکتہ رسی تھی ہر علم وفن میں وعظ فرماتے اور درایت و روایت اور احکام و معاملات کی گتھیاں سلجھاتے تھے۔ بعض صوفیاء تو تعریف میں حد سے تجاوز کر گئے ہیں آپ کا ارشاد ہے:

سبحان من جعل قلوب العارفین	وہ ذات پاک ہے جس نے عارفوں کے
اوعیة الذکر وقلوب الذاھدین	دلوں کو ذکر کی جگہ اور زاہدوں کے دلوں کو
اوعیة التوکل وقلوب	توکل کی جگہ اور توکل کرنے والوں کے دلوں
المتوکلین اوعیة الرضا و	کو رضا کی جگہ اور درویشوں کے دلوں کو
قلوب الفقراء اوعیة القناعة	قناعت کی جگہ اور دنیا داروں کے دلوں کو
وقلوب اھل الدنیا اوعیة الطمع	حرص کی جگہ قرار دیا ہے۔

اس ارشاد کا مطلب یہ ہے کہ اللہ نے جب حس واعضاء پیدا فرمائے تو اس میں اسی قسم کی طاقت وتوانائی بخشی، مثلاً ہاتھوں کو پکڑنے کا آلہ اور پاؤں کو چلنے کی طاقت، آنکھوں کو بینائی کا ذریعہ، کانوں کو سننے کے لئے اور زبان کو بولنے کے واسطے پیدا فرمایا ان کی تخلیق وظہور میں کوئی زیادہ اختلاف نہ رکھا لیکن جب دلوں کو پیدا فرمایا تو ہر دل کی مراد مختلف، ہر دل کا ارادہ

مختلف اور ہر دل کی خواہش گونا گوں پیدا فرمائی چنانچہ کسی دل کو معرفت کی جگہ، کسی دل کو گمراہی کا مقام، کسی دل کو قناعت کی جگہ اور کسی دل کو حرص و لالچ کا مقام بنایا اور اس نے دل سے بڑھ کر کوئی چیز نرالی پیدا نہیں کی۔ آپ کا ایک ارشاد یہ ہے کہ:

الناس رجلان عارف بنفسه فشغله في المجاهدات والرياضة وعارف بربه وشغله بخدمته وعبادته ومرضاته

لوگ دو قسم کے ہیں یا وہ اپنے نفس کے عارف ہوں گے یا حق تعالیٰ کے عارف، اگر وہ اپنے نفس کے عارف ہیں تو ان کا مشغلہ ریاضت و مجاہدہ ہے اور اگر حق تعالیٰ کے عارف ہیں تو ان کا مشغلہ خدمت، عبادت اور طلب رضا ہے۔

لہٰذا جو عارف نفس ہوتے ہیں ان کی نظر عبادت و ریاضت پر ہوتی ہے تا کہ درجہ و مقام حاصل کریں اور جو عارف رب ہوتے ہیں ان کی نظر عبادت و ریاضت کی طرف نہیں ہوتی بلکہ وہ عبادت اس لئے کرتے ہیں کہ وہ خود سب کچھ ہو جائیں۔

"فشتان مابين الرتبتين" ان دونوں مرتبوں میں بڑا بعد ہے، ایک بندہ مجاہدے میں قائم ہے اور دوسرا مشاہدے میں۔ واللہ اعلم۔

آپ کا ایک ارشاد یہ ہے کہ

الناس رجلان مفتقر الى الله فهوفي اعلى الدرجات على لسان الشريعة والآخر لايرى الافتقار لما علم من فراغ الله من الخلق والرزق والاجل والحيات والسعادة والشقاوة وهو في افتقاره اليه واستغنائه

لوگ دو قسم کے ہیں، ایک خدا کی طرف محتاج، تو ان کا درجہ شریعت کی ظاہری زبان میں بہت بلند ہے دوسرا وہ ہے جو اپنی نیاز مندی کو دیکھتا ہی نہیں اس لئے کہ وہ جانتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ازل ہی میں ہر مخلوق کے رزق، موت و حیات سعادت و شقاوت کو لکھ دیا ہے وہ خدا سے اپنی نیاز مندی میں

به عن غیرہ	خالص، غیروں سے بے پرواہ ہے۔

لہٰذا وہ پہلا شخص جو افتقار کی شان میں تقدیر دیکھنے کی وجہ سے رویت احتیاج میں محجوب ہے اور وہ دوسرا شخص جو اپنی نیاز مندی کی رویت کو چھوڑے ہوئے ہے وہ اپنی نیاز مندی کی رویت میں مکاشفہ اور استغناء میں ہے۔ گویا ایک نعمت کے ساتھ ہے دوسرا نعمت دینے والے کے ساتھ لیکن وہ جو نعمت کے ساتھ نعمت کی رویت میں ہے اگر چہ وہ غنی ہے مگر وہ دراصل فقیر ہے اور جو منعم کے ساتھ ہے اس کی رویت و مشاہدے میں ہے اگر چہ وہ فقیر ہے مگر وہ دراصل غنی ہے۔

(۲۹) حضرت احمد بن عاصم انطا کی رحمتہ اللہ علیہ:

طریقت کے اماموں میں سے ایک بزرگ، ممدوحِ اولیاء، قدوۂ اہل رضا حضرت ابو عبداللہ احمد بن عاصم انطار کی رحمتہ اللہ علیہ ہیں۔ آپؒ خاصانِ خدا اور سادات صوفیاء میں سے ہیں علوم شریعت و طریقت اور ان کے فروع و اصول کے عالم تھے طویل عمر پائی اور متقدمین مشائخ کی صحبت میں رہے تبع تابعین کا زمانہ پایا اور حضرت بشر حافی، سری سقطی کے ہم زمانہ اور حضرت حارث محاسبی رحمہم اللہ کے مرید تھے آپ نے حضرت فضیل کو دیکھا اور ان کی صحبت میں رہے اور ہر شیخ نے آپ کی تعریف و توصیف کی ہے طریقت اور اس کے فنون میں آپ کا کلام ارفع اور لطائف دل پسند ہیں۔ آپ کا ارشاد ہے:

انفع الفقر ما کنت به متجملا	نافع ترین درویشی وہ ہے جس کے ذریعہ تم
وبه راضیا	صاحب جمال بن کر اس سے راضی رہو۔

مطلب یہ ہے کہ عام لوگوں کے نزدیک تو جمال یہ ہے کہ بندہ ہر ناز و نعم کا مالک اور مختار ہے۔ درویشی میں جمال یہ ہے کہ اسباب کی نفی اور اثبات اور مسبب اور اس سے رغبت کچھ نہ ہو اور خدا کے احکام سے راضی رہے اس لئے کہ درویشی، سبب کی عدم موجودگی کا نام ہے اور تونگری سبب کی موجودگی کا نام۔ درویش بغیر سبب کے حق کے ساتھ ہوتا ہے اور تونگر، سبب کے ساتھ اپنے لئے ہوتا ہے۔ معلوم ہوا کہ سبب محل حجاب ہے اور ترک سبب محل کشف، اور دونوں

جہان میں جمال، کشف ورضا کے اندر ہے۔ سارے جہان کی تختی حجاب میں۔ یہ بیان تونگری پر درویشی کی فضیلت میں واضح اور ظاہر ہے۔ واللہ اعلم۔

(۳۰) حضرت ابو عبداللہ بن خفیف رحمتہ اللہ علیہ:

ائمۂ طریقت میں سے ایک بزرگ سالکِ طریق ورع وتقوای، امت میں مشابہ زہد حضرت یحیٰ علیہ السلام، حضرت ابو عبداللہ بن خفیف رحمتہ اللہ علیہ ہیں۔ طریقت کے ہر حال میں زاہد و تابع اور احادیث میں آپ کی روایات بلند مرتبہ رکھتی ہیں آپ فقہ اور سلوک میں امام ثوری کے پابند ہیں ان کے اصحاب کو دیکھنے والے اور ان کی صحبت میں رہنے والے تھے۔ آپ کا کلام سلوک وطریقت میں پر مغز ہے۔ آپ کا ارشاد ہے:

من اراد ان یکون حیافی حیوٰته فلا یسکن اطمع فی قلبه	جو شخص اپنی زندگی کو سکون قلب کے ساتھ گزارنا چاہے اس کے لئے ضروری ہے کہ دل میں طمع کو جگہ نہ دے۔

حتیٰ کہ وہ لذت کام ودہن سے بھی بے نیاز رہے اس لئے کہ حریص آدمی طمع دنیا میں مردہ حال ہوتا ہے حرص وآز سے دل پر مہر سی لگ جاتی ہے اور اس میں کوئی شک وشبہ کی گنجائش نہیں کہ مہر شدہ دل مردہ ہوتا ہے سب سے عمدہ وبہتر دل وہ ہے جو ماسوای اللہ سب کے لئے مردہ اور حق تعالیٰ کے لئے زندہ رہے کیونکہ حق تعالیٰ نے دل کو عزت دینے والا اور ذلت دینے والا پیدا کیا ہے اور وہ اپنے ذکر سے دل کو عزت بخشتا اور طمع دنیا سے دل کو ذلیل کرتا ہے۔ آپ کا ارشاد ہے کہ:

خلق الله تعالٰی القلوب مساكن الذكر. فصارت مساكن الشهوات من القلوب الاخوف مزعج اوشوق مغلق	اللہ تعالیٰ نے دلوں کو ذکر کا مقام بنایا ہے پھر جب وہ نفس کی پیروی کرتے ہیں تو خواہشات کی جگہ بن جاتی ہے۔ شہوتوں سے دلوں کی پاکیزگی یا تو بے قرار کرنے والے خوف سے ہوتی ہے یا بے آرام کرنے والے شوق سے۔

معلوم ہوا کہ خوف اور شوق، ایمان کے دو ستون ہیں جبکہ دل ایمان کا مسکن ہے تو اس کے لائق ذکر و قناعت چاہئے نہ کہ طمع و غفلت، لہٰذا مومنِ باخلاص کا دل نہ طماع ہو سکتا ہے نہ خواہشات کا غلام کیونکہ طمع و شہوت، موجب وحشت ہیں اس سے دل پریشان رہتا ہے اور ایمان سے غافل و بے خبر کر دیتا ہے ایمان کو حق سے انس و محبت اور ماسوٰی اللہ سے وحشت و نفرت۔ چنانچہ فرمایا:

الطماع مستوحش منه کل واحد
طمع کرنے والے سے ہر ایک ڈرتا اور پریشان ہوتا ہے۔

(۳۱) حضرت جنید بغدادی رحمتہ اللہ علیہ:

طریقت کے اماموں میں سے ایک بزرگ، طریقت کے شیخ المشائخ، شریعت کے امام الائمہ حضرت ابوالقاسم جنید بن محمد بن جنید بغدادی رحمتہ اللہ علیہ ہیں۔ آپ علمائے ظاہر اور ارباب قلوب میں مقبول تھے فنونِ علم میں کامل، سلوک و معاملات کے اصول و فروع میں امام و مفتی اور امام ثوری کے مصاحب تھے آپ کا کلام بلند پایہ اور احوال کامل ہیں یہاں تک کہ تمام اہل طریقت آپ کی امامت پر اتفاق رکھتے ہیں اور کسی مدعی و متصرف نے آپ پر اعتراض نہیں کیا ہے آپ حضرت سری سقطی رحمتہ اللہ علیہ کے بھانجے اور انہیں کے مرید تھے ایک مرتبہ حضرت سری سقطی رحمتہ اللہ علیہ سے لوگوں نے پوچھا کیا کوئی مرید اپنے پیر سے بلند مرتبہ ہوا ہے؟ آپ نے فرمایا ہاں! اور اس کا ثبوت ظاہر ہے کہ حضرت جنید کا درجہ میرے درجہ سے بلند ہے حالانکہ ان کا یہ فرمانا ازراہِ انکسار و تواضع تھا مگر انہوں نے جو فرمایا بصیرت سے فرمایا۔ امر واقعہ یہ ہے کہ کوئی شخص اپنے سے بلند کا درجہ نہیں دیکھ سکتا کیونکہ دیدار تحت تعلق ہے اور ان کا یہ فرمان دلیل واضح ہے کہ انہوں نے حضرت جنید کو اپنے سے بلند مقام پر پایا جب بھی انہیں دیکھا۔ اگرچہ انہوں نے بلندی میں دیکھا لیکن درحقیقت وہ ان کے تحت ہی ہے چنانچہ مشہور واقعہ ہے کہ حضرت سری سقطی رحمتہ اللہ علیہ کی حیات میں مریدوں نے حضرت جنید سے عرض کیا اے شیخ ہمیں ایسی نصیحت فرمایا کیجئے جس سے ہمارے دلوں کو چین و قرار آئے آپ نے فرمایا

کہ جب تک میرے شیخ اپنے مقام پر جلوہ افروز ہیں میں کوئی تلقین نہیں کرسکتا یہاں تک کہ ایک رات آپ کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا دیدار ہوا حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے فرمایا اے جنید لوگوں کو پند و نصائح کیوں نہیں کیا کرتے تا کہ اللہ تعالیٰ تمہارے ذریعہ ایک جہان کو نجات عطا فرمائے۔ جب آپ بیدار ہوئے تو آپ یہ خیال فرما رہے تھے کہ میرا درجہ، میرے شیخ کے درجہ میں پیوست ہو گیا ہے اور مجھے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے دعوت و تبلیغ کا امر فرمایا ہے۔ جب صبح ہوئی تو حضرت سری سقطی رحمتہ اللہ علیہ نے ایک مرید کو بھیجا کہ جب جنید نماز فجر کا سلام پھیریں تو ان سے کہنا تم نے مریدوں کے کہنے سے تعلیم و تبلیغ نہ کی اور نہ مشائخ بغداد کی سفارش قبول کی سب کی درخواستوں کو رد کرتے رہے میرا پیغام بھی پہنچا جب بھی تبلیغ شروع نہیں کی اب تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا حکم بھی ہو چکا ہے اب تو حکم بجالاؤ۔ حضرت جنید فرماتے ہیں کہ اس وقت میں نے جانا کہ میرا شیخ میرے دل سے بخوبی واقف ہے اور وہ میری ظاہری و باطنی ہر حالت سے باخبر ہیں، ان کا درجہ میرے درجہ سے بلند ہے کیونکہ وہ تو میرے اسرار سے واقف ہیں اور میں تو ان کے احوال سے بے خبر ہوں اس کے بعد میں اپنے شیخ کے دربار میں حاضر ہوا اور توبہ و استغفار کیا۔ میں نے عرض کیا کہ حضرت آپ کو کیسے معلوم ہوا کہ میں نے خواب میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا دیدار کیا ہے؟ انہوں نے فرمایا میں نے خواب میں رب العزت جل و علا کو دیکھا اس نے مجھ سے فرمایا کہ میں نے حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو جنید کے پاس بھیجا ہے کہ وہ لوگوں کو وعظ و تبلیغ کیا کریں تا کہ بغداد کے لوگوں کی دلی مراد برآئے۔

اس واقعہ کی روشن دلیل یہ ہے کہ مرشد جس حال میں بھی ہو وہ مریدوں کی ہر حالت سے باخبر ہوتا ہے۔

آپ کا کلام بہت بلند اور پر مغز و لطیف ہے چنانچہ آپ کا ارشاد ہے کہ:

کلام الانبیاء نباء عن الحضور و	نبیوں کا کلام حضور حق کی اطلاع دیتا ہے اور
کلام الصدیقین اشارات عن المشاهده	صدیقوں کا کلام مشاہدے کی طرف اشارہ کرتا ہے۔

خبر کی صحت نظر سے اور مشاہدے کی صحت فکر سے ہوتی ہے خبر عین ذات کو دیکھے بغیر نہیں دی جا سکتی اور اشارہ غیر کے بغیر نہیں ہو سکتا غرض یہ کہ صدیقین کا جو حد کمال اور انتہا ہے وہ انبیاء علیہم السلام کے حالات کی ابتداء ہے نبی و ولی کے درمیان یہ فرق اور ان کی فضیلت جو نبیوں کو اولیاء پر ہے اس سے واضح اور ظاہر ہے۔ بخلاف ملحدوں کے ان دو گروہوں نے جو فضیلت میں انبیاء کو موخر اور اولیاء کو مقدم کہتے ہیں۔ نعوذ باللہ منہا۔

حضرت جنید بغدادی رحمتہ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ میرے دل میں شیطان کو دیکھنے کی خواہش پیدا ہوئی ایک روز میں مسجد کے باہر کے دروازے پر کھڑا تھا کہ دور سے ایک بوڑھا آتا ہوا نظر پڑا جب میں نے اس کی صورت دیکھی تو مجھ پر شدید نفرت کا غلبہ ہوا جب وہ میرے قریب آیا تو میں نے کہا اے بوڑھے تو کون ہے؟ کہ تیری مہیب شکل کو میری آنکھیں دیکھنے کی طاقت نہیں رکھتیں اور تیری موجودگی سے میرے دل کو سخت وحشت ہو رہی ہے؟ اس نے کہا میں وہی ابلیس ہوں جس کے دیکھنے کی تم نے تمنا کی تھی۔ میں نے کہا او ملعون! حضرت آدم علیہ السلام کو سجدہ کرنے سے تجھے کس چیز نے باز رکھا؟ شیطان نے کہا اے جنید تمہارا کیا خیال ہے؟ کیا میں غیر خدا کو سجدہ کر لیتا۔ حضرت جنید فرماتے ہیں کہ ابلیس کی یہ بات سن کر میں ہکا بکا اور ششدر رہ گیا اور مجھے کوئی جواب نہ بن پڑا اتنے میں غیب سے ندا آئی کہ "**قل لہ کذبت لو کنت عبدا ماموراً لما خرجت من امرہ ونھیہ فسمع النداء من قلبی فصاح وقال احرقتنی باللہ وغاب**" "اے جنید اس ملعون سے کہو، تو جھوٹا ہے اگر تو فرمانبردار ہوتا تو تو اس کے حکم سے اور اس کی ممانعت سے کیوں انکار کرتا۔ شیطان نے میرے دل کے اندر سے یہ آواز سنی تو وہ چیخا اور کہنے لگا خدا کی قسم تم نے مجھے جلا دیا پھر اچانک وہ غائب ہو گیا۔

یہ حکایت آپ کی حفاظت وعصمت کی دلیل ہے اس لئے کہ اللہ تعالیٰ اپنے اولیاء کی نگہداشت فرماتا ہے اور ہر حال میں انہیں شیطان کے شر وفساد سے محفوظ رکھتا ہے۔

آپ کے ایک مرید کے دل میں یہ گمان پیدا ہو گیا کہ وہ کسی درجہ پر پہنچ گیا ہے اور وہ

منہ موڑ کر چلا گیا اس کے بعد ایک دن اس خیال سے آیا کہ وہ آپ کا تجربہ کرے آپ اپنی بزرگی سے اس کے دلی خیالات سے باخبر ہو چکے تھے اس نے آپ سے ایک سوال کیا۔ حضرت جنید نے فرمایا اس کا جواب لفظوں میں چاہتا ہے یا معنی میں؟ اس نے کہا دونوں شکلوں میں؟ آپ نے فرمایا اگر لفظوں میں چاہتا ہے تو اگر تو نے اپنا تجربہ کر لیا ہے تو میرے تجربہ کی تجھے حاجت نہیں حالانکہ تو یہاں میرے تجربہ کے لئے آیا اور اگر تو معنوی تجربہ چاہتا ہے تو میں تجھے اسی وقت ولایت سے معزول کرتا ہوں فوراً اور اسی لحہ اس مرید کا چہرہ کالا ہو گیا اور وہ کہنے لگا کہ یقین کی راحت میرے دل سے جاتی رہی ہے پھر وہ توبہ استغفار میں مشغول ہو گیا اور فضول باتوں سے تائب ہو گیا اس وقت حضرت جنید نے اس سے فرمایا تو اسے نہیں جانتا کہ اولیاء اللہ اسرار کے والی اور حاکم ہوتے ہیں تو ان کے زخم کی طاقت نہیں رکھتا پھر آپ نے اس پر دم کیا اور وہ دوبارہ اپنی مراد پر بحال ہو گیا اس کے بعد اس نے مشائخ سے بدگمانی رکھنے سے توبہ کر لی۔

(۳۲) حضرت ابوالحسن احمد بن محمد نوری رحمتہ اللہ علیہ:

طریقت کے اماموں میں ایک بزرگ، شیخ المشائخ، شریعت کے امام الائمہ، بادشاہِ اہل تصوف، بری از آفت تکلف، حضرت ابوالحسن احمد بن محمد خراسانی نوری رحمتہ اللہ علیہ ہیں جو تصوف کے معاملات میں عمدہ کلمات میں ظاہر تر اور مجاہدوں میں واضح تر تھے تصوف میں میں آپ کا اپنا ایک خاص مشرب ہے۔ صوفیاء کی جماعت آپ کو نوری کہتی اور ان کے اقتداء و پیروی کرتی ہے۔ صوفیوں کے بارہ گروہ جن میں سے دو گروہ مردود ہو چکے ہیں اور دس مقبول ہیں اور ان مقبول گروہوں میں ایک گروہ محاسبیوں کا ہے اور دوسرا قصاریوں کا تیسرا سیفوریوں کا، چوتھا جنیدیوں کا، پانچواں نوریوں کا، چھٹا سہیلیوں کا، ساتواں حکیموں کا، آٹھواں حرازیوں کا، نواں خفیفیوں کا اور دسواں ستاریوں کا ہے یہ دسوں گروہ محقق اور اہل سنت و جماعت ہیں لیکن وہ دو گروہ جو مردہ ہیں ان میں سے ایک حلولیوں کا جو حلول وامتزاج سے منسوب ہے اور سالمی اور مشبہ ان سے تعلق رکھتے ہیں اور دوسرا گروہ حلاجیوں کا ہے جو ترک شریعت کے قائل ہیں انہوں نے الحاد کی راہ اختیار کی جس سے وہ ملحد و بے دین ہو گئے۔ اباحتی اور فارسی ان ہی سے

متعلق ہیں۔اس کتاب میں اپنی جگہ ہر ایک کا جدا جدا تذکرہ آئے گا،اور ان کا اختلاف بھی مذکور ہوگا اور دوگروہ کے خلافیات بھی بیان کئے جائیں گے۔تا کہ مکمل استفادہ کیا جا سکے۔انشاء اللہ۔

لیکن نوری طریق،ترک مداہنت جوانمردی کی رفعت اور دائمی مجاہدے ان کی قابل تعریف خصوصیات ہیں۔

• حضرت ابوالحسن نوری رحمتہ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ میں حضرت جنید بغدادی رحمتہ اللہ علیہ کی خدمت میں حاضر ہوا تو انہیں مسند صدارت پر تشریف فرما دیکھ کر میں نے کہا "یاابا القاسم غشیتهم فصدروك ونصحتهم فرمونی بالحجارة" اے ابوالقاسم آپ نے ان سے حق کو چھپایا تو انہوں نے آپ کو مسند صدارت پر بٹھایا اور میں نے ان کو نصیحت کی تو انہوں نے مجھ پر پتھر پھینکے اس کی وجہ یہ ہے کہ مداہنت،خواہشات کے ساتھ موافقت رکھتی ہے اور نصیحت کو اپنے خلاف سمجھتی ہے اور آدمی چونکہ اس چیز کا دشمن ہوتا ہے جو اس کی خواہش کے خلاف ہو اور اس کو پسند کرتا ہے جو اس کی خواہش کے موافق ہو۔حضرت ابوالحسن نوری رحمتہ اللہ علیہ حضرت جنید رحمتہ اللہ علیہ کے رفیق اور ان کے شیخ طریقت حضرت سری سقطی رحمتہ اللہ علیہ کے مرید تھے۔حضرت نوری نے بکثرت مشائخ سے ملاقات کی اور ان کی صحبت میں رہے اور حضرت احمد بن ابی الجواری رحمتہ اللہ علیہ سے بھی ملے ہیں طریقت و تصوف میں آپ کے اشارات لطیف اور پسندیدہ ہیں اور فنون علم میں آپ کے نکات بہت بلند ہیں۔آپ کا ارشاد ہے:

"الجمع بالحق تفرقة عن غيره والتفرقة من غيره جمع بالحق"

حق کے ساتھ جمع ہونا اس کے غیر سے جدائی ہے اور اس کے غیر سے جدائی حق کے ساتھ ملنا ہے مطلب یہ ہے کہ ہر وہ شخص جو حق تعالیٰ سے واصل ہے وہ ماسوی اللہ سے جدا ہے۔ اصطلاحِ طریقت میں اسی کو جمع کہتے ہیں معلوم ہوا کہ حق سے واصل ہونا فکر خلائق سے علیحدگی ہے جس وقت خلق سے کنارہ کشی ہو جائے حق سے وصال درست ہوگا اور جب حق تعالیٰ سے

وصال درست ہے تو خلق سے اعراض صحیح ہوگا کیونکہ ''الضدان لایجتمعان ''ایک ساتھ دو ضدیں جمع نہیں ہو سکتیں۔

حکایت:

ایک مرتبہ حضرت ابوالحسن نوری رحمتہ اللہ علیہ نے تین شبانہ روز اپنے گھر میں کھڑے ہو کر شور مچایا لوگوں نے حضرت جنید بغدادی سے جا کر حال بیان کیا۔ آپ اٹھ کر فوراً تشریف لائے اور فرمایا اے ابوالحسن! اگر تم جانتے ہو کہ اس شور وغل میں کچھ بھلائی ہے تو بتاؤ میں بھی شور وغل کروں اور اگر تم جانتے ہو کہ اس میں کوئی فائدہ نہیں تو دل کو رضائے الٰہی کے حوالہ کر دینا چاہئے تا کہ تمہارا دل خوش وخرم رہے چنانچہ حضرت نوری اس سے باز آگئے اور کہنے لگے اے ابوالقاسم! آپ کیسے اچھے ہمارے استاد ورہنما ہیں۔ آپ کا ارشاد ہے:

اعز الاشیاء فی زماننا شیاء عالم	ہمارے زمانہ میں دو چیزیں بہت پیاری ہیں
یستفید بعلمہ وعارف ینطق	ایک وہ جو اپنے علم سے کام لے دوسرا وہ
عن الحقیقۃ	عارف جو حقیقت کو بیان کرے۔

مطلب یہ ہے کہ ہمارے زمانہ میں علم ومعرفت دونوں عزیز ہیں اس لئے کہ بے عمل علم بجائے خود جہالت ونادانی ہے اور بغیر حقیقت کے معرفت ناشناسی ہے آپ نے اپنے زمانہ کے حالات اور نشانیاں بیان فرمائی ہیں ورنہ آپ خود اپنے تمام اوقات میں عزیز ہوئے ہیں اور آج بھی عزیز ہیں۔

جو شخص عالم اور عارف کی جستجو میں سرگرداں رہتا ہے وہ اپنے حال میں پریشان رہتا ہے وہ کبھی عالم وعارف کو نہ پا سکے گا حالانکہ اسے اپنی ذات میں تلاش کرنا چاہئے تا کہ اسے سارا جہان عالم وعارف نظر آئے اور خود کو حوالۂ خدا کر دے تا کہ جہان کو عارف نظر آئے کیونکہ عالم وعارف بہت پیارا اور عزیز ہوتا ہے اور عزیز ومحبوب دشواری سے حاصل ہوتا ہے جس چیز کا ادراک دشوار ہو اس کے حاصل کرنے میں وقت کی اضاعت ہے خود اپنے میں علم ومعرفت کو حاصل کرنا چاہئے اور اپنے ہی اندر علم وحقیقت کے چشمے جاری کرنے چاہئیں۔ آپ کا ارشاد

ہے:

من علم الاشیاء باللہ فرجوعہ فی کل شیء الی اللہ

جو شخص ہر چیز کو خدا کی طرف سے جانتا اور سمجھتا ہے وہ ہر شئے کو دیکھ کر اس کی طرف متوجہ ہوتا ہے اس لئے کہ مِلک اور مُلک دونوں کا قیام مالک کے ساتھ ہوتا ہے۔

لہٰذا تسکین خاطر، خالق کائنات کو دیکھنے سے ہی حاصل ہوتی ہے نہ کہ پیدا شدہ اشیاء کو دیکھنے سے کیونکہ اگر اشیاء کو افعال کی علت بنائے گا تو غم وفکر میں مبتلا ہو جائے گا اور کسی شئے کی طرف اس کا متوجہ ہونا شرک ہوگا اور اگر اشیاء کو فعل کا سبب قرار دے گا تو سبب از خود قائم نہیں ہوتا بلکہ اس کا قیام مسبب کے ساتھ ہوتا ہے اور جب وہ مسبب الاسباب کی طرف متوجہ ہو گیا تو وہ غیر میں مشغول ہونے سے نجات پائے گا۔ واللہ اعلم۔

(۳۳) حضرت سعید بن اسمٰعیل حیری رحمتہ اللہ علیہ:

طریقت کے اماموں میں سے ایک بزرگ، پیشوائے سلف، یادگارِ صلحا حضرت ابو عثمان سعید بن اسمٰعیل حیری رحمتہ اللہ علیہ ہیں۔ آپ مقتدمین میں بزرگ تر، اور اپنے زمانہ میں منفرد تھے۔ اولیاء اللہ کے دلوں میں آپ کی بڑی قدر و منزلت تھی ابتداء میں حضرت یحییٰ بن معاذ کی صحبت میں رہے پھر شاہ شجاع کرمانی کی صحبت میں عرصہ تک رہے بعد ازاں حضرت ابو حفص کی زیارت کے لئے نیشاپور آ گئے اور ان کی صحبت میں رہے اور تمام عمر وہیں گزار دی۔

آپ خود اپنی سرگزشت بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ بچپن ہی سے میرا دل حقیقت کی طلب میں لگا ہوا تھا اور اہل ظاہر سے میرا دل متنفر تھا میرا دل جانتا تھا کہ عام لوگ جس ظاہری حالت میں ہیں یقیناً اس کے سوا کوئی باطنی حالت ضرور ہوگی یہاں تک کہ میں بالغ ہو گیا ایک دن میں حضرت یحییٰ بن معاذ رحمتہ اللہ علیہ کی مجلس میں پہنچا تو وہاں میں نے باطنی حقیقت اور مقصود کا چشمہ بہتا ہوا دیکھا میں نے ان کی صحبت اختیار کر لی حتیٰ کہ ایک جماعت شاہ شجاع کرمانی کے پاس سے ان کی صحبت میں آئی لوگوں نے ان کی باتیں مجھے سنائیں تو میرا دل ان کی زیارت

کے لئے بے تاب ہو گیا پھر میں نے رےؔ سے کرمان جانے کا عزم کیا میں نے بڑی کوشش کی کہ کسی طرح شاہ شجاع کی صحبت میسر آجائے مگر انہوں نے مجھے اجازت نہ دی اور فرمایا چونکہ تم مقام رجاؔ کے پروردہ اور صحبت یافتہ ہو اور تم نے حضرت یحییٰ کی صحبت اٹھائی ہے جو کہ مقام رجا پر فائز ہیں اس لئے جسے مشرب رجا مل جائے وہ طریقت پر گامزن نہیں رہ سکتا کیونکہ رجاؔ کی تقلید سے کاہلی اور سستی آجاتی ہے لیکن میں نے بہت منت وسماجت کی اور بیس دن ڈیوڑھی پر پڑا رہا تب کہیں جا کر قدم بوسی کی اجازت ملی۔ ایک عرصہ تک ان کی صحبت میں رہا وہ مردِ غیور تھے یہاں تک کہ انہوں نے حضرت ابو حفص کی زیارت کے لئے نیشا پور کا ارادہ کیا تو میں بھی ان کے ہمراہ ہو گیا جب ہم حضرت ابو حفص کے پاس پہنچے تو شاہ شجاع قبا زیب تن کئے ہوئے تھے حضرت ابو حفص نے جب انہیں دیکھا تو تعظیم کے لئے کھڑے ہو گئے اور استقبال کے لئے دوڑے اور فرمایا: ''وجدت فی القباء ماطَلَبْتُ فی العباء '' جسے میں گدڑی میں دیکھنا چاہتا تھا وہ قبا میں ملبوس ہے۔ وہ عرصہ دراز تک وہاں رہے اور میری تمام کوششیں حضرت ابو حفص کی صحبت میں حصول اسرار میں صرف ہوئیں لیکن شاہ کا دبدبہ اور ان کی خدمت کا التزام مجھے مانع رہا مگر حضرت ابو حفص میری دلی خواہش کو بھی ملاحظہ فرما رہے تھے اور میں دل میں اللہ تعالیٰ سے دعائیں کرتا تھا کہ مجھے حضرت ابو حفص کی صحبت اس طرح میسر آئے کہ شاہ شجاع آزردہ خاطر نہ ہوں غرض یہ کہ جب شاہ نے واپسی کا قصد کیا تو میں نے بھی ان کی ہمسفری کے لئے سفری لباس پہن لیا حالانکہ میرا دل حضرت ابو حفص کا گرویدہ ہو چکا تھا اس وقت حضرت ابو حفص نے شاہ سے فرمایا اس فرزند کو خوشدلی کے ساتھ یہاں چھوڑ دو تو میرے لئے باعث مسرت ہو گا۔ شاہ نے میری طرف رخ پھیر کر فرمایا ''اجب الشیخ '' شیخ کی خواہش کو قبول کرو۔ بالآخر شاہ چلے گئے اور میں وہیں رہ گیا میں نے حضرت ابو حفص کی صحبت میں بڑے عجائب وغرائب دیکھے مجھ پر ان کی بڑی شفقت تھی۔

اللہ تعالیٰ نے حضرت ابو عثمان کو تین بزرگوں کی صحبت میں تین منزلوں سے گزارا اور وہ تینوں منازل خود ان کے اشارات میں موجود ہیں یعنی مقام رجاؔ حضرت یحییٰ کی صحبت میں

مقام غیرت شاہ شجاع کی صحبت میں اور مقام شفقت حضرت ابو حفص رحمہم اللہ کی صحبت میں حاصل ہوا۔ طریقت میں یہ جائز ہے کہ مرید پانچ یا چھ یا اس سے زائد شیوخ کی صحبت میں رہ کر کوئی خاص منزل حاصل کرے اور شیخ اور اس کی صحبت اسے کسی خاص مقام کا کشف کرائے لیکن سب سے بہتر یہ خصلت ہے کہ مرید اپنے مقام سے کسی شیخ کو ملوث نہ کرے اور اس مقام میں ان کی نہایت کو ظاہر نہ کرے بلکہ یوں کہے کہ ان کی صحبت میں میرا اتنا حصہ تھا ان کا مرتبہ تو اس سے بلند تر تھا البتہ میرے نصیب میں ان کی صحبت سے اس سے زیادہ حصہ مقدر نہ تھا ایسی روش مقامِ ادب کے زیادہ نزدیک ہے اس لئے کہ سالکانِ حق کو کسی کے مقام و احوال سے سروکار نہیں ہوتا۔

حضرت ابو عثمان رحمتہ اللہ علیہ نے نیشا پور اور خراسان میں تصوف کا اظہار کیا اور حضرت جنید، حضرت رویم، یوسف بن حسین اور محمد بن فضل بلخی رحمہم اللہ کی خدمت میں بھی حاضر رہے مشائخ کے دلوں سے کسی نے اتنا فائدہ نہ اٹھایا ہوگا جتنا حضرت ابو عثمان نے اٹھایا تھا مشائخ اور اہل نیشا پور نے آپ کو منبر پر بٹھایا تا کہ لوگوں کو تصوف کے رموز و نکات سمجھائیں۔ آپ کی کتابیں بلند اور علم طریقت کے فنون میں آپ کی روایتیں وقیع ہیں۔ آپ کا ارشاد ہے:

حق لمن عزه الله بالمعرفة ان لايذل له بالمعصية	اللہ تعالیٰ جسے معرفت سے معزز فرمائے اسے واجب ہے کہ وہ معصیت کے ذریعہ خود کو ذلیل نہ کرے۔

اس ارشاد کا تعلق بندے کے کسب، مجاہدے اور امور حق کی دائمی رعایت سے ہے اگر تم اس راہ پر گامزن ہو جو کہ اس کے لائق ہے تو یاد رکھو کہ حق تعالیٰ جب کسی بندے کو معرفت سے نوازے تو وہ گناہ میں مبتلا ہو کر خود کو ذلیل نہ بنائے کیونکہ معرفت حق تعالیٰ کی عطا اور اس کی عنایت ہے اور معصیت بندے کا فعل ہے جسے حق تعالیٰ کے عطا کی عزت مل جاتی ہے اس کے لئے ناممکن ہوتا ہے کہ حق تعالیٰ اپنے کسی فعل کے ذریعہ اسے ذلیل کرے جس طرح کہ حضرت آدم علیہ السلام کو جب اس نے اپنی معرفت سے معزز فرمایا تو پھر اپنے فعل سے انہیں ذلیل نہ

فرمایا۔

(۳۴) حضرت احمد بن یحییٰ بن جلالی رحمتہ اللہ علیہ:

طریقت کے اماموں میں سے ایک بزرگ، سہیل اوج معرفت، قطب محبت حضرت ابوعبداللہ احمد بن یحییٰ بن جلالی رحمتہ اللہ علیہ ہیں، آپ بزرگانِ قوم اور سادات وقت میں سے تھے نیک خصلت، عمدہ سیرت اور حضرت جنید ابوالحسن نوری اور دیگر اکابرِ طریقت کے صحبت یافتہ تھے حقائق میں آپ کا کلام ارفع اور اشارات لطیف ہیں۔ آپ کا ارشاد ہے:

همت العارف الی مولاه ولم یعطف علی شیئی سواه عارف کا عزم و ارادہ اپنے مولیٰ کی طرف ہوتا ہے اس کے سوا کسی چیز کی طرف وہ مائل ہی نہیں ہوتا۔

عدمِ میلان کی وجہ یہ ہے کہ عارف کو معرفت کے سوا کچھ معلوم نہیں ہوتا جب اس کے دل کا خزانہ معرفت ہو جاتا ہے تو اس کی ہمت کا مقصود دیدارِ الٰہی کے سوا کچھ نہیں ہوتا کیونکہ افکار کی پراگندگی غم و فکر پیدا کرتی ہے اور اس کے لئے بارگاہ حق میں مانع و حجاب بن جاتی ہے۔

آپ اپنا واقعہ بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ ایک دن میں نے ایک خوبصورت اور حسین مجوسی لڑکے کو دیکھا میں اس کا حسن و جمال دیکھ کر دنگ رہ گیا اور اس کے روبرو جا کر کھڑا ہو گیا اتنے میں حضرت جنید بغدادی رحمتہ اللہ علیہ کا گزر ادھر سے ہوا میں نے ان سے عرض کیا کہ اے استاد! اللہ تعالیٰ ایسے حسین و جمیل چہرے کو دوزخ میں جلائے گا؟ آپ نے فرمایا اے فرزند! یہ نفس کا کھیل ہے جو تجھے لاحق ہوا ہے یہ نظارۂ عبرت نہیں ہے کیونکہ اگر تو بنگاہِ عبرت دیکھے تو عالم کے ہر ذرے میں ایسے ہی عجوبے موجود پائے گا تجھے بہت جلد مشیت الٰہی کی بے حرمتی کی بنا پر سزا ملنے والی ہے اس کے بعد آپ بیان کرتے ہیں کہ حضرت جنید منہ پھیر کر تشریف لے گئے تو اسی وقت میرے حافظہ سے قرآن کریم فراموش ہو گیا یہاں تک کہ میں نے برسوں اللہ سے مدد مانگی اور توبہ کی تب کہیں جا کر دوبارہ پھر قرآن کریم کی نعمت مجھے حاصل ہوئی اب مجھ میں یہ جرات نہیں کہ موجوداتِ عالم میں کسی چیز کی طرف ملتفت ہوں اور اپنی محبت کو اس

کائنات میں عبرت کی نظر سے دیکھنے میں ضائع کروں۔

(۳۵) حضرت ردیم بن احمد رحمۃ اللہ علیہ:

طریقت کے اماموں میں سے ایک بزرگ، وحید العصر، امام الدہر حضرت ردیم بن احمد رحمۃ اللہ علیہ ہیں جو اجلۂ ساداتِ مشائخ اور حضرت جنید رحمۃ اللہ علیہ کے مقربین خاص اور رازداروں میں سے تھے۔ آپ فقیہ الفقہا حضرت داؤد طائی رحمۃ اللہ علیہ کے ہم مشرب تھے علم تفسیر و قرأت میں کامل مہارت اور اپنے زمانہ میں تمام علوم و فنون میں ایسے منفرد تھے کہ کوئی آپ کا ہم پلہ نہ تھا۔ علوِ حال، رفعت مقام اور نیک خصلتی میں یگانۂ روزگار اور ریاضت شدیدہ میں یکتا و بے مثال تھے اپنی عمر کے آخری ایام میں علائق دنیا میں ملوث ہو کر منصب قضا پر فائز ہو گئے تھے آپ کا درجہ در پردہ ہونے سے زیادہ کامل تھا چنانچہ حضرت جنید بغدادی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ ہم مشغول عارف ہیں اور ردیم مشغول فارغ ہیں۔

آپ کی تصانیف بکثرت ہیں خاص کر وہ کتاب جس کا ''غلطة الواجدين'' میں نام ہے مجھے بہت پسند ہے۔

ایک شخص نے آپ سے پوچھا ''كيف حالك'' آپ کا حال کیسا ہے؟ آپ نے فرمایا ''كيف حال من دينه هواه وهمته دنياه ليس هو بصالح تقي ولا بعارف نقي'' تم اس کا حال کیا پوچھتے ہو کہ جس کا حال یہ ہے کہ اس کا دین اس کی خواہش، اس کی ہمت اس کی دنیا ہے نہ وہ صالح متقی ہے نہ عارفِ مصفی۔ آپ کا یہ اشارہ نفس کے عیبوں کی طرف ہے اس لئے کہ نفس کے نزدیک ہوا کا نام دین ہے اور ہوا کے پیروکار اسے دین کا نام دیتے اور اس کی پیروی کو شریعت کی متابعت کہتے ہیں جو بھی نفس کی خواہش پر چلے گا اگرچہ وہ مبتدع ہو، اہل ہوا کے اندر دیندار کہلائے گا اور جو اس کے خلاف چلے گا اگرچہ وہ متقی ہی کیوں نہ ہو اسے بے دین کہا جائے گا۔ ہمارے زمانہ میں یہ فتنہ و فساد ایک دوسرے میں عام ہے لہٰذا جن کی ایسی حالت ہو ہم ان کی صحبت سے پناہ مانگتے ہیں درحقیقت شیخ نے سائل کے جواب میں اہل زمانہ کے حال کی طرف اشارہ کیا ہے اور یہ بھی ممکن ہے کہ سائل کو اس حال کے

مطابق پایا ہوتو آپ نے اپنے اوپر ڈھال کر اس کا حال اس طرح بیان کیا ہو اور اپنا حال مخفی رکھا ہو۔ واللہ اعلم

(۳۶) حضرت یوسف بن حسین رازی رحمتہ اللہ علیہ:

طریقت کے اماموں میں سے ایک بزرگ، نادر زمانہ، رفیع المنزلت حضرت ابو یعقوب یوسف بن حسین رازی رحمتہ اللہ علیہ ہیں جو وقت کے اکابر ائمہ اور متقدمین مشائخ میں سے تھے اپنی زندگی بہت عمدہ گزاری حضرت ذوالنون مصری رحمتہ اللہ علیہ کے مرید، بکثرت مشائخ کے صحبت یافتہ اور ان کے خدمت گزار تھے۔ آپ کا ارشاد ہے:

اذل الناس الفقیر الطماع	لوگوں میں سب سے زیادہ لالچی ذلیل
واعزهم المحب المحبوبه	درویش ہے اور ان میں سب سے زیادہ
الصدیق	صاحب عزت درویش صادق ہے۔

کیونکہ لالچ درویش کو دونوں جہان میں خوار کر دیتی ہے اس لئے کہ بجائے خود درویشی اہل دنیا کی نظر میں حقیر و ذلیل ہے اور جب اس کے ساتھ لالچ بھی شامل ہو جائے تو اور زیادہ ذلیل بنا دیتی ہے لہٰذا صاحب عزت تونگر، ذلیل درویش سے بہت اچھا ہے اور طمع و لالچ سے درویش محض فریبی اور جھوٹا معلوم ہوتا ہے اور دوسرا محبّ بھی اپنے محبوب کی نظر میں تمام مخلوق سے زیادہ ذلیل ہوتا ہے اس لئے کہ محبّ خود کو اپنے محبوب کے مقابلہ میں بہت ذلیل جانتا ہے وہ اس کے ساتھ انکساری سے پیش آتا یہ بھی طمع و لالچ کا نتیجہ ہے جب طبیعت سے طمع جاتی رہتی ہے تب ہر ذلت میں وہ عزت پاتا ہے چنانچہ جب تک زلیخا حضرت یوسف علیہ السلام کی طامع رہی وہ ہمیشہ ذلیل تر ہوتی رہی اور جب طمع جاتی رہی تو اللہ تعالیٰ نے ان کا حسن و جمال اور عالم شباب انہیں واپس کر دیا یہ قاعدہ ہے کہ محبّ جتنا محبوب کے سامنے آنے کی کوشش کرے گا، محبوب اتنا ہی دور ہوتا جائے گا جب دوستی کو ہاتھ میں لے اور محض دوستی میں دوست سے کنارہ کش ہو اور صرف دوستی ہی پر اکتفا کرے تو لامحالہ دوست اس کی طرف متوجہ ہوگا۔ درحقیقت محبّ کی عزت اس وقت تک ہے جب تک وصل کی طمع نہ کرے اور جب محبّ میں وصال کی

ہوس پیدا ہوا اور وصل میسر نہ آئے تو اس کا لازمی نتیجہ ہے کہ وہ ذلیل ہو جاتا ہے اور جس محبّ کو دوستی میں دوست کے وصال و فراق سے بے نیازی نہ ہو اس کی محبت غرضمندانہ ہوتی ہے۔ واللہ اعلم

(۳۷) حضرت ابوالحسن سمنون بن عبداللہ خواص رحمۃ اللہ علیہ:

از ائمہ طریقت، آفتاب اہل محبت، قدوۂ اہل معاملت حضرت ابوالحسن سمنون بن عبد اللہ خواص رحمۃ اللہ علیہ ہیں جو اپنے زمانہ میں بے نظیر تھے۔ محبت میں آپ کا مرتبہ بلند تھا تمام مشائخ بزرگ جانتے تھے اور سمنون المحب کہتے تھے حالانکہ وہ خود اپنے کو سمنون الکذب کہا کرتے تھے آپ نے غلام الخلیل سے بڑی تکلیفیں اٹھائیں اس نے خلیفہ وقت کے آگے ناممکن و محال جھوٹی گواہیاں دیں جس سے تمام مشائخ آزردہ رہے یہ غلام الخلیل ایک ریاکار آدمی تھا جو صوفی و پارسا ہونے کا مدعی تھا جس نے خود کو بادشاہ کا حضوری اور اس کا نائب و خلیفہ مشہور کر رکھا تھا اور پکا دنیا دار اور چغل خور انسان تھا جیسے چغل خور اور جھوٹے لوگ آج بھی پائے جاتے ہیں اسی طرح یہ مدعی، درویشیوں اور مشائخ کی بدگوئیاں حکام امراء کے سامنے کرتا رہتا تھا تاکہ ایسے لوگوں کی رسائی آمروں اور حاکموں تک نہ ہونے پائے اور خود اس کا مرتبہ برقرار رہے مقام مسرت ہے کہ حضرت سمنون اور ان مشائخ کے زمانہ میں صرف ایک ہی ایسا بدخصلت شخص تھا ورنہ اس زمانہ میں تو ہر محقق کے لئے ایک لاکھ غلام الخلیل جیسے بدطینت موجود ہیں۔

بغداد میں جب حضرت سمنون کے مرتبہ کا غلغلہ بلند ہوا اور ہر ایک آپ کی نزدیکی کا خواہاں ہوا تو غلام الخلیل اس سے رنجیدہ ہوا اور اس نے کئی باتیں گھڑ لیں یہاں تک کہ ایک خوبصورت عورت کو حضرت سمنون کے پاس بھیجا حضرت سمنون کی نظر جب اس کے جمال پر پڑی تو عورت نے اپنے آپ کو پیش کیا آپ نے اسے جھڑک دیا پھر وہ حضرت جنید کے پاس پہنچی اور ان سے کہا کہ آپ سمنون سے فرمائیں کہ وہ مجھ سے نکاح کر لیں حضرت جنید کو اس کی یہ درخواست ناپسند آئی اور اسے جھڑک کر نکال دیا اس کے بعد وہ غلام الخلیل کے پاس آئی اور اس سے ان عورتوں کی مانند جو دھتکاری جاتی ہیں اور اتہام طرازی شروع کر دیتی ہیں آپ پر

تہمت دھرنے لگی اور اس قسم کی باتیں بنا کر کہنے لگی کہ جو سنتا ان سے برگشتہ ہو جاتا حتیٰ کہ خلیفہ وقت کو ان سے اتنا برگشتہ کر دیا کہ اس نے انہیں قتل کرنے کا پختہ ارادہ کر لیا جب جلاد کو بلایا گیا اور اس نے خلیفہ سے قتل کی اجازت مانگی اور خلیفہ نے قتل کی اجازت دینی چاہی تو اس کی زبان گنگ ہو گئی جب اس رات وہ سویا تو خواب میں اسے خبردار کیا گیا کہ تیرے ملک اور حکومت کا زوال حضرت سمنون رحمتہ اللہ علیہ کی زندگی سے وابستہ ہے دوسرے دن خلیفہ نے ان سے معافی مانگی اور حسن سلوک سے پیش آیا۔

حقیقت و محبت میں آپ کا کلام بلند اور اشارات دقیق ہیں ایک مرتبہ کا واقعہ ہے کہ جب وہ حجاز سے واپس آ رہے تھے تو شہر "فید" کے لوگوں نے درخواست کی کہ منبر پر تشریف فرما ہو کر کچھ پند و نصائح فرمائیں۔ آپ منبر پر وعظ کے لئے تشریف لے گئے کوئی متوجہ نہ ہوا آپ نے اپنا رخ مسجد کی قندیلوں کی طرف کر کے فرمایا اے قندیلو! میں تم سے مخاطب ہوں دفعتاً سب قندیلیں گر کر چکنا چور ہو گئیں۔ آپ کا ارشاد ہے:

لایعبر عن شئی الابما ھو ادق منہ ولا شئی ادق من المحبۃ فبم یعبر عنھا	چیزوں کی تعبیر اس سے زیادہ دقیق چیز سے ہوتی ہے کیونکہ محبت سے زیادہ ادق چیز کوئی نہیں ہے اس کی تعبیر کسی چیز سے نہیں کی جا سکتی۔

مطلب یہ ہے کہ محبت کے مفہوم کو الفاظ و عبارت میں ادا نہیں کیا جا سکتا چونکہ عبارات معبر یعنی معنیٰ کی صفت ہے اور محبت محبوب کی صفت ہے لہٰذا عبارت کے ذریعہ اس کی حقیقت کا ادراک ناممکن ہے۔ واللہ اعلم

(۳۸) حضرت شاہ شجاع کرمانی رحمتہ اللہ علیہ:

از ائمہ طریقت، شاہ شیوخ، تغیراتِ زمانہ سے محفوظ حضرت ابو الفوارس شاہ شجاع کرمانی رحمتہ اللہ علیہ ہیں جو خانوادۂ سلاطین سے تعلق رکھتے تھے۔ آپ اپنے زمانہ میں بے نظیر اور ابو تراب نخشبی رحمتہ اللہ علیہ کے صحبت یافتہ تھے بکثرت مشائخ سے ملاقات کی حضرت ابو عثمان

حیری کے تذکرے میں آپ کا مختصر حال مذکور ہے تصوف میں آپ کی کتب وتحریریں مشہور ہیں آپ کو "مرآۃ الحکما" یعنی دانشمندوں کا آئینہ کہا جاتا تھا آپ کا کلام بلند ہے۔ آپ کا ارشاد ہے:

لاھل الفضل فضل مالم یروہٗ فاذا رأوہ فلا فضل لھم ولاھل والایۃ ولایۃ مالم یروھا فاذا رأوھا فلا ولا یتہ لھم

صاحب فضیلت کو اس وقت تک فضیلت ہے جب تک کہ اپنی فضیلت کو نہ دیکھے جب اسے دیکھ لیا تو اب اس کی کوئی فضیلت نہیں ایسے ہی صاحب ولایت کے لئے اس وقت تک ولایت ہے جب تک کہ وہ اس کی نظر سے پوشیدہ ہے جب اسے نظر آ گئی تو اب اس کے لئے کوئی ولایت نہیں۔

مطلب یہ ہے کہ فضیلت ایسی صفت ہے جسے فاضل نہیں دیکھتا اسی طرح ولایت بھی ایسی صفت ہے جسے ولی نہیں دیکھتا جس نے اپنے آپ کو دیکھا کہ میں فاضل ہوں یا ولی ہوں تو وہ نہ فاضل ہے اور نہ ولی۔ آپ کی سیرت کے تذکرے میں مذکور ہے کہ آپ چالیس سال تک نہیں سوئے اور جب سوئے تو انہیں خواب میں دیدار الٰہی نصیب ہوا انہوں نے عرض کیا اے خدا! تجھے تو میں بیداری میں تلاش کر رہا تھا مگر تو خواب میں ملا فرمایا اے شاہ! تو نے بے داری کی وجہ ہی سے خواب میں نعمت دیدار پائی ہے اگر تو وہاں سوتا تو یہاں نہ پاتا۔ واللہ اعلم

(۳۹) حضرت عمرو بن عثمان مکی رحمتہ اللہ علیہ:

طریقت کے اماموں میں سے ایک بزرگ، دلوں کے سرور، بواطن کے نور حضرت عمرو بن عثمان مکی رحمتہ اللہ علیہ ہیں جو اکابر سادات اہل طریقت میں سے تھے علم طریقت کے حقائق میں آپ کی تصانیف مشہور ہیں اپنی نسبت ارادت، حضرت جنید بغدادی رحمتہ اللہ علیہ سے کرتے تھے ان کے بعد انہوں نے حضرت ابوسعید خراز سے ملاقات کی اور ناجی کی صحبت پائی۔ اصول میں آپ امام وقت تھے۔ آپ کا ارشاد ہے:

لایقع علی کیفیة الوجد عبارة لانه سر الله عند المومنین

مردانِ خدا کے وجد کی کیفیت عبارت سے ادا نہیں کی جا سکتی کیونکہ وہ حق کا بھید ہے جو مومنوں کے لئے ہے۔

اس لئے کہ جن لفظوں کو مرکب کر کے مفہوم ادا کیا جائے گا وہ حق تعالیٰ کا بھید نہیں ہوگا بندوں کی ہر سعی، تکلف و تصرف پر مبنی ہے اور اسرارِ ربانی اس سے بہت دور ہیں۔

حضرت عمرو جب اصفہان تشریف لائے تو ایک نوجوان آپ کی صحبت میں شامل ہو گیا اس کا باپ ان کی صحبت سے منع کرتا تھا یہاں تک کہ وہ نوجوان اس غم میں بیمار پڑ گیا اور عرصہ تک صحبت میں نہ آیا ایک روز حضرت عمرو اپنے رفقاء کے ساتھ اس کی عیادت کے لئے تشریف لے گئے نوجوان نے اشارہ کیا کہ کسی قوال کو بلا کر چند اشعار سنوا دیجئے چنانچہ قوال بلایا گیا اور اس نے یہ شعر پڑھا:

مالی مرضت فلم یعدنی عاید
منکم ویمرض عندکم فاعود

میرا عجب حال ہے کہ میں بیمار ہوتا ہوں تو تم میں سے کوئی میری عیادت کو نہیں آتا اور جب تم بیمار ہوتے ہو تو میں بیمار پرسی کرتا ہوں۔نوجوان نے جب یہ شعر سنا تو اٹھ کر بیٹھ گیا اور مرض کی شدت بہت کم ہو گئی وہ کہنے لگا اے قوال اور کوئی شعر سناؤ۔ چنانچہ اس نے پڑھا:

واشد من مرضی علّی صدودکم
وصدود عندکم علّی شدید

تمہاری صحبت میں حاضری کی بندش اپنے مرض سے زیادہ سخت ہے اور تمہاری صحبت سے روکنا مجھ پر بہت دشوار ہے۔یہ سن کر وہ نوجوان کھڑا ہو گیا اور سارا مرض دور ہو گیا یہ دیکھ کر اس کے باپ نے اسے حضرت عمرو کے سپرد کر دیا ان کی طرف سے دل میں جو اندیشہ تھا اس کی معذرت چاہی اور توبہ کی۔وہ نوجوان مشائخ طریقت میں شامل ہے۔واللہ اعلم

(۴۰) حضرت سہل بن عبداللہ تستری رحمتہ اللہ علیہ:

طریقت کے اماموں میں ایک بزرگ، مالک القلوب، ماحی العیوب حضرت ابو محمد

سہل بن عبداللہ تستری رحمتہ اللہ علیہ ہیں جو شیخ وقت اور سب کے نزدیک ستودہ صفات تھے آپ صاحب ریاضت شدیدہ اور نیک خصلت تھے اخلاص اور افعال کے عیوب میں آپ کا کلام لطیف ہے۔ علماء ظاہر فرماتے ہیں کہ ''ھو جمع بین الشریعة والحقیقة'' وہ شریعت وحقیقت کے جامع تھے حالانکہ یہ مقولہ بجائے خود خطا کی علامت ہے اس لئے کہ کسی نے شریعت وطریقت میں فرق نہیں کیا ہے کیونکہ شریعت بغیر حقیقت کے نہیں اور حقیقت بغیر شریعت کے نہیں دونوں لازم ملزوم ہیں ممکن ہے اس مقولہ سے ان کی مراد یہ ہو کہ ان کا کلام فہم حقیقت میں بہت آسان اور دلوں میں اثر کرنے والا تھا اللہ تعالیٰ نے جب خود شریعت اور حقیقت کو یکجا فرمایا ہے تو ناممکن ہے کہ کوئی ولی ان میں فرق کرے۔ لامحالہ جو فرق کو جائز رکھتا ہے اس پر لازم آتا ہے کہ وہ ایک کو قبول کرے اور دوسرے کو رد کرے حالانکہ شریعت کا رد کرنا الحاد و بے دینی ہے اور طریقت کا رد کرنا کفر وشرک ہے اور جو فرق بھی نظر آتا ہے وہ معنی کا فرق نہیں ہے بلکہ اثبات حقیقت کا فرق ہے چنانچہ کہتے ہیں کہ ''لا الٰہ الا اللہ حقیقه محمد رسول اللہ شریعة'' لاالٰہ الا اللہ حقیقت ہے اور محمد رسول اللہ شریعت ہے اگر کوئی صحت ایمان کی حالت میں ایک کو دوسرے سے جدا کرنا چاہے تو نہیں کرسکتا اس کی یہ خواہش صحت ایمان کو باطل کرتی ہے حالانکہ پوری شریعت حقیقت کی فرع ہے جس طرح توحید کا اقرار حقیقت کی معرفت ہے اسی طرح فرمان کو بجالانا شریعت کے ہم معنیٰ ہے یہ ظاہر دار لوگ جو انہیں پسند نہ آئے اس کے منکر ہو جاتے ہیں راہ حق کے اصولوں میں سے کسی اصل کا انکار خطرناک ہے۔ آپ کا ارشاد ہے:

ماطلعت الشمس ولاغربت علی اھل وجه الارض الا دھم جھال باللہ الا من یوثر اللہ علی نفسه وروحه و دنیاه وآخرته

روئے زمین کے رہنے والوں پر اس حال میں سورج طلوع وغروب ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ سے ان کی بے خبری بڑھتی ہی جاتی ہے بجز ان خوش نصیب لوگوں کے جنہوں نے اللہ تعالیٰ کو اپنے آپ پر اور اہل وعیال اور

اپنی دنیا وآخرت پر مقدم کر رکھا ہے۔

مطلب یہ ہے کہ جو شخص اپنے مقدر کے دامن پر دست اندازی کرتا ہے یہ اس کی دلیل ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی قدرت سے لاعلم ہے کیونکہ اگر اسے معرفت ہوتی تو وہ تدبیر سے کنارہ کش ہو جاتا کیونکہ معرفت تدبیر کے ترک کی مقتضی ہے اور اسی کا دوسرا نام تسلیم و رضا ہے تدبیر کا اثبات تقدیر سے جہالت و نادانی ہے۔ واللہ اعلم

(۴۱) حضرت محمد بن فضل بلخی رحمتہ اللہ علیہ:

طریقت کے اماموں میں ایک بزرگ، مختار اہلِ حرمین، مشائخ کے قرۃ العین حضرت ابو محمد عبداللہ محمد بن فضل بلخی رحمتہ اللہ علیہ ہیں جو اجلۂ مشائخ میں سے تھے اور اہل عراق و اخراسان کے محبوب تھے حضرت احمد بن حضرویہ کے مرید تھے اور حضرت ابو عثمان حیری کو آپ سے عظیم تعلق خاطر تھا متعصب لوگوں نے اپنے جنون میں آپ کو بلخ سے نکال دیا آپ وہاں سے سمرقند تشریف لے گئے اور وہیں عمر گزار دی۔ آپ کا ارشاد ہے:

اعرف الناس باللہ اشدھم مجاھدۃ فی اوامرہ واتبعھم بسنۃ نبیہ

لوگوں میں سب سے زیادہ عارف وہ ہے جو ادائے شریعت میں کوشاں اور اپنے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی پیروی کا سب سے زیادہ خواہاں ہے

کیونکہ جو جتنا زیادہ خدا کے نزدیک ہوگا وہ اتنا ہی زیادہ ادائے حکم میں حریص ہوگا اور جتنا خدا سے دور ہوگا وہ اتنا ہی زیادہ اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی پیروی سے کنارہ کش ہوگا۔ آپ کا ارشاد ہے:

عجبت لمن یقطع الھوادی والقفار والمغاوز حتٰی یصل الٰی بیتہٖ وحرمہٖ لان فیہ اٰثار انبیاء ہ کیف لایقطع بادیتہ نفسہ وھواہ

میں اس شخص پر تعجب کرتا ہوں جو جنگل وصحرا اور بیابانوں کو طے کرتا ہوا خدا کے گھر اور حرم تک تو پہنچتا ہے کیونکہ اس میں اس کے نبیوں کے آثار ہیں لیکن وہ اپنے نفس کے جنگل اور

حتّٰی یصل الٰی قلبہ لان فیہ آثار مولاہ

اپنی خواہشات کی وادیوں کو طے کر کے اپنے دل تک پہنچنے کی کوشش کیوں نہیں کرتا کیونکہ دل میں تو اس کے مولیٰ کے آثار ہیں۔

مطلب یہ ہے کہ دل حق تعالیٰ کی معرفت کی جگہ ہے وہ اس کعبہ سے بہتر ہے جو خدمت وعبادت کا قبلہ ہے کعبہ وہ ہے جس کی طرف بندہ کی نظر ہے اور دل وہ ہے جس کی طرف حق تعالیٰ خود نظر فرماتا ہے جہاں میرے دوست کا دل ہوگا میں وہاں ہوں گا اور جہاں اس کا حکم ہوگا میری مراد وہاں ہوگی اور جس جگہ میرے نبیوں کے آثار ہیں وہ جگہ میرے دوستوں کا قبلہ ہے۔

(۴۲) حضرت محمد بن علی ترمذی رحمتہ اللہ علیہ:

طریقت کے اماموں میں ایک بزرگ، شیخ باخطر، فانی از صفاتِ بشر حضرت ابوعبداللہ محمد بن علی ترمذی رحمتہ اللہ علیہ ہیں جو فنون علم کے کامل امام اور برگزیدہ شیخ المشائخ تھے آپ کی تصانیف بکثرت ہیں اور ہر کتاب سے آپ کی کرامتیں ظاہر ہیں آپ کی تصانیف میں کتاب ''ختم الولایت''، ''کتاب النہج'' اور ''نوادر الاصول'' زیادہ مشہور ہیں۔ میں آپ کی ہر کتاب پر فریفتہ ہوں میرے شیخ نے فرمایا ہے کہ حضرت محمد بن علی ترمذی ایسے درّ یتیم ہیں جن کی مثال سارے جہان میں نہیں ہے علوم ظاہری میں بھی آپ کی کتابیں ہیں اور احادیث میں آپ کی سند بہت وقیع ہے آپ نے ایک تفسیر بھی شروع کی تھی مگر آپ کی عمر نے وفا نہ کی جس قدر تحریر فرمائی ہے وہ تمام اہل علم میں مروج ہے۔ حضرت امام اعظم ابوحنیفہ رضی اللہ عنہ کے مصاحبین میں سے کسی ایک خاص مصاحب کو فقہ پڑھائی شہر ترمذ میں آپ کو حکیم ترمذی کے نام سے یاد کیا جاتا تھا اس ولایت میں تمام دانشور صوفیاء آپ کی پیروی کرتے تھے آپ کے مناقب بہت ہیں آپ حضرت خضر علیہ السلام کی صحبت میں بھی رہے آپ کے مرید حضرت ابوبکر وراق بیان کرتے ہیں کہ ہر اتوار کو حضرت خضر علیہ السلام ان کے پاس آتے اور ایک دوسرے سے واقعات وحالات دریافت کرتے تھے۔ آپ کا ارشاد ہے:

من جهل باوصاف العبودیته یکون اجهل باوصاف الربوبیّة ومن لم یعرف طریق معرفة النفس لم یعرف طریق معرفته الرب بان الظاهر متعلق بالباطن والتعلق بالظاهر بلاباطن محال ودعوی الباطن بلا ظاهر محال فمعرفته اوصاف الربوبیة فی الصحیح ارکان العبودیته ولایصح ذالك الا بالادب

جو شخص علم شریعت اور اوصافِ عبودیت سے ناواقف ہے وہ اوصافِ ربوبیت سے تو اور بھی زیادہ بے خبر ہوگا اور جو ظاہر میں معرفتِ نفس کی راہ سے بے خبر ہے وہ معرفت رب کی راہ یعنی طریقت سے بھی بے خبر ہوگا کیونکہ ظاہر باطن کے ساتھ مربوط ہے اور ظاہری تعلق بغیر باطن کے محال ہے نیز بغیر ظاہر کے باطن کا دعوٰی بھی باطل ہے لٰہذا اوصاف ربوبیت کی معرفت، ارکانِ عبودیت و بندگی کی صحت پر منحصر ہے اور یہ بات صحتِ ادب اور احکامِ شریعت کی پابندی کے بغیر حاصل نہیں ہو سکتی۔

(۴۳) حضرت ابوبکر محمد بن عمر وراق رحمتہ اللہ علیہ:

طریقت کے اماموں میں ایک بزرگ، شرفِ زہادِ امت، مزکی اہل صفوت، حضرت ابوبکر محمد بن عمر وراق رحمتہ اللہ علیہ ہیں جو اکابر وزہاد مشائخ میں سے تھے آپ نے حضرت احمد بن خضرویہ سے ملاقات کی اور حضرت محمد بن علی ترمذی کی صحبت پائی ہے۔ آداب و معاملات میں آپ کی تصانیف بکثرت ہیں مشائخ عظام آپ کو "مؤدب الاولیاء" کہتے ہیں۔

حکایت:

آپ فرماتے ہیں کہ میرے شیخ حضرت محمد بن علی ترمذی نے چند اوراق مجھے دیئے تھے کہ میں انہیں دریائے جیحون میں ڈال دوں لیکن میرا دل ان کے دریا برد کرنے پر راضی نہ ہوا میں نے ان اوراق کو اپنے گھر رکھ لیا اور حاضر ہو کر کہہ دیا کہ میں نے دریا میں ڈال دیا ہے آپ

نے فرمایا تم نے کیا دیکھا؟ میں نے کہا میں نے تو کچھ بھی نہیں دیکھا۔ فرمایا تو پھر تم نے انہیں دریا برد نہیں کیا جاؤ انہیں دریا برد کر کے آؤ چنانچہ میں گیا اس وقت دل میں کئی قسم کے وسوسے لاحق ہو رہے تھے بالآخران اوراق کو دریا میں ڈال دیا۔ دریا کا پانی اسی لمحہ پھٹا اور ایک صندوق نمودار ہوا جس کا ڈھکنا کھلا ہوا تھا وہ اوراق اس صندوق میں چلے گئے پھر اس کا ڈھکنا بند ہو گیا اور پانی برابر ہو کر صندوق رو پوش ہو گیا واپس آ کر انہوں نے سارا واقعہ بیان کر دیا آپ نے فرمایا ہاں اب تم نے ڈالا ہے۔ میں نے عرض کیا اے شیخ! یہ کیا اسرار ہیں مجھ پر ظاہر فرمایئے۔؟ آپ نے فرمایا میں نے اصول تحقیق میں ایک کتاب لکھی تھی جس کا سمجھنا دشوار تھا میرے بھائی حضرت خضر علیہ السلام نے مجھ سے اسے مانگا۔ اللہ تعالیٰ نے پانی کو مامور فرمایا کہ وہ ان تک پہنچادے۔ حضرت ابوبکر وراق رحمتہ اللہ علیہ کا ارشاد ہے کہ:

الناس ثلثة العلماء والامراء والفقراء فاذا فسد العلماء فسد الطاعة والشريعة واذا فسد الامراء فسد المعاش واذا فسد الفقراء فسد الاخلاق

لوگ تین طرح کے ہیں، علماء، امراء اور فقراء جب علماء خراب ہو جاتے ہیں تو خلق کے طاعت و احکام تباہ ہو جاتے ہیں اور جب امراء خراب ہو جاتے ہیں تو لوگوں کی معیشت تباہ اور برباد ہو جاتی ہے اور جب فقراء خراب ہو جاتے ہیں تو لوگوں کے اخلاق برباد ہو جاتے ہیں۔

لہٰذا امراء سلاطین کی خرابی ظلم و ستم، علماء کی حرص و طمع کی صورت میں ظاہر ہوتی ہے اور فقراء کی خرابی جاہ و منصب کی خواہش میں رونما ہوتی ہے جب تک امراء و سلاطین علماء سے منہ نہ موڑیں تباہ و برباد نہیں ہوتے اور جب تک علماء بادشاہوں کی صحبت سے اجتناب کریں تباہ و خراب نہیں ہوتے اور جب تک فقراء میں جاہ و حشم کی خواہش پیدا نہیں ہوتی تباہ و خراب نہیں ہوتے اس لئے کہ بادشاہوں کا ظلم، بے علمی کی وجہ سے، علماء میں طمع بد دیانتی کی وجہ سے اور فقراء میں جاہ و حشم کی خواہش بے توکلی کی وجہ سے پیدا ہوتی ہے لہٰذا بے علم بادشاہ، بد دیانت عالم اور

بے توکل فقیر بہت برے ہوتے ہیں لوگوں میں خرابیوں کا ظہور اور برائیوں کا صدور ان ہی تینوں گروہوں سے رونما ہوتا ہے۔

(۴۴) حضرت ابوسعید احمد بن عیسیٰ خرازی رحمتہ اللہ علیہ:

طریقت کے اماموں میں سے ایک بزرگ، سفینۂ توکل و رضا، سالک طریق فنا حضرت ابوسعید احمد بن عیسیٰ خرازی رحمتہ اللہ علیہ ہیں جو احوال مریداں کی زبان اور طالبان اوقات کی برہان تھے۔ سب سے پہلے جس نے طریق بقا و فنا کی تعریف لفظوں میں کی وہ آپ ہی تھے آپ کے مناقب، عمدہ ریاضتیں اور اس کے نکتے مشہور ہیں ان سے کتابیں بھری پڑی ہیں آپ کا کلام اور آپ کے رموز و اشارات بلند ہیں حضرت ذوالنون مصری، بشر حافی اور سری سقطی رحمہم اللہ کی صحبت اٹھائی۔ آپ کا ارشاد ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے:

جبلت القلوب علی حب من احسن الیھا قال وعجبا لمن لم یر محسنا غیر اللہ کیف لایمیل بکلیتہ الی اللہ

اللہ تعالیٰ نے دلوں کو اس خاصیت پر پیدا فرمایا ہے کہ جو اس پر احسان کرتا ہے اس کا دل محبت کے ساتھ اس کی طرف مائل ہوتا ہے مجھے ایسے دل پر تعجب ہوتا ہے جو یہ دیکھنے کے باوجود کہ اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی احسان کرنے والا نہیں مگر وہ خلوص دل سے خدا کی طرف مائل نہیں ہوتا

حقیقت یہ ہے کہ وہی احسان کرتا ہے جو ایمانوں یعنی جانوں کا حقیقی مالک ہو احسان کی تعریف یہ ہے کہ صاحب احتیاج کے ساتھ بھلائی کی جائے اور جو خود دوسرے کا احسان مند ہے وہ بھلا کسی دوسرے پر کیا احسان کرے گا؟ چونکہ حقیقی ملکیت اور حقیقی بادشاہت اللہ تعالیٰ ہی کو حاصل ہے اور اسی ہی کی ذات ایسی ہے جو کسی دوسرے کے احسان سے بے نیاز ہے جب بندگانِ خدا منعم و محسن کے انعام و احسان کے اس معنی کو دیکھتے اور سمجھتے ہیں تو ان کے قلوب صافیہ مکمل طور پر اسی کی محبت میں غرق ہو جاتے ہیں اور وہ ہر غیر سے کنارہ کش رہتے ہیں۔

(۴۵) حضرت علی بن محمد اصفہانی رحمتہ اللہ علیہ:

طریقت کے اماموں میں ایک بزرگ، شاہ محققان دل مریداں حضرت ابوالحسن علی بن محمد اصفہانی رحمتہ اللہ علیہ ہیں۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ حضرت علی بن محمد جو اکابر مشائخ میں سے تھے اور ان سے حضرت جنید بغدادی کی لطیف مکاتبت ہوئی اور عمرو بن عثمان مکی ان کی زیارت کو اصفہان تشریف لے گئے۔ وہ ابوتراب کے مصاحب، حضرت جنید کے رفیق خاص تھے۔ واللہ اعلم۔ غرض یہ کہ آپ ممدوح مشائخ، رضا و ریاضت سے آراستہ اور فتنہ و آفت سے محفوظ تھے حقائق و معاملہ میں عمدہ زبان اور دقائق و اشارات میں لطیف بیان کے حامل تھے۔ آپ کا ارشاد ہے کہ:

الحضور افضل من الیقین لان الحضور وطنات والیقین خطرات

بارگاہ قدسی میں حضوری یقین سے افضل ہے اس لئے حضور دل میں جاگزیں ہوتا ہے اس میں غفلت جائز نہیں اور یقین میں خطرے ہیں کبھی ہو کبھی نہ ہو۔

لہٰذا حاضر رہنے والے حضور میں رہتے ہیں اور یقین کرنے والے چوکھٹ پر

نیز آپ کا ارشاد ہے کہ:

من وقت آدم الی قیام الساعت الناس یقولون القلب القلب وانا احب ان اری رجلایصف القلب ویقول ایش القلب او کیف القلب فلا اریٰ

آدم علیہ السلام سے قیامت تک لوگ یہی کہتے رہے اور کہتے رہیں گے کہ ہائے دل، ہائے دل، لیکن میں ایسے شخص کو دیکھنا پسند کرتا ہوں جو یہ کہے کہ دل کیا ہے یا دل کیسا ہوتا ہے لیکن میں نے ایسا شخص ابھی تک نہیں دیکھا۔

عام لوگ گوشت کے لوتھڑے کو دل کہتے ہیں وہ تو پاگلوں، دیوانوں اور بچوں میں بھی ہوتا ہے اگر وہ دل نہیں ہے؟ تو پھر دل کیا ہے جسے بجز لفظوں کے نہیں سنتا یعنی اگر عقل کو دل کہیں

تو وہ دل نہیں ہے اور اگر روح کو دل کہیں تو وہ بھی دل نہیں ہے اگر علم کو دل کہیں تو وہ بھی نہیں مطلب یہ ہے کہ شواہد حق کا قیام جس دل سے کیا جاتا ہے وہ لفظ و بیان میں تو ہے لیکن ظاہر میں اس کا کوئی وجود نہیں ہے۔

(۴٦) حضرت ابوالحسن محمد بن اسمٰعیل خیر النساج رحمتہ اللہ علیہ:

طریقت کے اماموں میں ایک بزرگ، شیخ اہل تسلیم، طریق محبت میں مستقیم حضرت ابوالحسن محمد بن اسمٰعیل خیر النساج رحمتہ اللہ علیہ ہیں جو اپنے زمانہ میں بزرگانِ مشائخ میں سے اور معاملات میں عمدہ زبان اور مہذب بیان رکھتے تھے طویل عمر پائی حضرت شبلی اور حضرت ابراہیم خواص رحمہما اللہ نے آپ کی مجلس میں توبہ کی اور حضرت شبلی کو حضرت جنید بغدادی کی خدمت میں احترام وعزت کے ساتھ بھیج دیا۔

آپ حضرت سری سقطی رحمتہ اللہ علیہ کے مرید تھے حضرت ابوالحسن نوری کے ہم زمانہ اور حضرت جنید بغدادی کے نزدیک قابل احترام شخص تھے حضرت ابوحمزہ نے آپ کی خیر خواہی کی آپ کو خیر النساج کہنے کی وجہ یہ ہے کہ آپ اپنی جائے ولادت سامرہ سے بارادۂ حج روانہ ہوئے جب کوفہ سے گزر ہوا تو شہر پناہ کی دیوار پر ایک ریشم بننے والے نے آپ کو پکڑ لیا اور کہنے لگا تو میرا غلام ہے اور تیرا نام خیر ہے آپ نے اس معاملہ میں قضا وقدر کا ہاتھ دیکھا تو اس سے تعرض نہ کیا یہاں تک کہ سالہا سال اس کے ساتھ کام کرتے رہے جب بھی وہ پکارتا کہ اے خیر! تو جواب دیتے کہ حاضر ہوں حتیٰ کہ وہ شخص اپنے کئے پر شرمسار ہوا اور آپ سے کہنے لگا کہ میں نے غلطی کی ہے تم میرے غلام نہیں ہو اب تم جاؤ پھر آپ وہاں سے چل کر مکہ مکرمہ آئے اور اس درجہ ومقام تک رسائی پائی حضرت جنید بغدادی رحمتہ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ "خیر خیرنا" ہمارا خیر بہت اچھا ہے۔ آپ اسے پسند کرتے تھے کہ لوگ آپ کو خَیر سے پکاریں۔ آپ فرمایا کرتے تھے کہ یہ جائز نہیں ہے کہ ایک مسلمان نے میرا نام خَیر رکھا میں اسے بدل دوں۔

جب آپ کی وفات کا وقت قریب آیا تو شام کی نماز کا وقت تھا جب موت کی بے ہوشی میں آنکھ کھولی تو ملک الموت کے سوا کچھ نظر نہ آیا اس وقت آپ نے کہا:

قف عافك الله فانما انت عبد مامور وانا عبد مامور وامرت به لايفوتك وما امرت به فهو شيئی يفوتنی فدعنی امضی فيما امرت به ثم امضی بما امرت به

اے ملک الموت خدا تیرا بھلا کرے ذرا ٹھہر جا تو بھی بندہ فرمانبردار ہے اور میں بھی بندہ فرمانبردار ہوں تجھے جو حکم دیا گیا ہے تو اسے ترک نہیں کر سکتا یعنی تم روح ضرور قبض کرو گے اور جو حکم مجھے دیا گیا ہے۔
میں بھی اسے نہیں چھوڑ سکتا یعنی شام کی نماز ضرور ادا کروں گا لہٰذا تم مجھے اتنی مہلت دو کہ فرمانِ الٰہی بجا لاؤں پھر میں تمہیں اجازت دے دوں گا کہ تم بھی خدا کا حکم بجا لاؤ۔

اس کے بعد آپ نے پانی طلب فرمایا وضو کر کے نماز ادا کی اور جان جان آفریں کے سپرد کر دی اسی رات لوگوں نے خواب میں آپ کو دیکھا تو انہوں نے آپ سے پوچھا کہ خدا نے آپ کے ساتھ کیا سلوک کیا؟ تو آپ نے فرمایا ''لاتسأ لنی عن هذا ولكن استرحت من دينا كم'' یہ بات مجھ سے نہ پوچھو کیونکہ میں نے تمہاری دنیا سے رہائی پائی ہے۔ آپ کا ارشاد ہے کہ:

شرح الله صدور المتقين بنور اليقين و كشف بصائر المومنين بنورر حقائق الايمان

اللہ نے متقیوں کے سینہ کو نور یقین سے بھر دیا ہے اور مسلمان کی آنکھوں کو حقائق ایمان کے نور سے منور فرما دیا ہے۔

مطلب یہ ہے کہ متقیوں کے لئے یقین کے سوا کوئی چارہ نہیں ان کا دل نورِ یقین کے لئے کھولا گیا ہے اور مومن کو ایمان کے حقائق کے سوا کوئی چارہ نہیں ان کی عقلوں کی بصیرتوں کو نورِ ایمان سے روشن کر دیا گیا ہے لہٰذا جہاں ایمان ہو گا یقین ہو گا اور جہاں یقین ہو گا تقویٰ بھی ہو گا کیونکہ یہ ایک دوسرے کے قریب اور ایک دوسرے کے تابع ہیں۔

(۴۷) حضرت ابوحمزہ خراسانی رحمتہ اللہ علیہ:

طریقت کے اماموں میں ایک بزرگ، داعی عصر، یگانۂ دہر، حضرت ابوحمزہ خراسانی رحمتہ اللہ علیہ ہیں جو خراسان کے قدماء مشائخ میں سے ہیں آپ نے حضرت ابوتراب کی صحبت پائی اور حضرت خراز سے ملاقات کی توکل پر آپ کو کامل اعتماد وایقان تھا۔

حکایت:

ایک دن کا واقعہ ہے آپ جا رہے تھے کہ اچانک کنویں میں گر پڑے تین دن کے بعد ایک قافلہ ادھر سے گزرا اور کنویں کے کنارے اس نے پڑاؤ کیا۔ آپ نے دل میں خیال کیا کہ اہل قافلہ کو مدد کے لئے پکاریں یا نہیں؟ پھر خیال گزرا کہ آواز دینا اچھا نہیں ہے کیونکہ یہ غیر خدا سے مدد چاہنا ہوگا اور اس کی شکایت بھی گویا میں یہ کہوں گا کہ خدا نے تو مجھے کنویں میں ڈالا اب تم مجھے یہاں سے آکر نکال لو اتنے میں قافلہ والے خود کنویں پر آگئے اور کنویں میں جھانک کر کہنے لگے یہ کنواں سر راہ واقع ہے نہ کوئی روک اس پر ہے نہ مُڈیر وغیرہ ایسا نہ ہو کہ کوئی راہ گزر اس میں گر پڑے آؤ مل کر اس پر چھت ڈال دیں اور اس کا دہانہ بند کر دیں تا کہ اس میں کوئی گر نہ پڑے اور اس عمل خیر کا اجر خدا سے حاصل کریں۔ حضرت ابوحمزہ فرماتے ہیں کہ ان کی یہ باتیں سن کر مجھ گھبراہٹ طاری ہوگئی اور میں اپنی زندگی سے ناامید ہو گیا قافلہ والوں نے کنویں پر چھت ڈالی اور دہانہ بند کر کے زمین ہموار کی اور چلے گئے میں خدا سے دعا مانگنے لگا موت کے تصور سے میرا دل بیٹھنے لگا چونکہ اب کسی مخلوق کی مدد پہنچنے کا امکان ہی نہیں تھا چنانچہ جب رات ہوئی تو میں نے دیکھا کہ چھت میں جنبش پیدا ہوئی جب غور سے دیکھا تو نظر آیا کہ کوئی چیز دہانہ کے سر کو کھول رہی ہے اور اژدہے کی مانند کوئی بہت بڑا جانور اپنی دم کنویں میں لٹکا رہا ہے اس وقت مجھے یقین ہوا کہ یہ میری نجات کا ذریعہ ہے اور یہ حق تعالیٰ کی فرستادہ ہے میں نے اس جانور کی دم پکڑ لی اور اس نے مجھے کھینچ کر باہر نکال لیا اس وقت غیب سے آواز آئی اے اباحمزہ! کیسی اچھی تمہاری نجات ہے کہ جان لینے والے کے ذریعہ تمہاری جان کو نجات دلائی گئی۔

لوگوں نے آپ سے سوال کیا کہ غریب یعنی اجنبی کون ہے؟ آپ نے فرمایا ''المستوحش من الالف'' وہ شخص ہے جو الفت و محبتِ الٰہی سے پریشان و وارفتہ ہو۔ درویش کے لئے دنیا و آخرت میں کوئی وطن نہیں ہے اور وطن کے سوا الفت کرنا وحشت ہے جب درویش کی الفت مخلوق سے منقطع ہوگئی تو وہ ہر ایک سے وحشت زدہ ہوگا اس کی یہ حالت غربت کہلائے گی یہ بہت بلند درجہ ہے۔ واللہ اعلم

(۴۸) حضرت ابوالعباس احمد بن مسروق رحمتہ اللہ علیہ:

طریقت کے اماموں میں ایک بزرگ، داعی مریداں بحکم فرمانِ الٰہی حضرت ابو العباس احمد بن مسروق رحمتہ اللہ علیہ ہیں جو خراسان کے اجلۂ مشائخ و اکابر میں سے ہیں اور تمام اولیاء آپ کے زمین پر اوتاد ہونے پر متفق ہیں آپ نے ''قطب المدار علیہ'' کی صحبت پائی لوگوں نے آپ سے ''قطب المدار علیہ'' کی بابت پوچھا کہ وہ کون ہیں؟ آپ نے اس کی وضاحت نہیں فرمائی البتہ اشارات سے پتہ چلتا ہے کہ اس سے آپ کی مراد حضرت جنید بغدادی رحمتہ اللہ علیہ ہیں۔ آپ نے چالیس صاحب تمکین اولیاء کی خدمت کی اور ان سے استفادہ کیا۔ ظاہری و باطنی علوم میں آپ کو کمال دسترس حاصل تھا۔ آپ کا ارشاد ہے کہ:

من کان سروره بغير الحق فسروره يورث الهموم ومن لم يكن انسه في خدمته ربه فانسه يورث الوحشة

یعنی خوشی و مسرت خدا کے سوا کسی اور سے ہے تو اس کی یہ خوشی دائمی غم کا وارث بناتی ہے اور جس کا لگاؤ خدا کی خدمت و عبادت سے نہ ہو تو اس کا یہ لگاؤ دائمی وحشت کا ورثہ دیتی ہے۔

اس لئے کہ خدا کے سوا ہر چیز فانی ہے اور جس کی خوشی فانی چیز سے ہوگی تو جب وہ چیز فنا ہو جائے گی تو اس کے لئے بجز حسرت و غم کے کچھ نہ رہے گا اور غیر خدا کی خدمت حقیر شئے ہے جس وقت اشیاء مخلوق کی دنائت اور خواری ظاہر ہوگی تو اس کے لئے اس سے انس و محبت رکھنا موجب وحشت و پریشانی ہوگا لہٰذا غیر اللہ پر نظر رکھنے ہی سے سارے جہان میں غم و

پریشانی ہے۔ واللہ اعلم

(۴۹) حضرت ابوعبداللہ بن احمد اسمٰعیل مغربی رحمتہ اللہ علیہ:

طریقت کے اماموں میں ایک بزرگ، استاذِ متوکلان، شیخ محققان حضرت ابوعبداللہ بن احمد اسمٰعیل مغربی رحمتہ اللہ علیہ ہیں جو بزرگان سلف اور اپنے زمانہ کے مقبول اساتذہ میں سے تھے مریدوں کی خوب نگہبانی فرماتے تھے۔ حضرت ابراہیم خواص اور ابراہیم شیبانی رحمہم اللہ دونوں آپ کے مرید تھے آپ کا کلام عالی اور براہین واضح ہیں خلوت نشینی میں کامل تر تھے۔ آپ کا ارشاد ہے کہ:

مــا رائيـت انـصف من الدنيـا ان خـدمتهـا خدمتك و ان تر كتهـا تر كتك — میں نے دنیا سے زیادہ منصف چیز نہیں دیکھی اگر تم اس کی خدمت کرو تو وہ تمہاری خدمت کرے گی اگر تم اسے چھوڑ دو تو وہ تمہیں چھوڑ دے گی۔

مطلب یہ ہے کہ جب تک تم دنیا کی طلب میں رہو گے تو وہ تمہاری طلب میں رہے گی اور جب اسے چھوڑ کر خدا کے طالب بن جاؤ گے تو وہ تمہیں چھوڑ دے گی اور اس کا خطرہ تمہارے دل میں نہ رہے گا لہٰذا جو صدق دل سے دنیا سے کنارہ کش ہوتا ہے وہ اس کے شر سے محفوظ رہتا ہے۔ واللہ اعلم

(۵۰) حضرت ابوعلی بن الحسن بن علی جورجانی رحمتہ اللہ علیہ:

طریقت کے اماموں میں ایک بزرگ، شیخ زمانہ، اپنے وقت کے یگانہ حضرت ابوعلی بن الحسن بن علی جورجانی رحمتہ اللہ علیہ ہیں جو اپنے زمانہ میں بے مثل تھے آپ کی تصانیف، معاملاتِ علم اور رویت آفات میں مشہور ہیں۔ حضرت محمد بن علی ترمذی رحمتہ اللہ علیہ کے مرید اور حضرت ابوبکر وراق رحمتہ اللہ علیہ کے ہم عصر تھے حضرت ابراہیم سمرقندی آپ ہی کے مرید تھے۔ آپ کا ارشاد ہے کہ:

الخلق كلهم في ميادين الغفلة يركضون وعلى الظنون يعتمدون وعندهم انهم في الحقيقه ينقلبون وعن المكاشفة ينطقون	تمام مخلوق غفلت کے میدانوں میں محض ظن و گمان پر اعتماد کر کے بھاگی چلی جارہی ہے اور وہ اپنے خیال میں سمجھ رہے ہیں کہ وہ حق پر ہیں اور جو کچھ وہ کر رہے ہیں وہ کشف سے کر رہے ہیں

آپ کے ارشاد کا مطلب یہ ہے کہ سب کچھ طبیعت کے غرور اور نفس کی رعونت کی وجہ سے ہے کیونکہ آدمی جاہل ہونے کے باوجود اپنی جہالت پر کامل اعتقاد رکھتا ہے بالخصوص جاہل صوفی، جس طرح عالم صوفی، مخلوق خدا میں سب سے بڑھ کر عزیز ہوتا ہے اسی طرح جاہل صوفی مخلوق خدا میں سب سے زیادہ ذلیل وخوار ہوتا ہے اس لئے کہ علماء طریقت علم وحقیقت پر گامزن ہوتے ہیں نہ کہ محض ظن وگمان پر اور جاہل صوفی کا تکیہ گمان پر ہوتا ہے نہ کہ یقین پر وہ غفلت کے میدانوں میں چرتے ہیں اور گمان یہ رکھتے ہیں کہ وہ ولایت کے میدانوں میں دوڑ رہے ہیں ظن وگمان پر اعتماد ہوتا ہے اور خیال یہ کرتے ہیں کہ یقین پر ہیں ظاہری رسموں پر ان کا عمل ہوتا ہے اور گمان یہ ہوتا ہے کہ وہ حقیقت پر ہیں نفسانی خواہش سے بولتے ہیں اور گمان یہ کرتے ہیں کہ یہ مکاشفہ ہے آدمی کے دماغ سے ظن وگمان کا اخراج اس وقت تک ممکن نہیں جب تک کہ جلالِ حق یا جمالِ حق کا اسے دیدار نہ ہو جائے کیونکہ اس کے جمال کے اظہار میں سب کچھ اسی کا دیکھتا ہے اور اس کا ظن وگمان فنا ہو جاتا ہے کشفِ جلال میں خود کو بھی نہیں دیکھتا اور اس کا گمان سر بھی نہیں اٹھا سکتا۔ واللہ اعلم

(۵۱) حضرت ابو محمد بن احمد بن حسین حریری رحمتہ اللہ علیہ:

طریقت کے اماموں میں ایک بزرگ، باسط علوم، واضح رسوم طریقت حضرت ابو محمد بن احمد الحسین حریری رحمتہ اللہ علیہ ہیں جو حضرت جنید بغدادی رحمتہ اللہ علیہ کے محرم اسرار تھے۔ حضرت سہل بن عبداللہ تستری کی صحبت پائی تھی۔ آپ تمام اقسام علوم کے عالم اور فقہ میں امام

وقت تھے اصول میں مہارت اور طریق تصوف میں ایسا درجۂ کمال حاصل تھا کہ حضرت جنید بغدادی آپ سے فرمایا کرتے تھے کہ میرے مریدوں کوادب وریاضت کی تعلیم دیا کریں حضرت جنید رحمتہ اللہ کی عدم موجودگی میں آپ ان کے ولی عہد ہوتے اوران کی جگہ تشریف رکھتے تھے۔ آپ کاارشاد ہے کہ:

دوام الایمانِ وقوام الادیان وصلاح الابدان فی ثلثة خصال الاکتفاء والاتقاء والاحتماء من اکتفٰی باللّٰہ صلحت سریرته ومن اتقی مانھی اللّٰہ عنه استقامت سیرته ومن احتماما لم یوافقه ارتاضت طبیعته فثمرة الاکتفاء صفوالمعرفته وعاقبته الاتقاء حسن الخلیقة وغایته الاحتماء اعتدال الطبیعة

ایمان کا دوام، دین کا قیام اور بدن کی اصلاح کا انحصار تین چیزوں پر ہے قناعت تقوٰی اور غذا کی حفاظت، جس نے خدا پر اکتفا کیا اور اسی پر قناعت کی اس کے باطنی اسرار درست رہیں گے اور جس نے خدا کی ممنوعہ چیزوں سے اجتناب کیا اس کی سیرت عمدہ اور مضبوط ہو جائے گی اور جس نے ناموافق غذا کھانے میں احتیاط برتی اس کی طبیعت درست رہے گی لہٰذا اکتفا وقناعت کا پھل صفائے معرفت ہے اور تقوٰی کا نتیجہ پاکیزہ اخلاق سے مزین ہوتا ہے اور غذا میں احتیاط کا ثمرہ تندرستی کا ضامن ہے۔

مطلب یہ ہے کہ جو اللہ تعالٰی پر اکتفا کرتا ہے اس کی معرفت پاک وصاف ہو جاتی اور جو معاملات میں تقوٰی کا دامن تھامے رہتا ہے اس کی عادت وخصلت دنیا وآخرت میں عمدہ ہو جائے گی جیسا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ "من کثر صلوٰة باللیل حسن وجھه بالنھار " جورات میں نماز کی کثرت رکھتا ہے اس کا چہرہ دن میں دمکتا چمکتا رہتا ہے۔ ایک حدیث میں وارد ہے کہ روزِ قیامت اہل تقوٰی اس شان سے لائے جائیں گے کہ "وجوھھم نور علی منابر من نور " ان کے چہرے منور نوری تخت پر جلوہ فگن ہوں گے

اور جو غذا میں احتیاط برتتا ہے اس کا جسم بیماری سے اور اس کا نفس خواہشات سے محفوظ رہتا ہے سمع و طاعت میں یہ کلام جامع ہے۔ واللہ اعلم

(۵۲) حضرت ابوالعبّاس احمد بن محمد بن سہل آملی رحمتہ اللہ علیہ:

طریقت کے اماموں میں ایک بزرگ، شیخ اہل معاملہ، قدوہ اہلِ صفا حضرت ابوالعباس احمد بن محمد بن سہل آملی رحمتہ اللہ علیہ ہیں جو اپنے زمانہ میں بزرگ ترین اکابر مشائخ میں سے محرم اسرار تھے۔ علم تفسیر و قرأت کے عالم اور لطائف قرآن بیان کرنے میں خاص کر ماہر تھے حضرت جنید رحمتہ اللہ علیہ کے اکابر مریدوں میں سے تھے۔ حضرت ابراہیم مارستانی کی صحبت پائی حضرت ابوسعید خراز رحمتہ اللہ علیہ آپ کا بہت احترام کرتے تھے اور آپ کے سوا کسی کو تصوف میں مسلم و معتبر نہ گردانتے تھے آپ کا ارشاد ہے کہ:

السکون الی مالوفات الطبائع یقطع صاحبها عن بلوغ درجات الحقائق	طبیعتوں کی مرغوبات سے چین و راحت پانے والا شخص درجات حقائق سے محروم رہ جاتا ہے

یعنی جو طبعی مرغوبات سے عیش و آرام حاصل کرلے گا وہ حقیقت سے محروم رہے گا اس لئے کہ طبائع نفس کے آلات و اوزار ہیں اور نفس جائے حجاب اور حقیقت مقام کشف ہے مرید مجوب، مکاشف کے برابر چین و راحت نہیں پاتا لہٰذا حقائق کا ادراک کشف کا محل ہے اور یہ حقیقت، مرغوباتِ طبع سے اعراض کرنے میں وابستہ ہے طبائع کی رغبت دو چیزوں سے ہوتی ہے ایک دنیا اور اس کی چیزوں سے دوسرے آخرت اور اس کے احوال سے لہٰذا جو دنیا سے الفت و رغبت رکھتا ہے وہ تو ہم جنس ہونے کی وجہ سے ہے لیکن آخرت سے الفت رکھنا ظن و گمان کی بناء پر ہے جو بے دیکھی اور غیر جنس ہے آخرت سے الفت گمان اور ناشناخت ہی کی وجہ سے ہے نہ کہ مشاہدۂ عینی سے اگر حقیقت کی معرفت ہو جائے تو وہ اس جہان میں پگھل جائے اور جب اس جہان میں پگھل جاتا ہے اور دنیا سے قطع تعلق کر لیتا ہے تو وہ طبائع کی ولایت سے گزر جاتا ہے پھر کہیں جا کر کشف حقائق کا درجہ حاصل ہوتا ہے کیونکہ عاقبت کو فنائے طبع کے بغیر سکون

نہیں ملتا۔

لان فیھا مالاخطر علٰی قلب بشرٍ — کیونکہ تحقیق عقبیٰ میں وہ چیز ہے جس کا گزر بندے کے دل پر نہیں ہوتا۔

آخرت کا خطرہ بھی یہی ہے کہ اس کا راستہ خطرناک ہے اور اس کا کوئی خطرہ ایسا نہیں جو دنیا میں دل کے اندر آسکے جبکہ آخرت کی معرفتِ حقیقت سے ہمارا ذہن وشعور علیحدہ ہے تو طبیعت کو اس کے تصور عینی سے کس طرح الفت ہوسکتی ہے یہ بات صحیح ہے کہ طبیعت کو آخرت سے الفت گمان ہی کی وجہ سے ہے۔ واللہ اعلم

(۵۳) حضرت ابوالمغیث حسین بن منصور حلاج رحمۃ اللہ علیہ:

منجملہ اکابر طریقت، مستغرق معنی مستھلک دعویٰ حضرت ابوالمغیث الحسین بن منصور حلاج رحمۃ اللہ علیہ ہیں جو طریقت کے مشتاق اور اس کے رہین منت تھے آپ کا حال قوی اور ہمت بلند تھی آپ کے بارے میں مشائخ کی رائیں مختلف ہیں بعض مردود گردانتے تھے اور بعض مقبول جانتے تھے چنانچہ عمرو بن عثمان مکی، ابو یعقوب نہر جوری، ابو یعقوب اقطع اور علی بن سہل جیسے مشائخ نے آپ کو "مردود" قرار دیا ہے اور حضرت ابن عطا محمد بن خفیف ابوالقاسم نصر آبادی اور تمام مشائخ متاخرین آپ کو مقبول جانتے تھے تیسرا طبقہ ایسا ہے جو آپ کے بارے میں توقف کی راہ پر قائم ہے ان میں حضرت جنید بغدادی، شبلی، حریری، حصری وغیرہ مشائخ طریقت ہیں چوتھا طبقہ ایسا ہے جو جادو وغیرہ کی نسبت کرتا ہے لیکن ہمارے زمانہ میں شیخ المشائخ ابوسعید ابوالخیر، شیخ ابوالقاسم گرگانی اور شیخ ابوالعباس شقانی رحمہم اللہ نے اسے باطنی اسرار پر محمول کیا ہے ان کے نزدیک وہ بزرگ تھے لیکن استاد ابوالقاسم قشیری فرماتے ہیں کہ اگر وہ ارباب معانی وحقائق میں سے ہوتے تو لوگوں کی جدائی انہیں حق سے جدا نہ ہونے دیتی اور اگر وہ مہجورِ طریقت اور مردودِ حق ہوتے تو خلق کی قبولیت سے مقبول نہ ہوتے؟ اب ہم بحکم تسلیم حق، ان کے معاملہ کو خدا کے حوالہ کرتے ہیں اور ان میں جس قدر حق کی نشانیاں پاتے ہیں اتنا ہی ہم ان کو بزرگ جانتے ہیں بہرحال چند کے سوا تمام مشائخ ان کے کمال فضل، صفائے حال اور کثرت ریاضت ومجاہدہ

کے منکر نہیں ہیں اس کتاب میں ان کے تذکرے کو بیان نہ کرنا بددیانتی ہوگی کیونکہ کچھ ظاہری لوگ ان کی تکفیر کرتے ہیں اور ان کے منکر ہیں اور ان کے احوال کو عذر، حیلہ اور جادو سے منسوب کرتے ہیں۔ ان کا گمان ہے کہ حسین بن منصور حلاج بغدادی ملحد ہے جو محمد بن زکریا کا استاد تھا اور ابوسعید قرمطی کا ساتھی و ہمعصر حالانکہ وہ اور شخص ہے ہم جس حسین بن منصور حلاج کا تذکرہ کر رہے ہیں ان کے بارے میں ہمیں اختلاف ہے وہ فارس کے شہر بیضا کے رہنے والے ہیں ان کے بارے میں مشائخ کا جو ہجر اور ردّ ہے وہ ان کے دین و مذہب پر طعنہ زنی کے سلسلے میں نہیں ہے بلکہ ان کے حال اور کیفیت کے بارے میں ہے کیونکہ وہ ابتداء میں سہل بن عبداللہ تستری کے مرید ہوئے پھر بغیر اجازت لئے ان کے پاس سے چلے گئے اور عمرو بن عثمان کی صحبت اختیار کر لی پھر ان کے پاس سے بھی بغیر اجازت چلے گئے اور حضرت جنید رحمتہ اللہ علیہ کی خدمت میں حاضر ہوئے مگر انہوں نے قبول نہ کیا اور صحبت کی اجازت نہ دی اس بناء پر مشائخ ان کو مہجور گردانتے تھے۔ لہٰذا یہ مہجوری معاملہ میں ہے نہ کہ اصل طریقت میں حضرت شبلی علیہ الرحمتہ کے اس قول پر غور کرو! فرمایا:

انا والحلاج فی شیئی واحدٍ	میں اور حلاج دونوں ایک ہی راہ کے راہی
فخلصی جنونی واهلکه عقله	ہیں مجھے میری وارفتگی نے نجات دی اور ان کو ان کی عقل نے خراب کر دیا۔

اگر وہ ایسے ہی مطعون و مردود ہوتے تو شبلی یہ نہ فرماتے کہ "میں اور حلاج ایک ہی راہ کے راہی ہیں۔"

اور حضرت محمد بن خفیف علیہ رحمتہ فرماتے ہیں کہ:

هو عالم ربانی	حلاج ربانی عالم ہیں

اسی طرح کے اور بھی اقوال ہیں جس سے معلوم ہوتا ہے کہ مشائخ طریقت کی ناخوشی اور عاق کر دینا طریقت میں ہجران و وحشت کا باعث ہوتا ہے۔

حضرت حلاج علیہ رحمتہ کی تصانیف بکثرت ہیں اور احوال و فروع میں ان کا رموز و

کلام مہذب ہے۔

حضرت سیدنا داتا گنج بخش رحمتہ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ میں نے بغداد' راس کے گرد ونواح میں ان کی تصانیف میں سے پچاس کتابیں دیکھی ہیں اور کچھ خوزستان ، فارس اور خراسان میں بھی ہیں تمام کتابوں میں ایسی ہی باتیں تھیں جس طرح نوآموز مرید ظاہر کرتا ہے کچھ قوی اور کچھ کمزور کچھ آسان اور کچھ سخت جب کسی پر تجلی حق ہو جاتی ہے تو اپنی قوت استعداد کے مطابق اپنے حال کو ظاہر کرتا ہے فضل الٰہی اس کا معاون و مددگار بن جاتی ہے اور جب کوئی بات مشکل و دشوار ہو بالخصوص جبکہ بیان کرنے والا عجلت و حیرت میں اظہار کرے تو اس کے سننے سے اوہام میں نفرت پیدا ہوتی ہے اور عقل سمجھنے سے قاصر رہ جاتی ہے ایسے ہی وقت کہا جاتا ہے کہ یہ بات اونچی ہے اور کچھ لوگ جہالت سے انکار کرتے ہیں اور کچھ جہالت سے اقرار کر لیتے ہیں ان کا اقرار بھی ان کے انکار کے مانند ہے لیکن جب محقق اور اہل بصیرت دیکھتے ہیں تو وہ عبارت میں نہ اٹکتے ہیں نہ حیرت و تعجب کرتے ہیں وہ مدح و ذم سے بے تعلق ہو کر انکار و اقرار سے دامن کو بچا کر گزر جاتے ہیں۔

لیکن وہ لوگ جو اس جوانمرد کے حال پر سحر و جادو سے نسبت دیتے ہیں تو یہ محال ہے اس لئے کہ اہل سنت و جماعت کے اصول میں سحر و جادو اسی طرح حق ہے جیسے کرامت حق ہے لیکن حالت کمال میں سحر کا اظہار تو کفر ہے مگر اس حالت میں کرامت کا اظہار معرفت ہے اس لئے کہ سحر اگر خدا کی ناراضگی کا موجب ہے تو کرامت خدا کی رضا مندی کی علامت یہ مسئلہ اثبات کرامت کے بیان میں تشریح کے ساتھ بیان کیا جائے گا۔

اہل سنت کے صاحبان بصیرت کا اتفاق ہے کہ مسلمان زیاں کار اور جادوگر نہیں ہوتے اور نہ کافر صاحب کرامت کیونکہ جمع اضداد محال ہے حضرت حسین علاج جب تک جامہ حیات میں رہے درست کار رہے عمدہ طریق پر نماز ادا کرتے تھے بکثرت ذکر و اذکار کرتے تھے متواتر روزہ دار رہتے تھے اور پاکیزہ حمد و ثنا کیا کرتے تھے اور توحید خدا کے نکات بیان کرتے رہتے تھے اگر ان کے افعال میں سحر ہوتا تو ان سب کا صدور ان سے محال تھا لہٰذا صحیح یہ ہے کہ یہ

کرامت تھی اور کرامت بجز ولی کے متحقق نہیں ہوتی۔

اہلِ سنت میں کچھ حضرات ایسے ہیں جو ان کے اصولِ الٰہی کا رد کرتے ہیں اور ان کے کلمات پر اعتراض کرتے ہیں جو امتزاج واتحاد کی تعبیر میں ہیں یہ الفاظ اگرچہ تعبیر و بیان میں بہت برے ہیں لیکن مفہوم ومعنیٰ میں اتنے برے نہیں ہیں اس لیے کہ مغلوب الحال میں صحیح تعبیر کی قدرت نہیں ہوتی اور اپنے غلبہ حال میں اس کی عبارت صحیح نہیں لاسکتا اور یہ بھی امکان ہے کہ معنیٰ میں عبارت مشکل ہو اور تعبیر کرنے والا اظہار مقصود میں آسان عبارت لانے سے قاصر رہا ہو اور وہ منکرین جن کی فہم میں اس کے معنی صحیح نہیں آئے وہ ایسی صورت بنادیں کہ جس سے انکار کا جواز پیدا ہو جائے تو ایسوں کا انکار انہیں کی طرف راجع ہوگا نہ کہ معنی میں۔ بایں ہمہ میں نے بغداد اور اس کے گردونواح میں ایسے ملحدوں کو دیکھا ہے جو ان کی پیروی کا دعوٰی کرتے ہیں اور اپنی زندیقی کی دلیل میں ان کا کلام پیش کرتے ہیں اور وہ خود کو حلاجی کہلواتے ہیں ان کے بارے میں ایسا غلو کرتے ہیں جیسے روافض محبتِ علی رضی اللہ عنہ کے دعوے میں۔ ان کے ایسے کلمات کا رد انشاء اللہ اس باب میں لاؤں گا جہاں جدا جدا فرقوں کا تذکرہ ہوگا۔

حاصلِ بحث یہ ہے کہ سلامتی اسی میں ہے کہ ان کے کلام کو مقتداء نہ بنایا جائے اس لیے کہ وہ اپنے حال میں مغلوب تھے، متمکن نہ تھے متمکن کے کلام کی ہی اقتداء کرنی چاہیے۔

الحمد للہ حضرت حسین بن علاج مجھے دل سے مرغوب ومحبوب ہیں لیکن ان کا طریق کسی اصل پر قائم نہیں اور کسی حال پر ان کی استقامت ہے ان کے حالات میں فتنہ بہت ہے مجھے ابتدائے ظہور کے وقت ان سے بہت تقویت ملی ہے اور دلائل حاصل ہوئے ہیں اس کتاب سے قبل میں نے ان کے کلام کی شرح لکھی ہے اس میں دلائل وشواہد سے علو کلام اور ان کے صحتِ حال کا اثبات کیا ہے اور اپنی کتاب ''منہاج العابدین'' میں ان کی ابتداء ان کی انتہا کا تذکرہ کیا ہے یہاں بھی اتنا تذکرہ کردیا ہے لہٰذا جس کے طریق کی اصل کو اتنے اعتراضات، اعترافات اور حیلوں سے ثابت کیا جائے اس سے تعلق اور اس کی پیروی کیوں کی جائے؟ لیکن جو نفسانی خواہش کا پیروکار ہے اسے راہِ راست سے کیا تعلق؟ کیونکہ وہ ایسا ہی راستہ تلاش کرتا ہے جس

میں کجی اور ٹیڑھا پن ہو۔

چنانچہ حضرت حسین حلاج کا ایک قول یہ ہے کہ:

الالسنه مستنطقات تحت نطقها مستهلكات

"بولنے والی زبانیں اپنی گویائی کے نیچے ہلاک ہیں (ان کے دل خاموش ہیں)"

یہ عبارت سراسر آفت ہے اور حقیقی معنیٰ میں یہ عبارت ایک قسم کی بڑ ہے۔ کیونکہ معنیٰ حاصل ہوں تو عبارت مفقود نہیں ہوتی اور جب معنیٰ مفقود ہوں تو عبارت موجود نہیں ہوتی بجز اس کے کہ اس میں کوئی ایسا گمان ظاہر ہو کہ جس میں طالب کی ہلاکت مضمر ہو اس لیے کہ وہ عبارت کو گمان کرتا ہے کہ یہ اس کے حقیقی معنیٰ ہیں۔ واللہ اعلم

(۵۴) حضرت ابواسحٰق ابراہیم بن احمد خواص رحمتہ اللہ علیہ:

منجملۂ ائمہ طریقت، سرہنگ متوکلان، سردارِ مستعلمان حضرت ابو اسحاق ابراہیم بن احمد خواص رحمتہ اللہ علیہ ہیں جن کا توکل میں بڑا مرتبہ ہے بکثرت مشائخ کی صحبت پائی آپ کی بکثرت نشانیاں اور کرامتیں ہیں طریقت کے معاملات میں آپ کی تصانیف عمدہ ہیں۔ آپ کا ارشاد ہے:

العلم كله فى كلمتين لاتكلف فى ما كفيت ولا تضيع ما استكفيت

سارا علم دو کلموں میں جمع ہے ایک یہ کہ اللہ تعالیٰ نے جس چیز کا اندیشہ دل سے اٹھا دیا ہے اس میں تکلف نہ کرو دوسرا یہ کہ جو کچھ تمہیں کرنا ہے وہ تم پر فرض ہے اسے ضائع نہ کرو یہاں تک کہ دنیا و آخرت میں اس کے موافق بن جاؤ۔

مطلب یہ ہے کہ تقدیر میں تکلف نہ کرو کیونکہ ازلی قسمت تمہارے تکلف سے بدل نہیں سکتی اور اس کے کسی حکم کی بجا آوری میں کوتاہی نہ کرو کیونکہ نافرمانی تمہیں عذاب میں مبتلا کر دے گی۔

آپ سے کچھ لوگوں نے دریافت کیا کہ عجائبات میں سے آپ نے کیا کیا دیکھا؟ آپ نے فرمایا میں نے بکثرت عجائبات دیکھے ہیں لیکن اس سے زیادہ عجیب کچھ نہ تھا کہ حضرت خضر علیہ السلام نے مجھ سے اجازت چاہی کہ میں تمہاری مجلس میں شامل رہوں مگر میں نے اسے منظور نہ کیا لوگوں نے پوچھا اس کی کیا وجہ؟ آپ نے فرمایا میرا منظور نہ کرنا اس لیے نہ تھا کہ میں ان سے بہتر رفیق کو چاہتا تھا بلکہ میں ڈرتا تھا کہ میں کسی غیر حق کے ساتھ اعتماد کر کے اپنے توکل کو ضائع نہ کر بیٹھوں کہیں ایسا نہ ہو کہ نفل کے بدلے فرض جاتا رہے۔ یہ آپ کا درجہ کمال ہے۔

(۵۵) حضرت ابوحمزہ بغدادی بزاز رحمتہ اللہ علیہ:

منجملۂ ائمہ طریقت محرم سراپردۂ تمکین، اساس اہل یقین حضرت ابوحمزہ بغدادی بزاز رحمتہ اللہ علیہ ہیں جو اکابر متکلمین مشائخ میں سے تھے آپ حضرت محاسبی کے مرید، حضرت سری سقطی کے صحبت یافتہ اور حضرت نوری و خیر النساج کے ہم زمانہ تھے آپ نے اکابر مشائخ کی صحبت پائی اور بغداد میں مسجد صافیہ میں وعظ فرمایا کرتے تھے تفسیر و قرأت کے عالم تھے آپ کی روایات حدیث بلند مرتبہ ہیں جس وقت حضرت نوری پر ابتلاء کا زمانہ آیا تو آپ ان کے ساتھ تھے اللہ نے سب کو نجات عطا فرمائی۔ آپ کا ارشاد ہے کہ:

اذا سلمت منك نفسك فقل	جب تمہارا جسم تم سے سلامتی پائے تو جان لو
اديت حقها واذا اسلم منك	کہ تم نے اس کا حق ادا کر دیا اور جب لوگ تم
الخلق قضيت حقوقهم	سے محفوظ رہیں تو جان لو کہ تم نے ان کا حق
	ادا کر دیا۔

مطلب یہ ہے کہ حق دو طرح کے ہیں۔ اپنے اوپر اپنا حق دوسرا اپنے اوپر لوگوں کا حق جب تم نے اپنے آپ کو معصیت سے محفوظ رکھا اور دنیا میں سلامتی کی راہ پر قائم رہ کر آخرت کے عذاب سے اسے بچا لیا تو تم نے اس کا حق ادا کر دیا اور جب تم نے لوگوں کو اپنی اذیت سے محفوظ رکھا اور ان کی بدخواہی نہ کی تو تم نے ان کا حق ادا کر دیا لہٰذا کوشش کرو کہ نہ تم خود برائی میں پڑو اور نہ لوگوں کو برائی میں ڈالو اس کے بعد حق تعالیٰ کے حقوق کی ادائیگی میں پوری کوشش کرو۔ واللہ

اعلم۔

(۵۶) حضرت ابوبکر محمد بن موسیٰ واسطی علیہ الرحمۃ:

منجملۂ آئمہ طریقت، اپنے حق کے امام عالی حال، لطیف کلام، حضرت ابوبکر محمد بن موسیٰ واسطی رحمۃ اللہ علیہ ہیں جو محققین مشائخ میں سے تھے۔ حقائق میں آپ کا بہت بلند درجہ تھا تمام مشائخ کے نزدیک آپ لائق تعریف اور حضرت جنید کے قدیم مصاحبوں میں تھے آپ کے اظہار و بیان میں ایسی گہرائی ہوتی تھی کہ اصحابِ غور و فکر کی فہم سے بالاتر ہوتی تھی آپ نے کسی شہر میں مستقل اقامت اختیار نہیں کی جب آپ شہر مرو میں تشریف لائے تو وہاں کے لوگ آپ کی لطافت طبع اور نیک سیرتی کے گردیدہ ہو گئے اور آپ کا وعظ غور سے سنا کرتے تھے عمر کے آخری ایام وہیں گزارے۔ آپ کا ارشاد ہے:

الذاکر فی ذکرہ اکثر غفلۃ من الناس لذکرہ	ذکر کرنے والے کو اس کی یاد میں فراموش کنندہ ذکر سے زیادہ غفلت ہوتی ہے۔

اس لیے کہ جب خدا کو یاد رکھے اور اس کے ذکر کو بھول جائے تو اس میں کوئی مضائقہ نہیں ہے خرابی تو اس میں ہے کہ تو اس کے ذکر کو یاد رکھے اور اسے بھول جائے کیونکہ ذکر اور چیز ہے اور مذکور یعنی جس کا ذکر کیا جائے اور ہے لہٰذا جب ذکر کے گمان پر ذاتِ مذکور سے منہ موڑ لے تو اس میں غفلت زیادہ پائی جاتی ہے بہ نسبت اس کے کہ عین مذکور کی یاد کو فراموش کر دے اور گمان بھی نہ ہو۔ بھول جانے والے کو نسیان و غیبت کی حالت میں حضور کا گمان نہیں رہتا اور ذاکر کو حالت ذکر و غیبت میں ذاتِ مذکور کے حضور کا گمان ہوتا ہے لہٰذا عدم حضور کی حالت میں حضور کا گمان بہ نسبت اس کے جو غیبت خالی از گمان ہو غفلت سے زیادہ نزدیک ہے اس لیے کہ طالبانِ حق کی ہلاکت ان کے گمان میں ہے کہیں گمان زیادہ اور معنیٰ کم ہوں گے اور کہیں معنیٰ زیادہ اور گمان کم ہوگا درحقیقت ان کا گمان، عقل کی اتہام طرازی ہے اور عقل کی اتہام طرازی نفس کے ارادہ سے حاصل ہوتی ہے لیکن ہمت کا تہمت سے کوئی تعلق نہیں اصل ذکر یا تو غیبت میں ہوتا ہے یا حضور میں، جب غائب از خود غیبت میں اور حق کے حضور میں ہو تو وہاں

ذکر نہیں ہوتا بلکہ مشاہدہ ہوتا ہے۔ اور جب بندہ حق سے غائب اور از خود حاضر ہو تو وہاں بھی ذکر نہیں ہوتا کیونکہ غیبت غفلت سے ہوتی ہے۔

(۵۷) حضرت ابوبکر بن دلف بن جحدر شبلی علیہ الرحمۃ:

منجملہ ائمہ طریقت، سکینۂ احوال، سفینۂ مقال حضرت ابوبکر بن دلف بن جحدر شبلی رحمۃ اللہ علیہ ہیں جو اکابر مشائخ میں سے تھے اور سب کے نزدیک قابل تعریف تھے آپ کے حالات و مقالات بیان حق میں مہذب و پاکیزہ ہیں اشارے لطیف اور قابلِ ستائش ہیں جیسا کہ متاخرین مشائخ فرماتے ہیں کہ "ثلثة من عجائب الدنیا اشارات الشبلی و نکات المرتعش و حکایات الجعفر" دنیا میں تین بزرگوں کی عجیب و غریب خصوصیتیں ہیں ایک شبلی کے اشارے دوسرے مرتعش کے نکتے اور تیسرے جعفر کی حکایتیں۔

آپ اکابر قوم اور سادات اہلِ طریقت میں سے ہیں ابتداء میں آپ خلیفہ وقت کے مقرب خاص تھے حضرت خیر النساج کی صحبت میں آپ نے توبہ کی اور حضرت جنید رحمۃ اللہ علیہ سے تعلق ارادت قائم کیا۔ بکثرت مشائخ سے ملاقاتیں کیں۔

آپ نے ارشادِ حق "قُلْ لِّلْمُؤْمِنِیْنَ یَغُضُّوْا مِنْ اَبْصَارِهِمْ" (النور:۳۰) کی تفسیر میں فرمایا:

ایٔ ابصار الرؤس عن المحارم والبصار القلوب عما سوی اللہ.

اے نبی صلی اللہ علیہ وسلم مسلمانوں کو یہ حکم پہنچا دو کہ وہ اپنی نگاہوں کو نیچا رکھیں یعنی سروں کی آنکھوں کو نامحرموں کی طرف شہوت کے ساتھ دیکھنے سے بچائیں اور دلوں کی آنکھوں کو غیر اللہ کی طرف دیکھنے سے محفوظ رکھیں۔

مطلب یہ ہے کہ دل کی آنکھ کو انواعِ فکر سے محفوظ رکھو، اسے دیدار و مشاہدہ کے سوا اور کسی سے سروکار نہ رکھو لہٰذا خواہشات کی پیروی اور نامحرموں کی طرف نظر، غفلت سے ہوتی

ہے اور غافلوں کے لیے اہانت آمیز مصیبت یہ ہے کہ وہ اپنے عیبوں سے جاہل ہوتے ہیں جو شخص دنیا میں جاہل ہے وہ آخرت میں بھی جاہل ہوگا۔ حق تعالیٰ فرماتا ہے:

مَنْ كَانَ فِي هٰذِهٖۤ اَعْمٰى فَهُوَ فِي الْاٰخِرَةِ اَعْمٰى (بنی اسرائیل:۷۲) جو اس جہان میں اندھا ہے وہ آخرت میں بھی اندھا ہوگا۔

درحقیقت جب تک اللہ تعالیٰ کسی کے دل سے شہوانی خیالات کو دور نہ فرمائے اس وقت تک سر کی آنکھیں اس کے غوامض سے محفوظ نہیں ہوتیں اور جب تک اللہ تعالیٰ اپنی محبت اور اپنا ارادہ کسی کے دل میں جاگزیں نہ کرے اس وقت تک دل کی آنکھیں غیر کے نظارے سے محفوظ نہیں رہتیں۔

آپ بیان کرتے ہیں کہ ایک دن میں بازار گیا تو لوگ کہنے لگے "ھٰذا مجنون" یہ پاگل ہے۔ میں نے ان کو جواب دیا "انا عندکم مجنون و انتم عندی اصحاء فزادنی اللہ فی جنونی وزاد صحتکم" میں تمہارے نزدیک پاگل ہوں اور تم میرے نزدیک ہوشیار ہو لہٰذا اللہ تعالیٰ میرے جنون کو اور زیادہ کرے اور تمہاری صحت کو اور بڑھائے کیونکہ میرا جنون شدتِ محبت میں ہے اور تمہاری صحت قوی غفلت کی وجہ سے ہے لہٰذا اللہ تعالیٰ میری دیوانگی کو بڑھائے تا کہ اس سے میری قربت، اور زیادہ ہو اور تمہاری ہوشیاری اور زیادہ کرے تا کہ اس سے اور زیادہ دوری ہو جائے یہ فرمان غیر تمندی کی وجہ سے ہے تا کہ آدمی ایسا نہ بنے کہ وہ صحت و دیوانگی میں فرق نہ کر سکے۔ واللہ اعلم

(۵۸) حضرت ابو محمد بن جعفر بن نصیر خالدی علیہ الرحمۃ:

منجملۂ آئمہ طریقت، حکایت کنندۂ احوال اولیاء حضرت ابو محمد جعفر بن نصیر خالدی علیہ الرحمۃ ہیں آپ حضرت جنید کے اصحاب کبار اور متقدمین مشائخ میں سے ہیں فنون طریقت کے متبحر عالم، انقا میں مشائخ کے محافظ تھے ہر فن میں آپ کا کلام ارفع ہے ترک رعونت کے ہر مسئلہ میں حکایات بیان کی ہیں یہاں پر اس کا حوالہ کسی دوسرے کی طرف کیا۔ ہے۔ آپ کا ارشاد ہے:

التوکل استواء القلب عن الوجود والعدم	متوکل وہ ہے کہ اس کے دل میں وجود اور عدم برابر ہوں۔

مطلب یہ ہے کہ رزق پانے سے دل خوش نہ ہو اور اس کے نہ ہونے سے دل غمگین نہ ہو اس لیے کہ جسم مالک کا ملک ہے اس کی پرورش اور اس کی ہلاکت دونوں مالک ہی کے قبضہ میں ہیں اور وہ اپنے ملک کو تم سے زیادہ جانتا ہے وہ جیسا چاہے رکھے تم اس میں دخل نہ دو ملکیت کو مالک کے حوالہ کر کے اس سے لاتعلق ہو جاؤ۔

آپ بیان کرتے ہیں کہ میں ایک دن حضرت جنید علیہ الرحمۃ کی خدمت میں حاضر ہو تو ان کو بخار میں مبتلا پایا میں نے عرض کیا کہ اے استاذ! آپ حق تعالیٰ سے دعا کریں کہ وہ صحت بخشے۔ حضرت جنید نے فرمایا میں نے کل دعا کی تھی میرے دل میں آواز آئی کہ اے جنید! تمہارا جسم، ہماری ملکیت ہے ہمیں اختیار ہے چاہے تندرست رکھیں یا بیمار تم کون ہو کہ ہمارے اور ہماری ملکیت کے درمیان دخل دو اپنا اختیار ختم کر دو تا کہ بندے ہو جاؤ۔ واللہ اعلم

(۵۹) حضرت ابوعلی محمد بن قاسم رودباری علیہ الرحمۃ:

منجملۂ آئمۂ طریقت، شیخ محمود، معدنِ جود، حضرت ابوعلی محمد بن قاسم رودباری علیہ الرحمۃ اللہ ہیں جو اکابر جوان مردانِ صوفیا کے سرخیل تھے خاندانِ سلاطین سے تعلق رکھتے تھے فنون معاملات میں عظیم المرتبہ تھے۔ آپ کے مناقب ونشانیاں بکثرت اور معرفت وطریقت کے دقائق میں کلام لطیف ہے۔ آپ کا ارشاد ہے:

المرید لا یرید لنفسه الا ما اراد الله له والمراد لا یرید من الکونین شیأ غیره	مرید وہ ہے جو اپنے لیے کچھ نہ چاہے بجز اس کے جو اللہ تعالیٰ اس کے لیے چاہے اور مراد وہ ہے جو دونوں جہان سے بجز خدا کسی چیز کو نہ چاہے۔

مطلب یہ ہے کہ حق تعالیٰ کے ارادے پر راضی رہ کر اپنے لیے کوئی خواہش نہ رکھے تا کہ وہ مرید صادق بن جائے۔ محب کو زیبا ہے کہ اپنا کوئی ارادہ نہ ہو تا کہ خدا ہی اس کی مراد ہو

گویا وہ حق تعالیٰ ہی کو چاہے اور کسی غیر کی طلب نہ رکھے اور وہی چاہے جو خدا چاہے کیونکہ اسے حق چاہتا ہے لہٰذا وہ بجز حق کے کسی کو نہ چاہے چونکہ تسلیم و رضا طریقت کا ابتدائی مقام ہے اور ربوبیت کے ساتھ محبت کرنا احوال کی انتہا ہے۔ عبودیت کے تحقق سے مقامات کی نسبت ہے اور ربوبیت کی تائید سے احوال کی منزلت ہے جب یہ کیفیت پیدا ہو جائے گی تو مرید بخود قائم اور مراد بحق قائم ہو جائے گا۔ واللہ اعلم

(٦٠) حضرت ابوالعباس قاسم بن مہدی سیاری علیہ الرحمۃ:

منجملۂ ائمۂ طریقت، خزینہ دار توحید، سمسار تفرید حضرت ابوالعباس قاسم بن مہدی سیاری رحمۃ اللہ علیہ ہیں جو اپنے زمانہ کے امام اور علوم ظاہر اور فنونِ حقائق کے عالم تھے حضرت ابوبکر واسطی کے صحبت یافتہ، بکثرت مشائخ سے ادب گرفتہ، صوفیاء کی صحبت میں از ہمہ اشرف اور راہِ الفت میں زاہد تر تھے آپ کا کلام بلند اور تصانیف عمدہ ہیں۔ آپ کا ارشاد ہے:

التوحید ان لا یخطر بقلبك مادون توحید — توحید یہ ہے کہ دل میں حق تعالیٰ کے سوا کسی دوسرے کا تصور نہ ہو۔

دل کے اسرار پر کسی مخلوق کا گذر نہ ہو اور نہ معاملات کی پاکیزگی میں کوئی کدورت ہو اس لیے کہ غیر کا اندیشہ غیر کے اثبات سے ہے جب غیر کا اثبات ہے تو حکمِ توحید ساقط ہے۔

حضرت ابوالعباس سیاری کے بارے میں مشہور ہے کہ آپ مرو کے علاقے کے ایک بڑے رئیس تھے کہ کوئی شخص دولت اور مرتبہ میں آپ سے بڑھ کر نہ تھا آپ نے اپنے والد کی میراث میں بہت مال و دولت پایا تھا لیکن یہ تمام مال و منال دے کر آپ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے دو موئے مبارک حاصل کر لئے اللہ تعالیٰ نے آپ کو ان موئے مبارک کی برکت سے سچی توبہ عطا فرمائی اور حضرت ابوبکر واسطی کی صحبت میں رہ کر ایسا کمال پایا کہ صوفیاء کے امام حنیف ہو گئے۔

آپ فرمایا کرتے تھے کہ مجھے جو کچھ ملا ان موئے مبارک کی برکت سے ملا جب آپ دنیا سے رحلت فرمانے لگے تو وصیت کی کہ وہ موئے مبارک کو میرے منہ میں رکھ دینا چنانچہ ایسا

ہی کیا گیا اسی کا اثر ہے کہ مرو میں آج بھی آپ کی قبر کا نشان ہے لوگ مزار مبارک پر حاضر ہو کر مرادیں مانگتے ہیں حل مشکلات کی دعائیں کرتے ہیں اور ان کی مرادیں پوری ہوتی ہیں اور مشکلیں آسان ہوتی ہیں۔ یہ آزمودہ ہے۔

(۶۱) حضرت ابوعبداللہ محمد بن خفیف علیہ الرحمۃ:

منجملۂ ائمۂ طریقت، اپنے زمانہ میں تصوف کے مالک، حضرت ابوعبداللہ محمد بن خفیف رحمۃ اللہ علیہ ہیں آپ کی طبیعت تکلف وتصرف سے پاک تھی انواع علوم میں اپنے وقت کے امام تھے، مجاہدہ عظیم حقائق میں بیان شافی اور حال عمدہ تھا آپ کی تصانیف سے پتہ چلتا ہے کہ آپ نے حضرت ابن عطا، حضرت شبلی، حسین بن علاج، منصور حریری اور مکہ مکرمہ میں حضرت یعقوب نہر جوری کی صحبت پائی تھی۔ مجرد رہ کر خوب سیاحت کی آپ شاہی خاندان سے تعلق رکھتے تھے لیکن اللہ تعالیٰ نے توبہ کی توفیق بخشی اور بادشاہت چھوڑ کر راہِ طریقت اختیار کر لی آپ کا باطن اہل معانی کے باطن پر فائق تھا۔ آپ کا ارشاد ہے:

التوحید الاعراض عن الطبیعتہ — طبیعت سے منہ موڑنے ہی میں توحید کا قیام ہے

اس لیے کہ طبیعت سراپا حجاب ہے جو خدا کی نعمتوں سے محجوب واندھا کر دیتی ہے لہٰذا جب تک طبیعت سے منہ نہ موڑا جائے اس وقت تک وصالِ حق ممکن نہیں اور صاحب طبع حقیقت توحید سے حجاب میں رہتا ہے جس وقت طبیعت کی آفتوں سے باخبر ہو گیا اس وقت حقیقت توحید منکشف ہو جائے گی۔ آپ کے دلائل بکثرت ہیں۔ واللہ اعلم

(۶۲) حضرت ابوعثمان سعیدن بن سلام مغربی علیہ الرحمۃ:

منجملۂ آئمۂ طریقت، سیفِ سیادت، آفتابِ نجابت حضرت ابوعثمان سعید بن سلام مغربی رحمۃ اللہ علیہ ہیں جو اہل استقامت بزرگوں میں سے تھے صاحب ریاضت وسیاست اور فنون علم میں کامل مہارت رکھتے تھے روایات میں مانند آفتاب نجابت تھے آپ کی نشانیاں بکثر

ت اور براہین عمدہ ہیں۔

آپ کا ارشاد ہے:

من آثر صحبته الاغنياء علىٰ مجانسة الفقراء ابتلاه الله تعالىٰ بموت القلب	جو درویشوں کی صحبت پر تونگروں کی ہم نشینی کو ترجیح دیتا ہے اللہ تعالیٰ اسے دل کی موت میں مبتلا کر دیتا ہے۔

اس لیے کہ جب درویشوں کی مجلس کے مقابلہ میں تونگروں کی صحبت اختیار کرے گا تو اس کا دل حاجت کی موت سے آپ ہی مر جائے گا اور اس کا جسم وہم وگمان میں گرفتار ہو جائے گا جب کہ مجلس چھوڑنے کا نتیجہ دل کی موت ہے تو صحبت سے اعراض کا کیا انجام ہوگا؟ ان مختصر کلمات میں صحبت اور مجانست کا فرق ظاہر ہے۔ واللہ اعلم

(۶۳) حضرت ابوالقاسم ابراہیم بن محمد بن محمود نصر آبادی علیہ الرحمۃ:

منجملۂ آئمۂ متقدمین، صوفیا کے صف کے بہادر، عارفوں کے احوال کے معبر حضرت ابوالقاسم ابراہیم بن محمد بن محمود نصر آبادی رحمۃ اللہ علیہ ہیں۔ جس طرح نیشاپور میں خوارزم بادشاہ تھے اور شاہ پور میں میں حمویہ بادشاہ گزرے ہیں اسی طرح آپ نیشاپور میں بلند مرتبہ پر فائز تھے فرق یہ تھا کہ وہ دنیا کی عزت رکھتے تھے اور آپ آخرت کی عزت سے مالا مال آپ کا کلام انوکھا اور نشانیاں بہت ہیں حضرت شبلی علیہ الرحمۃ کے مرید اور متاخرینِ اہل خراسان کے استاذ تھے اپنے زمانے میں ہر فن میں اعلم و اورع تھے۔ آپ کا ارشاد ہے:۔

انت بين نسبتين نسبته الى آدم ونسبته الى الحق فاذا انتسبت الىٰ آدم دخلت فى ميادين الشهوات ومواضع الآفات وازلا لات وهى نسبته تحقق	یعنی تم دو نسبتوں کے درمیان ہو ایک نسبت حضرت آدم کی طرف ہے اور دوسری نسبت حق تعالیٰ کی طرف ہے جب تم آدم کی طرف منسوب ہوتے ہو تو شہوت کے میدانوں میں اور آفت کی غلط جگہوں اور

البشریتہ قال اللہ تعالیٰ انہ کان ظلوما جھولا واذا نسبت الی الحق دخلت فی مقامات الکشف والبراھین والعصمۃ والولایتہ وھی نسبتہ تحقق العبودیتہ قال اللہ تعالیٰ وعباد الرحمٰن الذین یمشون علی الارض ھونا (الأیہ)

مقامات میں داخل ہوجاتے ہو یہی وہ نسبت ہے جس سے تمہارا بشر ہونا ثابت ہے اسی نسبت کے لحاظ سے اللہ تعالیٰ نے فرمایا ابن آدم بڑا جفا کار اور ناعاقبت اندیش واقع ہوا ہے جب تم اپنی نسبت حق تعالیٰ سے قائم کرتے ہو تو تم کشف و براہین اور عصمت و ولایت کے مقامت میں داخل ہوجاتے ہو یہی وہ نسبت ہے جس سے حق تعالیٰ کی بندگی کا ثبوت ملتا ہے اسی نسبت کے اعتبار سے حق تعالیٰ نے فرمایا رحمٰن کے بندے زمین پر عاجزی سے چلتے ہیں۔

پہلی نسبت بشریت کی ہے اور دوسری نسبت عبودیت کی نسبتِ آدم تو قیامت میں منقطع ہوجائے گی البتہ نسبتِ عبودیت ہمیشہ قائم ودائم رہے گی اس میں تغیر تبدل جائز نہیں رکھا گیا جب اپنی نسبت کو اپنی طرف یا حضرت آدم علیہ السلام سے جوڑے تو اس کا کمال یہ ہے کہ وہ کہے "اِنِّیْ ظَلَمْتُ نَفْسِیْ" میں نے اپنی جان پر زیادتی کی ہے اور جب اپنی نسبت حق تعالیٰ کی طرف کرتا ہے تو وہ بندہ اسی کا محل بن جاتا ہے کہ حق تعالیٰ فرمائے "یَا عِبَادِیْ لَا خَوْفٌ عَلَیْکُمُ الْیَوْمَ" (الزخرف:٦٨) اے میرے بندے آج تم پر کوئی خوف نہیں۔ واللہ اعلم

(٦۴) حضرت ابوالحسن علی بن ابراہیم حضرمی علیہ الرحمۃ:

منجملہ آئمہ متقدمین، سالکانِ طریق حق کے سردار، اہل تحقیق کی جانوں کے جمال حضرت ابوالحسن علی بن ابراہیم حضرمی رحمۃ اللہ علیہ ہیں جو بارگاہِ الٰہی کے بزرگ ترین احرار بندوں اور صوفیاء کبار کے اماموں میں سے تھے۔ آپ اپنے عہد میں بے نظیر تھے ہر معانی میں آپ کا کلام ارفع اور عبارتیں عمدہ ہیں۔ آپ کا ارشاد ہے:

دعونی فی بلائی واسمعوا مالکم الستم من اولاد آدم الذی خلقه الله تعالیٰ بیده ونفخ فیه من روحه واسجدله الملائکته ثم امره بامر فخالف فاذا کان اول الدن دُرْ دِیًّا فکیف کان آخره.

مجھے اپنی بلاؤں میں چھوڑ دو، سنو! تم کیا اسی آدم علیہ السلام کی اولاد میں سے نہیں ہو جسے اللہ تعالیٰ نے اپنے دست قدرت سے پیدا کر کے اپنی طرف سے ان میں روح پھونکی اور انہیں فرشتوں سے سجدہ کرایا پھر ایک حکم دیا تو اس کی بھی خلاف ورزی کی جب کہ شروع ہی میں تلچھٹ ہے تو آخر میں کیا ہوگا؟

آپ کے فرمانے کا مطلب یہ ہے کہ اگر آدمی کو اس کے حال پر چھوڑ دیا جائے تو وہ سراسر مخالفِ حق بن جائے گا اور اگر اس پر عنایتِ حق ہو جائے تو سرتاپا محبت ہو جائے لہٰذا اللہ تعالیٰ کی حسنِ عنایت کو سمجھ کر اپنے معاملات کی برائی کا اس سے موازنہ کرتے رہنا چاہئے اور اپنی تمام عمر اسی موازنہ میں گزار دینی چاہیے۔ وباللہ التوفیق

یہ ہے سلف کے برگزیدہ متقدمین مشائخ کا مختصر تذکرہ اگر میں اس کتاب میں تمام بزرگوں کا تذکرہ کرتا یا تشریح و تفصیل کے درپے ہوتا اور ان کے تمام حالات و واقعات کو درج کرتا تو اصل مقصود فوت ہو جاتا طوالت کے خوف سے اسی پر اکتفا کیا جاتا ہے اب کچھ متاخرین صوفیاء کا تذکرہ شامل کرتا ہوں۔

متاخرین ائمہ و مشائخ کا تذکرہ

واضح رہنا چاہیے کہ ہمارے زمانہ میں ایک گروہ ایسا ہے جو ریاضت کا بوجھ برداشت کرنے کی طاقت نہیں رکھتا اور بے ریاضت مرتبہ کا خواہاں ہے اور وہ تمام صوفیاء کو اپنا ہی جیسا کاہل خیال کرتا ہے جب وہ ان صوفیاء کی باتیں سنتے ہیں اور ان کے عزت و مرتبہ کو دیکھتے ہیں اور ان کے معاملات کو پڑھتے ہیں اور پھر اپنے آپ پر نظر ڈالتے ہیں تو خود کو ان سے بہت دور

پاتے ہیں اس وقت تصوف کو چھوڑ دیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ہم ایسے باہمت لوگ نہیں ہیں اور نہ ہمارے زمانہ میں ایسے حضرات نظر آتے ہیں حالانکہ ان کا یہ کہنا باطل ہے اس لیے کہ اللہ تعالیٰ زمین کو ہرگز بے حجت نہیں چھوڑتا اور اس امت کو بغیر ولی کے کبھی نہیں رکھتا جیسا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ "لَایَزَالُ طَائِفَةٌ مِّنْ اُمَّتِیْ عَلَی الْخَیْرِ وَالْحَقِّ حَتّٰی تَقُوْمَ السَّاعَتُہ" میری امت کی ایک جماعت ہمیشہ خیر و حق پر تا قیامت قائم رہے گی نیز فرمایا "لَایَزَالُ فِیْ اُمَّتِیْ اَرْبَعُوْنَ عَلٰی خُلُقِ اِبْرَاهِیْمَ" میری امت کے چالیس افراد حضرت ابراہیم علیہ السلام کے خلق پر ہمیشہ موجود رہیں گے ان میں سے کچھ افراد کا تذکرہ اس جگہ لا رہا ہوں اگر چہ کچھ حضرات دنیا سے کوچ کر کے بہشت میں آرام پذیر ہیں اور کچھ زندہ ہیں۔ رضی اللہ تعالیٰ عناوعن جمیع المسلمین والمسلمات برحمتہ۔

(۱) حضرت ابوالعباس احمد بن محمد قصاب علیہ الرحمتہ:

منجملہ متاخرین ائمہ طریقت، طراز طریق ولایت، جمال اہل ہدایت، حضرت ابو العباس احمد بن محمد قصاب رحمہ اللہ ہیں آپ نے ماوراء النہر کے صوفیاء متقدمین سے ملاقات کی اور ان کی صحبت میں رہے آپ علو حال، صدق فراست، کثرت برہان اور زہد و کرامت میں مشہور و معروف تھے امام طبرستان حضرت ابوعبداللہ خیاطی فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کا ایک فضل یہ ہے کہ وہ کسی کو بغیر تعلیم کے ایسا بنا دیتا ہے کہ جب ہم کو اصول دین اور توحید کے دقائق میں کوئی مسئلہ دشوار و مشکل نظر آتا ہے تو ہم ان سے جا کر حل کر لیتے ہیں وہ حضرت ابوالعباس قصاب ہیں چونکہ آپ اُمیّ تھے لیکن علم تصوف اور اصول دین میں آپ کا کلام بہت ارفع تھا آپ کی حالت ابتداء و انتہا بہت اعلیٰ اور نیک سیرت تھی۔

اگر چہ مجھے آپ کی بہت سی حکایتیں سنائی گئی ہیں لیکن میرا طریق اس کتاب میں اختصار ہے اس لئے آپ کی ایک حکایت بیان کرتا ہوں۔

حکایت:

ایک بچہ اونٹ پر بوجھ لادے اس کی نکیل پکڑے آمل کے بازار میں جا رہا تھا اس بازار میں کیچڑ بہت تھی اونٹ کا پاؤں پھسلا وہ گر پڑا اور اس کا پاؤں ٹوٹ گیا لوگوں نے چاہا کہ اونٹ کی کمر سے بوجھ اتار لیں لیکن بچہ ہاتھ اٹھا کر دعائیں مانگ رہا تھا اور روتا جا رہا تھا اتفاق سے ادھر حضرت ابوالعباس کا گزر ہوا آپ نے پوچھا کیا بات ہے؟ لوگوں نے کہا اونٹ کا پاؤں ٹوٹ گیا ہے آپ نے اونٹ کی نکیل تھامی اور آسمان کی طرف منہ کر کے دعا مانگی کہ اے خدا! اس اونٹ کا پاؤں ٹھیک کر دے اور اگر تو درست کرنا نہیں چاہتا تو اس قصابی کا دل بچے کے رونے سے کیوں جلاتا ہے اسی وقت اونٹ کھڑا ہو گیا اور دوڑنے لگا۔

آپ کا ارشاد ہے کہ سارے عالم کو خواہ وہ چاہیں یا نہ چاہیں بہر طور خدا کی خو سے خوگیر ہونا چاہئے ورنہ وہ رنج میں رہیں گے اس لئے کہ جب تم حق تعالیٰ کی خصلت کے عادی بن گئے تو بلاء و ابتلا کی حالت میں رغبت زیادہ پاؤ گے کیونکہ بلا پر بلا نہیں آتی اگر حق کے خوگر نہ ہو گے تو بلا کی حالت میں تم آزردہ دل ہو گے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے خوشی و سختی دونوں مقدر فرمائے ہیں وہ اپنی تقدیر کو بدلتا نہیں ہے لہٰذا اس کے حکم پر ہمارا راضی ہونا ہماری راحت کا سبب ہو گا اور جو بھی اس کا عادی ہو گا اس کا دل راحت پائے گا اور اس سے اعراض کرو گے تو تقدیر کے نازل ہونے پر آزردہ ہو گے۔ واللہ اعلم

(۲) حضرت ابو علی بن حسین بن محمد دقاق علیہ الرحمۃ:

از ائمہ متاخرین، بیان مریداں، برہانِ محققاں حضرت ابو علی بن حسین بن محمد دقاق رحمۃ اللہ علیہ ہیں جو اپنے فن کے امام، زمانہ میں بے نظیر اور کشفِ راہِ حق میں بیان صریح اور زبان فصیح رکھتے تھے بکثرت مشائخ سے ملاقات کی اور ان کی صحبت پائی آپ حضرت نصر آبادی کے مرید تھے وعظ و نصیحت فرمایا کرتے تھے۔ آپ کا ارشاد ہے:

من آنس بغیره ضعف فی حاله ومن نطق من غیره کذب فی مقاله

جوحق تعالیٰ کے ماسواء کسی اور سے انس رکھے وہ اپنے حال میں کمزور ہے اور جو اس کے غیر کی بات کرے وہ اپنے کلام میں جھوٹا ہے۔

اس لئے کہ غیر سے انس رکھنا معرفت کی کمی کی بناء پر ہے اور خدا سے انس رکھنا غیر کی وحشت سے محفوظ رہنا ہے اور جو غیر سے ڈرنے والا ہوتا ہے وہ غیر سے بات تک نہیں کر سکتا۔

ایک بزرگ بیان کرتے ہیں کہ ایک دن میں ان کی مجلس میں اس لئے گیا کہ میں ان سے متوکلین کا حال دریافت کروں۔ آپ اس وقت طبری کا نفیس عمامہ سر پر باندھے ہوئے تھے میرا دل دستار پر مائل ہو گیا میں نے ان سے عرض کیا اے شیخ! توکل کیا ہے آپ نے فرمایا یہ ہے کہ تم لوگوں کی دستار کا لالچ نہ کرو یہ فرما کر اپنا عمامہ میرے آگے ڈال دیا۔

(۳) حضرت ابوالحسن علی بن احمد خرقانی علیہ الرحمتہ:

از ائمہ متاخرین شرف اہل زمانہ در زمانہ خود یگانہ حضرت ابوالحسن علی بن احمد خرقانی رحمتہ اللہ علیہ ہیں جو برگزیدہ جلیل القدر مشائخؒ میں سے ہیں تمام اولیاء کے ممدوح رہے حضرت شیخ ابوسعید نے ان کی زیارت کا قصد کیا انہوں نے ان کے ساتھ ہر فن کے لطیف محاورات استعمال کئے جب واپسی کا عزم کیا تو فرمایا میں آپ کو اپنے زمانہ کا صاحب ولایت اور برگزیدہ شخص مانتا ہوں اور آپ کی باتیں حسن ادب سے سنی ہیں حالانکہ وہ شیخ ابوسعید کے خادم تھے اور جب یہ شیخ ان کے پاس پہنچتے تب بھی ان سے کوئی اور بات نہ کرتے وہ ان کی باتیں سنتے رہتے اور بات کا جواب دیتے رہتے اس کے سوا کچھ نہ فرماتے میں نے ان سے دریافت کیا اے شیخ! آپ نے ایسی خاموشی کس لئے اختیار فرمائی آپ نے فرمایا ایک ہی شخص بیان کرنے کے لئے کافی ہے حضرت استاذ ابوالقاسم قشیری رحمتہ اللہ علیہ سے میں نے سنا وہ فرماتے ہیں کہ جب میں خرقان کی ولایت میں داخل ہوا تو اس بزرگ کے جلال و دبدبہ کی وجہ سے میری فصاحت جاتی رہی اور میری تمام نکتہ سنجیاں ختم ہو گئیں میں نے خیال کیا کہ شاید میں اپنی ولایت سے معزول کر

دیا گیا ہوں۔

آپ کا ارشاد ہے کہ راستے دو ہیں، ایک گمراہی کا دوسرا ہدایت کا جو راستہ گمراہی کا ہے وہ بندے کا راستہ خدا کی طرف ہے اور جو راستہ ہدایت کا ہے وہ خدا کی راہ بندے کی طرف ہے لہٰذا جو یہ کہے کہ میں حق تک پہنچ گیا وہ نہیں پہنچا اور جو یہ کہے کہ مجھے اس تک پہنچا دیا گیا ہے وہ پہنچ گیا اس لئے کہ جو خود بخود اس تک پہنچنے کا دعوٰی کرتا ہے گویا وہ بغیر پہنچانے والے کے دعوٰی کرتا ہے اور یہ کہنا کہ میں خود نہیں پہنچا، پہنچایا گیا ہوں تو یہ پہنچنے سے متعلق ہے۔ واللہ اعلم

(۴) حضرت محمد بن علی المعروف بہ داستانی علیہ الرحمۃ:

از ائمہ، متاخرین، بادشاہِ وقت، اپنے زمانہ میں بیان و تعبیر میں منفرد، حضرت ابو عبداللہ محمد بن علی المعروف بہ داستانی علیہ الرحمۃ ہیں جو بسطام کے رہنے والے انواع علوم کے عالم اور برگزیدۂ بارگاہِ حق تھے۔ آپ کا کلام مہذب اور اشارات لطیف ہیں اس علاقہ کے امام شیخ سہلکی رحمۃ اللہ علیہ آپ کے ساتھ خوش اعتقادی رکھتے تھے میں نے ان کے کچھ انفاس شیخ سہلکی سے سنے ہیں وہ بہت بلند مرتبہ اور خوش اخلاق تھے۔ آپ کا ارشاد ہے:

التوحید عنك موجود وانت فی التوحید مفقود	تم سے متعلق توحید موجود ہے لیکن تم توحید میں غیر موجود ہو۔

کیونکہ توحید کا اقتضاء ہے اس پر تم قائم نہیں ہو۔ توحید کا ادنیٰ درجہ یہ ہے کہ ملکیت میں اپنا تصرف و اختیار ختم کر دیا جائے اور اپنے تمام امور خدا کے حوالہ کر کے اس پر ثابت قدم رہے۔

حضرت سہلکی رحمہ اللہ بیان کرتے ہیں کہ شہر بسطام میں ایک مرتبہ ٹڈی دل نے یلغار کی اور ان کی کثرت سے تمام درخت اور کھیتیاں سیاہ ہو گئیں سب لوگ ہاتھ ملتے ہوئے دلفگار نکلے حضرت شیخ نے مجھ سے پوچھا یہ کیسا شور و غل ہے؟ میں نے بتایا کہ ٹڈیاں آ گئی ہیں لوگ پریشان ہیں۔ شیخ اٹھے اور چھت پر چڑھ کر منہ آسمان کی طرف اٹھایا اسی وقت تمام ٹڈیاں اٹھ گئیں اور ظہر کی نماز تک ایک ٹڈی باقی نہ رہی اور کسی درخت کا ایک پتہ تک ضائع نہ ہوا۔

(۵) حضرت فضل اللہ بن محمد مہینی علیہ الرحمتہ:

از ائمہ متاخرین، شہنشاہِ محباں، ملک الملوک صوفیاں، حضرت ابوسعید فضل اللہ بن محمد مہینی رحمتہ اللہ علیہ ہیں جو سلطان وقت اور جمال طریقت تھے تمام لوگ آپ سے مسخر تھے کچھ آپ کے دیدار جمال سے اور کچھ عقیدت سے اور کچھ قوت حال سے۔ آپ فنونِ علوم کے عالم اور نرالی شان رکھتے تھے اسرار الٰہی سے مشرف حضرات میں آپ کا مرتبہ بلند تھا علاوہ ازیں آپ کی نشانیاں اور براہین بکثرت ہیں اور آج بھی جہان میں ان کے آثار ظاہر ہیں آپ کا ابتدائی حال یہ ہے کہ آپ مہنہ سے تحصیل علم کے لئے سرخس آئے اور حضرت ابوعلی زاہد کے درس میں بیٹھے آپ ان سے ایک دن میں تین دن کا درس لیتے اور تین دن عبادت میں گزارتے یہاں تک کہ آپ کے استاد نے آپ کے رشد کا حال دیکھا تو تعظیم وتکریم میں اضافہ کر دیا اس زمانہ میں سرخس کا حاکم شیخ ابوالفضل حسن تھا ایک روز آپ نہر کے کنارے جا رہے تھے کہ سامنے سے ابوالفضل آتے دکھائی دیا وہ کہنے لگا اے ابوسعید تمہارا راستہ یہ نہیں ہے جس پر تم چل رہے ہو، اپنی راہ چلو۔ آپ نے اس سے کچھ تعرض نہ کیا اور پلٹ کر اپنی جگہ آ گئے اور ریاضت ومجاہدہ میں مشغول ہو گئے یہاں تک کہ حق تعالیٰ نے آپ پر ہدایت کا دروازہ کھول دیا اور مراتب علیا پر فائز کر دیا۔

حضرت شیخ ابومسلم فارسی نے مجھے بتایا کہ میری ان سے بڑی چھیڑ چھاڑ رہتی تھی ایک مرتبہ میں ان سے ملنے گیا اس وقت میں میلی سی ایک گدڑی پہنے ہوئے تھا جب میں مکان کے اندر ان کے روبرو پہنچا تو انہیں دیبائے مصری پہنے ہوئے تخت پر بیٹھے دیکھا میں نے دل میں کہا یہ اس ٹھاٹھ باٹھ کے ساتھ بودوباش پر درویشی کا دعوٰی کرتے ہیں اور میں ان تمام علاقوں سے مجرد رہ کر درویشی کا مدعی ہوں ان کے ساتھ میری موافقت کیسے ہوگی؟ وہ مردِ خدا، میرے اس دلی خدشہ سے باخبر ہو گیا۔ سر اٹھا کر فرمایا:

یا ابا مسلم! فی ای دیوان وجدت	اے ابو مسلم! تم نے کس کتاب میں پایا ہے
من کان قلبہ قائماً فی مشاھدۃ	کہ جس کا دل مشاہدۂ حق میں قائم ہوا اس پر
الحق یقع فی اسم الفقر	نام فقر (ناداری و مفلسی) لکھا ہے۔

مطلب یہ ہے کہ اصحاب مشاہدہ تو حق تعالیٰ کے ساتھ غنی ہوتے ہیں فقراء تو اربابِ مجاہدہ میں سے ہوتے ہیں۔ ابو مسلم کہتے ہیں کہ میں اپنے گمان پر پشیمان ہوا اور برے اندیشہ سے توبہ کی۔ حضرت ابو سعید کا ارشاد ہے:

التصوف قیام القلب مع اللہ	تصوف وہ ہے کہ بے واسطہ حق کے ساتھ دل
بلاواسطۃ	کا قیام ہو

یہ اشارہ مشاہدہ کی طرف ہے اور مشاہدہ دوستی کے غلبہ کا نشان ہے اور صفت میں مستغرق ہونا دیدار کے شوق کا ثبوت ہے اور صفت کا فنا ہونا حق کے ساتھ بقا کا ثبوت ہے۔ مشاہدے کی تفصیل باب الحج میں بیان کی جائے گی۔

ایک مرتبہ حضرت ابو سعید نے نیشاپور سے مقام طوس جانے کا ارادہ کیا راستہ میں ایک گھاٹی اتنی سرد آئی کہ موزے میں پاؤں ٹھنڈے ہو رہے تھے ایک درویش کو خیال آیا کہ میں اپنی چادر پھاڑ کر دو ٹکڑے کر کے شیخ کے پاؤں پر لپیٹ دوں چادر چونکہ عمدہ اور قیمتی تھی ٹکڑے کرنے کو دل نے گوارہ نہ کیا جب ہم طوس پہنچے تو اس درویش نے ان سے سوال کیا کہ اے شیخ! شیطانی وسوسہ اور الہام حق کے درمیان کیا فرق ہے؟ انہوں نے فرمایا کہ الہام وہ تھا کہ تجھے چادر پھاڑ کر دو ٹکڑے کر کے ابو سعید کے پاؤں پر لپیٹنے کا حکم دیا گیا تا کہ وہ سردی سے محفوظ رہیں اور شیطانی وسوسہ وہ تھا کہ تجھے ایسا کرنے سے باز رکھا۔ اس قسم کی بکثرت اور متواتر باتیں ان سے منسوب ہیں۔ مردانِ خدا کا یہی کام ہے۔ واللہ اعلم

(۶) حضرت ابوالفضل محمد بن حسن ختلی علیہ رحمتہ:

از ائمہ متاخرین زین اوتاد، شیخ عباد حضرت ابوالفضل محمد بن حسن ختلی رحمتہ اللہ علیہ ہیں۔ طریقت میں میری ارادت انہیں سے ہے آپ علم تفسیر و روایات کے عالم اور تصوف میں

حضرت جنید بغدادی رحمتہ اللہ علیہ کے ہم مشرب تھے حضرت حصری کے مرید اور حضرت سردانی کے مصاحب اور حضرت ابوعمر قزوینی حضرت ابوالحسن بن سعالبہ رحمہم اللہ کے ہم عصر تھے ساٹھ سال کامل گوشہ نشینی اختیار کر کے پہاڑوں کے غاروں میں زندگی گزار دی اور اپنا نام ونشان گم رکھا زیادہ تر لگام نامی پہاڑی پر اقامت رکھی عمدہ زندگی گزاری آپ کی نشانیاں اور براہین بکثرت ہیں لیکن آپ عام صوفیاء کے رسم ولباس کے پابند نہ تھے اہل رسوم سے سخت بے زار تھے میں نے آپ سے بڑھ کر رعب ودبدبہ والا کسی مردِ خدا کو کبھی نہ دیکھا۔ آپ کا ارشاد ہے:

الدنیا یوم ولنا فیھا صوم   دنیا ایک دن کی ہے اور ہم اس میں روزہ دار ہیں

مطلب یہ ہے کہ ہم نہ تو دنیا سے کچھ حاصل کرنے کی خواہش کرتے ہیں اور نہ اس کی بندش میں آنا چاہتے ہیں ہم نے اس کی آفتوں کو دیکھ لیا ہے اور اس کے حجابات سے باخبر ہو چکے ہیں ہم اس سے بھاگتے ہیں۔

حضرت داتا گنج بخش رحمتہ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ میں وضو کرتے آپ کے ہاتھوں پر پانی ڈال رہا تھا میرے دل میں خیال گزرا کہ جب تمام کام قسمت وتقدیر پر منحصر ہیں تو آزاد لوگ کیوں کرامت کی خواہش میں مرشدوں کے غلام بنتے پھرتے ہیں آپ نے فرمایا اے فرزند! جو خیالات تمہارے دل میں گزر رہے ہیں میں نے جان لیا ہے لہٰذا تمہیں معلوم ہونا چاہئے کہ ہر حکم کے لئے کوئی سبب ہوتا ہے جب اللہ تعالیٰ کسی سپاہی بچہ کو تاج وتخت عطا فرماتا ہے تو وہ اسے توبہ کی توفیق دے کر کسی دوست ومحبوب کی خدمت کی سعادت نصیب فرماتا ہے تاکہ یہ خدمت اس کی کرامت کا موجب بنے اس قسم کے بکثرت لطائف روزانہ ظہور پذیر ہوتے تھے جس دن آپ کی رحلت ہوئی اس وقت آپ، دمشق دینان رود کے مابین گھاٹی کے کنارے ایک گاؤں "بیت الحق" نامی میں تشریف فرما تھے اور آپ کا سر مبارک میرے آغوش میں تھا اس وقت اپنے کسی دوست کی طرف سے میرے دل میں کچھ رنج تھا جو انسانی خاصہ مزاج ہے آپ نے مجھ سے فرمایا اے فرزند! دل کو مضبوط کرنے والا ایک مسئلہ بتاتا ہوں اگر خود کو اس

پر کاربند کریں تو تمام رنج وفکر سے محفوظ ہوگے۔فرمایا ہر محل اور حالت کوخواہ وہ نیک ہو یا بد، اللہ تعالیٰ ہی نے اسے پیدا فرمایا ہے لہٰذا اس کے کسی فعل پر معترض نہ ہونا چاہئے اور نہ دل کو رنجیدہ کرنا چاہئے اس کے سوا آپ نے کوئی وصیت نہ فرمائی اور اپنی جان جاں آفریں کے سپرد کردی ۔واللہ اعلم

(۷) حضرت ابوالقاسم قشیری علیہ الرحمۃ:

از ائمہ متاخرین، استاذ و امام وزین اسلام حضرت ابوالقاسم عبدالکریم ابن ہوازن قشیری رحمتہ اللہ علیہ ہیں جو اپنے زمانہ میں یکتا اور قدر و منزلت میں ارفع و اشرف تھے۔آپ کے حالات اور گوناگوں فضائل اہل زمانہ میں مشہور ہیں ہر فن میں آپ کے لطائف موجود ہیں آپ کی محققانہ تصانیف بکثرت ہیں اللہ تعالیٰ نے آپ کے حال و زبان کو لغویات سے محفوظ رکھا۔میں نے آپ کا یہ ارشاد سنا ہے کہ:

مثل الصوفی کعلة ابرسام اوله	صوفی سرسام کی بیماری کی مانند ہے کہ پہلے
هذیان وآخره سکوت فاذا	بکواس ہوتی ہے آخر میں خاموشی پھر جب
تمکن خرس	قائم ہوجائے تو گونگا بنا دیتی ہے۔

مطلب یہ ہے کہ صفوت کی دو صورتیں ہوتی ہیں۔ایک وجد کی دوسرے نمود کی نمود مبتدیوں کے لئے ہے، نمود سے مراد ہذیان ہے اور وجد منتہیوں کے لئے ہے اور حالت وجد کا بیان محال و دشوار ہوتا ہے لہٰذا جب تک طالب ہے علو ہمت سے گویا ہے اور گویائی اہل طلب کے نزدیک ہذیان ہے جب وصال ہوگیا تو واصل ہوگئے ان کے لئے بیان و اشارے کی حاجت نہیں رہتی جس طرح کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام جب مبتدی تھے تو ان کی تمام ہمتیں رویت الٰہی کی تمنا میں رہیں اور ''رب ارنی انظر الیك'' اے رب مجھے اپنا جلوہ دکھا کہ میں تیرے دیدار سے مشرف ہوجاؤں کی مناجات کرتے رہے یہ مقصود کی نارسائی میں نمود کی تعبیر ہے اور ہمارے آقا سید عالم صلی اللہ علیہ وسلم منتہی اور صاحب تمکین ہیں جب آپ کا وجود مقام ہمت سے بلند ہوا اور ہمت فنا ہوئی تو ارشاد ہوا ''لااحصی ثناءً علیك'' میں تیری ثنا شمار

نہیں کرسکتا۔ یہ منزلت رفیع اور مقام اعلیٰ ہے۔ واللہ اعلم

(۸) حضرت ابوالعباس احمد بن محمد اشقانی علیہ الرحمتہ:

از ائمہ متاخرین، شیخ وامام اوحد درطریق خود مفرد حضرت ابوالعباس احمد بن محمد اشقانی رحمتہ اللہ علیہ ہیں جوفنون علم کے اصول وفروع میں امام اور ہر معانی میں کامل واکمل تھے۔ اہل تصوف کے اکابر اور اجلہ میں آپ کا شمار ہے بکثرت مشائخ سے ملاقات کی آپ اہل راہ کو فنا سے تعبیر کرتے تھے اور مغلق ومشکل عبارت بولنے میں مخصوص تھے میں نے جہلا کی ایک جماعت کو دیکھا کہ وہ ان عبارتوں کی تقلید کرتے اور ان کی شطحیات کی پیروی کرتے اور غیر محمود معنیٰ کا اتباع کرتے تھے حالانکہ ان کی عبارتوں پر غور وفکر کی ضرورت تھی مجھے ان سے بڑی محبت تھی چونکہ وہ مجھ پر بڑی مہربانی وشفقت فرماتے تھے بعض علوم میں وہ میرے استاد تھے شریعت کی تعظیم کرتے اور ہر شخص سے کنارہ کش رہنے میں ان سے زیادہ کسی شخص کو میں نے نہ دیکھا علم اصول میں ان کی دقیق عبارتوں سے امام ومحقق کے سوا کوئی فائدہ نہیں اٹھا سکتا۔ ان کی طبیعت ہمیشہ دنیا وآخرت سے بےزار رہی اور ہمیشہ یہی کہتے رہے کہ "**اشتھی عدما مالا وجود له**" میں ایسی فنا کا طالب ہوں جس میں وجود کا شائبہ تک نہ ہو اور فارسی میں فرماتے جس کا مطلب یہ ہے کہ ہر آدمی کو محال کی خواہش ہے مجھے بھی محال درکار ہے لیکن میں یقین سے جانتا ہوں کہ ایسا کبھی نہ ہوگا حالانکہ ممکن وہی ہے جس کی مجھے ضرورت ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ مجھے ایسی فنا میں لے جائے گا جہاں فنا کا بھی وجود نہ ہوگا کیونکہ جتنے مقامات جو کہ زمانہ میں ہیں وہ سب ہی حجاب وابتلاء ہیں اور آدمی خود اپنے حجاب کا عاشق ہے۔ دیدار کی آرزو میں بندہ کا فنا ہونا حجاب میں آرام وسکون سے بہتر ہے اور جب کہ اللہ تعالیٰ باقی ہے اور اس پر عدم وفنا جائز ہی نہیں ہے تو بہتر یہی ہے کہ میں اس کے قبضۂ قدرت ہی میں فنا ہو جاؤں کیونکہ ایسے فنا کے لئے ہرگز بقا نہ ہوگی۔ صحت فنا میں یہ قاعدہ مضبوط ومستحکم ہے۔ واللہ اعلم

(۹) حضرت ابوالقاسم بن علی گرگانی علیہ الرحمتہ:

از ائمہ متاخرین قطب زمانہ در وقت خود یگانہ حضرت ابوالقاسم بن علی بن عبداللہ گرگانی رحمتہ اللہ علیہ ہیں جو اپنے وقت و زمانہ میں بے نظیر و بے عدیل تھے آپ کا ابتدائی حال بہت اچھا تھا آپ کی مسافرت سخت اور باشرط تھی لوگوں کے دل آپ کی طرف مائل تھے تمام طلباء آپ سے عقیدت رکھتے تھے اور مریدوں کے وقوع کشف میں ایک قسم کا نشان تھے ظاہری حالت مزین اور تمام علوم میں ماہر تھے آپ کا ہر مرید جہان کی زینت تھا۔ انہوں نے اپنی اولاد کو نیک چھوڑا توقع ہے کہ انشاء اللہ وہ قوم کے پیشوا ہوں گے۔ آپ لسان الوقت تھے۔

حضرت ابوعلی فضل بن محمد نے ان کے حق میں اپنا نصیب نہ چھوڑا تھا چونکہ وہ سب سے کنارہ کش رہتے تھے اللہ تعالیٰ نے اس اعراض کی برکت سے اس مقتداء کو زبان حال بنا دیا تھا۔ ایک دن میں شیخ کے روبرو حاضر تھا اپنے احوال و نمود کو شمار کر رہا تھا تا کہ اپنی کیفیت آپ سے بیان کروں کیونکہ آپ ہی وقت کے ناقد تھے۔ آپ نے مجھ پر شفقت فرما کر انہیں سنا اور اسے میرے بچپن کے غرور اور جوانی کی آگ پر محمول فرمایا اور اسی نتیجہ میں اس کیفیت کی موجودگی قرار دی، چونکہ یہ شیخ اپنے ابتدائے حال میں اس کوچہ سے گزر چکے تھے اس لئے میرے بارے میں انہوں نے اتنا عجز و انکسار برتا لیکن وہ میری دلی کیفیت کو سمجھ گئے۔ فرمانے لگے اے والد کے دوست! تمہیں معلوم ہونا چاہئے کہ میرا یہ انکسار نہ تمہارے لئے ہے نہ تمہارے حال کے لئے کیونکہ حال کا بدلنے والا محال کے محل میں آتا ہے بلکہ میرا یہ انکسار محوّلِ احوال اللہ تعالیٰ کے حضور میں ہے یہ بات تمام طلباء کے لئے عام ہے صرف تمہارے ہی لئے نہیں ہے۔ جب میں نے یہ سنا تو میں از خود رفتہ ہو گیا۔ انہوں نے میری باطنی حالت کو ملاحظہ فرما کر کہا اے فرزند! آدمی کو اس طریقت سے اس سے زیادہ نسبت نہیں ہوتی کہ جب اسے طریقت کی طرف لگائیں تو اس کے گمان کو پھیر دیا جائے اور جب وہ گمان سے پھر جائے تو پھر اس پر خیالی تعبیر کی راہ بند کر دی جائے لہٰذا نفی و اثبات اور اس کا وجود و عدم دونوں خیال ہیں آدمی کسی طرح خیالی بندش سے باہر نہیں نکل سکتا اسے چاہئے کہ وہ حق کی بندگی اختیار کرے اور اپنے

دل سے تمام نسبتوں کو نکال پھینکے صرف بندگی اور فرمانبردار کی نسبت کو برقرار رکھے اس کے سوا اور بھی بکثرت اَسرار کی باتیں ہوئیں جن کے تذکرے میں اصل موضوع خلط مبحث ہو جائے گا۔ واللہ اعلم

(۱۰) حضرت ابواحمد المظفر علیہ الرحمتہ:

از ائمہ متاخرین، رئیس اولیاء، ناصح اصفیاء حضرت ابو احمد المظفر بن احمد بن حمدان رحمتہ اللہ علیہ ہیں۔ آپ کا باطن مسند جلوہ ہائے ربانی تھا۔ تصوف کے دروازے کشادہ اور سر پر تاجِ فراست آراستہ تھا فنا و بقا کی تشریح عمدہ اور تعبیر بلند تھی۔ شیخ المشائخ حضرت ابوسعید فرماتے ہیں کہ ہمیں بارگاہِ الٰہی کا قرب بندگی کی راہ سے عطا ہوا اور خواجہ المظفر کو براہِ راست خدا کی طرف سے ملا۔ مطلب یہ ہے کہ ہم نے مجاہدے سے مشاہدہ کیا اور انہوں نے مشاہدے سے مجاہدہ کیا۔ انہیں سے میں نے سنا کہ بزرگوں کو جو کچھ بادیہ پیمائی اور قطع مسافت کے بعد ملا وہ مجھے مسند اور بالانشینی سے حاصل ہوا۔ اصحاب رعونت و متکبرین شیخ کی اس بات کو دعوٰی پر محمول کرتے ہیں حالانکہ دعوٰی عیب ہے اور کسی صورت سے اپنے حال کی صداقت کے بیان کو دعوٰی نہیں کہا جا سکتا خاص کر جبکہ اہل معنیٰ بیان کریں۔ ان کا فرزند رشید موجود ہے۔

حضرت خواجہ ابوسعید فرماتے ہیں کہ ایک دن میں ان کے پاس موجود تھا کہ نیشاپور کا ایک مدعی آیا اور آپ کے ارشاد پر کہنے لگا "فانی شود آنگاہ باقی شود" یعنی فانی ہو جانے کے بعد باقی ہوتا ہے۔ خواجہ المظفر نے فرمایا فنا پر بقا کی کیا صورت ہے؟ کیونکہ فنا معدوم ہونے کو کہتے ہیں اور بقا موجود کو۔ یہ ہر ایک دوسرے کو نفی کرنے والا ہے لہٰذا فنا تو معلوم ہے کہ چیز ناپید ہو جاتی ہے اگر وہ موجود ہو جائے تو وہ عین شئے نہیں ہو سکتی بلکہ وہ بجائے خود دوسری چیز ہو گی اور یہ جائز نہیں کہ ایمان و ذات فنا ہو جائیں البتہ فنائے صفت اور فنائے سبب جائز ہے۔ معلوم ہوا کہ جب سبب اور صفت معدوم ہو گئی تو اب موصوف و مسبب رہ گیا اور ذات کے لئے فنا درست نہیں۔

حضرت داتا گنج بخش رحمتہ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ حضرت خواجہ کی بعینہٖ عبارت مجھے یاد

نہیں البتہ اس کا مفہوم یہی تھا جو درج کیا گیا ہے مزید وضاحت عام فہم طور پر یوں کی جائے گی کہ بندے کا اختیار بندے کی صفت ہے۔ بندہ اپنے اس اختیار کی وجہ سے اختیارِ حق میں محجوب ہے لہٰذا اس صفت کی بناء پر بندہ حق تعالیٰ سے حجاب میں آ گیا اور یہ یقینی امر ہے کہ اختیارِ حق ازلی ہے اور بندہ حادث۔ ازل کے لئے فنا جائز نہیں ہے اور جب اختیارِ حق بندہ کے بارے میں بقاپذیر تو لامحالہ بندے کا اختیار فانی ہوا اور اس کا تصرف منقطع ہو گیا۔ واللہ اعلم

ایک دن میں پراگندہ حال سفری کپڑے پہنے کرمان ان کے پاس پہنچا انہوں نے مجھ سے فرمایا اے ابوالحسن! اپنا حال بیان کرو؟ میں نے عرض کیا، سماع چاہتا ہوں۔ آپ نے اسی وقت قوال کو بلانے بھیجا ۔اس کے بعد اہل عشرت کی ایک جماعت آئی۔ جوشِ جوانی، قوت ارادی اور سوزِ محبت نے مجھے کچھ کلمات سننے پر بے چین کر دیا۔ کچھ عرصہ بعد جب جوش ٹھنڈا پڑا اور غلبہ کم ہوا تو انہوں نے مجھ سے فرمایا سماع کے بارے میں کیا حال ہے؟ میں نے عرض کیا اے شیخ! مجھے بڑی فرحت حاصل ہوئی۔ انہوں نے فرمایا جس وقت قوال کو بلایا گیا تھا اس وقت سماع کی آواز اور کوّوں کی آواز دونوں برابر تھیں کیونکہ سماع کی طاقت اس وقت تک ہے جب تک کہ مشاہدہ نہ ہو، اور جب مشاہدہ حاصل ہو جاتا ہے تو قدرت سماع ناپید ہو جاتی ہے دیکھو ایسی عادت اختیار نہ کرو کہ کہیں طبیعت ثانیہ نہ بن جائے اور مشاہدے سے دور ہو جاؤ۔ واللہ اعلم

مختلف شہروں میں مشائخ متاخرین کا تذکرہ

اگر میں ہر ایک کے ذکر اور حال کی تشریح کروں تو کتاب طویل ہو جائے گی اور بالکل ہی ذکر نہ کروں تو کتاب کا مقصد فوت ہو جائے گا اس لئے صرف ان کے اسماء گنا تا ہوں جو میرے زمانے میں طریقت کے مشائخ اور صوفیا گزرے ہیں اور وہ ارباب معانی میں سے ہیں نہ کہ اصحاب رسوم میں سے۔

عراق و شام میں مشائخ متاخرین میں سے (۱) شیخ زکی بن العلاء ہیں جو برگزیدہ اور سادات زمانہ میں سے ہیں۔ میں نے ان کو سراپا شعلۂ محبت پایا ان کی نشانیاں اور براہین ظاہر

ہیں، (۲) شیخ بزرگوار ابوجعفر محمد بن المصباح صیدلانی ہیں جو رؤساء متصوفین میں سے ہیں اور تحقیق میں زبان و بیان کے ماہر ہیں وہ حضرت حسین بن منصور حلاج سے بڑی محبت رکھتے ہیں ان کی بعض تصانیف میں نے پڑھی ہیں، (۳) حضرت ابوالقاسم سدسی جو صاحب مجاہدہ اور صاحب حال ہیں۔ حسنِ عقیدت کے ساتھ درویشوں کی نیازمندی اور خدمت گزاری کرتے ہیں۔

ملک فارس میں (۱) شیخ الشیوخ ابوالحسن بن سالبہ ہیں جو تصوف میں افصح اللسان اور توحید میں اوضح البیان ہیں ان کے کلمات مشہور ہیں، (۲) شیخ مرشد ابواسحٰق ابن شہریار ہیں جو برگزیدۂ قوم اور صاحب سیاست ہیں، (۳) شیخ طریقت ابوالحسن بن بکران ہیں جو اکابر صوفیا میں سے ہیں، (۴) شیخ ابومسلم ہروی ہیں جو عزیز وقت اور صاحب حال ہیں، (۵) شیخ ابوالفتح سالبہ ہیں جو اپنے والد کے فرزند رشید اور امیدوار ہیں، (۶) شیخ ابوطالب ہیں جو ایک بزرگ پابند کلمات حق ہیں، (۷) شیخ الشیوخ شیخ ابواسحٰق راندیدہ جوان سب میں بزرگ ہیں۔

قہستان، آذربائیجان، بحرستان اور فک میں (۱) شیخ شفیق فرح المعروف بہ اخی زنجانی ہیں جو مرد نیک سیرت اور ستودہ طریقت ہیں اور اپنے زمانہ کے شیخ اور بزرگ صوفی ہیں ان کی نیکیاں بہت ہیں۔ بادشاہ جو عیار شخص تھا ان کی وجہ سے تائب ہو کر راہ حق پر آ گیا، (۲) شیخ ابو عبداللہ جنیدی ہیں جو مہربان و شفیق بزرگ ہیں، (۳) اجلہ مشائخ میں سے شیخ ابوطالب مکشوف ہیں، (۴) خواجہ حسن سمنانی جو ایک مرد گرفتار بلا اور امیدوار ہیں، (۵) شیخ سہلکی ہیں جو جماعت صوفیا میں دانشور ہیں، (۶) احمد بن شیخ خرمانی جو اپنے والد کے فرزند رشید ہیں، (۷) حضرت ادیب کمندی جو ساداتِ زمانہ میں سے ہیں۔

کرمان میں (۱) حضرت خواجہ علی بن حسین کیرکانی ہیں جو سیاحِ وقت اور نیک خصلت ہیں، ان کے فرزند حکیم، ایک مرد عزیز ہیں، (۲) حضرت شیخ محمد بن سلمہ ہیں جو اس عہد کے بزرگوں میں سے ہیں ان کے سامنے بکثرت اولیاء اللہ جوانمرد اور طالب و امید گزرے ہیں۔

خراسان میں جہاں آج سایۂ اقبالِ حق ہے (۱) شیخ مجتہد حضرت ابوالعباس وامغانی

ہیں جن کا حال اور زمانہ بہت عمدہ ہے، (۲) حضرت خواجہ ابوجعفر محمد بن علی الجوینی ہیں جو طریقت کے محققوں میں سے ہیں، (۳) حضرت خواجہ ابوجعفر ترشیزی ہیں جو عزیزانِ وقت میں سے ہیں، (۴) حضرت خواجہ محمود نیشاپوری جو مقتدا اور فصیح ہیں، (۵) حضرت شیخ محمد معشوق ہیں جن کا حال عمدہ و نیک ہے اور نہایت خوش خلق ہیں، (۶) حضرت جمرۃ الحب جو نیک باطن اور خوش و خرم بزرگ ہیں، (۷) حضرت خواجہ رشید مظفر فرزند شیخ ابوسعید امیدوار ہیں جو مقتدائے قوم اور دلوں کے قبلہ ہیں، (۸) حضرت خواجہ شیخ احمد نجار سمرقندی مقیم مرو ہیں جو سلطانِ زمانہ ہیں، (۹) حضرت خواجہ شیخ احمد جماری سرخسی ہیں جو وقت کے سپاہی اور میرے ساتھی ہیں ان کے کاموں میں بڑی قدرت دیکھی ہے جوانمردان متصوفہ میں سے ہیں، (۱۰) حضرت شیخ ابوالحسن علی بن علی الاسود ہیں جو اپنے والد کے فرزند رشید اور اپنے زمانہ میں علو ہمت اور صدق و فراست میں بہترین و بے مثل ہیں۔ خراسان کے تمام مشائخ کا ذکر تو دشوار ہے ان میں سے تین سو مشائخ سے تو میں نے ملاقات کی ہے اور ہر ایک کا مشرب جدا جدا پایا ہے ان میں کا ہر ایک فرد سارے جہان کے لئے کافی ہے یہ سب اس لئے ہیں کہ خراسان کے افق پر آفتاب محبت اور اقبال طریقت ہمیشہ تاباں رہا ہے۔

ماوراء النہر میں (۱) خواجہ و امام، مقبول خاص و عام حضرت ابوجعفر محمد بن حسین حرمی ہیں جو صاحب سماع اور پابند طریقت ان کی ہمت بلند اور حال پاکیزہ ہے۔ سالکانِ راہِ حق کے ساتھ شفقت فرماتے ہیں اور اپنے ساتھیوں میں سردار و فقیہ ہیں، (۲) حضرت ابومحمد پالغری ہیں جو عمدہ حال اور محکم معاملات رکھتے ہیں، (۳) شیخ وقت حضرت احمد ایلاقی ہیں جو برگزیدۂ وقت اور تارکِ رسوم و عادات ہیں، (۴) فرید العصر اور یکتائے زمانہ حضرت خواجہ عارف ہیں، (۵) حضرت خواجہ زمن علی بن ابی الحق ہیں جو مردِ محتشم اور نیک زبان ہیں۔ یہ وہ مشائخ ہیں کہ جن سے میں نے ملاقات کی ہے اور ہر ایک کا مقام معلوم کیا ہے یہ سب محقق ہیں۔

غزنی میں (۱) شیخ عارف، ممدوحِ زمانہ حضرت ابوالفضل بن اسدی ہیں جو شیخ طریقت ہیں اور ان کی کرامت و براہین ظاہر ہیں۔ جب سوزِ محبت کا غلبہ ہوا تو ظاہری حالت

سے لوگوں نے دھوکہ کھایا، (۲) شیخ مجرد، علائق دنیوی کے تارک حضرت اسمٰعیل شاشی ہیں جو شیخ محتشم اور ملامتی طریق پر ہیں، (۳) منجملہ علماء طریقت حضرت شیخ سالار ہیں جن کا حال عمدہ ہے، (۴) شیخ دانا، معدنِ اسرار حضرت ابوعبداللہ محمد بن حکیم معروف بہ ''مرید از مستانِ حق'' ہیں جو اپنے زمانہ میں اپنے فن میں ثانی نہیں رکھتے ان کا حال لوگوں پر پوشیدہ ہے براہین و نشانات ظاہر و روشن ہیں ان کا حال صحت میں بہتر ہے اس لئے کہ وہ صاحب مشاہدہ ہیں، (۵) شیخ محترم تمام میں مقدم حضرت سعید بن ابی سعید عیار ہیں جو حدیث مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کے حافظ ہیں عمدہ زندگی پائی، حال میں قوی و باخبر مگر پوشیدہ رہتے ہیں کسی پر ظاہر نہیں ہوتے بکثرت مشائخ کی صحبت پائی ہے، (۶) خواجہ بزرگوار، جانشینِ ہمت و وقار، حضرت ابوالعلٰی عبدالرحیم بن احمد سعدی ہیں جو عزیز قوم اور سردار وقت ہیں۔ مجھے وہ دل سے پیارے لگتے ہیں ان کی زندگی مہذب، حال عمدہ اور فنون کے عالم ہیں، (۷) شیخ اوحد حضرت قصورہ بن محمد جرویزی ہیں جو اہل طریقت سے کمال محبت رکھتے ہیں اور ہر ایک کا احترام فرماتے ہیں بکثرت مشائخ سے ملاقات کی۔ مجھے اس شہر کے عام لوگوں کے اعتقاد اور وہاں کے علماء سے اچھی امید وابستہ ہے وہاں کا رہنے والا جو بھی ملتا ہے مجھے اس سے حسن عقیدت ہوتی ہے۔ یہ گروہِ مشائخ، منتشر اور مختلف شہروں میں اقامت پذیر ہے یہ طریقہ میرے نزدیک اچھا نہیں ہے کیونکہ یہ ایسے شہر کو چھوڑ کر چلے جاتے ہیں جو بزرگوں کی اقامت گاہ ہے۔ اب میں طریقت کے فرقوں اور ان کے مذاہب کا بیان شروع کرتا ہوں۔

اہل طریقت کے مذاہب اور ان میں امتیازی فرق

حضرت ابوالحسن نوری رحمتہ اللہ علیہ کے تذکرے میں پہلے بتا چکا ہوں کہ اہل طریقت کے بارہ مذہب ہیں جن میں سے دو مردود اور دس مقبول ہیں ان دسوں کے معاملات اور طریقت کے سلوک درست وعمدہ ہیں مشاہدات میں ان کے آداب لطیف و دقیق ہیں اگرچہ باہم معاملات و مجاہدات اور ان کی ریاضتوں میں اختلاف ہے تاہم توحید اور شریعت کے اصول و

فروع میں سب متفق ہیں۔ حضرت ابو یزید بسطامی رحمتہ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ ''اختلاف العلماء رحمۃ الا فی تجرید التوحید '' یعنی توحید خالص کے سوا ہر مسئلہ میں علماء کا اختلاف رحمت ہے۔ اس قول کے موافق ایک مشہور حدیث بھی ہے۔ اختیار مشائخ کے درمیان تصوف کی حقیقت، دو حصوں پر منقسم ہے ایک باعتبارِ حقیقت دوسرے باعتبارِ مجاز و رسوم۔ اب میں ان کے اقوال کو جو ان حصوں پر مشتمل ہیں بطریق ایجاز و اختصار بیان کرتا ہوں اور ہر مذہب کی اساس اور ان کی بنیاد کا تذکرہ کرتا ہوں تاکہ طالب کو ان کا علم ہو اور علماء کو علم کا مخزن ایک جگہ مل جائے اور یہ کہ مریدوں کی اصلاح محجوبوں کی فلاح اور دانشوروں کو مروت و تنبیہ ہو اور دونوں جہان میں میرے لئے اجر و ثواب کا سبب بنے۔ وباللہ التوفیق

(۱) فرقہ محاسبیہ

فرقہ محاسبیہ کی نسبت و عقیدت، حضرت ابو عبداللہ حارث بن اسد محاسبی رحمتہ اللہ علیہ سے ہے وہ اپنے زمانے میں مقبول النفس اور قاطع النفس تھے۔ آپ کا کلام توحید خالص کے حقائق اور اس کے فروع و اصول کے بیان میں ہے آپ کے تمام ظاہری و باطنی معاملات صحیح و درست تھے آپ کے مذہب کی خصوصیت یہ ہے کہ آپ رضائے الٰہی کو مقامات کے قبیل سے نہیں مانتے تھے بلکہ از قسم احوالِ طریقت سمجھتے تھے۔ طریقت میں یہ پہلا اختلاف ہے جو ان سے واقع ہوا اس پر علماء خراسان و عراق نے گرفت و مواخذہ کیا ان کا کہنا ہے کہ رضا طریقت کے ایک مقام کا نام ہے جو توکل کی آخری منزل ہے یہ اختلاف آج تک علماء کے درمیان موجود و برقرار ہے۔ اب میں اس قول کی کچھ تشریح کرتا ہوں۔

حقیقت رضا:

بیانِ مذہب اور وجہ اختلاف کے لئے ضروری ہے رضا کی حقیقت اور اس کے اقسام کی وضاحت کروں اس کے بعد حال و مقام کی حقیقت اور ان کا اختلاف ظاہر کروں جاننا چاہئے کہ رضا پر کتاب و سنت ناطق اور اس پر امت کا اجماع ثابت ہے چنانچہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے

"وَرَضُوْا عَنْهُ" (المجادلہ:۲۲) وہ اللہ سے راضی ہو گئے۔ نیز ارشاد باری ہے "لَقَدْ رَضِیَ اللّٰہُ عَنِ الْمُؤْمِنِیْنَ اِذْ یُبَایِعُوْنَكَ تَحْتَ الشَّجَرَةِ" (الفتح:۱۸) اللہ تعالیٰ ان مسلمانوں سے راضی ہو گیا جنہوں نے درخت کے نیچے آپ سے بیعت کی۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے "ذَاقَ طَعْمَ الْاِیْمَانِ مَنْ رَضِیَ بِاللّٰہِ رَبًّا" اس نے ایمان کا ذائقہ پالیا جو اللہ کے رب ہونے پر راضی ہو گیا۔

صورتِ رضا:

رضا کی دو صورتیں ہیں ایک یہ کہ اللہ تعالیٰ کا بندے سے راضی ہونا دوسری یہ کہ بندہ کا اللہ تعالیٰ سے راضی ہونا ہے لیکن خدا کے راضی ہونے کی حقیقت یہ ہے کہ وہ بندے کو ثواب و نعمت اور کرامت سے نوازے اور بندے کا خدا سے راضی ہونے کی حقیقت یہ ہے کہ اس کے فرمان پر عمل کرے اور اس کے حکم کے آگے سر تسلیم خم کر دے اور خدا کے معاملات میں چون و چرا نہ کرے اس لئے کہ رضائے بندہ، رضائے خدا پر موقوف ہے اسی پر اس کا قیام ہونا چاہئے۔

رضائے بندہ کا خلاصہ یہ ہے کہ منع و عطاء کی دونوں حالتوں میں اس کا دل یکساں رہے اور جلال و جمال کے نظارے میں اس کا باطن مضبوط و مستحکم رہے خواہ اسے منع سے روک دیا جائے یا عطا میں آگے بڑھایا جائے ہر حالت میں اس کا قیام مساوی ہو خواہ آتشِ جلال میں جلے یا لطف و جمال کے نور سے منور ہو، اس کے دل میں جلنا اور منور ہونا یکساں ہو کیونکہ اس کا ظہور حق تعالیٰ کی طرف سے ہے اس کی جانب سے جو بھی کچھ آئے اچھا ہی ہوتا ہے۔

امیر المومنین حضرت امام حسن بن علی رضی اللہ عنہما کے آگے حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ کا یہ قول رکھا گیا ہے کہ "الفقر احب الی من الغناء والسقم احب الی من الصحت" میرے نزدیک مفلسی تونگری سے اور بیماری صحت مندی سے زیادہ محبوب ہے۔ حضرت امام حسن رضی اللہ عنہ نے فرمایا "رحم اللہ اباذر اما انا اقوال من اشرف علی حسن اختیار اللہ لہٗ لم یتمن غیر ما اختار اللہ لہ" اللہ تعالیٰ ابوذر پر رحم فرمائے میں تو یہ کہتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ نے بندے کے لئے جو اختیار فرمایا ہے بندۂ خدا کے اختیار کردہ حالت

کے سوا کسی اور حالت کی آرزو نہ کرے اللہ تعالیٰ بندے کے لئے جو پسند فرمائے بندہ اسی کو چاہے۔ جب بندہ خدا کی رضا اور اختیار کو دیکھ لیتا ہے تو وہ اپنی مرضی واختیار سے منہ موڑ کر ہر غم وفکر سے نجات پا جاتا ہے۔ یہ معنی حالت غیبوبت میں ممکن نہیں اس کے لئے مشاہدہ درکار ہے۔ ''لان الرضا للاحزان نافیته وللغفلة غفلت معالجة شافیه'' رضا بندے کو غفلت سے چھڑاتی اور غموں کے پنجوں سے بچاتی ہے اور غیر کے اندیشے کو دل سے نکالتی اور تکلیفوں کی بندشوں سے نجات دیتی ہے کیونکہ رضا کی صفت ہی آزاد کرنا ہے۔

معاملاتِ رضا کی حقیقت:

معاملاتِ رضا کی حقیقت بندے کی پسندیدگی ہے کہ وہ یقین رکھے کہ منع وعطا اللہ تعالیٰ کے علم سے ہے اور وہ اعتقاد رکھے کہ اللہ تعالیٰ تمام حالات کا دیکھنے والا باخبر ہے۔ اس معنی کے حق میں علماء کے چار گروہ ہیں۔ ایک یہ کہ وہ خدا کی عطا پر راضی ہو یہ معرفت ہے، دوسرا یہ کہ وہ نعمتوں پر راضی ہو یہ دنیا کے اندر ہے، تیسرا یہ کہ مصائب وابتلا پر راضی رہے یہ مختلف الانواع مشقتیں ہیں، چوتھا یہ کہ برگزیدگی پر راضی ہو یہ محبت ہے لہٰذا وہ لوگ جو عطا کرنے والے کے جلوے کو اس کی عطا میں دیکھتے ہیں اور جان ودل سے قبول کرتے ہیں تو ان کا یہ قبول کرنا ان کے دل سے اس کی کلفت ومشقت کو دور کر دیتی ہے اور جو لوگ عطا کے ذریعہ، عطا کرنے والے کو دیکھتے ہیں وہ عطا ہی میں رہ جاتے ہیں وہ تکلف سے رضا کی راہ پر چلتے ہیں اور تکلف میں سراسر رنج ومشقت ہے معرفت اس وقت حقیقت ہوتی ہے جب بندہ حق کی معرفت میں مکاشف ومشاہد ہو اور جب اس کے لئے معرفت قید وحجاب ہو تو وہ معرفت نکرہ، وہ نعمت عذاب اور وہ عطا حجاب بن جاتا ہے۔

۲ لیکن وہ لوگ جو دنیا کے اندر نعمتوں کے ذریعہ اس سے راضی ہوں وہ ہلاکت ونقصان میں رہتے ہیں ایسی رضا، اسے دوزخ میں جھونک دیتی ہے اس لئے کہ جس کے دل میں حق تعالیٰ کی محبت ہوتی ہے اس کے لئے دنیاوی نعمتوں کی کوئی قدر وقیمت نہیں ہوتی اور نہ اس کے دل میں محرومی پر کوئی رنج وملال گزرتا ہے۔ نعمت تو اس وقت نعمت کہلاتی ہے جبکہ وہ نعمت دینے والے کی طرف

رہنمائی کرے لیکن جب وہ اسے منعم سے محجوب کردے تو ایسی نعمت سراپا آفت و بلا ہوتی ہے۔

۳۔ لیکن وہ لوگ جو ابتلا کے ذریعہ اس سے راضی ہوں وہ وہ ہیں جو بلا میں میلان کو دیکھتے اور مشقت کے ذریعہ مشاہدے کی طرف مائل ہوتے ہیں اس حالت میں ان کی تکلیف ان کو دوست کے مشاہدہ کی مسرت میں آزردہ نہیں کرتی۔

۴۔ لیکن وہ لوگ جو برگزیدگی کے ذریعہ اس سے راضی ہوں وہ اس کے محبوب ہوتے ہیں کیونکہ وہ حالت رضا میں بلا و سختی سے خالی ہوتے ہیں ان کے دلوں کی منزلیں صرف حق تعالیٰ ہی کی طرف ہوتی ہے ان کے سوا پردۂ اسرار بجز محبت کے گل و غنچہ کے کچھ نہیں ہوتا غائب ہوتے ہوئے بھی حاضر ہوتے ہیں، فرشی ہوتے ہوئے بھی عرشی ہوتے ہیں اور جسمانی ہوتے ہوئے بھی روحانی ہوتے ہیں یہ لوگ خالص موحد ربانی اور لوگوں سے دل برداشتہ ہوتے ہیں ان کے مقامات و احوال محفوظ، ان کا باطن خلق سے جدا، حق تعالیٰ کی محبت میں وارفتہ اور اس کے لطف و کرم کے انتظار میں رہتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

لَا يَمْلِكُوْنَ لِاَنْفُسِهِمْ ضَرًّا وَّلَا نَفْعًا وَّلَا يَمْلِكُوْنَ مَوْتًا وَّلَا حَيٰوةً وَّلَا نُشُوْرًا (الفرقان:۳)

وہ اپنی جانوں کے نفع و نقصان کے مالک نہیں ہوتے نہ موت و حیات اور مرنے کے بعد اٹھنے کے مالک ہوتے ہیں۔

لہٰذا غیر حق پر راضی ہونا نقصان کا موجب اور حق تعالیٰ سے راضی ہونا رضوان کا سبب ہے اس لئے کہ اللہ سے راضی ہونا صریحاً بادشاہت ہے اور اسی میں عافیت ہے۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:

مَنْ لَّمْ يَرْضَ بِاللّٰهِ وَبِقَضَائِهٖ شَغَلَ قَلْبَهٗ وَتَعِبَ بَدَنَهٗ

جو اللہ کی رضا اور اس کی قضا پر راضی نہ ہو اس نے اپنے دل کو تقدیر و اسباب میں مشغول کر کے بدن کو سختی میں ڈال دیا۔ واللہ اعلم

حضرت کلیم کی دعائے رضا:

احادیث میں وارد ہے کہ حضرت موسیٰ کلیم اللہ علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ سے دعا مانگی

کہ "اَللّٰهُمَّ دُلَّنِیْ عَلٰی عَمَلٍ اِذَا عَمِلْتُ رَضِیْتَ عَنِّیْ" اے میرے رب! مجھے ایسا عمل بتا جس پر میں عمل کروں تو مجھے تیری رضا حاصل ہو جائے؟ اللہ تعالیٰ نے فرمایا "لَا تُطِیْقُ ذَالِكَ یَا مُوْسٰی، فَخَرَّ مُوْسٰی عَلَیْهِ السَّلَامُ سَاجِدًا مُتَضَرِّعًا" اے موسیٰ یہ بات تمہاری قوتِ برداشت سے باہر ہے۔ یہ سن کر حضرت موسیٰ روتے ہوئے سجدے میں گر پڑے۔ چنانچہ وحی نازل فرمائی کہ "یَا ابْنَ عِمْرَانَ اِنَّ رِضَائِیْ فِیْ رِضَائِكَ بِقَضَائِیْ" اے فرزندِ عمران! میری رضا تو تمہارے اندر ہے تم کو چاہئے کہ قضا پر راضی رہو۔ مطلب یہ ہے کہ جب بندہ اللہ تعالیٰ کی قضا پر راضی رہے گا تو یہ اس کی دلیل ہے کہ حق تعالیٰ اس سے راضی ہے۔

زہد و رضا کے مابین فضیلت:

حضرت بشر حافی رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت فضیل بن عیاض رحمۃ اللہ علیہ سے دریافت کیا کہ زہد افضل ہے یا رضا؟ حضرت فضیل نے فرمایا:

الرضا افضل من الزهد لان	زہد سے رضا افضل ہے کیونکہ "راضی" اس
الارضى لايتمنى فوق منزله	سے اوپر کی منزل کی خواہش نہیں کرتا۔

مقصد یہ ہے کہ زہد کے اوپر اور بھی ایک منزل ہے جس کو حاصل کرنے کی زاہد تمنا کرتا ہے لیکن رضا کے اوپر کوئی منزل نہیں جس کی راضی تمنا کرے۔ اوپر کا درجہ نیچے کے درجہ سے افضل ہوتا ہے۔ یہ واقعہ حضرت محاسبی کے اس قول کی صحت پر دلالت کرتا ہے کہ رضا احوال کے قبیل سے ہے یہ کوئی شئے نہیں ہے جو مجاہدے اور کسب کے ذریعہ حاصل ہو جائے بلکہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے وہبی یعنی عطیہ اور بخشش کے طور پر حاصل ہوتی ہے نیز اس کا بھی احتمال ہے کہ راضی کو سرے سے تمنا ہی نہ ہو جیسا کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی ایک دعا میں فرمایا کہ "اسألك الرضا بعد القضا" میں تجھ سے دعا مانگتا ہوں کہ نزول قضا کے بعد مجھے راضی رکھنا۔ مطلب یہ ہے کہ مجھے ایسی صفت عطا فرما کہ جب تیری جانب سے قضا کا اترا ہو تو نزول قضا کے وقت تو مجھے راضی پائے۔ اس سے ثابت ہوتا ہے نزولِ قضا سے پہلے رضا درست نہیں

ہوتی اس لئے کہ یہاں رضا پر عزم ہوگا اور عزم رضا، عین رضا نہیں ہوتی۔

رضا کے بارے میں اقوالِ مشائخ:

حضرت ابوالعباس بن عطا فرماتے ہیں کہ "الرضا نظر القلب الی قدیم اختیار اللہ للعبد" بندے پر اللہ کے قدیم اختیار کی جانب دلی نگاہ کو رضا کہتے ہیں۔ مطلب یہ کہ بندے کو جو کچھ پہنچے اس پر وہ اعتقاد رکھے کہ یہ اللہ کے ارادہ قدیم اور حکم ازلی کی بنا پر ہے جو میرے لئے مقدر فرمایا ہے اس پر بندہ بے چین نہ ہو بلکہ خوش دل رہے۔

حضرت حارث محاسبی رحمۃ اللہ علیہ صاحب مذہب فرماتے ہیں کہ "الرضا سکون القلب تحت مجاری الاحکام" احکام الٰہی کے اجراء پر سکون قلب کا نام رضا ہے۔ اس مسئلہ میں حضرت محاسبی کا مسلک قوی ہے کیونکہ دل کا سکون و اطمینان بندے کے اختیاری عمل سے متعلق نہیں ہے بلکہ یہ وہبی اور اللہ تعالیٰ کی بخشش وعطا سے تعلق رکھتا ہے یہ بات اس کی دلیل ہے کہ رضا احوال کے قبیل سے ہے مقام سے اس کا تعلق نہیں ہے۔

اہل علم بیان کرتے ہیں کہ حضرت عتبۃ الغلام رات بھر نہیں سوئے اور دن چڑھے تک یہی کہتے رہے کہ "ان تعذبنی فانالك محب وان ترحمنی فانا لك محب" اگر تو مجھے دوزخ کے اندر عذاب میں ڈال دے یا اپنی رحمت کی چادر میں ڈھانپ لے! دونوں حالتوں میں میں تجھ سے محبت کرتا رہوں گا۔

مطلب یہ ہے کہ عذاب کی تکلیف اور نعمت اور لذت جسم پر ہوگی لیکن اگر محبت و دوستی میرے دل میں قائم رہے تو یہ عذاب میرے لئے نقصان رساں نہ ہوگا یہ بات بھی حضرت محاسبی کے مذہب ہی کی تائید کرتی ہے کیونکہ رضا محبت کا نتیجہ ہے اور محبت کرنے والا محبوب کے ہر فعل پر راضی رہتا ہے اگر وہ عذاب میں رکھے جب بھی دوستی سے محجوب نہیں ہوتا بلکہ خوش رہتا ہے اور اگر نعمت میں رکھے تب بھی دوستی سے محجوب نہیں ہوتا اور اپنی خواہش کو حق تعالیٰ کے اختیار کے مقابلہ میں دخل انداز نہیں کرتا۔

حضرت ابوعثمان حیری رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ "منذ اربعین سنتہ ما اقامنی اللہ

فی حال فکرھتہ وما نقلنی الی غیرہ وسخطتہ " چالیس سال گزر گئے ہیں اللہ تعالیٰ نے مجھے جس حال میں رکھا میں نے اسے ناپسند نہ کیا اور جس حال کی طرف بھی اس نے مجھے پھیرا میں نے اس سے ناراضگی ظاہر نہیں کی۔ یہ اشارہ دائمی رضا اور کمالِ محبت کی طرف ہے۔

حکایت:

مشہور واقعہ ہے کہ دجلہ میں ایک درویش پھنس گیا وہ تیرنا نہیں جانتا تھا کسی نے کنارے سے پکار کر کہا اے درویش اگر تم چاہو تو کسی کو بلاؤں تا کہ وہ تمہیں نکال لے؟ درویش نے کہا نہیں، اس شخص نے کہا کیا غرق ہونے کی خواہش ہے؟ درویش نے کہا نہیں، اس نے کہا پھر کیا چاہتے ہو؟ جواب دیا وہی چاہتا ہوں جو میرا رب میرے لئے چاہتا ہے۔

غرض کہ رضا کی تعریف و بیان میں مشائخ کا بہت اختلاف ہے لیکن اس باب میں دو بنیادی قاعدے ہیں جن کو بیان کر کے بحث کو مختصر کرتا ہوں مگر مناسب ہے کہ پہلے احوال و مقام کا فرق اور اس کے حدود ظاہر کر دوں تا کہ اس کے سمجھنے میں سب کو آسانی ہو اور اس کے حدود سے بھی واقفیت ہو جائے۔ انشاءاللہ

مقام و حال کا فرق

معلوم ہونا چاہئے کہ مقام و حال کے دونوں لفظ تمام مشائخ کے مابین مستعمل اور ان کی عبارتوں میں رائج اور محققین کے علوم و بیان میں متداول ہیں طالبانِ علمِ طریقت کے لئے ان کی واقفیت کے بغیر کوئی چارہ کار نہیں ہے۔

مقام کی تحقیق:

واضح ہو کہ مُقام، میم کے پیش سے بندے کا قیام اور میم کے زبر سے بندے کے جائے اقامت و قیام کے معنیٰ میں استعمال ہوتا ہے۔ لفظ مقام کے معنیٰ اور اس کی تفصیل کے لئے عربی زبان کے قواعد کا اعتبار و لحاظ کرنا سہو و غلط ہے چونکہ قواعدِ عربی میں لفظ مُقام، میم کے

پیش سے بمعنیٰ اقامت وجائے قیام کے ہیں اور بندے کا راہِ حق میں اقامت کے معنیٰ اس میں نہیں ہیں اسی طرح مَقام میم کے زبر سے قیام کے ہیں۔ بندے کا راہِ حق میں قیام کے معنیٰ اس میں نہیں ہے اور بندے کا اس مقام کے حق کو ادا کرنا اور اس کی رعایت کرنا تا کہ اس کے کمال تک وہ رسائی پائے جہاں تک بھی اس کی قدرت ہو جائز ہے البتہ یہ جائز نہیں ہے کہ اس مقام کا حق ادا کئے بغیر اس مقام سے گزر جائے مثلاً پہلا مقام توبہ ہے اس کے بعد انابت پھر زہد پھر توکّل وغیرہ وغیرہ۔

مطلب یہ ہے کہ یہ جائز نہیں ہے کہ بغیر توبہ کئے انابت میں پہنچ جائے یا بغیر انابت کے زہد حاصل کر لے یا بغیر زہد کے توکل مل جائے۔ اللہ تعالیٰ نے ہمیں جبریل علیہ السلام کے کلام میں تعلیم دی کہ ''**وما منا الا لہ مقام معلوم**'' یعنی ہم میں سے کوئی بھی ایسا نہیں جس کے لئے کوئی مقام معلوم نہ ہو۔

حال کی تحقیق:

حال اس معنیٰ کو کہتے ہیں جو حق تعالیٰ کی طرف سے بندے کے دل پر طاری ہو اور اسے وہ اپنے قدرت واختیار سے دور نہ کر سکتا ہو اور نہ کسی محنت ومجاہدے سے حاصل کر سکتا ہو مطلب یہ کہ جب دل میں آئے تو دور نہ کر سکے اور نہ آئے تو وہ لا نہ سکے لہٰذا بارگاہِ الٰہی میں ریاضت ومجاہدے کے ذریعہ، محل ریاضت اور اس کے درجہ میں طالب کی راہ اور اس کی جائے اقامت کا نام مقام ہے اور جو کیفیت بغیر ریاضت ومجاہدے کے دل پر وارد ہو وہ اللہ تعالیٰ کا لطف وفضل ہے اس کا نام حال ہے اسی لحاظ سے مقام اعمال کی قبیل سے ہے اور حال، اللہ تعالیٰ کی بخشش اور اس کی عطا کے زمرے میں ہے گویا مقام اول تا آخر کسبی ہے اور حال وہبی ہے لہٰذا صاحب مقام اپنے مجاہدے میں قائم اور صاحب حال، اپنے وجود میں فانی ہے اور وہ اس حال کے ساتھ قائم ہے جسے حق تعالیٰ نے اس کے دل میں پیدا فرمایا ہے۔ مشائخ کی ایک جماعت حال کے دوام کو جائز رکھتی ہے۔

......اور ایک جماعت دوام کو جائز نہیں رکھتی اس سلسلے میں ان کا اختلاف ہے چنانچہ

حضرت محاسبی رحمتہ اللہ علیہ کا مذہب حال کے دوام کا ہے وہ فرماتے ہیں کہ محبت وشوق اور قبض و بسط یعنی دل کی تنگی وکشادگی یہ سب احوال سے متعلق ہیں اگر اس میں دوام کو جائز نہ مانا جائے تو محبّ، محبت نہیں رہ سکتا، اور نہ مشتاق، مشتاق رہ سکتا ہے۔ جب تک حال بندے کی صفت نہ ہو تو اس کا وقوع بندے پر کس طرح ہو سکتا ہے؟ اسی بنا پر آپ رضا کو احوال کی قبیل سے شمار کرتے ہیں اور حضرت ابوعثمان حیری کے قول کا اشارہ بھی اسی طرف ہے کہ "چالیس (۴۰) برس گزر گئے ہیں اللہ تعالیٰ نے مجھے جس حال میں رکھا میں نے اسے ناپسند نہیں کیا۔"

مشائخ کی وہ دوسری جماعت جو حال کے دوام و بقا کو جائز نہیں مانتی، ان میں سے ایک حضرت جنید بغدادی رحمتہ اللہ علیہ ہیں۔ ان کا ارشاد ہے کہ:

الاحوال كالبروق وان يبقى فحديث النفس	احوال بجلی کوندنے کی مانند ہیں کہ جو ظاہر ہوتی اور ختم ہو جاتی ہے اور جو باقی رہتی ہے وہ حدیث نفس یعنی طبعی تخلیق ہے۔

ایک جماعت نے اس کی نسبت یہ کہا کہ:

الاحوال كاسمها يعنى انها كما تحل في القلب تزول	احوال کی کیفیت اپنے نام ہی کی مانند ہے یعنی جس طرح دل میں آتا ہے اسی طرح دوسرے وقت دل سے زائل ہو جاتا ہے۔

اور جو کیفیت باقی و برقرار رہتی ہے اس کو صفت کہتے ہیں اور صفت کا قیام موصوف کے ساتھ ہوتا ہے۔ ورنہ لازم آئے گا کہ موصوف اپنی صفت میں کامل ہو، یہ محال ہے۔

میں نے حال اور مقام کا یہ فرق اس لئے واضح کر کے بیان کیا ہے کہ اس کتاب میں جہاں کہیں بھی مشائخ کے اقوال میں حال و مقام کا ذکر آئے تو جان سکو کہ اس سے کیا مراد ہے؟ مختصراً اتنا یاد رکھو کہ رضا مقامات کی انتہا اور احوال کی ابتداء ہے اور یہ مقام ایسا ہے جس کا ایک کنارہ ریاضت و مجاہدے کی طرف ہے اور دوسرا کنارہ محبت واشتیاق کی سمت! اس سے اوپر اور کوئی مقام نہیں ہے اور تمام مجاہدے اسی پر ختم ہو جاتے ہیں۔ اس کی ابتدا کسبی ہے اور اس کی انتہا

وہبی۔ البتہ اس کا امکان ہے کہ جس نے اپنی رضا کی ابتدا، اپنے ساتھ دیکھی اس نے کہہ دیا کہ یہ مقام ہے اور جس نے اپنے رضا کی انتہا، حق کے ساتھ دیکھی اس نے کہہ دیا کہ یہ حال ہے۔ تصوف میں حضرت محاسبی کے مذہب کا معاملہ یہ ہے۔ بایں ہمہ تصوف کے معاملات میں انہوں نے کوئی اختلاف نہیں کیا۔ البتہ انہوں نے اپنے مریدوں کو ایسی عبارات اور معاملات میں زجر و توبیخ فرمائی ہے جس میں کسی قسم کا ابہام و خطا ہو اگر چہ وہ اصل میں درست ہی کیوں نہ ہو۔

جیسے ایک دن حضرت ابو حمزہ بغدادی رحمتہ اللہ علیہ جو حضرت محاسبی کے مرید تھے ان کے پاس آئے چونکہ وہ صاحب حال اور صاحب سماع تھے اور حضرت حارث محاسبی کے یہاں ایک مرغ تھا جو بانگ دیا کرتا تھا، اتفاق سے مرغ نے اس وقت بانگ دینی شروع کر دی۔ اسی بانگ پر حضرت حمزہ نے نعرہ مارا۔ حضرت محاسبی خنجر لے کر اٹھ کھڑے ہوئے اور فرمایا ''کفرت'' تو نے کفر کیا اور حضرت حمزہ کو مار ڈالنے کے لئے بڑھے۔ دیگر مریدین حضرت شیخ کے قدموں میں گر پڑے اور بمشکل انہیں باز رکھا۔ اس کے بعد انہوں نے ابو حمزہ سے فرمایا ''اسلم یا مطرود'' او مردود اسلام قبول کر۔ (جب معاملہ رفت گزشت ہو گیا) تو مریدوں نے عرض کیا کہ اے شیخ! جبکہ ہم آپ سب، ابو حمزہ کو مخصوص اولیا اور توحید پر استقامت رکھنے والوں میں سے جانتے ہیں تو آپ کو ان پر کیوں شک و تردّد ہوا؟ حضرت محاسبی نے فرمایا مجھے اس کے ایمان پر کوئی شک تردد نہیں ہوا یقیناً میں اسے مشاہدۂ حق اور دل سے توحید میں مستغرق جانتا ہوں لیکن ہم اسے ایسا کرنے کی کیسے اجازت دے سکتے ہیں جیسے حلولیوں کا وطیرہ اور ان کے کردار کا شعار ہے مرغ ایک بے عقل جانور ہے وہ اپنی عادت کے مطابق بانگ دیتا ہے اسے حق تعالیٰ کے ساتھ ہم کلامی کیسے ہو گئی۔ یہ بات حق تعالیٰ کے شایانِ شان بھی نہیں۔ وہ تجزی سے پاک ہے اور اس میں بھی شبہ نہیں کہ اللہ تعالیٰ کے دوستوں کا ہر وقت اور ان کا ہر حال حق کے ساتھ ہے اور ان کا ہر لحہ خدا کے شایان شان سلام و کلام کے بغیر آرام و چین سے نہیں گزرتا اس کے باوجود کسی چیز میں اس کا حلول و نزول بھی جائز نہیں ہے اور نہ قدیم پر اتحاد و امتزاج اور ترکیب جائز ہے۔ حضرت ابو حمزہ نے جس وقت مرشد کی بالغ نظری کو دیکھا عرض

کرنے لگے اے شیخ! اگر چہ میں اصل کے اعتبار سے راستی پر تھا لیکن چونکہ میرا یہ فعل ایسی قوم کے مشابہ بن گیا تھا جو حلولی اور گمراہی میں مبتلا ہیں۔ میں رجوع و توبہ کرتا ہوں۔

چونکہ میرا مقصود اختصار ہے اسی پر اکتفا کرتا ہوں۔ بلاشبہ ان کا یہ طریق سلامتی اور حفاظت کی راہ میں صحت کمال کے باوجود بہت پسندیدہ اور لائق تعریف ہے۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:

مَنْ كَانَ مِنْكُمْ يُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ فَلَا يَقِفَنَّ مَوَاقِفَ التُّهَمِ　تم میں جو اللہ اور قیامت پر ایمان رکھتا وہ تہمت کی جگہوں پر ہرگز کھڑا نہ ہو۔

حضور سیدنا داتا گنج بخش رحمتہ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ میں اللہ تعالیٰ سے ہمیشہ یہی دعا کرتا ہوں کہ مجھے بھی اللہ ایسی ہی توفیق نصیب فرمائے اور آج کل کے رسمی پیروں فقیروں کی صحبت سے بچائے یہ لوگ ایسے نہیں جن کی ریا و معصیت میں اگر موفقت نہ کی جائے تو دشمن ہو جاتے ہیں۔ نعوذ باللہ من الجہل۔ واللہ اعلم بالصواب

(۲) فرقہ قصاری

قصاری فرقہ کے پیشوا، حضرت ابو صالح بن حمدون بن احمد بن عمارہ قصار رحمتہ اللہ علیہ ہیں جو اکابر علماء اور ساداتِ طریقت میں سے ہیں ان کا مسلک و مشرب، ملامت کی نشر و اشاعت ہے۔ فنونِ معاملات میں ان کا کلام بلند و بالا ہے وہ فرماتے ہیں کہ لوگوں کو جتانے کے مقابلہ میں تمہارا علم اللہ تعالیٰ کے متعلق بہت بہتر سے بہتر ہونا چاہئے مطلب یہ ہے کہ خلوت میں اللہ تعالیٰ کے ساتھ تمہارا معاملہ اس سے بہتر ہونا چاہئے جو تم لوگوں کے ساتھ ظاہر میں کرتے ہو اس لئے کہ راہِ حق میں سب سے بڑا حجاب یہ ہے کہ تمہارا دل لوگوں کے ساتھ مشغول ہو۔ ملامتی مشرب کے بارے میں شروع کتاب میں بہت کچھ لکھ چکا ہوں۔ مختصراً یہ کہ:

حکایت:

حضرت ابو صالح بیان کرتے ہیں کہ ایک مرتبہ میں نیشاپور میں نہر حیرہ کے کنارے جا

رہا تھا وہاں ایک شخص نوح نامی جس کی جوانمردی نیشاپور میں مشہور تھی، راستے میں ملا میں نے اس سے پوچھا کہ اے نوح! جوانمردی کیا چیز ہے؟ اس نے کہا آپ میری جوانمردی کے بارے میں دریافت کرتے ہیں یا اپنی جوانمردی کے بارے میں؟ میں نے کہا دونوں کے بارے میں۔ اس نے کہا میری جوانمردی تو یہ ہے کہ میں نے قبا کو اتار کر گدڑی پہن لی ہے اور ایسا معاملہ کرنے لگا ہوں جس سے صوفی بن جاؤں خدا سے حیاء کرتا ہوں اور اس لباس میں معصیت سے پرہیز کرتا ہوں اور آپ کی جوانمردی یہ ہے کہ آپ اس گدڑی کو اتار ڈالیں تا کہ آپ سے لوگ فتنہ میں مبتلا نہ ہوں لہٰذا میری جوانمردی ظاہر شریعت کی حفاظت میں ہے اور آپ کی جوانمردی، باطنی حقیقت کی حفاظت میں ہے۔ یہ اصل بڑی قوی ہے۔ واللہ اعلم

(۳) فرقہ طیفوریہ

طیفوری فرقہ کے پیشوا، حضرت ابو یزید طیفور بن عیسیٰ بن سروشاں بسطامی رحمتہ اللہ علیہ ہیں جو اکابر اور سادات صوفیا میں سے ہیں۔ یہ صاحب غلبہ اور صاحب سکر تھے شوق الٰہی کا غلبہ، سکر اور محبت۔ انسان کی محبت کسی جنس سے نہیں ہے بلکہ یہ انسان کے کسب و اختیار کے احاطہ سے باہر ہے جو اس کا دعویٰ کرے وہ باطل ہے اور ایسوں کی تقلید محال ہے لہٰذا کسی صحت مند کے لئے سکر یعنی مدہوشی صفت نہیں ہو سکتی۔ لامحالہ آدمی، سکر کو اپنی طرف لانے کی قدرت نہیں رکھتا بلکہ وہ خود سکر کے ہاتھوں مغلوب ہو جاتا ہے۔ نہ وہ لوگوں کی طرف متوجہ ہوتا ہے نہ اس سے تکلف کی کوئی صفت ظاہر ہوتی ہے۔ اس بارے میں مشائخ کا مسلک یہ ہے کہ صاحب استقامت ہی کی پیروی اور تقلید کی جائے گردشِ احوال کی اقتداء درست نہیں ہوتی اگرچہ مشائخ کی ایک جماعت اسے جائز رکھتی ہے کہ آدمی اپنے اختیار سے غلبہ و سکر کی راہ اختیار کر سکتا ہے کیونکہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:

اِبْكُوْا فَاِنْ لَّمْ تَبْكُوْا فَتَبَاكُوْا (ابن ماجہ)

تضرع وزاری کرو اگر نہ کرسکو تو رونے کی سی صورت بنالو

اس کی دو صورتیں ہیں ایک تو یہ کہ ریاکاروں کی مانند خود کو بھی ویسا ہی بنالو یہ شرک صریح ہے۔ دوسری یہ کہ خود کو ویسا بنالو تاکہ حق تعالیٰ اس بناوٹ کو حقیقت کے اس درجہ کے مطابق بنادے جو اہل حقیقت کا ہے تاکہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے اس فرمان کے موافق بن جاؤ "مَنْ تَشَبَّهَ بِقَوْمٍ فَهُوَ مِنْهُمْ" (ابوداؤد) جس نے جس قوم کی مشابہت کی وہ اسی میں سے ہے لہٰذا اقسام مجاہدے میں سے جس قدر ہوسکے اسے تو کرتا رہے اس کے بعد وہ خدا سے امیدوار رہے کہ اس پر اس کے معنی حقیقت کو کھول دے ایک بزرگ فرماتے ہیں کہ "المشاهدات مواريث المجاهدات" مجاہدوں سے مشاہدے حاصل ہوتے ہیں۔

حضور سیدنا داتا گنج بخش رحمتہ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ مجاہدے ہر لحاظ سے عمدہ اور بہتر ہیں لیکن سکر و غلبہ انسان کے کسب و اختیار میں نہیں ہیں کہ وہ مجاہدوں سے اسے حاصل کر سکے اور حصولِ سکر کے لئے عین مجاہدات بھی علت و سبب نہیں ہیں۔ مجاہدے صحت مندی کی حالت ہی میں ممکن ہیں اور کوئی صحت مند سکر کی حالت کو قبول نہیں کر سکتا کیونکہ یہ محالِ عادی ہے اب میں سکر و صحو کو اور اس میں اختلاف اقوال کو بیان کرتا ہوں تاکہ مشکلات دور ہو جائیں۔ انشا اللہ تعالیٰ۔

سکر و صحو کی بحث

واضح رہنا چاہئے کہ ارباب معانی نے سکر و غلبہ (مدہوشی) سے غلبہ محبت الٰہی اور صحو (صحت مندی) سے حصول مقصد مراد لئے ہیں۔ اس مسئلہ میں اہل معانی کا بہت اختلاف ہے چنانچہ ایک جماعت، سکر کو صحو پر فضیلت دیتی ہے اور ایک جماعت صحو کو سکر پر برتری دیتی ہے۔ پہلی جماعت جو سکر کو صحو پر فضیلت دیتی ہے ان میں حضرت ابو یزید بسطامی اور ان کے متبعین ہیں ان کا کہنا ہے کہ صحو آدمیت کی صفت پر اعتدال و استقامت کی شکل بناتی ہے اور یہ مشاہدہ حق میں بہت بڑا حجاب ہے اور سکر آفت کے زائل ہونے، صفاتِ بشریت کے فنا کرنے، تدبیر و اختیار کے نیست و نابود ہونے اور معنوی بقا اور حق تعالیٰ کے افعال میں بندے کے تصرفات کے

فنا ہونے اور اس قوت کے فنا ہونے سے جو بندے میں اس کی جنس کے خلاف ہے حاصل ہوتا ہے یہ حالت سکر، بمقابلہ صحو ابلغ واتم اور زیادہ مکمل ہے چنانچہ حالت صحو میں جب حضرت داؤد علیہ السلام سے وہ فعل صادر ہوا جس کا ذکر اللہ تعالیٰ نے فرمایا تو ان کے اس فعل کی نسبت انہیں کی طرف فرمائی جیسا کہ فرمایا ''وَقَتَلَ دَاوٗدُ جَالُوْتَ'' (البقرہ:۲۵۱) حضرت داؤد علیہ السلام نے جالوت کو قتل کیا اور ہمارے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم چونکہ حالت سکر (یعنی فنائی الذات) پر فائز تھے تو آپ سے جب فعل وجود میں آیا تو اللہ تعالیٰ نے اس فعل کی نسبت اپنی طرف فرمائی جیسا کہ فرمایا ''وَمَا رَمَیْتَ اِذْ رَمَیْتَ وَلٰکِنَّ اللّٰہَ رَمٰی'' (الانفال:۱۷) آپ نے وہ مشتِ خاک نہیں پھینکی بلکہ اللہ نے پھینکی ہے۔ ''**فبعد مابین عبد و معبودیته**'' لہٰذا بندے اور بندگی کے درمیان بڑا فاصلہ ہے۔ جو از خود قائم اور اپنی صفات میں ثابت و برقرار ہے۔ اللہ تعالیٰ نے تو فرمایا ہے ''تو نے کیا'' اگرچہ اس میں بھی ان کی بزرگی اور کرامت کا اظہار ہے لیکن وہ ذات جو حق کے ساتھ قائم ہے اور اپنی صفات میں فانی ہے اسے یوں فرمایا کہ ''جو کچھ تم نے کیا وہ ہم نے کیا'' لہٰذا بندے کے فعل کی نسبت حق تعالیٰ کے ساتھ ہونا اس سے افضل و بہتر ہے جس میں حق تعالیٰ کے فعل کی نسبت بندے کی طرف کی جائے۔ جب فعل الٰہی کی نسبت بندے کی طرف ہوتی ہے تو بندہ اپنے وجود سے قائم ہوتا ہے اور جب بندے کے فعل کی نسبت حق تعالیٰ کے ساتھ ہو تو وہ حق کے ساتھ قائم و باقی رہتا ہے جب بندہ اپنے وجود میں ثابت و برقرار ہوتا ہے تو بندہ حضرت داؤد علیہ السلام کے زیرِ قدم نظر آتا ہے اور بسا اوقات ایسی حالت میں اس کی نظر نامناسب مقام پر بھی پڑ جاتی ہے جیسے کہ حضرت داؤد علیہ السلام کی نظر اور یا عورت پر پڑی اور جو دیکھا سو دیکھا، اور جب بندہ حق کے ساتھ قائم ہو جائے جیسے کہ ہمارے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ہیں تو اس کی نظر کا یہ عالم ہو جاتا ہے کہ جب اس کی نظر جنس عورت پر ہی پڑتی ہے تو حضرت زید رضی اللہ عنہ کی بیوی، خود زید پر حرام ہو جاتی ہے۔ اس کی وجہ یہی ہے کہ حضرت داؤد علیہ السلام اور حضرت زید رضی اللہ تعالیٰ عنہ محل صحو (ہوش و اختیار) میں تھے اور ہمارے حضور صلی اللہ علیہ وسلم محل سکر میں۔

اور وہ جماعت جو صحو کو سکر پر فضیلت دیتی ہے ان میں حضرت جنید بغدادی رحمتہ اللہ علیہ اور ان کے تابعین ہیں۔ ان کا کہنا یہ ہے کہ سکر محل آفت ہے اس لئے کہ سکر میں احوال پراگندہ، صحت و ہوش مفقود اور بندے کے تمام علائق گم ہوتے ہیں اور جب بندہ تمام قواعد معانی کا طالب ہو خواہ صورتِ فنا میں یا حالت بقا میں، خواہ نابود ہونے کی صورت میں یا اثبات کی شکل میں! اگر بندہ صحیح الحال نہ ہوگا تو تحقیق کا فائدہ کیسے حاصل کر سکے گا اس لئے کہ اہل حق کا دل ہر موجود مخلوق سے خالی ہونا چاہئے اور بینائی کی بنیاد، قیدِ اشیاء میں کبھی چین نہیں پاتی اور اس کی آفت ہرگز زائل نہیں ہوتی۔ لوگ حق تعالیٰ کے مشاہدے سے اسی لئے محروم رہ جاتے ہیں کہ وہ حق تعالیٰ کے سوا چیزوں کو جیسی کہ وہ ہیں کہ وہ ناپید و فنا ہونے والی ہیں، نہیں دیکھ پاتے اور وہ اس میں پھنسے رہتے ہیں۔

صحیح طور پر اشیاء کا دیکھنا دو طرح پر ہے دیکھنے والی چیزوں کو یا تو بقا کی نظر سے دیکھے یا پھر فنا کی نظر سے؟ اگر وہ بقا کی نظر سے دیکھے گا تو ان تمام چیزوں کو اپنے وجود میں ناقص پائے گا کیونکہ وہ چیزوں کو ان کی موجودہ حالت میں اپنے وجود کے ساتھ باقی دیکھے گا۔ اور اگر وہ فنا کی نظر سے دیکھے گا تو وہ تمام چیزوں کو حق تعالیٰ کی بقا کے پہلو میں فانی اور ناپید دیکھے گا۔ یہ دونوں کیفیتیں، موجودات سے، دیکھنے والے کا منہ پھیر دیتی ہیں۔ اسی لئے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے بحالتِ دعا یہ فرمایا کہ ''اَللّٰھُمَّ اَرِنَا الْاَشْیَاءَ کَمَاھِیَ '' اے خدا مجھے اشیاء کی حقیقت جیسی کہ وہ ہیں دکھا۔ یہ اس لئے کہ جس نے اشیاء کو ان کی حقیقت کے ساتھ دیکھا وہ آسودہ رہا۔ اسی معنی میں حق تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے کہ ''فَاعْتَبِرُوْا یٰاُولِی الْاَبْصَارِ '' (الحشر:۲) اے دیکھنے والے صاحب بصیرت، بہ نگاہِ عبرت دیکھ۔ بندہ جب تک دیکھے گا نہیں تو وہ عبرت کیسے حاصل کر سکے گا۔ اس لئے یہ باتیں حالت صحو (ہوش و اختیار) کے سوا کیسے درست ہو سکتی ہیں۔ اہل سکر کی ان معانی تک کیسے رسائی ممکن ہے؟ چنانچہ حضرت موسیٰ علیہ السلام سکر کی حالت میں تھے۔ وہ ایک تجلی ربانی کو برداشت نہ کر سکے۔ ہوش جاتے رہے جیسا کہ حق تعالیٰ نے فرمایا ہے ''وَخَرَّ مُوْسٰی صَعِقًا '' (الاعراف:۱۴۳) موسیٰ علیہ السلام چیخ مار کر زمین پر گر پڑے اور

ہمارے رسول مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی حالت صحو کی تھی اس لئے مکہ مکرمہ سے "قَابَ قَوْسَیْنِ اَوْ اَدْنٰی" (النجم:۹) تک عین تجلی ربانی میں، بیدار اور ہوشیار رہے۔

شربت الراح کأسا بعد کأسٍ

فما نفد الشراب وَمَا رَوِیت

میں نے شرابِ راحت، پیالے بھر بھر کے پیے

لیکن شراب نے مجھ پر نہ اثر کیا اور نہ میں اس سے سیراب ہی ہو سکا

میرے شیخ و مرشد نے فرمایا جو جنیدی مشرب کے تھے کہ سکر بچوں کے کھیل کا میدان ہے اور صحو، مردانِ خدا کے فنا کا میدان۔

حضور سیدنا داتا گنج بخش رحمتہ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ میں اپنے شیخ و مرشد کی متابعت اور ان کی موافقت میں کہتا ہوں کہ صاحب سکر کے حال کا کمال صحو ہے اور صحو کا ادنیٰ درجہ یہ ہے کہ وہ بشری حالت میں دیدار سے محروم رہ جائے۔ لہٰذا ایسا صحو جو یہ آفت برپا نہ کرے اس سکر سے بہتر ہے جو سراسر آفت ہے۔

حضرت ابو عثمان مغربی رحمتہ اللہ علیہ کے واقعات میں مذکور ہے کہ انہوں نے ابتدائے احوال میں جنگلوں میں بیس سال تک ایسی گوشہ نشینی کی زندگی بسر کی کہ کسی آدمی کی بو تک نہ سونگھی۔ یہاں تک کہ ریاضت و مجاہدے نے چہرے پر جھریاں اور آنکھوں میں حلقے ڈال دیئے بیس سال کے بعد صحبت و جلوت کا فرمان ہوا۔ اس وقت انہوں نے دل میں سوچا کہ پہلے اہل اللہ اور خانہ کعبہ کے ہم نشینوں کے ساتھ ہم نشینی کرنا مبارک رہے گا چنانچہ مکہ مکرمہ کا قصد کر کے چل دیئے۔ ادھر اولیاء کرام کے دلوں میں الہام ہو چکا تھا کہ حضرت ابو عثمان آ رہے ہیں تو وہ سب ان کے استقبال کے لئے باہر آ گئے۔ انہوں نے ان کو اس حال میں پایا کہ بینائی پتھرا چکی تھی اور سوائے زندگی کے رمق کے ان کے جسم میں کچھ نہ تھا۔ یہ حال دیکھ کر کہنے لگے کہ اے ابو عثمان! آپ نے زندگی کے بیس سال اس شان سے گزارے کہ تمام لوگ آپ کے زندہ ہونے ہی سے مایوس ہو چکے تھے ہمیں بتایئے آپ نے ایسا کیوں کیا؟ اور آپ نے کیا دیکھا؟

اور کیا پایا؟ اور کیوں واپس آئے؟ حضرت ابوعثمان نے فرمایا میں بحالت سکر گیا، سکر کی آفت دیکھی، مایوسی کو پایا اور عاجزی سے واپس آیا۔ تمام مشائخ نے بیک زبان کہا اب آپ کے بعد صحو وسکر کی تعبیر، ہر تعریف کرنے والے پر حرام ہے کیونکہ انہوں نے تشریح وتعبیر کا حق ادا کیا اور سکر کی آفت کو ظاہر فرما دیا۔

غرضیکہ سکر، بقائے صفت کا عین اور فنائے صفت کا گمان ہے اور یہ سراپا حجاب ہے اور صحو فنائے صفت میں مکمل مشاہدہ کی بقا ہے اور یہ عین کشف ومشاہدہ ہے۔ اگر کسی کی یہ صورت ہو کہ صحو کے مقابلہ میں سکر فنا سے زیادہ نزدیک ہو تو یہ محال ہے کیونکہ سکر ایسی صفت ہے جو صحو پر زیادہ ہے اور جب تک بندے میں ایسی صفات کا اضافہ ہوتا رہے وہ اس وقت تک بے خبر رہتا ہے اور جب بندے میں یہ صفات کم ہونے لگیں اس وقت طالب کو امید ہو سکتی ہے کہ مشاہدہ ہو۔ صحو وسکر کی تعریف میں یہ انتہائی حالت کا بیان ہے۔

حکایت:

حضرت بایزید بسطامی رحمتہ اللہ علیہ جو مغلوب الحال تھے ان کا واقعہ ہے کہ حضرت یحییٰ بن معاذ نے ان کے نام ایک خط بھیجا جس میں دریافت کیا کہ آپ اس شخص کے بارے میں کیا فرماتے ہیں جس نے دریائے محبت سے ایک قطرہ پیا اور مست ہو گیا؟ حضرت بایزید نے جواب میں تحریر فرمایا آپ اس شخص کے بارے میں کیا فرماتے ہیں کہ اگر سارے جہان کے دریا، محبت کی شراب بن جائیں اور وہ شخص ان سب کو پی جائے پھر بھی وہ سیراب نہ ہو اور پیاسا ہی رہ جائے؟ لوگوں نے اس سے یہ سمجھا کہ حضرت یحییٰ نے سکر کی طرف اشارہ فرمایا تھا اور حضرت بایزید نے صحو کی طرف اشارہ فرمایا حالانکہ واقعہ اس کے برعکس ہے یعنی صاحب صحو وہ ہوتا ہے جو ایک قطرہ کی بھی برداشت نہ رکھے اور صاحب سکر وہ ہوتا ہے جو مستی میں سب کچھ پی کر بھی پیاسا رہتا ہے۔ اس لئے کہ شراب محبت، مستی کا سرچشمہ ہے۔ جنس کے لئے ہم جنسی ہی بہتر ہوتی ہے۔ صحو چونکہ اس کی ضد ہے اس لئے وہ شراب سے راحت نہیں پاتا (بلکہ اس کے لئے شربت وصال اور دیدار ومشاہدہ موجب راحت ہوتا ہے۔ مترجم)

سکر کے اقسام:

سکر کی دو قسمیں ہیں ایک شراب مودّت سے دوسرے جام محبت سے۔ سکرِ مودت معلول ہے یعنی وہ سب کے ساتھ ہے کیونکہ مدہوشی اور مستی، نعمت کے دیدار سے پیدا ہوتی ہے اور سکرِ محبت غیر معلول یعنی بے علت وسبب ہے کیونکہ یہ مستی، منعم یعنی حق تعالیٰ کے دیدار سے پیدا ہوتی ہے لہٰذا جس نے نعمت کو دیکھا گویا اس نے خود کو دیکھ لیا اور جس نے منعم کو دیکھا اس نے اپنے آپ کو نہیں دیکھا۔ اگرچہ وہ حالتِ سکر میں ہے لیکن اس کا یہ سکر، صحو ہے۔

صحو کی اقسام:

اسی طرح صحو کی بھی دو قسمیں ہیں ایک صحو بر غفلت، دوسرا صحو بر محبت، صحو بر غفلت بہت بڑا حجاب ہے اور صحو بر محبت، روشن و واضح کشف و مشاہدہ ہے۔ لہٰذا جو غفلت پر ہوتا ہے اگرچہ وہ صحو و ہوشمند ہے مگر سکر و مدہوش ہے اور جو محبت میں واصل بحق ہو جائے اگرچہ وہ سکر و مدہوشی میں ہو مگر وہ صحو و ہوشمند ہے اور جب اصل و بنیاد، مضبوط و مستحکم ہوتی ہے تو صحو سکر کی مانند اور سکر صحو کی مانند ہوتی ہے اور جب اصل و بنیاد، درست و صحیح نہ ہو تو دونوں بے فائدہ اور بے کار ہیں۔

خلاصہ یہ ہے کہ مردانِ خدا کی جائے اقامت میں صحو و سکر اختلاف سبب کی وجہ سے معلول ہوتا ہے لیکن جب سلطانِ حقیقت اللہ رب العزت اپنا جمال دکھادے تو صحو و سکر دونوں طفیلی رہ جاتے ہیں۔ اس لئے کہ ان دونوں کے کنارے اور سرحدیں ایک دوسرے سے ملی ہوئی ہیں اور ایک کی انتہا میں دوسرے کی ابتداء شامل ہے۔ ابتداء و انتہا سوائے تفرقہ کے کچھ نہیں ہے۔ چونکہ ان کی نسبت تفرقہ سے ہے اس لئے حکم میں دونوں برابر ہیں، اور دو نفی کے جمع کرنے سے تفرقہ ہی ہوگا۔ اسی مفہوم میں یہ شعر کہا گیا ہے:

اذا طلع الصباح بنجم راح
تساوی فیہ سکران وصاح

"جب دیدارِ حق کی صبح دل کو خوش کرنے والے تاروں کے ساتھ طلوع ہوتی ہے تو اس میں مست و ہوشیار دونوں برابر ہوتے ہیں۔"

حکایت:

سرخس میں دو بزرگ رہتے تھے ایک کا نام لقمان اور دوسرے کا نام ابوالفضل حسن تھا۔ ایک دن لقمان، ابوالفضل کے پاس آئے۔ ابوالفضل کے ہاتھ میں کتاب دیکھ کر کہا اے ابو الفضل! کتاب میں کیا تلاش کر رہے ہو؟ انہوں نے جواب دیا اسے تلاش کر رہا ہوں جسے تم اس کو چھوڑ کر تلاش کر رہے ہو۔ لقمان نے کہا یہ خلاف کیوں ہے؟ ابوالفضل نے جواب دیا خلاف تو تم کر رہے ہو اور مجھ سے دریافت کرتے ہو کہ کیا تلاش کر رہے؟ لہٰذا مستی سے ہوشیار بنو اور ہوشیاری سے بیدار ہو تا کہ تم سے خلاف اٹھ جائے اور جان سکو کہ ہم اور تم کسے تلاش کر رہے ہیں۔

مذکورہ بحث سے تم نے اندازہ لگا لیا ہوگا کہ طیفوریوں کا جنیدیوں سے کتنا اختلاف ہے۔ تصوف کے معاملات میں ان کا مذہب مطلقاً ترکِ صحبت اور عزلت نشینی اختیار کرنا ہے اور وہ اپنے مریدوں کو اسی کی تلقین کیا کرتے تھے۔ اگر یہ میسر آ جائے تو یہ طریقہ محمود اور سیرت لائق ستائش ہے۔

(۴) فرقہ جنیدیہ

فرقہ جنیدیہ کے پیشوا، حضرت ابوالقاسم جنید بن محمد بغدادی رحمتہ اللہ علیہ ہیں جن کو اپنے زمانہ میں "طاؤس العلماء" کہا جاتا تھا۔ وہ مشائخ کے سردار اور امام الائمہ تھے۔ ان کا طریقہ، طیفوری مذہب کے برعکس صحو پر مبنی ہے جس کی تفصیل گزر چکی ہے۔ جنیدی مسلک و مشرب، تمام مذاہب میں سب سے زیادہ مشہور اور معروف ہے۔ اکثر و بیشتر مشائخ جنیدی مسلک پر ہوئے ہیں۔ ماسوا اس کے طریقت کے معاملات میں ان کے اختلاف اور یہی بہت سے ہیں لیکن میں نے اختصار کے پیشِ نظر اسی پر اکتفا کر کے انہیں چھوڑ دیا ہے۔ وباللہ التوفیق۔

حکایت:

حضرت حسین بن منصور حلاج رحمتہ اللہ علیہ اپنے غلبہ حال میں جب حضرت عمرو بن عثمان سے جدا ہو کر حضرت جنید کے پاس آئے تو آپ نے فرمایا کیوں آئے ہو؟ عرض کیا اس لئے کہ شیخ کی صحبت میں رہوں۔ آپ نے فرمایا مجھے مجنونوں کی صحبت درکار نہیں ہے کیونکہ صحبت کے لئے صحت چاہئے۔ جب تم آفت کی موجودگی میں میرے قریب رہو گے تو ایسا ہی ہو گا جیسے تم نے حضرت عبداللہ تستری اور عمرو کے ساتھ رہ کر کیا اور پھر جدا ہو کر چلے آئے۔ حضرت حلاج نے عرض کیا ''ایھا الشیخ الصحوو سکر صفتان للعبد وما دام العبد محجوبا عن ربه حتٰی فنٰی اوصافهٗ'' اے شیخ! صحو و سکر تو بندے کی صفتیں ہیں اور یہ بندے کے ساتھ اس وقت تک پیوست ہیں جب تک وہ اپنے رب سے محجوب ہے حتیٰ کہ اس کی تمام صفات فنا نہ ہو جائیں۔ اس کے جواب میں حضرت جنید نے فرمایا ''یا ابن المنصور اخطأت فی الصحو والسکر لان الصحو بلا خلاف عبارۃ عن صحته حال العبد مع الحق، وذالك لا یدخل تحت صفته العبد والکتاب الحق وانا ارٰی یا ابن المنصور فی کلامك فضولا کثیرا وعبارات لا طائل تحتها'' اے منصور کے بیٹے! تم نے صحو و سکر کے معنی سمجھنے میں غلطی کی ہے اس لئے کہ بلا خلاف صحو کا مفہوم یہ ہے کہ بندہ کا حال حق تعالیٰ کے ساتھ صحیح ہو اور یہ مفہوم نہ بندے کی صفت ہے اور نہ اس کے اکتساب حق کے تحت داخل ہے اور اے ابن منصور میں نے تمہاری باتوں میں بہت سی لغو اور بے معنی عبارتیں پائی ہیں۔ واللہ اعلم

(۵) فرقہ نوریہ

نوری فرقہ کے پیشوا، حضرت ابوالحسن احمد بن نوری رحمتہ اللہ علیہ ہیں جو مشائخ میں علماء اعلام گزرے ہیں اور نوری کے لقب سے مشہور ہیں۔ مشائخ میں ان کے اوصاف حمیدہ اور دلائل قویہ معروف ہیں۔ تصوف میں ان کا مذہب مختار ہے۔ ان کے مذہب کی بنیادی خصوصیت

یہ ہے کہ وہ فقر پر تصوف کو فضیلت دیتے ہیں اور ان کا معاملہ حضرت جنید رحمۃ اللہ علیہ کے مذہب کے موافق ہے اور اس طریقہ کے نوادرات میں سے یہ ہے کہ صاحب حق صحبت میں اپنے حق کا ایثار کرتے ہیں۔ اس لئے کہ وہ بغیر ایثار کے صحبت حرام جانتے ہیں۔ حضرت نوری فرماتے ہیں کہ درویشوں کے لئے صحبت فرض ہے اور گوشہ نشینی ناپسندیدہ، اور یہ کہ ہم نشیں کا دوسرے ہم نشیں کے لئے ایثار بھی فرض ہے۔ چنانچہ ان کا ارشاد ہے:

ایاکم والعزلۃ فان العزلۃ مقاربتہ الشیطان وعلیکم بالصحبتہ فان الصحبۃ رضاء الرحمٰن	گوشہ نشینی سے بچو کیونکہ گوشہ نشینی شیطان کی ہم نشینی ہے اور بندگان خدا کی صحبت میں آؤ۔ کیونکہ صحبت میں اللہ تعالیٰ کی خوش نودی ہے۔

اب میں ایثار کی حقیقت بیان کرتا ہوں اور جب صحبت اور عزلت کے باب میں پہنچوں گا تو وہاں اس کی بھی وضاحت کر دوں گا۔ انشاء اللہ

ایثار کی بحث

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

وَیُؤْثِرُوْنَ عَلٰٓی اَنْفُسِهِمْ وَلَوْ کَانَ بِهِمْ خَصَاصَةٌ (الحشر:۹)	مسلمان اپنی جانوں کی نسبت دوسروں پر ایثار کرتے ہیں اگرچہ انہیں تنگی ہو۔

ایثار کرنے والے اگرچہ خود اس کے ضرورت مند ہوتے ہیں۔ یہ آیۂ کریمہ فقراء صحابہ کی شان میں خاص طور پر نازل ہوئی۔

ایثار کی حقیقت:

ایثار کی حقیقت یہ ہے کہ صحبت میں اپنے رفیق کے حق کی حفاظت رکھے اور اپنے حق سے اس کے حق کی خاطر دستبردار ہو جائے اور اپنے رفیق کو آرام و راحت پہنچانے میں خود تکلیف برداشت کرے اور اپنے آرام وراحت کو اس پر قربان کر دے۔ ''لِاَنَّ الْاِیْثَارِ الْقِیَامُ

بِمُعَاوَنَةِ الْاَغْیَارِ مَعَ الْاَشْتِغَالِ بِمَا اَمَرَہُ الْجَبَّارُ لِرَسُوْلِہِ الْمُخْتَارِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمْ قَالَ اللّٰہُ تَعَالٰی خُذِ الْعَفْوَ وَاْمُرْ بِالْعُرْفِ وَاَعْرِضْ عَنِ الْجَاھِلِیْنَ (الآیۃ) "
اس لئے کہ ایثار یہ ہے کہ دوسروں کی مدد کرنے میں قائم رہے باوجود یہ کہ وہ خود اس کا حاجت مند ہو۔ یہ اس حکم خداوندی کے تحت ہے جسے اپنے رسول مختار صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم دیا کہ درگزر سے کام لو اور نیکی کا حکم دو اور جاہلوں سے دور رہو۔ یہ مسئلہ اپنی کامل تشریح کے ساتھ آداب صحبت کے باب میں آئے گا۔ انشاءاللہ

ایثار کی اقسام:

ایثار کی دو قسمیں ہیں ایک صحبت میں ایثار کرنا جیسا کہ لکھا جا چکا ہے۔ دوسرے محبت میں ایثار کرنا۔ لیکن ہم نشین اور رفیق کے حق میں ایثار کرنا ایک طرح سے رنج و تکلیف ہے لیکن دوست کے حق میں ایثار کرنا سراسر راحت ہی راحت ہے۔

حکایت:

یہ واقعہ مشہور ہے کہ غلام الخلیل نے جماعت صوفیاء کے ساتھ جب عداوت کا اظہار کیا اور ہر ایک سے طرح طرح کی دشمنی پیدا کی اور حضرت نوری، رقام اور ابوحمزہ رحمہم اللہ کو گرفتار کرا کے دربارِ خلافت میں بلوایا تو اس وقت اس غلام الخلیل نے کہا یہ زندیقوں کی جماعت ہے۔ اے امیر المومنین! اگر آپ ان زندیقوں کے قتل کا حکم دے دیں تو ان زندیقوں کی نسل ہی ختم ہو جائے کیونکہ یہ تینوں تمام زندیقوں کے سرغنہ ہیں جس کے ہاتھ سے ایسی نیکی واقع ہو میں اس کے اجر و ثواب کا ضامن ہوں گا۔ خلیفہ نے ان سب کے گردنیں اڑانے کا حکم دے دیا۔ چنانچہ سیاف یعنی جلاد آیا اور اس نے تینوں کے ہاتھ باندھے اور حضرت رقام کی گردن اڑانے کے لئے تلوار اٹھائی تو حضرت نوری جلدی سے اٹھے اور رقام کی جگہ تلوار کی زد میں جا بیٹھے۔ تمام لوگوں نے اس پر تعجب کیا۔ جلاد نے کہا اے جوانمرد یہ تلوار ایسی نہیں ہے جسے کھیل سمجھا جائے! اور تم اس کے سامنے آؤ۔ ابھی تمہاری باری نہیں آئی ہے۔ حضرت نوری نے فرمایا تم ٹھیک کہتے

ہو لیکن میرا طریقہ ایثار ہے دنیا میں سب سے عزیز چیز زندگانی ہے میں چاہتا ہوں کہ اپنی زندگی کے جو بقیہ سانس ہیں ان کو اپنے بھائیوں پر قربان کر دوں کیونکہ میرے نزدیک دنیا میں ایک سانس لینا آخرت کے ہزار سانس سے بہتر ہے۔ یہ دنیا خدمت و عبادت اور خدا کی بندگی کا مقام ہے اور آخرت قربت کی جگہ اور قربت خدا ہی سے حاصل ہوتی ہے۔ خلیفہ نے جب یہ بات سنی تو وہ ان کی طبیعت کی نرمی اور کلام کی باریکی پر ایسا متعجب ہوا کہ اسی وقت حکم دیا کہ ابھی ٹھہر جاؤ۔ اس زمانے میں قاضی القضاۃ ابوالعباس بن علی تھے۔ خلیفہ نے ان کے احوال کی تفتیش کا کام اس کے سپرد کر دیا۔ چنانچہ قاضی ابوالعباس ان تینوں کو اپنے گھر لے گیا۔ اس نے شریعت اور حقیقت کے احکام و مسائل کے بارے میں سوالات کئے اور ہر سوال کے جواب میں انہیں راہِ حق پر پایا اور ان کے احوال سے اپنی غفلت و نادانی پر شرمسار ہوا۔ اس وقت حضرت نوری نے فرمایا اے قاضی! جو سوالات تم نے دریافت کئے ہیں ان کی حیثیت کچھ بھی نہیں ہے کیونکہ ''فان للہ عباد یأکلون باللہ ویشربون باللہ ویجلسون باللہ ویقولون باللہ'' اللہ تعالیٰ کے ایسے بندے بھی ہیں جو اسی کے ساتھ کھاتے، پیتے، بیٹھتے اور اسی کے ساتھ بات کرتے ہیں۔ مطلب یہ کہ ان مردانِ خدا کا قیام وقعود، اکل و شرب، حرکت و سکون اور نطق و کلام اللہ تعالیٰ ہی کے ساتھ ہے اسی کے لئے زندہ ہیں اور اسی کے مشاہدے میں محو رہتے ہیں اگر ایک لمحہ کے لئے بھی مشاہدۂ حق نہ ہو تو ان کی زندگی مضمحل و پراگندہ ہو جاتی ہے۔ ایسا لطیف کلام سن کر قاضی بہت حیرت زدہ ہوا اس نے اسی وقت تمام گفتگو اور ان کے حالات کی درستگی قلم بند کر کے خلیفہ کے پاس بھیج دی اور لکھا کہ اگر یہ جماعت ملحدوں کی ہے تو ''فمن الموحد فی العالم'' جہان میں پھر کون موحد اور توحید پرست ہوگا؟ میں گواہی دیتا ہوں اور فیصلہ کرتا ہوں کہ اگر یہ ملحد ہیں تو روئے زمین میں کوئی موحد نہیں ہے۔ خلیفہ نے ان سب کو بلایا اور کہا اگر کچھ ضرورت ہو تو بتائیں؟ انہوں نے کہا اے خلیفہ! ہمیں تم سے یہی حاجت ہے کہ تم ہم سب کو فراموش کر دو۔ نہ اپنی قبولیت سے ہمیں اپنا مقرب بناؤ اور نہ اپنی دوری سے ہمیں مردود و مقہور قرار دو۔ کیونکہ ہمارے لئے تمہاری دوری تمہاری قبولیت کے مشابہ ہے اور تمہاری قبولیت،

تمہاری دوری کی مانند، خلیفہ رونے لگا اور عزت واحترام کے ساتھ انہیں رخصت کر دیا۔

اثرِ صحابہ:

حضرت نافع بیان کرتے ہیں کہ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما کو ایک روز مچھلی کھانے کی خواہش پیدا ہوئی۔ شہر بھر میں مچھلی تلاش کرائی مگر نہ ملی۔ چند روز بعد مجھے مچھلی مل گئی میں نے باورچی کو تیار کرنے کا حکم دیا۔ پھر جب میں نے ان کے روبرو پیش کیا تو مچھلی دیکھتے ہی ان کی پیشانی پر خوشی ومسرت کی لہر دوڑ گئی۔ اسی وقت ایک سائل ان کے دروازے پر آ گیا۔ انہوں نے حکم دیا کہ یہ مچھلی سائل کو دے دی جائے۔ غلام نے کہا اے آقا، آپ اتنے دن سے مچھلی کی تلاش میں تھے آپ کو اس کی خواہش تھی۔ آپ اسے کیوں دے رہے ہیں میں سائل کو کوئی اور چیز دے دیتا ہوں؟ فرمایا اے غلام! اب اس کا کھانا مجھ پر حرام ہے کیونکہ میرے دل میں اس کی خواہش نہیں رہی۔ اس کے بعد حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ نے یہ واقعہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو سنایا تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "اَیُّمَا امْرِئٍ یَشْتَھِیْ شَھْوَۃً فَرَدَّ شَھْوَتَہٗ وَآثَرَ الْاٰخِرَۃَ عَلٰی نَفْسِہٖ غُفِرَلَہٗ" یعنی جس آدمی کے دل میں کسی چیز کی خواہش پیدا ہو اور وہ چیز اسے مل جانے پر وہ اس سے ہاتھ کھینچ لے اپنے آپ پر دوسرے کو ترجیح دے تو یقیناً اللہ تعالیٰ اس ایثار پر اسے بخش دے گا۔

ایثار کی نادر مثال:

دس (۱۰) درویش بیابان میں سفر کر رہے تھے۔ اثنائے راہ میں انہیں شدت کی پیاس لگی۔ ان کے پاس صرف ایک پیالہ پانی تھا۔ ہر ایک نے دوسرے کو وہ پیش کیا مگر کسی نے نہیں پیا یہاں تک کہ پیاس کی شدت میں نو درویش دنیا سے رخصت ہو گئے صرف ایک درویش رہ گیا اس نے کہا جب میں نے دیکھا کہ سب فوت ہو چکے ہیں اور صرف میں ہی رہ گیا ہوں تو میں نے وہ پانی پی لیا جس سے مجھے ہوش آیا اور توانائی محسوس ہوئی۔ کسی نے اس درویش سے کہا اگر تم بھی اسے نہ پیتے تو اچھا ہوتا، اس نے کہا او شخص! شریعت کو کیا سمجھتا ہے؟ اگر اس وقت میں

اسے نہ پیتا اور مرجاتا تو میں اپنی جان کا قاتل ہوتا اور مواخذہ دار ٹھہرتا۔ اس شخص نے کہا پھر تو وہ نو درویش بھی اپنے قاتل ٹھہرے۔ درویش نے کہا نہیں، انہوں نے ایک دوسرے کی خاطر پانی نہیں پیا کہ ان کی زندگیاں بچ جائیں جب وہ اس خاطر داری اور ایثار میں جان بحق ہوئے اور صرف میں اکیلا رہ گیا تو اب شرعاً پانی کا پینا مجھ پر واجب ہو گیا۔

ایثار میں فرشتوں کی آزمائش:

امیر المومنین سیدنا علی مرتضیٰ کرم اللہ وجہہ، بوقت ہجرت، رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے بستر پر آرام فرما ہوئے اور حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کے ساتھ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم مکہ مکرمہ سے ہجرت کر کے غارِ ثور میں تشریف فرما ہوئے چونکہ اس رات کافروں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو شہید کرنے کا مصمم ارادہ کر لیا تھا تو اللہ تعالیٰ نے حضرت جبریل و میکائیل (علیہما السلام) سے فرمایا میں نے تم دونوں کے درمیان برادری اور محبت پیدا کر کے ایک دوسرے پر زندگی دراز کر دی ہے اب بتاؤ تم دونوں میں سے کون سا بھائی ایسا ہے جو اپنی زندگی کو دوسرے پر قربان کر کے اپنی موت کو چاہے گا؟ مگر ان دونوں فرشتوں نے اپنی اپنی زندگی کو ہی اختیار کیا اور ایک دوسرے پر ایثار و قربانی کے لئے تیار نہ ہوئے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا تم دونوں حضرت علی مرتضیٰ کی بزرگی وفضیلت کو دیکھو کہ میں نے علی مرتضیٰ اور اپنے رسول کے درمیان برادری قائم فرمائی لیکن علی مرتضیٰ نے ان کے مقابلہ میں اپنے قتل اور اپنی موت کو پسند کیا اور وہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی جگہ پر سو گئے۔ اپنی جان کو ان پر فدا کرنے اور اپنی زندگی کو ان پر نثار کرنے کے لئے تیار ہو گئے اور خود کو ہلاکت کے منہ میں ڈال دیا۔ اب تمہارا فرض یہ ہے کہ تم زمین پر جاؤ اور علی مرتضیٰ کی خدمت بجالاؤ اور ان کو دشمنوں سے محفوظ رکھو چنانچہ جبریل و میکائیل علیہما السلام آئے ایک علی مرتضیٰ کے سرہانے اور دوسرے ان کی پائنتی حفاظت کے لئے کھڑے ہو گئے۔ اس وقت جبریل علیہ السلام نے کہا "بَخٍ بَخٍ مَنْ مِّثْلُكَ ابْنَ اَبِیْ طَالِبٍ اِنَّ اللّٰهَ یُبَاهِیْ بِكَ عَلٰی مَلٰٓئِکَتِهٖ" اے علی ابن ابی طالب! تم کتنے خوش قسمت ہو، کون ہے جو تمہاری مثل ہو، بلاشبہ اللہ تعالیٰ آج تمہارے ساتھ فرشتوں پر فخر ومباہات فرما رہا ہے اور تم اپنی

نیند میں مگن ہو۔ اس ایثار پر اللہ تعالیٰ نے یہ آیہ کریمہ نازل فرمائی:

وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّشْرِیْ نَفْسَهُ ابْتِغَآءَ مَرْضَاتِ اللهِ وَاللهُ رَءُوْفٌ م بِالْعِبَادِ (البقرہ:۲۰۷)

کچھ لوگ ایسے ہیں جو اپنی جان کو خدا کی خاطر بیچتے ہیں اور اللہ بندوں پر مہربان ہے۔

غزوۂ احد میں ایثار کی مثال:

جس وقت اللہ تعالیٰ نے غزوۂ احد میں سختی و مشقت کے ذریعہ مسلمانوں کا امتحان لیا تو ایک انصاری عفت مآب عورت شربت کا پیالہ لے کر آئی تا کہ کسی مجروح کو پلائے وہ بیان کرتی ہیں کہ میدانِ جنگ میں ایک بزرگ صحابی کو زخموں سے چور دیکھا جو گنتی کے سانس پورے کر رہا تھا۔ اس نے اشارہ کیا کہ مجھے پانی دو۔ جب میں پانی لے کر اس کے قریب پہنچی تو دوسرے زخمی نے پکارا مجھے پانی دو، پہلے زخمی نے پانی نہ پیا اور مجھ سے کہا اس کے پاس لے جاؤ، جب میں اس کے پاس پہنچی تو تیسرے زخمی نے پکارا پانی، اس نے بھی پانی نہ پیا اور کہا کہ اس کے پاس لے جاؤ یہاں تک کہ اس طرح میں سات زخمیوں کے پاس پہنچی جب میں ساتویں کے پاس پہنچی اور اس نے چاہا کہ پانی پیے تو جان بحق ہو گیا میں پانی لے کر چھٹے کے پاس پہنچی تو اس نے بھی جان دے دی اسی طرح ہر ایک زخمی اپنی جان کو حق تعالیٰ کے حوالہ کرتے رہا اور کسی نے ایک دوسرے کے ایثار میں پانی نہیں پیا۔ اس سلسلے میں آیہ کریمہ نازل ہوئی کہ ''وَيُؤْثِرُوْنَ عَلٰٓى اَنْفُسِهِمْ وَلَوْ كَانَ بِهِمْ خَصَاصَةٌ'' (الحشر:۹) مسلمان اپنی جانوں پر ایثار کرتے ہیں اگر چہ وہ خود تنگی میں ہوں۔

بنی اسرائیل کے ایک عابد کا واقعہ:

بنی اسرائیل میں ایک عابد تھا جس نے چار سو (۴۰۰) سال تک عبادت کی۔ ایک دن اس نے کہا اے خدا، اگر اس پہاڑ کو پیدا نہ فرمایا ہوتا تو لوگوں کے آنے جانے اور سفر و سیاحت کرنے میں بہت آسانی ہوتی۔ اس زمانہ کے نبی صلوات اللہ علیہ سے رب تعالیٰ نے فرمایا کہ تم

فلاں عابد کو بتا دو کہ ہماری ملکیت میں تجھے تصرف کرنے اور رائے دینے کا کوئی حق نہیں۔ اب چونکہ تو نے یہ گستاخی و جرأت کی ہے تو سن کہ تیرا نام نیک بختوں کی فہرست سے خارج کر کے نافرمانوں اور بدبختوں کی فہرست میں لکھتا ہوں۔ عابد کے دل میں یہ سن کر بڑی خوشی ہوئی اور فوراً سجدۂ شکر میں گر گیا۔ اللہ تعالیٰ نے نبی کے ذریعہ کہلوایا کہ او نادان، شقاوت و بدبختی پر سجدۂ شکر واجب نہیں ہوتا۔ عابد نے کہا میرا شکر، شقاوت پر نہیں ہے بلکہ اس پر ہے کہ میرا نام اللہ تعالیٰ کے کسی دیوان میں تو ہے۔ لیکن اے خدا کی نبی! میری ایک حاجت خدا کی بارگاہ میں پیش کر دو۔ نبی نے فرمایا کہو کیا ہے؟ اس نے کہا خدا سے عرض کرو کہ اب جبکہ تو نے میرے لئے دوزخ میں جانا مقرر کر دیا ہے تو اتنا کرم کر مجھے ایسا بنا دے کہ تمام موحد گنہگاروں کے بدلے صرف میں ہی گنہگار ٹھہروں تا کہ وہ سب جنت میں جائیں۔ فرمانِ الٰہی ہوا کہ اس عابد سے کہہ دو، تیرا یہ امتحان تیری ذلت کے لئے نہیں تھا بلکہ لوگوں کے سامنے تیرے ایثار کے اظہار کے لئے تھا۔ اب روزِ قیامت تو جس جس کی شفاعت کرے گا میں ان سب کو جنت میں بھیج دوں گا۔

حضرت احمد حماد سرخسی کا ایثار:

حضرت داتا گنج بخش رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ میں نے حضرت احمد حماد سرخسی سے پوچھا کہ تمہاری توبہ کا ابتدائی واقعہ کیا ہے انہوں نے بیان کیا کہ میں ایک مرتبہ سرخس سے جنگل کی طرف گیا اور عرصہ تک وہاں اونٹوں کے پاس رہا اور میں ہمیشہ خواہش مند رہا کہ میں بھوکا رہوں اور اپنا کھانا کسی دوسرے کو دے دوں چونکہ خدا کا یہ ارشاد لوحِ قلب پر نقش تھا کہ "وَيُؤْثِرُونَ عَلَىٰ أَنفُسِهِمْ وَلَوْ كَانَ بِهِمْ خَصَاصَةٌ" (الحشر:۹)

حضرت نوری کی مناجات:

جعفر خلدی بیان کرتے ہیں کہ ایک دن حضرت ابوالحسن نوری رحمۃ اللہ علیہ خلوت میں مناجات کر رہے تھے میں ان کی مناجات کے الفاظ سننے کی غرض سے اس طرح قریب ہوا

کہ ان کو خبر نہ ہو کیونکہ وہ مناجات فصیح و بلیغ تھیں۔ انہوں نے مناجات میں کہا کہ اے خدا، تو دوزخیوں کو عذاب دے گا حالانکہ وہ سب تیرے بندے ہیں اور تیرے پیدا کردہ ہیں اور وہ تیرے ازلی علم وارادہ اور قدرت میں ہیں اگر تو واقعتہً دوزخ کو لوگوں سے بھرنا ہی چاہتا ہے تو تُو اس پر قادر ہے کہ مجھ سے دوزخ اور اس کی طبقات کو بھر دے اور ان دوزخیوں کو جنت میں بھیج دے۔ جعفر کہتے ہیں کہ میں یہ الفاظ سن کر حیران رہ گیا۔ میں نے خواب میں دیکھا کہ کسی نے آکر مجھ سے کہا کہ تم ابوالحسن سے جا کر کہہ دو کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے ہم نے تمہاری اس شفقت و ایثار پر جو تمہیں ہمارے بندوں سے ہے تمہیں بخش دیا۔

حضرت ابوالحسن رحمتہ اللہ علیہ کو نوری اس بنا پر کہا جاتا تھا کہ اندھیرے گھر میں جب وہ بات کرتے تھے تو ان کے باطن کے نور سے وہ گھر روشن ہو جاتا تھا اور یہ کہ وہ مریدوں کے اَسرار کو نورِ حق سے معلوم کر لیتے تھے یہاں تک کہ حضرت جنید بغدادی ان کے بارے میں فرمایا کرتے تھے کہ "ابوالحسن تو دلوں کا جاسوس ہے۔"

یہ ہیں نوری مذہب کی خصوصیات، جو اہل بصیرت کے نزدیک قوی الاصل اور عظیم المعاملات ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ انسان کے لئے روح پر خرچ کرنے اور اپنی محبوب و مرغوب چیز سے دستکش ہونے سے زیادہ شدید چیز کوئی نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ نے تمام نیکیوں کی کنجی، سب سے زیادہ محبوب چیز خرچ کرنے کو بتایا ہے۔ چنانچہ فرماتا ہے:

لَنْ تَنَالُوا الْبِرَّ حَتّٰى تُنْفِقُوْا مِمَّا تُحِبُّوْنَ (آلِ عمران:۹۲)

ہر گز ہر گز نیکی نہ پاؤ گے جب تک کہ اپنی سب سے زیادہ محبوب چیز اس کے لئے خرچ نہ کرو گے۔

طریقت کی اصل یہی ہے۔ چنانچہ حضرت رویم رحمتہ اللہ علیہ کے پاس ایک شخص آیا اس نے کہا کہ مجھے کوئی نصیحت فرمایئے؟ آپ نے فرمایا:

یابنی لیس الامر غیر بذل الروح ان قدرت علی ذالك والا فلا تشتغل بترهات الصوفیته

اے فرزند! کوئی چیز جان خرچ کرنے سے بڑھ کر نہیں ہے بشرطیکہ تم کو اس پر قابو ہو ورنہ صوفیوں کی گہری باتوں کے در پے نہ ہو اس کے سوا جو کچھ ہے سب باطل ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

وَلَا تَحْسَبَنَّ الَّذِيْنَ قُتِلُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اَمْوَاتاً (آلِ عمران:۱۶۹)

یعنی جو خدا کی راہ میں جان دے چکے ہیں انہیں مردہ گمان نہ کرو بلکہ وہ اپنے رب کے حضور زندہ ہیں انہیں رزق دیا جاتا ہے

دوسری جگہ ارشاد ہے:

وَلَا تَقُوْلُوْا لِمَنْ يُّقْتَلُ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اَمْوَاتٌ بَلْ اَحْيَآءٌ (الآیہ) (البقرہ:۱۵۴)

جنہوں نے راہِ خدا میں جان دی انہیں مردہ نہ کہو وہ زندہ ہیں حیات ابدی اور قربِ سرمدی راہِ خدا میں جان دینے اپنے نصیب کو چھوڑنے اور اللہ کے دوستوں کی فرمانبرداری سے حاصل ہوتی ہے۔

عین ایثار و اختیار، اگرچہ معرفت کی نظر میں جدا جدا ہیں مگر عین میں جمع ہیں، عینِ ایثار یہ ہے کہ اپنے نصیب کو جو قربان کیا ہے حقیقت میں وہ ایثار و قربانی ہی اس کا نصیب تھا۔ (کیونکہ حقیقت میں وہ حصہ اگر اس کے مقدر میں ہوتا تو مقدر میں چونکہ تغیر و تبدل کا امکان نہیں لامحالہ وہ کسی دوسرے پر کیسے خرچ ہوتا بلکہ اس کا مقدر وہی ہے جو اسے نہ ملا بلکہ دوسرے کو پہنچا۔ فافہم مترجم) طالب کا سلوک جب تک اس کے حصول سے متعلق رہے گا وہ ہلاکت میں رہے گا لیکن جب اللہ تعالیٰ کی توفیق اور اس کی مدد شامل ہو جائے تو طالب کے تمام افعال و احوال پراگندہ اور ناپید ہو جاتے ہیں۔ اس کیفیت کی کوئی لفظی تعبیر نہیں ہو سکتی اور نہ اس کیفیت کا کوئی نام تجویز کیا جا سکتا ہے جس سے اس کی تعبیر کی جا سکے یا اس کا حوالہ دے کر کسی نام سے پکارا جا

سکے۔اس مفہوم کو حضرت شبلی علیہ الرحمۃ اس طرح ادا کرتے ہیں کہ:

غبت عنی فما احس بنفسی
وتلاشت بصفاتی الموصوفته
فانا الیوم غائب عن جمیع
لیس الا العبارة الملهوفته

"یعنی جب تو میری نگاہوں سے اوجھل تھا تو میں اپنے آپ کو بھی نہ پہچان سکا اور ذات موصوف میری صفتوں کو تلاش ہی کرتی رہی۔آج تو میں سب سے غائب ہوں۔اب افسوس کی عبارتوں کے سوا کچھ نہیں ہے۔"

(۶) فرقۂ سُہیلیَہ

فرقہ سہیلیہ کے پیشوا، حضرت سہل بن عبد اللہ تستری رحمتہ اللہ علیہ ہیں۔ یہ اکابر و برگزیدہ مشائخ میں سے ہیں۔ان کا تذکرہ پہلے کیا جا چکا ہے۔غرض یہ کہ یہ اپنے زمانہ کے سلطانِ وقت اور طریقت میں اہل حل وعقد، صاحب اسرائے تھے۔ان کے دلائل بہت واضح اور ان کی حکایات فہم عقل سے بہت بلند ہیں۔ان کے مذہب کی خصوصیت، اجتہاد، مجاہدۂ نفس اور ریاضت شاقہ ہے۔مریدوں کو مجاہدے سے درجہ کمال تک پہنچا دیتے تھے۔

آپ کے واقعات میں مشہور ہے کہ ایک مرید سے فرمایا خوب جہد و کوشش کرو یہاں تک کہ ایک روز تمام دن یا اللہ یا اللہ یا اللہ ہی کہتے رہو اور دوسرے اور تیسرے دن بھی یہی ورد رہے۔اس کے بعد فرمایا اب ان کے ساتھ رات کو بھی شامل کر لو، اور یہی کہتے رہو چنانچہ مرید نے اس پر عمل کیا یہاں تک کہ مرید جب خواب میں ہوتا تو وہ خواب میں بھی یہی کہتا تھا حتیٰ کہ یہ اس کی طبعی عادت بن گئی۔اس کے بعد فرمایا اب اس سے لوٹ آؤ اور اس کی یاد میں مشغول ہو جاؤ۔پھر اس کی یہ حالت ہوگئی کہ وہ ہمہ وقت اسی میں مستغرق رہنے لگا۔ایک دن مرید اپنے گھر

میں تھا ہوا کی وجہ سے وزنی لکڑی گری اور اس نے اس کا سر پھاڑ دیا سر سے جو خون کے قطرے ٹپک کر زمین پر گرتے تھے وہ بھی اللہ اللہ لکھتے جاتے تھے۔

غرض کہ مجاہدے و ریاضت کے ذریعہ مریدوں کی تربیت، سہیلیوں کا خاص طریقہ ہے۔ درویشوں کی خدمت اور ان کی تعظیم و توقیر حمدونیوں کا خاص امتیاز ہے اور باطن کا مراقبہ جنیدیوں کا امتیاز ہے اس میں ریاضت و مجاہدہ فائدہ مند نہیں ہوتا؟

اب میں معرفت نفس اور اس کی حقیقت بیان کرتا ہوں اس کے بعد مجاہدوں کے مذاہب اور ان کے احکام بیان کروں گا تا کہ طالب معرفت پر حقیقت آشکارا ہو جائے۔ واللہ اعلم

نفس کی حقیقت اور ہوٰی کے معنیٰ کی بحث

واضح ہو کہ نفس کے لغوی معنیٰ، وجودِ شیئ اور حقیقت و ذات کے ہیں۔ لوگوں کی عادت اور ان کے استعمال میں اس کے معانی بہت ہیں جو ایک دوسرے کے بالکل خلاف بلکہ متضاد ہیں۔ چنانچہ ایک گروہ کے نزدیک نفس کے معنی روح ہیں، اور ایک گروہ کے نزدیک اس کے معنی مودّت ہیں اور ایک گروہ کے نزدیک اس کے معنی جسم و بدن کے ہیں ایک دوسرے گروہ کے نزدیک اس کے معنی خون کے ہیں۔ لیکن طریقت کے محققین کے نزدیک اس لفظ کے مذکورہ معانی میں سے کوئی معنی مراد نہیں ہیں۔ اربابِ طریقت کا اس پر اتفاق ہے کہ درحقیقت نفس، تمام شر اور برائی کا سرچشمہ ہے جو بڑا امام اور قائد ہے لیکن ایک گروہ یہ کہتا ہے کہ نفس وہ شئے ہے جو قالب میں بطور امانت رکھا گیا ہے جیسے روح، ایک گروہ یہ کہتا ہے کہ یہ قالب ہی کی ایک صفت ہے جس طرح حیات و زندگانی اس کی صفت ہے بایں ہمہ اس میں سب متفق ہیں کہ کمینہ خصلتیں اور برے افعال اسی سے ظاہر ہوتے ہیں۔

افعال نفس کے اقسام:

نفس کے افعال کی دو قسمیں ہیں ایک معصیت و نافرمانی دوسرے کمینہ خصائل، جیسے

تکبر، حسد، بخل، غصہ اور کینہ وغیرہ ان کے ماسوا وہ تمام باتیں جو عقل وشریعت کے نزدیک مذموم ورکیک ہیں نفس کے افعال بد ہیں۔ اس لئے ریاضت ومجاہدے سے ان برے خصائل کو زائل کیا جاسکتا ہے جس طرح توبہ سے معصیت کو دور کیا جاتا ہے اور یہ کہ معاصی، نفس کے ظاہری اوصاف میں سے ہے اور کمینہ خصائل اس کے باطنی اوصاف میں سے تعلق رکھتے ہیں۔ ریاضت ومجاہدہ اس کے ظاہری افعال کو اور توبہ اس کے باطنی افعال کو نیست و بود کرتے ہیں اور کمینہ خصائل سے جو باطن میں کدورت پیدا ہوتی ہے وہ ظاہری اوصاف (ریاضت ومجاہدے) کے ذریعہ پاک وصاف کی جاسکتی ہے اور جو کدورت، ظاہری افعالِ بد سے پیدا ہوتی ہے وہ باطن کی صفائی سے جاتی رہتی ہے۔ نفس وروح دونوں قالب میں اتنے ہی لطیف ہیں جتنے عالم شیاطین وفرشتے اور جنت ودوزخ۔ لیکن ایک محلِ خیر ہے اور ایک محل شر۔ جس طرح آنکھ محل بصر، کان محل سماعت، اور زبان محل ذائقہ ہے اسی طرح کچھ ایمان واوصاف قالب انسان میں بطور امانت رکھے گئے ہیں لہٰذا نفس کی مخالفت، تمام عبادتوں کی جڑ اور مجاہدوں کی اصل ہے اس کے بغیر بندہ راہِ حق نہیں پاسکتا اس لئے کہ نفس کی موافقت میں بندے کی ہلاکت ہے اور اس کی مخالفت میں بندے کی نجات ہے۔ چونکہ حق تعالیٰ نے اس کی مذمت فرمائی ہے جیسا کہ ارشاد ہے:

وَنَهَى النَّفْسَ عَنِ الْهَوٰى فَاِنَّ الْجَنَّةَ هِيَ الْمَاْوٰى (النّٰزعٰت: ۴۰،۴۱)	جس نے نفس کو خواہش سے روکا بے شک جنت اس کا مسکن ہے۔

اور ارشاد ہے:

اَفَكُلَّمَا جَآءَكُمْ رَسُوْلٌۢ بِمَا لَا تَهْوٰٓى اَنْفُسُكُمُ اسْتَكْبَرْتُمْ (البقرہ: ۸۷)	جب بھی تمہارے پاس رسول وہ چیز لے کر آئے جو تمہارے جی کو پسند نہیں تھی تو تم نے اس سے تکبر کیا۔

حضرت یوسف صدیق علیہ السلام کے قول کی اللہ تعالیٰ نے خبر دی کہ:

وَمَآ اُبَرِّئُ نَفۡسِیۡ، اِنَّ النَّفۡسَ لَاَمَّارَۃٌۢ بِالسُّوۡٓءِ اِلَّا مَا رَحِمَ رَبِّیۡ (یوسف:۵۳)

میں اپنے نفس کی پاکی نہیں بیان کرتا کیونکہ نفس تو بہت زیادہ برائی کا حکم کرنے والا ہے مگر جو خدا نے مجھ پر رحم فرمایا۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:

اِذَا اَرَادَ اللّٰہُ بِعَبۡدٍ خَیۡرًا بَصَّرَہٗ بِعُیُوۡبِ نَفۡسِہٖ

اللہ تعالیٰ جب بندے سے بھلائی کا ارادہ فرماتا ہے تو اسے اس کے نفس کے عیوب دکھا دیتا ہے۔

احادیث میں مذکور ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت داؤد علیہ السلام پر وحی نازل فرمائی:

یَا دَاوٗدُ عَادَ نَفۡسَكَ فَاِنَّ وُدِّیۡ فِیۡ عَدَاوَتِهَا

اے داؤد تم اپنے نفس کو دشمن جانو کیونکہ میری محبت اس کی دشمنی میں ہے۔

یہ جو کچھ بیان ہوا سب صفات ہیں، اور یہ یقینی چیز ہے کہ صفت کے لئے موصوف درکار ہوتا ہے تا کہ وہ اس کے ساتھ قائم ہو کیونکہ صفت از خود قائم نہیں ہوتی، اور صفت کی معرفت اس وقت تک نہیں ہو سکتی جب تک کہ قالب کی پہچان مکمل طور پر سے نہ ہو جائے اس کی پہچان کا طریقہ، انسان کے اوصاف کا بیان ہے اور لوگوں کی انسانیت کی حقیقت میں عرفاء کے بہت سے قول ہیں یہاں تک کہ یہ نام کس چیز کا ہے اور کس چیز کے لئے سزاوار ہے؟ اس کا علم ہر طالب حق پر فرض ہے اس لئے کہ جو طالب خود سے بے خبر ہے وہ اپنے غیر سے زیادہ جاہل ہوگا۔ جب بندے کو معرفت الٰہی کا مکلّف بنایا گیا ہے تو لامحالہ پہلے اسے اپنی معرفت ہونی چاہئے تا کہ اپنے حادث و نوپید ہونے کی صحت کے ساتھ اللہ تعالیٰ کے قدیم و ازلی ہونے کو پہچانے اور اپنی فنا سے حق تعالیٰ کے ساتھ بقا کو معلوم کر سکے۔ نص قرآنی اس پر ناطق ہے کہ اللہ تعالیٰ نے کفار کا ذکر صفت جہالت سے کیا ہے۔ چنانچہ ارشاد ہے کہ:

ومن یرغب عن ملت ابراهیم الامن سفه نفسهٗ

جس نے ملت ابراہیمی سے منہ موڑا وہ اپنے آپ سے جاہل ہے۔

یعنی اس نے اپنے آپ کونہیں پہچانا۔طریقت کے ایک بزرگ فرماتے ہیں کہ:

من جهل نفسه فهو بالغير اجهل — جو اپنے نفس سے جاہل ہے وہ دوسروں سے زیادہ جاہل ہوگا یعنی اس نے اپنے آپ کو نہیں پہچانا۔

حضوراکرم صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں:

مَنْ عَرَفَ نَفْسَهٗ فَقَدْ عَرَفَ رَبَّهٗ — جس نے اپنے نفس کو پہچانا اس نے اپنے رب کو پہچان لیا۔

مطلب یہ کہ جس نے اپنے نفس کی بابت یہ جان لیا کہ وہ فنا ہونے والی چیز ہے تو اس نے اپنے رب کو پہچان لیا اور سمجھ لیا کہ وہی باقی رہنے والی ذات ہے۔ایک قول یہ ہے کہ جس نے اپنے نفس کو جان لیا کہ وہ ذلیل وخوار ہونے والی چیز ہے اس نے اپنے رب کو پہچان لیا کہ وہ عزت وکرامت بخشنے والی ذات ہے۔ایک قول یہ ہے کہ جس نے اپنے نفس کو بندگی سے پہچان لیا اس نے اپنے رب کو ربوبیت سے پہچان لیا جس نے اپنے ہی کو نہ پہچانا وہ دوسرے کو کیا پہچانے گا؟ اس جگہ معرفت نفس سے مراد،معرفت انسانیت ہے۔

معرفت انسانیت:

باہمی معارضہ کی وجہ سے لوگوں کا اس میں اختلاف ہے چنانچہ ایک گروہ یہ کہتا ہے کہ انسان صرف روح کا نام ہے اور جسم اس کی زرہ اور لباس اور اس کے رہنے کی جگہ ہے تاکہ طبائع کے خلل سے محفوظ رہے اور حسن عقل اس کی صفت ہے۔یہ قول باطل ہے اس لئے کہ جب روح جسم سے جدا ہو جاتی ہے تب بھی اسے انسان کہا جاتا ہے یہ نام مردہ شخص سے بھی جدا نہیں ہوتا۔ فرق صرف اتنا ہے کہ جب جسم میں روح تھی تو زندہ انسان تھا اور جب روح نکل گئی تو وہ انسان مردہ ہوگیا۔بطلان کی دوسری وجہ یہ ہے کہ حیوان کے اجسام میں بھی روح رکھی گئی ہے مگر اسے انسان نہیں کہا جاتا۔اگر انسانیت کی علت روح ہوتی تو چاہئے تھا کہ روح جہاں کہیں بھی ہو اس پر انسانیت کے حکم کا اطلاق کیا جاتا اور وہ بھی دلائل کے ساتھ۔یہ قول باطل ہے۔

ایک گروہ یہ کہتا ہے کہ جب تک روح وجسم دونوں یکجا ہیں اس کا نام "انسان" ہے اور جب یہ دونوں جدا ہو جائیں تو پھر یہ نام ساقط ہو جاتا ہے جس طرح گھوڑے میں جب دو رنگ مل جائیں ایک سیاہ دوسرا سفید تو اسے ابلق کہتے ہیں اور جب کوئی اور رنگ اس سے جاتا رہے تو پھر ابلق نہ کہیں گے بلکہ سفید یا سیاہ کہیں گے۔ یہ قول بھی باطل ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

هَلْ اَتٰى عَلَى الْاِنْسَانِ حِيْنٌ مِّنَ	کیا انسان پر زمانہ میں ایسا وقت نہ گزرا جبکہ
الدَّهْرِ لَمْ يَكُنْ شَيْـًٔا مَّذْكُوْرًا	وہ کوئی قابل ذکر شی نہ تھا۔

(الدھر:۱)

اور یہ کہ حضرت آدم علیہ السلام کے جسد خاکی (پتلے) کو انسان کہا گیا حالانکہ ان کے قالب میں اس وقت جان وروح، ڈالی بھی نہیں گئی تھی۔

ایک گروہ یہ کہتا ہے کہ انسان ایسے حصۂ جسم کا نام ہے جس کا تجزیہ نہیں کیا جا سکتا اور اس کا مقام دل ہے کیونکہ آدمی کے تمام صفات کی بنیاد یہی دل ہے یہ قول بھی باطل ہے اس لئے کہ اگر کوئی مارڈالا جائے اور اس کا دل نکال کر پھینک دیا جائے تب بھی انسانیت کا نام اس سے جدا نہیں ہوتا اور نفخ روح سے پہلے باتفاق حضرت آدم علیہ السلام کے قالب میں دل نہ تھا۔

مدعیانِ تصوف کا ایک گروہ انسان کے معنیٰ میں شدید غلطی پر اصرار کرتا ہے اس کا قول ہے کہ انسان میں کھانے پینے اور تغیر پذیر ہونے کی صلاحیت نہیں ہے انسان کا وجود خدا کا ایک بھید ہے اور جسم اس کا لباس، یہ خدا کا بھید، امتزاجِ طبع اور جسم وروح کے اتحاد میں پنہاں ہے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ تمام غافل، دیوانے، فاسق وفاجر اور تمام کافروں کے ساتھ بھی انسانیت کا نام مستعمل ہے حالانکہ ان میں ان کے مزعومہ میں اَسرارِ الٰہی کا نام ونشان تک نہیں۔ وہ سب متغیر اور اپنے وجود میں کھانے پینے والے ہیں۔ اسی طرح شخصی وجود کے بھی کوئی معنیٰ نہیں کہ اسے انسان کہا جائے خواہ وہ موجود ہو یا ناپید؟ حالانکہ اللہ تعالیٰ نے ہمارے ان تمام عناصر کو جن سے ہم مرکب ہیں انسان ہی فرمایا ہے باوجود ان معانی کے جو بعض آدمیوں میں نہیں ہیں چنانچہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

وَلَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ مِنْ سُلٰلَةٍ مِّنْ طِيْنٍ o ثُمَّ جَعَلْنٰهُ نُطْفَةً فِيْ قَرَارٍ مَّكِيْنٍ o ثُمَّ خَلَقْنَا النُّطْفَةَ عَلَقَةً فَخَلَقْنَا الْعَلَقَةَ مُضْغَةً فَخَلَقْنَا الْمُضْغَةَ عِظٰمًا فَكَسَوْنَا الْعِظٰمَ لَحْمًا ثُمَّ اَنْشَاْنٰهُ خَلْقًا اٰخَرَ فَتَبٰرَكَ اللّٰهُ اَحْسَنُ الْخٰلِقِيْنَ o (المؤمنون: ۱۲، ۱۳، ۱۴)

بے شک ہم نے انسان کو چنی ہوئی مٹی سے بنایا پھر اسے پانی کی بوند (نطفہ) کیا ایک مضبوط جگہ (رحم) میں، پھر ہم نے اس پانی کی بوند کو خون کی پھٹکی بنایا اور پھر اس کو گوشت کی بوٹی پھر گوشت کی بوٹی سے ہڈی اور پھر ان ہڈیوں پر گوشت چڑھایا پھر اسے اور صورت میں اٹھان دی تو بڑی برکت والا ہے اللہ، سب سے بہتر بنانے والا۔

لہٰذا بفرمان الٰہی، جو تمام سچوں سے بڑھ کر سچا ہے۔ یہ مخصوص صورت جو اعضاء وطبائع اور مزاجوں سے مرکب ہے اس کا نام انسان رکھا ہے جیسے کہ اہل سنت و جماعت کے ایک گروہ نے کہا ہے کہ انسان اس صورت کا نام ہے جو ان صفات کے ساتھ مخصوص ہے جو کہ اس کے نام کو اس کی موت سے جدا نہیں کرتی یہاں تک کہ ظاہر و باطن کی جو کیفیت اس صورتِ مخصوصہ پر مترتب ہے اسی ظرف وآلہ ہی کا نام انسان ہے اس صورتِ معہودہ ومخصوصہ سے مراد، تندرست و بیمار ہونا اور آلہ موسومہ سے مراد مجنون و پاگل ہے اور غافل ہونا ہے۔ باتفاق جو خلقت میں صحیح تر ہوگا وہ اتنا ہی کامل تر ہوگا۔

کامل تر انسان:

واضح ہو کہ محققین کے نزدیک کامل تر انسان، باعتبارِ ترکیب، تین معنیٰ سے ہوتا ہے ایک تو روح، دوسرے نفس، تیسرے جسم۔ اور اس کے ہر ذات وجود کے لئے ایک صفت ہوتی ہے جو اس کے ساتھ قائم ہوتی ہے۔ روح کے لئے عقل، نفس کے لئے خواہش (ہوا) اور جسم کے لئے احساس، انسان سارے عالم کا نمونہ ہے اور عالم نام دونوں جہان کا ہے۔ انسان میں دونوں جہان کی نشانیاں موجود ہیں۔ اِس جہان کی نشانی پانی، مٹی، ہوا اور آگ ہے اسی سے بلغم، خون، صفراء اور سودا کی ترکیب ہے اور اُس جہان کی نشانی جنت و دوزخ اور میدانِ قیامت ہے۔ انسان

میں جنت کی لطافت کی قائم مقام روح ہے۔ اور دوزخ کی آفت اور اس کی ہولناکیوں کا قائم مقام نفس ہے اور میدانِ قیامت کا قائم مقام جسم ہے۔ ان دونوں معنی کا جمال و پرتو قہر و محبت ہے۔ لہٰذا جنت خدا کے رضا کی تاثیر اور دوزخ اس کی ناراضگی کا نتیجہ ہے۔ اسی طرح مومن کی روح معرفت کی راحت، اور اس کا نفس حجاب وضلالت سے ہے۔ جب تک مومن روزِ قیامت دوزخ سے نجات حاصل کر کے جنت میں نہ پہنچے وہ دیدارِ الٰہی کی حقیقت سے بہرہ ور نہیں ہوسکتا اور مراد کی تحقیق سے ہم کنار نہیں ہوسکتا اور نہ قربت و معرفت کی حقیقت جو روح ہی کی اصل ہے حاصل کرسکتا ہے۔

جو شخص دنیا میں خدا کو پہچانتا ہے وہ دوسروں سے منہ موڑ کر راہِ شریعت پر قائم رہتا ہے وہ روزِ قیامت نہ دوزخ میں جائے گا اور نہ پل صراط کی دشواریوں سے دوچار ہوگا۔

خلاصہ یہ ہے کہ مومن کی روح اسے جنت کی طرف بلاتی ہے کیونکہ روح دنیا میں جنت کا نمونہ ہے اور نفس دوزخ کی طرف لے جانے والا ہوتا ہے کیونکہ نفس دنیا میں دوزخ کا نمونہ ہے مومن و عارف ربانی کے لئے عقل مدبر کامل ہے اور جاہل و نادان کے لئے نفس کی خواہشیں نکمی قائد ہیں۔ عارف کے عقل کی تدبیر درست وصواب اور ان کے ماسوا کی خطا و غلط، لہٰذا طالبانِ راہ حق پر واجب ہے کہ ہمیشہ نفس کی مخالفت کی راہ پر جمے رہیں تاکہ اس کی مخالفت میں عقل و روح مدد کرتی رہے۔ کیونکہ وہ اسرارِ الٰہی کا مقام ہے۔ واللہ اعلم بالصواب

حقیقتِ نفس میں مشائخ کے اقوال

حضرت ذوالنون مصری رحمتہ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ:

اشد العذاب رویتہ النفس وتدبیرھا	بندے کے لئے سخت ترین حجاب، نفس کو دیکھنا اور اس کی تدبیر کی پیروی کرنا ہے۔

کیونکہ نفس کی پیروی میں حق تعالیٰ کی مخالفت مخفی ہے اور حق تعالیٰ کی مخالفت حجابات کا منبع ہے۔ حضرت بایزید بسطامی رحمتہ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ:

النفس صفة لا تسكن الا بالباطل — نفس کی خوبوایسی ہے کہ وہ باطل ہی سے چین پاتا ہے۔

اور راہِ حق سے اسے کبھی فرحت محسوس نہیں ہوتی۔ حکیم ترمذی حضرت محمد بن علی رحمتہ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ:

تريد ان تعرف الحق مع بقاء نفسك فيك ونفسك لاتعرف نفسها فكيف تعرف غيرها — تم یہ چاہتے ہو کہ اپنے نفس کی بقاء کے باوجود جو تمہارے اندر ہے حق تعالیٰ کی معرفت حاصل ہو جائے بھلا یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ جب کہ تمہارا نفس اپنے وجود کے باقی رکھنے کی تدبیر سے بھی آشنا نہیں ہے وہ اپنے غیر کو کیسے پہچان سکے گا؟

مطلب یہ ہے کہ نفس تو خود اپنے بقا کی حالت سے نابلد اور محجوب ہے اور جو خود اپنے آپ سے نابلد و محجوب ہو وہ حق تعالیٰ کو کس طرح پہچان سکے گا۔؟ حضرت جنید بغدادی رحمتہ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ:

اساس الكفر قيامك على مراد نفسك — کفر کی بنیاد، اپنے نفس کی آرزو پر تیرا قائم رہنا ہے۔

گویا نفس کی خواہشات پر قائم رہنے میں بندے کے لئے کفر کی بنیاد ہے کیونکہ اسلام کی لطافت کے ساتھ نفس کو کوئی لگاؤ نہیں ہے۔ لہٰذا خواہشات نفس سے اعراض کرنے کی پوری کوشش کرنی چاہئے اس سے پہلو تہی کرنے والا منکر ہوتا ہے بلکہ منکر بیگانہ حضرت ابوسلیمان درانی رحمتہ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ:

النفس مانعة بالاخائنة مانعة من الرضا وافضل الاعمال خلافها — نفس، امانت میں خیانت کرنے والا اور رضائے الٰہی سے روکنے والا ہے اور سب سے بہتر عمل نفس کشی ہے۔

کیونکہ امانت میں خیانت بے گانگی اور رضائے الٰہی کے ترک میں گمشدگی ہے اس سلسلے میں مشائخ کے اقوال بکثرت ہیں جن کی تفصیل پیش کرنا دشوار ہے۔

اب میں اپنے مقصود کی طرف آتا ہوں اور حضرت سہل رحمتہ اللہ علیہ کے مذہب کے اثبات اور ان کے مجاہدۂ نفس، ریاضت اور حقیقت کو بیان کرتا ہوں۔ وباللہ التوفیق

مجاہدۂ نفس کی بحث

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ:

وَالَّذِیْنَ جَاهَدُوْا فِیْنَا لَنَهْدِیَنَّهُمْ سُبُلَنَا (العنکبوت:۶۹)
جنہوں نے ہماری راہ میں مجاہدہ کیا یقیناً ہم نے انہیں اپنا رستہ دکھایا

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ:

اَلْمُجَاهِدُ مَنْ جَاهَدَ نَفْسَهٗ فِی اللّٰهِ
مجاہد وہ ہے جس نے راہِ خدا میں اپنے نفس کے ساتھ جہاد کیا۔

اور آپ نے فرمایا کہ:

رَجَعْنَا مِنَ الْجِهَادِ الْاَصْغَرِ اِلَی الْجِهَادِ الْاَکْبَرِ قِیْلَ یَارَسُوْلَ اللّٰهِ مَا الْجِهَادُ الْاَکْبَرُ قَالَ اَلَا وَهِیَ مُجَاهَدَةُ النَّفْسِ
اب ہم چھوٹے جہاد یعنی غزوے سے جہاد اکبر کی طرف لوٹ رہے ہیں۔ صحابہ نے عرض کیا یارسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جہاد اکبر کیا ہے؟ فرمایا سن لو! وہ نفس سے مجاہدہ ہے۔

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے مجاہدۂ نفس کو جہاد یعنی غزوات پر فضیلت دی ہے اس لئے کہ اس میں رنج و مشقت زیادہ ہے اور اس میں پائمال کرنا واجب ہے اور مجاہدۂ نفس میں نفس کو مغلوب و مقہور کرنا ہے۔

تو اے عزیز! اللہ تعالیٰ تمہیں عزت بخشے، آگاہ رہو کہ مجاہدۂ نفس کا طریقہ کتاب و

سنت سے واضح و ظاہر ہے اور تمام دینوں اور سب ملتوں میں اس کی تعریف کی گئی ہے۔ اہل طریقت تو خاص طور سے اسے ملحوظ رکھتے ہیں اور تمام عام و خاص مشائخ میں اس کے معمولات جاری و مستعمل ہیں۔ اس بارے میں مشائخ کے بکثرت رموز و اشارات ہیں۔ حضرت سہل بن عبداللہ تستری رحمۃ اللہ علیہ تو اس خصوص میں بہت زیادہ اصرار کرتے ہیں مجاہدے کے سلسلہ میں ان کے دلائل و براہین بکثرت ہیں۔ عرفاء فرماتے ہیں کہ حضرت سہل کی عادت تھی کہ ہر پندرھویں روز ایک مرتبہ کھانا کھاتے تھے۔ اتنی قلیل غذا پر انہوں نے طویل عمر پائی۔ تمام محققین نے مجاہدے کو ثابت کیا ہے اور اسے مشاہدے کا ذریعہ بتایا ہے۔ مشائخ فرماتے ہیں کہ حضرت سہل رحمۃ اللہ علیہ نے بھی مجاہدے کو مشاہدے کی علت قرار دیا ہے اور فرمایا ہے کہ طالب کے لیے عرفانِ حق میں مجاہدہ نہایت موثر عمل ہے۔

حضرت سہل رحمۃ اللہ علیہ دنیاوی زندگانی کو جو طالب عرفانِ حق میں ہو اس آخرت کی زندگانی کے مقابلہ میں جو حصول مراد سے تعلق رکھتی ہے افضل بتاتے ہیں۔ اسی بنا پر ان کا یہ ارشاد ہے کہ اخروی حصول مراد، اس دنیوی مجاہدے کا ثمرہ ہے۔ جب تم دنیا میں خدمت و عبادت کرو گے تو آخرت میں قربت پاؤ گے۔ بغیر خدمت کے وہ قربت حاصل نہیں ہوسکتی حتیٰ کہ یہ اتنا ضروری ہے کہ وصولِ حق کی علت بندہ کا مجاہدہ ہے بشرطیکہ خدا اس کی توفیق بخشے۔

"المشاهدة موازيث المجاهدات" مجاہدوں کی میراث مشاہدہ ہے۔

اس کے برعکس دیگر مشائخ یہ فرماتے ہیں کہ وصولِ حق کے لیے کوئی علت و سبب نہیں ہے جو بھی واصل ہوتا ہے وہ فضلِ الٰہی سے ہوتا ہے۔ فضل کے مقابلہ میں بندے کے افعال کی کیا حقیقت؟ مجاہدہ تو تہذیب نفس اور اس کے تزکیہ کے لیے ہے نہ کہ حقیقت قریب کے لیے؟ اس کی وجہ یہ ہے کہ مجاہدے کی طرف رجوع ہونا بندے کی جانب سے ہے اور مشاہدہ کے احوال حق تعالیٰ کی طرف اس صورت میں محال ہے کہ بندے کے افعال اس کا سبب یا اس کا آلہ بن سکیں۔ اس مسئلہ میں ان کے خلاف حضرت سہیل یہ دلیل پیش کرتے ہیں کہ:

وَالَّذِيْنَ جَاهَدُوْا فِيْنَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا (العنکبوت:٦٩) جس نے ہماری راہ میں مجاہدہ کیا یقیناً ہم اسے اپنی راہ دکھاتے ہیں۔

مطلب یہ کہ جو مجاہدہ کرتا ہے وہ مشاہدہ پاتا ہے۔ نیز انبیائے کرام علیہم السلام کی بعثت، شریعت کا قیام، کتابوں کا نزول اور تمام احکام مکلّفہ یہ سب مجاہدے ہی تو ہیں۔ اگر مجاہدہ مشاہدے کی علت نہ ہوتو ان سب کا حکم باطل قرار پاتا ہے۔ نیز دنیا وآخرت کے تمام احکام، علل وحکم کے ساتھ ہی متعلق ہیں۔ جو حکم سے علت کی نفی کرتا ہے وہ شریعت اور اس کے احکام کو اٹھاتا ہے۔ اس صورت میں نہ اصل میں احکام مکلّفہ کا ثبوت درست ہوگا اور نہ فرع میں۔ کھانا بھوک کو ختم کرنے اور لباس سردی کو دور کرنے کی علت ہوتے ہیں لہٰذا علتوں کی نفی سے تمام مقصود و معانی میں تعطل وخلل واقع ہوتا ہے لہٰذا افعال میں اسباب پر نظر توحید اور اس کی نفی تعطیل ہے۔ اس بارے میں ان کے مسلک کے بموجب مشاہدے کے اثبات میں دلائل ہیں اور مشاہدہ کا انکار، مکابرہ اور ہٹ دھرمی ہے۔ کیا تم نے نہیں دیکھا کہ سرکش گھوڑے کو چابک کے ذریعہ سدھا کر بہادری کی شان پیدا کی جاتی ہے اور اس کی سرکشی کو ختم کیا جاتا ہے اور آخر میں وہی چابک زمین سے اٹھا کر گھوڑا خود مالک کے ہاتھ میں دے دیتا ہے اور اپنے منہ میں لگام لے لیتا ہے۔ اس طرح نادان عجمی بچے پر محنت کر کے عربی زبان سکھا دی جاتی ہے اور اس کی طبعی بولی کو بدل دیا جاتا ہے پھر یہ کہ وحشی جانوروں کو ریاضت کے ذریعہ ایسا سدھا دیا جاتا ہے کہ جب اسے چھوڑتے ہیں تو وہ خود چلا جاتا ہے اور جب بلاتے ہیں تو آجاتا ہے۔ پنجرے میں رہنا آزادی اور چھوڑنے سے زیادہ پسندیدہ ہے۔ ناپاک کتے کو سدھا کر اس منزل تک پہنچا دیا جاتا ہے کہ اس کا شکار حلال ہو جاتا ہے حالانکہ آدمی کے بغیر سدھائے اس کا شکار حرام ہے۔ اس قوم کی بے شمار مثالیں ہیں۔ لہٰذا پوری شریعت اور اس کے احکام کا مدار مجاہدے پر ہے۔ اللہ کے حبیب سید عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے خود بکثرت مجاہدے فرمائے ہیں۔ آپ کو حصول قرب، وصول مقصود، عافیت عقبیٰ اور قیام برعصمت حاصل تھا۔ اس کے باوجود بھوکے رہے۔ طویل مدت تک صومِ وصال رکھے اور کتنی ہی راتوں تک شب بیداری فرمائی۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ فرماتا

ہے:

طٰـهٰ مَـا اَنْـزَلْـنَـا عَلَيْكَ الْقُرْاٰنَ لِتَشْقٰٓى (طٰهٰ:۱،۲)

اے محبوب! آپ پر قرآن ہم نے اس لیے نازل نہیں کیا کہ اپنی جان کو ہلاکت میں ڈالیں۔

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ مسجد نبوی کی تعمیر کے وقت رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم اینٹیں اٹھا رہے تھے اور میں دیکھ رہا تھا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو تکلیف ہو رہی تھی میں نے عرض کیا یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! اینٹوں کا کام میرے سپرد فرما دیں میں یہ خدمت بجالاؤں! حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اے ابو ہریرہ:

خُـذْ غَيْرَهَا فَإِنَّهٗ لَا عَيْـشَ اِلَّا عَيْـشَ الْاٰخِرَةِ.

تم اور کام کرو کیونکہ حقیقی عیش تو آخرت کا ہی عیش ہے۔

دنیا تو رنج و محنت کی جگہ ہے۔

حضرت حیان بن خارجہ مکی رحمۃ اللہ علیہ بیان کرتے ہیں کہ حضرت عبداللہ ابن عمر رضی اللہ عنہما سے دریافت کیا کہ جہاد کیا ہے؟ تو فرمایا

اِبْدَأْ بِـنَـفْسِكَ فَـجَـاهِدْهَـا وَابْدَأْ بِـنَـفْسِكَ فَاَغْزِهَا فَاِنَّكَ اِنْ قُتِلْتَ فَـارًّا بَـعَثَكَ اللهُ فَـارًّا وَاِنْ قُتِلْتَ مِرَائِيًا بَعَثَكَ اللهُ مُرَائِيًا وَاِنْ قُتِلْتَ صَـابِرًا مُحْتَسِبًا بَعَثَكَ اللهُ صَابِرًا مُحْتَسِبًا

پہلے اپنے نفس سے جہاد کی ابتداء کرو اور اس کے ساتھ جنگ شروع کرو اب اگر تم بھاگتے ہوئے مارے گئے تو اللہ تعالیٰ بھاگنے والوں میں تمہیں اٹھائے گا اور اگر تم ریا کاری میں مارے گئے تو اللہ تعالیٰ ریا کاروں میں اٹھائے گا اور اگر حصولِ اجر و ثواب کے لیے صبر و تحمل میں مارے گئے تو اللہ تعالیٰ تمہیں صابروں اور شاکروں میں اٹھائے گا۔

لہٰذا حق تعالیٰ کے معانی کے بیان میں جتنی عبارتیں تصنیف و تالیف میں مروی و ماثور

ہیں اتنی ہی مجاہدے کے اصولِ معانی اور اس کی ترکیب و تالیف میں مروی ہیں جس طرح بغیر عبارت و ترکیب کے بیان درست نہیں ہوتا۔ اسی طرح وصولِ حق، بغیر ریاضت و مجاہدے کے درست نہیں۔ جو بغیر مجاہدے کے وصولِ حق کا دعوٰی کرتا ہے وہ غلطی پر ہے اس لیے کہ جہان اور اس کے حدوث کا ثبوت اس کے پیدا کرنے والے کی معرفت کی دلیل ہے، وہاں معرفتِ نفس اور اس کا مجاہدہ، اس کے وصل اور مشاہدے کی دلیل ہے۔

اہل طریقت کے ایک گروہ کی دلیل یہ ہے کہ تفسیر کے لحاظ سے کلمات آیہ مقدم اور مؤخر ہیں۔

وَالَّذِیْنَ جَاھَدُوْ اِفِیْنَا لَنَھْدِیَنَّھُمْ سُبُلَنَا اَیْ وَالَّذِیْنَ ھَدَیْنَا ھُمْ سُبُلَنَا جَاھَدُوْا فِیْنَا.

جو ہماری راہ میں جہاد کرتے ہیں ہم انہیں اپنا راستہ دکھاتے ہیں اس کا مطلب یہ ہے کہ جن لوگوں کو ہم نے اپنی راہ دکھادی ہے وہ ہماری راہ میں جہاد کرتے ہیں۔

اور یہ کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:

لَمْ یَنْجُوْ اَحَدُکُمْ بِعَمَلِہٖ

تم میں سے کوئی اپنے عمل کے ذریعہ نجات نہیں پائے گا

قِیْلَ وَلَا اَنْتَ یَارَسُوْلَ اللّٰہِ

کسی نے عرض کیا یا رسول اللہ! کیا آپ بھی نہیں؟

قَالَ وَلَا اَنَا اِلَّا اَنْ یَّتَغَمَّدَنِیَ اللّٰہُ بِرَحْمَتِہٖ.

فرمایا ہاں میں بھی نہیں لیکن اللہ تعالیٰ نے اپنی رحمت میں مجھے ڈھانپ رکھا ہے۔

لہٰذا مجاہدہ فعلِ بندہ ہے اور یہ محال ہے کہ اس کا فعل اس کی نجات کا موجب بنے کیونکہ بندے کی نجات مشیتِ الٰہی سے متعلق ہے نہ کہ مجاہدے سے؟ اسی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:

فَمَنْ يُّرِدِ اللّٰهُ اَنْ يَّهْدِيَهٗ يَشْرَحْ صَدْرَهٗ لِلْاِسْلَامِ وَمَنْ يُّرِدْ اَنْ يُّضِلَّهٗ يَجْعَلْ صَدْرَهٗ ضَيِّقًا حَرَجًا (الانعام:۱۲۵)

جس کے لیے اللہ تعالیٰ کی مشیت یہ ہوتی ہے کہ وہ ہدایت پائے تو اللہ تعالیٰ اسلام کے لیے اس کا سینہ کھول دیتا ہے اور جس کے لیے اللہ تعالیٰ کی مشیت یہ ہو کہ وہ گمراہ رہے تو وہ اس کے سینہ کو بہت زیادہ تنگ کر دیتا ہے۔

ارشاد ہے کہ:

تُؤْتِی الْمُلْكَ مَنْ تَشَآءُ وَتَنْزِعُ الْمُلْكَ مِمَّنْ تَشَآءُ (آلِ عمران:۲٦)

جسے چاہتا ہے ملک دیتا ہے اور جس سے چاہتا ہے ملک لے لیتا ہے۔

اللہ تعالیٰ نے اپنی مشیت کے اثبات میں سارے جہان کے افعال کی نفی فرمائی ہے۔ اگر مجاہدہ وصولِ حق کا وسیلہ ہوتا تو شیطان مردود نہ ہوتا اگر مجاہدے کا ترک مردود ہونے کی علت ہوتی تو حضرت آدم علیہ السلام ہرگز مقبول و مصفانہ ہوتے۔ لہٰذا حصولِ مقصد، فضل و عنایت الٰہی کی سبقت ہے نہ کہ کثرت مجاہدہ۔ اور یہ بات بھی نہیں کہ جو سب سے زیادہ مجاہدہ کرے وہ سب سے زیادہ محفوظ ہو بلکہ جس پر حق تعالیٰ کی عنایت زیادہ ہے وہی حق تعالیٰ سے زیادہ قریب ہے کوئی کلیسا میں رہ کر ہمیشہ طاعت میں مشغول رہتے ہوئے حق تعالیٰ سے دور رہے اور کوئی شراب خانہ میں رہ کر معصیت میں مبتلا ہو کر حق تعالیٰ سے قریب ہے۔ ہر لحاظ سے بچے کا ایمان سب سے زیادہ مشرف ہے کیونکہ وہ مکلّف نہیں ہے اس کا حکم، حکمی ایمان ہے۔ یہی حال دیوانوں کا ہے۔ ظاہر ہے کہ جب عنایت الٰہی میں زیادہ مشرف ہونے کے لئے مجاہدہ وسیلہ نہیں ہے تو جو بھی اس سے کم ہو اس کے لئے بھی وسیلہ کی محتاجی نہیں۔

حضور سیدنا داتا گنج بخش رحمتہ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ یہ تعبیر دو طرح پر خلافِ عمل ہے کیونکہ ایک قول ہے ''من طلب وجد'' جس نے چاہا پا لیا، اور دوسرا قول ہے ''من وجد طلب'' جس نے پایا وہ طالب ہوا۔ مطلب یہ ہے کہ پانے کا سبب طلب ہوتی ہے اور طلب کا

سبب پاتا ہے۔ ایک مجاہدہ کرتا ہے تاکہ مشاہدہ کرے، دوسرا مشاہدہ کرتا ہے تاکہ مجاہدہ کرے۔ اس کی حقیقت یہ ہے کہ مشاہدے میں مجاہدہ، طاعت میں توفیق الٰہی میسر آنے کی وجہ سے ہے جو خاص اس کا فضل اور عطا ہے۔ لہٰذا جب بے توفیق کے حصول کی طلب محال ہے تو حصولِ توفیق بھی بے طاعت محال ہے۔ جب بغیر مشاہدے کے مجاہدے کا وجود نہیں تو بے مجاہدہ کے مشاہدہ بھی ممکن نہیں اس کے لئے جمالِ الٰہی کا نور درکار ہے تاکہ مجاہدے میں بندے کی رہنمائی کر سکے۔ پھر جب مجاہدے کی علت، نور جمال الٰہی ہے تو مجاہدے پر ہدایت پہلے ہوئی لیکن یہ جماعت، یعنی حضرت سہیل اور ان کے اتباع جو دلیل دیتے ہیں کہ جو مجاہدے کا اثبات نہیں کرتا وہ تمام انبیاء، کتب سماوی اور شرائع کا منکر ہے کیونکہ تکلیف کا مدار مجاہدے پر ہے۔ اس سے بہتر یہ تھا کہ وہ یہ کہتے کہ تکلیف کا مدار حق تعالیٰ کی ہدایت پر منحصر ہے۔ مجاہدہ تو اثباتِ حجت کے لئے ہے نہ کہ وصل الٰہی کی حقیقت کے لئے۔ چونکہ حق تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ:

وَلَوْ اَنَّنَا نَزَّلْنَا اِلَيْهِمُ الْمَلٰٓئِكَةَ وَكَلَّمَهُمُ الْمَوْتٰى وَحَشَرْنَا عَلَيْهِمْ كُلَّ شَيْءٍ قُبُلًا مَّا كَانُوْا لِيُؤْمِنُوْٓا اِلَّآ اَنْ يَّشَآءَ اللّٰهُ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَهُمْ يَجْهَلُوْنَ (الانعام:١١١)

اگر ہم ان کی طرف فرشتوں کو اتاریں اور مُردوں کو ان سے کلام کرائیں اور تمام چیزوں کو ان کے روبرو اٹھائیں تب بھی وہ ہرگز ایمان نہ لائیں گے مگر یہ کہ اللہ اگر چاہے لیکن اکثر لوگ نادان ہیں۔

کیونکہ ایمان کی علت، ہماری مشیت ہے نہ کہ دلائل کے دیکھنے اور ان کے مجاہدے پر موقوف ہے نیز ارشاد حق ہے کہ:

اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا سَوَآءٌ عَلَيْهِمْ ءَاَنْذَرْتَهُمْ اَمْ لَمْ تُنْذِرْهُمْ لَا يُؤْمِنُوْنَ (البقرہ:٦)

بے شک جنہوں نے کفر کیا ان کے لئے برابر ہے کہ آپ انہیں ڈرائیں یا نہ ڈرائیں وہ ایمان لانے والے نہیں۔

کیونکہ کافروں کے لئے اظہار حجت اور ورودِ دلائل اور روزِ قیامت سے ڈرانا یا نہ ڈرانا دونوں برابر ہیں۔ وہ اس وقت تک ایمان لانے والے نہیں جب تک ہم انہیں اہل ایمان

ہونے کی توفیق نہ بخشیں۔ اس لئے کہ ان کے دلوں پر شقاوت و بدبختی کی مہر لگ چکی ہے۔ لہٰذا انبیاء علیہم السلام کی بعثت، کتابوں کا نزول اور احکام شریعت کا دردسب حق تعالیٰ سے ملنے کے اسباب ہیں نہ کہ علت۔ اس لئے کہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ قبول اسلام میں ایسے ہی مکلّف تھے جس طرح ابوجہل تھا لیکن حضرت صدیق رضی اللہ عنہ تو عدل اور فضل الٰہی کو پہنچ گئے لیکن ابوجہل بے عدل اور بے فضل ہی پڑا رہا۔ لہٰذا ابوجہل کے اس میں پڑے رہنے کی علت، عین وصول اور توفیق الٰہی سے محرومی ہے نہ کہ طلب وصول یعنی جدوجہد وغیرہ کیونکہ اگر طلب اور مطلوب دونوں برابر ہوتے تو طالب واجد ہوتا جب واجد ہوتا تو طالب نہ رہتا اس لئے کہ واجد تو واصل ہوتا ہے اور طالب کے لئے آرام درست نہیں۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

مَنِ اسْتَوٰی یَوْمَاہُ فَھُوَ مَغْبُوْنٌ جس کے دو دن یکساں رہیں وہ آفت زدہ ہے۔

مطلب یہ کہ طالبانِ حق کے لئے ہر دن پہلے دن سے برتر و بہتر ہونا چاہئے کیونکہ اس کا ہر دن ترقی پذیر ہے یہ طالبوں کا درجہ ہے پھر حضور نے فرمایا:

اِسْتَقِیْمُوْا وَلَنْ تُحْصِنُوْا استقامت پہ رہو اور ایک حال پہ نہ رہو۔

گویا حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے مجاہدے کو سبب قرار دیا اور حجت کے اثبات کے لئے سبب کا اثبات فرمایا اور تحقیق الٰہیت کے لئے سبب سے وصول کی نفی کر دی اور وہ جو یہ کہتے ہیں کہ گھوڑے کو سدھا کر محنت و مشقت کے ذریعہ دوسری صفت میں بدلا جا سکتا ہے تو اسے یوں سمجھنا چاہئے کہ گھوڑے میں ایک خاص صفت پوشیدہ ہوتی ہے جس کے اظہار کا سبب محنت و مشقت ہے جب تک اس پر محنت و مشقت نہ کی جائے اس صفت کا اظہار نہ ہوگا اور چونکہ گدھے میں وہ صفت سرے سے ہے ہی نہیں اس لئے وہ گھوڑے کی مانند ہوشیار نہیں ہو سکتا اور نہ گھوڑے کو محنت و مشقت کے ذریعہ گدھے کی مانند بنایا جا سکتا ہے چونکہ وہ صفت سرے سے ہے ہی نہیں اس لئے کہ یہ قلب عین یعنی ذات کی تبدیلی ہے لہٰذا جب کسی چیز کی عین و ذات نہیں بدل سکتی تو حق تعالیٰ کے لئے اس کا اثبات کرنا محال ہے حضرت سہیل تستری رحمتہ اللہ علیہ پر

مجاہدے کا ورود تھا کیونکہ وہ اس سے آزاد تھے اور ان کی ذات میں اس کا بیان منقطع تھا۔ وہ ان لوگوں میں سے نہیں تھے کہ جنہوں نے بغیر درستگی معاملہ، صرف بیان بازی کو اپنا مذہب بنا لیا ہو۔ یہ محال ہے کہ تمام اعمال و معاملات کی وضاحت صرف لفظ و بیان سے کی جائے۔ خلاصہ یہ کہ باتفاق، اہل طریقت میں ریاضت و مجاہدہ موجود ہے لیکن مجاہدہ کی حالت میں مجاہدے کی دید آفت ہے، لہٰذا جو حضرات مجاہدے کی نفی کرتے ہیں ان کی مراد، عین مجاہدے کی نفی نہیں بلکہ ان کی مراد، عدم رویت مجاہدہ اور اپنے ان افعال میں ہے جو بارگاہ قدس میں ظہور پذیر ہو رہے ہوں ان پر عجب و غرور نہ کرنا ہے اس لئے کہ مجاہدہ بندے کا فعل ہے اور مشاہدہ من جانب اللہ ہے اور جب تک عطائے حق نہ ہو، بندے کے افعال کی کوئی قدر و قیمت نہیں ایک زمانہ کے بعد وہ اپنے دل میں خود پالے گا کہ اس قدر دل کی آراستگی کی کوشش کی مگر فضل الٰہی کو نہ دیکھا اور کیوں اپنے افعال پر باتیں بنائیں۔ اس کے بعد معلوم ہونا چاہئے کہ حق تعالیٰ کے دوستوں کا مجاہدہ ان کے اپنے اختیار کے بغیر محض حق تعالیٰ کے فضل اس کے غلبہ اور اس کے سوز و گداز سے ہوتا ہے اور سوز و گداز کا ہونا سراسر حق تعالیٰ کی مہربانی ہے اور جاہلوں کا مجاہدہ خود ان کا اپنا فعل ہوتا ہے، جو پریشان کن ہے۔ پریشان ہونا اور دل کی پراگندگی، آفت کی پراگندگی سے ہوتی ہے لہٰذا تم سے جہاں تک ہو سکے اپنے فعل کا اظہار و بیان نہ کرو اور کسی حال میں نفس کی پیروی نہ کرو کیونکہ تمہاری ہستی کا وجود تمہارے لئے حجاب ہے۔ اگر تم کسی ایک فعل سے محجوب ہوئے تو دوسرا فعل اپنا سر اٹھائے گا۔ چونکہ تم سراپا حجاب ہو لہٰذا جب تک تم بالکل فانی نہ ہو گے اس وقت تک تم بقا کے لائق نہیں بنو گے۔

لان النفس کلب باغ وجلد الکلب لا یطھر الا بالدباغ

نفس باغی کتا ہے اور کتے کی کھال پکانے ہی سے پاک ہوتی ہے۔

درستگیٔ معاملہ کی مثال:

حضرت حسین بن منصور رحمتہ اللہ علیہ کوفہ میں محمد بن حسین علوی کے گھر مقیم تھے۔ حضرت ابراہیم خواص رحمتہ اللہ علیہ جب کوفہ تشریف لائے تو انہوں نے ان سے ملاقات کی اور

پوچھا کہ اے ابراہیم! طریقت میں آپ کو چالیس سال گزر چکے ہیں اس کے معانی میں آپ نے کیا حاصل کیا؟ انہوں نے فرمایا مجھے توکل کا طریقہ کامل طور سے حاصل ہوا ہے۔ حضرت حسین بن منصور نے کہا:

ضیعت عمرك فی عمران باطنك فاین الفنا فی التوحید

آپ نے اپنے باطن کی بستی میں اتنی عمر ضائع کردی پھر بھی آپ کو توحید میں فنا حاصل نہ ہوا۔

مطلب یہ ہے کہ توکل کے معنی تو یہ ہیں کہ اپنے معاملات کو حق تعالیٰ کے سپرد کر کے اپنے باطن کو اعتماد کے ساتھ درست رکھے اور جب کوئی ساری عمر، باطنی معاملات کی درستگی ہی میں صرف کردے تو ظاہری معاملات کی درستگی کے لئے اسے ایک اور عمر درکار ہوگی یہ دونوں عمریں ضائع ہونے کی بعد بھی اس پر حق کا کوئی اثر نہ ہوگا۔

نفس کی سرکشی کی مثال:

حضرت شیخ ابوعلی سیاہ مروزی رحمتہ اللہ علیہ بیان کرتے ہیں کہ میں نے نفس کو ایسی شکل میں دیکھا جو میری ہم صورت تھا کسی نے ان کے بال پکڑ رکھے تھے اس نے اسے میرے حوالہ کردیا میں نے اسے ایک درخت سے باندھ دیا اس کے بعد میں نے اسے ہلاک کردینے کا ارادہ کیا۔ اس نے مجھ سے کہا اے ابوعلی! زحمت نہ اٹھاؤ میں خدا کا لشکری ہوں تم مجھے فنا نہیں کر سکتے۔

نفس کی الٹی خصلت کی مثال:

حضرت محمد بن علیان نسوی جو حضرت جنید بغدادی رحمتہ اللہ علیہ کے اکابر اصحاب میں سے تھے بیان کرتے ہیں کہ ابتدائے حال میں جب میں نفس کی آفتوں پر بینا ہوا اور اس کی خفیہ پناہ گاہوں سے واقف ہوا اسی وقت میرے دل میں نفس کی طرف سے کینہ ہوگیا تھا۔ ایک دن لومڑی کے بچے کی مانند کوئی چیز میرے حلق سے باہر نکلی۔ حق تعالیٰ نے مجھے اس سے واقف کرایا

اور میں جان گیا کہ وہ نفس ہے میں اسے پاؤں سے روندنے لگا اور ٹھوکریں مارنے لگا مگر وہ بڑھتا ہی رہا۔ اس وقت میں نے کہا اے نفس! ہر چیز مارنے اور زخمی کرنے سے ہلاک ہو جاتی ہے تو اس کے برعکس بڑھتا ہی جاتا ہے اس کی وجہ کیا ہے؟ نفس نے کہا میری تخلیق الٹی ہے۔ اوروں کو جو چیزیں تکلیف پہنچاتی ہیں وہ مجھے آرام و راحت پہنچاتی ہیں اور جو چیزیں دوسروں کو آرام و راحت پہنچاتی ہیں وہ مجھے تکلیف دیتی ہیں۔

کتے کی شکل میں نفس کا ظہور:

حضرت شیخ ابوالعباس شقانی رحمۃ اللہ علیہ جو امام وقت تھے فرماتے ہیں کہ ایک دن میں گھر آیا تو زرد رنگ کے ایک کتے کو اپنے بستر پر سوتا ہوا پایا۔ میں نے خیال کیا کہ شاید محلّہ کا کتا گھس آیا ہے اسے باہر نکالنے کا ارادہ کیا مگر وہ میرے دامن میں گھس کر غائب ہو گیا۔

مختلف صورتوں میں نفس کا ظہور:

حضرت شیخ ابوالقاسم گرگانی جو آج قطب زمانہ اور طریقت کے دارالمہام ہیں...... ابقاہ اللہ تعالیٰ۔ وہ اپنے ابتدائے حال کی ایک نشانی بیان کرتے ہیں کہ میں نے نفس کو سانپ کی صورت میں دیکھا ہے اور ایک بزرگ بیان کرتے ہیں کہ میں نے نفس کو چوہے کی شکل میں دیکھا ہے تو میں نے اس سے پوچھا تو کون ہے؟ اس نے کہا میں غافلوں کو ہلاکت میں ڈالنے والا، ان کو شرارت و برائی کی طرف بلانے والا اور دوستوں کی نجات ہوں۔ چونکہ میرا وجود سراپا آفت ہے تو وہ اپنی پاکی و طہارت پر نازاں ہو کر اپنے افعال پر تکبر کرنے لگتے ہیں وجہ یہ کہ جب وہ دل کی پاکیزگی، سیرت کی صفائی، نورِ ولایت اور طاعت پر اپنی استقامت کو دیکھتے ہیں تو ہوا و تکبر ان میں پیدا ہو جاتا ہے پھر جب وہ اپنے پہلو میں مجھے دیکھتے ہیں تو وہ ان تمام عیبوں سے پاک ہو جاتے ہیں۔

یہ تمام امثال و حکایات اس بات کی دلیل ہیں کہ نفس مستقل ذات ہے نہ کہ صفت، البتہ نفس کی کچھ صفات بھی ہیں جن کو ہم ظاہر طور پر دیکھتے ہیں۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد

ہے:

اَعدیٰ عَدُوِّكَ نَفْسُكَ الَّتِیْ بَیْنَ جَنْبَیْكَ — تمہارا سب سے بڑا دشمن تمہارا وہ نفس ہے جو دونوں پہلو کے درمیان ہے۔

لہٰذا جسے نفس کی معرفت ہو جاتی ہے وہ جان لیتا ہے کہ اسے ریاضت و مجاہدے کے ذریعہ ہی قابو میں لایا جا سکتا ہے۔ چونکہ نفس کی اصل و ماہیت اچھی نہیں ہے اگر طالب کو اس کی صحیح طور پر پہچان ہو جائے تو اس کی موجودگی میں بھی اسے کوئی خطرہ نہیں ہوتا۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:

لِاَنَّ النَّفْسَ کَلْبٌ بِنَاحٍ وَاِمْسَاكُ الْكَلْبِ بَعْدَ الرِّیَاضَةِ مُبَاحٌ — اس لئے کہ نفس آزاد کتا ہے سکھانے کے بعد کتے کو باندھنا مباح ہے۔

لہٰذا مجاہدہ، نفس کی صفات کو تو فنا کر دیتا ہے لیکن اس کی ذات کو ناپید نہیں کرتا۔ اس بارے میں مشائخ کے اقوال بکثرت ہیں بخوف طوالت، اسی پر اکتفا کرتا ہوں۔ اب ہوا کی حقیقت اور ترکِ شہوت کی بحث شروع کرتا ہوں۔ وباللہ التوفیق۔

ہوا کی حقیقت اور ترکِ شہوت کی بحث

اے عزیز! اللہ تعالیٰ تمہیں عزت دے، جاننا چاہئے کہ ایک گروہ کے نزدیک اصناف نفس میں سے ایک وصف ہوا یعنی خواہش ہے اور ایک گروہ کے نزدیک طبعی ارادہ خواہش کا متصرف و مدبر ہے اس کا نام ہوا ہے۔ جس طرح روح کے لئے عقل ہے اور اور ہر وہ روح جس کی اپنی افزائش میں عقلی قوت نہ ہو ناقص ہوتی ہے اسی طرح ہر وہ نفس جس کے لئے ہوا کی قوت نہ ہو ناقص ہوتی ہے لہٰذا روح کا ناقص ہونا قربت کا نقص ہے اور نفس کا ناقص ہونا عین قربت ہے۔ بندہ کے لئے ہمیشہ دو دعوتیں ہوتی ہیں ایک عقل کی طرف سے دوسری ہوا کی طرف سے۔ جو عقل کی دعوت کو قبول کر کے اس کا مطیع بن گیا وہ صاحب ایمان ہو گیا اور جو ہوا کی دعوت کو قبول کر کے اس کا فرمانبردار بن گیا وہ ضلالت و کفر میں پڑ گیا۔ لہٰذا ہوا واصلوں کے لئے حجاب

اور گمراہ کرنے والی چیز ہے۔ غافلوں کے لئے جائے قیام ہے اور طالبوں کے لئے محل اعراض ہے۔ بندے کو اس کے خلاف عمل کرنے کا حکم دیا گیا ہے اور اسے اس کے ارتکاب سے روکا گیا ہے۔

لان من ركبها هلك ومن خالفها ملك — جس نے اس کی سواری کی یعنی فرمانبرداری کی وہ ہلاک ہوا اور جس نے اس کے خلاف کیا وہ مالک ہوا۔

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

وَاَمَّا مَنْ خَافَ مَقَامَ رَبِّهٖ وَنَهَى النَّفْسَ عَنِ الْهَوٰى فَاِنَّ الْجَنَّةَ هِيَ الْمَاْوٰى (النّٰزعٰت:۴۰) — جو اپنے رب کے حضور کھڑے ہونے سے ڈرتے اور نفسانی خواہشوں سے بچتے ہیں یقیناً انہی کے لئے جنت میں ٹھکانا ہے۔

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ:

اَخْوَفُ مَا اَخَافُ عَلٰى اُمَّتِيْ اِتِّبَاعُ الْهَوٰى وَطُوْلُ الْاَمَلِ — میری امت پر سب سے زیادہ خوفناک ہوا کی پیروی اور امیدوں کی درازی ہے۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما آیہ کریمہ کی تفسیر میں فرماتے ہیں کہ:

اَرَئَيْتَ مَنِ اتَّخَذَ اِلٰهَهٗ هَوَاهُ اَیْ اَلْهَوٰى اِلٰهاً مَّعْبُوْدًا (الفرقان:۴۳) — کیا تم نے اسے دیکھا جس نے اپنی ہوا کو اپنا معبود بنا لیا ہے یعنی خواہش کو اپنا خدا بنا لیا ہے

وہ شخص قابل افسوس ہے جس نے حق تعالیٰ کے سوا اپنی خواہش کو اپنا خدا ٹھہرا کر اپنی طاقتیں رات دن اس کی اطاعت و چاپلوسی میں صرف کر دی ہیں۔

خواہشات نفسانیہ کی قسمیں:

تمام نفسانی خواہشیں دو قسم کی ہیں ایک لذت اور شہوت کی دوسرے لوگوں میں عزت و منزلت کی۔ جو شخص کسی لذت کا غلام ہے وہ شراب خانہ میں ہے لوگ اس کے فتنہ سے محفوظ ہیں

لیکن جو شہوت اور لوگوں میں عزت و منزلت کا خواہش مند ہے وہ حرص و طمع اور خواہشات کے چکروں میں پھنسا ہوا ہے۔ وہ لوگوں کے لئے فتنہ ہے۔ خود تو راہِ حق سے برگشتہ ہے ہی دوسروں کو بھی اس گمراہی میں پھنساتا ہے۔ نعوذ باللہ من متابعة الھوٰی۔

جس کی حرکتیں خواہش نفس کی پیرو ہیں اور وہ ان کا دلدادہ ہے وہ حق تعالیٰ سے دور ہے اگر چہ وہ تمہارے ساتھ مسجد میں شریک جماعت ہی کیوں نہ ہو اور جس کی حرکتیں خواہشات سے پاک ہیں اور وہ اس کی پیروی سے نفرت کرتا ہے وہ حق تعالیٰ کے نزدیک ہے اگر چہ کسی دیر ہی میں کیوں نہ ہو۔

ایک راہب کی نفس کشی:

حضرت ابراہیم خواص رحمتہ اللہ علیہ بیان کرتے ہیں کہ ایک مرتبہ میں نے سنا کہ روم میں راہب ہے جو ستر سال سے کنیسہ میں زہد و رہبانیت میں مشغول ہے میں نے تعجب سے کہا کہ رہبانیت کی شرط تو چالیس سال ہوتی ہے یہ آدم زاد کس مذہب پر ستر سال سے کنیسہ میں بیٹھا ہوا ہے۔ چنانچہ میں اس سے ملنے گیا۔ اس نے کھڑکی کھول کر مجھ سے بات چیت کی اور کہا کہ اے ابراہیم! میں جانتا ہوں کہ تم کس لئے آئے ہو میں یہاں رہبانیت کی غرض سے ستر سال سے نہیں بیٹھا ہوں بلکہ میرے پاس ایک کتا ہے جو خواہش میں سرکش ہے میں اس کتے کی رکھوالی کر رہا ہوں تا کہ لوگ اس کے شر سے محفوظ رہیں ورنہ میں یہاں نہ ہوتا۔ میں نے جب راہب کی یہ بات سنی تو خدا سے مناجات کی کہ اے خدا تو بڑا قادر ہے، کھلی گمراہی میں پڑے ہوئے شخص کو بھی صحیح راستہ دکھاتا ہے۔ پھر راہب نے مجھ سے کہا اے ابراہیم! تم کب تک لوگوں کی طلب میں رہو گے جاؤ پہلے اپنے آپ کو طلب کرو جب تم اپنے آپ کو پا جاؤ تو اس کی نگہبانی کرو کیونکہ ہر روز یہ ہوا یعنی نفسانی خواہش تین سو ساٹھ قسم کی الوہیت کا لباس پہن کر بندے کو گمراہی کی طرف بلاتی ہے۔

غرض کہ شیطان کا بندے کے دل اور باطن پر اس وقت تک قبضہ نہیں ہوسکتا جب تک کہ معصیت و نافرمانی کا جذبہ اور خواہش اس کے اندر نہ ابھر آئے۔ جس وقت بندے کے

اندر خواہش نے سر اٹھایا اسی وقت شیطان کا اس پر قبضہ ہو جاتا ہے وہ دل میں آرام کرتا ہے اور اس کے باطن میں جم کر بیٹھ جاتا ہے اس حالت کا نام "وسواس" ہے۔ اس کی ابتداء ہوا و خواہش سے ہوتی ہے "والبادی اظلم" پہل کرنے والا زیادہ ظالم ہوتا ہے۔ یہ مطلب اللہ تعالیٰ کے اس فرمان سے ماخوذ ہے جو اللہ نے ابلیس سے فرمایا تھا اور اس نے کہا تھا میں تمام آدمیوں کو راہِ حق سے ورغلاؤں گا حق تعالیٰ نے فرمایا:

اِنَّ عِبَادِیْ لَیْسَ لَکَ عَلَیْهِمْ سُلْطَانٌ (الحجر:۴۲) اے ابلیس میرے خاص بندوں پر تیرا کوئی قبضہ و اختیار نہیں ہے۔

درحقیقت شیطان ہی بندے کا نفس و ہوا ہے اسی وجہ سے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ:

وَمَا مِنْ اَحَدٍ اِلَّا وَقَدْ غَلَبَهٗ شَیْطَانُهٗ اِلَّا عُمَرَ فَاِنَّهٗ غَلَبَ شَیْطَانَهٗ کوئی شخص ایسا نہیں ہے جس پر اس کا شیطان غالب نہ آتا ہو بجز حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے کہ وہ اپنے شیطان پر غالب آ گئے ہیں۔

اس حدیث میں شیطان سے مراد، بندے کی نفسانی خواہشیں ہیں لہٰذا آدمی کے سرشت میں ہی ہوا کی ترکیب ہے جیسا کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:

اَلْهَوٰی وَالشَّهْوَةُ مَعْجُوْنَةٌ بِطِیْنَةِ ابْنِ اٰدَمَ ہوا اور شہوت سے ابن آدم کا خمیر مرکب ہے۔

ترکِ ہوا بندے کو امیر کرتا ہے اور اس کا ارتکاب امیر کو اسیر بناتا ہے چنانچہ زلیخا نے ہوا یعنی خواہش کا ارتکاب کیا وہ امیر تھی اسیر ہو گئی حضرت یوسف علیہ السلام نے ترکِ ہوا کیا تو وہ اسیر تھے پھر امیر بن گئے۔

حضرت جنید بغدادی رحمۃ اللہ علیہ سے کسی نے پوچھا "ما الوصل قال ترک ارتکاب الهوی" وصل کیا ہے فرمایا خواہش کے ارتکاب کو ترک کرنا۔

جو شخص چاہتا ہے کہ حق تعالیٰ کے وصال سے مشرف ہو اس سے کہو کہ جسم کو خواہش کے خلاف کرے کیونکہ بندہ کو کوئی عبادت حق سے اتنا قریب نہیں کرتی جتنی ہوا کی مخالفت، ہوا کی مخالفت کرنے والا ہی زیادہ بزرگ ہے کیونکہ آدمی کے لئے ناخن سے پہاڑ کھودنا اس سے زیادہ آسان ہے کہ وہ اپنی خواہش کے خلاف کرے۔

خواہش پر قدم رکھ کر اڑنا:

حضرت ذوالنون مصری رحمتہ اللہ علیہ بیان کرتے ہیں کہ میں نے ایک شخص کو دیکھا جو فضا میں اڑ رہا تھا میں نے اس سے پوچھا کہ تمہیں یہ کمال کیسے حاصل ہوا؟ اس نے کہا میں ہوائے نفس پر قدم رکھ کر ہوا میں اڑ جاتا ہوں۔

حضرت محمد بن فضل بلخی رحمتہ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ مجھے اس شخص پر تعجب ہوتا ہے جو نفسانی خواہش کو لے کر خانہ کعبہ جاتا ہے اور اس کی زیارت کرتا ہے۔ وہ ہوائے نفس پر قدم کیوں نہیں رکھتا تاکہ وہ حق تعالیٰ تک پہنچے اور اس کا دیدار پائے۔

نفسانی شہوت:

نفس کی سب سے بڑھ کر ظاہر صفت شہوت ہے اور شہوت کے معنی آدمی کے تمام اعضا میں انتشار پیدا ہونا ہے بندے کو ان کے تحفظ کی تکلیف دی گئی ہے قیامت کے دن ہر ایک عضو کے افعال کی بابت سوال ہوگا چنانچہ آنکھ کی شہوت، دیکھنا، کان کی شہوت، سننا، ناک کی شہوت، سونگھنا، زبان کی شہوت، بولنا، تالو کی شہوت، چکھنا، جسم کی شہوت، چھونا اور سینہ کی شہوت، سوچنا ہے۔ لہٰذا طالب پر لازم ہے کہ وہ اپنے وجود کا حاکم و نگہبان بنے اور دن و رات اس کی حفاظت کرے یہاں پر تک کہ خواہش کے ہر داعیہ کو جو اس میں ظاہر ہو اپنے سے جدا کر دے اور اللہ تعالیٰ سے دعا مانگے کہ وہ اسے وہ صفت عطا فرمائے تاکہ اس کے باطن سے ہر خواہش دور ہو جائے کیونکہ جو شہوت کے بھنور میں پھنسا رہتا ہے وہ ہر لحاظ سے محجوب رہتا ہے۔ اگر بندہ اپنی طاقت سے اسے دور کرنا چاہے تو یہ بندے کے لئے سخت دشوار ہوتا ہے اور اس کے جنس کا

ورود پے در پے ہوتا رہتا ہے۔اس کا چارۂ کار طریق تسلیم ہے تا کہ مراد حاصل ہو۔

مقام عبرت:

حضرت ابوعلی سیاہ مروزی رحمتہ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ میں ایک دن حمام میں گیا اور سنت کے مطابق استرہ استعمال کر رہا تھا۔ میں نے اپنے دل میں سوچا کہ اے ابوعلی اس عضو کو جو تمام شہوتوں کی جڑ ہے اور اس سے تجھے کتنی آفتوں میں مبتلا ہونا پڑتا ہے، اپنے سے جدا کر کے کیوں نہیں پھینک دیتا تا کہ تو شہوت کی ہر آفت سے محفوظ رہے۔اسی لمحہ ایک آواز محسوس ہوئی کہ اے ابوعلی! تم ہماری مِلک میں تصرف کر رہے ہو ہمارے بنائے ہوئے کسی عضو سے کوئی دوسرا عضو زیادہ بہتر نہیں ہے مجھے اپنی عزت کی قسم اگر تم نے اسے کاٹ کر پھینک دیا تو میں تمہارے ہر بال کو سو گنا شہوت دے کر اس کا قائم مقام بنا دوں گا۔اسی مفہوم میں یہ شعر ہے:

تبتغی الاحسان دع احسانك

اترك بخشى الله ريحانك

تو احسان کا متلاشی ہے۔ اپنے احسان کو چھوڑ

خوفِ خدا سے سب کو چھوڑ دے اسی میں تیری راحت ہے

بندے کے لئے اس کے جسم کے کسی حصہ کی بنا پر فساد نہیں ہے بلکہ تبدیل صفت میں خرابی و فساد ہے اور توفیق الٰہی اور تسلیم اور امر و نواہی میں اپنے تصرف اختیار اور قوت کے ذریعہ تغیر و تبدل سے خرابی پیدا ہوتی ہے۔

درحقیقت جب تسلیم کا مرتبہ حاصل ہو جاتا ہے تو اس میں عصمت و حفاظت آ جاتی ہے اور بندہ خدا کی حفاظت میں رہ کر مجاہدے کے مقابلہ میں زیادہ محفوظ اور فنائے آفت میں نزدیک تر ہو جاتا ہے۔

لان نفى الذباب بالمكنة ايسر من نفيه بالمذبة	اس لئے کہ مکھی کو جھاڑو سے دور کرنا آسان ہے بمقابلہ لاٹھی کے

لہٰذا خدا کی حفاظت، تمام آفتوں سے بچانے والی ہے اور تمام علتوں کو دور کرنے والی

ہے اور کسی صفت میں بھی بندہ اس کا شریک نہیں ہے جیسا کہ اس کا ارشاد ہے کہ اس کے ملک میں کوئی تصرف کر ہی نہیں سکتا جب تک کہ عصمتِ الٰہی مقدر نہ ہو جائے بندہ اپنی قوتوں سے محفوظ نہیں رہ سکتا اگر توفیق الٰہی میسر نہ ہو تو اس کی تمام کوششیں رائیگاں اور بے فائدہ ہو جاتی ہیں۔ بندے کی تمام کوششیں دو ہی صورتوں کے لئے ہو سکتی ہیں یا تو اس لئے کہ کوشش کے ذریعہ اپنی جانب سے تقدیر الٰہی کو بدل دے یا تقدیر کے خلاف اپنے لئے کوئی اور چیز بنائے حالانکہ یہ دونوں صورتیں ممکن نہیں ہیں نہ تو کوشش سے تقدیر کو بدلا جا سکتا ہے اور نہ بغیر تقدیر کے کوئی کام ہو سکتا ہے۔

اٹل تقدیر کی مثال:

حضرت شبلی علیہ الرحمتہ جب بیمار ہوئے تو ایک طبیب ان کے پاس آیا اور اس نے مشورہ دیا کہ پرہیز کیا جائے۔ آپ نے پوچھا کس چیز سے پرہیز کیا کروں کیا اس سے جو میری روزی ہے یا اس چیز سے جو میری روزی نہیں ہے۔ اگر پرہیز روزی سے متعلق ہے تو یہ ممکن ہی نہیں۔ اگر اس کے سوا کچھ اور ہے تو وہ اللہ تعالیٰ مجھے دیتا ہی نہیں۔

ان المشاهدة لا تجاهد — جسے مشاہدہ حاصل ہو جاتا ہے وہ مجاہدہ نہیں کرتا۔

اس مسئلہ کو کسی اور جگہ مزید بیان کروں گا۔

(۷) فرقہ حکمیہ

فرقہ حکمیہ کے پیشوا حضرت ابو عبداللہ محمد بن علی حکیم ترمذی رحمتہ اللہ علیہ ہیں جو اپنے زمانہ کے امام وقت، تمام ظاہری و باطنی علوم کے ماہر، صاحب تصانیف کثیرہ ہیں۔ ان کے مذہب کی خصوصیت اثبات ولایت اور اس کے قواعد و درجات کا بیان ہے۔ آپ حقیقت کے معانی اور اولیاء کے درجات اس ترتیب اور ایسے انداز سے واضح فرماتے تھے گویا وہ ایک بحر بے پایاں تھے جس میں بکثرت عجیب و غریب چیزیں تھیں۔ ان کے مذہب کی ابتدائی وضاحت یہ

ہے کہ وہ ہر شخص کو یہ بتانا اور سکھانا چاہتے تھے کہ اولیاء اللہ کی شان یہ ہے کہ حق تعالیٰ ان کو دنیا میں برگزیدہ کر کے ان کی ہمتوں کو متعلقات سے جدا کر کے اور نفس وہوا کے ہر داعیہ سے منزہ بنا کر کسی نہ کسی درجہ پر فائز فرماتا ہے اور جو معانی کا دروازہ ان پر کھول دیا گیا ہے اس کا کلام طویل ہے۔ چند اصول وقواعد کے لئے بھی شرح درکار ہے۔ اب میں بر سبیل اختصار اس تحقیق کو ظاہر کرتا ہوں اور ان کے کلام کے اسباب واوصاف بیان کرتا ہوں۔

اثباتِ ولایت کی بحث

واضح رہنا چاہئے کہ تصوف ومعرفت کے طریقہ کے اصول وقواعد، اور تمام ولایتوں کی پہچان اور اس بات کے سلسلہ میں اتنا جان لینا کافی ہے کہ تمام مشائخ کا اس پر اتفاق ہے البتہ ہر ایک نے ولایت کا اثبات جداگانہ انداز میں کیا ہے۔ چنانچہ حکیم ترمذی حقیقت وطریقت کے معانی کے بیان واطلاق میں خاص کمال رکھتے تھے۔

ولایت کی تحقیق:

ولایت، واوٗ کے زبر سے اس کے لغوی معنی ''تصرف کرنا'' ہے اور ولایت، واوٗ کے زیر سے اس سے معنی امارت وحکومت کے ہیں۔ دونوں کا مصدر بروزنِ فعلی ولیۃ ہے۔ نیز ولایت کے معنی ربوبیت کے بھی ہیں۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے ''هُنَالِكَ الْوَلَايَةُ لِلّٰهِ الْحَقِّ '' (الکہف:۴۴) اس جگہ ولایت یعنی ربوبیت اللہ تعالیٰ ہی کا حق ہے کیونکہ کفار اس سے التجا کرتے ہیں اور اپنے خداؤں سے اظہارِ بیزاری کرتے ہیں نیز ولایت کے ایک معنی محبت کے بھی ہیں۔

لفظ وَلی کی تحقیق:

لفظ وَلی فعیل کے وزن پر مفعول کے معنی میں بھی ممکن ہے جیسا کہ ارشادِ باری تعالیٰ ہے کہ ''وَهُوَ يَتَوَلَّى الصّٰلِحِيْنَ '' اللہ تعالیٰ نیکوں کا کارساز ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ اپنے نیک

بندوں کو ان کے افعال واوصاف کے ساتھ نہیں چھوڑتا اور اپنی حفاظت و پناہ کی چادر میں چھپا لیتا ہے اور یہ بھی ممکن ہے کہ لفظ وَلی اسم فاعل کے معنی میں مبالغہ کے طور پر آیا ہو؟ کیونکہ بندہ طاعت میں خوب محبت کا اظہار کرتا ہے اور اس کے حقوق کی ہمیشہ نگہبانی کرتا ہے اور اس کے غیر سے مُنہ موڑ لیتا ہے۔ ایسا شخص مرید کہلائے گا اور اللہ تعالیٰ مراد۔ یہ تمام معانی، حق کا بندہ کے ساتھ ہونا یا بندہ کا حق کے ساتھ ہونا دونوں صورتوں میں جائز ہیں۔ یہ بھی جائز ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے نیک بندوں کا مددگار ہو کیونکہ اس نے ان کی مدد کا وعدہ فرمایا ہے جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے ان دوستوں سے جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ ہیں مدد کا وعدہ کرتے ہوئے فرمایا ہے کہ:

اَلَآ اِنَّ نَصْرَ اللّٰہِ قَرِیْبٌ — آگاہ رہو اللہ کی نصرت قریب ہے

نیز ارشاد ہے:

وَاَنَّ الْکٰفِرِیْنَ لَا مَوْلٰی لَھُمْ اَیْ لَا نَاصِرَ لَھُمْ (محمد:١١) — یقیناً کافروں کا کوئی مولیٰ یعنی مددگار نہیں ہے۔

جب کافروں کا کوئی مددگار نہیں ہے تو لامحالہ مسلمانوں کا کوئی مددگار ضرور ہونا چاہئے جو ان کی مدد کرے۔ اور وہ اللہ تعالیٰ ہے۔ جو آیات و دلائل کے لانے میں ان کی عقلوں کے اور معانی کے بیان کرنے میں اور ان کے اسرار منکشف کرنے کے لئے ان کے دلوں کے دروازے کھول دیتا ہے اور تمام مسلمانوں کو نفس و شیطان کی مخالفت اور احکام الٰہیہ کی متابعت کرنے میں مدد دیتا ہے۔

دوسرے یہ بھی جائز ہے کہ محبت و خلت میں انہیں مخصوص فرما کر دشمنی کے مقامات سے محفوظ رکھے جیسا کہ ارشاد ہے "یُحِبُّھُمْ وَیُحِبُّوْنَہٗ" (المائدہ:۵۴) وہ خدا سے محبت کرتے ہیں اور خدا انہیں محبوب رکھتا ہے۔ تا کہ ان کی دوستی خدا کے لئے ہو اور انہیں کو دوست رکھے۔ اور یہ بھی جائز ہے کہ کسی کو ولایت عطا فرما کر طاعت پر قائم رکھے اور اپنی حفاظت و پناہ میں رکھے تا کہ وہ اطاعتِ الٰہی پر قائم رہیں اور اس کی مخالفت سے اجتناب کریں یہاں تک کہ ان کی حسنِ طاعت کو دیکھ کر شیطان ذلیل ہو کر بھاگے اور یہ بھی جائز ہے کہ کسی کو ولایت اس

لئے عطا فرمائے کہ اس کی عقدہ کشائی سے ملک میں عقدہ کشائی ہو اور تمام بندوبست اور امور تکوینیہ ان کے قبضہ میں دے کر ان کی دعاؤں کو مستجاب اور ان کے انفاس کو مقبول بنائے جیسا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے:

رُبَّ اَشْعَثَ اَغْبَرَ ذِیْ طِمْرَیْنِ لَایُعْبَأُ بِهٖ لَوْ اَقْسَمَ عَلَی اللّٰهِ لَاَبَرَّهٗ

بکثرت بندگانِ خدا پریشان حال، غبار آلود بال بکھرے، کپڑے پھٹے، ایسے ہیں جن کی لوگ پرواہ نہیں کرتے اگر وہ کسی معاملہ میں اللہ کی قسم کھائیں تو اللہ ان کی قسموں کو ضرور پورا کرتا ہے۔

فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کی حقیقی امارت کی مثال:

مشہور واقعہ ہے کہ سیدنا فاروق اعظم عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ کے عہدِ خلافت میں حسب قدیم دریائے نیل کا پانی خشک ہو گیا۔ چونکہ زمانۂ جاہلیت میں دستور تھا کہ ہر سال ایک جوان خوبصورت لڑکی زیورات سے آراستہ کر کے دریا کو بھینٹ چڑھائی جاتی تھی تب جا کر دریا جاری ہوتا تھا۔ (مصر کے گورنر نے یہ واقعہ لکھ کر آپ کی خدمت میں بھیجا آپ نے گورنر کے حکم کی توثیق کرتے ہوئے) ایک کاغذ کے پرچہ پر لکھ کر ارسال فرمایا (اور گورنر کو حکم دیا کہ یہ رقعہ دریائے نیل میں پڑھ کر ڈال دیں۔ اس رقعہ پر تحریر تھا کہ) اے پانی! اگر تو اپنی مرضی سے رکا ہے تو جاری نہ ہو اور اگر خدا کے حکم سے رکا ہے تو عمر کہتا ہے کہ جاری ہو جا۔ جب رقعہ پڑھ کر پانی میں ڈالا گیا تو پانی جوش مارتا ہوا جاری ہو گیا (اس کے بعد آج تک اس کا پانی خشک نہیں ہوا) فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کی یہ امارت حقیقی تھی۔

میری مراد، ولایت اور اس کے اثبات سے یہی حقیقی امارت ہے۔ اب تم سمجھ لو کہ وَلی کا نام اسی کے لئے جائز ہے جس میں مذکورہ معانی موجود ہوں جیسا کہ ہم نے بیان کیا ہے اور وہ صاحب حال ہو نہ کہ صاحب قال اور مالک بحث و جدال۔ اسی لئے گزشتہ مشائخ نے اس سلسلہ

میں بکثرت کتابیں تصنیف فرمائی ہیں جو نایاب ہوتی جارہی ہیں۔ اب صاحب مذہب حضرت حکیم ترمذی رحمۃ اللہ علیہ کی مراد اور اس کی خوبیاں بیان کرتا ہوں کیونکہ مجھ کو ان سے حد درجہ حسن عقیدت ہے خدا کرے کہ ہر طالب راہِ حق اور اس کتاب کے پڑھنے والے کو فائدہ پہنچے اور سعادت حاصل کرے۔

واضح رہنا چاہئے کہ لفظِ وَلی لوگوں میں بہت مستعمل ہے اور کتاب وسنت اس پر ناطق وشاہد ہے۔

نام ولی کے اطلاقات:

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

اَلَآ اِنَّ اَوْلِيَآءَ اللّٰهِ لَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ (یونس:۶۲)

خبردار! اللہ کے اولیاء وہ ہیں جن پر نہ خوف ہوتا ہے اور نہ حزن وملال

اور ارشاد ہے:

نَحْنُ اَوْلِيَآؤُكُمْ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَفِي الْاٰخِرَةِ (حم السجدہ:۳۱)

ہم تمہاری دنیاوی اور اخروی زندگانی میں مددگار ہیں۔

اور ارشاد ہے:

اَللّٰهُ وَلِيُّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا

ایمان داروں کا مددگار اللہ ہی ہے۔

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

اِنَّ مِنْ عِبَادِ اللّٰهِ لَعِبَادًا يَّغْبِطُهُمُ الْاَنْبِيَاءُ وَالشُّهَدَاءُ

بلاشبہ بندگان خدا میں سے کچھ بندے ایسے ہیں جن پر انبیاء وشہداء غبطہ (رشک) کرتے ہیں۔

صحابہ نے عرض کیا ''يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ صِفْهُمْ لَنَا لَعَلَّنَا نُحِبُّهُمْ'' یارسول اللہ! ہمیں ان کی پہچان بتائیے تاکہ ہم ان سے محبت قائم رکھیں۔ آپ نے فرمایا:

قَوْمٌ تَحَابُّوْا بِرُوْحِ اللّٰهِ مِنْ غَيْرِ اَمْوَالٍ وَاكْتِسَابٍ وُجُوْهُهُمْ نُوْرٌ عَلٰى مَنَابِرَ مِنْ نُوْرٍ لَايَخَافُوْنَ اِذَا خَافَ النَّاسُ وَلَا يَحْزَنُوْنَ اِذَا حَزِنَ النَّاسُ ثُمَّ تَلَا اَلَا اِنَّ اَوْلِيَآءَ اللّٰهِ لَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ۔

یہ وہ لوگ ہیں جو مال و محنت کے بغیر صرف ذات الٰہی سے محبت رکھتے ہیں ان کے چہرے نور کے مناروں پر روشن و تاباں ہیں۔ لوگوں کے خوف کے وقت یہ بے خوف اور ان کے غموں کے وقت یہ بے غم ہیں پھر آپ نے یہ آیت تلاوت فرمائی کہ بے شک اللہ کے اولیاء وہ ہیں جن پر نہ خوف ہے اور نہ حزن و ملال۔

ایک حدیث قدسی میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

مَنْ اٰذٰی وَلِیًّا فَقَدِ اسْتَحَلَّ مُحَارِبَتِیْ

جس نے میرے ولی کو ایذا دی اس سے میرا لڑنا حلال ہو گیا۔

کتاب و سنت کے ان دلائل سے مراد یہ ہے کہ اولیاء اللہ کی شان یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو اپنی دوستی و ولایت سے مخصوص کر کے اپنے ملک کا والی بنایا ہے اور ان کے احوال کو برگزیدہ کر کے اپنے فعل و اظہار کا مرکز بنایا ہے اور متعدد کراموں سے سرفراز کر کے ان کی طبع کی آفتوں اور نفس و ہوا کی پیروی سے پاک و منزہ فرمایا ہے تا کہ ان کے تمام ارادے خدا کے لئے ہی ہوں اور ان کی محبت اسی سے ہو۔ زمانہ ماضی میں ہم سے پہلے بھی اولیاء اللہ گزرے ہیں اور آج بھی موجود ہیں اور قیامت تک ہوتے رہیں گے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے اس امت کو تمام گزشتہ امتوں پر شرافت و بزرگی عطا فرمائی ہے اور ضمانت دی ہے کہ میں شریعت محمدیہ علی صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کی ہمیشہ حفاظت فرماؤں گا۔ اس پر دلائل نقلیہ اور براہین عقلیہ علماء کے درمیان آج بھی موجود ہیں اور غیبی دلائل بھی کہ اولیاء اللہ اور خاصانِ خدا کا موجود ہونا ضروری ہے۔ اس مسئلہ میں ہمارا اختلاف دو گروہ سے ہے ایک معتزلہ سے دوسرے حشویوں سے۔ معتزلہ، ایمانداروں میں ایک کی دوسرے پر تخصیص کا انکار کرتے ہیں۔ حالانکہ ولی کے خاص ہونے سے انکار کرنا نبی کے انکار کو مستلزم ہے اور یہ کفر

ہے اور عام حشوی، اگر چہ تخصیص کو جائز تو رکھتے ہیں لیکن ساتھ ہی یہ کہتے ہیں کہ ولی ہوئے تو ہیں لیکن آج نہیں ہیں۔ حالانکہ ماضی و حال و مستقبل کا انکار سب برابر ہے اس لئے کہ انکار کا ایک رخ دوسرے رخ سے زیادہ بہتر ہوتا ہے لہٰذا اللہ تعالیٰ نے براہین نبوت کو آج تک باقی رکھا ہے اور اولیاء کو اس کے اظہار کا سبب بنایا ہے تا کہ آیات حق، اور حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی صداقت کے دلائل ہمیشہ ظاہر ہوتے رہیں۔ اللہ تعالیٰ نے اولیاء کو جہان کا والی بنایا ہے یہاں تک کہ وہ خالص سنت نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کے پیروکار ہو کر رہے اور نفس کی پیروی کی راہوں کو چھوڑ دیا۔ آسمان سے رحمتوں کی بارش انہی کے قدموں کی برکت سے ہوتی ہے اور زمین میں جو کچھ اگتا ہے وہ انہی کی برکت اور ان کے احوال کی صفائی کی بدولت پیدا ہوتا ہے۔ کافروں پر مسلمانوں کی فتح یابی انہی کے ارادے سے ہے۔

مخفی اولیاء کی تعداد:

اولیاء اللہ میں سے چار ہزار تو وہ ہیں جو پوشیدہ رہتے ہیں وہ نہ تو ایک دوسرے کو پہنچانتے ہیں اور نہ اپنے حال کی خوبی و جمال کو جانتے ہیں ان کی حالت خود اپنے سے اور تمام لوگوں سے پوشیدہ رہتی ہے۔ اس بارے میں متعدد احادیث وارد ہوئی ہیں اور اولیاء کرام کے اقوال اس پر شاہد و ناطق ہیں۔ مجھ پر خود بحمد اللہ اس کے معانی ظاہر ہو چکے ہیں۔

اولیاء کے اقسام:

جو اولیاء حق تعالیٰ کی بارگاہ کے لشکری اور مشکلات کو حل کرنے والے اور حل شدہ کو بند کرنے والے ہیں، ان کی تعداد تین سو (۳۰۰) ہے۔ ان کو اخیار کہا جاتا ہے اور چالیس (۴۰) وہ ہیں جن کو ابدال اور سات وہ ہیں جن کو ابرار اور چار وہ ہیں جن کو اوتاد اور تین وہ ہیں جن کو نقباء اور ایک وہ ہے جسے قطب اور غوث کہا جاتا ہے۔ یہ اولیاء وہ ہیں جنہیں ایک دوسرے پہچانتے ہیں اور امور و معاملات میں ایک دوسرے کی اجازت کے محتاج ہوتے ہیں اس پر مروی صحیح حدیثیں ناطق ہیں اور اہل سنت و جماعت کا ان کی صحت پر اجماع ہے۔ یہاں شرح و بسط

کی گنجائش نہیں ہے۔

اعتراضات اوران کے جوابات:

عام لوگ اعتراض کرتے ہیں کہ میں نے جو یہ کہا ہے کہ "یہ ایک دوسرے کو پہچانتے ہیں کہ ہر ایک ان میں سے ولی ہے اس سے لازم آتا ہے کہ وہ اپنی عاقبت سے بے خوف ہوں حالانکہ یہ محال ہے کہ معرفت الٰہی اور منصب ولایت، بے خوفی کا اقتضاء کرے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ جب یہ جائز ہے کہ مومن اپنے ایمان کا عارف ہوتے ہوئے بے خوف نہیں ہوتا تو یہ بھی جائز ہے کہ ولی اپنی ولایت کا عارف ہوتے ہوئے بے خوف نہ ہو۔

دوسرا جواب یہ ہے کہ یہ بھی جائز ہے کہ حق تعالیٰ کرامت کے طور پر ولی کو اس کے حال کی صحت اور مخالفت پر خدا کی حفاظت بتا کر اسے اپنی عاقبت کے محفوظ ہونے پر عارف اور مشرف فرما دے۔

چونکہ اس جگہ مشائخ کا اختلاف ہے اور اختلاف کی وجہ میں نے ظاہر کر دی ہے کہ کچھ اولیاء وہ ہیں جو چھپے رہتے ہیں جن کی تعداد چار ہزار ہے ان کو اپنے ولایت سے آگاہی جائز نہیں لیکن مشائخ کی ایک جماعت ایسی ہے جو اس آگاہی کو جائز رکھتی ہے۔ تو یہ وہ اولیاء ہیں جن کی تفصیل اس کے بعد بیان کی گئی ہے۔ بکثرت فقہاء و متکلمین پہلے گروہ کی بھی موافقت کرتے ہیں اور دوسری جماعت کے نظریہ کی بھی۔ چنانچہ استاد ابواسحاق اسفرائنی اور متقدمین کی ایک جماعت کا مذہب یہ ہے کہ ولی اپنے آپ کو نہیں پہچانتا کہ وہ ولی ہے؟ اور استاد ابوبکر بن موزک اور متقدمین کی ایک اور جماعت کا مذہب یہ ہے کہ ولی اپنی ولایت کو پہچانتا ہے۔

جب ہم پہلے گروہ سے دریافت کرتے ہیں کہ ولی کو اپنی آگاہی میں کیا آفت و نقصان ہے تو وہ کہتے ہیں کہ آگاہ ہونے پر وہ عجب و غرور میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ اس پر ہم کہتے ہیں کہ ولایت کی شرط تو یہ ہے کہ وہ حق تعالیٰ کی حفاظت میں رہ کر ہر آفت سے محفوظ رہے بھلا خدا کی حفاظت میں رہ کر اس پر عجب و غرور کا صدور جائز ہی کب ہے؟ اور یہ بات تو بہت ہی عامیانہ اور بودی ہے کہ جو ولی ہو اور اس سے خرق عادات اور کرامتوں کا صدور بھی ہو پھر بھی وہ اتنا نہ جانے

کہ میں ولی ہوں اور یہ کہ یہ کرامتیں ہیں۔؟ عوام میں سے کچھ لوگوں نے پہلے گروہ کی تقلید کی اور کچھ لوگوں نے دوسرے گروہ کی۔ اور ان کی باتوں کو قابل اعتناء نہیں سمجھا لیکن معتزلہ تو سرے سے تخصیص ایمان اور کرامتوں ہی کا انکار کرتے ہیں حالانکہ ولایت کی حقیقت تخصیص اور کرامت ہی سے ہے۔ معتزلہ کہتے ہیں کہ تمام وہ مسلمان جنہوں نے ایمانی احکام کو قائم رکھا اور حق کی فرمانبرداری کی وہ سب اولیاء اللہ ہیں اور جس نے ایمانی احکام کو قائم نہ رکھا، صفات الٰہی اور دیدارِ خدا کا انکار کیا، مومن کے لئے خلودِ دوزخ کو جائز رکھا اور انبیاء و مرسلین کی بعثت اور نزولِ کتب سماویہ کے بغیر، محض عقل کے ذریعہ احکام کے جواز کا قائل ہوا ان کے نزدیک وہ وَلی ہے۔ بلاشبہ جس کے معتقدات ایسے ہوں تمام مسلمانوں کے نزدیک وہ ولی ہے مگر وہ خدا کا وَلی نہیں بلکہ شیطان کا وَلی ہوگا؟ نعوذ باللہ منہا۔

معتزلہ یہ بھی کہتے ہیں کہ ولایت کے لئے اگر کرامت واجب ہوتی تو لازم تھا کہ ہر مسلمان کے لئے کرامت ہوتی کیونکہ تمام مسلمان ایمان میں مشترک ہیں جب کہ وہ اصل میں مشترک ہیں تو لامحالہ وہ فرع میں بھی مشترک ہوں گے۔ اس کے بعد وہ کہتے ہیں کہ یہ جائز ہے کہ مسلمان اور کافر سے کرامت صادر ہو جائے اور یہ ایسا ہی ہوگا جیسا کہ سفر میں کوئی بھوکا ہو اور اسے کوئی میزبان مل جائے اور کھانا کھلا دے یا تھکا ہوا ہو اور اسے کوئی سواری مل جائے وغیرہ وغیرہ۔ وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ اگر کسی کے لئے طویل مسافت ایک رات میں طے کرنا جائز ہوتا تو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے بھی یہ بات جائز ہوتی حالانکہ جب آپ نے مکہ مکرمہ کا عزم فرمایا تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ:

وَتَحْمِلُ اَثْقَالَكُمْ اِلٰى بَلَدٍ لَّمْ تَكُوْنُوْا بٰلِغِيْهِ اِلَّا بِشِقِّ الْاَنْفُسِ (النحل:۷)	اور وہ تمہارے بوجھ اٹھا کر لے جاتے ہیں ایسے شہر کی طرف کہ تم اس تک نہ پہنچتے مگر ادھ مرے ہو کر

اس کے جواب میں ہم کہتے ہیں کہ تمہارا یہ قول باطل ہے اس لئے کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

سُبْحَانَ الَّذِیْٓ اَسْرٰی بِعَبْدِہٖ لَیْلًا مِّنَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ اِلَی الْمَسْجِدِ الْاَقْصٰی (الآیہ)

(بنی اسرائیل:۱)

پاک ہے وہ ذات جو اپنے بندۂ خاص کو رات کے مختصر حصہ میں مسجد حرام سے مسجد اقصیٰ تک لے گیا۔

لیکن جس آیت کو تم پیش کرتے ہو اس میں بوجھ اٹھانے کے معنی، صحابہ رضی اللہ عنہم کو جمع کر کے ان کو مکہ کی طرف لے جانا ہے کیونکہ کرامت خاص ہے عام نہیں ہے اگر کرامت سے ان سب کو مکہ مکرمہ لے جاتے تو کرامت عام ہو جاتی اور ایمان بالغیب ضروری نہ رہتا اور غیبی ایمان کے تمام احکام اور غیبی خبروں کا وجود سب جاتا رہتا کیونکہ ایمان مطیع و عاصی میں محل عموم ہے اور ولایت، محل خاص ہے۔ لہٰذا اللہ تعالیٰ نے اس حکم کو محل عام نہیں رکھا اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو صحابہ کرام کی موافقت پر بوجھ اٹھانا فرمایا ہے اور اللہ تعالیٰ نے دوسری جگہ حکم کو محل خاص میں رکھا اور اپنے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو رات کے مختصر حصہ میں مکہ سے بیت المقدس تک لے گیا۔ اس کے بعد وہاں سے ''قاب قوسین'' اور عالم کے دونوں کناروں پر لے جا کر سب کچھ دکھایا اور جب واپس تشریف لائے تو رات کا بیشتر حصہ باقی تھا۔ خلاصہ یہ کہ ایمان کا حکم عام ہے اور عام لوگوں سے متعلق ہے اور کرامت کا حکم خاص ہے اور خاص لوگوں سے وابستہ ہے۔ تخصیص کا انکار تو کھلا مکابرہ اور ہٹ دھرمی ہے اسے یوں سمجھو جیسے کہ بادشاہ کے دربار میں حاجب، دربان، امیر اور وزیر ہوتے ہیں حالانکہ خدمت و نوکری کے اعتبار سے وہ سب برابر ہوتے ہیں لیکن ایک کو دوسرے پر فرق مراتب کے لحاظ سے فوقیت حاصل ہوتی ہے اسی طرح ایمان کی حقیقت میں تمام مسلمان برابر ہیں اس کے باوجود کوئی عاصی، کوئی مطیع، کوئی عالم اور کوئی جاہل ہے۔ اسی بناء پر خصوصیت کے انکار سے ہر معنی کا انکار ثابت ہوتا ہے۔ واللہ عالم

ولایت کے رموز واشارات:

ولایت کے معنی کی تحقیق میں مشائخ کے متعدد رموز و اشارات ہیں حتی المقدور ان

کے مختار رموز کو بیان کرتا ہوں۔

(۱) حضرت ابوعلی جرجانی رحمتہ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ:

الولی هو الفانی فی حاله و الباقی فی مشاهدة الحق لم یکن له عن نفسه اخبار ولا مع غیر الله قرار

ولی وہ ہے جو اپنے حال میں فانی اور مشاہدۂ الٰہی میں باقی ہے اس کے لئے ممکن نہ ہو کہ اپنے حال کی خبر دے اور نہ اسے غیر اللہ سے سکون وقرار حاصل ہو۔

کیونکہ خبر دینا تو بندے کے احوال کے قبیل سے تعلق رکھتی ہے جب بندے کے احوال ہی فنا ہو گئے تو اس کی خبر دینا کیسے درست ہو سکتا ہے۔ جب وہ خدا کے سوا کسی سے آرام پا ہی نہیں سکتا تو اپنے احوال کی خبر کسی دوسرے کو کیسے دے سکتا ہے کیونکہ اپنے حال کی خبر کسی دوسرے کو دینا گویا حبیب کے اَسرار کو منکشف کرنا ہے جو غیبی حال سے متعلق ہے اور حبیب کے اسرار کا انکشاف غیر حبیب پر محال ہے نیز جب ولی مشاہدے سے ہوتا ہے تو مشاہدے میں غیر کی رویت محال ہوتی ہے۔ جب غیر کی رویت تک کا امکان نہیں تو غیر سے سکون وقرار تو بعید از قیاس ہے۔

(۲) حضرت جنید بغدادی رحمتہ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ:

"الولی من لایکون له خوف لان الخوف ترتب مکروه یحل فی المستقبل وانتظار المحبوب یفوت فی المستانف والولی این وقته لیس له وقت مستقبل فیخاف شیاً کما لاخوف له ولا رجاء له لان الرجاء انتظار محبوب یحصل او مکروه یکشف وذالك فی الثانی من الوقت وکذالك لایحزن من حزونته الوقت من کان فی ضیاء الرضاء ونور الشکر وروضة الموافقة فانّٰی یکون له حزن قال الله تعالٰی الا ان اولیاء الله لاخوف علیهم ولا هم یحزنون."

اس ارشاد کا مطلب یہ ہے کہ ولی کو خوف نہیں ہوتا کیونکہ خوف اس مکروہ چیز کو کہتے ہیں جس کے آنے سے دل میں ناگواری یا جسم پر کوئی سختی آئے یا حاصل شدہ محبوب چیز کے گم ہونے کا خدشہ ہو۔ ولی کے پاس اتنا وقت ہی کہاں کہ وہ آنے والے لمحات کا خوف کرے جس طرح ولی کو خوف نہیں ہوتا اسی طرح اسے امید بھی نہیں ہوتی اس لئے کہ ''امید'' نام ہے کہ کسی محبوب چیز کے حاصل ہونے کا انتظار کرنا یا کسی ناگوار چیز کے دور ہونے کا انتظار کرنا۔ یہ دوسری بات بھی وقت کے قبیل سے ہے اور ان کے پاس اتنا وقت ہوتا نہیں اسی طرح ولی کو کوئی غم بھی نہیں ہوتا کیونکہ غم وقت کی تلچھٹ ہے جو شخص رضا کی روشنی اور شکر کی چاندنی میں ہو اسے غم کہاں؟ اللہ تعالیٰ اسی کی خبر دیتا ہے کہ خبردار، اللہ کے ولیوں کے لئے نہ کوئی خوف ہے اور نہ کوئی غم وفکر۔

اس قول سے عوام یہ خیال کرتے ہیں کہ اولیاء کو جب نہ کوئی خوف وغم ہے اور نہ امید و رجا تو ضرور انہیں امن ہوگا حالانکہ انہیں امن بھی نصیب نہیں کیونکہ امن، غیب کے نہ دیکھنے اور وقت کے منہ موڑنے سے تعلق رکھتا ہے یہ تمام اوصاف ان کے ہوتے ہیں جنہوں نے اپنی بشریت کو نہ دیکھا ہو۔ وہ تو ہر صفت سے بے نیاز ہو سکتے ہیں۔ خوف وغم اور امید سب نفس کے نصیبہ میں ہیں جب بندہ اپنے نفس کو فنا کر لیتا ہے اس وقت بندہ کی صفت رضا وتسلیم بنتی ہے اور جب رضا کا حصول ہو گیا تو مشاہدۂ الٰہی میں استقامت پیدا ہو کر تمام احوال سے کنارہ کشی ظاہر ہوگئی پھر کہیں جا کر ولایت دل پر منکشف ہوتی ہے اور اس کے معنی باطن پر ظاہر ہوتے ہیں۔

(۳) حضرت ابوعثمان مغربی علیہ الرحمۃ فرماتے ہیں کہ:

الولی قد یکون مشهورا ولا یکون مفتونا	ولی مشہور تو ہو سکتا ہے لیکن فتنہ میں نہیں پڑ سکتا۔

(۴) ایک بزرگ بیان فرماتے ہیں:

الولی قد یکون مستورا ولا یکون مشهورا	ولی گمنام تو ہو سکتا ہے لیکن مشہور نہیں ہو سکتا۔

ان بزرگوں کے نزدیک ولی کی گمنامی کی وجہ یہ ہے کہ وہ شہرت سے بچتا ہے کیونکہ شہرت میں فتنہ ہوتا ہے۔اس پر حضرت ابوعثمان نے فرمایا ہے کہ جائز ہے کہ ولی مشہور ہو لیکن اس کی شہرت موجب فتنہ نہ ہوگی اس لئے جھوٹی شہرت میں فتنہ ہوتا ہے مگر جب ولی اپنی ولایت میں صادق ہے تو یہ شہرت موجب فتنہ نہیں اور جھوٹے پر ولایت کا اطلاق نہیں ہوتا اور جھوٹے کے ہاتھ پر کرامت کا ظہور بھی ناممکن ومحال ہے۔اس ارشاد کے بموجب لازم آتا ہے کہ صادق ولی کے زمانہ سے فتنہ دور ہو جاتا ہے اور ان دونوں قول سے یہ بات بھی مترشح ہوتی ہے کہ ولی خود کو نہیں پہچانتا کہ وہ ولی ہے کیونکہ اگر آگاہی ہو جائے تو مشہور ہو جائے اور اگر آگاہی نہ ہو تو فتنہ میں پڑ جائے۔اس کی تشریح طوالت چاہتی ہے یہاں اس کی گنجائش نہیں۔

مستغرقِ ولایت کی مثال:

(۵) حضرت ابراہیم ادہم علیہ الرحمہ نے ایک شخص سے پوچھا کیا تم چاہتے ہو کہ اللہ کے ولی ہو جاؤ؟ اس نے کہا خواہش تو ہے۔آپ نے فرمایا:

لاترغب فی شیٔ من الدنیا والاٰخرۃ وفرغ نفسك لِلّٰہ واقبل بوجھك علیہ	اے عزیز! دنیا و آخرت کی کسی چیز سے رغبت نہ رکھو کیونکہ دنیا کی طرف راغب ہونا، حق تعالیٰ کی طرف سے منہ موڑ کر فانی چیز کی طرف متوجہ ہونا ہے۔

اور اُخروی چیز کی رغبت رکھنا گویا حق تعالیٰ کی جانب سے منہ موڑنا ہے۔

جب فانی چیز سے اعراض ہو تو وہ فانی چیز فنا ہو جاتی ہے اور اعراض نابود ہو جاتا ہے اور جب کسی چیز سے اعراض باقی ہو تو بقا پر فنا جائز نہیں ہے۔

لہٰذا اس اعراض پر بھی فنا جائز نہیں۔اس قول سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ اپنی دنیا و آخرت کی خاطر اللہ تعالیٰ کو نہ چھوڑو۔آخر میں حضرت ابراہیم نے نصیحت فرمائی کہ اپنے آپ کو خدا کی دوستی کے لئے وقف کر دو۔دنیا و آخرت کو اپنے دل میں راہ نہ دو اور دل کا لگاؤ صرف خدا ہی کے ساتھ ہو جس وقت یہ اوصاف تمہارے اندر پیدا ہو جائیں گے تو تم ولی بن جاؤ گے۔

شریعت کی پاسداری:

(۶) حضرت بایزید بسطامی رحمتہ اللہ علیہ سے کسی نے پوچھا ولی کون ہے؟ انہوں نے فرمایا:

الولی ھو الصابر تحت الامر والنھی — ولی وہ ہے جو اللہ تعالیٰ کے امر ونہی کے تحت صبر کرے۔

کیونکہ جس کے دل میں محبت زیادہ ہوگی اتنی ہی وہ اس کے حکم کی دل سے تعظیم کرے گا اوراس کی مخالفت سے دور رہے گا۔ نیز یہ بھی انہی سے مروی ہے کہ ایک مرتبہ لوگوں نے مجھے بتایا کہ فلاں شہر میں اللہ کا ایک ولی رہتا ہے۔ میں اٹھا اوراس کی زیارت کی غرض سے سفر شروع کر دیا جب میں اس کی مسجد کے پاس پہنچا تو وہ مسجد سے نکل رہا تھا میں نے دیکھا کہ منہ کا تھوک فرشِ مسجد پر گر رہا ہے میں وہیں سے واپس لوٹ پڑا اسے سلام تک نہ کیا۔ میں نے کہا کہ ولی کے لئے شریعت کی پاسداری ضروری ہے تا کہ حق تعالیٰ اس کی ولایت کی حفاظت فرمائے۔ اگر یہ شخص ولی ہوتا تو اپنے منہ کے تھوک سے مسجد کی زمین کو آلودہ نہ کرتا اس کا احترام کرتا۔ اسی رات حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو میں نے خواب میں دیکھا حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھ سے فرمایا اے بایزید! جو کام تم نے کیا ہے اس کی برکتیں تم ضرور پاؤ گے دوسرے دن ہی میں اس درجہ پر فائز ہو گیا جہاں آج تم سب مجھے دیکھ رہے ہو۔

(۷) حضرت ابوسعید رحمتہ اللہ علیہ کی خدمت میں ایک شخص آیا اس نے مسجد میں پہلے بایاں قدم رکھا۔ انہوں نے حکم دیا کہ اسے نکال دو جو شخص دوست کے گھر میں داخل ہونے کا سلیقہ نہیں رکھتا اور بایاں قدم رکھتا ہے وہ ہماری مجلس کے لائق نہیں ہے۔

ملحدوں کی ایک جماعت اس بزرگ کے ساتھ تعلق کا اظہار کرتی ہے۔ (خدا ان پر لعنت کرے) وہ ملحدین کہتے ہیں کہ خدمت یعنی عبادت اتنی ہی کرنی چاہئے جس سے بندہ ولی بن جائے۔ جب ولی ہو جائے تو خدمت وعبادت ختم۔ یہ کھلی گمراہی ہے کیونکہ راہِ حق میں کوئی مقام ایسا نہیں ہے جہاں خدمت وعبادت کے ارکان میں سے کوئی رکن ساقط ہو جائے۔ اس کی

تشریح اپنی جگہ انشاء اللہ آئے گی۔

اثباتِ کرامت

واضح رہنا چاہئے کہ صحیح طور پر مکلّف ہونے کی حالت میں ولی کے لئے کرامت کا ظہور جائز ہے۔ اہل سنت و جماعت کے دونوں فریق یعنی علماء و مشائخ کا اس پر اتفاق ہے اور عقل کے نزدیک بھی یہ ناممکن و محال نہیں ہے اس لئے کہ یہ از قسم قدرتِ الٰہی ہے اور شریعت کے اصول میں اس کے اظہار کے منافی ہونے پر کوئی اصل نہیں ہے۔ اور یہ ارادۂ حسن اور وہم و عقل سے بعید بھی نہیں ہے۔ کرامت ولی کی صداقت کی علامت ہے جھوٹے پر کرامت کا ظہور جائز ہی نہیں ہے اور ولایت کا جھوٹا دعوٰی، کرامت نہ ہونے سے ثابت ہے بلکہ اس کے جھوٹے دعوے کا نشان ہے۔

کرامت کی تعریف:

کرامت ایسا فعل ہے جو اس کی مانند لانے پر انسانی عادتوں کو عاجز کر دے معرفتِ الٰہی کے لئے استدلالی قوتوں سے صدق کے مقابل باطل کو عاجز کر دینا بھی کرامت ہے۔ اہل سنت و جماعت کے ایک طبقہ کے نزدیک کرامت حق ہے لیکن معجزے کی حد تک نہیں مثلاً دعاؤں کا لازمی قبول ہونا یا مرادوں کا ضروری حاصل ہونا یا اس قسم کی باتیں جو انسانی عادتوں کو توڑنے والی ہوں۔

حضور سیدنا داتا گنج بخش رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ مکلّف ہونے کی حالت میں ولی صادق سے ایسا فعل سرزد ہو جس سے عادتِ انسانی ٹوٹتی ہو تو اس میں فساد کی بابت تمہارا کیا خیال ہے؟ اگر تم یہ کہو کہ از قسم قدرت الٰہی نہیں ہے تو یہ خود گمراہی ہے اور اگر یہ کہو کہ یہ از قسم قدرتِ الٰہی تو ہے لیکن ولیِ صادق سے اس کا ظہور، ابطالِ نبوت اور انبیاء علیہم السلام کی خصوصیت کی نفی ہے تو ہم جواب دیں گے کہ یہ بھی محال ہے اس لئے کہ ولی کرامتوں کے ساتھ مخصوص ہے اور نبی معجزات کے ساتھ۔

"والمعجزة لم تكن معجزة بعينها انما كانت معجزة لحصولها ومن شرطها اقتران دعوی النبوة فالمعجزة تختص للانبياء والكرامات يكون للاولياء"

"فی نفسہٖ معجزہ عاجز کرنے والا نہیں ہوتا البتہ اس کا حاصل کرنا عاجز کرنے والا ہوتا ہے اور معجزہ کی شرط یہ ہے کہ دعوٰئ نبوت بھی شامل ہو لہٰذا معجزہ انبیاء کے لئے مخصوص ہے اور کرامات اولیاء کے لئے ہیں۔"

چونکہ وَلی وَلی ہے اور نبی نبی اور ان کے درمیان کوئی وجہ التباس واشتباہ بھی نہیں ہے جس سے احتراز کیا جائے اور یہ کہ انبیاء علیہم السلام کے مراتب کی بزرگی اور ان کی عظمت و برتری، عصمت اور صفائے باطنی کی وجہ سے ہے نہ کہ صرف معجزہ یا کرامت یا ایسے افعال کے صدور کی وجہ سے ہے جو خرق عادات ہوں۔ باتفاق تمام نبیوں کے تمام معجزات، خارقِ عادات ہوتے ہیں اور اصل اعجاز میں سب برابر ہیں البتہ فضیلت میں ایک دوسرے پر فائق ہے جبکہ یہ بات جائز ہے کہ انبیاء کے معجزات خرقِ عادات میں مساوی ہونے کے باوجود ایک کو دوسرے پر فضیلت ہے تو یہ کیوں جائز نہیں کہ یہ کرامت بھی ہو اور وہ کرامت خارقِ عادت بھی ہو اور جبکہ انبیاء اولیاء سے افضل ہیں جب وہاں خرقِ عادت فعل، فضیلت کی علت اور ان کے ساتھ ایک دوسرے سے خصوصیت نہیں رکھتے تو اس جگہ بھی خرقِ عادت فعل وَلی کی خصوصیت کی علت نہیں ہو سکتی اور نبی کے ساتھ ان کی برابری و مساوات نہیں ہو سکتی۔ ہر صاحب عقل وخرد، جب اس بات کو دلیل سے سمجھے گا تو اس کے دل سے یہ شبہ جاتا رہے گا۔

اب اگر کسی کے دل میں یہ خیال پیدا ہو کہ وَلی کی کرامت اگر خارقِ عادت ہوتی تو وہ نبوت کا دعوٰی کر لیتا؟ تو یہ بات محال ہے اس لئے کہ ولایت کی شرط راست گوئی اور صداقت ہے اور خلاف معنی دعوٰی کرنا جھوٹ وکذب ہے جھوٹا آدمی ولی نہیں ہو سکتا اگر وَلی نبوت کا دعوٰی کرے تو بلاشبہ یہ معجزے میں دست درازی ہے اور یہ کفر ہے اور کرامت فرمانبردار مومن کے سوا دوسرے سے ظاہر نہیں ہوتی اور کذب و جھوٹ معصیت ہے نہ کہ

طاعت جب حقیقتِ واقعہ یہ ہے کہ تو ولی کی کرامت نبی کی حجت کے اثبات کے موافق ہوگی
اس لئے کرامت اور معجزے کے درمیان کسی قسم کا شبہ اور طعنہ واقع نہیں ہوتا کیونکہ حضور اکرم
صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی نبوت کا اثبات معجزے کے اثبات سے کیا ہے اور وَلی بھی اپنی
ولایت کے ساتھ کرامت کے ذریعہ، حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کا اثبات کرتے ہیں
لہٰذا سچا ولی اپنی ولایت کے اثبات میں وہی کہتا ہے جو نبی صادق اپنی نبوت میں فرماتے ہیں۔
ولی کی کرامت، نبی کے اعجاز کا عین ہوتی ہے اور مومن کے لئے ولی کی کرامت دیکھنا، نبی کی
صداقت پر زیادہ مہر یقین ثبت کرتا ہے نہ کہ اس میں شبہ ڈالنا کیونکہ ان کے دعوٰی میں تضاد
واقع نہیں ہوتا جس سے ایک دوسرے کی نفی ہوتی ہو۔ ایک کا دعوٰی بعینہٖ دوسرے کے دعوٰی
کی دلیل ہے۔ چنانچہ شریعت میں جب ایک گروہ وراثت کے دعوٰی میں متفق ہو تو جس وقت
ایک کی حجت ثابت ہو جائے تو اس کے دعوٰی میں متفق ہونے کی وجہ سے دوسرے کی حجت
بھی ثابت ہو جاتی ہے اور جب دعوٰی میں تضاد ہو اس وقت ایک حجت دوسرے کی حجت نہیں
ہوتی۔ جب نبی معجزے کی دلالت سے نبوت کی صحت کا مدعی ہوتا ہے تو ولی، نبی کے دعوٰی میں
اس کا تصدیق کرنے والا ہوتا ہے۔ اس میں شبہ کا ثابت کرنا محال ہے۔ واللہ اعلم

معجزات اور کرامتوں کے درمیان فرق و امتیاز

جب کہ یہ بات صحیح ہے کہ جھوٹے سے معجزہ، اور کرامت محال ہے تو لامحالہ خوب واضح
کوئی فرق و امتیاز ہونا چاہئے تاکہ اچھی طرح معلوم و ظاہر ہو جائے۔ جاننا چاہئے کہ معجزات کی
شرط، اظہار ہے اور کراماتِ اولیاء کی شرط اخفاء ہے۔ اس لئے کہ معجزے کا فائدہ دوسروں کو پہنچتا
ہے (کہ لوگ نبی کی صداقت پر یقین کر کے ایمان لائیں) اور کرامت کا فائدہ خاص ولی یعنی
صاحب کرامت کو پہنچتا ہے (کیونکہ اس میں ولی کی عزت افزائی اور اس کی بزرگی کی نشانی
پوشیدہ ہے) اور ایک فرق یہ بھی ہے کہ صاحب معجزہ یعنی نبی، اسے دور بھی کر سکتا ہے کیونکہ یہ
عین اعجاز ہے اور ولی دور نہیں کر سکتا کیونکہ یہ کرامت بمعنی عزت افزائی ہے یا استدراج ہے

(اصل کتاب فارسی کی عبارت سے ایک مفہوم یہ بھی پیدا ہوتا ہے کہ صاحب معجزہ یقین رکھتا ہے کہ یہ خالص اعجاز ہے اور ولی یقین نہیں کرسکتا کہ یہ کرامت ہے یا استدراج ہے۔ واللہ اعلم۔ مترجم غفرلہٗ)

ایک فرق یہ بھی ہے کہ صاحب معجزہ یعنی نبی، شریعت میں تصرف کرسکتا ہے اور اس کی ترتیب میں بفرمان خدا، نفی و اثبات کرسکتا ہے لیکن صاحب کرامت یعنی ولی کو اس میں بجز تسلیم کرنے اور احکام پر عمل کرنے کے سوا کوئی صورت ممکن ہی نہیں ہے کیونکہ ولی، اپنی کرامت کے ذریعہ نبی کے کسی شرعی حکم میں کسی قسم کی منافات اور ردوبدل نہیں کرسکتا۔

اگر کوئی یہ کہے کہ جب تم معجزے کو خرقِ عادت سے اور ولایت کو نبی کی صداقت سے تعبیر کرتے ہو اور اسے نبی کے علاوہ بصورتِ کرامت دوسروں کے لئے جائز سمجھتے ہو تو اثبات معجزہ پر کرامت کے اثبات کی تمہاری عین حجت باطل ہو جاتی ہے اس کے جواب میں ہم کہیں گے کہ تمہاری یہ بات اس صورت کے برخلاف ہے جس پر تمہارا اعتقاد ہے اس لئے کہ معجزہ وہ ہے جو لوگوں کی عادت کو توڑنے والا ہو۔ جب ولی کی کرامت نبی کا ہی عین معجزہ ہے تو وہی دلیل دکھائے گی جو نبی کے معجزے کی ہے اور ایک معجزہ دوسرے معجزے کا توڑ نہیں ہوتا۔ کیا تم نے نہیں دیکھا کہ جب صحابی رسول صلی اللہ علیہ وسلم حضرت خبیب رضی اللہ عنہ کو کافروں نے مکہ مکرمہ میں سولی پر چڑھایا تو مدینہ منورہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مسجد نبوی میں تشریف فرما ہو کر وہ سب کچھ دیکھ لیا اور صحابہ کو بتا دیا کہ کفارِ مکہ حضرت خبیب کے ساتھ ظلم و ستم کر رہے ہیں۔ ادھر اللہ تعالیٰ نے حضرت خبیب کی آنکھوں سے بھی درمیان کے پردے اٹھا دیئے حتیٰ کہ انہوں نے بھی حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا اور آپ پر درود و سلام بھیجا۔ اللہ تعالیٰ نے ان کا سلام حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے گوش مبارک میں پہنچایا اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے سلام کا جواب دیا اور یہ جواب حضرت خبیب کے کانوں نے سنا اور دعا کی یہاں تک کہ وہ رو بقبلہ ہو گئے۔

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا مدینہ منورہ سے مکہ مکرمہ میں ان کو دیکھنا ایسا فعل تھا جو

خارق عادت یعنی معجزہ تھا۔ اسی طرح حضرت خبیب کا مکہ مکرمہ سے مدینہ منورہ میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھنا خارق عادت یعنی ان کی کرامت تھی۔ باتفاق غائب کو دیکھنا خرق عادت ہے لہٰذا غیبتِ زمان اور غیبت مکان میں کچھ فرق نہ رہا اس لئے کہ حضرت خبیب کی یہ کرامت اس حالت میں ہے جبکہ ان کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے غیبت مکانی تھی یہی صورتِ حال متاخرین اولیاء کے لئے ہے کیونکہ وہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے غیبتِ زمانی کی حالت میں ہیں اور یہ ظاہر فرق اور واضح دلیل اس بات کی ہے کہ کرامت، معجزے کے برخلاف نہیں ہوتی۔ (اگرچہ صورت میں یکساں اور برابر ہوتی ہے مگر معنی اور اعتقاد میں فرق ہوتا ہے۔ مترجم) کیونکہ کرامت، صاحب معجزہ کی تصدیق کے بغیر، کسی اور حالت میں ثابت نہیں ہوتی اور تصدیق کرنے والے عبادت گزار مومن کے سوا کسی اور سے بھی ظاہر نہیں ہوتی۔ اس لئے کرامت کی کرامت درحقیقت نبی ہی کا معجزہ ہے کیونکہ آپ کی شریعت باقی ہے، اس لئے لازمی ہے کہ اس کی حجت بھی باقی رہے۔ لہٰذا اولیاء امت، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت کی صداقت کے گواہ ہیں۔ یہ جائز نہیں ہے کہ غیر امتی سے کرامت کا ظہور ہو۔ اسی مفہوم کی ایک حکایت یہ ہے۔

ایک ولی کی کرامت اور ایک نصرانی کا مقابلہ:

حضرت ابراہیم خواص رحمتہ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ میں اپنی عزلت نشینی کی عادت کے تحت جنگل میں چلا گیا۔ کچھ عرصہ کے بعد بیابان کے ایک جانب سے ایک شخص آیا اس نے مجھ سے ساتھ رہنے کی اجازت مانگی۔ جب میں نے اس پر گہری نظر ڈالی تو میرے دل میں اس کی طرف سے نفرت پیدا ہوئی اور میں نے خیال کیا یہ کس لائق ہے؟ اس نے مجھ سے کہا اے ابراہیم آپ آزردہ خاطر نہ ہوں میں نصرانی راہب ہوں۔ آپ کی صحبت کی آرزو میں ملک روم سے آرہا ہوں۔ جب مجھے معلوم ہوا کہ یہ شخص غیر ہے تو میرے دل کو اطمینان ہوا اور صحبت کا طریق اور اس کا حق مجھ پر بہت آسان ہو گیا۔ میں نے کہا اے نصرانی راہب! میرے ساتھ کھانے پینے کی چیزیں نہیں ہیں مجھے خوف ہے کہ اس جنگل میں تمہیں کوئی تکلیف نہ پہنچے۔

راہب نے کہا اے ابراہیم! جہان میں آپ کا بڑا شہرہ ہے لیکن آپ ابھی تک کھانے پینے کے ہی غم میں مبتلا ہیں۔ فرماتے ہیں کہ راہب کی اس بات پر مجھے تعجب ہوا اور تجربہ کے طور پر اس کی صحبت کو قبول کر لیا کہ وہ اپنے دعوے میں کتنا سچا ہے۔ جب ہمیں سات دن اور سات راتیں سفر کرتے ہوئے گزر گئے تو ہمیں پیاس معلوم ہوئی تو راہب رک کر کہنے لگا کہ اے ابراہیم! جہان میں آپ کا نقارہ بج رہا ہے اب کچھ لائیے آپ کیا رکھتے ہیں پیاس کی شدت نے بے جان کر رکھا ہے بجز آپ کی جناب میں گستاخی کے کوئی چارۂ کار نہیں ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ میں نے اپنا سر زمین پر رکھا اور دعا مانگی کہ اے خدا مجھے اس بیگانہ کے سامنے ذلیل ورسوانہ کرنا کیونکہ وہ اپنی بے گانگی میں مجھ سے نیک گمان رکھتا ہے کیا مضائقہ ہے اگر ایک کافر کا گمان مجھ پر پورا ہو جائے۔ وہ فرماتے ہیں کہ جب میں نے سجدے سے سر اٹھایا تو دیکھا کہ ایک طشت میں دو روٹی اور دو گلاس پانی کے رکھے ہوئے ہیں۔ ہم نے اسے کھایا پیا اور وہاں سے چل دیئے جب سات روز اسی طرح گزر گئے تو میں نے دل میں خیال کیا کہ میں اس کافر کا تجربہ کروں قبل اس کے کہ وہ مجھ سے کسی اور چیز کا سوال کرے اور میرا امتحان لے اور اپنے مطالبہ میں مجھ سے اصرار کرے اور میں ذلت محسوس کروں۔ میں نے کہا اے نصرانیوں کے راہب! آج تمہاری باری ہے دیکھوں کہ اتنا عرصہ ریاضت کر کے تم نے کیا پایا ہے؟ اس نے بھی سر زمین پر رکھا اور کچھ دعا مانگی اسی وقت ایک طشت نمودار ہوا جس میں چار روٹی اور چار گلاس پانی کے رکھے ہوئے تھے۔ میں یہ دیکھ کر سخت متعجب ہوا اور آزردہ خاطر ہوا اور اپنے احوال سے ناامید ہو گیا۔ میں نے اپنے آپ سے کہا میں اسے نہیں کھاؤں گا کیونکہ یہ کافر کے لئے آسمان سے اترا ہے اس میں اس کی معونت یعنی مدد ہے میں اسے کیسے کھا سکتا ہوں۔ راہب نے مجھ سے کہا اے ابراہیم! کھایئے۔ میں نے کہا میں نہیں کھاؤں گا۔ راہب نے پوچھا کیا وجہ؟ میں نے کہا تم اس کے اہل نہیں ہو۔ اور بات تمہارے حال کی جنس سے نہیں ہے میں اس معاملہ میں سخت حیران ہوں اگر اسے کرامت پر محمول کروں تو کافر پر کرامت جائز نہیں اور اگر اسے معونت کہوں تو مدعی شبہ میں پڑ جائے گا۔ راہب نے مجھ سے کہا کھایئے اور دو چیزوں کی بشارت سنئے۔ ایک تو میرے اسلام کی

کہ میں کلمہ پڑھتا ہوں کہ "اَشْھَدُ اَنْ لَّآ اِلٰـہَ اِلَّا اللّٰہُ وَحْدَہٗ لَاشَرِیْکَ لَہٗ وَاَشْھَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا عَبْدُہٗ وَرَسُوْلُہٗ" دوسرے یہ کہ خدا کی جناب میں آپ کا بڑا مرتبہ ہے۔ میں نے پوچھا وہ کیسے؟ اس نے کہا اس لئے کہ اس جنس میں سے میرے پاس تو کچھ نہیں تھا میں نے صرف شرمساری کی وجہ سے زمین پر سر رکھا تھا اور دعا مانگی تھی کہ اے خدا اگر دین محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) حق ہے اور تیرا پسندیدہ ہے تو تُو مجھے دو روٹی اور دو گلاس پانی کے دے اور اگر ابراہیم خواص تیرا بندہ وَلی ہے تو دو روٹی اور دو گلاس پانی اور عطا فرما۔ جب میں نے سر اٹھایا تو اس طشت کو موجود پایا۔ یہ ماجرا سن کر حضرات ابراہیم نے اسے کھایا پیا۔ وہ راہب جوانمرد اور بزرگانِ دین میں گزرا ہے۔ یہ معنی ہیں عین اعجاز نبی کے جو ولی کی کرامت سے قریب تر ہے۔ یہ حکایت عجیب ہے نبی کی غیبت میں غیر کے لئے دلیل رُونما ہوا اور وَلی کے حضور میں اس کے غیر کے لئے اس کی کرامت میں سے حصہ ملے۔ درحقیقت ولایت کی منتہی کو اس کے مبتدی کے سوا کوئی نہیں جانتا اس لئے کہ وہ راہب فرعون کے جادوگروں کی طرح تھا اس کا ایمان پوشیدہ تھا لٰہذا حضرت ابراہیم خواص رحمتہ اللہ علیہ نے نبی کے معجزے کی صداقت ثابت کی اور راہب نے بھی نبوت کی صداقت کا مطالبہ کیا اور ساتھ ہی ولایت کی عزت کا مطالبہ کیا۔ اللہ تعالیٰ نے بحسن عنایت ازلی اس کے مقصود کو پورا فرما دیا۔ کرامت و اعجاز کے درمیان یہ ایک ظاہر فرق ہے۔

اولیاء کرام کا کرامت ظاہر فرمانا یہ ان کی مزید کرامت ہے کیونکہ ولایت کی شرط تو پوشیدہ رکھنا ہے نہ کہ بالقصد اظہار کرنا۔ میرے شیخ و مرشد رحمتہ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اگر ولی ولایت ظاہر کرے اور اس سے اپنے حال کی درستگی ثابت کرے تو کوئی حرج نہیں ہے لیکن اگر اسے تکلف سے ظاہر کرے تو یہ رعونت ہے۔ واللہ اعلم بالصواب

خدائی دعویٰ کرنے والے کے ہاتھ سے از قسم معجزہ ظاہر ہونے کی بحث

طریقت کے مشائخ اور تمام اہل سنت و جماعت کا اس پر اتفاق ہے کہ کسی کافر کے

ہاتھ سے معجزہ وکرامت کے مشابہ کوئی خرقِ عادت فعل کا ظاہر ہونا جائز ہے کیونکہ شبہات کے مواقع کو اس فعل کا ظہور دور کر دیتا ہے اور کسی کو اس کے جھوٹے ہونے میں شک نہیں رہتا اور اس فعل کا ظہور اس کے جھوٹے ہونے پر گواہ بن جاتا ہے۔ جس طرح کے فرعون تھا کہ اس نے چارسو (۴۰۰) سال عمر پائی لیکن اس دوران وہ کبھی بیمار تک نہ ہوا اس کا حال یہ تھا کہ دریا کا پانی اس کی پشت کے عقب میں اونچا ہو جاتا اور جب وہ کھڑا ہوتا تو پانی بھی ٹھہر جاتا اور جب چلنے لگتا تو پانی بھی چلنے لگتا لیکن ان تمام باتوں کے باوجود بھی کسی عقل مند کو اس کے دعویٔ خدائی کے جھوٹے ہونے میں شبہ نہ ہوا کیونکہ عقل مند کا اتفاق ہے کہ اللہ تعالیٰ مجسم و مرکب نہیں ہے اس قسم کی باتیں اور افعال عاقل کے لئے اس کے جھوٹے مدعی ہونے میں شبہ نہیں ڈالتے۔ باغ ارم کے مالک شداد و نمرود کے بارے میں بھی اس قسم کی باتیں سنی جاتی ہیں ان کو بھی اسی پر قیاس کرنا چاہئے۔ اسی کے ہم معنی حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں خبر دی ہے کہ آخر زمانہ میں دجال نکلے گا جو خدائی کا دعوٰی کرے گا اور دو پہاڑ ایک داہنی جانب اور ایک بائیں جانب ساتھ ساتھ لے کر چلے گا داہنی جانب کے پہاڑ کو وہ جنت کہے گا اور بائیں جانب کے پہاڑ کو دوزخ۔ وہ لوگوں کو اپنی طرف بلائے گا جو اس کی دعوت قبول نہ کرے گا وہ اسے سزا دے گا اور وہ لوگوں کو اپنی گمراہی کے سبب ہلاک کرے گا پھر انہیں زندہ کرے گا۔ سارے جہان میں اسی کا حکم چلے گا اگر وہ اس سے بڑھ کر سو گنا خرقِ عادات افعال ظاہر کرے تب بھی کسی عقل مند کو اس کے جھوٹے ہونے میں کوئی شبہ نہ ہوگا۔ ہر ذی شعور بخوبی جانتا ہے کہ خدا گدھے پر نہیں بیٹھتا اور متغیر و متلون نہیں ہوتا ایسی باتوں کی نمائش کو استدراج کہتے ہیں اور یہ بھی جائز ہے کہ کسی جھوٹے مدعی نبوت سے خرق عادات فعل صادر ہو جو اس کے جھوٹ پر دلالت کرتا ہو جیسے صادق نبی سے ظاہر ہوتا ہے اور معجزہ اس کے صدق کی دلیل ہوتا ہے لیکن یہ جائز نہیں ہے کہ اس سے ایسا فعل سرزد ہو جس سے صاحب عقل کو شبہ پڑ جائے۔ اگر ہم شبہ کو بھی جائز مان لیں تو پھر کاذب سے صادق کو اور صادق سے کاذب کو نہیں پہچان سکیں گے اس وقت طالب کو دشوار ہوگا کہ کس کی تصدیق کریں اور کس کی تکذیب، اس طرح حکم ثبوت بالکل باطل ہو جاتا ہے۔

جائز ہے کہ مدعیِ ولایت سے از قسم کرامت کوئی فعل ظاہر ہو کیونکہ وہ دین میں تو درست ہے اگر چہ معاملاتِ طریقت میں بہتر نہیں ہے۔ وہ ظہورو کرامت سے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی صداقت کا اثبات اور خود پر فضل حق کو ظاہر کرنا چاہتا ہے۔ یہ فعل اس کی اپنی قوت و طاقت سے نہیں ہے اور جو اصل ایمان میں بلا دلیل راست گو ہو وہ اعتقاد کے تمام اصول اور ولایت میں دلیل کے ساتھ راست گو ہوگا اس لئے کہ اس کا اعتقاد ہر حال میں ولی کے اعتقاد کی صفت میں ہوگا اگر چہ اس کے اعمال اس کے اپنے اعتقاد کے موافق نہ ہوں۔ اس کے دعوٰی ولایت پر ولایت کے معاملات نہ کرنے سے کوئی اثر نہیں پڑتا جس طرح ایمان کا دعوٰی، احکام و عمل نہ کرنے سے باطل قرار نہیں پاتا۔ درحقیقت کرامت اور ولایت، حق تعالیٰ کی عطاؤ بخشش سے متعلق ہے نہ کہ بندے کے کسب و اختیار سے لہٰذا بندے کا کسب و مجاہدہ درحقیقت ہدایت کے لئے علت نہیں ہوتا۔ اس سے قبل بتا چکا ہوں کہ اولیاء معصوم نہیں ہیں کیونکہ عصمت نبوت کے لئے ہے لیکن اولیاء آفتوں سے محفوظ ہیں کیونکہ ان کے وجود سے نفی مقتضی ہوسکتی ہے اور ولایت کا نفی میں آفت کا وجود ایمان کی نفی کا حکم رکھتی ہے۔ اس میں ارتداد از قسم معصیت نہیں ہے یہ مذہب محمد بن علی حکیم ترمذی کا ہے اور حضرت جنید، حضرت ابوالحسن نوری اور حضرت محاسبی رحمہم اللہ اور ان کے بکثرت محقق اتباع کا بھی یہی مسلک ہے لیکن اہل معاملات جیسے حضرت سہل بن عبداللہ تستری، ابوسلیمان درانی اور ابوحمدون قصاب وغیرہ رحمہم اللہ کا مشرب ہے کہ ولایت کی شرط ہمیں طاعت پر قائم رہنے کی ہے جب ولی کے دل پر کبیرہ کا گزر ہو جائے تو وہ ولایت سے معزول ہو جاتا ہے۔ میں پہلے ظاہر کر چکا ہوں کہ امت کا اجماع ہے کہ کبیرہ کے ارتکاب سے بندہ ایمان سے خارج نہیں ہوتا لہٰذا کوئی ولایت، دوسری ولایت سے بہتر نہیں ہے اور جب معرفت کی ولایت جو تمام کرامتوں کی جڑ ہے معصیت سے ساقط نہیں ہوتی تو یہ ناممکن ہے کہ جو چیز شرف و کرامت میں اس سے کم درجہ پر ہو وہ معصیت سے زائل ہو جائے۔ مشائخ کے درمیان یہ اختلاف بہت طویل بحث بن چکا ہے۔

ظہور کرامت کی حالت:

اس سلسلہ میں سب سے اہم بات علم یقین سے اس کا جاننا ہے کہ ولی سے ظہورِ کرامت کس حالت میں ہوا ہے؟ آیا حالت صحو میں ہوا ہے یا حالت سکر میں؟ غلبۂ حال میں ہوا ہے یا محل استقامت میں؟ صحو و سکر کی تفصیل طیفوری مذہب کے ذکر میں آچکی ہے۔

حضرت بایزید بسطامی، حضرت ذوالنون مصری، حضرت محمد بن خفیف، حضرت حسین بن منصور، حضرت یحیٰ ابن معاذ رازی رحمہم اللہ اور ایک جماعت کا مذہب یہ ہے کہ ولی سے ظہور کرامت، بجز حالت سکر کے ممکن نہیں اور جو حالت صحو میں واقع ہوتا ہے وہ نبی کا معجزہ ہے۔ ان کے مذہب میں کرامت و معجزے کے درمیان یہ فرق واضح ہے کیونکہ ولی پر اظہارِ کرامت سکر کی حالت میں ہوگا یعنی وہ مغلوب الحال اور دعوٰی سے بے نیاز ہوگا اور نبی پر معجزے کا اظہار اس کے صحو کی حالت میں ہوگا کیونکہ وہ تحدی کرتا اور لوگوں کو اپنے مقابلہ میں بلاتا ہے اور صاحب معجزہ حکم کے دونوں اطراف میں مختار کیا گیا ہے۔ ایک اس کے اظہار میں جبکہ وہ اعجاز کے لئے معارضہ میں لائے۔ دوسرے ان کے پوشیدہ رکھنے میں۔ چونکہ اولیاء کے لئے یہ صورت متصور نہیں کہ انہیں کرامت میں اختیار دیا گیا ہے کیونکہ بسا اوقات وہ ظہور کرامت چاہتے ہیں اور ظہور نہیں ہوتا اور کبھی چاہتے نہیں مگر ظہور ہو جاتا ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ ولی داعی نہیں ہوتا ہے کہ اس کا حال قیام سے منسوب ہو بلکہ وہ پوشیدہ ہے اور اس کا حال صفت فنا سے موصوف ہے لہٰذا ایک صاحب شرع ہے اور دوسرا صاحب اَسرار۔ اس لئے سزاوار یہ ہے کہ کرامت، خوف اور غیبت حال کے سوا ظاہر نہ ہو۔

خلاصۂ کلام یہ ہے کہ اس کا تصرف حق تعالیٰ کے تصرف سے وابستہ ہے۔ جس وقت ولی کا ایسا حال ہو جائے اس وقت اس کی ہر بات حق تعالیٰ کی مدد سے وجود میں آتی ہے اس لئے کہ صفت بشریت کی برقراری یا تو اہل لہو کو ہوگی یا اہل سہو کو یا مطلق الٰہی کو لہٰذا انبیاء علیہم السلام کی بشریت لہو اور سہو کی بنا پر نہیں ہوگی اور انبیاء کے سوا کوئی مطلق الٰہی نہیں ہوگا۔ (جن پر اطلاق بشریت خدا کی طرف سے ہو اور اصل حقیقت عوام سے مخفی ہو۔ فافہم مترجم) اس جگہ ایک تردد

تلون رہ جاتا ہے جو تحقیق و تمکین کے سوا ہے۔

اولیا کی بشریت جب تک قائم و باقی رہتی ہے وہ محجوب رہتے ہیں اور صفاتِ بشریت کو فنا کر کے مکاشف اور مشاہدے میں ہوتے ہیں تو وہ الطاف حق کی حقیقت میں مدہوش ہو جاتے ہیں لہٰذا حالت کشف کے بغیر، اظہار کرامت صحیح نہیں ہوتا اور یہ ان کے قرب کا درجہ ہے۔ اس حال میں ان کے دل میں پتھر اور سونا دونوں برابر ہیں۔ یہ حال انبیاء کے سوا کسی صورت میں کسی اور کے لئے ممکن نہیں اگر کسی کا ہو بھی جائے تو وہ عارضی حالت ہوگی یہ حال بجز سکر و مدہوشی کے نہ ہوگا۔ جس طرح حضرت حارث محاسبی ایک دن دنیا سے ایسے گم ہوئے کہ دنیا میں رہتے ہوئے بھی عقبیٰ سے جا ملے اس وقت انہوں نے فرمایا:

عرضت نفسی من الدنیا	میں نے دنیا سے اپنے آپ کو جدا کیا تو اس
فاستوت عندی حجرھا و ذھبھا	وقت میرے نزدیک دنیا کا سونا چاندی اور
وفضتھا ومدرھا	پتھر ڈھیلے سب برابر ہو گئے۔

دوسرے دن لوگوں نے جب باغ میں کام کرتے دیکھا تو پوچھا اے حارث کیا کر رہے ہو؟ انہوں نے فرمایا اپنی روزی حاصل کر رہا ہوں کیونکہ اس کے بغیر کوئی چارۂ کار نہیں۔ ایک دن ان کا وہ حال تھا اور دوسرے دن ان کا یہ حال۔؟

اولیاء کے نزدیک صحو عوام کا درجہ ہے اور ان کے سکر کا مقام انبیاء کا درجہ ہے۔ جب وہ اپنے آپ میں واپس آتے ہیں تو اس وقت وہ خود کو دیگر لوگوں کی مانند ایک فرد جانتے ہیں اور جب وہ اپنے آپ سے غائب ہو جاتے ہیں اس وقت وہ اللہ تعالیٰ کی طرف متوجہ ہوتے ہیں یہاں تک کہ ان کا سکر انہیں مہذب اور شائستہ بنانے والا ہوتا ہے اور وہ حق تعالیٰ کے ساتھ شائستہ ہو جاتے ہیں اور سارا جہان مثل سونے کے ہو جاتا ہے۔ حضرت شبلی علیہ الرحمۃ فرماتے ہیں کہ:

ذھب اینما ذھبنا ودر حیثما	جہاں ہم گئے سونا تھا اور جس جگہ پہنچے
درنا وفضۃ فی الفضاء	موتی تھے اور فضاء میں چاندی تھی۔

استاد امام ابوالقاسم قشیری رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ میں نے طبرانی سے ابتدائی حال کی بابت پوچھا تو انہوں نے کہا ایک دن مجھے ایک پتھر کی ضرورت لاحق ہوئی سرخس کی شاہراہ سے جو پتھر اٹھاتا تھا وہ جوہر و پارس ہوتا تھا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ان کے نزدیک دونوں برابر تھے بلکہ یہ اس لئے تھا کہ جو لعل ان کے ہاتھ میں آتا تھا وہ ان کی مراد کے مقابلہ میں پتھر سے زیادہ حقیر چیز تھی۔

مجھ سے خواجہ امام خرامی نے سرخس میں فرمایا کہ میں بچہ تھا اور مایۂ قزر کے لئے شہتوت کے پتوں کی تلاش میں وہاں کے ایک محلّہ میں پہنچا اور ایک درخت پر چڑھ کر ایک ٹہنی سے پتے جھاڑنے لگا۔ شیخ ابوالفضل بن حسن رحمہ اللہ علیہ اس کوچہ سے گزرے انہوں نے مجھے درخت پر چڑھا ہوا نہ دیکھا مجھے اس میں کوئی شک نہیں وہ اس وقت اپنے آپ سے غائب تھے اور ان کا دل خدا کے ساتھ خوش و خرم تھا۔ حضرت ابوالفضل رحمۃ اللہ علیہ نے اپنا سر اٹھا کر کہا اے خدا ایک سال سے زیادہ گزر گیا تو نے مجھے ایک دمڑی تک نہ دی کہ میں سر کے بال ہی بنوالیتا دوستوں کے ساتھ ایسا کرتا ہے وہ بیان کرتے ہیں کہ اسی وقت درخت کے تمام پتے، ٹہنیاں اور جڑیں سونے کی ہو گئیں۔ یہ دیکھ کر حضرت ابوالفضل نے کہا، عجیب بات ہے؟ میری کنارہ کشی پر میرے دل کی کشادگی کے لئے یہ سب پھبتی اور استہزاء ہے میں تجھ سے ایک بات بھی نہیں کہہ سکتا۔

حضرت شبلی علیہ الرحمۃ کا واقعہ ہے کہ انہوں نے چار ہزار اشرفیاں دریائے دجلہ میں پھینک دیں۔ لوگوں نے کہا یہ کیا کرتے ہو؟ انہوں نے فرمایا پتھر پانی میں اچھے ہوتے ہیں۔ لوگوں نے کہا اسے مخلوق خدا میں تقسیم کیوں نہ کر دیا۔ آپ نے فرمایا کہ سبحان اللہ! اپنے دل سے حجاب اٹھا کر مسلمان بھائیوں کے دلوں پر ڈال دوں۔ میں خدا کو کیا جواب دوں گا کیونکہ دین میں اس کی گنجائش کہاں ہے کہ مسلمان بھائیوں کو اپنے سے بدتر سمجھوں۔ یہ سب سکر و مدہوشی کے حالات ہیں۔ جیسا کہ پہلے بیان کر چکا ہوں۔ اس جگہ مقصود اثبات کرامت ہے۔

حضرت جنید بغدادی، ابوالعباس سیاری، ابوبکر واسطی اور صاحب مذہب محمد بن علی حکیم

ترمذی رحمہم اللہ کا مذہب یہ ہے کہ کرامت، صحو و تمکین یعنی استقامت کی حالت میں بغیر سکر کے ظاہر ہوتی ہے کیونکہ اولیاء اللہ، حق تعالیٰ کی طرف سے مدبرانِ عالم اور برگزیدہ حضرات ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے جہان کا حاکم بنا کر دنیا کا حل وعقد و بسط و کشاد ان سے وابستہ کیا ہے اور انہیں کے ارادوں پر جہان کے لئے احکام منحصر فرمائے ہیں لہٰذا سزاوار یہی ہے کہ ان کی رائے سب سے زیادہ صحیح اور خلق خدا پر ان کا دل سب سے بڑھ کر مہربان ہو کیونکہ وہ واصل بحق ہیں، تلوین و سکر تو ان کا ابتدائی حال ہے جب بلوغ حاصل ہو جاتا ہے تو تلوین و سکر، تمکین و استقامت سے بدل جاتا ہے اس وقت وہ حقیقی ولی اور ان کی کرامت صحیح ہوتی ہے اولیاء کے درمیان مشہور ہے کہ اوتاد کے لئے لازم ہے کہ وہ رات بھر میں سارے جہان کا گشت مکمل کر لیں اور اگر کوئی جگہ ایسی رہ جائے جہاں ان کی نظر نہ پڑے تو دوسرے دن اس جگہ کوئی خلل واقع ہو جاتا ہے اس وقت وہ اوتاد، اپنے غوث و قطب کی طرف رجوع ہوتے ہیں تا کہ وہ اپنی قوت اس طرف مبذول فرمائے۔ اللہ تعالیٰ اسی غوث و قطب کی برکت سے جہان کے اس خلل کو دور فرما دیتا ہے۔

جو حضرات یہ کہتے ہیں کہ ''سونا اور پتھر ان کے نزدیک برابر ہیں'' یہ بات سکر اور دیدار الٰہی میں نادرستی کی علامت ہے اس کے لئے یہ حالت بزرگی کی نہیں ہے مردانِ خدا کی بزرگی تو صحیح اور راست پندار میں ہے اور ان کے نزدیک سونا سونا اور پتھر پتھر ہے مگر وہ اس کی آفت سے باخبر ہوتا کہ انہیں دیکھ کر یہ کہہ سکے کہ اے زرد سونے اے سفید چاندی مجھے کیوں فریب دیتے ہو میں تمہارے دھوکے میں نہیں آسکتا کیونکہ میں نے تمہاری آفتوں کو دیکھ لیا ہے اور جس نے ان آفتوں کو دیکھ لیا اس کے لئے وہ محل حجاب نہیں بنتا۔ جب وہ ان کے چھوڑنے کو کہتا ہے تو وہ ثواب پاتا ہے پھر یہ کہ جب وہ سونے کو پتھر کہتا ہے تو پتھر کو چھوڑنے کی تلقین کسی طرح درست نہیں ہو سکتی۔ تم نے نہیں دیکھا کہ حضرت حارث جب حالت سکر میں تھے تو انہوں نے فرمایا: سونا چاندی اور پتھر ڈھیلے میرے نزدیک سب برابر ہیں۔

حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ صاحب صحو تھے دنیا کے قبضہ کی آفت کو دیکھا اور اس کی جدائی میں اجر و ثواب معلوم ہوا تو مال و زر سے ہاتھ اٹھا لیا یہاں تک کہ نبی کریم نے ان سے فرمایا اے

صدیق گھر والوں کے لئے کیا چھوڑا؟ عرض کیا اللہ اور اس کا رسول صلی اللہ علیہ وسلم۔

واقعہ:

حضرت ابوبکر وراق رحمتہ اللہ علیہ بیان فرماتے ہیں کہ ایک دن حکیم ترمذی رحمتہ اللہ علیہ نے مجھ سے فرمایا اے ابوبکر آج میں تمہیں اپنے ساتھ لے کر جاؤں گا میں نے عرض کیا شیخ کا حکم سر آنکھوں پر۔ میں ان کے ساتھ چلد یا زیادہ دیر نہ گزری تھی کہ میں نے ایک نہایت گھنا جنگل دیکھا اور اس جنگل کے درمیان ایک سرسبز درخت کے نیچے ایک زرنگار تخت بچھا ہوا دیکھا جہاں ایک چشمہ پانی کا جاری تھا۔ ایک شخص عمدہ لباس پہنے ہوئے اس تخت پر بیٹھا ہوا تھا جب حکیم ترمذی رحمتہ اللہ علیہ اس کے نزدیک پہنچے تو وہ شخص کھڑا ہو گیا اور انہیں اس تخت پر بٹھا دیا تھوڑی دیر کے بعد ہر طرف سے لوگ آنے لگے یہاں تک کہ چالیس آدمی جمع ہو گئے۔ انہوں نے اشارہ کیا اسی وقت آسمان سے کھانے کی چیزیں اترنے لگیں ہم سب نے کھایا، حکیم ترمذی نے کوئی سوال کیا اس مرد نے اس کا بہت طویل جواب دیا جس کا میں ایک کلمہ بھی نہ سمجھ سکا کچھ عرصہ بعد اجازت مانگی اور واپس آ گئے۔ مجھ سے فرمایا تم نیک بخت ہو۔ جب کچھ مدت بعد ترمذ پھر تشریف لائے تو میں نے عرض کیا اے شیخ! وہ کون سی جگہ تھی؟ اور وہ کون شخص تھا؟ انہوں نے فرمایا بنی اسرائیل کا جنگل تھا اور وہ مرد ''قطب مدار علیہ'' تھا۔ میں نے عرض کیا اے شیخ! اتنی مختصر گھڑی میں ترمذ سے بنی اسرائیل کے جنگل میں کیسے پہنچ گئے؟ وہ بولے اے ابوبکر! تمہیں پہنچنے سے کام ہے نہ کہ پوچھنے اور سبب دریافت کرنے سے؟ یہ حالت صحو کی علامت ہے نہ کہ سکر کی۔ مختصراً کرامت کے اثبات میں تمام پہلو پر گفتگو کر چکا ہوں مزید تفصیل وتشریح کی یہاں گنجائش نہیں اب اس ضمن میں یہاں کچھ حکایاتِ لطیف بیان کرتا ہوں جن کے درمیان کچھ دلائل بھی ہوں گے تا کہ ہر طبقہ کے لئے سودمند ثابت ہوں۔ وباللہ التوفیق۔

کرامات اولیاء کے ثبوت میں دلائل نقلیہ

واضح رہنا چاہئے کہ جب کرامت کی صحت پر دلائل ہے اور اس کے ثبوت میں

براہین ساطعہ قائم ہو جائیں تو مناسب ہے کہ کچھ دلائل نقلیہ بھی بیان کر دیئے جائیں چنانچہ اہل اللہ کی کرامتیں اور ان سے خرق عادات افعال کے صدور ہونے کی صحت پر کتاب وسنت اور احادیث صحیحہ مروی ہیں اس کا انکار تمام نصوصی احکام کا انکار ہوگا۔ اللہ تعالیٰ نے ہمیں قرآن میں خبر دی ہے کہ:

وَظَلَّلْنَا عَلَيْكُمُ الْغَمَامَ وَاَنْزَلْنَا عَلَيْكُمُ الْمَنَّ وَالسَّلْوٰى (البقرہ:۵۷)

اور ہم نے تم پر بادلوں کا سایہ کیا اور ہم نے من وسلویٰ اتارا (جو ہر رات تازہ اترتا تھا)۔

اگر کوئی منکر یہ کہے کہ یہ تو حضرت موسیٰ علیہ السلام کا معجزہ تھا تو ہم جواب دیں گے کہ ٹھیک ہے اولیاء کی کرامتیں بھی تو ہمارے حضور صلی اللہ علیہ وسلم ہی کے معجزے ہیں اگر کوئی یہ کہے کہ اولیاء کی کرامت نبی کی غیبت میں واجب نہیں کیونکہ وہ نبی کا معجزہ ہے اور حضرت موسیٰ علیہ السلام اس وقت ان میں موجود تھے؟ تو ہم کہیں گے کہ جس وقت حضرت موسیٰ علیہ السلام بنی اسرائیل سے غائب ہو کر کوہِ طور پر گئے تھے اس وقت بھی تو یہ معجزہ برقرار تھا لہٰذا غیبت مکان اور غیبت زمان برابر ہے جبکہ وہ معجزہ غیبت مکان میں درست تھا تو اس وقت غیبت زمان میں بھی درست ہے۔

دوسری دلیل یہ کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت آصف بن برخیا کی کرامت کی بھی ہمیں خبر دی ہے جس وقت کہ حضرت سلیمان علیہ السلام نے چاہا تھا کہ بلقیس کا تخت ان کے سامنے پیش کیا جائے اور انہوں نے اس جگہ حاضر کر دیا تھا۔ اللہ تعالیٰ نے چاہا کہ حضرت آصف کی شرافت و بزرگی لوگوں پر ظاہر ہو جائے اور وہ اپنی کرامت لوگوں کے روبرو ظاہر کریں کیونکہ کرامت اولیاء جائز ہے۔ چنانچہ حضرت سلیمان علیہ السلام نے دربار میں فرمایا تھا کون ہے جو بلقیس کے آنے سے پہلے اس کا تخت ہمارے سامنے لے آئے؟ اللہ نے ہمیں اس طرح خبر دی ہے کہ:

قَالَ عِفْرِيْتٌ مِّنَ الْجِنِّ اَنَا اٰتِيْكَ بِهٖ قَبْلَ اَنْ تَقُوْمَ مِنْ مَّقَامِكَ (النمل:۳۹)

جنات میں سے ایک دیو نے کہا میں آپ کی مجلس برخاست ہونے سے پہلے لے آؤں گا۔

حضرت سلیمان علیہ السلام نے فرمایا اس سے جلدی درکار ہے۔ حضرت آصف بن برخیا نے عرض کیا:

اَنَا اٰتِيْكَ بِهٖ قَبْلَ اَنْ يَّرْتَدَّ اِلَيْكَ طَرْفُكَ فَلَمَّا رَاٰهُ مُسْتَقِرًّا (النمل: ۴۰)

میں اسے آپ کی پلک جھپکنے سے پہلے لے آؤں گا پھر جب نظر اٹھائی تو تخت موجود تھا۔

حضرت سلیمان علیہ السلام نے حضرت آصف کی اس تعمیل پر نہ حیرت کا اظہار فرمایا نہ انکار کیا اور نہ اسے محال جانا حالانکہ یہ کسی حال میں معجزہ نہ تھا کیونکہ حضرت آصف نبی نہ تھے لامحالہ یہی کہا جائے گا کہ یہ کرامت تھی اگر معجزہ ہوتا تو اس کا ظہور حضرت سلیمان علیہ السلام کے ہاتھ سے ہونا چاہئے تھا۔

تیسری دلیل پر سب کا اتفاق ہے کہ حضرت مریم سلام اللہ علیہا نبی نہ تھیں۔ اللہ تعالیٰ نے ان کے حال کی صریح طور پر خبر دی کہ:

وَهُزِّيْٓ اِلَيْكِ بِجِذْعِ النَّخْلَةِ تُسٰقِطْ عَلَيْكِ رُطَبًا جَنِيًّا (مریم: ۲۵)

اے مریم کھجور کے درخت کی ٹہنی اپنی طرف ہلاؤ وہ تم پر تر و تازہ کھجوریں گرائے گا۔

اور یہ کہ اللہ تعالیٰ نے انہیں کے قصہ میں ہمیں خبر دی کہ جب زکریا علیہ السلام ان کے پاس تشریف لائے تو ان کے پاس گرمی کے موسم میں سردی کے میوے اور سردی کے موسم میں گرمی کے میوے موجود پاتے چنانچہ حضرت زکریا علیہ السلام نے ان سے پوچھا:

اَنّٰى لَكِ هٰذَا قَالَتْ هُوَ مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ (آل عمران: ۳۷)

تمہارے پاس یہ میوے کہاں سے آئے تو مریم نے کہا یہ اللہ تعالیٰ نے بھیجے ہیں۔

چوتھی دلیل یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اصحاب کہف کے حالات میں ان کے کتے کا ان سے کلام کرنے اور غار میں دائیں بائیں پہلو بدلتے رہنے کی خبر دی ہے کہ:

وَنُقَلِّبُهُمْ ذَاتَ الْيَمِيْنِ وَذَاتَ الشِّمَالِ وَكَلْبُهُمْ بَاسِطٌ ذِرَاعَيْهِ (الکہف:۱۸)

ہم انہیں دائیں اور بائیں پہلو بدلتے رہتے ہیں اور ان کا کتا دونوں بازو پھیلائے بیٹھا ہے۔

مذکورہ تمام افعال خرق عادات سے تعلق رکھتے ہیں اور ظاہر ہے کہ معجزے نہیں ہیں۔ لامحالہ انہیں کرامت ہی کہنا چاہئے خواہ یہ کرامتیں قبولیت دعا کے معنی میں ہوں جو تکلیف کے زمانہ میں امور موہوم کے حاصل ہونے کے لئے ہوں، خواہ طویل مسافت، مختصر وقت میں طے کرنا ہو، خواہ طعام کا ظاہر ہونا غیر متوقع جگہ سے ہوا ہو خواہ لوگوں کے ذہنوں میں شرافت و بزرگی جمانی مقصود ہو یا کسی اور سلسلہ میں ہو۔

احادیث سے کرامت کا ثبوت:

(۱) احادیث صحیحہ میں حدیث غار مشہور و معروف ہے جس کی تفصیل یہ ہے کہ ایک روز صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا! یا رسول اللہ! گزشتہ امتوں کے احوال میں سے کوئی عجیب چیز بیان فرمائیے؟ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا گزشتہ زمانہ میں تین شخص کہیں جا رہے تھے۔ جب رات کا وقت آیا تو ایک غار میں چلے گئے اور وہاں سو گئے جب رات کا ایک پہر گزرا تو پہاڑ سے ایک بڑا پتھر لڑھکا اور غار کے منہ پر آ گرا جس سے دہانہ بند ہو گیا سب پریشان ہو کر کہنے لگے اب یہاں سے ہماری خلاصی ممکن نہیں جب تک کہ ہر ایک اپنے اپنے ان افعال کو یاد کر کے (جو بغیر ریاکاری کئے ہوں) خدا کی بارگاہ میں توبہ نہ کر لے۔ چنانچہ ایک نے کہا میرے ماں باپ بوڑھے اور ضعیف تھے اور میرے پاس سوائے ایک بکری کے کوئی دنیاوی مال نہ تھا میں بکری کا دودھ انہیں پلاتا تھا اور خود روزانہ لکڑیاں، کاٹ کر لاتا اور انہیں فروخت کر کے اپنا اور ان کا کھانا تیار کرتا تھا اتفاق سے ایک

رات دیر سے آیا اور وہ بغیر دودھ پئے اور کھانا کھائے سو گئے، میں بھی کچھ کھائے پئے بغیر دودھ کا پیالہ ہاتھ میں لئے ان کی بیداری کے انتظار میں کھڑا رہا یہاں تک کہ ساری رات بیت گئی صبح دم وہ بیدار ہوئے اور کھانا کھایا اس کے بعد میں بیٹھا۔ پھر اس نے دعا مانگی کہ اے خدا اگر میں صحیح کہہ رہا ہوں تو ہمارے لئے راستہ کھول دے اور ہماری فریاد کو قبول فرما۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ اس وقت اس پتھر نے جنبش کی اور تھوڑا سا دہانہ سے سرک گیا۔ اس کے بعد دوسرے نے کہا میرے چچا کی ایک خوبصورت لڑکی تھی میں اس پر فریفتہ تھا میں اسے بلاتا تھا مگر وہ منظور نہ کرتی تھی یہاں تک کہ میں نے ایک دن بہانے سے دو ہزار اشرفیاں بھیجیں تا کہ ایک رات میرے پاس گزارے جب وہ میرے پاس آئی تو میرا دل خوفِ خدا سے کانپ اٹھا اور میں نے اسے چھوڑ دیا اور اشرفیاں بھی اس کے پاس رہنے دیں اس کے بعد اس نے دعا مانگی کہ اے خدا اگر میں سچ کہہ رہا ہوں تو ہمارے لئے راستہ کھول دے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ پتھر نے جنبش کی اور وہ دہانہ سے کچھ اور ہٹ گیا لیکن ابھی اتنا راستہ نہ ہوا تھا کہ اس سے گزر سکیں۔ پھر تیسرے شخص نے کہنا شروع کیا میرے پاس کچھ مزدور کام کرتے تھے جب کام ختم ہو گیا تو تمام مزدوروں کو اجرت دے کر رخصت کر دیا لیکن ایک مزدور ان میں سے غائب تھا۔ میں نے اس کی مزدوری سے ایک بھیڑ خریدی دوسرے سال وہ دو ہو گئیں تیسرے سال وہ چار ہو گئی ہر سال وہ اسی طرح بڑھتی رہیں یہاں تک کہ چند سالوں میں ایک ریوڑ بن گیا اس وقت وہ مزدور آیا اس نے کہا تم کو یاد ہوگا کہ فلاں وقت میں نے تمہاری مزدوری کی تھی اب مجھے اس کی مزدوری چاہئے۔ میں نے کہا وہ تمام بھیڑیں لے جاؤ وہ سب تمہارا مال ہے تم اس کے مالک ہو اس نے کہا تم مجھے ہنسی کرتے ہو میں نے کہا نہیں میں ٹھیک کہہ رہا ہوں میں نے وہ تمام مال تمہارے لئے ہی جمع کر کے رکھا ہے تم انہیں لے جاؤ اس کے بعد اس نے دعا مانگی کہ اے خدا اگر

میں سچ کہہ رہا ہوں تو ہمارے لئے راستہ کھول دے۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ وہ پتھر غار کے دہانہ سے بالکل ہٹ گیا اور یہ تینوں باہر نکل آئے۔ یہ فعل بھی خرقِ عادات ہی تھا۔

(۲) جریج راہب والی ایک حدیث مشہور ہے جسے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا شیر خوارگی کے زمانہ میں کسی نے جھولے میں کلام نہ کیا بجز تین شخصوں کے ایک حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے جن کا حال سب کو معلوم ہے اور دوسرے بنی اسرائیل میں جریج نامی ایک راہب نے جو ایک مجتہد شخص تھا اس کی ماں پردہ نشین عورت تھی۔ ایک دن وہ اپنے بیٹے جریج کو دیکھنے آئی وہ خانہ خدا کے حجرے میں نماز پڑھ رہا تھا۔ دروازہ نہ کھلا، دوسرے اور تیسرے دن بھی ایسا ہی ہوا اس کی ماں نے دل برداشتہ ہو کر بددعا کی کہ اے خدا میرے بیٹے کو میرے حق میں نکال کر رسوا کر دے اسی دوران ایک فاحشہ عورت نے ایک گروہ کی خوشنودی اور خوشامد کی خاطر وعدہ کیا کہ میں جریج کو بے راہ کر دوں گی چنانچہ وہ اس کے حجرے میں گھس آئی لیکن جریج نے اس کی طرف التفات تک نہ کیا۔ واپسی پر اسی عورت نے راستہ میں ایک چرواہے کے پاس رات گزاری اور وہ اس سے حاملہ ہو گئی جب وہ بستی میں آئی تو کہنے لگی کہ یہ حمل جریج نامی راہب کا ہے۔ جب اس عورت نے بچہ جنا تو لوگوں نے جریج کے حجرے میں گھس کر اسے پکڑ لیا اور بادشاہ کے سامنے لے گئے۔ جریج نے نوزائیدہ بچے کی طرف متوجہ ہو کر کہا اے بچے! بتا تیرا باپ کون ہے؟ بچے نے جواب دیا اے جریج! میری ماں نے تم پر الزام و بہتان باندھا ہے میرا باپ فلاں چرواہا ہے۔

شیر خوارگی میں کلام کرنے والا تیسرا بچہ اس عورت کا ہے جو اپنے گھر کے دروازے پر بن سنور کر بیٹھی تھی ایک حسین و جمیل سوار عورت کے آگے سے گزرا اس عورت نے دعا مانگی کہ اے خدا میرے بچہ کو اس سوار کی مانند بنا دے۔ اس شیر خوار بچے نے کہا

اے خدا! مجھے ایسا نہ کر۔ کچھ دیر بعد ایک بدنام عورت گزری۔ بچہ کی ماں نے کہا اے خدا! میرے بچہ کو اس جیسا نہ بنا۔ اسی وقت بچہ نے کہا اے خدا! مجھے اس عورت جیسا کر دے۔ بچہ کی ماں نے متعجب ہو کر پوچھا ایسا کیوں کہتا ہے؟ بچے نے جواب دیا وہ سوار متکبر اور ظالم ہے اور یہ عورت اصلاح پسند ہے لیکن لوگ اسے برا کہتے ہیں حالانکہ وہ اسے پہچانتے نہیں۔ میں نہیں چاہتا کہ میں ظالموں اور متکبروں میں سے ہوں۔ میں چاہتا ہوں کہ اصلاح کرنے والا بنوں۔

(۳) ایک اور حدیث امیر المومنین حضرت عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ کی باندی زائدہ کی مشہور ہے۔ ایک دن زائدہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی بارگاہ میں آئی۔ اس نے سلام عرض کیا تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا زائدہ اتنے دنوں کے بعد کیوں آئی ہے حالانکہ تو فرمانبردار ہے اور میں تجھے پسند بھی کرتا ہوں۔ اس نے عرض کیا یارسول اللہ میں ایک عجیب بات عرض کرنے کے لئے حاضر ہوئی ہوں۔ فرمایا وہ کیا بات ہے؟ اس نے کہا، صبح کے وقت میں لکڑیاں تلاش کرنے نکلی اور ایک گٹھر باندھ کر پتھر پر رکھا تا کہ اسے میں اٹھا کر سر پر رکھوں اتنے میں ایک سوار کو آسمان سے زمین پر اترتے دیکھا اس نے پہلے مجھے سلام کیا اور پھر کہا کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے میرا سلام عرض کرنا اور کہنا کہ خازنِ جنت رضوان نے سلام پیش کیا ہے اور آپ کو بشارت دی ہے کہ جنت کو آپ کی کرامت کے لئے تین حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ ایک حصہ تو ان لوگوں کے لئے ہے جو بے حساب جنت میں داخل ہوں گے اور ایک حصہ ان لوگوں کے لئے ہے جن پر حساب آسان ہوگا اور ایک حصہ ان لوگوں کے لئے جو آپ کی سفارش اور آپ کے وسیلہ سے بخشے جائیں گے۔ یہ کہہ کر وہ سوار آسمان پر چڑھنے لگا پھر زمین و آسمان کے درمیان میری طرف رخ کر کے اس نے دیکھا میں لکڑی کا گٹھر اٹھا کر سر پر رکھنا چاہتی تھی لیکن وہ مجھ سے اٹھایا نہیں جا رہا تھا۔ اس سوار نے کہا اے زائدہ اسے پتھر پر ہی رہنے دو۔ پھر پتھر سے کہا اے پتھر! اس گٹھر کو زائدہ کے

ساتھ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے مکان تک پہنچادے اس پتھر نے ایسا ہی کیا اور وہ پتھر گھر تک پہنچا گیا۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اٹھے اور اپنے صحابہ کے ساتھ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے گھر تشریف لائے اور پتھر کے آنے اور جانے کا نشان ملاحظہ فرمایا۔ پھر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا الحمد للہ! خدا نے مجھے دنیا سے اس حال میں رخصت فرمایا ہے کہ رضوان کے ذریعہ میری امت کی بشارت مرحمت فرمائی اور میری امت میں سے ایک عورت جس کا نام زائدہ ہے اسے مریم سلام اللہ علیہا کے درجہ پر فائز کیا ہے۔

(۴) مشہور واقعہ ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علاء بن حضری رضی اللہ عنہ کی سرکردگی میں ایک لشکر روانہ فرمایا۔ سفر کے دوران ایک نہر پڑی لشکریوں نے اس میں قدم ڈال دیئے۔ سب گزر گئے اور کسی کا پاؤں تک نہ بھیگا۔

اولیائے امت محمدیہ صلی اللہ علیہ وسلم کے کرامات

(اولیائے امت محمدیہ صلی اللہ علیہ وسلم کے کرامات اگرچہ اس کتاب میں جگہ بجگہ ہیں تکرار کے لحاظ سے ان کا اعادہ نہیں کیا جا رہا ہے مزید چند جھلکیاں پیش کی جا رہی ہیں جو اہم ہیں)۔

(۱) حضرت عبداللہ ابن عمر رضی اللہ عنہما کا واقعہ ہے کہ وہ کسی سفر میں جا رہے تھے آپ نے ملاحظہ فرمایا کہ سرِ راہ ایک جماعت خوفزدہ کھڑی ہے اور ایک شیر ان کا راستہ روکے کھڑا ہوا ہے۔ حضرت عبداللہ ابن عمر رضی اللہ عنہما نے شیر کو مخاطب کر کے فرمایا اے کتے! اگر تو اللہ تعالیٰ کے حکم سے راستہ روکے کھڑا ہے تو ہمیں راستہ نہ دے اگر خدا کی حکم سے نہیں تو راستہ چھوڑ دے۔ شیر اٹھا اور ان کے آگے سر جھکا دیا اور راستہ سے ہٹ گیا۔

(۲) ایک بہادر عجمی شخص مدینہ منورہ آیا اس نے حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کی بابت

دریافت کیا لوگوں نے بتایا کسی جھونپڑے میں سو رہے ہوں گے۔ چنانچہ اس حال میں ان کو سوتا پایا کہ کوڑہ ان کے سر کے نیچے رکھا ہوا تھا اس نے اپنے دل میں کہا جہان میں سارا فتنہ انہیں کے دم کا ہے اس وقت ان کا مارڈالنا بہت آسان ہے اس نے قتل کرنے کے ارادہ سے تلوار سونتی اتنے میں دو شیر نمودار ہوئے دونوں نے اس پرحملہ کر دیا اس نے مدد کے لئے پکارا اس کی چیخ و پکار سے حضرت عمر رضی اللہ عنہ بیدار ہو گئے پھر اس نے سارا قصہ بیان کیا اور اسلام قبول کر لیا۔

(۳) حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کے زمانہ خلافت میں حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ (امیر لشکر اسلام) کے پاس سوادِ عراق سے تحفوں میں ایک ڈبہ لائے جس میں زہر قاتل تھا۔ اس سے زیادہ مہلک زہر اور کوئی نہ تھا۔ حضرت خالد نے اس ڈبہ کو کھولا اور زہر کو ہتھیلی پر رکھ کر بسم اللہ پڑھی اور منہ میں ڈال لیا۔ زہر نے انہیں کوئی نقصان نہیں پہنچایا۔ لوگ حیران رہ گئے اور ان میں سے بکثرت لوگوں نے اسلام قبول کر لیا۔

(۴) حضرت ابوالدرداء اور حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہما دونوں ایک جگہ کھانا کھا رہے تھے اور کھانے میں سے تسبیح کی آواز سن رہے تھے۔

(۵) حضرت ابراہیم نخعی رحمتہ اللہ علیہ کا یہ واقعہ مشہور ہے کہ انہوں نے ایک شخص کو ہوا میں بیٹھا دیکھا۔ انہوں نے اس سے پوچھا اے بندۂ خدا، تجھے یہ کمال کس چیز سے حاصل ہوا۔ اس نے کہا تھوڑی سی چیز سے، پوچھا وہ کیا چیز ہے؟ اس نے کہا میں نے دنیا سے منہ موڑ لیا ہے اور خدا کے فرمان سے دل لگا لیا ہے اس نے کہا اب تم کیا چاہتے ہو؟ میں نے کہا یہ کہ ایک مکان ہوا میں ہوتا کہ میرا دل لوگوں سے جدا ہو جائے۔

(۶) حضرت حسن بصری رحمتہ اللہ علیہ بیان کرتے ہیں کہ ایک حبشی عابد ویرانوں میں رہا کرتا تھا۔ ایک دن میں بازار سے کچھ خرید کر اس کے پاس لے گیا۔ اس نے پوچھا کیا چیز ہے؟ میں نے کہا کچھ کھانے کی چیزیں ہیں اس خیال سے لایا ہوں کہ شاید

تمہیں حاجت ہو؟ وہ میری طرف دیکھ کر ہنسا اور ہاتھ کا اشارہ کیا میں نے دیکھا کہ اس ویران مکان کے تمام اینٹ پتھر سونے کے بن گئے ہیں میں اپنے کئے پر شرمندہ ہوا اور جو لے گیا تھا اسے چھوڑ کر عابد کے رعب سے بھاگ کھڑا ہوا۔

(۷) حضرت ابراہیم ادہم رحمتہ اللہ علیہ بیان کرتے ہیں کہ میں ایک چرواہے کے پاس سے گزرا اور اس سے پانی مانگا۔ اس نے کہا میرے پاس دودھ ہے پانی کیوں مانگتے ہو؟ میں نے کہا مجھے پانی ہی چاہئے وہ اٹھا اور ایک لکڑی کو پتھر پر مارا اس پتھر سے صاف وشیریں پانی جاری ہو گیا اس کو دیکھ کر میں حیران رہ گیا؟ اس نے مجھ سے کہا حیرت وتعجب نہ کرو جب بندہ حق تعالیٰ کا فرمانبردار ہو جاتا ہے تو سارا جہان اس کے حکم کے تابع ہو جاتا ہے۔

(۸) حضرت ابوسعید خراز رحمتہ اللہ علیہ بیان کرتے ہیں کہ میں جنگل میں سفر کر رہا تھا میرا معمول تھا کہ ہر تیسرے دن کھانا کھاتا تھا جب تیسرے دن کے بعد پھر تیسرا دن گزر گیا تو کھانا نہ ملنے کی وجہ سے مجھے کمزوری معلوم ہونے لگی بدن غذا مانگ رہا تھا میں نقاہت سے ایک جگہ بیٹھ گیا غیب سے ایک آواز آئی اے ابوسعید نفس کے آرام کے لئے کھانا چاہتے ہو یا وہ سبب چاہتے ہو جو بغیر غذا کے کمزوری دور کر دے؟ میں نے عرض کیا اے خدا مجھے قوت چاہئے۔ اسی وقت توانائی آ گئی اور اٹھ کر سفر شروع کر دیا اور بغیر کھائے پئے بارہ منزلیں (بارہ دن میں) اور طے کر لیں۔

(۹) مشہور ہے کہ شہر تستر میں حضرت سہل بن عبداللہ تستری کے گھر کو لوگ بیت السباع کہتے ہیں اور تستر کے باشندوں کا کہنا ہے کہ ان کے پاس بکثرت درندے اور شیر وغیرہ آتے ہیں اور وہ ان کو کھلاتے اور خاطر داری کرتے ہیں۔

(۱۰) حضرت ابوالقاسم مروزی رحمتہ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ میں حضرت ابوسعید خزاری کے ساتھ دریا کے کنارے جا رہا تھا۔ میں نے ایک جوان گدڑی پہنے دیکھا پہاڑ کی کھوہ میں ایک توشہ دان لٹکا ہوا تھا۔ حضرت ابوسعید نے فرمایا اس نوجوان کی پیشانی سے

ظاہر تھا کہ یہ طریقت میں ضرور کوئی مقام رکھتا ہے جب اس نوجوان کی طرف دیکھتا تھا تو کہتا تھا کہ یہ واصل ہے اور جب توشہ دان پر نظر پڑتی تھی تو خیال آتا تھا کہ یہ ابھی طالب راہ ہے۔ انہوں نے فرمایا آؤ اس سے دریافت کریں کہ کیا حال ہے؟ چنانچہ حضرت خراز نے پوچھا اے نوجوان خدا کی راہ کون سی ہے؟ اس نے جواب دیا خدا کے دو راستے ہیں ایک عوام کی راہ دوسری خواص کی لیکن تمہیں خواص کی راہ کا تو پتہ ہی نہیں البتہ عوام کی راہ وہ ہے جس پر تم گامزن ہو اور اپنی ریاضت و مجاہدے کو وصولِ حق کا ذریعہ بنائے ہوئے ہو اس توشہ دان کو حجاب کا ذریعہ سمجھے ہوئے ہو۔

(۱۱) حضرت ذوالنون مصری رحمتہ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ میں کچھ لوگوں کے ساتھ کشتی میں سفر کر رہا تھا اور مصر سے جدہ کا ارادہ تھا۔ ایک نوجوان بھی گدڑی پہنے شریک سفر ہو گیا۔ مجھے خواہش ہوئی کہ میں اس کی صحبت میں بیٹھوں مگر اس کے رعب وہیبت سے بات کرنے کی ہمت نہ ہوئی کیونکہ وہ بہت ہی معزز تھا اور اس کا کوئی لمحہ عبادت سے خالی نہ تھا یہاں تک کہ ایک دن ایک شخص کے جواہرات کی تھیلی گم ہو گئی اس تھیلی کے مالک نے اس جوان پر الزام لگایا اور وہ چاہتا تھا کہ اس پر سختی کرے۔ میں نے اس سے کہا تم اس سے بات نہ کرو میں اس سے ابھی معلوم کئے لیتا ہوں چنانچہ میں اس کے پاس گیا اور نرمی سے بات کر کے بتایا کہ یہ لوگ تم پر ایسا شک کرتے ہیں اور میں نے ان کو ظلم وسختی سے روکا ہے۔ اب کیا کرنا چاہیئے؟ اس نے آسمان کی طرف سر اٹھایا اور کچھ پڑھا۔ میں نے دیکھا کہ مچھلیاں منہ میں ایک ایک موتی دبائے نکل آئیں۔ اس جوان نے ان میں ایک موتی لیا اور اس شخص کو دے دیا۔ کشتی میں تمام لوگ اس منظر کو دیکھ رہے تھے وہ جوان اٹھا اور پانی پر قدم رکھ کر چلا گیا جس نے وہ تھیلی چرائی تھی وہ کشتی ہی میں تھا اس نے اسے نکال کر ڈال دیا۔ تمام کشتی والے شرمندہ ہو کر رہ گئے۔

(۱۲) حضرت ابراہیم رقی علیہ الرحمۃ بیان کرتے ہیں کہ میں ابتدائے احوال میں حضرت

مسلم مغربی کی زیارت کرنے گیا۔ جب میں مسجد میں داخل ہوا تو وہ نماز کی امامت کر رہے تھے اور قرأت میں الحمد غلط پڑھ رہے تھے میں نے دل میں خیال کیا کہ میری محنت ضائع گئی۔ اس رات میں وہیں رہا دوسرے دن طہارت کے وقت اٹھا تا کہ نہر فرات کے کنارے جا کر وضو کرلوں راستہ میں ایک شیر سوتا دکھائی دیا۔ میں واپس آنے لگا اتنے میں ایک اور شیر چیختا ہوا میرے عقب میں آ گیا میں مجبور ہو کر رک گیا اس وقت حضرت مسلم مغربی اپنے حجرے سے باہر تشریف لائے جب شیروں نے انہیں دیکھا تو سر جھکا کر کھڑے ہو گئے۔ انہوں نے دونوں کے کان پکڑ کر سرزنش کی اور فرمایا اے خدا کے کتو! میں نے تم سے نہیں کہا ہے کہ میرے مہمانوں کو پریشان نہ کیا کرو اور میری طرف مخاطب ہو کر فرمایا اے ابوالحسن! تم لوگوں کی ظاہری درستگی کے درپے ہو اور حال یہ ہے کہ تم مخلوق خدا سے ڈرتے ہو اور میں حق تعالیٰ سے ڈرتا ہوں اور باطن کی درستگی کے درپے ہوں۔ مخلوق خدا ہم سے ڈرتی ہے۔

(۱۳) ایک دن میرے مرشد برحق رحمۃ اللہ علیہ نے بیت الجن سے دمشق جانے کا ارادہ فرمایا۔ بارش ہو رہی تھی مجھے کیچڑ میں چلنے سے دشواری ہو رہی تھی مگر جب میں نے اپنے مرشد کی طرف دیکھا تو ان کے کپڑے اور جوتیاں خشک تھیں میں نے ان سے عرض کیا تو فرمایا ہاں! جب سے میں نے توکل کی راہ میں اپنے قصد اور ارادہ کو ختم کر کے باطن کو لالچ کی وحشت سے محفوظ کرلیا ہے اس وقت سے اللہ تعالیٰ نے مجھے کیچڑ سے بچالیا ہے۔

(۱۴) حضور سیدنا داتا گنج بخش رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ مجھے ایک واقعہ ایسا پیش آیا کہ اس کا حل میرے لئے دشوار ہو گیا۔ میں حضرت شیخ ابوالقاسم گرگانی کی زیارت کرنے طوس پہنچا میں نے ان کو اپنے مکان کی مسجد میں تنہا پایا۔ انہوں نے بعینہٖ میری مشکل کو مسجد کے ستون کو مخاطب کر کے بیان کرنا شروع کر دیا۔ میں نے عرض کیا اے شیخ! یہ بات آپ کس سے فرما رہے ہیں۔ انہوں نے فرمایا اے فرزند! حق

تعالیٰ نے اسی وقت اس ستون کو مجھ سے بات کرنے کا حکم دیا اور اس نے مجھ سے یہ سوال کیا اور میں نے اس کو یہ جواب دیا (اس طرح میرے باطن کی عقدہ کشائی بغیر عرض کیے انہوں نے فرمادی)

(۱۵) فرغانہ میں ایک گاؤں سلاٰنگ نامی ہے، وہاں ایک بزرگ زمین کے اوتاد میں سے تھے جنہیں لوگ باب عمر کہتے تھے چونکہ اس شہر کے تمام مشائخ سب سے بڑے بزرگ کو باب کہا کرتے تھے۔ ان کے یہاں فاطمہ نام کی ایک بوڑھی عورت تھی میں نے ان کی زیارت کا ارادہ کیا۔ جب ان کے روبرو پہنچا تو انہوں نے پوچھا کس لئے آئے ہو؟ میں نے عرض کیا آپ کی زیارت کے لئے حاضر ہوا ہوں۔ شیخ نے شفقت و مہربانی سے میری طرف دیکھا اور فرمایا اے فرزند! میں فلاں روز سے برابر تمہیں دیکھ رہا ہوں اور جب تک تم مجھ سے روپوش نہ ہو جاؤ گے میں تم کو برابر دیکھتا رہوں گا جب میں نے ان کے بتائے ہوئے دن پر غور کیا تو وہی دن اور سال تھا جو میری توبہ اور بیعت کا ابتدائی دن تھا۔ پھر فرمایا اے فرزند! مسافت طے کرنا بچوں کا کام ہے لہٰذا اس ملاقات کے بعد ہمت کرو کہ حضورِ قلب حاصل ہو اس سے بڑھ کر کوئی چیز نہیں ہے اس کے بعد فرمایا اے فاطمہ! جو ہو لے آؤ تاکہ اس درویش کی کچھ خاطر کی جا سکے وہ ایک طباق میں تازہ انگور لائی حالانکہ وہ موسم انگوروں کا نہ تھا۔ اس طباق میں کچھ تازہ کھجوریں بھی تھیں حالانکہ فرغانہ میں کھجوریں ہوتی ہی نہ تھیں۔

(۱۶) مہنہ میں ایک دن حضرت شیخ ابوسعید رحمہ اللہ کے مزار پر حسب عادت تنہا بیٹھا تھا ایک سفید کبوتر دکھائی دیا جو قبر کے اوپر پڑی ہوئی چادر کے نیچے چلا گیا میں نے خیال کیا غالباً یہ کبوتر کسی کا چھوڑا ہوا ہے۔ میں اٹھا اور چادر اٹھا کر دیکھا مگر وہاں کچھ نہ تھا دوسرے اور تیسرے دن بھی میں نے ایسا ہی دیکھا۔ میں حیرت و تعجب میں پڑ گیا یہاں تک کہ ایک رات میں نے انہیں خواب میں دیکھا اور اس واقعہ کی بابت ان سے دریافت کیا۔ انہوں نے فرمایا وہ کبوتر میرے معاملہ کی صفائی ہے جو روزانہ قبر

میں میری ہم نشینی کے لئے آتا ہے۔

(۱۷) حضرت ابوبکر وراق رحمتہ اللہ علیہ بیان کرتے ہیں کہ ایک دن حضرت محمد بن علی حکیم ترمذی رحمتہ اللہ علیہ نے اپنی تصنیف کے کچھ اوراق مجھے دیئے کہ میں اسے دریائے جیحون میں ڈال دوں۔ جب باہر آ کر میں نے دیکھا تو وہ لطائف و نکات سے پر تھے۔ میرے دل نے کسی طرح قبول نہ کیا کہ دریا میں یونہی ضائع کر دوں۔ انہیں اپنے گھر رکھ کر واپس آ گیا اور کہہ دیا کہ میں نے دریا برد کر دئے۔ انہوں نے پوچھا تم نے کیا ماجرا دیکھا؟ میں نے عرض کیا میں نے تو کچھ بھی نہیں دیکھا۔ فرمایا تم نے دریا میں نہیں ڈالے۔ جاؤ انہیں دریا میں ڈال کر آؤ۔ حضرت ابوبکر وراق رحمتہ اللہ علیہ بیان کرتے ہیں کہ اس وقت میرے لئے دو مشکلیں تھیں ایک یہ کہ پانی میں ڈالنے کا کیوں حکم دیا جا رہا ہے دوسرے یہ کہ وہ کیا خاص بات ظاہر ہوگی جس کی بابت مجھ سے پوچھا جا رہا ہے؟ ناچار میں اٹھا اور دردِ دل کے ساتھ ان اوراق کو جیحون کے کنارے لا کر خود انہیں اپنے ہاتھ سے پانی میں ڈال دیا۔ پھر میں نے دیکھا کہ پانی کی سطح پھٹی اور ایک صندوق برآمد ہوا جس کا ڈھکنا کھلا ہوا تھا یہ اوراق اس صندوق میں جا گرے اور اس کا ڈھکنا بند ہو کر پانی کے تہہ میں روپوش ہو گیا۔ واپس آ کر تمام سرگزشت بیان کر دیں۔ انہوں نے فرمایا ہاں اب تم نے ڈالا ہے۔ میں نے عرض کیا یا شیخ! آپ کو عزتِ ذوالجلال کی قسم! یہ کیا اَسرار ہیں؟ مجھ پر واضح فرمایئے؟ انہوں نے فرمایا اے فرزند! میں نے علم مشائخ پر یہ کتاب لکھی تھی چونکہ ان کی تحقیق معقولات کے لئے دشوار تھی میرے بھائی حضرت خضر علیہ السلام نے مجھ سے مانگا تھا وہ آہنی صندوق ان کے حکم سے آیا تھا اور اللہ تعالیٰ نے پانی کو حکم دیا کہ وہ ان تک پہنچا دے۔

اس طرح کی حکایات و کرامات اس قدر ہیں کہ وہ ختم ہی نہیں ہو سکتیں چونکہ میرا مقصد اصولِ طریقت کا اثبات ہے اس لئے اس پر اکتفا کیا جاتا ہے اب میں مذاہب کے بارے میں

چند اہم عنوان شامل کتاب کرتا ہوں تا کہ حصولِ معنی کے لئے کسی اور جگہ نہ جانا پڑے۔ انشاء اللہ تعالیٰ۔

اولیاء پر انبیاء کی فضیلت

واضح رہنا چاہئے کہ تمام احوال و واقعات میں باتفاق تمام مشائخ طریقت، اولیاء کرام انبیاء کے متبع اور ان کے دعووں کی تصدیق کرنے والے ہیں اور انبیاء علیہم السلام، اولیاء سے افضل ہیں اس لئے کہ جہاں ولایت کی انتہا ہے وہاں سے نبوت کی ابتداء ہے۔ تمام انبیاء لازماً اولیا ہیں لیکن اولیاء میں سے کوئی نبی نہیں اور انبیاء علیہم السلام صفاتِ بشریت کی نفی میں متمکن و برقرار ہیں۔ اور اولیاء اس میں عارضی ہیں اس لئے کہ اولیاء پر جو خاص کیفیت طاری ہوتی ہے وہ انبیاء کا دائمی مقام ہے اور اولیاء کا جو مقام ہوتا ہے وہ انبیاء کے لئے حجاب ہوتا ہے۔

علمائے اہل سنت اور محققین اہل طریقت کا اس معنی میں کوئی اختلاف نہیں البتہ خراسان کے فرقہ حشویہ نے اختلاف کیا ہے جو سراپا عیب مجسم ہیں انہوں نے اصل توحید میں متناقض اور متخالف باتیں کہی ہیں حالانکہ انہیں طریقت کی ہوا تک نہیں لگی ہے۔ بایں جہالت وہ ولایت کا دعویٰ کرتے ہیں۔ ٹھیک ہے وہ ولی ضرور ہیں لیکن وہ شیطان کے ولی ہیں رحمٰن کے نہیں۔

حشوی ٹولہ کہتا ہے کہ اولیاء انبیاء سے افضل ہیں (معاذ اللہ) ان کی گمراہی کے لئے یہی قول کافی ہے کہ وہ ایک جاہل کو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے افضل کہتے ہیں۔ ایک گروہ اور ہے جن کو مشبہ کہتے ہیں وہ بھی طریقت کا دعویٰ کرتے ہیں اور اللہ تعالیٰ کے لئے نزول و حلول بمعنی ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل ہونے کو جائز جانتے ہیں اور اللہ تعالیٰ کے لئے تجزی یعنی اعضاء و جوارح کو جائز جانتے ہیں۔ طریقت میں یہی دو مذہب مذموم و مردود ہیں۔ میں حسب وعدہ آخر کتاب میں ان دونوں فرقوں کا مکمل تذکرہ انشاء اللہ ضرور کروں گا خلاصہ یہ کہ یہی دو گروہ مدعی اسلام ایسے ہیں جو انبیاء کرام علیہم السلام کی تخصیص کی نفی میں برہمنوں کے ہم نوا ہیں اور جو بھی انبیاء کی

تخصیص کے انکار پر اعتقاد رکھے گا وہ کافر ہے چونکہ انبیاء علیہم السلام حق تعالیٰ کی طرف بلانے والے اور امام مطلق ہیں اور اولیاء کرام حسن اعتقاد کے ساتھ انبیاء کے متبع اور پیروکار ہیں۔ یہ محال ہے کہ مقتدی و ماموم اپنے امام و رہنما سے افضل ہو۔ مختصراً یوں سمجھنا چاہئے کہ تمام اولیاء کے اقوال و انفاس اور ان کے معاملات کو صدق نبی کے پہلو میں رکھا جائے تو وہ تمام احوال و انفاس پریشان اور معدوم نظر آئیں گے اس لئے کہ اولیاء راہ حق کے طالب و سالک ہیں اور انبیاء بارگاہِ الٰہی کے واصل اور مقصود کو حاصل کئے ہوئے ہیں جو حکم دعوت و تبلیغ کے تحت رجوع ہو کر دعوت و تبلیغ فرماتے ہیں۔

ملحدوں کے اعتراضوں کے جوابات:

اگر کوئی مذکورہ ملحدوں میں سے (اللہ تعالیٰ ان پر لعنت کرے) یہ کہے کہ یہ قاعدہ ہے کہ جب کسی ملک کا قاصد دوسرے ملک میں آتا ہے تو وہ مبعوث الیہ یعنی جس کی طرف وہ بھیجا گیا ہو وہ ملک اس قاصد سے افضل ہوتا ہے۔ جس طرح انبیاء علیہم السلام حضرت جبریل سے افضل ہیں۔ (حالانکہ ان کی پیدا کردہ یہ صورت غلط ہے) میں جواب میں کہتا ہوں اگر کسی ملک سے ایک شخص کی طرف قاصد آئے تو جس کی طرف وہ بھیجا گیا ہے قاصد سے افضل ہوگا جیسے جبریل علیہ السلام ایک ایک رسول و نبی کے پاس آتے رہے تو وہ سب نبی و رسول جبریل علیہ السلام سے افضل ہیں لیکن جب قاصد و رسول کی ایک جماعت کو اور کسی قوم کی طرف بھیجا جائے تو وہ قاصد و رسول یقیناً اس قوم و جماعت سے افضل ہوگا جس طرح ہر نبی اپنی اپنی امت کی طرف مبعوث ہوا اور اس میں کسی ذی فہم کو حکم احادیث کے تحت اشتباہ نہیں ہو سکتا لہٰذا انبیاء علیہم السلام کا ایک ایک سانس، اولیاء کی پوری زندگی سے افضل ہے اس لئے کہ اولیاء جب اپنی عادت و عرف کے مطابق انتہا کو پہنچتے ہیں تب وہ مشاہدے کی خبر دیتے ہیں اور حجابِ بشریت سے خلاصی پاتے ہیں خواہ وہ کتنے ہی عین بشر کیوں نہ ہوں؟ لیکن نبی و رسول کا پہلا قدم ہی مشاہدے میں ہوتا ہے جب نبی و رسول کی ابتداء ولی کی انتہا ہوتی ہے تو ان کے ساتھ انہیں قیاس بھی نہیں کیا جا سکتا ہے۔ کیا تم نہیں دیکھتے کہ تمام طالبانِ حق، اولیاء کا اتفاق ہے کہ تفرقہ سے نکل کر مقام جمع میں ہونا کمالِ ولایت کی معراج ہے۔

تفرقہ وجمع کی صورت:

اس کی صورت یہ ہے کہ جب بندہ غلبہ محبت میں کسی منزل پر فائز ہوتا ہے تو اس کی عقل فعل پر نظر کرنے سے عاجز ہو جاتی ہے اور شوقِ محبت میں فاعل حقیقی کا فعل ہی سارے جہان میں نظر آتا ہے اس سلسلہ میں حضرت ابوعلی رودباری رحمتہ اللہ علیہ کا ارشاد ہے کہ:

لو زالت عنا رویته ماعبدناه اگر اس کا دیدار ہم سے جدا ہو جائے تو ہم سے بندگی کا نام جاتا رہے۔

اس لئے کہ عبادت کا شرف اس کے دیدار کے بغیر حاصل نہیں ہو سکتا۔ انبیاء کے لئے یہ معنی ان کے حال کی ابتداء ہے کیونکہ انبیاء کی تمام زندگی میں تفرقہ کی صورت پیدا ہی نہیں ہوتی اور ان کی نفی و اثبات، مسلک و مقطع، اقبال و اعراض اور ہدایۃ و نہایۃ سب کے سب عین ہیں چنانچہ حضرت ابراہیم خلیل اللہ علیہ السلام کا ابتدائی حال یہ ہے کہ جب آفتاب کو دیکھا تو فرمایا "هٰذَا رَبِّیْ" اور چاند ستاروں کو دیکھا تو فرمایا "هٰذا ربی" اس کی وجہ یہ کہ آپ کے دل پر حق کا غلبہ تھا اور عین جمع میں اپنے اجتماع کے اندر غیر نظر آیا ہی نہیں اگر نظر ڈالی بھی تو دیدۂ جمع کی نظر ڈالی اور اپنی رویت سے بیزاری کے اظہار میں فرمایا:

لَآ اُحِبُّ الْاٰفِلِیْنَ (الانعام:٧٦) یعنی میں روپوش ہونے والے کو پسند نہیں کرتا۔

گویا آپ کی ابتداء میں بھی جمع ہے اور انتہا میں بھی جمع۔ بلاشک وشبہ یہی ولایت کی ابتداء وانتہا ہے اور نبوت کی تو کوئی انتہا ہی نہیں ہے یہاں تک کہ ان کی ابتداء بھی نبوت سے ہے اور انتہا بھی نبوت پر اور اس سے قبل جبکہ مخلوق موجود نہ تھی اس وقت بھی حق تعالیٰ کی مراد وہی تھے۔

حضرت بایزید بسطامی رحمتہ اللہ علیہ سے لوگوں نے پوچھا انبیاء علیہم السلام کے احوال کی بابت کچھ فرمایئے؟ انہوں نے فرمایا افسوس کہ ہمیں ان کے بارے میں کوئی اختیار نہیں جو کچھ بھی ان کے بارے میں ہم کہیں گے وہ سب ہم ہی ہم ہوں گے اللہ تعالیٰ نے انبیاء علیہم

السلام کے نفی و اثبات کو اس درجہ میں رکھا ہے کہ وہاں تک مخلوق کی نظر نہیں پہنچ سکتی جس طرح اولیاء کے مرتبہ کے ادراک سے عام لوگ عاجز ہیں کیونکہ ان کا ادراک نہاں ہے اسی طرح اولیاء بھی انبیاء کے مرتبہ کے ادراک سے عاجز ہیں کیونکہ ان کا ادراک ان سے پوشیدہ ہے۔

حضرت بایزید بسطامی رحمۃ اللہ علیہ اپنے زمانہ کے مسلمہ صاحب حجت تھے وہ فرماتے ہیں کہ:

اول ماسرت الی الوحدانیته فصرت طیرًا جسمهٗ من الاحدیته وجناحه مِن الدیمومیته فلم ازل اطیر فی هواء الهویته حتی الی هواء التنزیهه ثم اشرفت علی میدان الازلیته ورأیته شجر الاحدیته فنظرت فعلمته ان هٰذا کله غیره

یعنی میں نے دیکھا کہ سب سے پہلے میرا باطن آسمانوں پر لے جایا گیا (میں نے کسی چیز کی طرف نگاہ نہ ڈالی جنت ودوزخ دکھائے گئے اس کی طرف بھی نگاہ نہ کی موجودات اور حجابات سے گزارا گیا ان کی طرف بھی التفات نہ کیا) "فصرت طیراً" اس وقت میں ایک پرندہ بن گیا جس کا جسم، احدیت کا، اور اس کے بال و پر دیمومیت کے تھے میں ذاتِ حق کی محبت میں مسلسل پرواز کرتا رہا یہاں تک کہ میں مقام تنزیہہ سے گزرا اور ازلیت کے میدان سے مشرف ہوا وہاں میں نے احدیت کے درخت دیکھے پھر جب میں نے نگاہ ڈالی تو وہ سب کچھ میں ہی میں تھا۔

اس وقت میں نے مناجات کی کہ اے خدا، میری خودی کو تیرا راستہ ہی نہیں ملتا اور مجھے اپنی خودی سے نکلنے کی کوئی راہ نظر نہیں آتی میری رہنمائی فرما اب مجھے کیا کرنا چاہیے؟ فرمانِ حق آیا کہ اے بایزید! تمہاری اپنی خودی سے نجات، ہمارے دوست (یعنی محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم) کی

متابعت سے وابستہ ہے ان کے قدم مبارک کے نیچے کی خاک کو اپنی آنکھوں کا سرمہ بناؤ اور ان کی پیروی میں ہمیشہ مصروف رہو۔ یہ حکایت بہت طویل ہے اہل طریقت اس کو حضرت بایزید رحمتہ اللہ علیہ کی معراج کہتے ہیں معراج سے ان کی مراد قرب حق ہے۔

انبیاء کی معراج از روائے اظہار، ان کی ذات و جسم کے ساتھ ہے اور اولیاء کی معراج از روئے ہمت و اَسرار ہے۔ انبیاء کے اجسام صفاء و پاکیزگی اور قرب سے متصف ہیں۔ جس طرح اولیاء کے دل ان کے اَسرار کا مسکن، اور یہ فضیلت ظاہر ہے اس کی صورت یہ ہے کہ ولی کو اپنے حال میں مغلوب کر کے مدہوش کر دیا جاتا ہے پھر اس کے باطنی درجات کو اس سے غائب کر کے قربِ حق سے سرفراز کر دیا جاتا ہے جب ان کی واپسی حالت صحو کی طرف ہوتی ہے تو وہ تمام دلائل ان کے دل میں نقش زن ہوتے ہیں اور ان کا علم اسے حاصل کرتا ہے لہٰذا وہ ہستی جس کے جسم کو قربِ حق میں لے جایا جائے یعنی نبی کو، اور وہ شخص جس کے فکر و باطن کو قرب میں لے جایا جائے یعنی ولی کو۔ ان دونوں کے درمیان بڑا فرق ہے۔ واللہ اعلم بالصواب۔

فرشتوں پر انبیاء و اولیاء کی فضیلت

واضح رہنا چاہئے کہ اہل سنت اور جمہور مشائخ طریقت کا اس پر اتفاق ہے کہ انبیاء علیہم السلام اور وہ اولیاء جو محفوظ ہیں فرشتوں سے افضل ہیں۔ اس مسئلہ میں معتزلہ کا اختلاف ہے۔ وہ فرشتوں کو انبیاء سے افضل کہتے ہیں۔ ان کا مذہب ہے کہ فرشتوں کا مرتبہ بلند، ان کی خِلقت لطیف تر اور وہ اللہ تعالیٰ کے سب سے بڑے فرمانبردار ہیں اسی لیے بہتر ہے کہ انہیں افضل کہا جائے۔ ہم جواب میں کہتے ہیں کہ حقیقت تمہارے اس گمان کے خلاف ہے اس لیے کہ بدنی اطاعت بلند مرتبت اور لطیف خِلقت فضل الٰہی کے لیے علت نہیں ہے فضیلت وہاں ہوتی ہے جہاں حق تعالیٰ رکھے جو کچھ تم فرشتوں کے لیے کہتے ہو وہ سب ابلیس کو بھی حاصل تھا لیکن باتفاق وہ ملعون ورسوا ہوا لہٰذا فضیلت اسی کو ہے جسے حق تعالیٰ دے کر خلق پر برتری عطا فرمائے۔

انبیاء علیہم السلام کی افضلیت کا بڑا ثبوت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے فرشتوں کو حکم دیا کہ آدم علیہ السلام کو سجدہ کریں۔ یہ قاعدہ مسلّم ہے کہ جسے سجدہ کیا جائے اس کا حال سجدہ کرنے والے کے حال سے بلند ہوتا ہے اگر کوئی یہ کہے کہ خانہ کعبہ جو پتھر اور بے حس و حرکت جماد ہے مسلمان اس سے افضل ہو کر اس کی طرف سجدہ کرتے ہیں لہٰذا جائز ہے کہ فرشتے حضرت آدم علیہ السلام سے افضل ہوں اگر وہ انہیں سجدہ کریں اس کا جواب ہم یہ دیں گے کہ کوئی شخص یہ نہیں کہتا کہ مسلمان خانہ کعبہ یا مسجد کے محراب و دیوار کو سجدہ کرتا ہے سب یہی کہتے ہیں کہ خدا کا سجدہ کرتے ہیں اور ہمارا یہ کہنا ہے کہ فرشتوں نے آدم علیہ السلام کو سجدہ کیا تھا اس کا مطلب یہ ہے کہ انہوں نے خدا کے حکم کی تعمیل میں سجدہ کیا تھا چنانچہ حق تعالیٰ نے حکم دیا کہ "اسْجُدُوْا لِاٰدَمَ" (طٰہٰ: ۱۱۶) یعنی ہم فرشتوں کو حکم دیتے ہیں کہ وہ آدم کو سجدہ کریں اور جب مسلمانوں کو سجدہ کا حکم دیا گیا تو اس طرح فرمایا کہ:

وَاسْجُدُوْا وَاعْبُدُوْا رَبَّکُمْ وَافْعَلُوْا الْخَیْرَ (الحج: ۷۷) اپنے رب کو سجدہ کرو اور اس کی بندگی بجا لاؤ اور نیک کام کرو۔

لہٰذا خانہ کعبہ آدم علیہ السلام کی مانند نہیں ہے کیونکہ مسافر جب عبادت کرنا چاہتا ہے تو سواری کی پشت پر خدا کی نفلی عبادت کرتا ہے اگر سواری کا رخ خانہ کعبہ کی طرف نہ ہو تو معذور مقصود ہوتا ہے۔ اسی طرح وہ شخص جس پر سمت قبلہ ظاہر نہ ہو اور جنگل میں کوئی بتانے والا بھی نہ ہو تو وہ تحری کر کے جدھر دل متوجہ ہو کر رخ کر لے نماز ادا کر سکتا ہے فرشتوں کو حضرت آدم علیہ السلام کو سجدہ کرنے میں عذر نہ ہوا اور جس نے اپنے لیے خود عذر گھڑا وہ ملعون و رسوا ہوا۔ اہلِ بصیرت کے لیے یہ دلائل واضح کافی ہیں۔

نیز یہ بھی واضح رہنا چاہیے کہ فرشتے اگرچہ معرفتِ الٰہی میں انبیاء کے برابر ہیں لیکن اس سے ان کے درجوں میں برابری کسی طرح ضروری نہیں کیونکہ فرشتوں کی خِلقت میں نہ شہوت ہے نہ دل میں حرص و آز اور نہ طبع میں ذوق و حیلہ ہے۔ ان کی غذا طاعت، ان کا پینا فرمانِ الٰہی پر اقامت ہے۔ پھر یہ کہ آدمی کی سرشت شہوت سے مرکب ہے اس سے معاصی کا ارتکاب ممکن ہے اور دنیا کی زیب و زینت اس کے دل پر اثر انداز ہو سکتی ہے اس کی طبیعت میں

حرص وحیلہ موجیں مارسکتا ہےاور شیطان کواس کی ذات پر اتنا غلبہ حاصل ہے کہ وہ لوگوں میں خون کے ساتھ گردش کرتا ہےاور وہ اس نفس کے ساتھ چمٹا ہوا ہے جوتمام برائیوں اور آفتوں کا سرچشمہ ہے۔جس کے وجود میں یہ تمام باتیں شامل ہوں پھر وہ غلبہ شہوت کے امکان کے ساتھ فسق وفجور سے اجتناب کرے۔سراپا حریص ہوکر دنیا سے منہ موڑ لےاور یا شیطانی وسوسے باقی رہتے ہوئے معاصی سے رجوع وتوبہ کرےاور نفسانی خواہش سے روگردانی کر کے بندگی پر قائم اور طاعت پر مستحکم ہوکر مجاہدہ نفس اور مجادلہ شیطانی میں مشغول ہو درحقیقت وہ فرشتوں سے افضل ہے کیونکہ فرشتوں کی خِلقت میں نہ تو شہوت سے معرکہ آرائی ہےاور نہ ان کی طبیعت میں غذاوَلذت کی خواہش نہ بیوی بچوں کا غم نہ خویش واقرباء کی مشغولیت، نہ سبب ووسیلہ کے محتاج، نہ امید وآفت کا استغراق ہے۔ان میں سے مجھے اس شخص پر تعجب ہوتا ہے جوافعال وکردار میں فضل کودیکھتا ہے یا خوبی وجمال میں عزت کودیکھتا ہے یاعزت ومال میں بزرگی کوتلاش کرتا ہے وہ جلد ہی اس نعمت وبزرگی کواپنے سے زائل دیکھے گا۔وہ مالک الاعیان حق تعالیٰ کے افضال کو کیوں نہیں دیکھتا۔رضائے الٰہی میں عزت اور معرفت وایمان میں بزرگی کو کیوں نہیں دیکھتا تا کہ اس نعمت کو ہمیشہ موجود پائے اور اپنے دل کو دونوں جہان میں خوش اور شادماں دیکھے۔ جبریل علیہ السلام نے ہزار ہا سال خلعت کے انتظار میں خدا کی بندگی کی لیکن انکی خلعت حضور سید عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت گزاری میں تھی یہاں تک کہ شب معراج حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی سواری کی خدمت کی۔وہ کس طرح حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے افضل ہوسکتے ہیں؟

جن بندگانِ خدا نے دنیا میں نفس کو مارنے میں ریاضتیں کیں۔رات دن مجاہدے کئے، حق تعالیٰ نے ان کے ساتھ مہربانی فرمائی اور اپنے دیدار سے سرفراز کر کے تمام خطرات سے محفوظ رکھا۔

جب فرشتوں کی نخوت حد سے بڑھ گئی اور ہر ایک نے اپنے معاملہ کی صفائی کو دلیل بنا کر بنی آدم کے بارے میں زبانِ ملامت دراز کی تو حق تعالیٰ نے چاہا کہ ان کا حال ان پر ظاہر فرمائے چنانچہ فرمایا اے فرشتو! اپنے میں سے تین ایسے بزرگ افراد کو منتخب کرلو جن پر تمہیں

اعتماد ہو وہ زمین پر جا کر زمین کے خلیفہ ہو جائیں اور مخلوقِ خدا کو راہِ راست پر لائیں اور بنی آدم میں عدل و انصاف قائم کریں۔ فرشتوں نے تین فرشتے چن لیے ان میں سے ایک تو زمین پر آنے سے پہلے ہی زمین کی آفتوں کو دیکھ کر پناہ مانگ گیا چنانچہ اللہ تعالیٰ نے اس فرشتہ کو روک لیا اور باقی دو فرشتے زمین پر آئے۔ اللہ تعالیٰ نے ان دونوں کی سرشت اور خِلقت کو بدل دیا تا کہ کھانے پینے کے خواہشمند ہو کر شہوت کی طرف مائل ہوں۔ یہاں تک کہ اس پر انہیں مستوجب سزا بنایا۔ اس طرح فرشتوں نے بنی آدم کی فضیلت کا اندازہ کر لیا۔

خلاصہ کلام یہ کہ خواصِ مومن، خواصِ ملائکہ سے افضل اور عوام مومن، عام فرشتوں سے افضل ہیں لہٰذا وہ جو معصوم و محفوظ نہیں وہ حفظہ اور کراماً کاتبین سے افضل ہیں۔ واللہ اعلم بالصواب۔

اس معنی میں بکثرت اقوال ہیں ہر شیخ نے اس سلسلہ میں کچھ نہ کچھ فرمایا ہے۔ اللہ تعالیٰ جسے چاہتا ہے بزرگی سے سرفراز فرماتا ہے۔ وباللہ التوفیق۔

تصوف میں حکیمیوں کے مذہب کے متعلقات اور صوفیاء کے باہمی اختلافات یہ ہیں جن کو بطور اختصار ہم نے بیان کر دیا۔

درحقیقت ولایت اَسرارِ الٰہی میں سے ایک سِرّ ہے جو ریاضت و مجاہدہ اور تربیت شیخ کے بغیر ظاہر نہیں ہوتا اور ولی کو ولی ہی پہچانتا ہے اگر اس حقیقت کا اظہار ہر صاحب عقل پر جائز ہوتا تو دوست و دشمن کی تمیز نہ رہتی اور واصل بحق، غافل سے ممتاز نہ ہوتا۔ لہٰذا مشیت الٰہی یہی ہے کہ دوستی و محبت کے جوہر کو ذلت و خواری کی سیپ یعنی صدف میں لوگوں سے محفوظ رکھا جائے اور اسے بلاؤں کے دریا میں چھپایا جائے تا کہ اس کا طالب اپنی جانِ عزیز کو اس کے فرمان کے تحت خطرے میں ڈالے اس جان لیوا دریا میں گزارہ کرے اور دریا کی گہرائی میں غوطہ زن ہو کر اپنی مراد کو حاصل کرے یا اسی طلب میں دنیا سے کوچ کر جائے۔ واللہ اعلم۔

(۸) فرقۂ خرازیہ

خرازی فرقہ کے پیشوا، حضرت ابو سعید خرازی رحمۃ اللہ علیہ ہیں۔ طریقت میں ان کی

تصانیف بکثرت ہیں اور تجرید وانقطاع میں ان کا مرتبہ عظیم ہے۔فنا وبقا کے حال پر سب سے پہلے انہوں ہی نے گفتگو فرمائی اور طریقت کے تمام رموز کو آپ نے ان ہی دو کلموں میں پوشیدہ کر دیا ہے۔

اب میں ان کے معنی بیان کر کے جنہوں نے اس میں غلطیاں کی ہیں ظاہر کرتا ہوں تا کہ ان کے مذہب کی معرفت کے ساتھ ان کے استعمال کا مقصد سمجھا جا سکے۔

بقا اور فنا

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

مَا عِنْدَكُمْ يَنْفَدُ وَمَا عِنْدَ اللّٰهِ بَاقٍ (النحل:۹۲)

جو تمہارے پاس ہے وہ فنا ہو جائے گا اور جو اللہ کے پاس ہے باقی رہنے والا ہے۔

ایک اور جگہ ارشاد ہے:

كُلُّ مَنْ عَلَيْهَا فَانٍ وَّيَبْقٰى وَجْهُ رَبِّكَ ذُو الْجَلَالِ وَالْاِكْرَامِ (الرحمٰن:۲۶،۲۷)

روئے زمین پر جو کچھ ہے وہ فانی ہے اور تمہارے رب کی عزت و جلال والی ذات باقی رہنے والی ہے۔

واضح رہنا چاہیے کہ علم زبان میں فنا و بقا کے معنی اور ہیں اور اصطلاحِ طریقت اور زبانِ حال میں اس کے معنی اور ہیں، علماء ظواہر جس قدر ان کے معنی میں حیران ہیں اتنے اور کسی معنی میں نہیں ہیں۔لہٰذا بقا کے معنی علم زبان اور اقتضائے لغت میں تین قسم کے ہیں، ایک یہ کہ بقا وہ ہے جس کا ابتدائی کنارہ بھی فنا ہو اور اس کا آخری کنارہ بھی فنا، مثلاً دنیا کہ یہ ابتداء میں بھی نہ تھی اور انتہا میں بھی نہ ہوگی اور موجودہ وقت باقی ہے اور دوسرے معنی یہ ہیں کہ بقا سرے سے موجود ہی نہ ہو اور جب موجود ہو جائے تو پھر وہ فنا ہی نہ ہو جیسے بہشت و دوزخ اور جہانِ آخرت اور اس کے رہنے والے ہیں۔تیسرے معنی یہ ہیں کہ بقا نہ آگے معدوم ہو اور نہ پہلے معدوم تھی یہ حق تعالیٰ کی ذات قدس اور اس کے صفات ہیں جو ہمیشہ سے ہے اور ہمیشہ اپنی قدیم صفات

کے ساتھ باقی رہے گا اور دائمی بقا سے مراد اس کا دائمی وجود ہے اور کوئی بھی کسی نوعیت سے اس کی ذات وصفات میں شریک وسہیم نہیں ہے۔

فنا کا علم یہ ہے کہ تم نے جان لیا ہے کہ دنیا فانی ہے اور بقا کا علم یہ ہے کہ تم نے جان لیا ہے کہ آخرت باقی ہے جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

وَالْاٰخِرَةُ خَیْرٌ وَّاَبْقٰی (الاعلیٰ:۱۷)

"آخرت بہتر اور باقی رہنے والی ہے۔"

اس آیت میں ابقیٰ کا کلمہ مبالغہ کے لیے ہے کیونکہ آخرت کی عمر کے لیے اس جہان میں فنا نہیں ہے لیکن طریقت کے اصطلاح میں بقائے حال اور فنائے حال سے مراد یہ ہے کہ جہالت کے لیے یقیناً فنا ہے اور علم باقی رہنے والا ہے۔ چنانچہ معصیت فانی ہے اور طاعت باقی بندہ جب اپنی طاعت کا علم حاصل کر لیتا ہے تو غفلت وجہالت معدوم ہو کر بقا کے ذکر میں باقی ہو جاتی ہے۔ مطلب یہ کہ بندہ جب حق تعالیٰ کو پہچان جاتا ہے تو وہ اس کے علم کے ساتھ باقی ہو جاتا ہے اور اس سے جہل فنا ہو جاتا ہے اور جب سے فنا ہوتا ہے تو وہ غفلت کے ذکر میں باقی ہوتا ہے۔ یہ بیان مذموم قبیح اوصاف کے دور کرنے اور محمود و پسندیدہ اوصاف کے قائم کرنے میں ہے لیکن خواصِ اہل طریقت کے نزدیک یہ مراد نہیں ہے، ان کے اشارات، اصل طریقت میں علم وحال سے متعلق نہیں ہیں وہ فنا و بقا کا استعمال ولایت کے درجہ کمال کے سوا نہیں کرتے۔

خواصِ اہل طریقت کے نزدیک فنا و بقا سے متصف وہ حضرات ہیں جو مجاہدے کی مشقت سے آزاد ہیں اور مقامات کی قید سے اور احوال کے تغیر سے نجات پا کر حصولِ مقصود میں فائز المرام ہو چکے ہیں ان کے دیکھنے کی تمام صلاحیتیں حق تعالیٰ کے دیدار کے ساتھ وابستہ ہیں ان کے سننے کی تمام قوتیں کلام الٰہی کی سماعت کے ساتھ پیوست ہیں اور اور دل سے جاننے کی تمام استعداد، اَسرارِ الٰہی کے حصول میں منہمک ہو چکی ہے یہ صاحبانِ ولایت اپنے اسرار کے حصول میں خود بینی کی آفت کو دیکھ چکے ہیں وہ سب سے کنارہ کش ہو کر مراد میں ہیں ان کے

ارادے فنا ہو چکے ہیں۔ وہ واصل بحق ہو کر ہر دعوے سے بے زار اور ہر لحاظ سے منقطع، کرامتوں سے مجوب مقامات کو دیکھنے والے ہوتے ہیں اور عین مراد میں آفتوں کا لباس پہننے سے بے مراد ہوتے ہیں اور ہر مشرب سے جدا ہو کر ہر مانوس شئے کی انسیت سے علیحدہ ہوتے ہیں۔

''لیھلك من ھلك بینتہٖ ویحییٰ من حیّ عن بینتہ '' تا کہ ہلاک ہوں تو مشاہدے میں ہلاک ہوں اور زندہ رہیں تو مشاہدے میں زندہ رہیں۔ اسی معنی میں مَیں کہتا ہوں کہ:

فنیت فنائی بفقد ھوائی

فصار ھوائی فی الامور ھوالك

فاذا فنی العبد عن اوصافہ

ادرك البقاء بتمامہ

یعنی میں نے فنا کو اپنی خواہش ناپید کر کے فنا کیا ہے

ہر امر میں میری خواہش صرف تیری محبت ہے

بندہ جب اپنے صفات بشری کو کریدتا ہے تو

وہ بقا کے تمام معانی جان لیتا ہے

مطلب یہ ہے کہ بندہ وجود اوصاف کی حالت میں جب وصف کی آفتوں سے فانی ہو جاتا ہے تب مراد کی فنا میں مراد کی بقا کے ساتھ باقی ہو جاتا ہے حتیٰ کہ قرب و بعد بھی نہیں رہتا نہ وحشت وانس رہتا ہے نہ صحو وسکر نہ فراق وصال رہتا ہے نہ مایوسی وخلع نہ اسماء واعلام رہتے ہیں نہ نقوش ورسوم اسی معنی میں ایک بزرگ فرماتے ہیں:

وطاح مقامی والرسوم کلاھما

فلست ارٰی فی الوقت قربا ولا بعدا

فنیت بہ عنی فبان لی الھدٰی

فھٰذا ظھور الحق عند الفناء قصدا

میرا مقام اور رسوم دونوں فنا ہوگئے
اب نزدیکی اور دوری کچھ نہیں رہی
جب یہ مجھ سے فنا ہوگئے تب میرے لئے ہدایت کی راہ کھلی
اب راہ حق کا ظہور، بالقصد فنا کے بعد ہے

درحقیقت اشیاء کی فناء، ان کی آفتوں کو دیکھے بغیر اور ان کی خواہش کی نفی کے بغیر درست نہیں ہوسکتی۔ جسے یہ خیال ہے کہ اشیاء کی فنا، اس چیز کے حجاب میں ہونے کے بغیر درست نہیں وہ غلطی پر ہے۔ ایسا نہیں ہے کہ آدمی کسی چیز کو دوست رکھے اور کہے کہ میں اس کے ساتھ باقی ہوں یا یہ کہ وہ کسی چیز سے دشمنی رکھے اور یہ کہے کہ میں اس کے ساتھ فانی ہوں کیونکہ یہ دونوں صفتیں طالب کی ہیں۔ فنا میں محبت وعداوت نہیں ہے اور نہ بقا میں جمع وتفرقہ کی رویت۔ ایک گروہ کو اس معنی میں غلطی لاحق ہوئی ہے ان کا گمان ہے کہ ذات کے گم ہونے اور وجود کو ناپید کرنے کا نام فنا ہے اور بقا یہ ہے کہ بندے کے ساتھ حق کی بقا مل جائے یہ دونوں صورتیں محال ہیں۔

میں نے (غیر منقسم) ملک ہندوستان میں ایک شخص کو دیکھا جو تفسیر وتذکیر اور علم وفہم کا مدعی تھا۔ اس معنی میں اس نے مناظرہ کیا۔ جب میں نے اس سے گفتگو کی تو پتہ چلا کہ وہ نہ تو فنا کو جانتا ہے اور نہ بقا کو۔ قدم وحدوث کے فرق کو بھی نہیں جانتا۔ ایسے جاہل قسم کے لوگ بہت ہیں جو فنائے کلیت کو جائز جانتے ہیں حالانکہ یہ کھلی ہوئی ہٹ دھرمی اور مکابرہ ہے۔ کسی چیز کے اجزائے ترکیبی کی فنا اور اس سے ان اجزاء کا انفکاک قطعاً جائز ہی نہیں۔ میں ان جاہل، غلط کاروں سے پوچھتا ہوں کہ ایسی فنا سے تمہارا مدعا کیا ہے؟ اگر یہ کہو کہ ذات فنا مقصود ہے تو یہ محال ہے اور اگر یہ کہو کہ وصف کی فنا مراد ہے تو اسے ہم جائز رکھتے ہیں کیونکہ فنا ایک علیحدہ صفت اور بقا ایک علیحدہ صفت بندہ ان دونوں صفات سے متصف ہوگا اور یہ محال ہے کہ کوئی شخص اپنے سوا کسی دوسرے کی صفت سے قائم ہو۔

نسطوریوں کا مذہب جو رومی نصرانیوں کا ہے یہ ہے کہ حضرت مریم رضی اللہ عنہا

مجاہدے کے ذریعہ تمام ناسوتی صفات کو فنا کر کے لاہوتی بقا کے ساتھ قائم ہو گئیں اور انہوں نے ایسی بقا پائی ہے کہ معبود کی بقا کے ساتھ باقی ہو گئیں اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام اسی کا نتیجہ اور ثمرہ ہیں۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے عناصر ترکیبی کی بنیاد، انسانی عناصر نہیں کہ انسان کے ساتھ بقا پائیں ان کا تحقق بقائے الوہیت کے ساتھ ہوا ہے لہٰذا وہ اور ان کی والدہ مریم اور اللہ تعالیٰ ایک ہی بقا کے ساتھ باقی ہیں جو کہ قدیم ہے اور حق تعالیٰ کی صفت ہے (معاذ اللہ) یہ سب باتیں ان حشویوں کے قول کے موافق ہیں جو مجسمہ و مشبہ کے قائل ہیں اور حق تعالیٰ کو محل حوادث کہتے ہیں اور قدیم کے لئے صفت حدوث جائز مانتے ہیں۔ (معاذ اللہ)

میں ان سب کے جواب میں کہتا ہوں کہ کیا محدث، قدم کا محل ہوتا ہے؟ کیا قدیم کے لئے حدوث کی صفت ہو سکتی ہے؟ اور کیا حادث کے لئے قدیم صفت بن سکتی ہے؟ اس کا جائز رکھنا دہریوں کا مذہب ہے وہ حدوثِ عالم کی دلیل کو باطل کرتے ہیں اور اس سے مصنوع اور صانع دونوں کو قدیم کہنا چاہتے ہیں یا دونوں کو حادث یعنی مخلوق کا ترکب و امتزاج نامخلوق یعنی خدا کے ساتھ اور نامخلوق (خدا) کا حلول مخلوق کے ساتھ بنانا چاہتے ہیں۔ ایسی خرابی و بدنصیبی انہیں کو سزاوار ہو کیونکہ وہ قدیم کو محل حوادث یا حوادث کو محل قدیم کہتے ہیں لہٰذا مصنوع اور صانع دونوں کو قدیم ہی کہنا چاہئے اور جب دلیل سے ثابت ہے کہ مصنوع حادث ہے تو لامحالہ صانع کو بھی محدث ہی کہنا چاہئے کیونکہ کسی چیز کا محل اس چیز کے عین کی مانند ہوتا ہے جب محل حادث ہے تو چاہئے کہ حال بھی حادث ہو لہٰذا ان سب باتوں سے لازم آتا ہے کہ محدث کو قدیم کہیں یا قدیم کو محدث؟ حالانکہ یہ دونوں ضلالت و گمراہی ہیں۔

خلاصہ یہ کہ جو چیز کسی دوسرے کے ساتھ متصل و متحد اور ممتزج ہو ان دونوں کا حکم یکساں ہوتا ہے لہٰذا ہماری بقا ہماری صفت ہے اور ہماری فنا ہماری صفت، اور ہمارے اوصاف کی خصوصیت میں ہماری فنا ہماری بقا کی مانند اور ہماری بقا ہماری فنا کی مانند ہے اور ہماری فنا ایسی صفت ہے جو ہماری بقا کے ساتھ ایک اور صفت ہے۔

اس کے بعد اگر کوئی فنا سے یہ مراد لے کہ بقا کا اس سے کوئی تعلق نہیں تو یہ جائز ہے

اور اگر بقا سے یہ مراد لے کہ فنا کا اس سے کوئی تعلق نہیں تو یہ بھی جائز ہے کیونکہ اس کی مراد اس فنا سے غیر کے ذکر کی فنا ہے اور بقا سے حق تعالیٰ کے ذکر کی بقا ہے۔

من فنا من المراد بقی بالمراد	جو اپنی مراد سے فانی ہو گیا وہ مرادِ حق سے باقی ہو گیا۔

اس لئے کہ بندے کی مراد فانی ہے اور حق تعالیٰ کی مراد باقی ہے۔ جب تم اپنی مراد سے وابستہ ہو گئے تو تمہاری مراد فانی ہو گی اور فنا کے ساتھ اس کا قیام ہو گا پھر جب حق تعالیٰ کی مراد کے ساتھ متصف ہو گے تو حق کی مراد کے ساتھ باقی ہو گے اور بقا کے ساتھ باقی ہو گے۔ اس کی مثال ایسی ہے کہ جو چیز آگ کے غلبہ میں ہو گی اس کے غلبہ کی وجہ سے اس میں بھی وہی صفت پیدا ہو جائے گی جو آگ کی ہے تو جب آگ کا غلبہ اس چیز کی صفت کو دوسری صفت کے ساتھ بدل دیتا ہے تو حق تعالیٰ کے ارادہ کا غلبہ آگ کے غلبہ سے بدرجہ اولیٰ بہتر ہے لیکن آگ کا یہ تصرف لوہے کے وصف میں ہے نہ کہ لوہے کی ذات میں؟ کیونکہ لوہا ہرگز آگ نہیں بن جاتا۔ واللہ اعلم

فنا و بقا میں مشائخ کے رموز و لطائف:

فنا و بقا کی تعریف میں ہر بزرگ نے لطائف و رموز بیان کئے ہیں۔ چنانچہ صاحب مذہب حضرت ابو سعید خراز رحمتہ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ:

الفناء فناء العبد عن رویته العبودیته والبقاء بقاء العبد بمشاهدة الالٰهیته	فنا یہ ہے کہ بندہ اپنی بندگی کی دید سے فانی ہو اور بقا یہ ہے کہ بندہ مشاہدہ الٰہی سے باقی ہو۔

مطلب یہ ہے کہ افعالِ بندگی کی رویت میں آفت ہے اور بندگی کی حقیقت سے وہ اس وقت روشناس ہوتا ہے جبکہ وہ اپنے افعال کو نہ دیکھے اور ان افعال کو دیکھنے سے وہ فانی ہو اور فضل الٰہی کی دید سے باقی ہو۔ تا کہ اس کے معاملہ کی نسبت حق کے ساتھ وابستہ ہو نہ کہ اس کے ساتھ کیونکہ بندہ کے ساتھ جب تک ان افعال کا تعلق رہے گا اس وقت تک وہ ناقص رہے گا اور

جب حق تعالیٰ کے ساتھ اس کی نسبت ہو جائے گی تو وہ پورے طور پر کامل ہو جائے گا۔ لہٰذا جب بندہ اپنے متعلقات سے فانی ہو جاتا ہے تب کمالِ الٰہی سے باقی ہو جاتا ہے۔ حضرت یعقوب نہر جوری رحمتہ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ:

صحتہ العبودیتہ فی الفناء والبقاء — بندگی کی صحت و درستگی فنا و بقا میں ہے۔

کیونکہ جب تک بندہ اپنے ہر تعلق و نسبت سے بے زاری نہ کرے خلوص کے ساتھ خدمت الٰہی کے لائق نہیں بنتا۔ لہٰذا انسان کا اپنے تعلق سے بے زاری کرنا فنا ہے اور بندگی میں خلوص کا ہونا بقا ہے۔ حضرت ابراہیم شیبانی رحمتہ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ:

علم الفناء والبقاء یدور علی الاخلاص والوحدانیتہ وصحة العبودیتہ وما کان غیر ھٰذا فھوا المغالیط والزندقتہ — اخلاص، وحدانیت اور بندگی کی درستگی پر منحصر ہے اور جو اس کے ماسوا ہے وہ غلط اور بے دینی ہے۔

مطلب یہ کہ فنا و بقا کے علم کا قاعدہ اخلاص و وحدانیت پر ہے چونکہ جب بندہ حق تعالیٰ کی وحدانیت کا اقرار کرتا ہے تو وہ اپنے آپ کو حکم الٰہی میں مغلوب و مجبور دیکھتا ہے اور جو مغلوب ہوتا ہے وہ غالب کے غلبہ میں فانی ہوتا ہے جس وقت اس کی فنا درست ہو جاتی ہے اور اپنے عجز کا اقرار کرتا ہے تب وہ بجز بندگی کے کچھ نہیں دیکھتا اور اپنی تمام صلاحیتیں بارگاہِ الٰہی میں گم کر دیتا ہے۔ جو کوئی فنا و بقا کی اس کے سوا تعریف کرتا ہے اور وہ فنا کو ذات کی فنا اور بقا کو بقائے حق سے تعبیر کرتا ہے" وہ زندیق ہے۔ یہ مذہب تو نصاریٰ کا ہے۔"

حضور سیدنا داتا گنج بخش رحمتہ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ یہ تمام اقوال باعتبار معنی قریب قریب ہیں اگرچہ عبارات مختلف ہیں ان سب کی حقیقت یہ ہے کہ بندہ کے لئے فنا، جلالِ حق کی دید اور اس کی عظمت کا کشف و مشاہدہ دل سے تعلق رکھتا ہے یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ کے جلال کے غلبہ میں اس کے دل سے دنیا و آخرت فراموش ہو جاتی ہے اور اس کی ہمت کی نظر میں،

احوال و مقام حقیر معلوم ہونے لگتے ہیں اور اس کی حالت میں ظہور و کرامت پراگندہ اور عقل و نفس سے فانی ہو جاتے ہیں حتیٰ کہ وہ فنا سے بھی فانی ہو جاتا ہے اور عین فنا میں گم ہو کر اس کی زبان حق کے ساتھ گویا ہو جاتی ہے اور اس کے دل میں خشیت اور جسم میں عاجزی پیدا ہو جاتی ہے۔جس طرح کہ ابتداء میں حضرت آدم علیہ السلام کے صلب سے ذریت کے اخراج کے وقت بندگی کے اقرار میں آفت شامل نہ تھی ایک بزرگ اس مفہوم کو اس طرح ادا کرتے ہیں کہ:

ان کنت دری کیف السبیل الیك
فنیت عن جمیعی فصرت ابکی الیك

اگر مجھے تجھ تک پہنچنے کی راہ معلوم ہوتی تو میں سب سے
اپنے آپ کو فنا کر دیتا اور تیری یاد میں روتا رہتا

اور ایک بزرگ یوں فرماتے ہیں کہ:

ففی فنائی فناء فنائی
وفی فنائی وجدت انت
محوت اسمی و رسم جسمی
سالت عنی فقلت انت

یعنی میری فنا میں اپنی فنا کی فنا ہے
اور خود کو فنا کرنے میں تیرا پانا ہے
لہٰذا میں نے اپنے نام و جسم کی آسائشوں کو مٹا دیا ہے
اگر تو نے مجھ سے کچھ پوچھا تو میں یہی کہوں گا تو ہی علیم ہے

فقر و تصوف میں فنا و بقاء کے احکام اور اس کا بیان یہ تھا جسے اختصار کے ساتھ بیان کر دیا اس کتاب میں جہاں بھی فنا و بقاء کا ذکر ہے اس سے یہی مراد ہے اور یہ قاعدہ خرازیوں کے مذہب کا ہے اور تمام مشائخ اسی اصل پر گامزن ہیں۔اس جماعت کا عام مقولہ ہے کہ جو جدائی دلیل وصال ہو وہ بے اصل نہیں ہوتی۔واللہ اعلم

(۹) فرقہ خفیفیہ

خفیفیہ فرقے کے پیشوا، حضرت ابوعبداللہ محمد بن خفیف شیرازی رحمۃ اللہ علیہ ہیں جو اکابر سادات مشائخ میں سے مقبول ومحبوب تھے اور اپنے زمانہ میں ظاہری و باطنی علوم کے ماہر تھے۔ طریقت کے علوم وفنون میں ان کی تصانیف مشہور ہیں۔ آپ کے فضائل ومناقب بے حدو شمار ہیں۔ آپ مقبولِ زمانہ، عزیز نفس اور پاکیزہ صفات تھے نفسانی خواہشوں کی پیروی سے کنارہ کش تھے۔ میں نے سنا ہے کہ انہوں نے چار سو (۴۰۰) نکاح کئے تھے اس کی وجہ یہ ہے کہ آپ شاہی خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ جس وقت انہوں نے توبہ کی تو شیراز کے تمام لوگ آپ سے بہت زیادہ محبت کرنے لگے جب آپ کا حال ارفع و اعلیٰ ہوا تو شاہی خاندان اور رئیسوں کی لڑکیوں نے حصولِ برکت کی خاطر آپ سے نکاح کی استدعا کی۔ آپ ان سے نکاح کرتے اور دخول سے پہلے باکرہ حالت میں طلاق دے دیا کرتے تھے البتہ چالیس بیبیاں ایسی خوش نصیب تھیں جنہوں نے ایک ایک دو دو تین تین راتیں گزاری تھیں ان میں سے صرف ایک بی بی چالیس سال تک ان کی صحبت میں رہی وہ ایک وزیر کی لڑکی تھی۔

حضرت ابوالحسن علی بن بکران شیرازی رحمۃ اللہ علیہ نے مجھ سے بیان کیا کہ ان کے زمانہ حکومت میں عورتوں کی ایک جماعت اس پر متفق تھی کہ اس شخص سے خلوت میں کوئی خاص شہوانی جذبات نہیں دیکھے گئے۔ ہر ایک کے دل میں قسم قسم کے وسوسے پیدا ہوتے اور حیرت و تعجب کا اظہار کرتی تھیں۔ اس سے قبل سب یہ جانتے تھے کہ وہ شہوت میں خاص مزاج رکھتے ہیں اور سب یہی کہتے تھے کہ ان کی صحبت کا راز وزیرزادی کے سوا اور کوئی نہیں جانتا کیونکہ ان کی صحبت میں وہی سالہا سال رہی ہیں اور ان کی چہیتی بیوی ہیں۔ حضرت ابوالحسن فرماتے ہیں کہ ہم نے دو آدمیوں کو منتخب کر کے وزیرزادی کے پاس بھیجا۔ انہوں نے ان سے پوچھا شیخ کو تم سے بڑی محبت رہی ہے اس لئے ہمیں ان کی صحبت کی کوئی خاص بات بتاؤ؟ وزیرزادی نے کہا جس دن، میں ان کے نکاح میں آئی اس وقت کسی نے مجھ سے کہا کہ آج شیخ تمہارے پاس

رہیں گے۔ میں نے عمدہ قسم کا کھانا تیار کیا اور خود کو خوب بنایا سنوارا۔ جب وہ میرے پاس تشریف لائے تو میں نے کھانا لاکے آگے رکھا اس کے بعد انہوں نے میری طرف کچھ دیر غور سے دیکھا پھر کھانے کی طرف کچھ دیر نظریں جمائیں بعد ازاں میرا ہاتھ پکڑ کر اپنی آستین میں لے گئے میں نے سینہ سے لے کر ناف تک پندرہ گرہیں پڑی ہوئی پائیں۔ انہوں نے فرمایا اے وزیر کی دختر! پوچھو کہ یہ گرہیں کیسی ہیں؟ میرے دریافت کرنے پر فرمایا یہ سب سوزش اور صبر کی شدت سے پڑی ہوئی گرہیں ہیں کیونکہ میں نے ہمیشہ ایسے خوبصورت و حسین چہروں اور ایسے لذیذ خوشبودار کھانوں پر صبر کیا ہے یہ فرما کر وہ اٹھ کھڑے ہوئے۔ سب سے بڑا معاملہ جو میرے ساتھ ان کا ہوا وہ یہی تھا۔

تصوف میں ان کے مذہب کی خصوصیت غیبت اور حضور ہے جس کو عبارت میں بیان نہیں کیا جا سکتا تاہم مقدور بھر بیان کرنے کی کوشش کروں گا۔

غَیبت اور حضور

غیبت و حضور، ایسی دو عبارتیں اور کلمے ہیں جو مقصود کے عین مفہوم کو بیان کرتے ہیں عکس و سایہ کی مانند ہیں (گویا لفظوں میں ان کے مقصود کا حقیقی مفہوم ادا کرنا ناممکن ہے) یہ دونوں لفظ ایک دوسرے کی ضد ہیں جو ارباب زبان اور اہل معانی کے درمیان بکثرت مستعمل ہیں لہٰذا حضور سے مراد وہ حضورِ قلب ہے جو یقینی ولایت کے ساتھ ہوتا ہے کہ اس کے لئے غیبی حکم عینی حکم کی مانند ہو جائے۔

اور غیب سے مراد، ماسوٰی اللہ سے دل کا غائب ہونا ہے یہاں تک کہ وہ اپنے آپ سے بھی غائب ہو کر اپنی غیبت سے بھی غائب ہو جائے اور اپنی غیبت کو بھی وہ خود نہ دیکھ سکے۔ اس کی علامت یہ ہے کہ وہ رسمی حکموں سے بھی کنارہ کش ہو جس طرح نبی ارتکاب حرام سے معصوم ہوتا ہے۔ لہٰذا اپنے سے غیبت، حق سے حضور ہے اور حق سے حضوری اپنے سے غیبت ہے چنانچہ جو اپنے سے غائب ہو گیا وہ حق تعالیٰ کے حضور پہنچ گیا اور جو حق تعالیٰ میں حاضر ہو گیا

وہ اپنے سے غائب ہوگیا کیونکہ دل کا مالک حق تعالیٰ ہے جب کسی جذبہ حق سے طالب کا دل مغلوب ہو جائے تو اس کے نزدیک دل کی غیبت، حضور کی مثل ہو جاتی ہے اور اس وقت دل سے شرکت وقسمت اٹھ جاتی ہے اور اپنے سے بھی نسبت منقطع ہو جاتی ہے۔ ایک بزرگ فرماتے ہیں کہ:

ولـی فـواد وانـت مـالکـه
بـلاشـریك فـکیف ینـقسم

میرے دل کا تو ہی بلا شریک مالک ہے
اب وہ کیسے تقسیم ہو؟

جب دل کا مالک اللہ تعالیٰ کے سوا اور کوئی نہیں رہتا تو اس وقت وہ خواہ غائب ہو یا حاضر، اسی کے قبضہ وتصرف میں ہوتا ہے اور نظری حکم میں عین کے ساتھ ہوتا ہے۔ تمام اربابِ طریقت کی دلیل، یہی سلوک ہے البتہ مشائخ کو جو اختلاف ہے وہ اس میں ہے کہ ایک گروہ حضور کو غیبت پر مقدم رکھتا ہے اور دوسرا گروہ غیبت کو حضور پر ترجیح دیتا ہے جیسا کہ سکر وصحو میں ہم نے بیان کیا لیکن فرق یہ ہے کہ صحو وسکر صفات بشریہ کے باقی رہنے کی نشاندہی کرتے ہیں اور غیبت وحضور ان کے فنا ہونے کا پتہ دیتے ہیں لہٰذا میدان تحقیق میں اس کا بڑا اعزاز ہے اور جو مشائخ، غیبت کو حضور پر مقدم رکھتے ہیں ان میں حضرت ابن عطاء، حسین بن منصور، ابوبکر شبلی، بندار بن حسین، ابوحمزہ بغدادی اور سمنون محبّ رحمہم اللہ ہیں۔

اہل عراق کی ایک جماعت کہتی ہے کہ راہِ حق میں سب سے بڑا حجاب تُو خود ہے جب تُو نے اپنے آپ کو غائب کر لیا تو تجھ سے تیری ہستی کو برقرار وثابت رکھنے والی تمام آفتیں فنا ہو جاتی ہیں اور زمانہ کے قاعدے بدل جاتے ہیں۔ مریدوں کے تمام مقامات تیرے لئے حجاب، طالبوں کے تمام احوال، تیری آفت گاہ بن جاتے ہیں۔ اسرارِ زمانہ نابود ہو گئے ارادہ کو قائم رکھنے والی چیزیں ذلیل ہو جاتی ہیں۔ اپنے وجود اور غیر اللہ کے وجود کو دیکھنے سے آنکھیں جل جاتی ہیں اور بشری اوصاف اپنی جگہ، قربت کی آگ سے خود بخود نیست ونابود ہو جاتے ہیں اور

ایسی صورت ہو جاتی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس غیبت کی حالت میں تجھے آدم کی پیٹھ سے نکالا اور اپنا کلام عزیز تجھے سنایا پھر خلعت توحید اور مشاہدہ کے لباس سے تجھے سرفراز فرمایا۔ جب تک تو اپنے سے غائب رہے گا بارگاہِ حق میں بے حجاب حاضر رہے گا اور جب تک اپنی صفات کے ساتھ حاضر رہے گا تو قربت حق سے غائب رہے گا۔ تیری ہلاکت، تیرے بشری صفات کی حاضری میں ہے۔ اللہ تعالیٰ کے ارشاد کا یہی مطلب ہے کہ:

وَلَقَدْ جِئْتُمُوْنَا فُرَادٰی کَمَا خَلَقْنٰکُمْ اَوَّلَ مَرَّۃٍ (الانعام:٦) یقیناً تم ہمارے حضور اکیلے آئے جس طرح ہم نے تمہیں پہلی مرتبہ پیدا فرمایا۔

حضرت محاسبی، حضرت جنید بغدادی، سہیل بن عبد اللہ تستری، ابو حفص حداد، ابو حمدون قصار، ابو محمد جریری، صاحب مذہب حضرمی اور محمد بن حفیف رحمہم اللہ کے علاوہ ایک اور جماعت کا مذہب یہ ہے کہ حضور غیبت سے مقدم ہے اس لئے کہ تمام خوبیاں حضور میں حاصل ہوتی ہیں اور اپنے سے غیبت تو حضور حق کا راستہ ہے۔ جب حضور حق حاصل ہو گیا تو پہنچنے کا راستہ تو آفت ہے لہٰذا جو شخص اپنے سے غائب ہو گیا، یقیناً وہ بارگاہِ حق میں حاضر ہو گیا۔ غیبت کا فائدہ تو حضور ہے۔ بے حضور غیبت دیوانگی اور مغلوبیت ہے۔ مناسب یہی ہے کہ تارک غفلت ہو جاؤ تا کہ غیبت کا جو مقصود ہے یعنی حضور، وہ حاصل ہو جائے جس وقت مقصود حاصل ہو جاتا ہے اس وقت علت ساقط ہو جاتی ہے اسی معنی میں یہ شعر ہے:

لیس الغائب من غاب من البلاد
انما الغائب من غاب من المراد
ولیس الحاضر من لیس له المراد
انما الحاضر من لیس له الفواد
حتٰی استقر فیه المراد

ب وہ نہیں جو شہروں سے غائب ہے
بلکہ غائب وہ ہے جو مقصود و مراد سے غائب ہے

وہ حاضر نہیں جس کی مراد موجود نہ ہو
بلکہ وہ حاضر ہے جسے قلبی خواہشیں کچھ نہ ہوں
یہاں تک کہ وہ مراد سے مالا مال ہو جائے

مطلب یہ ہے کہ جو بستی و شہر سے غائب ہے وہ دراصل غائب نہیں ہے بلکہ وہ غائب ہے جو اپنے ہر ارادہ سے غائب ہو حتیٰ کہ حق تعالیٰ کا ارادہ ہی اس کا ارادہ بن جائے اور جس میں چیزوں کا ارادہ نہ ہو اسے حاضر نہیں کہتے بلکہ حاضر وہ ہے جس کے دل میں رعنائی اور دلپسندی نہ ہوتا کہ اس میں دنیا و آخرت کی فکر نہ رہے اور خواہش سے اسے راحت نہ ہو۔ اسی معنی میں ایک بزرگ فرماتے ہیں کہ:

من لم یکن فینا عن نفسه
وعن الھوٰی بالانس والاحباب
فکانما بین المراتب واقف
لمنال حظٍ اولحسن مآب

جس کا حال یہ نہ ہو کہ وہ اپنے سے اور نفسانی
خواہشوں سے انسان اور عزیزوں سے فانی ہو
وہ گویا نفسانی خواہشوں کے حصول اور نیک انجام
کی تمنا میں مراتب کے درمیان ٹھہرا ہوا ہے

مشہور واقعہ ہے کہ حضرت ذوالنون مصری رحمتہ اللہ علیہ کا ایک مرید، حضرت بایزید بسطامی رحمتہ اللہ علیہ کی زیارت کے ارادہ سے گیا۔ دروازہ پر پہنچ کر اس نے دستک دی۔ حضرت بایزید رحمتہ اللہ علیہ نے پوچھا کون ہے؟ کیا چاہتے ہو؟ جواب دیا کہ حضرت بایزید کی زیارت کو آیا ہوں۔ پوچھا بایزید کون ہے؟ کہاں ہے اور وہ کیا ہے میں مدت سے بایزید کو تلاش کر رہا ہوں مگر وہ نہیں ملتا۔ جب مرید نے واپس ہو کر حضرت ذوالنون مصری رحمتہ اللہ علیہ سے یہ حال بیان کیا تو انہوں نے فرمایا:

اخی بویزید ذھب فی الذاھبین الی اللہ — میرا بھائی بایزید بسطامی تو خدا کی طرف جانے والوں میں جاملا۔

حضرت جنید بغدادی رحمۃ اللہ علیہ کے پاس آکر ایک شخص نے درخواست کی کہ تھوڑی دیر میرے پاس رہ کر کچھ باتیں کر لیجئے مجھے آپ سے کچھ عرض کرنا ہے؟

آپ نے فرمایا اے جوانمرد تم مجھ سے وہ چاہتے ہو جسے عرصہ سے میں خود چاہتا ہوں برسوں سے اسی تمنا میں ہوں کہ ایک لمحہ کے لئے اپنے آپ میں موجود ہو جاؤں لیکن اب تک ایسا وقت نہیں آیا پھر ہمیں بتاؤ میں تمہارے ساتھ کیسے رہ سکتا ہوں؟ اس سے معلوم ہوا کہ غیبت میں حجاب کی وحشت ہے اور حضور میں مشاہدے کی راحت۔ تمام احوال میں مشاہدہ حجاب کی مانند نہیں ہوتا۔ اسی معنی میں حضرت ابوسعید رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

تقشع غیم الھجر عن قمر الحب
واسفر نور الصبح عن ظلمتہ الغیب

محبت کے چاند سے ہجرت کے بادل ناپید ہوگئے
اور غیبت کی تاریکی سے صبح کا تڑکا چمک اٹھا

غیبت وحضور کے فرق میں مشائخ کے بکثرت لطائف، حالات اور ظاہری اقوال ہیں جن کا مفہوم باہم قریب قریب ہے یعنی بارگاہ حق کا حضور اوزاپنے سے غیبت برابر ہے کیونکہ اپنے سے غیبت کا مقصود، حضور ہے اور جو اپنے سے غائب نہیں ہے وہ بارگاہِ حق میں حاضر نہیں ہے اور جو حاضر ہے وہ غائب ہے۔ جس طرح حضرت ایوب علیہ السلام نے نزول بلا کے وقت فریاد میں اپنے آپ کو نہ دیکھا بلکہ وہ اس حال میں اپنے آپ سے غائب تھے اس لئے حق تعالیٰ نے ان کی عین فریاد کو صبر سے جدا نہیں ہونے دیا۔ انہوں نے فریاد کی کہ "اَنِّیْ مَسَّنِیَ الضُّرُّ وَاَنْتَ اَرْحَمُ الرّٰحِمِیْنَ" (الانبیاء:۸۳) اے خدا میں تکلیف میں ہوں تو ہی بہت مہربان ہے۔ حق تعالیٰ نے فرمایا:

فَاسْتَجَبْنَا لَهُ فَكَشَفْنَا مَابِهِ مِنْ ضُرٍّ (الانبیاء:۸۴) (ایوب صابر تھا) لہٰذا ہم نے اس کی فریاد سنی اور اس کی ہر تکلیف کو دور کر دیا۔

حضرت جنید بغدادی رحمتہ اللہ علیہ بیان کرتے ہیں کہ مجھ پر ایسا زمانہ بھی گزرا ہے کہ تمام زمین و آسمان والے میری پریشانی پر روتے تھے پھر ایسا زمانہ بھی آیا ہے کہ میں ان کی غیبت پر روتا تھا اب ایسا زمانہ آ گیا ہے کہ مجھے نہ اپنی خبر ہے نہ زمین و آسمان کی۔ یہ حضورِ حق کے متعلق بہترین اشارہ ہے۔

یہ ہیں غیبت و حضور کے معنی جسے میں نے اختصار کے ساتھ بیان کر دیا تا کہ خفیفیوں کا مسلک معلوم ہو جائے کہ غیبت و حضور سے ان کی کیا مراد ہے۔

(۱۰) فرقہ سیاریہ

سیاری فرقہ کے پیشوا، حضرت ابو العباس سیاری رحمتہ اللہ علیہ ہیں جو مرو کے امام، تمام علوم کے عالم اور حضرت ابو بکر واسطی رحمتہ اللہ علیہ کے مصاحب تھے۔ شہر نساء اور مرو میں ان کے مریدین بکثرت ہیں۔ تصوف کا کوئی مذہب اپنے حال پر باقی نہیں ہے لیکن ان کا مسلک اب بھی اپنے حال پر باقی ہے کیونکہ یہ دونوں اس مذہب کے رہنماؤں سے کبھی خالی نہ رہے ان کے مریدین و تلامذہ نے ان کے مذہب کی ہمیشہ حفاظت کی ہے اور انہوں نے ان کے لئے بکثرت رسائل لکھے ہیں۔

میں نے شہر مرو میں ان کے کچھ خطوط و رسائل دیکھے ہیں جو نہایت جامع و عمدہ ہیں سیاری مذہب کی خصوصیت جمع و تفرقہ ہے جو تمام اہل علم کے درمیان مستعمل ہے۔ ہر گروہ نے اپنی مراد اور اپنی عبارتوں کے سمجھانے میں ان دونوں کلمات کا استعمال کیا ہے لیکن ہر ایک کی وضاحت ایک دوسرے سے مختلف رہی ہے چنانچہ مذہب محاسبی میں جمع و تفرقہ سے مراد، کسی چیز کے شمار میں جمع اور افتراق لیا گیا ہے اور نحوی اور اصحابِ لغت ان سے مراد، ناموں کا جمع کرنا اور ان کا فرق لیتے ہیں۔ حضرات فقہا نے نص کا جمع کرنا اور ان کی صفات کو جدا کرنا یا نص کا جمع کرنا اور قیاس کو جدا کرنا مراد لیا ہے اور اصولِ کلام والوں نے صفات ذات کا جمع اور صفات فعل کا تفرقہ مراد لیا ہے لیکن

مشائخ طریقت کے نزدیک ان میں سے کوئی مراد نہیں ہے بلکہ ان کی مراد وہ ہے جسے ہم بیان کر رہے ہیں۔

جمع وتفرقہ

اللہ تعالیٰ نے ایک جگہ اپنی دعوت میں تمام مخلوق کو جمع کر کے فرمایا:

وَاللّٰهُ يَدْعُوْٓا اِلٰى دَارِ السَّلٰمِ ‏ (یونس:۲۵) اللہ تعالیٰ سلامتی کے گھر کی طرف بلاتا ہے

دوسری جگہ ہدایت حق میں انہیں تفرقہ کے ساتھ بیان کیا ہے کہ:

وَيَهْدِىْ مَنْ يَّشَآءُ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ (البقرہ:۲۰۳) اللہ جسے چاہتا ہے صراط مستقیم کی ہدایت فرماتا ہے۔

دعوت میں تو اللہ تعالیٰ نے سب کو جمع کر کے پکارا اور اظہار مشیت میں ایک گروہ کو حکم سے خارج کر کے بیان کیا اور باقی کو حکم میں جمع کر دیا گویا ایک گروہ کو تو مردود رسوا کر کے فرق کر دیا اور انہیں جدا کر دیا اور کچھ کو توفیق دے کر مقبول بنایا اور کچھ کو ممانعت کے ذریعہ جمع کر کے نکالا۔ ایک گروہ کو عصمت دی اور ایک گروہ کو آفت کی طرف میلان دیا لہٰذا اس معنی میں حقیقت و اسرار اور حق تعالیٰ کی معلوم و مراد میں لفظ جمع ہے اور امر و نہی کے اظہار میں لفظ تفرقہ ہے چنانچہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کو حکم دیا کہ اپنے فرزند حضرت اسماعیل علیہ السلام کو قربان کر دیں حالانکہ مشیتِ الٰہی یہ تھی کہ ایسا نہ ہو۔ ابلیس کو حکم دیا کہ حضرت آدم علیہ السلام کو سجدہ کرے اور مشیت الٰہی یہ تھی کہ وہ سجدہ نہ کرے۔ حضرت آدم علیہ السلام سے فرمایا کہ دانہ گندم نہ کھانا مگر مشیتِ الٰہی یہ تھی کہ وہ کھائیں۔ اس قسم کی بکثرت مثالیں ملتی ہیں۔

جمع وتفرقہ کی تعریف:

تصوف میں جمع وتفرقہ کی تعریف یہ ہے کہ:

الجمع ماجمع باوصافه — جمع وہ ہے جو اپنے اوصاف کے ساتھ جمع ہو

والتفرقة مافرق بافعاله — اور تفرقہ وہ ہے جو اپنے افعال سے جدا ہو۔

اس سے مراد مکمل ارادہ کا انقطاع اور ارادۂ الٰہی کے اثبات میں خلق کے تصرف کا مکمل ترک ہے۔ اس تعریف پر معتزلہ کے سوا تمام اہل سنت و جماعت اور تمام مشائخ کا اجماع ہے البتہ ان کے استعمال میں مشائخ کا اختلاف ہے چنانچہ ایک گروہ ان دونوں کلمات کو توحید پر محمول کرتا ہے اور کہتا ہے کہ جمع کے دو درجے ہیں ایک حق تعالیٰ کے اوصاف میں دوسرا بندوں کے اوصاف میں۔ حق تعالیٰ کے اوصاف سے جس کا تعلق ہے وہ توحید کا بھید ہے جس پر بندہ کا کوئی اختیار نہیں ہے اور جو بندوں کے اوصاف میں ہے اس سے مراد، توحید میں صدق عقیدت اور صحت عزیمت ہے یہ قول حضرت ابو علی رود باری علیہ الرحمتہ کا ہے۔ دوسرا گروہ حق تعالیٰ کے اوصاف پر محمول کرتا ہے چنانچہ وہ کہتا ہے کہ جمع، حق تعالیٰ کی صفت ہے اور تفرقہ حق تعالیٰ کا فعل۔ حق تعالیٰ کے صفت و فعل میں بندے کو کوئی اختیار نہیں ہے اس لئے کہ حق تعالیٰ کی اُلوہیت میں کوئی شئی متنازعہ نہیں ہے۔ جمع ذات وصفات اسی کے لئے ہے کیونکہ "الجمع التسویتہ فی الاصل" جمع اصل میں برابری کا مقتضی ہے حق تعالیٰ کی ذات وصفات میں کوئی اس کا مساوی نہیں اور اس کی جدائی میں خلق کی تفصیل وعبارت مجتمع نہیں ہے اس کے معنی یہ ہیں کہ اللہ تعالیٰ کے صفات قدیم ہیں اور وہ اسی کے ساتھ مختص ہیں اور ان کا قیام بھی اسی کے ساتھ ہے اور ان کی خصوصیات بھی اسی سے وابستہ ہیں چونکہ حق تعالیٰ کی ذات وصفات میں دوئی نہیں ہے اور نہ اس کی وحدانیت میں فرق وعدد روا ہے اس لحاظ سے جمع کا استعمال حق تعالیٰ کے سوا کسی اور کے لئے جائز نہ ہوگا۔

لیکن حکم میں تفرقہ، اللہ تعالیٰ کے افعال سے متعلق ہے کیونکہ تمام احکام متفرق ہیں کسی کے لئے وجود کا حکم ہے اور کسی کے لئے عدم کا اس لحاظ سے جمع کا استعمال ہوا اس میں ایک کو فنا کا حکم ہے اور دوسرے کو بقا کا حکم۔

ایک گروہ وہ ہے جو تفرقہ کو علم الٰہی پر محمول کرتا ہے۔ چنانچہ وہ کہتا ہے کہ:

الجمع علم التوحید والتفرقه علم الاحکام — توحید کا علم جمع، اور احکام کا علم تفرقہ ہے۔

اس لحاظ سے علم اصول، جمع اور علم فروع تفرقہ ہوں گے۔ ایک بزرگ کا قول یہ ہے کہ:

الجمع ما اجتمع علیہ اھل العلم والتفرقه ما اختلفوا فیه — جس پر اہل علم کا اجماع ہو وہ جمع اور جس میں ان کا اختلاف ہو وہ تفرقہ ہے۔

لیکن جمہور محققین تصوف کی عبارات واشارات میں تفرقہ سے مکاسب (بندے کے اختیاری اعمال) اور جمع سے مواہب (مجاہدے اور مشاہدے) مراد لئے ہیں۔ لہٰذا جو بندہ مجاہدے کے ذریعہ واصل بحق ہو وہ تفرقہ ہے اور حق تعالیٰ کی طرف سے بندہ پر جو خاص عنایت و ہدایت ہو وہ جمع ہے اور بندے کی عزت وتکریم اس میں ہے کہ وہ اپنے وجودی افعال اور جمال حق کے لئے مجاہدے کی قدرت میں اپنے افعال کی آفتوں سے محفوظ رہے اور اپنے افعال کو باعطائے فضل الٰہی جان کر مشاہدے کو ہدایت الٰہی کے دامن میں منفی دیکھے۔ لہٰذا ایسا بندہ اپنی ہر اقامت میں حق تعالیٰ کے ساتھ قائم ہو کر اس کا نائب اور اوصاف میں اس کا وکیل ہوگا اور اس کے تمام افعال کی نسبت اسی کی طرف ہوگی یہاں تک کہ وہ اپنے کسب کی نسبت سے محفوظ ہو جائے گا جیسا کہ حق تعالیٰ نے حبیب صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ بواسطہ حضرت جبرل علیہ السلام حدیث قدسی میں فرمایا:

لَايَزَالُ عَبْدِیْ يَتَقَرَّبُ اِلَیَّ بِالنَّوَافِلِ حَتّٰى اُحِبَّهٗ فَاِذَا اَحْبَبْتُهٗ كُنْتُ سَمْعًا وَّبَصَرًا وَّيَدًا وَّلِسَانًا فَبِیْ يَسْمَعُ وَبِیْ يُبْصِرُ وَبِیْ يَنْطِقُ وَبِیْ يَبْطِشُ (بخاری شریف)

میرا بندہ نوافل کے ذریعہ میری قربت کا ہمیشہ خواہاں رہتا ہے یہاں تک کہ میں اسے اپنا محبوب بنالیتا ہوں پھر جب میں اپنے کسی بندے کو اپنا محبوب بنا لیتا ہوں تو میں اس کے کان آنکھ ہاتھ اور زبان ہو جاتا ہوں وہ مجھ سے سنتا ہے، مجھ سے ہی دیکھتا، مجھ سے

ہی بولتا اور مجھ سے پکڑتا ہے۔

مطلب یہ ہے کہ ہمارا بندہ مجاہدے کے ذریعہ جب ہمارا مقرب ہو کر محبوب ہو جاتا ہے تو ہم اس کے وجود کو اس سے فنا کر دیتے ہیں اور اس کے افعال کی نسبت کو اس سے اٹھا لیتے ہیں حتیٰ کہ وہ ہمارے ذریعہ ہی سنتا ہے جو وہ سنے اور ہمارے ہی ذریعہ بولتا ہے جب وہ بولے اور ہمارے ہی ذریعہ دیکھتا ہے جب وہ دیکھے اور ہمارے ذریعہ پکڑتا ہے جب وہ پکڑے گویا وہ ہمارے ذکر میں ایسا مستغرق ہو جاتا ہے کہ وہ ذکر کا مغلوب بن جاتا ہے۔ اور اس کے ذکر میں اس کا کسب مفقود ہو جاتا ہے اور ہمارا ذکر اس کے ذکر کا سلطان بن جاتا ہے اور اس کے ذکر سے آدمیت کی نسبت جدا ہو جاتی ہے۔ لہٰذا اس کا ذکر ہمارا ہی ذکر ہوگا حتیٰ کہ بحالت غلبہ وہ اسی کے ساتھ موصوف ہوگا چنانچہ حضرت بایزید بسطامی رحمۃ اللہ علیہ غلبہ حال میں نعرہ لگاتے ہیں کہ ''سُبْحَانِیْ مَا اَعْظَمَ شَانِیْ'' (پاکی ہے مجھے، کتنی ہی بڑی میری شان) یہ جو کچھ فرمایا حق تعالیٰ کی گفتار سے تھا اور جو کہا حق کہا۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

اَلْحَقُّ یَنْطِقُ عَلٰی لِسَانِ عُمَرَ حق تعالیٰ حضرت عمر کی زبان میں بولتا ہے

(ابن ماجہ)

اس کی حقیقت اس طرح پر ہے کہ آدمیت پر جب حق تعالیٰ کے غلبہ کا ظہور ہوتا ہے تو اللہ تعالیٰ اسے اس کی ہستی سے نکال دیتا ہے یہاں تک کہ اس کی تمام باتیں حق تعالیٰ ہی کی فرمودہ ہوتی ہیں اس استحالہ کے باوجود کہ حق تعالیٰ کسی میں حلول نہیں کرتا اور نہ کسی مخلوق یا مصنوع میں ممتزج و متحد ہو جاتا ہے اور نہ کسی چیز میں وہ پیوست ہوتا ہے۔

تعالیٰ اللہ عن ذالک وعما یصفہ الملاحدۃ علوا کبیرا

البتہ یہ جائز ہے کہ حق تعالیٰ کی محبت بندے کے دل پر غالب ہو جائے اور اس کے غلبہ کی زیادتی میں اس کی عقل و طبع اس کی برداشت سے عاجز آ جائے اور اس کا امر اس کے کسب سے ساقط ہو جائے۔ اس درجہ میں اس حالت کا نام جمع ہے۔ جس طرح کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم محبتِ الٰہی میں ایسے مستغرق و مغلوب تھے کہ جو فعل آپ سے رونما ہوتا اللہ تعالیٰ اس

فعل کی نسبت کو آپ سے دور فرماتا اور فرماتا کہ وہ فعل میرا تھا آپ کا نہ تھا ہر چند کہ اس فعل کا ظہور وصدور آپ سے ہوا۔ چنانچہ ارشاد حق ہے:

وَمَا رَمَيْتَ اِذْ رَمَيْتَ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ رَمٰى (الانفال:۱۷)	اے محبوب وہ مشت خاک جو آپ نے دشمنوں پر پھینکی تھی وہ آپ نے نہیں پھینکی بلکہ ہم نے پھینکی تھی۔

اسی قسم کا فعل جب حضرت داؤد علیہ السلام سے صادر ہوا تو حق تعالیٰ نے اس فعل کی نسبت ان کی طرف کرتے ہوئے فرمایا:

وَقَتَلَ دَاوُدُ جَالُوْتَ (البقرہ:۲۵۱)	حضرت داؤد نے جالوت کو قتل کیا۔

یہ حالت تفرقہ کی تھی۔ اللہ تعالیٰ نے دونوں نبیوں کے افعال میں فرق و امتیاز رکھا۔ ایک کے فعل کی نسبت ان کی طرف ہی رکھی اور یہ نسبت فعل محل آفت وحوادث ہے اور دوسرے کے فعل کی نسبت اپنی طرف فرمائی۔ چونکہ اللہ تعالیٰ قدیم ہے لہٰذا اس کی طرف نسبت فعل، آفت وحوادث سے پاک ہے۔ بنابریں اگر آدمی سے ایسا فعل سرزد ہو جو آدمی کے افعال کی جنس سے اور اس کے قبیل سے نہ ہو تو یقیناً اس کے فعل کا فاعل، حق تعالیٰ ہے اور اعجاز وکرامت سب کچھ اس کے ساتھ شامل ہے لہٰذا تمام عادی افعال تفرقہ ہیں اور تمام ناقض عادت فعل، جمع ہیں کیونکہ ایک رات میں ''قاب قوسین'' پہنچنا فعل عادی نہیں ہے اور یہ بجز فعل الٰہی ممکن نہیں اسی طرح غایت درجہ سچی اور درست بات کہنا فعل عادی نہیں یہ بھی فعل الٰہی کے سوا ممکن نہیں اور آگ سے نہ جلنا بھی فعل عادی نہیں یہ بھی فعل الٰہی کے بغیر ممکن نہیں اور غیبوبت میں درست وصحیح بات کہنا بھی فعل عادی نہیں یہ بھی اس کے فعل کے بغیر ممکن نہیں۔ غرض کہ اللہ تعالیٰ نے انبیاء واولیاء کو یہ معجزات وکرامات عطا فرما کر ان کے افعال کو اپنی طرف منسوب فرمایا اور ان افعال کو اپنا ہی فعل بتایا جبکہ محبوبوں کا فعل اسی کا فعل قرار پایا تو ان کی بیعت، خدا کی بیعت اور ان کی اطاعت، خدا کی اطاعت ہوئی چنانچہ حق تعالیٰ کا ارشاد ہے:

اِنَّ الَّذِیْنَ یُبَایِعُوْنَکَ اِنَّمَا یُبَایِعُوْنَ اللّٰہَ (الفتح:۱۰)
یقیناً جنہوں نے آپ کے ہاتھ پر بیعت کی انہوں نے اللہ سے بیعت کی۔

نیز فرمایا:

مَنْ یُّطِعِ الرَّسُوْلَ فَقَدْ اَطَاعَ اللّٰہَ (النسآء:۸۰)
جس نے رسول کی اطاعت کی بلاشبہ اس نے اللہ کی اطاعت کی۔

خلاصہ یہ کہ محبوبانِ خدا اولیاء اللہ، اَسرارِ الٰہی سے تو مجتمع اور معاملات و اظہار سے مفترق ہیں یہاں تک کہ اجتماع کے ساتھ دوستی و محبت کے اسرار مستحکم ہیں اور افتراق کے ساتھ بندگی کی اقامت کا اظہار صحیح و درست ہے۔ ایک بزرگ بحالت جمع فرماتے ہیں کہ:

قد تحققت بسرّی فناجاك لسانی
فاجتمعنا لمعان وافترقنا لمعانی
فلیس عینك التعظیم لحظه عن عیانی
ولقد صیرك الواجد من الاجساد امانی

میرا باطن متحقق ہوا تو میری زبان نے تیری مناجات کی
لہٰذا ہم کچھ معانی میں جمع اور کچھ معانی میں مفترق ہیں

اس شعر میں اجتماع اسرار کو جمع اور زبان کی مناجات کو تفرقہ کہا گیا ہے اس کے بعد جمع و تفرقہ کا اپنے وجود میں نشانی بتائی اور اس قاعدہ کو اپنے پر محمول کیا۔ یہ بہت لطیف بات ہے۔ وباللہ التوفیق۔

جمع وتفرقہ کے معنیٰ میں مشائخ کا اختلاف

اب اس جگہ ایک اختلاف کا بیان باقی ہے جو ہمارے اور مشائخ کے اس گروہ کے درمیان ہے جو یہ کہتا ہے کہ جمع کا اظہار، تفرقہ کی نفی ہے اس لئے کہ یہ دونوں ضدیں ہیں کیونکہ جب ہدایت کا غلبہ اور استیلا ہوتا ہے تو بندے سے کسب و مجاہدے کا اختیار جاتا رہتا ہے اور یہ

تعطیل محض ہے۔اس کا جواب ہم یہ دیں گے کہ یہ بات خود تمہارے عقیدے ہی کے خلاف ہے اس لئے کہ جب تک معاملہ کی قدرت اور کسب و مجاہدے کی طاقت موجود رہتی ہے اس وقت تک بندے سے وہ ہرگز ساقط نہیں ہوتی اسی لئے جمع تفرقہ سے جدا نہیں ہے جیسے آفتاب سے نور، جوہر سے عرض اور موصوف سے صفت جدا نہیں کی جا سکتی اسی طرح ہدایت سے مجاہدہ اور شریعت سے طریقت و حقیقت اور طلب سے وجدان بھی جدا نہیں البتہ یہ مجاہدہ کبھی مقدم ہوتا ہے اور کبھی مؤخر لیکن مجاہدہ جہاں مقدم ہو اس پر مشقت زیادہ ہوتی ہے کیونکہ وہ غیبت میں ہوتا ہے اور مجاہدہ جہاں مؤخر ہو اس پر رنج و کلفت نہیں ہوتی کیونکہ وہ حضور میں ہوتا ہے اور جو اعمال کے مشرب و مذہب کی نفی کرتا ہے وہ عین عمل کی نفی کرتا ہے۔ یہ بہت بڑی غلطی ہے البتہ یہ جائز ہے کہ بندہ ایسے درجہ پر فائز ہو جائے جہاں اسے اپنے افعال معیوب نظر آنے لگیں جبکہ وہ اپنے اوصاف محمودہ کو بھی عیب کی نظر سے ناقص دیکھتا ہے تو لامحالہ وہ اوصاف قبیحہ مذمومہ کو تو بدرجہ اولیٰ عیب دار دیکھے گا۔

میں نے یہ معنی اس لئے بیان کئے ہیں کہ میں نے ایک جاہل قوم کو اس غلطی میں آلودہ پایا ہے چونکہ وہ بحالت بے گانگی ہیں اس لئے کہتے ہیں کہ یافت کے لئے کسی ریاضت کی حاجت نہیں اور ہمارے افعال و طاعات معیوب اور مجاہدات ناقص ہیں اس لئے انہیں کرنے سے نہ کرنا بہتر ہے۔ میں ان سے کہتا ہوں کہ ہمارے افعال باتفاق فعل ہیں اور ہمارے ہر قسم کے فعل، محل علت، اور منبع شر و آفت ہیں بایں ہمہ ''نہ کرنے'' کو بھی فعل ہی کہا جائے گا جب کہ دونوں فعل ہی ہوئے اور فعل محل علت ہوئے تو کس وجہ میں ''نہ کرنے'' کو ''کرنے'' سے بہتر جانتے ہو؟ یہ تو ظاہری بدنصیبی ونقصان اور واضح عیب ہے لہٰذا یہ کفر و ایمان کے درمیان بہترین فرق ہے کیونکہ مومن و کافر دونوں متفق ہیں کہ ان کے افعال محل علت ہیں مگر مومن بحکم فرمان خدا، ''کرنے کو نہ کرنے'' سے زیادہ بہتر جانتا ہے اور کافر بحکم تعطیل نہ کرنے کو کرنے سے زیادہ بہتر سمجھتا ہے۔ لہٰذا جمع یہ ہے کہ آفت کو دیکھنے میں آفت تفرقہ در حکم تفرقہ ساقط نہ ہو اور تفرقہ یہ ہے کہ جمع کے حجاب میں تفرقہ کو جمع جانے۔ حضرت مزین کبیر اس معنی میں فرماتے ہیں کہ:

الجمع الخصوصية والتفرقة العبوديته موصول احدهما بالاٰخر غیر مفصول عنه

بندے کے لئے حق تعالیٰ کی خصوصیت جمع ہے اور بندے کی بندگی اس کے لئے تفرقہ یہ دونوں بندے سے جدا نہیں ہیں۔

اس لئے کہ خصوصیت کی علامت بندگی کی حفاظت ہے۔ معاملہ میں جب مدعی معاملہ کے ساتھ قائم نہ ہوگا تو وہ اپنے دعوے میں جھوٹا ہوگا البتہ یہ جائز ہے کہ حکم الٰہی بجالانے اور مجاہدے کا حق ادا کرنے میں جو تکلیف ومشقت ہوتی ہے اس کا بوجھ بندے پر نہ پڑے لیکن یہ کسی طرح جائز نہیں ہے کہ عین جمع میں بغیر واضح عذر کے کوئی حکم شریعت یا مجاہدہ جو شریعت میں عام ہو بندے سے وہ عین حکم اٹھ جائے۔ اس مسئلہ کو کچھ وضاحت سے بیان کرتا ہوں۔

واضح رہنا چاہئے کہ جمع کی دو قسمیں ہیں ایک جمع سلامت اور دوسری جمع تکسیر، جمع سلامت یہ ہے کہ حق تعالیٰ بحالت غلبہ، قوت، وجد شدت اور شوق کو ظاہر فرما کر بندے کی حفاظت فرمائے اور اپنا حکم ظاہر طور پر بندے پر جاری کر کے اسے بجالانے میں اس کی نگہبانی کرے اور اسے مجاہدے سے آراستہ بنا دے چنانچہ حضرت سہل بن عبداللہ تستری، ابوحفص حداد، ابوالعباس سیاری مروری صاحب مذہب ہذا، بایزید بسطامی، ابوبکر شبلی، ابوالحسن حضرمی اور مشائخ کی ایک جماعت قدس سرہم ہمیشہ مغلوب الحال رہتے تھے۔ بایں ہمہ جب بھی نماز کا وقت آتا تو وہ اپنے حال پر لوٹ آتے ہیں اور جب نماز ادا کر چکتے تو پھر مغلوب الحال ہو جاتے تھے اس لئے کہ جب تک تم محلِ تفرقہ میں ہو گے تو تم ہو گے اور خدا کا حکم بجالانا تم پر لازم ہوگا اور جب حق تعالیٰ تمہیں جذب کر کے مغلوب الحال بنا دے گا تو بہتر ہے کہ حق تعالیٰ اپنے حکم میں دو باتوں میں تمہاری حفاظت کرے گا۔ ایک یہ کہ بندگی کی علامت تم سے نہ اٹھے دوسرے یہ کہ وعدے کے حکم پر قائم رکھے کیونکہ اس کا ارشاد ہے کہ میں کبھی بھی شریعت محمدی کو منسوخ نہ کروں گا۔

اور جمع تکسیر یہ ہے کہ بندہ حکم میں دیوانہ اور مدہوش ہو جائے اور اس کا حکم پاگلوں کی مانند بن جائے ایسا شخص معاملہ میں معذور ہوتا ہے اور پہلا شخص مشکور، اور جو مشکور ہوتا ہے اس

کے حالات دوسرے کے مقابلہ میں زیادہ قوی ہوتے ہیں کیونکہ دوسرا ہر حال میں معذور ہے۔

یاد رکھنا چاہئے کہ جمع کے لئے نہ کوئی مخصوص مقام ہے اور نہ کوئی ایک حال کیونکہ جمع اپنے مطلوب کے معنی میں ہمت کا جمع کرنا ہے۔ چنانچہ کسی گروہ کے لئے اس معنی کا کشف مقامات میں ہوتا ہے اور کسی گروہ کا کشف احوال میں ہوتا ہے اور دونوں وقتوں میں صاحب جمع کی مراد، نفی مراد سے حاصل ہوتی ہے۔ ''لان التفرقتہ فصل والجمع وصل'' اس لئے کہ تفرقہ جدائی ہے اور جمع وصل و ملاپ اور یہ قول تمام اقوال میں صحیح و درست ہے جیسا کہ حضرت یعقوب علیہ السلام کی ہمت، حضرت یوسف علیہ السلام کے ساتھ جمع تھی کیونکہ انہیں حضرت یوسف علیہ السلام کے سوا کچھ نظر نہیں آتا تھا اسی طرح مجنوں کی ہمت، لیلیٰ کے ساتھ جمع تھی کیونکہ اسے لیلیٰ کے سوا کچھ نظر آتا ہی نہ تھا اسے سارے جہاں میں ہر چیز کے اندر لیلیٰ نظر آتی تھی۔ اس قسم کی بے شمار مثالیں ہیں۔

حضرت بایزید بسطامی رحمۃ اللہ علیہ ایک دن حجرے میں تشریف فرما تھے کسی نے دستک دی اور پوچھا کیا بایزید حجرے میں ہیں؟ انہوں نے فرمایا بجز حق کے حجرے میں کوئی دوسرا نہیں ہے۔

ایک بزرگ فرماتے ہیں کہ ایک درویش مکہ مکرمہ آیا اور وہ ایک سال تک خانہ کعبہ کے روبرو اس طرح بیٹھا رہا کہ نہ اس نے کچھ کھایا نہ پیا، نہ سویا نہ رفع حاجت کو کہیں گیا اس کی تمام ہمتیں خانہ کعبہ کے مشاہدے ہی میں مجتمع رہیں اس نے اپنے آپ کو خانہ کعبہ سے اس طرح منسوب کر دیا کہ اس کا دیدار ہی اس کے جسم کی غذا اور اس کے روح کی توانائی بن گئی۔

ان حقائق کی اصل یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی محبت کے خمیر کو جو کہ جوہر ہے حصہ حصہ کر کے اس کا ایک ایک حصہ اپنے محبوب کے لئے اس کی تقدیر ولیاقت کے موافق مخصوص کر دیا ہے اس وقت اس سے انسانی جوش، طبعی لباس مزاجی پردے اور روح کے حجاب اٹھ جاتے ہیں یہاں تک کہ وہ جزو محبت جو اسے عطا ہوا ہے اپنی صفت پر اسے ڈھال لیتا ہے اور وہ سرتاپا محبت کا پیکر بن جاتا ہے اس کی تمام حرکتیں اور مشاہدے اسی سے مربوط ہو جاتے ہیں۔ اسی بناء پر اربابِ معانی واصحابِ

زبان اس کیفیت کو جمع کے نام سے موسوم کرتے ہیں اسی معنی میں حضرت حسین بن منصور فرماتے ہیں کہ:

لبیك لبیك یا سیدی ومولائی

لبیك لبیك یا مقصدی ومعنائی

یاعین، عین وجودی یا منتهی همی

یامنطقی واشاراتی وایمائی

یاکل کلی ویاسمعی ویابصری

ویاجملتی وتباعض واجزائی

یعنی حاضر ہوں حاضر ہوں اے میرے سردار اے میرے مولا
حاضر ہوں حاضر ہوں اے میرے مقصد و معنیٰ
اے ذات، تو میرے وجود کا عین ہے اے منتہیٰ تو میری ہمتوں کا منتہیٰ ہے
اے مجھے گویائی دینے والے! میرا کلام، میرا اشارہ اور میرا کہنا تو ہی ہے
اے میرے کل کے کل! اے میرے کان اور میری آنکھ
اے میرے تمام بدن اور میرے کل اعضاء و اجزاء سب تجھ سے ہی ہیں

لہٰذا جو اپنی صفات میں مستعار ہوتا ہے وہ اپنی ہستی میں عار اور لائق شرمسار ہوتا ہے اور دونوں جہان میں اس کی توجہ کفر ہوتی ہے اور موجودات میں اس کی ہمت موجب ذلت و رسوائی ہوتی ہے۔

ارباب زبان کا ایک گروہ اپنی عبارت و بیان کو مشکل و محیر العقول بنانے کے لئے جمع الجوامع یعنی ''جمع کی جمع بول جاتے ہیں اگر چہ یہ کلمہ عبارت میں تو اچھا ہے مگر معنی میں یہی بہتر ہے کہ جمع کی جمع نہ بولا جائے اس لئے کہ اولاً تفرقہ ہو تو اس پر جمع درست ہو سکتی ہے اور جبکہ جمع خود جمع ہے تو تفرقہ کیسے ہوگا؟ اور جمع کو اپنے حال سے کیسے گرایا جائے گا۔ اس طرح یہ عبارت یعنی جمع الجمع تہمت کی جگہ بن جائے گی اس لئے کہ جو جمع ہو جائے وہ فوق و تحت میں اپنے سے

باہر نہیں دیکھ سکتا۔ تم نے نہیں دیکھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو شب معراج، سارا جہان دکھایا گیا مگر آپ نے کسی چیز کی طرف التفات نہ فرمایا کیونکہ آپ جمع کے ساتھ جمع تھے اور مجتمع کو مشاہدے کی تفریق جدا نہیں کر سکتی اور وہ تفرقہ کو نہیں دیکھتا اسی لئے اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

مَازَاغَ الْبَصَرُ وَمَا طَغٰی (النجم:۱۷) محبوب کی آنکھ نہ ادھر ادھر پھری اور نہ حد سے گزری۔

میں نے اس معنی میں ایک کتاب بنام "کتاب البیان لاہل العیان" شروع میں لکھ دی ہے اور کتاب "بحر القلوب" میں جمع کے بیان میں چند واضح فصلیں تحریر کر دی ہیں۔ اس جگہ اظہار حقیقت کے لئے اتنا ہی کافی ہے۔ سیاری مذہب، تصوف میں مقبول و محقق ہے۔ اب میں ان نام نہاد صوفیوں کی طرف متوجہ ہوتا ہوں جو ملحدین کا گروہ ہے اور ان کی عبارتوں کو بیان کرتا ہوں جن کو پھیلا کر وہ خود ذلیل و خوار ہوئے ہیں، اور اپنی عزت گنوائی ہے۔ ضروری ہے کہ ان کی غلطیاں ظاہر ہو جائیں اور صاحب ارادت ان کے جھوٹے دعوؤں اور ان کے مکر و فریب سے محفوظ ہو جائیں اور خود کو ان سے بچائیں۔ والامر کل بیدہٖ

(۱۱-۱۲) ملحدوں کے حلولی فرقے

حلولیوں کے دو مردود گروہ ہیں۔ جو صوفیاء کے ساتھ محبت کا دم بھرتے ہیں مگر حقیقت میں وہ اپنی گمراہی کے اندر ایک دوسرے سے بڑھ کر ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان پر رحم فرمائے۔

فَمَاذَا بَعْدَ الْحَقِّ اِلَّا الضَّلَالُ فَاَنّٰی تُصْرَفُوْنَ (یونس:۳۲) اب حق کے بعد گمراہی کے سوا کچھ نہیں تم کہا بھٹک رہے ہو۔

ایک مردود گروہ اپنا پیشوا ابو حلمان دمشقی کو بتاتا ہے اور ان کی طرف ایسی روایتیں منسوب کرتا ہے جو ان کے برخلاف ہیں جن کو مشائخ اپنی کتابوں میں ان سے منقول لکھ چکے ہیں اور مشائخ ان کو ارباب ولایت میں سے جانتے ہیں لیکن ملحد و بے دین گروہ ان کی طرف حلول و امتزاج اور نسخ ارواح کی باتیں منسوب کرتے ہیں میں نے متقدمین کی کتابوں میں ان

کے اوپر طعنوں کو پڑھا ہے اور علماء اصول بھی ان کے ساتھ اسی قسم کا برتاؤ کرتے ہیں۔صحیح حقیقتِ حال کواللہ ہی بہتر جانتا ہے۔

اور دوسرا مردود گروہ وہ ہے جو فارس کی طرف نسبت کرتا ہے۔

اور دعوٰی کرتا ہے کہ یہ حضرت حسین بن منصور کا مذہب ہے حالانکہ ان ملحدوں کے سوا حضرت حسین بن منصور کے اصحاب وتلامذہ میں سے کسی کا بھی یہ مذہب نہیں ہے۔ میں نے ابو جعفر صیدلانی کو دیکھا ہے جو چار ہزار لوگوں کے ساتھ عراق میں پھیلا ہوا ہے اور اپنے آپ کو حلاجی کہلاتا ہے۔ان کے اقوال کے سبب فارس پر تمام بزرگ لعنت کرتے ہیں حالانکہ حضرت حسین بن منصور کی مصنفات میں بجز تحقیق کے کسی قسم کی لغویت نہیں ہے۔

حضور سیدنا داتا گنج بخش رحمتہ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ میں نہیں جانتا کہ فارس اور ابوحلمان کون ہے؟ اور ان کے کیا اقوال ہیں؟ لیکن جو بھی کوئی ایسی بات کا قائل ہو جو توحید و تحقیق کے خلاف ہو دین میں اس کا کوئی حصہ نہیں ہے۔ چونکہ دین میں جو چیز اصل ہے وہ توحید وتحقیق کا استحکام ہے جبکہ وہ اس میں ہی مستحکم نہیں تو تصوف جو کہ دین کی فرع اور اس کا نچوڑ ہے بدرجہ اولیٰ خلل پذیر ہوگا اس لئے کہ ظہور کرامات کشف اور مشاہدۂ آیات الٰہیہ اہل توحید اور دینداروں کے ساتھ مخصوص ہے۔ ان باطل اقوال کے ماننے والوں کی روح میں تو سراسر غلطیاں ہی غلطیاں ہیں (انہیں دین وولایت سے کیا علاقہ) اب میں قانون سنت کے مطابق ان کے احکام اور ملحدوں کے اقوال ومغالطے اور ان کے شبہات کو بیان کرتا ہوں تاکہ تم جان سکو کہ اس میں کتنے فساد پھیلائے گئے ہیں۔ وباللہ التوفیق

روح کی بحث

واضح رہنا چاہئے کہ روح کے وجود کا علم ضروری ہے لیکن اس کی حقیقت ومعرفت میں عقل عاجز ولاچار ہے۔امت مسلمہ کے ہر عالم ودانشور نے اپنے اپنے فہم وقیاس کے موافق کچھ نہ کچھ کہا ہے اور کفار وملحدین نے بھی اس میں خامہ فرسائی کی ہے۔جس وقت کفارِ قریش

نے یہودیوں کے سکھلانے پر نضر بن حارث کو بھیجا کہ وہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے روح کی کیفیت اور اس کی ماہیت دریافت کرے تو اللہ تعالیٰ نے پہلے روح کا اثبات کرتے ہوئے فرمایا:

وَيَسْئَلُوْنَكَ عَنِ الرُّوْحِ — اے محبوب تم سے روح کے بارے میں سوال کرتے ہیں۔ (بنی اسرائیل:۸۵)

اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے روح کی قدامت کی نفی کرتے ہوئے فرمایا:

قُلِ الرُّوْحُ مِنْ اَمْرِ رَبِّیْ — اے محبوب کہہ دو کہ روح میرے رب کے حکم سے ہے۔ (بنی اسرائیل:۸۵)

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:

"اَلْاَرْوَاحُ جُنُوْدٌ مُّجَنَّدَةٌ فَمَا تَعَارَفَ مِنْهَا ائْتَلَفَ وَمَا تَنَاكَرَ مِنْهَا اخْتَلَفَ" (بخاری شریف)

روحیں لشکر پیوستہ ہیں تو جو اس کی معرفت کی کوشش کرتا ہے وقت ضائع کرتا ہے اور جو اس کا انکار کرتا ہے وہ غلطی پر ہے۔ اس قسم کے بکثرت دلائل ہیں لیکن ان میں روح کی ماہیت پر بحث نہیں کی گئی جو روح کے وجود پر کیفیت میں تصرف کے بغیر شاہد ہے چنانچہ ایک گروہ کہتا ہے کہ:

الروح هو الحيوة التي يحيى به الجسد — روح ایک زندگی ہے جس سے بدن زندہ رہتا ہے۔

متکلمین کی ایک جماعت کا بھی یہی مذہب ہے۔ اس معنی میں روح ایک عرض ہے جس سے حکم خدا کے تحت جاندار زندہ ہوتا ہے اور تالیف و حرکت کے اقسام کا اجتماع اسی سے وابستہ ہے۔ جس طرح دیگر اعراض ہوتے ہیں جو ہر شخص کو ایک حال سے دوسرے حال کی طرف لے جاتے ہیں۔ ایک اور گروہ یہ کہتا ہے کہ:

"هو غير الحيٰوة ولا يوجد الحيٰوة الا معها كمالا يوجد

الروح الامع البنیه وان لایوجد احدهمادون الأخر کالالم والعلم بها لانهما شیئان لایفترقان."

"روح زندگی کے سوا ایک شئے ہے اور زندگی اس کے بغیر نہیں پائی جاتی اور روح جسم کے بغیر نہیں پائی جاتی اور دونوں میں کوئی بھی ایک دوسرے کے بغیر نہیں پائی جاتی جیسے الم اور اس کا علم کیونکہ یہ دونوں جداگانہ شئے ہیں۔"

مطلب یہ ہے کہ حیٰوۃ کے سوا روح کا وجود علیحدہ ہے اس کا وجود بغیر حیات کے ممکن نہیں ہے جیسے کہ غیر معتدل شخص کی روح جو ایک دوسرے کے بغیر نہیں پائی جاتی مثلاً الم و تکلیف اور اس کا علم کہ یہ دونوں وجود میں تو مختلف ہیں لیکن وقوع میں ایک دوسرے سے جدا نہیں ہیں۔ اسی معنی میں اسے عرضی بھی کہا جاتا ہے جس طرح کہ حیات کہا جاتا ہے۔

جمہور مشائخ اور اکثر اہل سنت و جماعت کا مذہب یہ ہے کہ روح نہ عینی ہے نہ وصفی، اللہ تعالیٰ جب تک روح کو انسانی قالب میں رکھتا ہے تو وہ دستور کے مطابق قالب میں حیات پیدا کرتا ہے اور حیات انسانی کی صفت ہے اور وہ اسی سے زندہ رہتا ہے اور یہ کہ روح جسم انسانی میں عاریۃً ہے ممکن ہے کہ وہ انسان سے جدا ہو جائے اور حیات کے ساتھ زندہ رہے جس طرح کہ نیند کی حالت میں روح نکل جاتی ہے مگر وہ حیات کے ساتھ زندہ رہتی ہے اور یہ ممکن ہے کہ جسم سے روح نکل جانے کے وقت اس میں عقل و علم باقی رہے اس لئے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ شہداء کی روحیں سبز پرندوں کی شکل میں ہوتی ہیں۔ یقیناً اس سے یہ لازم آتا ہے کہ روح عینی ہے۔ نیز آپ نے فرمایا "الارواح جنود مجندۃ" روحیں صف بستہ لشکر ہیں لامحالہ جنود باقی ہوتا ہے اور عرض پر بقا جائز نہیں اور نہ عرض از خود قائم ہو سکتا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ روح ایک جسم لطیف ہے جو اللہ تعالیٰ کے حکم سے آتی جاتی ہے۔ نبی کریم علیہ التحیۃ والتسلیم فرماتے ہیں کہ شب معراج میں نے حضرت آدم علیہ السلام صفی اللہ، یوسف صدیق، موسیٰ کلیم اللہ، ہارون حلیم اللہ، عیسیٰ روح اللہ اور حضرت ابراہیم خلیل اللہ علیہم

السلام کو آسمانوں پر دیکھا۔ بلاشبہ وہ ان کی ارواحِ مقدسہ تھیں۔ اگر روح شئے عرضی ہوتی تو از خود قائم نہ ہوتی اور اسے ہستی و وجود کی حالت میں نہیں دیکھا جا سکتا تھا اگر وہ عرضی ہوتی تو اس کے وجود کے لئے کوئی مقام درکار ہوتا تاکہ عارض اس مقام میں قیام کرے اور وہ مقام اس کا جوہر ہوتا اور جواہر مرکب و کثیف ہوتے ہیں۔ معلوم ہوا کہ روح کے لئے جسم لطیف ہے جبکہ وہ صاحب جسم ہے تو اس کا دیکھنا بھی ممکن ہے خواہ دل کی آنکھ سے ممکن ہو یا سبز پرندوں کی شکل میں یا صف بستہ لشکری کی صورت میں؟ جن سے وہ آئیں اور جائیں اس پر حدیثیں شاہد ہیں اور حق تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ:

قُلِ الرُّوْحُ مِنْ اَمْرِ رَبِّیْ — اے محبوب تم کہہ دو کہ روح میرے رب کے حکم سے ہے۔ (بنی اسرائیل:۸۵)

اب بے دینوں کے ایک اختلاف کا بیان اور باقی ہے وہ یہ کہ وہ روح کو قدیم کہتے اور اس کو پوجتے ہیں۔ اشیاء کا فاعل اور ان کا مدبر اسی کو جانتے ہیں۔ وہ ارواح کو آلہ کہتے اور اسے ہمیشہ مدبر سمجھتے اور ایک سے دوسرے کی طرف الٹنے پلٹنے والا جانتے ہیں (گویا وہ آواگون اور تناسخ کے قائل ہیں) ان لوگوں نے عوام میں جس قدر شبہات پھیلائے ہیں کسی نے اتنے نہیں پھیلائے اور نصاریٰ کا مذہب اسی پر ہے اگرچہ ان کی ظاہری عبارتیں اس کے برخلاف ہیں اور تمام اہل ہنود تبت و چین اور ماچین کے لوگ بھی اسی کے قائل ہیں۔ گروہ شیعہ، قرامطہ اور باطنی لوگ بھی اس کے قائل ہیں اور یہ دونوں مردود و باطل گروہ بھی انہیں خیالات فاسدہ کے قائل ہیں اور ہر گروہ اسے مقدم جانتا اور دلائل پیش کرتا ہے۔ ہم ان کے تمام دعووں میں سے صرف لفظ قِدم کے بارے میں سوال کرتے ہیں کہ اس سے تمہاری کیا مراد ہے؟ کیا شئی محدث اپنے وجود میں متقدم ہے یا ہمیشہ قدیم۔

اگر وہ یہ کہیں کہ ہماری مراد، محدث، وجود میں متقدم ہے تو اس بنیاد پر اصل سے اختلاف ہی جاتا رہتا ہے کیونکہ ہم بھی روح کو محدِث کہتے ہیں یا یہ کہ اس شخص کے وجود پر روح کا وجود متقدم ہے کیونکہ سید عالم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ:

اِنَّ اللّٰہَ تَعَالٰی خَلَقَ الْاَرْوَاحَ قَبْلَ الْاَجْسَادِ بِمَأَتَیْ اَلْفِ عَامٍ — اللہ تعالیٰ نے اجسام کی تخلیق سے دو لاکھ برس قبل ارواح کو پیدا فرمایا۔

چونکہ ارواح کا محدث ہونا صحیح ہے تو لامحالہ محدث کے ساتھ جو محدث ہو وہ بھی محدث ہوتا ہے اور دونوں ایک جنس کے ہوتے ہیں اور اللہ تعالیٰ نے تخلیق میں ایک کو دوسرے کے ساتھ ملایا ہے اور اس اتصال سے اللہ تعالیٰ نے اپنی قدرت سے حیات پیدا فرمائی ہے۔ مطلب یہ کہ تخلیق میں روح ایک جدا جنس ہے اور اجسام ایک جنس جداگانہ۔ اللہ تعالیٰ جب کسی کو حیات عطا فرماتا ہے تو روح کو جسم کے ساتھ ملنے کا حکم دیتا ہے اور اس سے زندگانی حاصل ہو جاتی ہے البتہ ایک جسم سے دوسرے جسم کی طرف روح کا منتقل ہونا جائز نہیں ہے اس لئے کہ جب ایک جسم کے لئے دو قسم کی حیات جائز نہیں تو ایک روح کے لئے دو مختلف جسم یا وجود بھی جائز نہیں۔ اگر اس پر احادیث ناطق نہ ہوتیں اور حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اپنے ارشاد میں صادق نہ ہوتے ازروئے عقل، صرف معقول روح، حیات کے بغیر نہ ہوتی اور وہ صفتی ہوتی عینی نہ ہوتی۔

اگر یہ ملحدین یہ کہیں کہ قِدم سے مراد قدیم و دوام ہے تو ہم دریافت کرتے ہیں کہ یہ ازخود قائم ہے یا کسی دوسرے کے ساتھ؟ اگر یہ کہیں کہ قائم بنفسہٖ ہے تو ہم دریافت کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ اس کا جاننے والا ہے یا نہیں؟ اگر کہیں کہ اللہ تعالیٰ اس کا جاننے والا نہیں ہے تو دوسرا قدیم ثابت ہوتا ہے اور یہ عقلاً محال ہے کیونکہ قدیم محدود نہیں ہوتا حالانکہ ایک ذات کا وجود دوسرے کی ضد ہوتی ہے اور یہ محال ہے۔ اگر کہیں کہ اللہ تعالیٰ اس کا جاننے والا ہے تو ہم جواب دیں گے کہ وہ تو قدیم ہے اور مخلوق محدث اور یہ محل ہے کہ محدث کا قدیم کے ساتھ امتزاج ہو یا اتحاد و حلول یا محدث قدیم کی جگہ ہو یا قدیم محدث کی جگہ اور جب ایک دوسرے سے ملایا جائے گا تو دونوں ایک ہو جائیں گی اور جدائی محدثات کے سوا جائز نہیں کیونکہ جنسیں مختلف ہیں۔ تعالیٰ اللہ عن ذالك علوا کبیرا

اور اگر یہ کہیں کہ وہ قائم بنفسہٖ نہیں ہے اور اس کا قیام غیر کے ساتھ ہے تو یہ صورت دو حال سے خالی نہیں یا تو وہ صفتی ہوگا یا عرضی۔ اگر عرضی کہیں تو لامحالہ اسے یا کسی محل میں کہیں گے یا

لامحل میں۔ اگر اسے محل میں کہیں تو وہ محل بھی اس کی مانند ہوگا اور قِدم کا نام ہر ایک سے باطل ہو جائے گا اور اگر لامحل میں کہیں تو یہ محال ہے جبکہ عرض خود ہی قائم بنفسہٖ نہیں تو لامحل میں کس طرح متصور ہوگا اور اگر کہیں کہ صفت قدیم ہے جیسے کہ حلول و تناسخ والے کہتے ہیں اور وہ صفت کو حق تعالیٰ کی صفت کہتے ہیں تو یہ بھی محال ہے کہ حق تعالیٰ کی قدیم صفت کسی مخلوق کی صفت بن جائے اور اگر یہ جائز ہو کہ خدا کی حیات مخلوق کی صفت ہو جائے تو یہ بھی جائز ہوگا کہ اس کی قدرت مخلوق کی قدرت ہو جائے۔ اس طرح صفت موصوف کے ساتھ قائم ہو جائے۔ لہٰذا یہ کیسے جائز ہو سکتا ہے کہ قدیم صفت کے لئے حادث موصوف ہو لامحالہ قدیم کو حادث سے کوئی تعلق نہ ہوگا۔ بہر طور اس بارے میں ملحدوں کا قول باطل ہے۔

فرمانِ الٰہی کے موافق روح مخلوق ہے جو اس کے خلاف کہے گا وہ کھلا مکابرہ ہے اور وہ حادث و قدیم کا فرق نہیں جانتا اور ولی کے لئے یہ کسی طور پر جائز نہیں ہے کہ وہ صحتِ ولایت کے ساتھ حق تعالیٰ کے اوصاف سے بے بہرہ ہو۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل و کرم سے ہمیں بدعت و ضلالت اور وسواس شیطانی سے محفوظ کر کے عقل سلیم عطا فرمائی ہے جس کے ذریعہ غور و فکر اور استدلال کرتے ہیں اور بحمدہٖ تعالیٰ اس نے ہمیں دولت ایمان سے سرفراز فرمایا ہے جس سے ہم اسے پہنچانتے ہیں۔ وہ حمد ہی کیا جو حمد اپنی غایت کو نہ پہنچے کیونکہ نامتناہی نعمتوں کے مقابلہ میں حمد متناہی ہوتی ہے وہ نامقبول ہوتی ہے جب اہل ظواہر نے ارباب اصول سے اس قسم کی باتیں سنیں تو گمان کرنے لگے کہ تمام صوفیاء کا ایسا ہی اعتقاد ہوگا اس لئے وہ ان نیکوکار بزرگوں کے بارے میں کھلے نقصان اور ان کے جمال سے محجوب ہو گئے اور وہ ولایت حق کے لطائف اور شعلہ ہائے رموزِ ربانی کے ظہور سے پوشیدہ رہ گئے اس لئے اکابر سادات کی راہوں سے برگشتہ ہونا اور انہیں رد کرنا ان کے قبول کرنے کی مانند اور ان کا قبول کرنا ان کے رد کرنے کی مانند ہوتا ہے۔ واللہ اعلم۔

روح کے بارے میں اقوالِ مشائخ

ایک بزرگ فرماتے ہیں کہ:

الروح فی الجسد کالنار فی الحطب فالنار مخلوقة والفحم مصنوعة	جسم میں روح، لکڑی میں آگ کی مانند ہے آگ مخلوق ہے اور کوئلہ مصنوع۔

اللہ تعالیٰ کی ذات وصفات کے سوا کسی چیز کا قدیم ہونا باطل ہے۔

حضرت ابوبکر واسطی رحمۃ اللہ علیہ نے روح کے بارے میں مفصل بحث کی ہے وہ فرماتے ہیں کہ:

الارواح علی عشر مقامات	دس مقامات پر روحیں قائم ہیں۔

(۱) مفسدوں کی روحیں تاریکی میں مقید ہیں......اور جانتی ہیں کہ ان کے ساتھ کیا ہوگا۔

(۲) نیک ومتقی حضرات کے جسموں کی روحیں آسمان کے نیچے اعمال صالحہ کے باعث خوش اور طاعت الٰہی میں مسرور ہو کر اس کی طاقت سے چلتی ہیں۔

(۳) محسنین کے جسموں کی روح نورانی قندیلوں میں عرشِ الٰہی سے آویزاں ہیں جن کی غذا محبت اور ان کا پانی شرابِ لطف وقربتِ ربانی ہے۔

(۴) مریدین کے جسموں کی روح کا مسکن چوتھے آسمان پر ہے وہاں صدق کی لذت پاتے ہیں اور اپنے اعمال کے سایہ میں فرشتوں کے ساتھ ہیں۔

(۵) اہل وفا کے جسموں کی روح حجابِ صفا اور مقام اصطفا میں خوش ہے۔

(۶) شہداء کے جسموں کی ارواح سبز پرندوں کے قالب میں جنت اور اس کے باغوں میں رہتی ہیں وہ جہاں چاہیں اور جب چاہیں جائیں۔

(۷) مشتاقوں کے جسموں کی ارواح ادب کے فرش پر انوار صفات کے پردوں میں قیام کرتی ہیں۔

(۸) عارفوں کے جسموں کی روحیں قدس کے توشک میں صبح وشام کلامِ الٰہی کی سماعت کرتی ہیں اور وہ دنیا اور جنت میں اپنے مساکن کو ملاحظہ کرتی ہیں۔

(۹) محبوبوں اور دوستوں کے جسموں کی ارواح مشاہدۂ جمالِ الٰہی اور مقام کشف میں محو ہیں اس کے سوا وہ کسی چیز کی خبر نہیں رکھتیں اور نہ کسی سے انہیں بجز اس کے چین و راحت ملتی ہے۔

(۱۰) درویشوں کے جسموں کی روحیں محلِ فنا میں مقرب ہو کر اور اپنی صفات کو بدل کر احوال میں متغیر ہوتی ہیں۔

اربابِ طریقت بیان کرتے ہیں کہ مشائخ نے ہر ایک کو ان کی جداگانہ صورتوں میں دیکھا ہے اور یہ دیکھنا جائز ہے۔ ہم بتا چکے ہیں کہ وہ موجود ہیں اور ان کے اجسام لطیف ہیں ان کو دیکھا جا سکتا ہے اور اللہ تعالیٰ جب چاہے اور جس طرح چاہے اپنے کسی بندے کو دکھا دیتا ہے۔

حضور سیدنا داتا گنج بخش رحمتہ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ میری زندگانی ہر حال میں حق تعالیٰ کے ساتھ ہے اور اسی سے قیام بھی ہے اور ہمیں زندہ رکھنا حق تعالیٰ کا فعل ہے۔ ہمارا وجود اور ہماری حیات سب اسی کی پیدا کردہ ہے اس کی ذات وصفات سے نہیں ہیں۔ حلولیوں کا قول سراسر باطل ہے اور وہ بہت بڑی گمراہی ہے ان کا پہلا باطل قول یہ ہے کہ وہ روح کو قدیم کہتے ہیں اگرچہ ان کی عبارتیں مختلف ہیں لیکن ان کے مفہوم یکساں ہیں، اور ان کا ایک گروہ نفس و ہیولیٰ کہتا ہے اور ایک گروہ نور وظلمت کہتا ہے اور اس طریقت کو باطل ٹھہرانے والے لوگ اسے یا تو فنا اور بقا کہتے ہیں یا جمع وتفرقہ وغیرہ اس قسم کی بیہودہ باتیں گھڑلی ہیں اور اپنے اس کفر کی داد چاہتے ہیں۔ صوفیاء کرام ایسے گمراہ گروہوں سے بے زار اور متنفر ہیں کیونکہ اثباتِ ولایت اور محبت الٰہی کی حقیقت بجز معرفت الٰہی کے درست نہیں ہو سکتی اور جب کوئی قدیم کو محدث سے جدا کر کے پہچان نہ سکے اس بارے میں وہ جو کچھ کہے گا وہ جہالت پر مبنی ہوگا۔ عقلمند جاہلوں کی باتوں کی طرف التفات نہیں کرتے میں نے ان دونوں مردود گروہوں کا مقصد اور ان کا بطلان واضح کر دیا ہے اگر

مزید علم کی خواہش ہو تو میری دیگر تصانیف کی طرف رجوع کریں۔ میں اس کتاب کو طول دینا نہیں چاہتا۔

اب میں طریقت و تصوف کے حجابات کا کشف اور معاملات و حقائق کے ابواب کو روشن دلائل کے ساتھ بیان کرتا ہوں تا کہ آسان طریقہ سے مقصود کا علم ہو سکے اور منکرین کے لئے سامان بصیرت فراہم ہو جائے اور یہ انکار سے باز آ جائیں اس طرح مجھے دعا و ثواب حاصل ہو جائے۔

پہلا کشف، معرفتِ الٰہی میں

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ:

وَمَا قَدَرُوا اللّٰهَ حَقَّ قَدْرِهٖٓ (الانعام:۹۱)

انہوں نے اللہ تعالیٰ کی قدر نہ جانی جیسا کہ اس کی قدر کا حق ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ:

لَوْعَرَفْتُمُ اللّٰهَ حَقَّ مَعْرِفَتِهٖ لَمَشَيْتُمْ عَلَى الْبُحُوْرِ وَالَزَالَتْ بِدُعَائِكُمُ الْجِبَالُ

اگر تمہیں اللہ تعالیٰ کی معرفت کما حقہ حاصل ہوتی تو تم دریاؤں پر خشک قدم چلتے اور تمہاری دعاؤں سے پہاڑ اپنی جگہ سے ٹل جاتے۔

معرفت کی اقسام:

معرفت الٰہی کی دو قسمیں ہیں ایک علمی دوسری حالی۔ معرفت علمی تو دنیا و آخرت کی تمام نیکیوں کی جڑ ہے جو بندے کے لئے ہمہ وقت اور ہر حالت میں تمام چیزوں سے زیادہ بہتر ہے۔

معرفت علمی کے دلائل:

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِيَعْبُدُوْنِ (اَیْ لِیَعْرِفُوْنَ) (الذّٰریٰت:٥٦)

ہم نے جن وانس کو اپنی معرفت ہی کے لئے پیدا کیا ہے مگر اکثر لوگ اس سے ناواقف اور روگرداں ہیں۔

لیکن وہ حضرات جن کو اللہ تعالیٰ نے برگزیدہ فرما کر دنیاوی تاریکیوں سے محفوظ رکھا اور ان کے دلوں کو زندہ وتابندہ بنایا ان میں سے ایک حضرت عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ کے حال کی خبر دیتے ہوئے حق تعالیٰ نے فرمایا:

وَجَعَلْنَا لَهٗ نُوْرًا يَّمْشِىْ بِهٖ فِى النَّاسِ يَعْنِىْ عُمَرَ

اور ہم نے ان کے لئے نور مقرر کیا جس کے ساتھ وہ لوگوں میں چلتے ہیں یعنی حضرت عمر رضی اللہ عنہ۔

اور اللہ تعالیٰ نے جن کے دلوں پر مہر لگائی اور دنیاوی تاریکیوں میں مبتلا کیا ان میں سے ایک ابوجہل لعین کے حال کی خبر دیتے ہوئے حق تعالیٰ نے فرمایا ہے:

كَمَنْ مَّثَلُهٗ فِى الظُّلُمَاتِ لَيْسَ بِخَارِجٍ مِّنْهَا يَعْنِىْ اَبُوْ جَهْلٍ (الانعام:١٢٢)

کون ہے اس کی مثل جو تاریکیوں میں ہے جو کبھی اس سے نکلتا ہی نہیں۔ یعنی ابوجہل لعنۃ اللہ علیہ

لہٰذا معرفت کی حقیقت یہ ہے کہ دل اللہ تعالیٰ کے ساتھ زندہ ہو اور اس کا باطن ماسوٰی اللہ سے خالی ہو اور ہر ایک کی قدر و منزلت معرفت سے ہے اور جسے معرفت نہیں وہ بے قیمت ہے اسی لئے تمام علماء وفقہا، علم کی صحت اور درستگی کو معرفتِ الٰہی کے ساتھ موسوم کرتے ہیں اور تمام مشائخ طریقت، حال کی صحت اور اس کی درستگی کو معرفتِ الٰہی سے تعبیر کرتے ہیں اسی بنا پر وہ معرفت کو علم سے افضل کہتے ہیں کیونکہ صحتِ حال، صحت علم کے بغیر ممکن نہیں اور صحت علم کے لئے صحت حال لازمی ہے مطلب یہ ہے کہ بندہ اس وقت تک عارف نہیں ہوسکتا جب تک کہ عالم بحق نہ ہو البتہ عالم کے لئے یہ ممکن ہے کہ وہ عارف نہ ہو جو لوگ اس معنی اور حقیقت سے واقف اور بے خبر ہیں خواہ کسی طبقہ سے متعلق ہوں ان سے مناظرہ کرنا بے فائدہ ہے یہی وہ

لوگ ہیں جو طریقت کے منکر ہیں اور طبقہ صوفیاء ان سے جدا ہے۔ اس اجمال کے بعد اب میں اس مسئلہ کے اسرار واضح کرتا ہوں تا کہ دونوں طبقوں کو فائدہ پہنچے۔

معرفت میں نظریاتی اختلاف:

اے عزیز واضح ہو کہ معرفتِ الٰہی اور اس کے علم کی صحت کے متعلق لوگوں میں بہت اختلاف ہے چنانچہ معتزلہ کہتے ہیں کہ خدا کی معرفت عقلی ہے عاقل کے سوا اس کی معرفت جائز نہیں یہ قول باطل ہے اس لئے کہ وہ دیوانے جو دارالاسلام میں ہوں ان کے لئے حکمی معرفت ہے اسی طرح وہ بچے جو عاقل نہیں ان کے لئے حکمی ایمان ہے۔ اگر حکم معرفت میں عقل شرط ہوتی تو جنہیں عقل نہیں وہ معرفت کے حکم میں نہ ہوتے اور کافروں میں چونکہ عقل ہے تو ان پر کفر نہ ہوتا اور اگر معرفت کے لئے عقل علت ہوتی تو ہر عاقل کو عارف کہا جاتا اور ہر بے عقل کو جاہل یہ کھلا مکابرہ ہے۔

ایک گروہ کہتا ہے کہ حق تعالیٰ کی معرفت کی علت استدلال ہے اور جس میں استدلال کی استعداد نہ ہو اس کے لئے یہ جائز نہیں یہ قول بھی ابلیس کی مثال سے باطل ٹھہرتا ہے اس لئے کہ ابلیس نے بکثرت نشانیاں اور آیات الٰہیہ دیکھیں مثلاً جنت، دوزخ، عرش و کرسی، وغیرہ لیکن اس کے لئے ان کی دید بھی معرفت کی علت نہ بنی اور اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

وَلَوْ اَنَّنَا نَزَّلْنَآ اِلَيْهِمُ الْمَلٰٓئِكَةَ وَكَلَّمَهُمُ الْمَوْتٰى وَحَشَرْنَا عَلَيْهِمْ كُلَّ شَيْءٍ قُبُلًا مَّا كَانُوْا لِيُؤْمِنُوْٓا اِلَّآ اَنْ يَّشَآءَ اللّٰهُ (الانعام:111)	اگر ہم فرشتوں کو کفار کے پاس بھیجتے اور مردے ان سے کلام کرتے اور ان کے سامنے ہر چیز کو اٹھاتے جب بھی وہ ہرگز ایمان لانے والے نہ تھے مگر جسے اللہ چاہے۔

اگر آیاتِ الٰہیہ کی دید اور ان کا استدلال معرفتِ حق کی علت ہوتی تو اللہ تعالیٰ معرفت کی علت انہیں قرار دیتا نہ کہ اپنی مشیت کو۔

اہل سنت و جماعت کے نزدیک، صحت عقل اور رویتِ آیاتِ الٰہیہ معرفت کا سبب

ہے نہ کہ اس کی علت، اور یہ یاد رکھنا چاہئے کہ معرفت کی علت، بجز عنایتِ الٰہی اور اس کی مشیت کے کچھ نہیں ہے کیونکہ بغیر عنایت الٰہی عقل اندھی ہوتی ہے کیونکہ عقل بجائے خود جاہل ہے۔ بکثرت عقلاء نے حق تعالیٰ کی حقیقت کو نہ جانا جبکہ عقل بجائے خود جاہل ہے تو بغیر عنایت الٰہی وہ اپنے غیر کو کس طرح جانے گی؟ اسی طرح آیات الٰہیہ کی رویت میں تفکر و استدلال بھی خطا ہے کیونکہ اہل ہوا اور ملحدوں کی جماعت استدلال ہی کرنے والے ہوتے ہیں بایں ہمہ وہ عرفان سے محروم رہتے ہیں۔ پھر یہ کہ جو عنایت الٰہی سے اہل عرفان ہیں ان کی تمام حرکتیں معرفت کی علامت ہیں اور ان کا استدلال اور ان کا ترک وطلب سب مسلم ہے اور صحت معرفت میں تسلیم طلب سے افضل نہیں ہے کیونکہ طلب ایسی اصل اور بنیاد ہے جس کا ترک جائز نہیں ہے اور تسلیم ایسی اصل اور بنیاد ہے کہ اس میں اضطراب جائز نہیں ہے اور ان دونوں کے لئے معرفت حقیقت نہیں ہے لیکن یہ بھی ملحوظ رہنا چاہئے کہ حقیقت میں بندے کے دل کو کھولنے والا اور اس کی رہنمائی کرنے والا حق تعالیٰ کے سوا کوئی نہیں ہے۔ محض عقل و دلائل، ہدایت کی قدرت نہیں رکھتے اور دلیل اس سے زیادہ واضح نہیں ہوتی۔ حق تعالیٰ فرماتا ہے:

وَلَوْرُدُّوْا لَعَادُوْا لِمَا نُهُوْا — اگر انہیں لوٹائیں تو یقیناً وہ اسی طرف پلٹیں گے جس سے انہیں روکا گیا ہے۔ (الانعام:۲۸)

مطلب یہ ہے کہ اگر کافروں کو قیامت کے بعد دوبارہ دنیا میں بھیجا جائے تو پھر وہ اپنے اسی کفر میں آلودہ ہو جائیں گے جس سے انہیں منع کیا گیا ہے۔

حضرت علی مرتضٰی کرم اللہ وجہہ سے جس وقت معرفت کے بارے میں دریافت کیا گیا تو آپ نے فرمایا:

عَرَفْتُ اللّٰهَ بِاللّٰهِ وَعَرَفْتُ مَادُوْنَ اللّٰهِ بِنُوْرِ اللّٰهِ — میں نے خدا کو اس کی مدد سے پہچانا اور ماسوٰی اللہ کو اسی کے نور سے جانا۔

چونکہ اللہ تعالیٰ نے جسم کو پیدا کر کے اس کی حیات کو روح کے حوالہ کر دیا لیکن دل کو پیدا کر کے اس کی حیات کو اپنے قبضہ میں رکھا۔ ظاہر ہے کہ جب عقل اور آیات کو جسم کے زندہ

کرنے کی قدرت نہیں دی تو محال ہے کہ وہ دل کو زندہ کر سکے چنانچہ ارشاد حق تعالیٰ ہے کہ:

اَوَمَنْ كَانَ مَيْتاً فَاَحْيَيْنَاهُ — جو شخص مردہ تھا اسے ہم نے زندہ کیا۔
(الانعام:۱۲۲)

اس فرمان میں ہر قسم کی زندگانی کا اپنے قبضہ میں ہونا بیان فرمایا ہے۔ پھر ارشاد ہوتا ہے:

وَجَعَلْنَا لَهٗ نُوْرًا يَّمْشِيْ بِهٖ فِي النَّاسِ (الانعام:۱۲۲) — اور ہم نے اس کے لئے نور مقرر کیا جس کے ساتھ وہ چلتا ہے۔

مطلب یہ ہے کہ ایسے نور کا پیدا کرنے والا جس کی روشنی میں مسلمان چلیں وہ میں ہوں اور یہ بھی فرمایا کہ:

اَفَمَنْ شَرَحَ اللّٰهُ صَدْرَهٗ لِلْاِسْلَامِ فَهُوَ عَلٰى نُوْرٍ مِّنْ رَّبِّهٖ (الزمر:۲۲) — کیا اللہ تعالیٰ نے اسلام کے لئے جس کا سینہ کھولا۔ تو وہ اپنے رب کے نور پر ہے۔

اس ارشاد میں بتایا گیا ہے کہ دل کی کشادگی اللہ تعالیٰ کے قبضۂ اختیار میں ہے اسی طرح اس کی بندش بھی اسی کے قبضۂ اختیار میں ہے۔ دل کے قبض کے سلسلہ میں فرمایا ہے:

خَتَمَ اللّٰهُ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ وَعَلٰى سَمْعِهِمْ وَعَلٰى اَبْصَارِهِمْ غِشَاوَةٌ (البقرہ:۷) — اللہ نے ان کے دلوں پر اور ان کے کانوں پر مہر لگا دی ہے اور ان کی آنکھوں پر پردہ ہے۔

اور فرمایا:

وَلَا تُطِعْ مَنْ اَغْفَلْنَا قَلْبَهٗ عَنْ ذِكْرِنَا (الکہف:۲۸) — (اے سننے والے) اس کی پیروی نہ کرنا جس کے دل کو ہم نے اپنے ذکر سے غافل کر دیا ہے۔

جبکہ دل کا قبض و بسط اور اس کا ختم و شرح، اللہ تعالیٰ کے قبضۂ اختیار میں ہے تو محال ہے کہ اس کے سوا کسی غیر کو رہنما بنایا جائے اور اللہ تعالیٰ کے سوا جو کچھ ہے وہ سب علت اور سبب

ہے۔ ہرگز علت وسبب بغیر مسبب یعنی خدا کے راہ نہیں دکھا سکتا کیونکہ حجاب راہزن ہوتا ہے نہ کہ راہبر اللہ تعالیٰ یہ بھی فرماتا ہے کہ:

وَلٰكِنَّ اللّٰهَ حَبَّبَ اِلَيْكُمُ الْاِيْمَانَ وَزَيَّنَهٗ فِيْ قُلُوْبِكُمْ (الحجرات:۷)

لیکن اللہ تعالیٰ ہی ہے جس نے تمہیں ایمان کی محبت دی اور اسی نے تمہارے دلوں کو اس سے مزین فرمایا۔

اس ارشاد میں حق تعالیٰ نے دل کی تزئین اور محبت جاگزیں کرنے کی نسبت اللہ تعالیٰ نے اپنی طرف فرمائی ہے۔ تقویٰ اور خدا کی محبت میں قائم رہنا جو کہ عین معرفت ہے اسی کی جانب سے ہے اور ملزم کو اپنے الزام میں اس حالت کو اپنے سے جدا کرنے یا اپنی طرف لانے کا کوئی اختیار حاصل نہیں ہے۔ لہٰذا جب تک اللہ تعالیٰ خود اپنی معرفت نہ کرائے لوگوں کے نصیب میں ہرگز اس کی معرفت ممکن نہیں ہے۔ مخلوق حصول معرفت الٰہی میں عاجز ہے۔ حضرت ابوالحسن نوری رحمتہ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ:

لا دلیل علی اللّٰہ سواہ انما العلم یطلب لآداب الخدمة

اللہ تعالیٰ پر اس کے سوا کوئی دلیل ورہنما نہیں علم تو خدمت (عبادت) کا طریقہ سیکھنے کے لئے حاصل کرتے ہیں۔

مطلب یہ کہ کسی مخلوق کو یہ طاقت نہیں ہے کہ وہ بندے کو خدا تک پہنچا دے۔ استدلال کرنے والا، حضرت ابوطالب سے بڑھ کر عاقل نہ ہوگا اور حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے زیادہ بزرگ کوئی دلیل نہ ہوگی جبکہ حضرت ابوطالب کو شقاوت پر اجرا کا حکم تھا تو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی دلالت انہیں فائدہ نہ پہنچا سکی۔ استدلال کی خرابیوں میں سے پہلا درجہ یہ کہ مستدل، حق تعالیٰ کی توفیق وعنایت سے روگرداں ہوتا ہے کیونکہ ! قت استدلال وہ غیر خدا پر غور وفکر کرتا ہے حالانکہ معرفت کی حقیقت تو یہ ہے کہ وہ غیر خدا ۔ ، روگرداں ہو اور دلائل کی جستجو کرنے والوں کی عادت استدلال کے سلسلے میں یہی ہے اور حق کی معرفت کے خلاف ہے لہٰذا جب معرفتِ الٰہی، بجز دوامی حیرانی عقل نہیں تو عنایتِ الٰہی کو پنی طرف متوجہ کرنا بندے کے

لئے اپنے اختیار میں کیسے ہوگا؟ کیونکہ اس راہ میں مخلوق کے کسب و اختیار کو کوئی دخل ہے ہی نہیں اور خدا کے سوا بندے کی دلالت کرنے والا اور کوئی نہیں ہے۔ رہا شرح صدر اور کشادگی قلب کا معاملہ، تو یہ غیبی خزانوں سے متعلق ہے اس لئے کہ جو کچھ خدا کے سوا ہے وہ سب حادث ہے اور اپنے جیسوں تک تو پہنچ سکتا ہے لیکن اپنے پیدا کرنے والا تک (خدا کی عنایت کے بغیر) نہیں پہنچ سکتا باوجود یہ کہ اس کا کسب و اختیار بھی اسی کا پیدا کردہ ہے لیکن جب وہ کسی کے تحت آجاتا ہے تو کسب کاسِب غالب ہو جاتا ہے اور حاصل شدہ مغلوب لہٰذا اس میں عزت نہیں کہ عقل انسانی، فعل کی دلالت سے فاعل کی ہستی کا اثبات کرے بلکہ عزت و کرامت اس میں ہے کہ وہ حق تعالیٰ کے نور سے اپنی ہستی کی نفی کرے۔ اول شخص کو معرفتِ قولی حاصل ہے اور دوسرے کو معرفتِ حالی۔

لیکن وہ گروہ جو عقل کو معرفت کی علت جانتا ہے اس سے کہو کہ تمہارے دل میں عین معرفت سے کیا چیز ثابت ہوتی ہے؟ کیونکہ جو کچھ عقل ثابت کرتی ہے معرفت اس کی نفی کا اقتضاء کرتی ہے مطلب یہ کہ دلالت عقلی کے ذریعہ دل میں جو خدا کی صورت بندھتی ہے کہ خدا ایسا ہے اس کی حقیقت اس کے برخلاف ہے لہٰذا عقل کو کہاں قدرت ہے کہ استدلال کے ذریعہ خدا کی معرفت حاصل کرلے اس لئے کہ عقل و وہم دونوں ہم جنس ہیں جہاں جنس ثابت ہوتی ہے وہاں معرفت کی نفی ہوتی ہے لہٰذا استدلال عقلی سے تشبیہ کا اثبات ہوتا ہے اور اس کی نفی سے تعطیل۔ عقل کی رسائی انہیں دونوں قاعدوں تک ہے اور یہ دونوں معرفت کے لئے بیکار ہیں۔ کیونکہ مشبّہ اور معطلہ موحد نہیں ہوتے عقل کی رسائی وہیں تک ہے جہاں تک اس کا امکان ہے اور جو کچھ اس سے نمودار ہوتا ہے وہ سب امکان یعنی حادث و مخلوق ہے۔

اللہ تعالیٰ کے دوستوں کے لئے اس کے سوا کوئی چارہ نہ تھا کہ وہ جستجو و تلاش کریں لامحالہ وہ خدا کے حضور میں حاضر ہو کر بغیر کسی علت و سبب کے آکھڑے ہوئے اور اپنے آرام میں بے آرام ہو کر آہ و زاری کے ساتھ ہاتھ پھیلا دئے اور اپنے زخم دل کے لئے مرہم مانگنے لگے کیونکہ ان کی راہ، اپنی قدرت و طلب کے اقسام سے ناواقف تھی تب قدرت حق اس جگہ ان

کی طاقت بنی اور اس طرح وہ اس تک رسائی پا گئے اور غیبت کی تکلیف سے نجات حاصل کی محبت کے باغ میں جگہ بنا کر آرام کرنے لگے اور ان کی روح میں سرور پیدا ہوا۔ جب عقل نے دلوں کو فائز المرام دیکھا تو اس نے اپنا تصرف ظاہر کرنا چاہا مگر اس نے دخل نہ پایا تو تھک ہار کر بیٹھ گئی اور متحیر و پریشان ہوگئی جب حیرت و پریشانی کا استیلاء ہوا تو عقل معزول ہوگئی اور جب عقل معزول ہوئی تو حق تعالیٰ نے خدمت کا لباس عطا کر کے فرمایا اے عقل جب تک تو باخود تھی اس وقت تک اپنے تصرف و اسباب کے ساتھ محجوب تھی جب تیرے آلاتِ تصرف فانی ہوگئے اور تو تنہا رہ گئی جیسے کہ پہلے تھی تب تو نے رسائی حاصل کی اس طرح دل کو قربت اور عقل کو خدمت نصیب ہوئی۔ چونکہ اپنی معرفت کے اندر معرفت پنہاں تھی جب اپنی معرفت ہوگئی تو اللہ تعالیٰ نے بندے کو اپنا عرفان عطا کر کے منزل عرفان سے روشناس کرایا تا کہ بندہ عرفان سے معرفت الٰہی کو پہچانے نہ کہ اسباب کے ذریعہ بلکہ اس کی شناخت اس وجود کے ذریعہ ہے جو اسے عطا کیا گیا ہے یہاں تک کہ عارف کی انانیت مکمل طور پر فانی ہو کر اس کا ذکر بغیر نسیان کے اور اس کا حال بغیر تقصیر کے بن گیا اب اس کی معرفت حال ہے نہ کہ گفتار۔

ایک گروہ کہتا ہے کہ معرفتِ الٰہی الہامی ہے حالانکہ یہ بھی محال ہے اس لئے کہ معرفت کے لئے صادق و کاذب ہر طرح کی دلیلیں ہو سکتی ہیں اور الہام والوں کے لئے خطا و صواب پر محتمل دلیل نہیں ہوتی اس لئے کہ ایک کہے گا مجھے الہام ہوا ہے کہ خدا مکان میں ہے اور دوسرا کہے گا کہ مجھے الہام ہوا ہے کہ اس کے لئے مکاں نہیں ہے لامحالہ ان دونوں مختلف دعووں میں ایک ہی حق پر ہو سکتا ہے حالانکہ دونوں ہی الہام کے مدعی ہیں یقیناً اس کے فیصلہ کے لئے کوئی ایسی دلیل درکار ہوگی جس سے صدق و کذب کے درمیان فرق ظاہر ہو جائے اور یہ دونوں مدعی جان لیں کہ الہامی حکم باطل ہے یہ قول برہمنوں کا ہے میں نے ایسے لوگوں کو دیکھا ہے جو الہام کے مدعی ہیں اور اس میں بہت غلو کرتے ہیں اور اپنے حالات کی نسبت مردانِ پارسا کی طرح کرتے ہیں حالانکہ ایسے لوگ گمراہی پر ہیں۔ ان کی باتیں نہ صرف مسلمانوں کے خلاف ہیں بلکہ کافروں کے عقلمندانہ نظریات کے بھی خلاف ہیں اس لئے کہ دس (۱۰) مدعیانِ الہام،

دس (۱۰) ہی متناقض و متخالف باتوں کا دعوٰی کرتے ہیں جو حکم میں سب کے سب باطل ہوتے ہیں۔ان مدعیانِ الہام میں سے کوئی ایک بھی حق پر نہیں ہوتا۔

اگر کوئی یہ کہے کہ "جو کچھ شریعت کے خلاف ہو وہ الہام نہیں ہوتا" تو ہم جواب دیں گے کہ تم تو اپنے اصل و قاعدے میں غلطی پر ہو اس لئے کہ شریعت کو اپنے الہام پر قیاس کرتے ہوئے کہتے ہو کہ شریعت سے ہمارا الہام ثابت ہے حالانکہ معرفت الٰہی شرعی، ثبوتی او ہدایتی ہوتی ہے نہ کہ الہامی اور معرفت میں الہام کا حکم بہمہ وجوہ باطل ہے۔

ایک گروہ کہتا ہے کہ معرفتِ حق ضروری یعنی بدیہی ہے حالانکہ یہ قول بھی باطل ہے اس لئے کہ بندے کے لئے ہر وہ چیز جس کا اسے علم ہو اگر بدیہی ہو تو ضروری ہے کہ اس میں تمام عقلاء مشترک و متحد ہوں۔ میں نے عقلاء کی ایک جماعت ایسی دیکھی ہے جو بدیہی ہونے کی منکر ہے اور تشبیہ و تعطیل کو جائز سمجھتی ہے۔صحیح بات یہی ہے کہ یہ ضروری اور بدیہی نہیں ہے۔ ایک وجہ یہ بھی ہے کہ اگر معرفتِ الٰہی ضروری و بدیہی ہوتی تو اس پر تکلیف جائز نہیں ہوتی کیونکہ محال ہے کہ کسی ایسی چیز کی معرفت کے لئے جس کا علم ضروری و بدیہی ہو، اس پر تکلیف ہو مثلاً اپنی پہچان آسمان و زمین، دن و رات اور تکلیف و راحت وغیرہ وغیرہ کہ یہ سب بدیہی ہیں اور ان میں سے کسی کے وجود کے لئے عاقل کو شک و شبہ لاحق نہیں ہوتا اور نہ اسے اس کی حاجت ہوتی ہے کہ وہ پریشان ہو اور علم حاصل کرنا چاہے تو بھی حاصل نہ ہو سکے۔البتہ صوفیوں کے ایک گروہ نے جب اپنے یقین کی صحت و درستگی پر غور کیا تو کہنے لگے کہ ہم اسے ضروری و بدیہی جانتے ہیں کیونکہ دل میں کوئی شک و شبہ واقع نہیں ہے۔انہوں نے یقین کا نام ضروری و بدیہی رکھ لیا۔یہ بات معنی کے لحاظ سے درست ہے لیکن تعبیر و بیان کے اعتبار سے غلط ہے اس لئے کہ ضروری و بدیہی علم میں، صحت و درستگی کی تخصیص جائز نہیں ہوتی ہے اور وہ تمام عقلوں میں مساوی ہوتی ہے اور ایک وجہ یہ بھی ہے کہ ضروری و بدیہی علم ہوتا ہے جو زندوں کے دلوں میں بغیر سبب و دلیل ظاہر ہو لیکن علم الٰہی اور معرفتِ ربانی سببی ہے۔

حضرت استاد ابو علی دقاق اور شیخ ابو سہل صعلوکی اور ان کے والد جو نیشاپور کے امام و

رئیس تھے ان کا نظریہ ہے کہ معرفت کی ابتداء استدلال سے ہے اور اس کی انتہا ضرورت و بداہت ہے۔

اہل سنت و جماعت کا ایک قول یہ ہے کہ جبکہ جنت میں علم الٰہی ضروری و بدیہی ہو جائے گا اور یہ جائز بھی ہے تو یہاں بھی ممکن ہے کہ وہ ضروری بدیہی ہو جائے نیز ایک قول یہ ہے کہ انبیاء علیہم السلام جب اللہ تعالیٰ کا کلام سنتے ہیں خواہ وہ بے واسطہ ہو یا فرشتہ یا وحی کے ذریعہ تو وہ اسے ضروری و بدیہی جانتے ہیں اور ہم بھی یہ اعتقاد رکھتے ہیں کہ اہل جنت، بہشت میں اللہ تعالیٰ کو ضرورت و بداہت سے جانیں گے چونکہ جنت تکلیف کا گھر نہیں ہے اور انبیاء علیہم السلام مامون العاقبۃ اور قطعی طور پر محفوظ ہیں ان کے لئے معرفت الٰہی ضروری و بدیہی ہے نیز انہیں خوف اور جدائی کا خطرہ بھی نہیں ہے ایمان و معرفت کو فضیلت اسی وجہ سے ہے کہ وہ غیب ہے۔ جب وہ عیاں ہو جائے تو ایمان خبر بن جائے اور اس کے عیاں ہونے کے بعد اختیار ختم ہو جائے اصول شرع مضطرب ہو جاتے ہیں اور ردت کا حکم باطل ہو جاتا ہے اور بلعم ابلیس اور برصیصا کی تکفیر درست نہیں رہتی کیونکہ وہ سب باتفاق اللہ تعالیٰ کو پہچانتے تھے جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے ابلیس کے مردود مرجوم ہونے کے وقت کی خبر دیتے ہوئے شیطان کا قول بیان کیا کہ:

فَبِعِزَّتِكَ لَأُغْوِيَنَّهُمْ أَجْمَعِينَ (الزمر:۸۲) اب تیری عزت کی قسم ہے میں ان سب کو ضرور بہکاؤں گا۔

درحقیقت بات کرنا اور کلام سننا معرفت کے مقتضیات میں سے ہے اور عارف جب تک عارف رہے وہ جدائی کے خطرے سے محفوظ ہے اور جب جدائی ہو جائے تو معرفت زائل ہو جاتی ہے حالانکہ علم بدیہی کے لئے زوال کی کوئی صورت ممکن نہیں۔

یہ مسئلہ لوگوں کے درمیان خطرناک ہے۔ بس اسی قدر شرط ہے کہ اتنا جان لو جس سے آفت سے چھٹکارا مل جائے کیونکہ بندے کو علم اور حق تعالیٰ کی معرفت اس وقت تک حاصل نہیں ہو سکتی جب تک کہ حق تعالیٰ ازلی علم و ہدایت کی توفیق عطا نہ فرمائے۔

البتہ یہ جائز ہے کہ معرفت میں بندے کے یقین میں احیاناً کمی و بیشی ہو لیکن اصل

معرفت میں کمی و بیشی ممکن نہیں کیونکہ معرفت میں زیادتی موجب نقصان ہے اور کمی میں بھی۔

معرفت الٰہی میں تقلید جائز نہیں ہے حق تعالیٰ کو صفاتِ کمالیہ کے ساتھ پہچاننا لازم ہے اور یہ بات بجز حسن رعایت اور خالص عنایت ربانی کے صحیح نہیں ہوسکتی۔ تمام عقلی دلائل حق تعالیٰ کی مِلک اور اس کے قبضہ اختیار میں ہیں وہ اگر چاہے تو اپنے کسی ایک فعل کو اس کے لئے دلیل بنا دے اور اسی کے ذریعہ اپنی راہ دکھا دے اور اگر وہ چاہے تو اپنے تمام افعال کو اس کے لئے حجاب بنا دے اور وہ خدا تک رسائی سے محروم رہ جائے۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام جہاں مسلمانوں کی ایک جماعت کے لئے معرفتِ الٰہی کی دلیل بنے وہاں نصاریٰ کے ایک گروہ کے لئے معرفت کے حجاب بنے۔ مسلمانوں نے انہیں خدا کا بندہ اور رسول مانا اور نصاریٰ نے انہیں خدا کا بیٹا گمان کیا (معاذ اللہ) یہی حال اصنام اور چاند اور سورج کا ہے۔ کسی کے لئے وہ معرفت کی دلیل ہیں اور کئی اس سے محروم رہے۔ اگر دلیل ہی معرفت کی علت ہوتی تو چاہئے تھا کہ ہر مستدل عارف ہوتا حالانکہ یہ کھلا مکابرہ ہے۔ اللہ تعالیٰ ہی کے اختیار میں ہے کہ وہ کسی کو برگزیدہ بنا کر ان چیزوں کو دلیل معرفت بنا دیتا ہے تا کہ ان ذرائع سے وہ خدا تک رسائی پائیں اور خدا کو پہچانیں۔ معلوم ہوا کہ دلیل خدا کی معرفت کا سبب تو ہوسکتی ہے مگر علت نہیں بن سکتی اور کوئی سبب کسی سبب سے مسبب یعنی خدا کے لئے بہتر نہیں ہوتا۔ اللہ تعالیٰ مسبب کے بارے میں ارشاد فرماتا ہے:

لَعَمْرُكَ اِنَّهُمْ لَفِيْ سَكْرَتِهِمْ يَعْمَهُوْنَ — اے محبوب! آپ کی حیات کی قسم بے شک یہ کافر اپنے نشہ میں بہک رہے ہیں۔

کیونکہ عارف کے لئے سبب کا اثبات کفر ہے اور غیر کی طرف توجہ شرک ہے۔ "مَنْ يُّضْلِلِ اللّٰهُ فَلَا هَادِيَ لَهٗ" (الاعراف:۱۸۶) جسے خدا دلیل سے اندھا بنائے اسے کون راہِ ہدایت دکھا سکتا ہے۔ لہٰذا جب کسی کے لئے لوحِ محفوظ میں لَا (نہیں) لکھا ہوا ہے اور حق تعالیٰ کی مراد معلوم میں کسی کے نصیب میں شقاوت و بدنصیبی ہے تو اس کے لئے دلیل و استدلال کس طرح موجب ہدایت بن سکتی؟ "من التفت الی الاغیار فمعرفتہٗ زنار" جس نے غیر کی طرف

توجہ کی اس کی معرفت کفر ہے۔ جو بندے خدا کے غلبہ محبت میں مستغرق اور اس کے متلاشی ہیں ان کے لئے خدا کے سوا اور چیزیں راہ میں رکاوٹ کیسے بن سکتی ہیں؟

حضرت ابراہیم خلیل اللہ علیہ السلام جب غار سے باہر تشریف لائے تو دن میں کوئی چیز نہ دیکھی حالانکہ دن میں بکثرت دلائل اور عجیب تر براہین موجود ہوتے ہیں لیکن جب رات ہوئی تو ستاروں کو دیکھا۔ اگر معرفتِ الٰہی کی علت دلیل ہوتی تو دن میں زیادہ دلائل نظر آتے اور اس سے زیادہ عجیب نشانیاں ظاہر ہوتیں لہٰذا اللہ تعالیٰ جس طرح چاہتا ہے بندے کو اپنی راہ دکھاتا ہے اور اس پر معرفت کا دروازہ کھول دیتا ہے تاکہ عین معرفت میں اس درجہ تک پہنچے جہاں عین معرفت بھی اسے غیر نظر آئے اور اسے معرفت کی صفت آفت معلوم ہو کیونکہ معرفت کے ساتھ معروف یعنی خدا سے وہ محجوب ہوتا ہے یہاں تک کہ اسے معرفت کی تحقیق اس درجہ تک پہنچا دیتی ہے کہ معرفت اس کا دعویٰ بن جاتا ہے۔

حضرت ذوالنون مصری رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ:

ایاك ان لاتكون بالمعرفته مدعیا	اے عزیز تم اس سے بچو کہ تم (بغیر تحقیق) معرفت کے مدعی بنو۔

کیونکہ:

يدعى العارفون معرفته
اقرا بالجهل ذاك معرفتى

عرفاء تو اپنی معرفت کا دعوٰی کرتے ہیں لیکن
میں ناواقفیت کا اقرار کرتا ہوں اور یہی میری معرفت ہے

اس لئے تمہیں سزاوار نہیں کہ تم معرفت کا دعوٰی کرو کیونکہ اس میں تمہاری ہلاکت ہے اور تمہارا تعلق اسی خوبی کے ساتھ ہونا چاہئے جس میں تمہاری نجات ہو اسی لئے جسے حق تعالیٰ کا کشف و مشاہدہ حاصل ہو جاتا ہے اس کے لئے اپنی ہستی وبال بن جاتی ہے اور تمام صفتیں آفت بن جاتی ہیں اور جو خدا کا ہو جائے اس کے لئے کوئی چیز ایسی نہیں رہتی جس کی نسبت اس

بندے کی طرف کرنا درست ہو، نہ اس دنیا میں نہ اس جہان میں۔

معرفت کی حقیقت یہ ہے کہ ہر چیز خدا کی ملکیت سمجھے۔ جب بندہ یہ جان لیتا ہے کہ ہر چیز خدا کی ملکیت ہے اور اسی کے تحت تصرف میں ہے تو پھر اسے کسی مخلوق سے کوئی سروکار نہیں رہتا حتیٰ کہ خود اپنے سے بھی نہیں وہ اپنے آپ سے اور تمام مخلوق سے محجوب ہو جاتا ہے اس کا جواب ہر شئے سے ناواقفیت ہے۔ جب یہ بھی فنا ہو جاتی ہے تو حجاب بھی پراگندہ ہو جاتا ہے اور دنیا بمنزلہ عقبیٰ ہو جاتی ہے۔

معرفت میں مشائخ کے رموز و لطائف

معرفت کے سلسلہ میں مشائخ کے بکثرت رموز و لطائف ہیں۔ حصولِ فائدہ کے لئے چند رموز درج کئے جاتے ہیں:

حضرت عبداللہ بن مبارک رحمتہ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ:

المعرفة ان لاتتعجب من شيئی — معرفت یہ ہے کہ تم کسی چیز سے متعجب نہ ہو۔

کیونکہ تعجب "عجب" ایسے فعل پر ہوتا ہے جو بندے کی اپنی طاقت سے زیادہ ہو اور جب اللہ تعالیٰ کمال پر قادر ہے تو عارف کے لئے خدا کے افعال میں حیرت و تعجب کا اظہار کرنا محال ہے۔ اگر کہیں عجب کی کوئی صورت ممکن ہو سکتی تو یہ بات تھی کہ اس نے ایک مٹھی خاک کو اس درجہ تک پہنچایا کہ وہ دنیا پر حکومت کرے ایک قطرہ خون کو اس مرتبہ تک پہنچایا کہ وہ معرفتِ الٰہی اور اس کی محبت و دوستی کی باتیں کرنے لگا اور وہ دیدارِ الٰہی اور اس کے قرب و وصال کا خواہش مند ہو گیا ہے۔ حضرت ذوالنون مصری رحمتہ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ:

حقیقته المعرفته اطلاع الحق علی الاسرار بمواصلة لطائف الانوار — معرفت کی حقیقت حق تعالیٰ کا اسرار پر مطلع کرنا اور اپنی معرفت کے انوار سے سرفراز فرمانا ہے۔

مطلب یہ ہے کہ حق تعالیٰ اپنی عنایت سے بندے کو اپنے انوار سے آراستہ کر کے تمام آفتوں سے محفوظ کر دیتا ہے چنانچہ جب تک بندے کے دل میں رائی کے دانہ برابر مخلوق کا اثر رہتا ہے اس وقت تک وہ غیبی اسرار کے مشاہدے سے سرفراز نہیں کرتا اور نہ اس کے ظاہر کو مغلوب کرتا ہے۔ جب وہ بندے کے دل سے تمام تر اثرات نکال دیتا ہے تب وہ مشاہدات کا معائنہ کراتا ہے۔ حضرت شبلی علیہ الرحمۃ فرماتے ہیں کہ:

المعرفته دوام الحیرة حیرت دوام ہی تو معرفت ہے۔

کیونکہ حیرت دو قسم کی ہوتی ہے ایک حیرت ہستی و وجود میں دوسری حیرت کیفیت میں۔ ہستی میں حیرت تو شرک ہے اور کیفیت میں حیرت معرفت ہے اس لئے کہ عارف کو اس کی ہستی و وجود میں شک کی کوئی گنجائش اور اس کی کیفیت میں عقل کو کوئی دخل نہیں اس جگہ اسے وجودِ باری تعالیٰ میں یقین، اور کیفیت میں حیرت حاصل ہو جاتی ہے اسی بناپر کسی نے کہا ہے کہ:

یادلیل المتحیرین زدنی تحیرا اے حیرت زدوں کے رہنما! میری حیرت کو اور زیادہ کر۔

اس قول کا مطلب یہ ہے کہ قائل نے پہلے تو حق تعالیٰ کے وجود کی معرفت اور اس کے اوصاف کا کمال ثابت کیا اور اقرار کیا کہ وہی مقصود خلق اور ان کی دعاؤں کا قبول کرنے والا ہے اور حیرت زدوں کی حیرت اس کے سوا نہیں ہے۔ اس کے بعد قائل نے زیادتی حیرت کی استدعا کی اور اعتراف کیا کہ مطلوب کی معرفت میں عقل کا کوئی دخل نہیں وہاں حیرت وسرگردانی کے سوا اس کے لئے کوئی حصہ نہیں یہ معنی لطیف ہیں نیز اس کا بھی احتمال ہو سکتا ہے کہ حق تعالیٰ کی ہستی و وجود کی معرفت، اپنی ہستی پر حیرت کا اقتضاء کرلے اس لئے کہ بندہ جب حق تعالیٰ کو پہچان لیتا ہے اور ہر چیز کو اس کے قبضہ و اختیار میں دیکھتا ہے اور یقین کر لیتا ہے کہ اس کا وجود بھی اسی سے ہے اور اس کا عدم بھی اسی سے تو اس کی قدرت میں سکون وحرکت سے متحیر ہوتا ہے کیونکہ جب کل کا قیام اسی سے ہے تو ''میں کون ہوں اور کیا ہوں'' (حیرت زدہ ہو کر رہ جاتا ہے) میں مستغرق ہو کر رہ جاتا ہے۔ اسی معنی میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ:

مَنْ عَرَفَ نَفْسَهٗ فَقَدْ عَرَفَ رَبَّهٗ — جس نے اپنے آپ کو فنا سے پہچان لیا یقیناً اس نے حق تعالیٰ کو بقا سے پہچان لیا۔

کیونکہ فنا سے عقل و صفت باطل ہوتی ہے اور جب چیز کا عین، عقلی نہ ہو تو اس کی معرفت میں حیرت کے سوا کچھ ممکن نہیں۔ حضرت بایزید بسطامی رحمتہ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ:

ان تعرف ان حرکات الخلق وسکناتھم باللہ — معرفت یہ ہے کہ تم جان لو کہ خلق کی تمام حرکت وسکون حق تعالیٰ سے ہے۔

اور کسی کو اس کی ملکیت میں اس کی اجازت کے بغیر تصرف کا اختیار نہیں۔ عین بھی اسی کے عین سے ہے۔ اثر بھی اسی کے اثر سے اور صفت بھی اسی کی صفت سے اور حرکت وسکون بھی اسی کے حرکت وسکون سے ہے کیونکہ جب تک حق تعالیٰ بندے کے وجود میں طاقت اور اس کے دل میں ارادہ پیدا نہ فرمائے بندہ کچھ بھی نہیں کر سکتا۔ بندے کے افعال مجازی ہیں اور مخلوق کے تمام افعال خدا کے پیدا کردہ ہیں۔ حضرت محمد بن واسع رحمتہ اللہ علیہ عارف کی صفت میں فرماتے ہیں کہ:

من عرف اللہ قل کلامہ ودام تحیرہ — جسے اللہ تعالیٰ کی معرفت حاصل ہوگئی وہ بات کم کرے گا اور اس کی حیرت دائمی ہوگی۔

کیونکہ الفاظ کا جامہ اسے پہنایا جا سکتا ہے جو تحت عبارت ہو اور اصول میں عبارت کی ایک حد ہے اور معبر چونکہ محدود نہیں ہے تو عبارت کی بنیاد اس پر کیسے رکھی جا سکتی ہے؟ جب عبارت کی ایک حد ہے اور معبر یعنی اللہ تعالیٰ غیر محدود ہے تو اسے عبارت کی حد بندی میں کیسے لایا جا سکتا ہے اور جب مقصود عبارت میں نہ سما سکے اور بندہ اس میں عاجز ولاچار رہ جائے تو عجز دائمی حیرت کے کیا چارۂ کار رہتا ہے۔ حضرت شبلی علیہ الرحمۃ فرماتے ہیں کہ:

العجز عن المعرفتہ — یعنی معرفت کی حقیقت یہ ہے کہ معرفت الٰہی سے عاجز رہے۔

کیونکہ حق تعالیٰ کی حقیقت سے بندہ، سوائے عجز کے کوئی نشان نہیں رکھتا۔ ممکن ہے

کہ بندے کو اس کے ادراک میں اپنے سے زیادہ دعوٰی نہ ہو اس لئے کہ عجز اس کی طلب ہے اور جب تک طالب اپنی صفت اور اسباب پر قائم ہے اس وقت تک اس پر عجز کا اطلاق درست نہیں ہوتا البتہ جب وہ اسباب اور اوصاف سے گزر جاتا ہے تب اسے فنا حاصل ہوتی ہے نہ کہ عجز۔

مدعیوں کے ایک گروہ کا خیال ہے کہ اس حالت میں جبکہ آدمیت کی صفت برقرار و ثابت ہو اور صحت خطاب سے مکلّف ہو اور حق تعالیٰ کی حجت اس پر قائم ہو، عاجز ہونے کا نام معرفت ہے اور ہم عاجز ہو کر سب سے پیچھے رہ گئے ہیں یہ قول گمراہی اور زیاں کاری پر مبنی ہے۔ ہم دریافت کرتے ہیں کہ تم کس چیز کی طلب میں عاجز ہوئے ہو؟ حالانکہ عجز کی دو نشانیاں ہیں اور یہ دونوں تم میں نہیں ہیں ایک نشانی طلب کے اسباب کی فنا ہے اور دوسری نشانی اظہار تجلی ہے۔ جہاں اسباب کی فنا ہے وہاں عبارات گم ہوتی ہیں۔ اگر عجز کی تعبیر، عبارت سے کرو گے تو عجز کی عبارت بجز عجز کے نہ ہوگی اور جہاں اظہار تجلی ہے وہاں نشان نہیں ہوتا اور تمیز کی کوئی صورت نظر نہیں آتی حتیٰ کہ عاجز بھی نہیں جانتا کہ وہ عاجز ہے یا یہ کہ وہ عجز سے منسوب ہے جس کی بنا پر اسے عاجز کہیں، اس کی بھی صورت نہیں۔ کیونکہ عجز غیر ہے اور غیر کی معرفت کا اثبات، معرفت نہیں ہے۔ جب تک دل میں غیر کی جگہ ہے یا عارف کو غیر کی تعبیر کی قدرت ہے اس وقت تک معرفت درست نہیں ہوتی اور جب تک عارف غیر سے کنارہ نہ کرے اس وقت تک عارف عارف نہیں ہوتا تو تمہارا یہ کہنا کسی طرح بھی صحیح نہیں ہے۔ حضرت ابو حفص حداد رحمتہ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ:

مذعرفت اللہ مادخل فی قلبی حق ولا باطل	مجھے جب سے عرفانِ حق ہوا ہے اس وقت سے میرے دل میں کسی حق و باطل کا خطرہ نہیں آیا۔

اس لئے کہ جب تک لوگوں سے تعلق اور خواہش رہے اس وقت تک وہ دل پر اثر انداز ہوتا ہے اور دل اس اثر کو لے کر نفس کے حوالہ کر دیتا ہے اور نفس باطل کا مقام ہے اسی

طرح جب کسی کی محبت دل میں ہمیشہ رہے گی تو وہ بھی دل پر اثر انداز ہوگی اور دل اس اثر کو لے کر روح کے سپرد کردے گا کیونکہ روح حق اور حقیقت کا منبع ہے۔ اور جب دل میں غیر کا دخل ہوتو اس کی طرف عارف کا رجوع کرنا معرفت کے منافی ہے لہٰذا تمام لوگ معرفت کی دلیل کی طلب بھی دل سے کرتے ہیں اور حرص و ہوا کی طلب بھی دل ہی سے ہے اور جب انہیں اپنی مراد حاصل نہ ہوئی تو انہوں نے دل کی طرف رجوع نہ کیا اور غیر حق سے راحت نہ پائی اور صرف حق تعالیٰ کو پایا اور اسی سے لو لگائے رکھی اور جب نشان و دلیل کی ضرورت پیش آئی تو حق تعالیٰ کی طرف رجوع کیا اور دل کی طرف رجوع نہ کیا۔ یہ فرق ہے ان بندوں کے درمیان، جو دل کی طرف رجوع ہوتے ہیں یا جو حق تعالیٰ کی طرف رجوع ہوتے ہیں۔ حضرت ابوبکر واسطی رحمتہ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ:

من عرف اللہ انقطع عن الکل بل خرس وانقمع	جس نے اللہ کو پہچان لیا وہ ہر ایک سے نہ صرف جدا ہوگیا بلکہ گونگا اور دل برداشتہ بھی ہوگیا۔

مطلب یہ کہ جس نے اسے پہچان لیا اس نے دل سے تمام اغیار کو نکال دیا اور اس کی تعبیر میں گونگا بن کر اپنے اوصاف سے فانی ہوگیا۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ارشاد فرماتے ہیں کہ:

لَا اُحْصِیْ ثَنَاءً عَلَیْکَ	تیری حمد و ثناء کو میں گھیر نہیں سکتا۔

جب تک آپ غیبت میں رہے آپ عرب میں سب سے زیادہ فصیح تھے آپ فرماتے ہیں کہ "اَنَا اَفْصَحُ الْعَرَبِ وَالْعَجَمِ" میں عرب و عجم میں سب سے زیادہ فصیح ہوں۔ اور جب آپ کو غیبت سے حضور میں بھیجا گیا تو بارگاہِ الٰہی میں عرض کناں ہوئے کہ میری زبان تیری حمد و ثنا کے کمال کو گھیرنے کی تاب و تواں نہیں رکھتی کس طرح تیری حمد ثنا کروں۔ قال سے بے قال اور حال سے بے حال ہوں تو وہی ہے جو تو ہے میری عرض یا تو میری وجہ سے ہوگی یا آپ کی وجہ سے۔ اگر اپنی وجہ سے کہوں تو محجوب ہوتا ہوں اگر تیری وجہ سے کہوں تو تیری قربت کی

تحقیق میں اپنے اختیار میں معیوب ہوتا ہوں لہٰذا میں کچھ عرض نہیں کر سکتا۔

حق تعالیٰ کی طرف سے فرمان ہوا کہ اے محبوب اگر تم کچھ نہیں کہہ سکتے تو ہم فرماتے ہیں کہ لَعَمْرُكَ اِذَا سَكَتَّ عَنْ ثَنَائِيْ فَالْكُلُّ مِّنْكَ ثَنَائِيْ یعنی اے محبوب تمہاری زندگانی کی قسم، جب آپ ثنا سے ساکت ہو گئے ہیں تو میں جہان کی ہر چیز کو تمہارا قائم مقام بناتا ہوں جو بھی میری ثنا کرے گا وہ تمہاری طرف سے میری ثنا کرے گا گویا ان سب کی ثنا تمہارے حوالہ ہوگی، اور تم اپنی طرف سے میرے حضور پیش کرو گے۔

دوسرا کشف، توحید کے بیان میں

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ:

وَاِلٰهُكُمْ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ (البقرہ:١٦٣) — تمہارا معبود ایک ہی ہے۔

نیز فرمایا:

قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ (اخلاص:١) — تم فرما دو کہ اللہ اکیلا ہے۔

نیز فرمایا:

لَا تَتَّخِذُوْٓا اِلٰهَيْنِ اثْنَيْنِ اِنَّمَا هُوَ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ (النحل:٥١) — تم دو معبود نہ بناؤ بلاشبہ معبود ایک ہی ہے۔

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ:

بَيْنَنَا رَجُلٌ فِيْمَنْ كَانَ قَبْلَكُمْ لَمْ يَعْمَلْ خَيْرًا قَطُّ اِلَّا تَوْحِيْدَ فَقَالَ لِاَهْلِهٖ اِذَا مِتُّ فَاَحْرِقُوْنِيْ ثُمَّ اسْتَحِقُوْنِيْ ثُمَّ ذَرُّوْنِيْ نِصْفِيْ فِي الْبَرِّ وَنِصْفِيْ فِي الْبَحْرِ فِيْ يَوْمٍ رَائِحٍ فَفَعَلُوْا فَقَالَ اللّٰهُ عَزَّ وَجَلَّ لِلرِّيْحِ وَالْمَاءِ اَجْمِعَا مَا اَخَذْتُمَا فَاِذَا هُوَ بَيْنَ يَدَيْهِ فَقَالَ لَهٗ

تم سے پہلے ایک شخص گزرا ہے جس کی کوئی نیکی توحید کے سوا نہ تھی اس نے اپنے گھر والوں سے کہا جب میں مر جاؤں تو مجھے جلا دینا پھر خاکستر کو خوب باریک کر کے تیز ہوا کے دن آدھا خشکی میں اور آدھا دریا میں بہا دینا۔ گھر والوں نے ایسا ہی کیا اللہ تعالیٰ نے ہوا اور پانی سے فرمایا جو تم نے پھیلایا ہے ان سب کو اکٹھا کرو اور میرے حضور لاؤ۔ جب

مَاحَمَلَكَ عَلٰى مَاصَنَعْتَ فَقَالَ لَا سْتِحْيَاءً مِّنْكَ فَغَفَرَلَهٗ (بخاری شریف، مسلم شریف)

خدا کے حضور وہ پیش ہوا تو حق تعالیٰ نے اس سے فرمایا تجھے کس چیز نے اپنے ساتھ ایسا سلوک کرنے پر آمادہ کیا۔ اس نے عرض کیا خدایا مجھے تیری حیا دامنگیر تھی اس لئے میں نے اپنی جان پر ایسا ظلم کیا ہے چنانچہ اللہ تعالیٰ نے اسے بخش دیا۔

توحید کی حقیقت یہ ہے کہ حق تعالیٰ کو اکیلا جانے اور اس پر صحیح علم رکھے چونکہ اللہ تعالیٰ ایک ہے وہ بے مثل، اپنی ذات وصفات میں بے نظیر اور اپنے افعال میں لاشریک ہے توحید کے ماننے والے مسلمانوں نے اللہ تعالیٰ کو ان ہی خوبیوں کے ساتھ جانا ہے اور اس جاننے کو توحید کی یکتائی کہا ہے۔

توحید کے اقسام:

توحید کی تین قسمیں ہیں ایک حق تعالیٰ کی توحید اسی کے لئے یعنی خود حق تعالیٰ کا علم ہے کہ وہ اکیلا ہے۔ دوسری حق تعالیٰ کی توحید، مخلوق کے لئے یعنی خدا کا حکم کہ بندے توحید تسلیم کریں...... اور اس نے بندوں کے دل میں توحید پیدا فرمائی۔ تیسری مخلوق کی توحید خدا کے لئے یعنی مخلوق کا جاننا کہ اللہ ایک ہے...... لہٰذا بندہ جب حق کے ساتھ عارف ہوتا ہے تو وہ اس کی وحدانیت کی حقیقت معلوم کرسکتا ہے۔

اثبات توحید:

واضح رہنا چاہئے کہ اللہ تعالیٰ ایک ہے وہ نہ وصل کو قبول کرتا ہے نہ فصل کو نہ اس پر دوئی جائز ہے اور نہ اس کی وحدانیت عددی ہے جو کسی عدد کے ثابت ہوجانے پر دو ہوجائے اور اس کی وحدانیت عدد بن جائے اور نہ وہ محدود ہے کہ اس کے لئے جہات اور سمتوں کا تحقق ہو اور نہ اس کے لئے مکان ہے اور نہ وہ کسی مکان میں ہے کہ اس کے لئے مکان کے اثبات کی ضرورت لاحق ہو اس لئے کہ اگر وہ مکان میں متمکن ہوتا تو مکان کے لئے بھی مکان کی حاجت

ہوتی اس طرح فعل، فاعل اور قدیم وحادث کا حکم باطل ہو جاتا ہے نہ وہ عرضی ہے کہ وہ کسی جوہر کا محتاج ہوتا کہ اپنے محل میں باقی رہے اور نہ جوہر ہے کیونکہ اس کا وجود، اپنی ذات کے سوا درست ہی نہیں اور نہ وہ طبعی ہے کہ وہ مبداء حرکت وسکون ہو، اور نہ وہ روح ہے کہ کسی جسم کا محتاج ہو، نہ وہ جسمی ہے کہ اس کے اجزاء ترکیبی ہوں اور نہ وہ چیزوں میں قوت وحال ہے کہ چیزوں کی ہم جنس ہو۔ نہ کوئی چیز اس کے ساتھ پیوست و پیوند ہے کہ وہ چیز اس کا جزو ہو۔ اس کی ذات وصفات ہر عیب ونقص سے پاک اور ہر آفت سے منزہ ہے اور نہ وہ کسی کے مانند ہے کہ اپنے مانند کے ساتھ دو ہو جائے اور نہ کوئی اولاد ہے کہ جس کی مثل اصل کی اقتضاء کرے اور نہ اس کی ذات وصفات پر تغیر جائز ہے کہ اس کا وجود اس سے متغیر ہو اور متغیر کے حکم میں تغیر کی مانند ہو۔

وہ ان صفات کمالیہ سے متصف ہے جن کا اثبات تمام اہل توحید مسلمان بحکم بصیرت کرتے ہیں کیونکہ خدا نے ان سے اپنی صفات خود بیان فرمائی ہیں اور وہ ان صفات سے پاک ہے جن کو ملحدین اپنی خواہش سے متصف قرار دیتے ہیں کیونکہ خدا نے ان سے اپنی صفات خود بیان نہیں کیں۔

اللہ تعالیٰ کی صفات میں سے حیی، علیم، رؤف، رحیم، مرید، قدیر، سمیع، بصیر، متکلم اور باقی ہے۔ اس کا علم اس کا حال نہیں ہے اور اس کی قدرت، اس میں سختی نہیں ہے اس کی شنوائی و بصارت میں تجدد یعنی بار بار پیدائش نہیں ہے اور اس کا کلام ایسا ہے جس میں نہ بعضیت ہے نہ تجدید۔ وہ ہمیشہ اپنی صفات کے ساتھ قدیم ہے اور تمام معلومات اس کے علم سے باہر نہیں اور کسی موجود کو اس کے ارادہ سے مفر کی راہ نہیں۔ وہی کرتا ہے جو وہ چاہتا ہے اور وہی چاہتا ہے جو اس کی مشیت ہے مخلوق کو اس میں کوئی بزرگی نہیں۔ اس کا ہر حکم حق ہے۔ اس کے دوستوں کو بجز تسلیم کے کوئی چارہ نہیں اس کا حکم حتمی اور قطعی ہے اس کے دوستوں کو اس کی فرمانبرداری کے سوا کوئی چارہ نہیں۔ ہر خیر وشر اس کا مقدر کیا ہوا ہے۔ اس کے سوا کسی سے امید وخوف رکھنا لائق نہیں۔ اس کے سوا کوئی نفع ونقصان کا پیدا کرنے والا نہیں۔ اس کا ہر

حکم حکمت پر مبنی ہے۔ اس کا پورا ہونا ضروری ہے۔ ہر ایک کو اسی سے وصل اور اسی تک رسائی چاہئے اہل جنت کے لئے اس کا دیدار جائز ہے وہ تشبیہ و جہت سے پاک ہے۔ اس کی ہستی پر مقابلہ و مواجہہ کی کوئی صورت نہیں۔ دنیا میں اس کے دوستوں کے لئے مشاہدہ جائز ہے۔ انکار کرنا شرط نہیں۔ جو خدا کو اس طرح جانتا ہے اہل قطعیت سے نہیں جو اس کے خلاف جانے اس کے لئے دیانت نہیں اصل معنی میں اصولی اور وصولی بکثرت اقوال ہیں جسے طوالت کے خوف سے مختصر کرتا ہوں۔

حضور سیدنا داتا گنج بخش رحمتہ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ میں نے ابتدائے عنوان میں لکھ دیا ہے کہ توحید یہ ہے کہ کسی چیز کی وحدانیت پر حکم کرنا ہے اور یہ حکم علم کے سوا نہیں کیا جا سکتا لہٰذا اہل سنت و جماعت تحقیق کے ساتھ وحدانیت کا حکم دیتے ہیں اس لئے کہ انہوں نے خدا کی لطیف صنعتوں، عجیب و بدیع فعلوں اور بکثرت لطائف کو دیکھا ہے اور اس پر غور و فکر کیا ہے۔ ان کا از خود ہونا محال جانا۔ انہوں نے ہر چیز کے اندر حدوث کی علامتوں کو موجود پایا۔ لامحالہ کوئی فاعل ایسا چاہے جو ان کو عدم سے وجود میں لائے۔ مطلب یہ کہ خدا ہی کی وہ ذات ہے جس نے اس جہان، زمین و آسمان، چاند و سورج، خشکی و تری اور پہاڑ و صحراء کو وجود بخشا، اور اسی نے ان سب کو حرکت و سکون، علم و نطق اور موت و حیات کے ساتھ پیدا فرمایا۔ لہٰذا ان سب کے لئے کوئی بنانے والا اور پیدا کرنے والا لازمی ہونا چاہئے، اور یہ سب دو یا تین بنانے والوں سے مستغنی ہے۔ وہی ایک بنانے والا، کامل، حیی، قائم، قادر، مختار اور ہر ایک شریک سے بے نیاز ہے۔ جب کوئی فعل، ایک فاعل سے مکمل نہ ہو تو مزید فاعلوں کی ضرورت ہوتی ہے اور وہ دونوں ایک دوسرے کے شریک ہوتے ہیں۔ لامحالہ بلا شک و شبہ اور علم الیقین سے جاننا چاہئے کہ ایک ہی صانع اور فاعل ہے اس مسئلہ میں ثنویوں نے نور و ظلمت کے اثبات میں ہم سے اختلاف کیا ہے۔ مجوسیوں نے یزداں (خالق خیر) اور اہرمن (خالق شر) کے اثبات میں اختلاف کیا ہے نیچریوں نے طبع و قوت کے اثبات کے ساتھ اختلاف کیا ہے۔ نجومیوں نے سات ستاروں کے اثبات کے ساتھ اختلاف کیا ہے اور فرقہ معتزلہ نے تو بے شمار خالقوں اور صانعوں کے اثبات کے ساتھ اختلاف کیا ہے۔ میں نے ان سب کی رد کے لئے مختصر مگر جامع و مکمل دلیل بیان کر دی ہے۔ چونکہ یہ کتاب ان کے

بیہودہ اقوال لانے کی نہیں ہے اس لئے طالب علم کو کسی اور کتاب کا مطالعہ کرنا چاہئے۔ اب میں مشائخ کے ان رموز کی طرف متوجہ ہوتا ہوں جو توحید کے سلسلے میں فرماتے ہیں۔

توحید کے سلسلہ میں مشائخ کے رموز واشارات

حضرت جنید بغدادی رحمتہ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ:

اَلتَّوْحِیْدُ اِفْرَادُ الْقِدَمِ عَنِ الْحَدْثِ توحید یہ ہے کہ قدیم کو حادث سے جدا جانے۔

مطلب یہ ہے کہ مومن قدیم کو محل حوادث اور حوادث کو محل قدیم نہ سمجھے اور جانے کے حق تعالٰی قدیم ہے اور خود محدث اور جو تمہاری جنس سے مخلوق ہے وہ بھی حادث ہے اور کوئی مخلوق اس سے ملحق نہیں اور نہ اس کی صفت، تم جیسی مخلوق میں شامل ہے۔ کیونکہ قدیم حادث کا ہم جنس نہیں ہے اس لئے کہ قدیم کا وجود محدثات کے وجود سے پہلے ہے جبکہ محدثات کے وجود سے پہلے قدیم تھا اور محدث کا محتاج نہ تھا تو بعد وجودِ محدث بھی وہ اس کا محتاج نہ ہوگا یہ قاعدہ ان لوگوں کے برخلاف ہے جو ارواح کو قدیم کہتے ہیں۔ ان کا ذکر پہلے کیا جا چکا ہے جب کوئی قدیم کو محدث میں نازل کہتا ہے یا محدث کو قدیم کے ساتھ متعلق جانتا ہے وہ حق تعالٰی کی قدامت اور عالم کے حدوث پر دلیل نہیں رکھتا۔ یہی مذہب دہریوں کا ہے۔

خلاصہ یہ کہ محدثات کی تمام حرکتیں، توحید کے دلائل حق تعالٰی کی قدرت کی گواہ اور اس کے قدیم ہونے کا اثبات کرتی ہیں لیکن بندہ اس میں بہت زیادہ غافل ہے کہ وہ اس کے غیر سے مراد چاہتا ہے اور اس کے غیر کے ذکر سے راحت پاتا ہے۔ جب کوئی تمہارے وجود و عدم میں اس کا شریک نہیں ہے تو ناممکن ہے کہ تمہاری قربیت اور پرورش میں خدا کے سوا کوئی اور شریک ہو۔ حضرت حسین بن منصور حلاج رحمتہ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ:

اول قدم فی التوحید فناء التفرید توحید میں پہلا قدم تفرید کا فنا کرنا ہے۔

اس لئے کہ تفرید کا حکم یہ ہے کہ کسی کو آفتوں سے جدا کر دے اور توحید کا حکم یہ ہے کہ خدا کو ہر چیز سے اکیلا جانے۔ تفرید میں غیر کا اثبات روا تھا اور اس کے غیر کے لئے اس کا اثبات درست لیکن وحدانیت میں غیر کا اثبات ناروا ہے اور یہ کسی غیر کے لئے ثابت کرنا درست نہیں اور نہ ایسا سمجھنا چاہئے کہ تفرید میں اشتراک کی تعبیر ہے اور توحید میں شرکت کی نفی اس لئے توحید میں پہلا قدم ہی شریک کی نفی، اور راستہ سے مزاج کا دور کرنا ہے کیونکہ راستہ میں مزاج کا ہونا ایسا ہے جیسے چراغ کی روشنی میں راستہ ڈھونڈا جائے۔ حضرت حضرمی رحمتہ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ:

اصولنا فی التوحید خمسة	یعنی توحید میں ہمارے پانچ اصول ہیں
اشیاء رفع الحدث و اثبات القدم	حدث کا ارتفاع قِدم کا اثبات، ترک اوطان،
وهجر الاوطان ومفارقته	بھائیوں سے جدائی، اور ہر علم و جہل کا بھول
الاخوان ونسیان ما علم وجهل	جانا۔

لیکن حدث کے ارتفاع کا مطلب! توحید کی مقارنت سے محدثات کی نفی کرنا ہے اور خدا کی مقدس ذات پر حوادث کو محال جاننا ہے اور اثبات قدم کا مطلب اللہ تعالیٰ کو ہمیشہ سے موجود ماننا ہے۔ اس کی تشریح حضرت جنید بغدادی رحمتہ اللہ علیہ کے قول سے کی جا چکی ہے اور ترک اوطان کا مطلب! نفس کی الفتوں، دل کی راحتوں اور طبیعت کی قرار گاہوں سے ہجرت کرنا یعنی چھوڑنا ہے اور مریدوں کے لئے دنیاوی رسموں، بلند مقاموں، عزت کی حالتوں اور اونچی منزلتوں سے ہجرت کرنا ہے اور بھائیوں سے جدائی کا مطلب لوگوں کی صحبت سے کنارہ کشی کرنا اور صحبت حق کی طرف متوجہ ہونا ہے کیونکہ وہ ہر خطرہ جو موحد کے دل پر غیر کے اندیشہ سے لاحق ہو حجاب و آفت ہے اور جتنا دل میں غیر کا اندیشہ ہوگا اتنا ہی وہ محجوب ہوگا اس لئے کہ تمام امتوں کا اجماع ہے کہ توحید، تمام ہمتوں کا جمع کرنا ہے اور غیر کے ساتھ آرام پانا ہمت کا تفرقہ ہے اور ہر علم و جہل کے بھول جانے کا مطلب توحید میں یہ ہے کہ مخلوق کا علم یا تو خوبی سے ہوگا یا کیفیت سے۔ یا جنس سے یا طبیعت سے۔ مخلوق جو علم بھی حق تعالیٰ کی توحید میں ثابت

کرے گی توحید اس کی نفی کرے گی اور جو کچھ جہل سے ثابت کرو گے وہ اپنے علم کے برخلاف ہوگا کیونکہ توحید میں تو جہل ہے ہی نہیں اور توحید کے متحقق ہونے میں علم تصوف کی نفی کے بغیر درست نہیں ہوگا اور علم و جہل تصرف کے بغیر نہیں۔ ایک بصیرت پر ہے اور دوسرا غفلت پر۔

ایک بزرگ فرماتے ہیں کہ میں حضرت حضرمی رحمۃ اللہ علیہ کی مجلس میں سو گیا میں نے خواب میں دیکھا کہ آسمان سے دو فرشتے زمین پر آئے ہیں کچھ عرصہ میں ان کی گفتگو سنتا رہا۔ ایک نے دوسرے سے کہا کہ جو کچھ یہ شخص کہتا ہے توحید کا علم ہے نہ کہ عین توحید۔ جب میں بیدار ہوا تو وہ توحید پر بیان فرما رہے تھے انہوں نے میری طرف رخ کر کے فرمایا اے فلاں! توحید کا بیان علم کے بغیر ہو ہی نہیں سکتا۔ حضرت جنید بغدادی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ:

التوحید ان یکون العبد شخصا بین یدی اللہ تعالیٰ تجری علیہ تصارف تدبیرہ فی مجاری احکام قدرتہ فی لجبح بحار توحید بالفناء عن نفسہ وعن دعوۃ الخلق لہ وعن استجابتہ لھم بحقائق وجود وحدانیتہ فی حقیقۃ قربہ بذھاب حسہ وحرکتہ لقیام الحق لہ فیما اراد منہ وھو ان یرجع آخر العبد الی اولہ فیکون کما کان قبل ان یکون

اصل توحید یہ ہے کہ جب حق تعالیٰ اپنی قدرت کی گزرگاہ میں اپنی تدبیر کا تصرف اس پر جاری فرمائے تو وہ خدا کے سامنے ایک پتلا بن جائے اور دریائے توحید میں اپنے اختیار و ارادہ سے خالی ہو جائے اور اپنے نفس کو فنا کر کے لوگوں کے بلانے پر کان نہ دھرے اور نہ اس کی طرف التفات کرے اور محل خیریت میں اپنی حس و حرکت ختم کر دے اور وحدانیت کی معرفت و حقیقت کے سبب وہ حق کے ساتھ قائم ہو حق نے جو اس کے لئے ارادہ فرمایا ہے اسے قبول کرے تا کہ اس محل میں بندہ کا آخر پہلے کی مانند ہو جائے اور وہ ایسا ہو جائے کہ جو کچھ ہے اپنی ہستی سے پہلے ہے۔

لہٰذا اس ارشاد کا مطلب یہ ہے کہ موحد کو اختیارِ حق میں اختیار نہ رہے اور اس کی

وحدانیت میں بندہ اپنے آپ کو نہ دیکھے اس طرح کہ محل قربت میں بندہ کا نفس فانی، حواس گم اور خدا جیسا چاہے اس پر اپنے احکام جاری کرے اور بندہ اپنے تصرف کے فنا میں ایسا ہو جائے گویا کہ وہ ذرہ ہے جیسا کہ ازل میں حالت توحید کے اندر تھا جہاں کہنے والا بھی حق تعالیٰ تھا اور جواب دینے والا بھی حق تعالیٰ اور اس ذرہ کا نشان بھی وہی، جس بندے کی حالت اس طرح کی ہو جائے وہ لوگوں سے راحت نہیں پاتا کہ وہ لوگوں کی پکار کو قبول کرے۔ اسے کسی کے ساتھ انس و محبت نہیں ہوتی کہ وہ ان کی دعوت کو قبول کرے۔ اس قول کا اشارہ فنائے صفت اور مشاہدۂ جلال کے غلبہ کی حالت میں صحت تسلیم کی طرف ہے تاکہ بندہ اپنے اوصاف سے فانی ہو کر آلہ اور جوہر لطیف بن جائے۔ یہاں تک کہ اگر اس کے جگر میں نیزہ مارا جائے اور وہ آر پار ہو جائے تو اس خبر تک نہ ہو اور اگر تلوار ماری جائے تو بے اختیاری میں کٹ جائے۔ گویا ہر حال میں سب سے فانی اور اس کا وجود مظہر اسرارِ الٰہی ہو جائے تاکہ اس کا کلام، حق کا کلام اس کے فعل کی نسبت حق تعالیٰ کی طرف اور اس کے صفت کا قیام اسی کے ساتھ ہو جائے اور ثبوتِ حجت کے لئے شریعت کا حکم تو اس پر باقی ہو مگر وہ ہر ایک کی رویت سے فانی ہو۔

یہ شان اور یہ صفت حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی تھی کہ شب معراج جب آپ کو مقام قرب میں پہنچایا گیا تو مقام کا تو فاصلہ تھا لیکن قرب میں فاصلہ نہ تھا اور آپ کا حال لوگوں سے دور اور ان کے اوہام سے ماوڑی تھا یہاں تک کہ دنیا نے آپ کو گم کیا اور آپ خود اپنے سے گم ہو گئے۔ فنائے صفت میں بے صفت ہو کر متحیر ہو گئے ترتیب طبائع اور اعتدال مزاج پراگندہ ہو گئے۔ نفس، دل کی جگہ، جان کے درجہ میں، جان سر کے مرتبہ میں اور سر، قرب کی صفت میں پہنچا گویا سب میں سب سے جدا ہو گئے۔ چاہا کہ وجود چھوڑیں، تشخص ختم کریں، لیکن حق تعالیٰ کی مراد اقامت حجت تھی فرمان ہوا اے محبوب اپنے حال پر رہو! اس کلام سے قوت پائی وہ قوت اس کی قوت بنی اور اپنی فنا سے حق کا وجود ظاہر ہوا چنانچہ آپ فرماتے ہیں کہ:

اِنِّیْ لَسْتُ کَاَحَدِکُمْ اِنِّیْ اَبِیْتُ عِنْدَ رَبِّیْ فَیُطْعِمُنِیْ وَیَسْقِیْنِیْ (دارمی)

میں تم میں سے کسی کی مانند نہیں میں اپنے رب کے حضور رات گزارتا ہوں وہی مجھے کھلاتا اور پلاتا ہے۔

لِیْ مَعَ اللّٰہِ وَقْتٌ لَا یَسَعُنِیْ فِیْہِ مَلَكٌ مُّقَرَّبٌ وَّلَا نَبِیٌّ مُّرْسَلٌ

بارگاہِ خداوندی میں میرا ایک وقت ایسا بھی ہوتا ہے جہاں میرے ساتھ مقرب فرشتہ یا کسی نبی مرسل کی بھی رسائی نہیں۔

حضرت سہل بن عبداللہ تستری رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ:

ذات اللہ موصوفة بالعلم غیر مدرکته بالاحاطة ولا مرئیته بالابصار فی دارالدنیا وھی موجودة بحقائق الایمان من غیر حد ولا حلول وتراہ العیون فی العقبٰی ظاھراوّ باطنا فی ملکہٖ

توحید یہ ہے کہ تم اعتقاد رکھو کہ ذاتِ الٰہی علم کے ساتھ موصوف ہے بغیر اس کے کہ تم عقل سے سمجھ سکو یا حواس سے پاسکو دنیا میں آنکھیں اسے دیکھ نہیں سکتیں ذاتِ الٰہی ایمانی حقائق کے ساتھ بے حد و نہایت موجود ہے حواس سے پانے کے سوا

وقدرته وقد حجب الخلق عن معرفته کنه ذاته ولھم بأیاته والقلوب تعرفه والعقول لا تدرکه ینظر الیه المومنون بالابصار من غیر احاطة ولا ادراك نھایته

آنے جانے میں موجود ہے اور اپنے ملک میں اپنی صنعت و قدرت سے ظاہر ہے وہ کسی میں حلول کیا ہوا نہیں ہے آخرت میں اس کے ملک و قدرت میں ظاہری اور باطنی طور پر آنکھیں اسے دیکھیں گی۔ دنیا میں مخلوق، اس کی ذات کی حقیقت کی معرفت سے محجوب ہے وہ عجائب و آیات کے اظہار کے ذریعہ راہ دکھاتا ہے اور دل اسے پہچانتے ہیں۔

مخلوق کی عقلیں کیفیت کے ساتھ اس کا ادراک نہیں کر سکتیں اور آخرت میں مسلمان اسے سر کی آنکھوں سے دیکھیں گے بغیر اس کے کہ اس کی ذات کا احاطہ کریں یا اس کی حد وغایت کا ادراک کریں۔

توحید میں اس کے الفاظ جامع ہیں۔ حضرت جنید بغدادی رحمتہ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ:

اشرف کلمة فی التوحید قول ابی بکر رضی الله عنه سبحان من لم یجعل لخلقه سبیلا الی معرفة الابالعجز عن معرفته

توحید کے بیان میں سب سے زیادہ بزرگ و اشرف کلام حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کا قول ہے۔ آپ فرماتے ہیں کہ پاک ہے وہ ذات جس نے مخلوق کو اپنی معرفت کی راہ نہ دکھائی بجز معرفت میں ان کی عاجزی کے۔

ایک جہان اس کلام سے غلطی میں مبتلا ہے۔ وہ گمان کرتے ہیں کہ معرفت سے عجز، بے معرفتی ہے حالانکہ یہ محال ہے اس لئے کہ موجودگی کی حالت میں عجز کی شکل پیدا ہوتی ہے اور معدوم کی صورت میں عجز کی شکل ظاہر نہیں ہوتی مثلاً مردے میں زندگی نہیں ہے بلکہ موت میں موت سے عاجز ہے اس لئے کہ عجز کا نام اس کی قوت محال جانتی ہے اسی طرح اندھا بینائی سے عاجز نہیں ہوتا بلکہ نابینائی بینائی سے عاجز ہوتی ہے اسی طرح لنگڑا کھڑے ہونے سے عاجز نہیں ہوتا بلکہ بیٹھنے کی حالت میں بیٹھنے سے عاجز ہوتا ہے یہی حال عارف کا ہے کہ وہ معرفت سے عاجز نہیں ہوتا چونکہ معرفت تو موجود ہے اور یہ اس کے لئے ضرورت و بدیہی کی مانند ہے لہٰذا حضرت صدیق رضی اللہ عنہ کے اس قول کو اس پر محمول کریں گے جیسا کہ حضرت ابوسہل صعلوکی اور استاد ابوعلی دقاق رحمہما اللہ فرماتے ہیں کہ معرفت ابتداء میں تو نظری اور کسبی ہوتی ہے لیکن

انتہا میں ضروری و بدیہی بن جاتی ہے اور علم ضروری یہ ہے کہ اس کا عالم اس کے وجود کی حالت میں اسے دور کرنے یا حاصل کرنے سے عاجز ہو۔ اس قول کے بموجب بندے کے دل میں توحید کا ہونا فعل حق ہوگا۔ حضرت شبلی علیہ الرحمۃ فرماتے ہیں کہ:

التوحید حجاب الموحد عن جمال الاحدیتہ — توحید موحد کے لئے جمال احدیت سے حجاب ہے۔

اس لئے کہ وہ توحید کو بندہ کا فعل کہتے ہیں۔ لامحالہ بندہ کا فعل، مشاہدہ الٰہی کے لئے علت نہیں بن سکتا اور جو چیز عین کشف میں کشف کی علت نہ ہو وہ حجاب ہے حالانکہ بندہ اپنے تمام اوصاف کے ساتھ غیر ہوتا ہے اس لئے کہ جب بندہ اپنی صفت کو حق جانے گا تو جس کی یہ صفت ہے یعنی وہ موصوف بھی حق ہوگا کیونکہ موصوف کی ہی تو یہ صفت ہے اس وقت موحد، توحید اور احد، تین وجود قائم ہو جائیں گے جو ایک دوسرے کی علت ہوں گے یہ بات نصاریٰ کے عقیدہ کے مطابق ثالث ثلثہ کے ہو بہو بن جائے گی۔ اور جب تک طالب کے لئے کوئی صفت بھی توحید میں فنا کے مانع رہے گی اس وقت تک وہ اس صفت میں محجوب رہے گا اور خالص موحد نہ بن سکے گا۔ "لان سواہ من الموجودات باطل "اس لئے کہ خدا کے سوا ہر موجود باطل ہے جب یہ بات درست ہے تو ایسا طالب جمال حق کے مشاہدے میں صفت غیر کی طلب کی وجہ سے باطل ہوگا یہی تفسیر کلمہ "لا الٰہ الا اللہ" کی ہے۔

حکایت:

حضرت ابراہیم خواص رحمۃ اللہ علیہ کوفہ میں جب حضرت حسین بن منصور حلاج رحمۃ اللہ علیہ سے ملاقات کرنے گئے تو حضرت حسین بن منصور نے ان سے دریافت کیا کہ اے ابراہیم! اب تک تمہارے حالات کہاں اور کیسے گزرے ہیں؟ انہوں نے فرمایا اب تک میں اپنے توکل کو درست کرتا رہا ہوں۔ حضرت حسین نے فرمایا:

ضیعت عمرك فی عمران باطنك فاین انت عن الفنا فی التوحید	اے ابراہیم! اپنے باطن کی آبادی ہی میں تم نے تو عمر ضائع کر دی توحید میں فنا ہونے کا زمانہ کب آئے گا۔؟

غرض کہ بیانِ توحید میں مشائخ کے بکثرت اقوال ہیں۔ کوئی ایسی فنا کہتا ہے جس کی فنا پر معیت درست نہ ہو اور کوئی کہتا ہے کہ اپنی فنا کے بغیر، صفتِ توحید درست نہیں ہوتی۔ حصولِ علم کے لئے اس بات کا جمع وتفرقہ پر قیاس کرنا چاہئے۔

حضور سیدنا حضرت داتا گنج بخش رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ بندے کے لئے توحید الٰہی ایسی مخفی حقیقت ہے جسے بیان وعبارت سے ظاہر نہیں کیا جا سکتا حتیٰ کہ اگر کوئی اس کے بیان کا دعویٰ کرتا ہے تو وہ یاوہ گو ہے کیونکہ بیان کرنے والا اور اس کی عبارت دونوں غیر ہیں اور توحید میں غیر کا اثبات شرک ہے اگر ایسا کرتا ہے تو یہ اس کی بیہودگی ہے کیونکہ موحد، ربانی ہوتا ہے نہ کہ یاوہ گو اور کھلاڑی؟ واللہ اعلم بالصواب۔

تیسرا کشف حجاب ایمان کے بارے میں

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْۤا اٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ (النسآء:۱۳۶)	اے ایمان والو! اللہ اور اس کے رسول پر ایمان لاؤ۔

اور ''یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا'' بکثرت ارشاد فرمایا ہے:

سید عالم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ:

اَلْاِیْمَانُ اَنْ تُؤْمِنَ بِاللّٰهِ وَمَلٰٓئِکَتِهٖ وَکُتُبِهٖ ۔آخر حدیث تک۔	ایمان یہ ہے کہ تم اللہ، اس کے فرشتے اور اس کی کتابوں پر ایمان لاؤ۔

(ترمذی، ابن ماجہ)

ایمان کے لغوی معنی تصدیق یعنی دل سے ماننے کے ہیں اور شریعت میں اثبات ایمان کے لئے بکثرت احکام واقوال اور باہم اختلاف مذکور ہے۔

معتزلہ، تمام طاعتوں کو ایمان کا علم اور اس کا معاملہ کہتے ہیں ان کا مذہب یہ ہے کہ بندہ گناہ کبیرہ کے ارتکاب سے خارج از ایمان ہو جاتا ہے۔ خوارج کا بھی یہی مذہب ہے وہ بھی مرتکب کبیرہ کو کافر کہتے ہیں اور ایک گروہ ایمان کو قولِ مفرد کہتا ہے ایک گروہ صرف معرفت کو ایمان کہتا ہے اور اہل سنت کے ارباب کلام کی ایک جماعت مطلق تصدیق کو ایمان کہتی ہے۔ میں نے اس بحث میں ایک مستقل کتاب علیحدہ لکھی ہے یہاں تو صرف صوفیاء کے اعتقاد کا اثبات مقصود ہے۔

صوفیاء کا اعتقاد:

جمہورِ صوفیاء کے نزدیک ایمان کی دو قسمیں ہیں جس طرح کہ فقہا کے نزدیک ہیں چنانچہ اہل یقین کی ایک جماعت کا اعتقاد یہ ہے کہ قول وعمل اور تصدیق کے مجموعہ کا نام ایمان ہے۔ ان میں حضرت فضیل بن عیاض، بشر حافی، خیر النساج، سمنون المحب، ابوحمزہ بغدادی اور ابو محمد جریری رحمہم اللہ کے سوا بکثرت مشائخ ہم خیال ہیں۔

ایک گروہ کا یہ اعتقاد ہے کہ قول اور تصدیق کا نام ایمان ہے۔ ان میں حضرت ابراہیم بن ادہم، ذوالنون مصری، بایزید بسطامی، ابوسلیمان درانی، حارث محاسبی، جنید بغدادی، سہل بن عبداللہ تستری، شفیق بلخی، حاتم اصم اور محمد بن فضل بلخی رحمہم اللہ کے سوا بکثرت مشائخ اور فقہائے امت ہیں۔ چنانچہ امام مالک، امام شافعی، امام احمد بن حنبل وغیرہ رحمہم اللہ پہلے قول کے قائل ہیں اور امام اعظم ابوحنیفہ، حسن بن فضل بلخی اور امام اعظم کے دیگر تلامذہ جیسے امام محمد بن حسن، حضرت داؤد طائی امام ابو یوسف رحمہم اللہ دوسرے قول کے قائل ہیں۔ درحقیقت یہ اختلاف لفظی ہے ورنہ معنی ومقصود میں سب متفق ہیں۔

ایمان کی اصل وفرع:

واضح رہنا چاہئے کہ اہل سنت و جماعت اور ارباب تحقیق ومعرفت کے درمیان اتفاق

ہے کہ ایمان میں اصل بھی اور فرع بھی، اصل ایمان، تصدیق قلبی ہے اور اس کی فرع اوامر ونواہی کی بجا آوری ہے۔ اہل عرب کا عرف ہے کہ وہ کسی فرعی بات کو بطور استعارہ اصل کہتے ہیں جیسے کہ تمام لغتوں میں شعاعِ آفتاب کو آفتاب کہا گیا ہے اسی لحاظ سے وہ گروہ طاعتوں کو ایمان کہتا ہے کیونکہ بندہ طاعت کے بغیر عذابِ الٰہی سے محفوظ نہیں رہتا اور نہ محض تصدیق محفوظ رہنے کا اقتضاء ہے جب تک کہ وہ تصدیق کے ساتھ احکام بھی نہ بجالائے لہٰذا جس کی طاعتیں زیادہ ہوں گی وہ عذابِ الٰہی سے زیادہ محفوظ ہوگا چونکہ تصدیق وقول کے ساتھ، طاعت، محفوظ رہنے کی علت ہے اس لئے اس کو بھی ایمان کہہ دیتے ہیں۔

ایک گروہ کا اعتقاد یہ ہے کہ عذاب الٰہی سے محفوظ رہنے کی علت معرفت ہے نہ کہ طاعت؟ اگرچہ طاعت بھی موجود ہو۔ جب تک معرفت نہ ہو طاعت فائدہ نہیں پہنچاتی لیکن جب معرفت موجود ہو اگرچہ طاعت موجود نہ ہو نتیجہ میں وہ نجات پا جائے گا اگرچہ یہ بات مسلم ہے کہ نجات کا حکم تحت مشیت الٰہی ہے کہ اگر وہ چاہے تو وہ اپنے فضل سے درگزر فرمائے یا حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی شفاعت سے بخش دے یا چاہے تو اس کے جرم کے مطابقت سزا دے اور دوزخ میں بھیج دے اس کے بعد بندے کو جنت میں منتقل کر دیا جائے لہٰذا اصحابِ معرفت اگرچہ مجرم ہوں بحکم معرفت وہ ہمیشہ دوزخ میں نہ رہیں گے اور صرف اہل عمل جو بے معرفت ہیں، جنت میں نہیں آئیں گے اس سے معلوم ہوا کہ طاعت محفوظ رہنے کی علت نہیں ہو سکتی۔

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ:

لَنْ يَّنْجُوَ اَحَدُكُمْ بِعَمَلِهٖ قِيْلَ وَلَا اَنْتَ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ قَالَ وَلَا اَنَا اِلَّا اَنْ يَّتَغَمَّدَنِيَ اللّٰهُ بِرَحْمَتِهٖ (بخاری)

تم میں سے کوئی بھی اپنے عمل کی وجہ سے ہرگز نجات نہیں پائے گا۔ کسی نے عرض کیا یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم آپ بھی نہیں؟ آپ نے فرمایا ہاں میں بھی نہیں لیکن اللہ تعالیٰ نے اپنی رحمت میں مجھے ڈھانپ لیا ہے۔

لہٰذا بلا اختلاف امت، ازروئے تحقیق وحقیقت، ایمان معرفت ہے اور اقرار عمل کو

بجالاتا ہے اور جسے خدا کی معرفت ہوگی اس کو اس کے کسی وصف کی بھی معرفت ہوگی۔

حق تعالیٰ کے اوصاف حسنیٰ تین قسم کے ہیں جمالؔ، جلالؔ اور کمالؔ۔ مخلوق کو اس کے کمال کی گہرائیوں تک رسائی نہیں بجز اس کے کہ وہ اس کے کمال کا اثبات و اعتراف کر لے اور اس سے نقص و عیب کی نفی کرے۔ اور جو جمالِ حق کا معرفت میں مشاہدہ کرتا ہے وہ ہمیشہ دید کا مشتاق رہتا ہے۔ جو جلال حق کا مشاہدہ کرتا ہے وہ ہمیشہ اپنے اوصاف سے متنفر رہتا ہے اور اس کا دل محل ہیبت میں رہتا ہے لہٰذا شوق، محبت کی تاثیر ہے اور بشری اوصاف سے نفرت بھی ایسا ہی ہے اس لئے کہ بشری اوصاف کے حجاب کا کشف عین محبت کے بغیر نہیں ہوسکتا اس سے معلوم ہوا کہ ایمان و معرفت کا نام محبت ہے اور علاماتِ محبت، طاعت ہے اس لئے کہ جب دل مشاہدے کا محل ہے اور آنکھیں دید کا مقام اور جان، جائے عبرت ہے تو جسم اور دل مشاہدے کا مقام ٹھہرا لہٰذا جسم کے لئے سزاوار یہی ہے کہ وہ تارکِ اوامر و نواہی نہ ہو۔ اور جس کا جسم تارک ہو اسے معرفت کی ہوا تک نہیں لگتی۔ آج کل یہ خرابی بناوٹی صوفیوں میں ظاہر ہے کیونکہ ان ملحدوں نے جب اولیاء حق کے جمال کی خوبیاں دیکھیں اور ان کی قدر و منزلت کو جانا تو وہ اپنے آپ کو ان کے جیسا بتانے لگے۔ اور کہنے لگے یہ رنج و مشقت تو اس وقت تک تھی جب تک معرفت نہ ہو اور جب معرفت حاصل ہوگئی تو جسم سے طاعت کی مشقت جاتی رہتی ہے حالانکہ یہ غلط ہے۔ ہم کہتے ہیں کہ جب معرفت حاصل ہوگئی تو دل شوق کا محل بن گیا اس وقت فرمان کی تعظیم اور زیادہ ہو جاتی ہے نہ کہ سرے سے ہی معدوم؟ اگرچہ اسے ہم جائز جانتے ہیں کہ فرمانبردار اس درجہ تک پہنچ جاتا ہے کہ اس سے طاعت کی مشقت اٹھ جاتی ہے اور اسے بالکل بار معلوم نہیں ہوتا اور فرمان کی بجا آوری میں اسے اتنی زیادہ توفیق مل جاتی ہے کہ لوگ تو اسے مشقت سمجھتے ہیں لیکن وہ اسے بے مشقت ادا کرتا ہے۔ یہ بات اس وقت حاصل ہوتی ہے جب اس میں کمال، تڑپ اور بے قراری پیدا ہو جائے۔

ایک گروہ کا یہ اعتقاد ہے کہ ایمان کلیۃً حق تعالیٰ کی طرف سے ہے اور ایک گروہ کے نزدیک کلیۃً بندے کی طرف سے ہے۔ یہ اختلاف ماوراءالنہر کے لوگوں میں طول پکڑ گیا ہے لہٰذا

جولوگ اسے کلیۃً حق کی طرف منسوب کرتے ہیں وہ خالص جبری ہیں اس لئے کہ بندہ کو چاہئے کہ وہ اس کے حصول میں بے قرار رہے اور جولوگ اسے کلیۃً بندہ کی طرف سے کہتے ہیں وہ خالص قدری ہیں۔ اس لئے کہ بندہ اعلام الٰہی کے بغیر اسے جان ہی نہیں سکتا حالانکہ توحید کی راہ جبر وقدر کے درمیان ہے یعنی جبر سے نیچے اور قدر کے اوپر۔

درحقیقت ایمان بندے کا فعل ہے جو حق تعالیٰ کی ہدایت کے ساتھ شامل ہے کیونکہ جسے خدا گمراہ کرے اسے کوئی ہدایت پر لا نہیں سکتا اور جسے خدا ہدایت پر لائے اسے کوئی گمراہ نہیں کرسکتا۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

فَمَنْ يُّرِدِ اللّٰهُ اَنْ يَّهْدِيَهٗ يَشْرَحْ صَدْرَهٗ لِلْاِسْلَامِ وَمَنْ يُّرِدْ اَنْ يُّضِلَّهٗ يَجْعَلْ صَدْرَهٗ ضَيِّقًا حَرَجًا (الانعام:۱۲۵)

جسے اللہ ہدایت پر لانا چاہے تو سینہ کو اسلام کے لئے کھول دیتا ہے اور جسے وہ گمراہ کرنا چاہے تو اس کے سینہ کو سخت اور تنگ کر دیتا ہے۔

اس ارشاد کے بموجب بندہ کے لئے یہی زیبا ہے کہ وہ ہدایت کی توفیق کو حق تعالیٰ سے اور فعل ایمان کو خود اپنے سے منسوب کرے۔

علاماتِ ایمان:

ایمان کی علامتوں میں سے یہ ہے کہ بندہ دل سے توحید کا اعتقاد رکھے، آنکھوں کو ممنوع چیزوں سے بچائے، حق تعالیٰ کی نشانیوں اور آیتوں سے عبرت حاصل کرے کانوں سے کلامِ الٰہی کی سماعت کرے، معدے کو حرام چیزوں سے خالی رکھے، زبان سے سچ بولے اور بدن کو منہیات سے اس حد تک محفوظ رکھے کہ باطن، ظاہر سے متحد ہو جائے۔ یہ سب ایمان کی علامات ہیں۔ اسی بناء پر ایک گروہ نے معرفت ایمان میں کمی وبیشی کو جائز رکھا ہے حالانکہ سب کا اتفاق ہے کہ معرفت ایمان میں کمی وبیشی جائز نہیں ہے کیونکہ اگر معرفت میں کمی وبیشی کو مانا جائے تو معروف میں بھی کمی وبیشی لازم آتی ہے جبکہ معروف میں کمی وبیشی جائز وممکن ہی نہیں تو معرفت میں بھی جائز نہ ہونی چاہئے اس کی وجہ یہ ہے کہ معرفت میں نقص وکمی نہیں ہوتی ہے۔

لہٰذا یہی مناسب ہے کہ فرع اور عمل میں کمی بیشی نہ ہو البتہ باتفاق طاعت میں کمی وبیشی جائز ہے اور حشویوں کے لئے جو ان دونوں طبقوں سے نسبت کا دعویٰ کرتے ہیں یہ مسئلہ ان کے لئے دشوار ہے کیونکہ حشویوں کا ایک گروہ طاعت کو بھی جزو ایمان کہتا ہے۔ ایک گروہ تو صرف قول ہی کو ایمان کہتا ہے حالانکہ یہ دونوں باتیں بے انصافی کی ہیں۔

غرض کہ حقیقت ایمان یہ ہے کہ بندے کے تمام اوصاف، طلب حق میں مستغرق ہوں اور تمام اہل ایمان کو اس پر اتفاق کرنا چاہئے کہ سلطانِ معرفت کا غلبہ نامرغوب اوصاف کو مغلوب کر دیتا ہے اور جہاں جہاں ایمان ہو وہاں وہاں سے اس سے انکار کے اسباب دور ہو جاتے ہیں جیسا کہ مقولہ ہے:

اذا طلع الصباح عطل المصباح — جب صبح طلوع ہو جاتی ہے تو چراغ بے کار ہو جاتے ہیں۔

اور دن کے لئے کسی دلیل و بیان کی حاجت نہیں ہوتی۔ اسی کے ہم معنی کسی کا یہ مقولہ بھی ہے کہ:

"روزِ روشن را دلیلے نباشد"

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

اِنَّ الْمُلُوْكَ اِذَا دَخَلُوْا قَرْيَةً اَفْسَدُوْهَا (النمل: ۳۴) — سلاطین جب کسی بستی پر غالب ہو کر داخل ہوتے ہیں تو اسے ویران کر دیتے ہیں۔

جب عارف کے دل میں معرفت کی حقیقت غالب ہو کر داخل ہو جاتی ہے تو ظن و شک اور انکار کی طاقت فنا کر دیتی ہے اور سلطانِ معرفت (حق تعالیٰ) اس کے حواس اور خواہشات کو اپنا گرویدہ بنالیتا ہے تا کہ وہ جو کچھ کرے، دیکھے اور جو کہے سب اسی کے زیر فرمان ہو۔

حضرت ابراہیم خواص رحمتہ اللہ علیہ سے لوگوں نے دریافت کیا کہ ایمان کی حقیقت کیا ہے؟ آپ نے فرمایا فی الحال اس کا جواب نہیں دوں گا اس لئے کہ جو کچھ کہوں گا وہ لفظ و

عبارت ہوں گے اور میرے لئے یہ ضروری ہے کہ میں معاملہ کے ساتھ جواب دوں چونکہ میں مکہ مکرمہ جانے کا ارادہ رکھتا ہوں اس غرض کے لئے تم بھی میرے ساتھ چلو تا کہ تم اس کا جواب پا سکو۔ راوی کا کہنا ہے کہ میں نے ویسا ہی کیا جب میں ان کے ساتھ جنگل میں پہنچا تو ہر روز دو روٹی اور دو گلاس پانی غیب سے نمودار ہوتے رہے جسے ایک میرے آگے اور ایک اپنے آگے رکھ لیتے یہاں تک کہ اس جنگل میں ایک روز ایک بوڑھا سوار آیا جب اس نے ان کو دیکھا تو گھوڑے سے اتر کر مزاج پرسی کی پھر کچھ دیر باتیں کر کے سوار ہو کر چلا گیا۔ میں نے عرض کیا اے شیخ! یہ بوڑھا کون تھا؟ انہوں نے فرمایا یہ تمہارے سوال کا جواب تھا۔ میں نے پوچھا کس طرح؟ فرمایا وہ حضرت خضر علیہ السلام تھے۔ انہوں نے میرے ساتھ رہنے کی اجازت چاہی میں نے منظور نہیں کیا۔ میں نے کہا آپ نے کیوں انکار فرمایا؟ انہوں نے جواب دیا مجھے خطرہ تھا کہ ان کی صحبت میں میرا اعتقاد، حق تعالیٰ کے سوا ان کے ساتھ نہ ہو جائے۔ اسی طرح میرا توکل برباد ہو جائے کیونکہ ایمان کی حقیقت توکل کی حفاظت ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

وَعَلَى اللّٰهِ فَتَوَكَّلُوْٓا اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ (المآئدہ:۲۳)	اللہ تعالیٰ ہی پر توکل رکھو اگر تم صاحب ایمان ہو۔

حضرت محمد بن خفیف رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ:

الایمان تصدیق القلب بما علم به الغیوب	ایمان یہ ہے کہ جو غیب سے اس کے دل پر انکشاف ہو اس پر یقین رکھے۔

اسی لئے ایمان غیب کے ساتھ ہے اور اللہ تعالیٰ سر کی آنکھوں سے غائب ہے جب تک معنی میں تقویت نہ ہو بندہ کا یقین ظاہر نہیں ہو سکتا اور یہ اللہ تعالیٰ کے معلوم کرانے سے حاصل ہوتا ہے۔ جب عارفوں کا تعارف کرانے والا اور عالموں کو معلوم کرانے والا اللہ تعالیٰ ہی ہے اور وہی ان کے دلوں میں معرفت و علم پیدا کرتا ہے تو علم و معرفت کا اختیار بندے کے کسب سے جاتا رہا۔ لہٰذا جس کا دل معرفت الٰہی پر یقین رکھتا ہے وہ مومن ہے اور حق تعالیٰ کے ساتھ واصل ہے۔ اہل بصیرت کے لئے اس قدر بیان کافی ہے چونکہ اس کتاب میں جگہ جگہ مقصود کی

وضاحت کی جاچکی ہے۔اب اَسرارِ معاملات کے حجابات کھولتا ہوں۔

چوتھا کشف حجاب

نجاست سے پاک ہونے کے بیان میں

ایمان کے بعد سب سے پہلا فرض طہارت ہے خاص کر نماز کی ادائیگی کے لئے طہارت بدنی یہ ہے کہ تمام جسم کو نجاست و جنابت سے پاک کرے اور شریعت کے اتباع میں تین اندامون کو دھو کر سر کا مسح کرے۔ اگر پانی میسر نہ ہو یا مرض کی زیادتی کا اندیشہ ہو تو تیمم کرے۔ان کے احکام سب کو معلوم ہیں۔

واضح رہنا چاہئے کہ طہارت دو قسم کی ہے، ایک باطنی طہارت، دوسری ظاہری طہارت، چنانچہ ظاہری طہارت کے بغیر نماز درست نہیں اور باطنی طہارت کے بغیر معرفت درست نہیں ہے۔ بدنی طہارت کے لئے مطلق پانی کی حاجت ہے جو کہ ناپاک یا استعمال کیا ہوا نہ ہو اور دل کی طہارت کے لئے خالص توحید کے پانی کی ضرورت ہے جو کہ مخلوط اور پراگندہ اعتقاد پر مشتمل نہ ہو۔ طریقت کے مشائخ ظاہری طور پر ہمیشہ پاک و طاہر ہوتے ہیں اور باطنی حالت میں بھی توحید کے ساتھ پاک و مطہر ہوتے ہیں۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک صحابی سے ارشاد فرمایا:

دُمْ عَلَى الْوُضُوْءِ يُحِبُّكَ حَافِظَاكَ — ہمیشہ وضو سے رہو تمہیں تمہارا محافظ دوست رکھے گا۔

جو لوگ ظاہری طہارت پر عمل پیرا رہتے ہیں فرشتے ان کو دوست رکھتے ہیں اور جس کا باطن توحید سے پاک و مطہر ہے اللہ تعالیٰ ان کو دوست رکھتا ہے۔ سید عالم صلی اللہ علیہ وسلم ہمیشہ اپنی دعاؤں میں یہ کہا کرتے تھے کہ:

اَللّٰھُمَّ طَهِّرْ قَلْبِىْ مِنَ النِّفَاقِ — اے خدا میرے دل کو باطنی آلودگیوں سے پاک رکھ۔

اور کسی قسم کی باطنی آلودگی آپ کے قلب اطہر تک نہیں پہنچ سکی۔ اپنی بزرگیوں کو دیکھنا غیر خدا کا اثبات کرنا ہے اور غیر کا اثبات، مقام توحید میں نفاق ڈالنا ہے۔ مانا کہ مریدانِ باصفا اپنے مشائخ کی کرامتوں اور بزرگیوں کو سرمۂ بصیرت بناتے ہیں لیکن آخر کاران کے کمال کے مقام میں بہت بڑا حجاب ہے اس لئے کہ جو بھی غیر ہو اس کی دید آفت ہے۔ حضرت بایزید بسطامی رحمتہ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ:

نفاق العارفین افضل من اخلاص المریدین	عارفوں کا نفاق، مریدوں کے اخلاص سے افضل ہے۔

مطلب یہ ہے کہ جو مرید کا مقام ہوتا ہے وہ کامل کا حجاب ہے۔ مرید کی ہمت یہ ہوتی ہے کہ کرامت حاصل کرے اور کامل کی یہ ہمت ہوتی ہے کہ کرامت دینے والے کو پائے۔ غرض کہ اثبات کرامت، اہل حق کے لئے نفاق نظر آتا ہے کیونکہ اس کی دید بھی معائنہ غیر ہے اسی طرح حق تعالیٰ کے دوست جسے آفت جانتے ہیں اسے تمام گنہگار معصیت سے نجات سمجھتے ہیں اور گنہگاروں کے معاصی کو گمراہ لوگ نجات جانتے ہیں کیونکہ اگر کافر، جانتے کہ ان کے گناہ خدا کو ناپسند ہیں جیسا کہ گنہگار جانتے ہیں تو وہ کفر سے نجات پاتے اور گنہگار جانتے کہ ان کے تمام معاملات محل علت ہیں یعنی سقیم ہیں جیسا کہ محبوبانِ خدا جانتے ہیں تو وہ سب معاصی سے نجات پا کر تمام آفتوں سے پاک ہو جاتے لہٰذا مناسب یہی ہے کہ ظاہری طہارت باطنی طہارت کے موافق ہو۔ مطلب یہ ہے کہ جب ہاتھ دھوئے جائیں تو چاہئے کہ دل سے دنیا کی محبت دھو ڈالی جائے۔ اسی طرح جب استنجا کرے تو مناسب ہے کہ جس طرح ظاہری گندگی کو دور کیا جائے اسی طرح باطن سے بھی غیر خدا کی محبت کو دور کر دیا جائے۔ جب منہ میں پانی لیا جائے تو مناسب ہے کہ منہ کو غیر کی یاد سے پاک کرے۔ جب ناک میں پانی ڈالے تو سزاوار ہے کہ شہوتوں کو اپنے اوپر حرام گردانے، جب چہرہ دھوئے تو مناسب ہے کہ تمام الفتوں سے یکدم کنارہ کش ہو جائے اور حق کی طرف متوجہ ہو جائے اور جب ہاتھوں کو دھوئے تو اپنے نصیبوں سے دست کش ہو جائے اور جب سر کا مسح کرے تو مناسب ہے کہ اپنے معاملات کو حق تعالیٰ کے

سپرد کر دے جب پاؤں دھوئے تو زیبا ہے کہ فرمانِ الٰہی کے خلاف ہر چیز پر قائم رہنے سے بچنے کی نیت کرے جب اس پر عمل کرے گا تو اسے دونوں قسم کی طہارت حاصل ہو جائے گی اس لئے کہ تمام ظاہری شرعی امور باطن کے ساتھ ہوئے ہیں یہی خاصہ ایمان ہے کہ ظاہر میں زبان سے اقرار ہو تو باطن میں اس کی تصدیق بھی۔ نیت کا تعلق دل سے ہے۔ شریعت میں طاعت کے احکام جسم ظاہری پر ہیں۔ لہٰذا دل کی طہارت کا طریقہ، دنیا کی آفت میں غور و فکر کرنا ہے اور یہ دیکھنا ہے کہ دنیا غداری کی جگہ اور محل فنا ہے۔ دل کو اس سے خالی کرے۔ یہ کیفیت کثرتِ مجاہدے کی ذریعہ حاصل ہوتی ہے اور مجاہدے میں اہم ترین بات ظاہری آداب کی حفاظت اور ہر حال میں اس پر مداومت ہے۔

حضرت ابراہیم خواص رحمتہ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ مجھے حق تعالیٰ کے حقوق ادا کرنے کے لئے دنیا میں ابدی عمر کی ضرورت ہے۔ یہاں تک کہ اگر ساری مخلوق خدا کو بھول جائے اور دنیاوی نعمتوں میں مست ہو جائے تو میں اکیلا و تنہا دنیا کی بلاؤں میں شریعت کے آداب کے تحفظ میں کھڑا ہو جاؤں، اور حق تعالیٰ کی یاد میں منہمک رہوں۔ واللہ اعلم بالصواب۔

حضرت ابو طاہر حرمی مکہ مکرمہ میں چالیس سال اس حال میں مقیم رہے کہ کبھی رفع حاجت نہ کی جب بھی وہ حدودِ حرم سے باہر رفع حاجت کے لئے جاتے خیال آجاتا کہ یہ وہ زمین ہے جسے حق تعالیٰ نے اپنے ساتھ منسوب فرمایا ہے استعمال شدہ پانی کو بھی اس جگہ گرانا مکروہ سمجھا۔

حضرت ابراہیم خواص رحمتہ اللہ علیہ کا واقعہ ہے کہ رَے کی جامع مسجد میں مرض اسہال لاحق ہوا۔ دن رات میں انہوں نے ساٹھ مرتبہ غسل کیا بالآخر ان کی وفات پانی ہی میں واقع ہوئی۔

حضرت علی رود باری رحمتہ اللہ علیہ عرصہ تک وسوسۂ طہارت میں مبتلا رہے وہ فرماتے ہیں کہ ایک دن دریا میں صبح سے ٹھہرا ہوا تھا یہاں تک کہ سورج نکل آیا اور میں پانی ہی میں رہا اس وقت دل میں رنج پیدا ہوا میں نے خدا سے التجا کی کہ "العافیہ العافیہ" دریا سے مجھے

غیبی آواز سنائی دی کہ ''العافیة فی العلم'' آرام علم میں ہے۔

حضرت ابوسفیان ثوری رحمتہ اللہ علیہ نے بیماری کی حالت میں ایک نماز کے لئے ساٹھ مرتبہ طہارت کی۔ مرض موت میں انتقال کے دن خدا سے دعا مانگی کہ اے خدا موت کو حکم دے کہ وہ اس وقت آئے جب کہ میں پاک وصاف ہوں۔

حضرت شبلی علیہ الرحمۃ نے ایک دن مسجد میں جانے کے لئے طہارت کی۔ غیب سے ندا آئی کہ تم نے ظاہر کو تو آراستہ کر لیا باطن کی صفائی کہاں ہے؟ وہ لوٹ آئے اور تمام ساز و سامان صدقہ کر دیا اور ایک سال تک صرف اسی قدر لباس پہنا جس سے نماز جائز ہو سکے پھر جب حضرت جنید بغدادی رحمتہ اللہ علیہ کے پاس وہ حاضر ہوئے تو فرمایا اے ابوبکر! جو طہارت تم نے کی ہے وہ بہت سود مند ہے۔ اللہ تعالیٰ تمہیں اس طہارت پر ہمیشہ قائم رکھے اس کے بعد حضرت شبلی آخر وقت تک کبھی بے طہارت نہ رہے جب ان کے انتقال کا وقت آیا تو ان کی طہارت ٹوٹ گئی آپ نے اپنے مرید کی طرف اشارہ فرمایا کہ مجھے طہارت کرائے۔ مرید نے انہیں طہارت کرائی لیکن داڑھی میں خلال کرنا وہ بھول گیا اور اس وقت ان میں کلام کرنے کی سکت نہ تھی، مرید کا ہاتھ پکڑ کر داڑھی کی طرف اشارہ فرمایا پھر اس نے داڑھی میں خلال کیا آپ فرمایا کرتے تھے کہ میں نے کبھی طہارت کا کوئی ادب ترک نہیں کیا جب بھی ایسا ہوا میرے باطن پر نصیحت ظاہر ہوگئی۔

حضرت بایزید بسطامی رحمتہ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ جب کبھی میرے دل پر دنیا کا اندیشہ گزرتا میں فوراً وضو کر لیتا اور جب آخرت کا اندیشہ گزرتا تو غسل کر لیتا کیونکہ دنیا محدث ہے اس کا اندیشہ حدث ہے اور آخرت محل غیبت و آرام ہے اس کا اندیشہ جنابت ہے۔ لہٰذا حدث سے وضو اور جنابت سے غسل واجب ہو جاتا ہے۔

حضرت شبلی علیہ الرحمۃ ایک دن وضو کے بعد جب مسجد کے دروازے پر آئے تو ان کے دل میں آواز آئی کہ اے ابوبکر تم ایسی طہارت رکھتے ہو اور اس گستاخی کے ساتھ ہمارے گھر میں داخل ہونا چاہتے ہو۔ جب یہ سنا تو واپس لوٹے پھر ندا آئی کہ ہمارے دروازے سے ہٹ

کر کدھر کا ارادہ ہے؟ یہ سن کر ان کی چیخ نکل گئی۔ ندا آئی ہم پر طعنہ کرتے ہو۔ وہ اپنی جگہ خاموش کھڑے ہو گئے۔ پھر آواز آئی کہ تم ہمارے سامنے بلا کے تحمل کا دعویٰ کرتے ہو۔ اس وقت حضرت شبلی نے پکارا:

المستغاث منك اليك — اے خدا تیری جانب سے تیری ہی طرف فریاد ہے۔

طہارت کی تحقیق میں مشائخ کے بکثرت ارشادات ہیں وہ ہمیشہ مریدوں کو ظاہر و باطن کی طہارت کا حکم دیتے رہے ہیں کہ جب بارگاہِ الٰہی میں حاضر ہونے کا ارادہ کرو تو ظاہری عبادت کے لئے ظاہری طہارت کرو اور جب باطن میں قربت کا قصد کرو تو باطن کی طہارت کرو ظاہری طہارت پانی سے ہے اور باطنی طہارت توبہ و رجوع کے ذریعہ ہے۔ اب میں توبہ اور اس کے متعلقات کی تشریح کرتا ہوں۔

توبہ اور اس کے متعلقات کا بیان

واضح رہنا چاہئے کہ سالکانِ راہِ حق کا پہلا مقام توبہ ہے جس طرح کہ طالبانِ عبادت کے لئے پہلا درجہ طہارت ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا تُوْبُوْٓا اِلَى اللّٰهِ تَوْبَةً نَّصُوْحًا (التحریم:۸) — اے ایمان والو! اللہ کے حضور میں دل سے توبہ کرو۔

نیز ارشاد ہے:

"وَتُوْبُوْٓا اِلَى اللّٰهِ جَمِيْعًا اَيُّهَ الْمُؤْمِنُوْنَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ"

(النور:۳۱)

"اے مومنو! تم سب اللہ کے حضور میں توبہ کرو تاکہ تم فلاح پاؤ"

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:

مَامِنْ شَيْءٍ اَحَبُّ اِلَى اللهِ مِنْ شَابٍ تَائِبٍ

اللہ کے نزدیک کوئی چیز اس سے زیادہ پسندیدہ نہیں کہ جوان آدمی توبہ کرے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

اَلتَّائِبُ مِنَ الذَّنْبِ كَمَنْ لَّا ذَنْبَ لَهٗ

گناہ سے توبہ کرنے والا ایسا ہے جیسا کہ اس کا کوئی گناہ ہی نہیں۔

آپ کا یہ بھی ارشاد ہے کہ:

اِذَا اَحَبَّ اللهُ عَبْدًا لَمْ يَضُرُّهٗ ذَنْبٌ

اللہ تعالیٰ جب بندہ کو محبوب بنالیتا ہے تو اسے گناہ کوئی نقصان نہیں پہنچاتا۔

کسی نے عرض کیا توبہ کی علت کیا ہے؟ فرمایا ندامت، لیکن یہ جو فرمایا کہ دوستوں کے لئے گناہ نقصان رساں نہیں ہوتا تو اس کا مطلب یہ ہے کہ گناہ سے بندہ کافر نہیں ہوتا اور نہ اس کے ایمان میں خلل ہوتا ہے بشرطیکہ گناہ، ایمان کو ضائع نہ کرے۔ ایسی معصیت کا نقصان، جس کا انجام کار نجات ہے درحقیقت نقصان وضیاع نہیں ہے۔

واضح رہنا چاہئے کہ لغت میں توبہ کے معنی رجوع کرنے کے ہیں۔ چنانچہ کہا جاتا ہے کہ "تاب ای رجع" لہٰذا حق تعالیٰ کی ممنوعات سے باز رہنا اس لئے کہ اسے خدا کے حکم کا خوف ہے اصل میں یہی توبہ کی حقیقت ہے۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ "الندم التوبة" ندامت وشرمندگی کا نام ہی توبہ ہے۔ یہ ایسا ارشاد ہے کہ جس میں توبہ کے تمام شرائط پنہاں ہیں۔

توبہ کی شرائط:

توبہ کی تین شرطیں ہیں۔ ایک تو یہ کہ مخالفت پر اظہارِ ندامت وافسوس کرے دوسرے یہ کہ ترکِ حالت میں ذلت محسوس کرے۔ تیسرے یہ کہ دوبارہ گناہ نہ کرے۔ شرائط کی یہ تینوں باتیں ندامت میں موجود ہیں کیونکہ جب دل میں ندامت پیدا ہوتی ہے تو پہلی دونوں شرطیں اور تیسری شرط ان کے ضمن میں پائی جاتی ہیں۔

ندامت کے بھی تین سبب ہیں جس طرح توبہ کی تین شرطیں ہیں۔ ندامت کا پہلا

سبب یہ ہے کہ جب دل پر سزا کا خوف غلبہ پاتا ہے تب وہ برے افعال پر دل آزردہ ہوتا ہے اور ندامت پیدا ہوتی ہے۔ دوسرا سبب یہ ہے کہ جب نعمت کی خواہش اس کے دل پر غالب ہو جائے اور وہ جان لے کہ برے فعل اور نافرمانی سے وہ حاصل نہیں ہو سکتی تو وہ اس سے پشیمان ہو جاتا ہے اور تیسرا سبب یہ ہے کہ اس کے دل میں اللہ کی شرم وحیا آجاتی ہے اور وہ مخالفت پر پشیمان ہوتا ہے۔ لہٰذا پہلے کو تائب دوسرے کو منیب اور تیسرے کو اواب کہتے ہیں۔ اسی طرح توبہ کے بھی تین مقام ہیں۔ ایک توبہ دوسری انابت تیسری اوابت۔ لہٰذا توبہ عذاب کے ڈر سے، انابت حصولِ ثواب کے لئے اور اوابت، فرمان کی رعایت سے ہے۔ اسی وجہ سے توبہ عام مسلمانوں کا مقام ہے جو گناہ کبیرہ سے پیدا ہوتا ہے کیونکہ حق تعالیٰ فرماتا ہے:

مَنْ خَشِیَ الرَّحْمٰنَ بِالْغَیْبِ وَجَآءَ بِقَلْبٍ مُّنِیْبٍ (ق: ۳۳) — جو خدا سے بحالت غیوبت ڈرے اور انابت والا دل لائے۔

اوابت، انبیاء و مرسلین کا مقام ہے کیونکہ حق تعالیٰ فرماتا ہے:

نِعْمَ الْعَبْدُ اِنَّہٗٓ اَوَّابٌ (ص: ۴۴) — کتنا اچھا بندہ ہے کہ ہر حال میں رجوع ہوتا ہے۔

غرض کہ طاعت کے ساتھ کبائر سے رجوع کا نام توبہ ہے اور محبت میں صغائر سے رجوع کا نام انابت ہے اور از خود خدا کی طرف رجوع کا نام اوابت ہے۔ یہ ان کے درمیان فرق ہے جو فواحش سے اوامر کی طرف رجوع کرے اور وہ جو محبت میں حجت اور فاسد اندیشہ سے رجوع کرے اور جو اپنی خودی سے حق کی طرف رجوع کرے۔

توبہ کی اصل، حق تعالیٰ کا آگاہ اور خبردار کرنا اور خوابِ غفلت سے دل کو بیدار کرنا اور اپنے حال کی غیبت کو دیکھنا ہے۔ جب بندہ اپنے برے افعال اور قبیح افعال میں غور وفکر کرتا ہے اور اس سے نجات کی کوشش کرتا ہے تو حق تعالیٰ اس پر توبہ کے اسباب آسان فرما دیتا ہے اور اسے اس کی معصیت کی برائی سے نکال کر اپنی طاعت کی شیرینی میں پہنچا دیتا ہے۔

اہل سنت و جماعت اور مشائخ طریقت کے نزدیک جائز ہے کہ بندہ کسی ایک گناہ

سے توتوبہ کرلے لیکن وہ کسی دوسرے گناہ میں مبتلا ہو جائے۔ اس کے باوجود حق تعالیٰ اس گناہ سے توبہ کے بدلے اسے ثواب عطا فرمائے گا اور ممکن ہے کہ اس توبہ کی برکت سے وہ دوسرے گناہ کے ارتکاب سے بھی باز آجائے مثلاً کوئی شرابی وزانی، زنا سے توتوبہ کرلے مگر شراب خوری پر مصر رہے تو اس کی توبہ دوسرے گناہ کے ارتکاب کے باوجود درست ہوگی لیکن معتزلہ کا وہ گروہ جسے ''بہشمی'' کہتے ہیں اس کا قول ہے کہ توبہ اس وقت تک صحیح نہیں ہوسکتی جب تک کہ بندہ تمام گناہوں سے توبہ نہ کرے۔ یہ نظریہ محال ہے اس لئے کہ تمام معاصی پر جو بندہ کرے اسے ان سب کی وجہ سے عذاب ہوتا ہے لیکن جب بندہ معاصی کی کسی ایک قسم کو چھوڑ دیتا ہے تو وہ اس قسم کے معاصی کے عذاب سے محفوظ ہو جاتا ہے۔ لامحالہ وہ اس سے تائب ہوا۔ اسی طرح اگر کوئی بندہ بعض فرائض بجالاتا ہے اور بعض کو چھوڑ دیتا ہے تو وہ جتنا کرے گا لامحالہ اس کا اسے ثواب ملے گا اور جتنا نہیں کرے گا اس کی اسے سزا ملے گی اور اگر کسی کے پاس معصیت کا آلہ ہی نہیں ہے اور نہ اس کے اسباب موجود ہیں پھر وہ توبہ کرتا ہے تو وہ تائب ہی کہلائے گا اس لئے کہ توبہ کا ایک رکن ندامت ہے اور اسے اس توبہ کے ذریعہ گزشتہ پر ندامت حاصل ہے۔ فی الحال گناہ کی اس جنس سے کنارہ کشی کرلی ہے اور ارادہ رکھتا ہے کہ اگر وہ آلہ موجود ہو جائے اور سبب بھی مہیا ہو جائے تو بھی میں ہرگز اس گناہ کا ارتکاب نہ کروں گا۔

توبہ کے بارے میں مشائخ کے ارشادات

حضرت سہل بن عبداللہ تستری رحمتہ اللہ علیہ اور ایک جماعت کا مذہب یہ ہے کہ ''التوبة ان لاتنسی ذنبك'' توبہ یہ ہو کہ کئے ہوئے گناہوں کو نہ بھولو اور اس کی ندامت میں ہمیشہ غرق رہو اگرچہ کتنے ہی زیادہ اعمال صالحہ ہو جائیں ان پر غرور نہ کرو اس لئے کہ برے فعل پر شرمندگی، اعمال صالحہ پر مقدم ہے۔ ایسا شخص کبھی گھمنڈ نہ کرے اور نہ گناہ کو فراموش کرے۔

حضرت جنید بغدادی رحمتہ اللہ علیہ اور مشائخ کی ایک جماعت کا مذہب یہ ہے کہ ''التوبة ان تنسی ذنبك'' کہ توبہ یہ ہے کہ کئے ہوئے گناہ کو بھول جاؤ کیونکہ توبہ کرنے والا

اہل محبت سے ہوتا ہے اور محبت والا مشاہدے میں ہوتا ہے اور مشاہدہ میں گناہ کی یاد ظلم ہے کیونکہ وہ کچھ عرصہ تو شقاوت میں رہا پھر کچھ عرصہ حالتِ وفا میں جفا کی یاد میں تڑپا حالانکہ وفا میں جفا کی یاد، وفا میں حجاب ہوتا ہے اور نافرمانی سے رجوع کرنا مجاہدہ ہے اور مشاہدے سے وابستہ ہوتا ہے۔

اس بیان کی تفصیل مذہب سہیلیاں میں دیکھنی چاہئے جو کہ تائب کو بخود قائم کہتے ہیں اور اس کے گناہ کے فراموش کرنے کو غفلت سمجھتے ہیں اور جو تائب کو حق کے ساتھ قائم کہتے اور اس کے گناہ کی یاد کو شرک بتاتے ہیں۔

غرض کہ تائب اگر اپنی صفت میں باقی رہے تو اس کے گناہ کی عقدہ کشائی نہیں ہو سکتی اور اگر وہ صفت میں فانی ہے تو اس کے لئے اس کی یاد درست نہیں ہوتی۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے بحالت بقائے صفت کہا "تبت الیك" میں نے تیری طرف رجوع کیا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بحالت فنائے صفت کہا "لَا اُحْصِیْ ثَنَاءً عَلَیْكَ" میں تیری ثنا کا احاطہ نہیں کر سکتا۔

خلاصہ یہ کہ مقام قربت میں وحشت کی یاد وحشت ہوتی ہے۔ تائب کے لئے زیبا یہی ہے کہ وہ اپنی خودی کو بھی یاد نہ کرے چہ جائیکہ وہ اپنے گناہوں کو یاد رکھے۔ درحقیقت اپنے گناہ کی یاد بھی اس مقام میں گناہ ہے کیونکہ یہ محل اعراض ہے۔ جب گناہ محل اعراض ہے تو اس کی یاد بھی محل اعراض ہی ہوگی۔ جیسے جرم کی یاد جرم ہے۔ اس طرح اس کا بھول جانا بھی جرم ہے کیونکہ ذکر و نسیان دونوں کا تعلق توبہ سے ہے۔

حضرت جنید بغدادی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ میں نے بکثرت کتابیں پڑھی ہیں کسی نے مجھے اتنا فائدہ نہ دیا جتنا اس شعر نے دیا ہے:

اذا قلت ما اذنبت قالت مجیبة

حیٰوتك ذنب لا یقاس بہ ذنب

جب میں نے کہا میں نے کیا گناہ کیا ہے تو جواب دینے والے نے کہا۔

تیری زندگی ہی گناہ ہے اس کی موجودگی میں کسی اور گناہ کے قیاس کرنے کی ضرورت ہی

کیا؟ جب کہ دوست کی بارگاہ میں دوست کا وجود ہی گناہ ہے تو اس کے وصف کی کیا قدر و قیمت ہوگی؟

غرض کہ توبہ تائید ربانی ہے اور معاصی، فعل جسمانی ہے۔ جب دل میں ندامت پیدا ہو جائے تو جسم میں کوئی سامان نہیں رہتا جو دل کی ندامت کو دور کر سکے اور جب اس کی ندامت ابتدائے فعل میں توبہ کو مانع نہیں تو جب فعل کی انتہا ہو جائے تو اس کی وہ کیسے مانع ہوگی۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

فَتَابَ عَلَيْهِ اِنَّهُ هُوَ التَّوَّابُ الرَّحِيْمُ (البقرہ:۳۷)

بندے نے اپنے افعال پر توبہ کی تو اللہ تعالیٰ نے اس کی توبہ قبول فرمائی وہی توبہ قبول کرنے والا اور مہربان ہے۔

قرآن کریم میں اس کے نظائر و شواہد بکثرت موجود ہیں ان کے بیان کرنے کی حاجت نہیں۔

توبہ کس سے کس کی طرف:

توبہ کی تین قسمیں ہیں ایک خطا سے راہ ثواب کی طرف دوسرے درستگی سے مزید درستگی کی طرف تیسرے اپنی خودی سے حق تعالیٰ کی طرف لیکن خطا سے راہ صواب پر گامزن ہونے کے بارے میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

وَالَّذِيْنَ اِذَا فَعَلُوْا فَاحِشَةً اَوْ ظَلَمُوْا اَنْفُسَهُمْ ذَكَرُوا اللّٰهَ فَاسْتَغْفِرُوْا لِذُنُوْبِهِمْ (آل عمران:۱۳۵)

وہ لوگ جنہوں نے برے کام کئے اور اپنی جانوں پر ظلم کیا تو انہوں نے خدا کو یاد کر کے اپنے گناہوں کی مغفرت مانگی۔

اور وہ جو درستگی سے مزید درستگی کی طرف رجوع ہے اس کی مثال حضرت موسیٰ علیہ السلام جیسی ہے کہ انہوں نے کہا " تُبْتُ اِلَيْكَ " میں تیری طرف رجوع ہوں اور وہ جو اپنی خودی سے حق تعالیٰ کی طرف رجوع ہے اس کی مثال حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد ہے

کہ:

وَاِنَّهٗ لَيُغَانُ عَلٰى قَلْبِىْ اِنِّىْ كُنْتُ لَاَسْتَغْفِرُ اللّٰهَ فِىْ كُلِّ يَوْمٍ سَبْعِيْنَ مَرَّةً (ابن ماجہ، بخاری)

جب میرے دل پر ہلکا سا ابر آ جاتا ہے تو اس وقت روزانہ ستر مرتبہ خدا سے استغفار کرتا ہوں۔

ارتکاب خطا و معصیت غایت درجہ قبیح فعل ہے اور خطا و معصیت سے راہِ صواب کی طرف رجوع و توبہ عمدہ اور پسندیدہ عمل ہے۔ یہ عام لوگوں کی توبہ ہے، اور اس کا عمل ظاہر ہے اور راہِ صواب پر گامزن رہتے ہوئے اس کی موجودہ حالت پر توقف باعث حجاب ہوتا ہے۔ موجودہ راہِ صواب سے آگے کے راہِ صواب کی طرف رجوع کرنا اہل ہمت کے نزدیک غایت درجہ عمل محمود ہے یہ خاص بندوں کی توبہ ہے اور یہ محال ہے کہ خواص معصیت سے توبہ نہ کریں۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام کے دل میں اس دنیا کے اندر جب دیدارِ الٰہی کی آرزو پیدا ہوئی تو انہوں نے اس سے توبہ کی اس لئے کہ دیدار کی خواہش اپنے اختیار سے تھی اور دوستی میں اختیار آفت ہوتی ہے اور اپنے اختیار کی آفت کو ترک کرنا لوگوں کے لئے ترک رویت اور درجہ محبت میں اپنی خودی سے حق کی طرف رجوع کرنے کی صورت میں نمودار ہوئی جیسا کہ مقام عالی پر وقوف آفت ہے اس سے توبہ کر کے اس سے بلند تر مقام پر فائز ہوتے ہیں اسی طرح مقام اور احوال کی دید ۔سے بھی توبہ کی جاتی ہے چنانچہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے مقامات ہر آن ترقی پر رہے جب کسی عالی مقام پر پہنچتے تو اس سے نیچے مقام کے وقوف پر استغفار کیا کرتے تھے اور اس مقام کی دید سے توبہ بجالاتے تھے۔ واللہ اعلم بالصواب

بار بار ارتکاب گناہ کا مسئلہ:

واضح رہنا چاہئے کہ جب بندہ عہد کرے کہ آئندہ گناہ نہ کرے گا تو اس کی توبہ کے لئے تائید ربانی شرط نہیں ہے۔ اگر تائب پر پھر ایسا وقت آجائے کہ عہد کے باوجود گناہ سرزد ہو تو دوبارہ توبہ کرنا اس کی درستگی کے حکم میں ہوگا۔ طریقت کے مبتدیوں اور تائبوں سے ایسا ہوا ہے کہ توبہ کرلی ہے پھر فساد لاحق ہوا اور معصیت کا ارتکاب ہوگیا۔ پھر جب خبردار ہوئے تو اس سے

دوبارہ توبہ کی ہے۔ یہاں تک کہ ایک بزرگ بیان کرتے ہیں کہ میں نے ستر (۷۰) بار توبہ کی ہے اور ہر توبہ کے بعد برابر معصیت کا صدور ہوتا رہا ہے اکہتر ویں (۷۱) مرتبہ توبہ کے بعد استقامت میسر آئی۔

حضرت ابوعمر نے حضرت جنید بغدادی رحمتہ اللہ علیہ سے بیان کیا کہ میں نے ابتداء میں حضرت ابوعثمان حیری رحمتہ اللہ علیہ کی مجلس میں توبہ کی اور اس پر کچھ عرصہ قائم رہا پھر میرے دل میں معصیت کی چاہت پیدا ہوئی اور میں نے ارتکاب کر لیا اور اس بزرگ کی صحبت سے روگرداں ہو گیا جب بھی میں انہیں دور سے دیکھتا تو میں شرمندہ ہو کر ادھر ادھر ہو جاتا کہ ان کے نظر مجھ پر نہ پڑے اتفاق سے میرا ان کا آمنا سامنا ہو گیا۔ انہوں نے فرمایا اے فرزند! تم اپنے دشمنوں کے ساتھ نہ رہا کرو کیونکہ ابھی تم معصوم ہو اس لئے کہ دشمن تمہارے عیب کو دیکھتا ہے اور جب تم انہیں عیب دار نظر آتے ہو تو وہ خوش ہوتے ہیں اور جب تم گناہ سے معصوم ہوتے ہو تو انہیں رنج پہنچتا ہے اگر تمہاری خواہش یہی ہے کہ معصیت میں مبتلا رہو تو ہمارے پاس آیا کرو تا کہ ہم تمہاری مصیبت و بلا کو دور کر دیا کریں اور تمہارے دشمنوں کو خوش ہونے کا موقعہ نہ دیں۔ حضرت ابوعمر بیان کرتے ہیں کہ اس کے بعد میرا دل گناہ سے سیر ہو گیا اور صحیح توبہ نصیب ہو گئی۔

میں نے سنا ہے کہ ایک شخص نے گناہوں سے توبہ کی اس کے بعد پھر اس سے گناہ سرزد ہو گیا جس سے وہ بہت شرمسار ہوا۔ ایک دن اس نے اپنے دل میں کہا اگر اب میں دوبارہ توبہ کر کے راہِ صواب اختیار کر لوں تو میرا حال کیا ہو گا؟ ہاتف نے آواز دی:

"اطعتنا فشكرناك ثم تركتنا فامهلناك فان عدت الينا قبلنالك"

تو نے ہماری اطاعت کی ہم نے اسے قبول کیا پھر تو نے بے وفائی کی اور ہمیں چھوڑ دیا تو ہم نے تجھے مہلت دی اب تو اگر توبہ کر کے ہماری طرف آئے تو ہم پھر تجھے قبول کر لیں گے۔

توبہ میں اقوال مشائخ:

حضرت ذوالنون مصری رحمتہ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ:

توبة العوام من الذنوب وتوبة الخواص من الغفلت	عوام کی توبہ گناہوں سے اور خواص کی توبہ غفلت سے ہے۔

کیونکہ عوام سے صرف ظاہر حال پوچھا جائے گا اور خواص سے معاملہ کی تحقیق کی جائے گی عوام کے لئے غفلت نعمت اور خواص کے لئے حجاب ہے۔ حضرت ابو حفص رحمتہ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ:

لیس للعبد فی التوبة شیئی لان التوبة الیه لامنه	بندے کو توبہ میں کوئی دخل نہیں ہے اس لئے کہ توبہ حق تعالیٰ کی طرف سے ہے نہ کہ بندے کی جانب سے۔

اس قول سے لازم آتا ہے کہ توبہ بندے کا عمل نہیں ہے بلکہ حق تعالیٰ کی عطاو بخشش ہے یہی جنیدی مذہب ہے۔

حضرت ابوالحسن بوشنجہ رحمتہ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ ''التوبة اذا ذکرت الذنب ثم لاتجد حلاوة عند ذکرہ فھو التوبة'' توبہ یہ ہے کہ جب تم گناہ کو یاد کرو تو اس کی یاد میں تمہیں لذت و سرور نہ معلوم ہو تو ایسی توبہ صحیح ہے اس لئے کہ گناہ کی یاد، یا تو حسرت سے ہوگی یا ارادہ و خواہش سے۔ اگر کوئی حسرت و ندامت سے اپنی معصیت یاد کرتا ہے تو وہ تائب ہے اور اگر ارادہ و خواہش سے اسے یاد کرتا ہے تو وہ گنہگار ہے کیونکہ ارتکاب معصیت میں اتنی آفت نہیں جتنی اس کے ارادہ و خواہش میں ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ ارتکاب گناہ کچھ لمحہ کا ہوتا ہے لیکن اس کا ارادہ و خواہش مستقل اور دائمی ہے۔ جس کا جسم ایک لمحہ کے لئے گناہ میں رہے وہ ویسا نہیں ہے بمقابلہ اس کے جس کا دل دن رات اس کی صحبت میں رہے۔ حضرت ذوالنون مصری رحمتہ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ:

التوبة توبتان توبة الانابت و توبة الاستحیاء، فتوبة الانابت ان یتوب العبد خوفا من عقوبتہ وتوبتہ الاستحیاء ان یتوب حیاء	توبہ دو طرح کی ہوتی ہے ایک توبہ انابت دوسری توبہ استحیاء۔ توبہ انابت یہ ہے کہ بندہ عذاب الٰہی کے خوف سے توبہ کرے اور توبہ استحیاء یہ ہے کہ بندہ حق تعالیٰ کے فضل و کرم

من کرمه — سے حیا کرکے توبہ کرے۔

لہٰذا خوف الٰہی والی توبہ، جلالِ الٰہی کے کشف سے ہے اور حیا والی توبہ جمال الٰہی کے نظارہ سے ہے یعنی ایک جلالِ الٰہی میں اس کے خوف کی آگ سے جلتا ہے اور دوسرا جمالِ الٰہی میں حیاء و شرم کے نور سے روشن ہوتا ہے ان دونوں میں سے ایک بحالت سکر دوسرا بحالت صحو ہے۔ اہل حیاء اصحاب سکر اور اہل خوف اصحاب صحو سے تعلق رکھتے ہیں۔

پانچواں کشف حجاب

نماز کے بیان میں

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

وَاَقِيْمُوْا الصَّلٰوةَ وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ — اے مسلمانو! نماز قائم کرو اور زکوٰۃ دو۔

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:

اَلصَّلٰوةُ وَمَا مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ — نماز کی حفاظت کرو اور ان چیزوں کی جن کے تم مالک ہو۔

نماز کے معنی باعتبار لغت، ذکر و انقیاد کے ہیں اور فقہاء کے عرف و اصطلاح میں مقررہ احکام کے تحت مخصوص عبادت ہے جو بفرمانِ الٰہی نمازِ پنج گانہ ہے جنہیں پانچ وقتوں میں ادا کیا جاتا ہے نماز کی فرضیت کے لئے اس کے وقت کا پہلے داخل ہونا شرط ہے نماز کے شرائط میں سے ایک شرط طہارت ہے جو ظاہری طور پر ناپاکی سے اور باطنی طور پر شہوت سے پاک ہونا ہے۔ دوسری شرط لباس کی پاکی ہے ظاہر طور پر نجاست سے اور باطنی طور پر اس طرح کہ وہ حلال کمائی سے ہو۔ تیسری شرط جگہ کا پاک ہونا ہے ظاہر طور پر حوادث و آفت سے اور باطنی طور پر فساد و معصیت سے۔ چوتھی شرط استقبال قبلہ ہے ظاہر طور پر خانہ کعبہ کی سمت اور باطنی طور پر عرشِ معلیٰ اور اس کا باطن مشاہدۂ حق ہے۔ پانچویں شرط قیام ہے ظاہری طور پر کھڑے ہونے کی قدرت اور باطنی طور پر قربت الٰہی کے باغ میں قیام ہے۔ چھٹی شرط دخول وقت ہے جو ظاہری

طور پر شرعی احکام کے مطابق اور باطنی طور پر حقیقت کے درجہ میں ہمیشہ قائم رہنا ہے اور داخلی شرائط میں سے ایک شرط خلوص نیت کے ساتھ بارگاہِ حق کی طرف متوجہ ہونا ہے اور قیام ہیبت و فنا میں تکبیر کہنا، محل وصل میں کھڑا ہونا، ترتیل و عظمت کے ساتھ قرأت کرنا، خشوع کے ساتھ رکوع کرنا، تذلل و عاجزی کے ساتھ سجدے کرنا، دل جمعی کے ساتھ تشہد پڑھنا اور فنائے صفت کے ساتھ سلام پھیرنا۔ حدیث پاک میں وارد ہوا ہے کہ:

كَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يُصَلِّيْ وَفِيْ جَوْفِهٖ اَزِيْزٌ كَاَزِيْزِ الْمِرْجَلِ	جب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نماز پڑھتے تو آپ کے بطن میں ایسا جوش اٹھتا جیسے دیگ میں جوش آتا ہے۔

امیر المومنین سیدنا علی مرتضیٰ کرم اللہ وجہہ، جب نماز کا ارادہ فرماتے تو ان کے جسم پر لرزہ طاری ہو جاتا اور فرماتے کہ اس امانت کے ادا کرنے کا وقت آ گیا جس کا بار زمین و آسمان اٹھانے سے عاجز رہے تھے۔

ایک بزرگ بیان کرتے ہیں کہ حضرت حاتم اصم سے میں نے پوچھا آپ نماز کس طرح ادا کرتے ہیں؟ انہوں نے فرمایا کہ جب اس کا وقت آتا ہے تو ایک ظاہری وضو کرتا ہوں دوسرا باطنی وضو۔ ظاہری وضو پانی سے اور باطنی وضو توبہ سے۔ پھر جب مسجد میں داخل ہوتا ہوں تو مسجد حرام کے روبرو دونوں ابرو کے درمیان مقام ابراہیم رکھتا ہوں اور اپنی داہنی جانب جنت کو اور بائیں جانب دوزخ کو دیکھتا ہوں اور خیال کرتا ہوں کہ میرے قدم پل صراط پر ہیں اور ملک الموت میرے پیچھے کھڑا ہے اس حال میں کمالِ عظمت کے ساتھ تکبیر، حرمت کے ساتھ قیام، ہیبت کے ساتھ قرأت، تواضع کے ساتھ رکوع، تضرع کے ساتھ سجدہ، حلم و وقار کے ساتھ جلسہ اور شکر و اطمینان کے ساتھ سلام پھیرتا ہوں۔

طریقت کی نماز:

واضح رہنا چاہئے کہ شریعت کے مطابق نماز ایسی عبادت ہے جس کی ابتداء و انتہا میں مریدین راہِ حق پاتے ہیں اور ان کے مقامات کا کشف ہوتا ہے چنانچہ مریدوں کے لئے

طہارت، توبہ کا قائم مقام، پیروی کا تعلق، قبلہ شناسی کا قائم مقام، مجاہدہ نفس پر قیام، قیام کا قائم مقام، ذکر الٰہی کی مداومت، قرأت قرآن کا قائم مقام، تواضع، رکوع کا قائم مقام، معرفت نفس، سجود کا قائم مقام، مقام امن، تشہد کا قائم مقام، دنیا سے علیحدگی، سلام کا قائم مقام اور نماز سے باہر آنا مقامات کی قید سے خلاصی کا قائم مقام ہے۔

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم جب اکل وشرب سے فارغ ہوتے تو کمالِ حیرت کے مقام میں شوق کے طالب ہوتے اور یکسو ہو کر خاص مشرب سے انہماک فرماتے ہیں۔ اس وقت آپ فرماتے ''اَرِحْنَا یَا بِلَالُ بِالصَّلٰوۃِ'' (ابوداؤد) اے بلال! نماز کی اذان دے کر ہمیں خوش کرو۔

اس بارے میں مشائخ طریقت کے بکثرت ارشادات ہیں اور ہر ایک کا خاص مقام اور درجہ ہے۔ چنانچہ ایک جماعت کہتی ہے کہ نماز حضورِ الٰہی کا ذریعہ ہے اور ایک جماعت کہتی ہے کہ نماز غیبت نفس کا ذریعہ ہے۔ ایک جماعت کہتی ہے کہ جو غائب رہتا ہے وہ نماز میں حاضر ہوتا ہے۔ ایک جماعت کہتی ہے کہ جو حاضر ہوتا ہے وہ نماز میں غائب ہو جاتا ہے جس طرح کہ اس جہان میں بحالتِ مشاہدہ محو ہوتا ہے۔ جو گروہ دیدار الٰہی میں رہتا ہے وہ غائب ہو کر حاضر رہتا ہے۔ اور جو گروہ حاضر ہوتے ہیں غائب ہو جاتے ہیں۔

حضور سیدنا داتا گنج بخش رحمتہ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ نماز خدا کا حکم ہے وہ ذریعہ حضور یا ذریعہ غیبت نہیں ہے کیونکہ حکم الٰہی کسی چیز کا ذریعہ نہیں ہوتا اس لئے کہ حضور کی علت، عین حضور اور غیبت کی علت بھی غیبت ہے اور حکم الٰہی کو کسی چیز کے ساتھ سَبَبی تعلق نہیں ہے۔ وجہ یہ ہے کہ نماز اگر حضور کی علت ہوتی تو چاہئے تھا کہ نماز کے سوا حاضر نہ ہوتا اور اگر غیبت کی علت ہوتی تو غائب، نماز کے ترک سے حاضر ہوتا حالانکہ غیبت وحضور کے لئے نماز کی ادا یا اس کا ترک، وسیلہ اور سبب نہیں ہے۔ نماز فی نفسہٖ ایک غلبہ ہے جو غیبت یا حضور پر موقوف نہیں ہے لہٰذا صاحبان مجاہدہ اور اہل استقامت، بکثرت نمازیں پڑھتے اور اس کا حکم دیتے ہیں چنانچہ بعض بزرگوں نے اپنے مریدوں کو دن ورات میں چار سو رکعات تک کا حکم دیا ہے تاکہ ان کا جسم

عبادت کا عادی بن جائے اور اہل استقامت بھی قبولیت حضور کے شکرانہ میں بکثرت نمازیں پڑھتے ہیں۔

باقی رہے صاحبانِ احوال، تو ان کی دو قسمیں ہیں کچھ وہ ہیں جن کی نمازیں کمال مشرب میں جمع کے قائم مقام ہیں اور اس سے وہ منزل جمع پاتے ہیں اور کچھ وہ ہیں جن کی نمازیں انقطاع مشرب میں تفرقہ کے قائم مقام ہیں اور وہ اس سے منزل تفرقہ حاصل کرتے ہیں جو حضرات نماز میں منزل جمع پاتے ہیں وہ فرائض وسنن کے علاوہ ہمہ وقت نماز میں مشغول رہتے ہیں اور اس کی کثرت کرتے ہیں اور جو صاحبانِ تفرقہ ہیں وہ فرائض وسنن کے سوا دیگر نوافل میں کم مشغول ہوتے ہیں۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:

جُعِلَتْ قُرَّةُ عَيْنِیْ فِیَ الصَّلٰوةِ نماز میں میری آنکھوں کی ٹھنڈک رکھی گئی ہے۔

مطلب یہ ہے کہ میری تمام راحتیں نماز میں ہیں۔ اسی لئے اہل استقامت کا مشرب نمازیں ہیں اس کی صورت یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو جب معراج میں لے جایا گیا اور مقام قرب سے سرفراز کیا گیا اور آپ کے نفس کو قیدِ دنیا سے آزاد کرایا گیا اور اس درجہ پر فائز کیا گیا کہ آپ کا نفس، دل کے درجہ میں، اور دل، روح کے درجہ میں، اور روح، سر کے مقام میں اور سر، مقامات میں فانی، اور مقامات کو محو کر کے نشانوں میں بے نشان، اور مجاہدے سے مشاہدہ میں غائب کر کے معائنہ سے معائنہ میں اس طرح فائز ہوئے کہ آپ کی بشری صفات ختم ہو گئیں اور نفسانی مادہ فنا ہو کر طبعی قوت بھی باقی نہ رہی اور شواہد ربانی آپ کے اختیار میں رونما ہوئے اور اپنی خودی سے نکل کر معانی کی پنہائیوں میں پہنچے اور دائمی مشاہدے میں مستغرق ہو گئے اور اسرارِ شوق سے بے اختیاری کو اختیار کر کے اللہ تعالیٰ سے مناجات کی کہ اے میرے رب! مجھے بلاؤں کی جگہ واپس نہ کر اور طبع و ہوا کی قید میں دوبارہ نہ ڈال۔ فرمانِ الٰہی ہوا اے محبوب، ہمارا حکم ایسا ہی ہے کہ ہم تمہیں دنیا میں واپس بھیجیں تا کہ تمہارے ذریعہ شریعت کا قیام ہو اور جو کچھ ہم نے تمہیں یہاں عطا فرمایا ہے وہاں بھی مرحمت فرمائیں گے۔ چنانچہ جب آپ

دنیا میں تشریف لائے تو جب بھی آپ کا دل اس مقام معلیٰ کا مشتاق ہوتا تو فرماتے "اَرِحْنَا یَابِلَالُ بِالصَّلٰوۃِ" اے بلال نماز کی اذان دے کر ہمیں آرام پہنچاؤ۔ لہٰذا آپ کی ہر نماز معراج و قربت ہوتی اور حق تعالیٰ کی مہربانیوں کو نماز میں دیکھتے، آپ کی روح تو نماز میں ہوتی مگر آپ کا دل نیاز میں آپ کا باطن راز میں اور آپ کا جسم گداز میں ہوتا یہاں تک کہ آپ کی آنکھوں کی ٹھنڈک نماز بن گئی۔ آپ کا جسم ملک دنیا میں ہوتا اور آپ کی روح ملکوت میں۔ آپ کا جسم انسانی ہوتا اور آپ کی جان، انس و محبت کے مقام میں۔ صلی اللہ علیہ وسلم۔

حضرت سہل بن عبداللہ تستری رحمتہ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ:

علامة الصدق ان یکون له تابع من الحق اذا دخل وقت الصّلٰوة بعثه علیها وینبهه ان کان نائما	محبِ صادق کی پہچان یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس پر ایک فرستادہ مقرر ہوتا ہے کہ جب نماز کا وقت آئے تو وہ بندے کو اس کی ادائیگی پر ابھارے اگر بندہ سوتا ہو تو اسے بیدار کر دے۔

یہ کیفیت حضرت سہل بن عبداللہ تستری رحمتہ اللہ علیہ میں موجود تھی کیونکہ وہ اپنے عہد کے شیخ تھے جب نماز کا وقت آتا وہ صحت مند ہو جاتے اور جب نماز ادا کر چکتے تو پھر وہی سکر کی حالت طاری ہو جاتی۔ ایک بزرگ فرماتے ہیں کہ:

یحتاج المصلی الی اربعة اشیاء فنـاء النفس وذهاب الطبع وصفاء السرو کمال المشاهدة	نماز پڑھنے والا چار چیزوں کا محتاج ہوتا ہے۔ نفس کی فناء، طبع کا خاتمہ، باطن کی صفائی اور مشاہدہ کا کمال۔

کیونکہ مصلی کے لئے فنائے نفس کے بغیر چارہ نہیں وہ بجز جمع کے ہمت نہیں کرتا اور جب ہمت مجتمع ہو جاتی ہے تو نفس کا اختیار جاتا رہتا ہے کیونکہ اس کا وجود تفرقہ سے ہے۔ جو بیانِ جمع کے تحت نہیں اور طبع کا خاتمہ اثباتِ جلالِ الٰہی کے بغیر نہیں ہوتا کیونکہ جلالِ حق، غیر کو زائل کر دیتا ہے۔ باطن کی صفائی محبت کے تحت ممکن نہیں اور کمالِ مشاہدہ، باطن کی صفائی کے بغیر متصور

نہیں۔

حضرت حسین بن منصور حلاج رحمتہ اللہ علیہ نے اپنے اوپر چار سو رکعات فرض کر رکھی تھیں۔ اس قدر درجہ کمال رکھتے ہوئے اتنی مشقت کس لئے ہے؟ انہوں نے فرمایا یہ تمام رنج و راحت تمہاری حالت کا پتہ دیتا ہے حق تعالیٰ کے کچھ دوست ایسے ہیں جن کی صفات فنا ہو چکی ہیں ان پر نہ رنج اثر کرتا ہے اور نہ راحت، کاہلی کو رسیدگی کا نام نہ دو اور نہ حرص کا نام طلب رکھو۔

ایک بزرگ بیان کرتے ہیں کہ میں حضرت ذوالنون مصری رحمتہ اللہ علیہ کی اقتداء میں نماز پڑھ رہا تھا جب انہوں نے تحریمہ کے وقت اللہ اکبر کہا تو بے ہوش ہو کر گر پڑے گویا کہ جسم میں حس و حرکت ہی نہیں رہی۔

حضرت جنید بغدادی رحمتہ اللہ علیہ جب بوڑھے ہو گئے تو اس بڑھاپے میں بھی جوانی کے کسی ورد کو نہ چھوڑا۔ لوگوں نے عرض کیا اے شیخ اب آپ بوڑھے ہو گئے کمزور ہو گئے ہیں ان میں سے کچھ نوافل چھوڑ دیجئے۔ انہوں نے فرمایا یہی تو وہ چیزیں ہیں جن کو ابتداء میں کر کے اس مرتبہ کو پایا ہے اب یہ ناممکن ہے کہ انتہا پر پہنچ کر ان سے دستبردار ہو جاؤں۔

مشہور ہے کہ فرشتے ہمیشہ عبادت میں رہتے ہیں۔ ان کا مشرب طاعت اور ان کی غذا عبادت ہے اس لئے کہ وہ روحانی ہیں اور ان میں نفس نہیں ہے۔ بندے کے لئے طاعت سے روکنے والی چیز صرف نفس ہے۔ جتنا بھی بندہ نفس کو مغلوب کرے گا اتنا ہی عبادت کی راہ آسان ہو جائے گی اور جب نفس فنا ہو جائے گا تو بندہ کی بھی غذا و مشرب عبادت بن جائے گی جس طرح کہ فرشتوں کے لئے ہے بشرطیکہ فنائے نفس درست ہو۔

حضرت عبداللہ بن مبارک علیہ الرحمۃ فرماتے ہیں کہ مجھے وہ عورت خوب یاد ہے جسے میں نے بچپن میں دیکھا جو بہت عبادت گزار تھی بحالت نماز بچھو نے اس عورت کے چالیس مرتبہ ڈنک مارا مگر اس کی حالت میں ذرہ برابر تغیر نہ ہوا جب وہ نماز سے فارغ ہوئی تو میں نے کہا اے اماں! اس بچھو کو تم نے کیوں نہیں ہٹایا؟ اس نے کہا اے فرزند! تو ابھی بچہ ہے۔ یہ کیسے جائز تھا میں اپنے رب کے کام میں مشغول تھی۔ اپنا کام کیسے کرتی۔؟

حضرت ابوالخیر اقطع رحمتہ اللہ علیہ کے پاؤں میں آکلہ تھا۔ طبیبوں نے مشورہ دیا کہ یہ پاؤں کٹوا دینا چاہئے۔ مگر وہ راضی نہ ہوئے۔ آپ کے مریدوں نے طبیبوں سے کہا نماز کی حالت میں ان کا پاؤں کاٹ دیا جائے، کیونکہ اس وقت انہیں اپنی خبر نہیں ہوتی چنانچہ ایسا ہی کیا گیا۔ جب نماز سے فارغ ہو کر دیکھا تو پاؤں کو کٹا ہوا پایا۔

سیدنا ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے بارے میں مروی ہے کہ جب آپ رات کو نماز پڑھتے تو قرأت آہستہ کرتے اور حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ بلند آواز سے قرأت کرتے تھے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے دریافت فرمایا کہ اے ابوبکر تم آہستہ کیوں پڑھتے ہو؟ عرض کیا "یَسْمَعُ مَنْ اُنَاجِیْ" جس سے میں مناجات کرتا ہوں وہ سنتا ہے۔ خواہ آہستہ کروں یا بلند۔ پھر حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ سے دریافت فرمایا کہ تم کیوں بلند آواز سے پڑھتے ہو؟ عرض کیا "اُوْقِظُ الْوَسْنَانَ وَاَطْرُدُ الشَّیْطَانَ" میں سوتے ہوؤں کو جگاتا ہوں اور شیطان کو بھگاتا ہوں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اے ابوبکر تم کچھ بلند آواز سے پڑھو اور اے عمر! تم کچھ آہستہ آواز سے اپنی اپنی عادت کے برخلاف پڑھو۔ اسی بناء پر بعض مشائخ فرائض کو ظاہر کر کے پڑھتے اور نوافل کو چھپا کر۔ اس میں ان کی مصلحت یہ ہوتی ہے کہ ریاؤ نمود سے پاک رہیں۔ کیونکہ جب کوئی ریا کاری کرتا ہے اور لوگوں کو اپنی طرف کھینچتا ہے تو وہ ریا کار بن جاتا ہے۔ مشائخ فرماتے ہیں کہ ہم اگرچہ اپنے معاملات کو نہیں دیکھتے مگر لوگ تو دیکھتے ہیں۔ یہ بھی تو ریا کاری ہے۔ لیکن مشائخ کی ایک جماعت فرائض اور نوافل سب کو ظاہر کر کے پڑھتے ہیں۔ وہ فرماتے ہیں کہ ریا باطل ہے اور طاعت حق ہے اور یہ محال ہے کہ باطل کی خاطر حق کو چھپایا جائے۔ لہٰذا ریا کو دل سے نکال دینا چاہئے اور جس طرح جی چاہے عبادت کرنی چاہئے۔ مشائخ طریقت نے نماز کے حقوق و آداب کی محافظت فرمائی ہے اور مریدوں کو اس فرض کی ادائی کا حکم دیا ہے۔ ایک بزرگ فرماتے ہیں کہ میں نے چالیس (۴۰) سال سیاحت کی ہے لیکن میری کوئی نماز جماعت سے خالی نہیں ہے اور ہر جمعہ میں نے کسی نہ کسی شہر ہی میں گزارا ہے۔

نماز کے احکام میری حد و شمار سے باہر ہیں۔ اس لئے نماز کی محبت کے مقامات کے ساتھ ہی محبت کے احکام پر بھی روشنی ڈالنا ضروری ہے۔

محبت کا بیان

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَنْ يَّرْتَدَّ مِنْكُمْ عَنْ دِيْنِهٖ فَسَوْفَ يَاْتِي اللّٰهُ بِقَوْمٍ يُّحِبُّهُمْ وَيُحِبُّوْنَهٗٓ (المائدہ:۵۴)

اے ایمان والو! تم میں سے جو بھی حق تعالیٰ کے دین سے پھر جائے تو اللہ تعالیٰ ایسی قوم کو لے آئے گا جو خدا کے محبوب رکھیں گے اور خدا ان کو محبوب رکھے گا۔

نیز فرمایا:

وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّتَّخِذُ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ اَنْدَادًا يُّحِبُّوْنَهُمْ كَحُبِّ اللّٰهِ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَشَدُّ حُبًّا لِّلّٰهِ (البقرہ:۱۶۵)

کچھ لوگ ایسے ہیں جو اللہ کے سوا دوسروں کو شریک گردانتے اور خدا کی محبت کے مانندان سے محبت کرتے ہیں لیکن جو ایمان والے ہیں ان کی محبت اللہ تعالیٰ سے بہت ہے۔

حدیث قدسی میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ:

"مَنْ اَهَانَ لِيْ وَلِيًّا فَقَدْ بَارَزَنِيْ بِالْمُحَارَبَةِ" (بخاری شریف)

جس نے میرے ولی کی اہانت کی بلا شبہ اس نے مجھ سے جنگ کرنے کی جسارت کی اور میں کسی چیز میں تردد نہیں کرتا جیسا کہ میں بندے کی جان قبض کرنے میں تردد کرتا ہوں بندہ موت کو مکروہ جانتا ہے اور میں اس کی بدی کو مکروہ جانتا ہوں حالانکہ موت اس کے لئے لابدی ہے اور ادائے فرض سے بڑھ کر کوئی چیز پیاری نہیں جو میرے بندے کو مجھ سے قریب کرے۔ بندہ ہمیشہ ادائے نوافل کے ذریعہ میری نزدیکی چاہتا ہے یہاں تک کہ میں اسے محبوب بنالیتا ہوں۔ جب وہ میرا محبوب ہو جاتا ہے تو میں اس کے کان، آنکھ، ہاتھ پاؤں اور زبان بن جاتا ہوں۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ جو بندہ اللہ تعالیٰ کے دیدار کو محبوب رکھتا ہے وہ بھی اس کی ملاقات کو محبوب رکھتا ہے اور جو اللہ کے دیدار کو مکروہ سمجھتا ہے اللہ اس کے ملنے کو مکروہ رکھتا

ہے۔

نیز فرمایا جب خدا کسی بندے کو محبوب بنا لیتا ہے تو جبریل امین سے فرماتا ہے اے جبریل میں نے فلاں بندے کو محبوب بنا لیا ہے تم بھی اس سے محبت کرو چنانچہ جبریل بھی اس کو محبوب سمجھنے لگتے ہیں اس کے بعد جبریل آسمان والوں سے کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے فلاں بندے کو محبوب بنا لیا ہے۔اے آسمان والو تم بھی اسے محبوب سمجھو پھر وہ زمین والوں سے فرماتے ہیں تو زمین والے بھی اسے محبوب سمجھنے لگتے ہیں۔واضح رہنا چاہئے کہ خدا کی محبت بندے کے لئے اور بندے کی محبت خدا کے لئے ضروری ہے کتاب وسنت اور اجماع امت اس پر شاہد وناطق ہیں۔

اللہ تعالیٰ کی ایک صفت یہ بھی ہے کہ وہ اپنے دوستوں کو محبوب رکھتا ہے اور محبوبانِ خدا اسے دوست رکھتے ہیں۔

اہل لغت کہتے ہیں کہ محبت حبہ سے ماخوذ ہے اور حبہ کے معنی تخم کے ہیں جو زمین پر گرتا ہے۔لہٰذا حَب کا نام حُب رکھا گیا۔ چنانچہ اصل حیات اسی میں ہے۔جس طرح اشجار ونباتات میں ہے حَب یعنی تخم ہے جس طرح میدان میں بیج کو بکھیرا جاتا ہے اور مٹی میں چھپایا جاتا ہے پھر اس پر پانی برستا ہے آبیاری کی جاتی ہے۔سورج چمکتا ہے گرم وسرد موسم گزرتا ہے لیکن زمانہ کے تغیرات اسے نہیں بدلتے جب وقت آتا ہے تو وہ تخم اگتا ہے پھل و پھول دیتا ہے اسی طرح جب محبت کا بیج دل میں جگہ پکڑتا ہے تو اسے حضور وغیبت، بلا وابتلاء مشقت، راحت ولذت اور فراق ووصال کوئی چیز نہیں بدل سکتی۔اسی معنی میں کسی کا شعر ہے:

یامن سقام جنونہ لسقام عاشقہ طبیب
جارت المؤدۃ فاستوی عندی حضورک والمغیب

اے وہ ذات کہ اس کی دیوانگی کا مرض اس کے عاشق کی بیماری کے لئے طبیب ہے
محبت کی برقراری میں میرے نزدیک تیرا حضور اور غیبت برابر ہے

نیز اہل لغت یہ بھی کہتے ہیں کہ محبت حب سے مشتق ہے اور حب وہ دانہ ہے جس

میں پانی بکثرت ہو اور اوپر سے وہ ایسا محفوظ ہو کہ چشموں کا پانی اس میں داخل نہ ہو سکے۔ یہی حال محبت کا ہے کہ جب وہ طالب کے دل میں جاگزیں ہو جاتا ہے تو اس کا دل اس سے پر ہو جاتا ہے پھر اس دل میں محبوب کے کلام کے سوا کوئی جگہ نہیں رہتی چنانچہ اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو جب خلعت خلت سے سرفراز فرمایا تو وہ صرف کلام حق کے ہو کر رہ گئے۔ یہ جہان اور جہان والے سب ان کا حجاب بن گئے اور وہ حق تعالیٰ کی محبت میں حجابات کے دشمن ہو گئے۔ اللہ تعالیٰ نے ان کے حال وقال کی ہمیں خبر دیتے ہوئے فرمایا ہے:

فَاِنَّهُمْ عَدُوٌّلِّيْٓ اِلَّا رَبَّ الْعٰلَمِيْنَ — یہ سب میرے دشمن ہیں بجز رب العالمین کے۔

حضرت شبلی علیہ الرحمۃ فرماتے ہیں کہ:

سمیت المحبة لانها تمحو من القلب ماسوی المحبوب — محبت اسی لئے نام رکھا گیا ہے کہ وہ دل سے محبوب کے ماسوٰی کو مٹا دیا ہے۔

ایک معنی یہ بھی بیان کئے گئے ہیں کہ حُب ان چار لکڑیوں کا نام ہے جو باہم جڑی ہوئی ہوں۔ جس پر آفتابہ رکھا جاتا ہے یعنی تپائی وغیرہ۔ لہٰذا حُب اسی لئے کہتے ہیں کہ محبت کرنے والا، محبوب کی عزت و ذلت، رنج و راحت بلاؤ مشقت اور جفا و وفا کو برداشت کرتا ہے اور یہ باتیں اس پر گراں نہیں گزرتیں۔ اس کا وہی کام ہوتا ہے جو مذکورہ تپائی وغیرہ کا ہوتا ہے اسی کی مانند وہ بھی بوجھ اٹھاتا ہے لہٰذا محبت کی خلقت میں ہی محبوب کے بوجھ کو اٹھانا ہے۔ اسی معنی میں یہ شعر ہے:

ان شئت جودی وان شئت فامتنعی
کلاهما منك منسوب الی الکرم

"اگر تو چاہے تو مجھ پر احسان کرے اور اگر تو چاہے تو مجھے منع کر دے
دونوں باتیں تیرے کرم سے منسوب ہیں۔"

ایک معنی یہ بھی بیان کئے گئے ہیں کہ محبت، حبوب سے ماخوذ ہے جو حبہ کی جمع ہے اور

حبہ وہ دل ہے جو لطائفِ کا مقام اوران کے قیام کی جگہ ہے۔اسی لئے محبت کا نام حبّ رکھا گیا یہ تسمیۂ حال باسم محل ہے اہل عرب کا رواج ہے کہ چیز کا نام اس کے مقام کے موافق رکھ دیتے ہیں۔

یہ بھی کہا گیا ہے کہ حباب سے ماخوذ ہے جس کے معنی پانی کے جوش کے ہیں اور شدید بارش میں پانی کے بلبلے جو اٹھتے ہیں اسی لئے محبت نام رکھا گیا ہے۔

''لان غيثان القلب عند الاشتياق الى لقاء المحبوب'' دوست کا دل دوست کے دیدار کے اشتیاق میں ہمیشہ مضطرب رہتا ہے جس طرح اجسام روح کی مشتاق ہیں یا جسم کا قیام روح کے ساتھ ہے اسی طرح دوستی کا قیام محبت کے ساتھ ہے اور محبت کا قیام محبوب کے وصال اور اس کی رویت میں ہے۔اسی معنی میں یہ شعر ہے:

اذا تمنى الناس روحاو راحة،

تمنيت ان القاك ياعز حاليا

''جس وقت لوگوں نے خوشی و راحت کی تمنا کی تو
اے عزیز میں نے یہ خواہش کی کہ میں تجھے ہر کام
سے فارغ کر دوں یعنی تیرا سارا بوجھ میں خود اٹھا
لوں۔''

یہ بھی کہتے ہیں کہ حب ایسا نام ہے جو محبت کی صفائی کے لئے وضع کیا گیا ہے اسی لئے اہل عرب، انسان کی آنکھ کی سفیدی کی صفائی کو ''حبة الانسان'' کہتے ہیں۔جس طرح دل کے نکتہ کی صفائی کو حبۃ القلب کہتے ہیں۔دل کا نکتہ محبت کی جگہ اور آنکھ کی سفیدی دیدار کا مقام ہے۔اسی معنی میں یہ مقولہ ہے کہ دل اور آنکھ دوستی میں مقارن و متصل ہیں۔اور اسی معنی میں یہ شعر ہے:

القلب يحسد عينى لذت النظر

والعين يحسد قلبى لذت الفكر

دل اس پر رشک کرتا ہے کہ آنکھ کو لذت دیدار ملی
اور آنکھ اس پر رشک کرتی ہے کہ دل کو لذت فکر ملی

استعمال محبت میں علماء کے خیالات:

واضح رہنا چاہئے کہ استعمال محبت میں علماء کے تین خیال ہیں ایک یہ کہ محبوب سے ایسی ارادت ہو کہ نفس کو قطعی چین حاصل نہ ہو اور نہ دل کو تمنا وخواہش اور میلان وانسیت ہو۔ ان معانی کا تعلق ذاتِ قدیم اللہ تبارک وتعالیٰ پر جائز نہیں ہے یہ تمام تعلقات صرف مخلوق ہی کے لئے ہیں اور وہی ایک دوسرے کے ہم جنس ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان معانی سے مستغنی اور برتر ہے۔

دوسرا خیال، بمعنی احسان ہے۔ یہ اس بندے کے ساتھ خاص ہے جسے اللہ تعالیٰ برگزیدہ کر کے ولایت کے کمال پر فائز کردے اور اسے گونا گوں الطاف واکرام سے نوازے۔

تیسرے صورت، بندے پر خوبی کی تعریف کے معنی میں ہے۔ متکلمین کی ایک جماعت کہتی ہے کہ قرآن وحدیث میں حق تعالیٰ کی جس محبت کی خبر ہمیں دی گئی ہے وہ تمام سماعی صفات سے تعلق رکھتے ہیں۔ مثلاً دید، استویٰ کی کیفیت وغیرہ۔ اگر کتاب وسنت ان پر ناطق نہ ہوتے تو ان کا وجود، ازروے عقل حق تعالیٰ کے لئے محال ہوتا۔ لہٰذا ہم اسی کی شان کے لائق محبت کا اثبات کرتے ہیں اور اعتقاد رکھتے ہیں نیز اس میں عقل کے ذریعہ تصرف کرنے سے توقف کرتے ہیں۔ متکلمین کی اس وضاحت سے مراد یہ ہے کہ وہ حق تعالیٰ کے لئے اس لفظ کا اطلاق ازروئے عقل جائز نہیں جانتے محبت کے معنی میں اقوال علماء بیان کرنے کے بعد اس کی حقیقت کا بیان شروع کرتا ہوں۔

محبت کی حقیقت:

واضح رہنا چاہئے کہ بندے کے لئے حق تعالیٰ کی محبت کا مطلب، اس کی طرف سے بھلائی کا ارادہ ہے وہ بندے پر رحم فرماتا ہے اور ارادے کے ناموں میں سے ایک نام محبت بھی ہے جیسے رضا، ناراضگی، رحمت اور مہربانی وغیرہ ہیں۔ ان اسماء صفات کو بھی حق تعالیٰ کے ارادہ

کے سوا پر محمول نہ کرنا چاہئے یہ حق تعالیٰ کی ایک قدیم صفت ہے کہ اس نے اپنے افعال کو ان اوصاف کے ساتھ یاد فرمایا ہے۔ لہٰذا حکم مبالغہ اور اظہارِ فعل میں بعض صفت، بعض سے اخص ہے۔

خلاصہ یہ کہ اللہ تعالیٰ کی محبت بندوں کے حق میں یہ ہے کہ اس پر نعمت کی ارزانی فرمائے اور دنیا و آخرت میں اجر و ثواب عطا فرما کر مقام سزا سے اسے محفوظ رکھے اور اسے ارتکاب معاصی سے بچا کر و قیع احوال اور مقامات علیا سے سرفراز فرمائے اس کے باطن کو اغیار کے التفات سے پاک و صاف کر کے ازلی عنایات کا مستحق بنائے یہاں تک کہ بندہ ہر ایک سے کنارہ کش ہو کر خالص رضائے الٰہی کو ملحوظ رکھنے لگے۔ حق تعالیٰ جب بندے کو ان معانی میں مخصوص فرما لیتا ہے تو اس کے ارادۂ تخصیص کا نام محبت رکھ دیا جاتا ہے۔ یہ مذہب حضرت حارث محاسبی، حضرت جنید بغدادی اور دیگر مشائخ عظام رحمتہ اللہ علیہم کا ہے اور فریقین کے اکثر فقہاء اور متکلمین اہل سنت کا مذہب بھی یہی ہے۔ لیکن وہ حضرات جو یہ کہتے ہیں کہ حق تعالیٰ کی محبت کے معنی، ثنائے جمیل ہے جو بندے پر لازم ہے۔ اس کی ثنا اس کا کلام ہے اس کا کلام غیر مخلوق ہے اور غیر مخلوق کو مخلوق کے ساتھ کیسے ملایا جا سکتا ہے۔

وہ حضرات جو یہ کہتے ہیں کہ محبت کے معنی احسان کے ہیں اور حق تعالیٰ کا احسان اس کا فعل ہے۔ معنی کے لحاظ سے یہ اقوال قریب قریب ہیں اور سب کا حکم یکساں موجود ہے۔

لیکن بندے کی محبت، اللہ تعالیٰ کے لئے، تو یہ ایک ایسی صفت ہے جو فرماں بردار مومن کے دل میں ظاہر ہوتی ہے جس کے معنی تعظیم و تکریم بھی ہیں یہاں تک کہ وہ محبوب کی رضا کو طلب کرتا اور اس کی رویت کی طلب میں بے خبر ہو کر اس کی قربت کی آرزو میں بے چین ہو جاتا ہے اور اسے اس کے بغیر چین و قرار حاصل ہوتے ہی نہیں۔ اس کی عادت اس کے ذکر کے ساتھ ہو جاتی ہے اور وہ غیر کی یاد اور غیر کے ذکر سے نفرت کرنے لگتا ہے کیونکہ غیر کے ساتھ راحت حرام ہے اور مُحبّ سے سکون و قرار جاتا رہتا ہے وہ تمام طبعی رغبتوں سے جدا ہو کر اپنی خواہشات سے کنارہ کش ہو جاتا ہے وہ غلبہ محبت کے ساتھ متوجہ ہوتا ہے اور خدا کے حکم کے آگے

سر جھکا دیتا ہے اور اسے کمالِ اوصاف کے ساتھ پہچاننے لگتا ہے۔

یہ جائز نہیں ہے کہ مخلوق کے ساتھ خالق کی محبت، لوگوں کی باہمی محبت کی جنس سے ہوتا کہ لوگوں کے مانند محبوب کی محبت کا ادراک اور احاطہ کر سکیں۔ یہ صفت تو جسموں کی ہے (اور اللہ تعالیٰ جسم و جسمانیت سے پاک ہے) لہٰذا محبوبانِ خدا اس کی قربت کے مارے ہوئے ہوتے ہیں نہ کہ اس کی کیفیت کے طلبگار۔ اس لئے کہ طالب، فی نفسہٖ محبت میں قائم ہوتے ہیں اور قربت کے مارے ہوئے تو محبوب کے ساتھ قائم ہوتے ہیں۔ جس قدر وہ محبوب ہوتے ہیں اتنے ہی محبت کی رزمگاہ میں وہ ہلاک و مغلوب ہوتے ہیں اس لئے کہ محدث قدیم کے ساتھ اس وقت ہوتا ہے جب قدیم، محدِث پر غلبہ فرمائے۔ جو محبت کی حقیقت کو پہچانتا ہے اسے کسی قسم کا ابہام اور شبہ نہیں ہوتا۔

محبت کی قسمیں:

محبت کی دو قسمیں ہیں ایک یہ کہ جنس کی محبت دوسرے ہم جنس کے ساتھ ہو ایسی محبت میلان طبع اور نفس پرستی کہلاتی ہے ایسا طالب، محبوب کی ذات کا عاشق اور اس پر فریفتہ ہوتا ہے۔

دوسری قسم یہ کہ ایک جنس کی محبت کسی غیر جنس کے ساتھ ہو ایسی محبت اپنے محبوب کی کسی صفت پر سکون و قرار حاصل کرنا ہوتا ہے تاکہ وہ اس خوبی سے راحت پائے، اور انس حاصل کرے مثلاً محبوب کا کلام سننا یا اس کے دیدار کا خواہاں ہونا وغیرہ وغیرہ۔

حق تعالیٰ سے محبت رکھنے والے حضرات دو طرح کے ہیں۔ ایک تو وہ جنہوں نے اپنے اوپر حق تعالیٰ کا انعام و احسان دیکھا اور اس کے دیکھنے کی وجہ سے منعم و محسن کی محبت کے متقاضی ہوئے دوسرے وہ جو تمام احسانات و انعام کو غلبہ محبت میں مقام حجاب تصور کرتے ہیں اور نعمتوں پر نظر کرنے کی بجائے ان کا طریق، نعمت دینے والے کی طرف ہوتا ہے یہ مقام پہلے کے مقابلہ میں بہت ارفع ہے۔ واللہ اعلم۔

محبت میں مشائخ کا طریق:

محبت کا مفہوم و معنی، تمام لوگوں کے درمیان معروف اور تمام زبانوں میں مشہور و مستعمل ہے اور کوئی صاحب عقل وفہم اس کی کیفیت کو اپنے اوپر چھپا نہیں سکتا۔ طریقت کے مشائخ میں سے حضرت سمنون المحب رحمتہ اللہ علیہ تو محبت میں خاص مذہب و مشرب رکھتے ہیں ان کا ارشاد ہے کہ محبت تو راہِ خدا کی اساس و بنیاد ہے اسی پر تو تمام احوال و مقامات اور منازل کی بنا ہے اور ہر منزل و محل میں خواہ طالب کہیں گامزن ہو اس کا اس سے زوال ممکن ہے لیکن حق تعالیٰ کی محبت کے مقام میں اس کا زوال ممکن نہیں۔ جب تک وہ اس راہ میں موجود ہے کسی حال میں اس سے زوال جائز نہیں۔ اس مسئلہ میں تمام مشائخ ان کے مذہب کی موافقت کرتے ہیں لیکن چونکہ یہ نام عام تھا اور انہوں نے چاہا کہ عام لوگوں سے ان معانی کو مخفی رکھا جائے اس لئے انہوں نے اس کے معنی کے وجود کے تحقق میں یہ نام بدل دیا چنانچہ کسی نے صفائے محبت کا نام صفوت رکھا ہے اور محبّ کو صوفی کہنے لگے اور کسی نے محبّ کے ترک اختیار، اور محبوب کے اثباتِ اختیار کا نام، فقر رکھا اور محبّ کو فقیر کہنے لگے کیونکہ محبت کا ادنیٰ درجہ، موافقت ہے اور محبوب کی موافقت، اس کی مخالفت کی ضد ہوتی ہے۔ شروع کتاب میں فقر و صفوت کے معنی کی وضاحت کی جا چکی ہے۔

ایک بزرگ فرماتے ہیں کہ:

الحب عند الزهاد اظهر من الاجتهاد	زاہدوں کے نزدیک محبت، اجتہاد سے زیادہ ظاہر ہے۔

محبت کے سلسلہ میں یہ مقولے عام زبان زد ہیں۔

عند التائبين اوجد من انين وحنين	توبہ کرنے والوں کے نزدیک نالہ و فغاں سے زیادہ ظاہر ہے۔
وعند الاتراك اشهر من الفتراك	ترکوں کے نزدیک شکار بند سے زیادہ مشہور ہے۔
وسبى الحب عند الهنود اظهر من سبى المحمود و رحم ولهب	ہندوؤں کے نزدیک محبوب و محبّ کا قصہ

قصة الحب والحبيب عند الروم	غزنوی کی قید یا اس کی مہربانی یا اس کی سختی
اشهر من الصليب	سے زیادہ ظاہر ہے۔
قصة الحب فی العرب	رومیوں کے نزدیک محبوب و محبّ کا قصہ،
ادب فی کل حیی منه طرب	صلیب سے زیادہ مشہور ہے۔
اوویل وهرب وحزن	عرب کے ہر قبیلہ کا ادب، محبت کا قصہ ہے
	جو خوشی، رنج، افسوس، جنگ اور غم سے زیادہ
	پیارا ہے۔

ان مقولوں کے بیان کرنے کا مقصد، یہ بتانا ہے کہ انسانوں میں کوئی بھی ایسا نہیں ہے جسے حالت غَیبت میں محبت سے واسطہ نہ پڑا ہو اور ان کے دل محبت سے خالی رہے ہوں خواہ وہ خوشی میں سرشار ہوں یا شراب میں بدمست؟ یا اس کے غلبہ میں مخمور انسان کا دل جوش اور بے قراری سے مرکب ہے اور عقل کا دریا محبت کی شراب ہے جو دل کے لئے اسی طرح ضروری ہے جس طرح جسم کے لئے خوراک، جو دل محبت سے خالی ہو وہ دل برباد و ویران ہے۔ تکلف میں محبت دور کرنے یا اس کے حاصل کرنے کی طاقت نہیں ہے۔ محبت کے لطائف جو دل پر وارد ہوتے ہیں نفس کو اس کی کچھ خبر نہیں ہوتی۔

حضرت عمرو بن عثمان مکی رحمتہ اللہ علیہ ''کتاب محبت'' میں فرماتے ہیں کہ اللہ نے قلوب کو ان کے اجسام سے سات ہزار سال قبل پیدا فرمایا اور انہیں اپنے قرب خاص میں رکھا۔ اس کے بعد محبت کے درجہ میں رکھا پھر ان کے باطن کو ان کے اجسام سے سات ہزار سال قبل پیدا کیا اور انہیں وصل کے درجہ میں رکھا اور روزانہ تین سو ساٹھ مرتبہ ظہور جمال سے باطن کو تجلی بخشی اور تین سو ساٹھ مرتبہ نظر کرامت ڈالی پھر محبت کا کلمہ سنایا اور تین سو ساٹھ مرتبہ دلوں پر انس و محبت کے لطائف ظاہر کئے یہاں تک کہ انہوں نے ساری کائنات پر نظر ڈالی تو کسی مخلوق کو اپنے سے زیادہ صاحب کرامت نہ پایا۔ اس بنا پر ان میں فخر و غرور پیدا ہوا اس وقت اللہ تعالیٰ نے ان سب کا امتحان لیا اور باطن کو جسم میں مقید کر کے روح کو دل میں محبوس کیا اور دل کو جسم

میں رکھا پھر عقل کو ان میں شامل کیا اور انبیاء علیہم السلام کو بھیج کر انہیں حکم دیا۔ اس کے بعد جو اپنے مقام کا متلاشی ہوا حق تعالیٰ نے اسے نماز کا حکم دیا تا کہ جسم تو نماز میں ہو اور دل محبتِ الٰہی میں اور جان قربت کا مقام حاصل اور باطن وصالِ حق سے سکون و قرار پائے۔

غرض کہ سب محبت کی تعبیرات ہیں نہ کہ عین محبت، اس لئے کہ محبت حال ہے اور حال کو کسی صورت الفاظ میں بیان نہیں کیا جا سکتا۔ اگر سارا جہان مل کر بھی چاہے کہ محبت کو حاصل کرے تو حاصل نہیں کر سکتا۔ اگر سب مل کر چاہیں کہ اسے اپنے سے دور کر دیں تو بھی ممکن نہیں کیونکہ عطیہ اور موہبۂ ربی سے متعلق ہے نہ کہ کسب و اختیار سے، اسی طرح اگر سارا جہان یہ چاہے کہ محبت اس میں آ جائے تو یہ بھی ممکن نہیں ہے اور اگر وہ سب مل کر یہ چاہیں کہ اسے اپنے سے محدود کر دیں تو وہ یہ بھی نہیں کر سکتے کیونکہ یہ خدا کا امر ہے اور آدمی لاہی یعنی کھلنڈرا ہے، لاہی، الٰہی کا ادرک نہیں کر سکتا۔ واللہ اعلم

استعمال عشق پر مشائخ کے اقوال:

لفظ عشق کے استعمال کے سلسلہ میں مشائخ کے بکثرت اقوال ہیں چنانچہ ایک جماعت کا یہ نظریہ ہے کہ بندہ کو حق تعالیٰ کا عشق ہو سکتا ہے لیکن حق تعالیٰ کو کسی سے عشق ہو یہ سمجھنا جائز نہیں ہے۔ یہ جماعت یہ بھی کہتی ہے کہ عشق ایسی صفت ہے جو اپنے محبوب سے روکا گیا ہو چونکہ بندہ کو حق تعالیٰ سے روکا گیا ہے اور حق تعالیٰ بندہ سے رکا ہوا نہیں ہے اس لئے بندہ پر تو عشق کا استعمال جائز ہے لیکن حق تعالیٰ کے لئے اس کا استعمال جائز نہیں ہے۔

ایک جماعت کا نظریہ ہے کہ بندہ کا حق تعالیٰ پر عاشق ہونا بھی جائز نہیں ہے اس لئے کہ حد سے بڑھ جانے کا نام عشق ہے اور حق تعالیٰ محدود نہیں ہے۔

صوفیائے متاخرین فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کی ذات کا عشق دونوں جہان میں درست نہیں ہو سکتا البتہ ادراک ذات کا عشق ممکن ہے مگر حق تعالیٰ کی ذات مدرک نہیں ہے لہٰذا اس کی کسی صفت کے ساتھ ہی عشق و محبت درست ہو سکتا ہے اس کی ذات کے ساتھ درست نہیں ہو سکتا ہے۔

نیز صوفیاء فرماتے ہیں کہ عشق، دیدار کے بغیر حاصل نہیں ہوتا البتہ محض سماعت کے ذریعہ محبت جائز ہو سکتی ہے۔ چونکہ عشق کا تعلق نظر سے ہے اور یہ حق تعالیٰ پر ممکن نہیں کیونکہ دنیا میں کسی نے اس کو نہیں دیکھا۔ جب حق تعالیٰ سے یہ بات ظاہر ہوئی تو ہر ایک اس کا دعویٰ کرنے لگتا کیونکہ خطاب میں سب برابر ہیں۔ چونکہ ذاتِ حق غیر مدرک و غیر محسوس ہے تو اس کے ساتھ عشق کرنا کیسے درست ہو سکتا ہے البتہ حق تعالیٰ نے اپنی صفات و افعال کے ساتھ جب اپنے اولیاء پر احسان و کرم فرمایا تو بایں وجہ صفات کے ساتھ محبت کرنا درست ہو جاتا ہے۔ کیا تم نے نہیں دیکھا کہ حضرت یعقوب علیہ السلام، حضرت یوسف علیہ السلام کی محبت میں ان کے صدمہ فراق سے وارفتہ ہو گئے تھے جب انہوں نے ان کی قمیص مبارک پائی تو ان کی چشم مبارک میں نور آ گیا اور جب زلیخا کو عشق یوسفی نے مارا تو جب تک انہیں ان کا وصال نصیب نہ ہوا آنکھیں روشن نہ ہوئیں حالانکہ یہ عجیب معاملہ ہے کہ ایک یعنی زلیخا خواہش نفسانی کی پرورش کرتی ہے اور دوسرا یعنی حضرت یعقوب علیہ السلام ہر خواہش کو فنا کر دیتے ہیں۔

صوفیاء کی ایک جماعت کا نظریہ یہ ہے کہ چونکہ عشق کی کوئی ضد نہیں ہے اور حق تعالیٰ کی بھی کوئی ضد نہیں ہے لہٰذا اسے زیبا ہے کہ اس پر یہ جائز ہو۔ اسی سلسلہ میں بکثرت لطائف ہیں اور دقائق ہیں بخوفِ طوالت انہیں چھوڑتا ہوں۔ واللہ اعلم بالصواب۔

تحقیق محبت میں مشائخ کے رموز:

محبت کی تحقیق میں مشائخ طریقت نے بکثرت رموز و اشارات بیان کئے ہیں بطور تبرک چند بیان کرتا ہوں۔ سب کی یہاں گنجائش نہیں ہے۔

حضرت استاذ ابوالقاسم قشیری رحمتہ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ:

المحبة محو المحب بصفاته واثبات المحبوب بذاته

محبت وہ ہے کہ وہ اپنی تمام صفتوں کو محبوب کی طلب اور اس کی ذات کے اثبات میں فنا کر دے۔

مطلب یہ ہے کہ محبوب باقی ہو اور محبّ فانی اور محبوب کی بقاء کے لئے محبت کی غیرت

کو اس حد تک نفی کرے کہ محبت ہی کا تصرف رہ جائے اور محبّ کے اوصاف کی فنا، ذات محبوب کے اثبات کے سوا نہ رہے۔ چونکہ یہ جائز ہی نہیں ہے کہ محبّ اپنے صفات کے ساتھ قائم رہے اگر وہ اپنی صفات میں قائم رہے گا تو جمال محبوب سے محروم رہے گا جبکہ محبّ یہ جانتا ہے کہ اس کی ذات، جمال محبوب سے وابستہ ہے تو وہ بدیہی طور پر اپنے صفات کی برقراری کی نفی کرے گا کیونکہ اسے معلوم ہے کہ جب تک اپنے صفات قائم ہیں وہ محبوب سے محجوب رہے گا لہٰذا وہ دوست ومحبوب کی محبت میں اپنا دشمن رہے گا۔

مشہور ہے کہ حضرت حسین بن منصور حلاج رحمتہ اللہ علیہ جب دار پر چڑھائے گئے تو ان کا آخری کلام یہ تھا کہ "حب الواحد افراد الواحدله" محبّ کے لئے یہ کتنا خوشی کا مقام ہے کہ اپنی ہستی کو راہِ محبت میں فنا کردے۔ اور نفس کا اختیار محبوب کے پانے میں صرف کر کے خود کو فنا کردے۔

حضرت بایزید بسطامی رحمتہ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ:

المحبة استقلال الکثیر من نفسك واستکثار القلیل من حبیبك

محبت یہ ہے کہ اپنے بہت کو تھوڑا جانے اور محبوب کے تھوڑے کو بہت جانے

بندے کے لئے یہ معاملہ حق ہے اس لئے کہ دنیا میں جس قدر نعمتیں اسے دی گئی ہیں حق تعالیٰ نے ان کو تھوڑا فرمایا ہے چنانچہ حق تعالیٰ فرماتا ہے:

قُلْ مَتَاعُ الدُّنْيَا قَلِيْلٌ (النسآء:۷۷)

اے محبوب تم کہہ دو یہ دنیاوی نعمتیں تو تھوڑی ہیں۔

لیکن قلیل زندگی، قلیل جگہ اور قلیل سامان کے ساتھ ان کے قلیل ذکر الٰہی کو بہت فرمایا ہے جیسا کہ ارشاد ہے:

وَالذّٰکِرِیْنَ اللہَ کَثِیْراً وَّالذّٰکِرٰتِ (الاحزاب:۳۵)

مرد وعورت خدا کا بہت ذکر کرنے والے ہیں۔

حضرت بایزید رحمۃ اللہ علیہ کے ارشاد کا مطلب یہ ہے کہ لوگ اس حقیقت کو جان لیں کہ حقیقی محبوب اللہ تعالیٰ ہی ہے۔ یہ صفت غیر کے لئے موزوں نہیں ہے اس لئے کہ حق تعالیٰ کی طرف سے جتنا بھی بندہ کو پہنچے وہ تھوڑا نہیں ہو سکتا اور بندے کی طرف سے جتنا بھی اس کی طرف جائے وہ تھوڑا ہی ہے۔ حضرت سہل بن عبداللہ تستری رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ:

المحبة معانقة الطاعات و مباينة المخالفات
محبت یہ ہے کہ محبوب کی طاعتوں میں ہی ہم آغوش رہے اور اس کی مخالفتوں سے ہمیشہ بچتا رہے۔

کیونکہ دل میں جس قدر محبت زیادہ ہوگی محبت کا حکم، محبّ کے لئے اتنا ہی زیادہ آسان ہوگا۔ یہ ملحدوں کے اس گروہ کا رد ہے جو یہ کہتا ہے کہ بندہ محبت میں اس کمال تک پہنچ جاتا ہے کہ اس سے طاعتیں اٹھ جاتی ہیں حالانکہ یہ خالص زندیقی اور بے دینی ہے یہ ناممکن ہے کہ عقل کی درستگی کی حالت میں بندے سے احکام مکلفہ ساقط ہو جائیں۔ وجہ یہ ہے کہ امت مسلمہ کا اس پر اجماع ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی شریعت ہرگز منسوخ نہ ہوگی اور عقل کی درستگی کی حالت میں جب کسی ایک سے بھی طاعت کے اٹھ جانے کو مانا جائے گا تو سب سے اٹھ جانا بھی جائز و ممکن بن جائے گا۔ یہ بات خالص بے دینی کی ہے البتہ مغلوب الحال یا پاگل دیوانے کا حکم مختلف ہے اور اس کا عذر جداگانہ ہے۔ البتہ یہ بات جائز ہے کہ محبت الٰہی میں بندہ اس کمال تک پہنچ جائے کہ اسے طاعت کی بجا آوری میں تکلیف و مشقت معلوم نہ ہو اس لئے کہ حکم کی کلفت، حکم والے سے محبت رکھنے کی مقدار کے مطابق معلوم ہوتی ہے اس سے قبل جتنی زیادہ محبت ہوگی اتنی ہی اس کے احکام کی بجا آوری آسان ہوگی یہ معنی حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے مبارک حال میں ظاہر ہے کہ حق تعالیٰ نے فرمایا "لَعَمْرُكَ" اے محبوب! آپ کی زندگی کی قسم، آپ نے شبانہ روز اس کثرت سے عبادت کی کہ تمام مشاغل سے دست کش ہو گئے اور آپ کے قدم ناز ورم کر آئے اس وقت اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

طٰهٰ مَآ اَنْزَلْنَا عَلَيْكَ الْقُرْاٰنَ لِتَشْقٰٓى (طٰهٰ: ۱،۲) — اے محبوب ہم نے یہ قرآن اس لئے نہیں اتارا کہ آپ مشقت میں پڑ جائیں۔

یہ صورت بھی ممکن ہے کہ طاعت کی بجا آوری میں بندے سے اس کی رویت اٹھالی جائے اور بندہ اپنے عمل کی کیفیت نہ دیکھ سکے۔ چنانچہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ ''بسا اوقات میرے دل پر ایک ابر سا چھا جاتا ہے تو میں اس وقت روزانہ ستر بار اپنے رب سے استغفار کرتا ہوں۔'' اس کی وجہ یہ ہوتی ہے کہ حضور اپنے اعمال کو خود ملاحظہ نہ فرماتے اور نہ ان پر حیرت وتعجب کا اظہار کرتے بلکہ امر حق کی تعظیم کی طرف ہی متوجہ ہو کر عرض کرتے کہ اے رب العالمین میرے اعمال تیرے شایانِ شان پورے نہ ہو سکے۔

حضرت سمنون محبّ رحمتہ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ:

ذهب المحبون لله بشرف الدنيا والاخره لان النبى صلى الله عليه وسلم قال المرء مع من احب — محبوبانِ خدا تو دنیا و آخرت کی شرافت کے ساتھ واصل بحق ہیں۔ کیونکہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ آدمی اس کے ساتھ رہے گا جس سے اسے زیادہ محبت ہے۔

چونکہ وہ حق تعالیٰ کے ساتھ ہیں اس لئے ان پر خطا کا صدور محال ہے۔ لہٰذا ان کی دنیاوی شرافت یہ ہے کہ حق تعالیٰ ان کے ساتھ ہے اور اُخروی شرافت یہ ہے کہ وہ حق تعالیٰ کے ساتھ ہیں۔ حضرت یحیٰی بن معاذ رازی رحمتہ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ:

حقيقة المحبته لا ينقص بالجفاء ولا يزيد بالبر والعطاء — حقیقی محبت، نہ ظلم سے کم ہوتی ہے اور نہ نیکی و عطاء سے بڑھتی ہے۔

اس لئے کہ یہ دونوں محبت میں سبب ہیں اور اسباب، ظاہر وجود کے حال میں فناء ہوتے ہیں اور محبّ، محبوب کی بلا میں خوش ہوتا ہے چونکہ راہِ وفاء میں ظلم و وفاء دونوں برابر ہیں اور جب محبت پیدا ہو جاتی ہے تو وفاء، جفا کی مانند اور جفا، وفا کی مانند بن جاتی ہے۔

حضرت شبلی علیہ الرحمۃ کو دیوانگی کے الزام میں شفاخانہ میں داخل کر کے محبوس کر کے کچھ لوگ بغرض ملاقات ان کے پاس گئے آپ نے ان سے پوچھا تم کون ہو؟ لوگوں نے کہا: ہم آپ سے محبت کرنے والے ہیں۔ یہ سن کر آپ نے پتھر مارنے کے لئے اٹھایا۔ لوگ سب بھاگ کھڑے ہوئے۔ اس وقت آپ نے فرمایا اگر تم مجھ سے سچی محبت کرنے والے ہوتے تو مار کے ڈر سے نہ بھاگتے۔ اس لئے کہ محبین، محبوب کی بلا سے بھاگا نہیں کرتے۔

اس معنی میں بکثرت اقوالِ مشائخ ہیں فی الحال میں ان ہی پر اکتفا کرتا ہوں۔ واللہ اعلم بالصواب۔

چھٹا کشف حجاب

زکوٰۃ کے بیان میں

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ:

''اَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ''

''نماز قائم کرو اور زکوٰۃ دو''

اس حکم پر مشتمل بکثرت آیات واحادیث وارد ہیں اور ایمان کے فرائض واحکام میں سے ایک زکوٰۃ کا وجوب ہے۔ جس پر زکوٰۃ فرض ہو جائے اس پر اعراض حرام ہے۔ البتہ تکمیل نصاب پر زکوٰۃ واجب ہوتی ہے مثلاً جس کے پاس دو سو درہم ہوں تو یہ کامل نصاب ہے اس پر مالکانہ حیثیت سے پانچ درہم زکوٰۃ واجب ہے اور بیس (۲۰) دینار بھی ایک پورا نصاب اور کامل نعمت ہے اس پر نصف دینار زکوٰۃ واجب ہے اور پانچ اونٹ بھی پوری نعمت ہے اس پر ایک بکری واجب ہے دیگر احوال کی زکوٰۃ کا بھی یہی حال وقاعدہ ہے۔

جس طرح مال کی زکوٰۃ واجب ہوتی ہے اسی طرح مرتبہ کی زکوٰۃ بھی واجب ہوتی ہے کیونکہ وہ بھی ایک پوری نعمت ہوتی ہے۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ:

اِنَّ اللہَ تَعَالٰی فَرَضَ عَلَیْکُمْ زَکٰوۃَ جَاهِکُمْ کَمَا فَرَضَ عَلَیْکُمْ زَکٰوۃَ مَالِکُمْ

اللہ تعالیٰ نے تمہارے مرتبہ کی زکوٰۃ بھی اسی طرح فرض کی ہے جیسا کہ تمہارے مال پر فرض کی۔

نیز ارشاد ہے:

اِنَّ لِکُلِّ شَیْئٍ زَکٰوۃٌ وَزَکٰوۃُ الدَّارِ بَیْتُ الضِّیَافَۃِ

یقیناً ہر چیز کے لئے زکوٰۃ ہے اور گھر کی زکوٰۃ مہمان کو ٹھہرانا اور اس کی مہمان نوازی کرنا ہے۔

زکوٰۃ کی حقیقت:

زکوٰۃ کی حقیقت، شکران نعمت ہے جو اسی جنس کی نعمت کے ساتھ ادا کی جائے چونکہ تندرستی ایک بڑی نعمت ہے لہٰذا ہر عضو کی زکوٰۃ بھی واجب ہے اور اس کی ادائیگی یہ ہے کہ اپنے تمام اعضاء کو عبادت میں مشغول رکھا جائے اور کسی کھیل کود میں نہ لگایا جائے تا کہ نعمت کی زکوٰۃ کا حق ادا ہو۔

اسی طرح باطنی نعمت کی بھی زکوٰۃ واجب ہوتی ہے چونکہ باطنی نعمت بے حد وحساب ہے اس لئے اس کی حقیقت کا احاطہ نہیں کیا جا سکتا اس میں ہر شخص کے لئے اپنے اندازہ کے مطابق اس کی زکوٰۃ واجب ہے اور وہ ظاہری و باطنی نعمتوں کا عرفان ہے۔ جب بندہ جان لے کہ حق تعالیٰ کی نعمتیں اس پر بے اندازہ ہیں تو وہ اس کا شکر بھی بے اندازہ بجالائے اس لئے کہ بے اندازہ نعمتوں کی زکوٰۃ کے لئے، بے اندازہ شکر درکار ہے۔

اہل طریقت کے نزدیک زکوٰۃ کی تمام قسموں میں سب سے زیادہ غیر محمود زکوٰۃ دنیاوی نعمت کی زکوٰۃ ہے کیونکہ اس میں بخل کا وجود ہے حالانکہ انسان کے لئے بخل مذموم صفت ہے۔ کیا یہ بخل کا کمال نہیں ہے کہ دو سو درہم کوئی شخص سال بھر تک قبضہ میں رکھے اور ایک سال کے بعد اس میں سے پانچ درہم زکوٰۃ نکالے۔ حالانکہ کریم وسخی کا طریق مال خرچ کرنا ہے نہ کہ مال کو جمع رکھنا۔ جب سخاوت کی عادت ہوگی تو زکوٰۃ کہاں سے واجب ہوگی۔؟

ایک ظاہری عالم نے بغرض تجربہ حضرت شبلی علیہ الرحمۃ سے دریافت کیا کہ کتنی مقدار پر زکوٰۃ کا وجوب ہے۔ آپ نے فرمایا جب بخیل کے پاس دو سو درہم مال موجود ہو تو تمہارے طریقہ میں پانچ درہم اور ہر بیس دینار پر نصف دینار زکوٰۃ واجب ہے لیکن ہمارے طریق میں کسی چیز کو اپنی ملکیت میں نہ رکھنا واجب ہے تاکہ زکوٰۃ کی مشغولیت سے بے نیاز رہے۔ اس عالم نے پوچھا اس مسئلہ میں آپ کا امام اور رہنما کون ہے؟ آپ نے فرمایا حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ ہیں کہ انہوں نے جو موجود تھا سب دے دیا۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''مَاخَلَّفْتَ لِعَیَالِكَ'' تم نے اپنے گھر والوں کے لئے کیا چھوڑا؟ عرض کیا ''اَللّٰہ وَرَسُوْلُہٗ'' امیر المومنین حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے اپنے ایک قصیدہ میں فرمایا ہے:

فما وجبت علی زکوۃ مال

وھل تجب الزکوۃ علی الجواد

مجھ پر کبھی زکوٰۃ واجب نہ ہوئی

کیا سخیوں پر بھی زکوٰۃ واجب ہوتی ہے

لہٰذا سخیوں کا مال خرچ ہوتا رہتا ہے وہ مال میں کنجوسی نہیں کرتے اور نہ مال کی بدولت کسی سے جھگڑا کرتے ہیں کیونکہ ان کی ملکیت میں کچھ رہتا ہی نہیں۔ اگر کوئی شخص اپنی جہالت سے یہ کہے کہ جب میرے پاس مال ہی نہیں تو زکوٰۃ کے مسائل جاننے کی کیا حاجت؟ اس کا یہ کہنا صحیح نہیں اس لئے کہ تحصیل علم، فرض عین ہے اور علم سے لاتعلقی کا اظہار، کفر ہے۔ موجودہ زمانہ کے فتنوں میں سے ایک فتنہ یہ بھی ہے کہ مدعیان صلاح وفقر، جہالت میں رہتے ہوئے علم کو چھوڑ جاتے ہیں۔

حضور سیدنا داتا گنج بخش رحمتہ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ میں ایک دن صوفیوں کی ایک جماعت کو پڑھا رہا تھا چونکہ وہ لوگ مبتدی تھے ان کو مفہوم سمجھا رہا تھا ایک جاہل درمیان میں دخل انداز ہوا۔ میں اس وقت اونٹ کی زکوٰۃ کے مسائل بیان کر رہا تھا اور بنت لبون، بنت مخاض اور حقہ کے احکام سمجھا رہا تھا اس جاہل مرکب کے دل میں یہ بات تنگی کا موجب بنی وہ اٹھ کھڑا ہوا اور

مجھ سے کہنے لگا میرے پاس اونٹ نہیں ہیں۔ بنت لبون کا علم میرے کس کام آئے گا؟ میں نے اس سے کہا اے شخص! جس طرح ہمیں زکوٰۃ دینے کے لئے علم کی حاجت ہے اسی طرح ہمیں زکوٰۃ وصول کرنے کے لئے بھی علم کی ضرورت ہے اگر کوئی تجھے بنت لبون دے اور تو اسے لے لے تو اس وقت بھی یہی کہے گا کہ مجھے بنت لبون کے علم کی ضرورت نہیں اگر کسی کے پاس مال نہ ہو اور مال کے حصول کی کوئی صورت نہ ہو تو کیا اس سے علم کی فضیلت جاتی رہے گی۔ فنعوذ باللہ من الجھل

زکوٰۃ لینے میں طریقت کے مسائل

مشائخ طریقت میں کچھ حضرات تو وہ ہیں جو زکوٰۃ کے لینے کو گوارہ کرتے ہیں اور کچھ حضرات وہ ہیں جو زکوٰۃ لینے کو ناپسند کرتے ہیں۔ جن حضرات کا فقر اختیاری ہوتا ہے وہ مالِ زکوٰۃ نہیں لیتے وہ کہتے ہیں کہ ہم مال جمع نہیں کرتے کہ ہمیں زکوٰۃ دینی پڑے گی اور دنیاداروں سے لینا بھی گوارہ نہیں کرتے کہ اس میں ان کا ہاتھ اونچا رہتا ہے اور ہمارا ہاتھ نیچا۔ جن حضرات کا فقر اختیاری نہ ہو بلکہ اضطراری ہو وہ زکوٰۃ لے لیتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ نہیں کہ انہیں مال زکوٰۃ کی ضرورت ہے بلکہ اس بنا پر کہ وہ چاہتے ہیں کہ اپنے مسلمان بھائی کی گردن سے فریضہ اتر جائے اور جب ان کی نیت یہ ہو تو اس میں انہیں کا ہاتھ اونچا ہے نہ کہ تونگر کا؟ اگر دینے والے کا ہاتھ اونچا رہے اور لینے والے کا نیچا تو اس سے خدا کے ارشاد گرامی "یَأْخُذُ الصَّدَقَاتِ" (توبہ:۱۰۴) وہ زکوٰۃ لیتے ہیں کا بطلان لازم آتا ہے اور یہ بھی کہ زکوٰۃ دینے والا زکوٰۃ لینے والے سے افضل ہے اور یہ خالص گمراہی ہے۔ اونچا ہاتھ وہی ہے جو کسی چیز کو وجوب کے طور پر مسلمان بھائی سے لے تا کہ اس کی گردن سے اس کا بوجھ اتر جائے۔ یہ درویش لوگ دنیاوی آدمی نہیں ہیں بلکہ عقبائی ہیں اگر یہ عقبائی درویش دنیاداروں سے نہ لیں تو ان کی ذمہ فریضہ واجب رہ جائے گا اور جس کی بنا پر قیامت میں وہ ماخوذ ہوں گے۔ لہٰذا اللہ تعالیٰ نے عقبائی درویشوں کو بہت کم ضروریات کے ذریعہ امتحان میں ڈالا تا کہ دنیاداروں کی گردنوں سے فرض کا بوجھ اتاریں لامحالہ اونچا ہاتھ فقرا کا ہی ہاتھ ہے جو

شریعت کے حق کے موافق اپنا حق لیتا ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ کا حق اس پر واجب تھا۔ اگر لینے والوں کا ہاتھ نیچا ہوتا جیسا کہ حشوی لوگ کہتے ہیں تو انبیاء کا ہاتھ نیچا ہوتا کیونکہ انہوں نے اللہ تعالیٰ کا حق لوگوں سے وصول کیا ہے اور لازماً اخراجات میں ان کو صرف فرماتے رہے ہیں اس لئے ان کا کہنا غلط ہے کہ لینے والا ہاتھ نیچا ہے اور دینے والا ہاتھ اونچا۔ تصوف میں دونوں قاعدے قوی ہیں۔ وباللہ التوفیق

جُود وسخا کا بیان

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

اَلسَّخِیُّ قَرِیْبٌ مِّنَ الْجَنَّةِ وَبَعِیْدٌ مِّنَ النَّارِ وَالْبَخِیْلُ قَرِیْبٌ مِّنَ النَّارِ وَبَعِیْدٌ مِّنَ الْجَنَّةِ (ترمذی)

سخی جنت سے قریب اور دوزخ سے دور ہے اور بخیل دوزخ سے قریب اور جنت سے دور ہے۔

اہل علم کے نزدیک جود وسخا کے ایک ہی معنی صفات بشریہ میں ہیں۔ حق تعالیٰ کو جواد تو کہہ سکتے ہیں مگر سخی نہیں کہہ سکتے کیونکہ حق تعالیٰ کے تمام اسماء وصفات توفیقی ہیں حق تعالیٰ نے اپنے آپ کو جواد تو فرمایا لیکن سخی نہیں کہلوایا ہے اور نہ کسی حدیث میں خدا کی صفت سخی وارد ہے اجماع امت اور اتفاقِ اہل سنت کے نزدیک بھی یہ جائز نہیں ہے کہ باعتبار عقل ولغت، اللہ تعالیٰ کو کسی نام سے پکارا جائے جب تک کہ کتاب وسنت اس پر ناطق نہ ہو۔ مثلاً خدا کے اسماء حسنیٰ میں عالم ہے باجماع امت اسے عالم تو کہہ سکتے ہیں لیکن عاقل وفقیہ نہیں کہہ سکتے۔ اگرچہ عالم، عاقل اور فقیہ کے معنی ایک ہی ہیں۔ اسی طرح بر بنائے توقیف خدا کو جواد تو کہہ سکتے ہیں لیکن عدم توقیف کی بنا پر سخی کا استعمال اس کے لئے درست نہیں۔

بعض اہل علم نے جود وسخا کے درمیان معنی میں کچھ فرق کیا ہے وہ کہتے ہیں کہ سخی وہ ہوتا ہے جو بخشش وعطا میں امتیاز برتے یعنی وہ کسی غرض وسبب کو ملحوظ رکھے۔ یہ جود کا ابتدائی درجہ ہے لیکن جود کا کامل مرتبہ یہ ہے کہ وہ کسی قسم کا امتیاز نہ برتے اور اس کا فعل بے سبب و بے غرض

ہو۔ یہ دونوں حالت دونبیوں کی ہیں ایک حضرت خلیل اللہ علیہ السلام کی دوسری سیدنا حبیب اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی۔ حدیث میں وارد ہے کہ حضرت خلیل اللہ علیہ السلام اس وقت تک کھانا نوش نہ فرماتے تھے جب تک کہ کوئی مہمان موجود نہ ہوتا۔ ایک مرتبہ تین دن گزر گئے کوئی مہمان نہ آیا اتفاق سے ایک کافر کا گزر آپ کے دروازے کے آگے سے ہوا۔ آپ نے اس سے پوچھا تو کون ہے؟ اس نے کہا میں کافر ہوں۔ آپ نے فرمایا تو میری مہمانی اور عزت افزائی کے لائق نہیں ہے۔ اسی وقت حق تعالیٰ نے وحی نازل فرمائی کہ اے خلیل، جسے میں نے ستر (۷۰) سال تک پالا تم نے اسے ایک روٹی تک نہ دی۔

اللہ کے حبیب صلی اللہ علیہ وسلم کا حال یہ ہے کہ جب حاتم طائی کا بیٹا آپ کی بارگاہ میں آیا تو آپ نے اپنی چادر مبارک اس کے نیچے بچھائی اور فرمایا: ''اِذَا اَتَاکُمْ کَرِیْمُ قَوْمٍ فَاَکْرِمُوْہُ'' (ابن ماجہ) جب کسی قوم کا عزت والا تمہارے پاس آئے تو تم اس کی عزت کرو۔ مقام غور ہے کہ ایک نبی نے امتیاز برتا اور سخاوت سے ہاتھ کھینچا اور ایک نبی نے امتیاز برتا اور اپنی شان نبوت کے اظہار میں کافر کے لئے چادر مبارک بچھائی۔ اول حضرت ابراہیم کی سخاوت کا حال تھا اور دوسرا ہمارے آقا صلی اللہ علیہ وسلم کے جود کا ذکر پاک۔

اس معنی میں سب سے عمدہ مذہب یہ ہے کہ دل میں جو سب سے پہلے خیال آئے اس کی پیروی جود ہے۔ اور جب اس پر دوسرا خیال غالب آجائے تو وہ بخل کی علامت ہے۔ محققین نے اول خیال کو بہت بلند جانا ہے کیونکہ پہلا خیال حق تعالیٰ کی جانب سے ہے۔

مجھے پتہ چلا ہے کہ نیشا پور میں ایک سوداگر تھا جو ہمیشہ ابو معید کی صحبت میں رہا کرتا تھا۔ ایک روز سوداگر سے کسی درویش نے کچھ مانگا۔ اس سوداگر نے دل میں کہا کہ میرے پاس ایک دینار ہے اور ایک ٹکڑا سونے کا ہے؟ دل کا پہلا خیال یہ کہتا ہے کہ اسے دینار دے دیا جائے اور دوسرا خیال یہ کہتا ہے کہ اسے سونے کا ٹکڑا دے دیا جائے اس سوداگر نے سونے کا ٹکڑا دے دیا جب حضرت ابو سعید رحمتہ اللہ علیہ کے سامنے اس کا ذکر آیا تو اس نے دریافت کیا کہ کیا حق تعالیٰ سے بحث کرنا جائز ہے؟ حضرت شیخ نے فرمایا تم نے بحث کی ہے کیونکہ حق تعالیٰ نے تو حکم

دیا کہ دینار دو مگر تم نے سونے کا ٹکڑا دے دیا یہ بھی مجھے معلوم ہوا ہے کہ حضرت شیخ ابو عبداللہ رود باری رحمتہ اللہ علیہ ایک مرید کے گھر تشریف لائے۔ مرید گھر میں موجود نہ تھا۔ انہوں نے فرمایا اس کے گھر کا سامان بازار میں فروخت کر دو۔ جب مرید گھر آیا تو وہ اس سے بہت خوش ہوا اور شیخ کی خوشنودی کی خاطر کچھ نہ کہا۔ جب اس کی بیوی آئی اور گھر کا یہ حال دیکھا تو اس نے اندر جا کر اپنے کپڑے اتار دیئے اور کہنے لگی کہ یہ بھی تو گھر کے سامان میں سے ہے اس کا بھی وہی حکم ہے۔ مرد نے اس پر تنبیہ کرتے ہوئے کہا کہ یہ سراسر تکلف و اختیار ہے، جو تو نے کیا ہے۔ عورت نے کہا شیخ نے جو کچھ کیا وہ ان کا جود تھا اب ہمیں اپنے نفس کی ملکیت میں تصرف کرنا چاہئے تا کہ ہمارا جود بھی ظاہر ہو مرد نے کہا ٹھیک ہے جبکہ ہم نے خود کو شیخ کے حوالہ کر دیا ہے تو ہم پر بھی ان کا اختیار اسی طرح ہے جیسا کہ ہمارا، ہمارے اوپر تھا۔ یہی ہمارا عین جود ہے۔

انسان کی صفت میں جود کا وجود تکلف و مجاز ہے۔ لہٰذا مرید کے لئے یہ لازم ہے کہ وہ ہمیشہ اپنے نفس کی طاقت کو اللہ تعالیٰ کی متابعت میں صرف کرے یہی مذہب حضرت سہل بن عبد اللہ تستری رحمتہ اللہ علیہ کا ہے وہ فرماتے ہیں کہ "الصوفی دمہ هدر وملکہ مباح" صوفی وہ ہے جس کا خون معاف، اور اس کی ملکیت مباح ہو۔

میں نے حضرت شیخ ابو مسلم فارسی رحمتہ اللہ علیہ سے سنا ہے انہوں نے فرمایا کہ ایک مرتبہ میں کچھ لوگوں کے ساتھ سفر حجاز میں تھا۔ حلوان کے نواح میں کردوں نے ہمارے سب کپڑے چھین لئے۔ ہم نے بھی ان سے کوئی مزاحمت نہ کی۔ ہم نے اسی میں ان کی خوشی سمجھی۔ لیکن ایک شخص ہم میں ایسا تھا جو بے قراری کا اظہار کر رہا تھا ایک کردی نے تلوار سونت کر اسے مار ڈالنا چاہا ہم سب نے اس کی سفارش کی۔ اس کردی نے کہا یہ جائز نہیں ہے کہ ہم اس جھوٹے کو زندہ چھوڑیں یقیناً ہمیں اسے مار ہی ڈالنا چاہئے۔ ہم نے اس کی وجہ پوچھی تو اس نے کہا کہ یہ صوفی نہیں ہے یہ اولیاء کی صحبت میں خیانت کرتا ہے۔ ایسے شخص کو ناپید کر دینا ہی بہتر ہے۔ ہم نے پوچھا یہ الزام کس بنا پر رکھتے ہو؟ اس کردی نے کہا اس لئے کہ صوفیوں کا سب سے کمتر درجہ جود ہے۔ یہ شخص چند پھٹے پرانے کپڑوں پر بے صبری کا اظہار کرتا ہے یہ کیسے صوفی ہو سکتا ہے؟

جو اپنے رفقاء سے اس طرح جھگڑا کرتا ہے۔ حالانکہ ہم برسوں سے یہ کام کر رہے ہیں تمہارا راستہ روک رہے ہیں اور تمہارے تعلقات کو منقطع کر رہے ہیں مگر تم کبھی رنجیدہ خاطر نہیں ہوتے۔

اہل علم بیان کرتے ہیں کہ حضرت عبداللہ بن جعفر طیار رضی اللہ عنہما ایک قبیلہ کی چراگاہ سے گزرے وہاں ایک حبشی غلام کو بکریوں کی رکھوالی کرتے دیکھا۔ اسی اثنا میں ایک کتا آیا اور اس غلام کے آگے بیٹھ گیا۔ اس نے ایک روٹی نکال کر کتے کے آگے ڈال دی اس کے بعد دوسری پھر تیسری۔ حضرت عبداللہ نے یہ حال دیکھ کر پوچھا اے غلام تیرا کھانا روزانہ کتنا ہوتا ہے اس نے کہا اتنا ہی جتنا آپ نے دیکھا۔ فرمایا وہ سب کیوں کھلا دیا؟ یہ سن کر اس نے کہا اس لئے کہ یہ جگہ کتوں کی تو ہے نہیں، معلوم ہوتا ہے یہ کہیں دور سے امید لے کر آتا ہے میں نے اچھا نہ جانا کہ اس کی محنت کو ضائع کر دوں۔ حضرت عبداللہ کو یہ بات اس کی بہت اچھی معلوم ہوئی۔ انہوں نے اس غلام کو اور اس کی تمام بکریوں کو مع چراگاہ کے خرید لیا۔ اور غلام کو آزاد کر کے فرمایا یہ سب بکریاں اور یہ چراگاہ تمہیں بخش دیں۔ غلام نے ان کے لئے دعا کی اور بکریوں کو خیرات کر کے چراگاہ وقف کر دی اور خود وہاں سے چلا گیا۔

ایک شخص حضرت امام حسن مجتبیٰ بن حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہما کے دروازے پر آیا اور اس نے عرض کیا اے فرزند رسول، مجھ پر چار سو درہم قرض ہیں حضرت امام حسن رضی اللہ عنہ نے حکم دیا کہ اسے چار سو (۴۰۰) درہم دے دیئے جائیں اور خود روتے ہوئے اندر تشریف لے گئے تو لوگوں نے پوچھا اے فرزند رسول صلی اللہ علیہ وسلم! رونے کی کیا وجہ ہے؟ آپ نے فرمایا اس لئے روتا ہوں کہ میں نے اس شخص کے حال کی جستجو میں کوتاہی کی ہے یہاں تک کہ میں نے اسے سوال کی ذلت میں ڈال دیا۔

حضرت ابوسہل صعلوکی رحمتہ اللہ علیہ کبھی خیرات کسی درویش کے ہاتھ پر نہ رکھتے اور جو چیز دینی ہوتی اسے کسی کے ہاتھ میں نہ دیتے بلکہ زمین پر رکھ دیتے تاکہ وہ اسے اٹھا لے۔ لوگوں نے اس کی وجہ پوچھی تو فرمایا اس طرح دینے میں وہ خطرہ نہیں رہتا جو کسی مسلمان کے ہاتھ میں دینے سے ہوتا ہے مطلب یہ کہ میرا ہاتھ اونچا ہو اور اس مہمان کا ہاتھ نیچا۔

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ایک واقعہ ہے کہ بادشاہِ حبش نے آپ کی خدمت میں دو نافے کستوری کے تحفہ میں بھیجے۔ آپ نے انہیں ایک بار ہی پانی میں گھول دیا اور اپنے اور اپنے صحابہ کے اوپر مل دیا۔

حضرت انس رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ ایک شخص حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں آیا۔ آپ نے اسے دو پہاڑ کے درمیان کی وادی جو بکریوں سے پر تھی عطا فرمادی۔ جب وہ اپنی قوم میں گیا تو اس نے کہا اے لوگو! جاؤ تم سب مسلمان ہو جاؤ کیونکہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اتنا زیادہ عطا فرماتے ہیں کہ آپ اپنی درویشی سے بھی نہیں ڈرتے۔

حضرت انس رضی اللہ عنہ یہ بھی بیان کرتے ہیں کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں اسی ہزار درہم لائے گئے آپ نے ان سب کو ایک چادر پر پھیلا دیا اور جب تک ان سب کو تقسیم نہ فرما دیا اپنی جگہ سے نہ اٹھے۔ حضرت علی مرتضٰی کرم اللہ وجہہ فرماتے ہیں کہ میں دیکھ رہا تھا آپ کے شکم اطہر پر بھوک کی وجہ سے پتھر بندھا ہوا تھا۔

میں نے متاخرین کے ایک درویش کو دیکھا ہے کہ ایک بادشاہ نے اس کے پاس تین ہزار درہم کے برابر خالص سونے کے پترے بھیجے وہ ان پتروں کو لے کر حمام میں گیا وہاں ان سب کو تقسیم کر کے چلا آیا۔ اس سے قبل نوری مذہب کے سلسلہ میں ایثار کے ضمن میں اس قسم کی بکثرت باتیں گزر چکی ہیں۔ واللہ اعلم

ساتواں کشف حجاب

روزے کے بیان میں

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

يَآ اَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُتِبَ عَلَيْكُمُ الصِّيَامُ (البقرہ:۱۸۳)　　اے ایمان والو تم پر روزے فرض کئے گئے ہیں۔

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ جبریل علیہ السلام نے مجھے خبر دی ہے کہ

حق تعالیٰ فرماتا ہے:

اَلصَّوْمُ لِیْ وَاَنَا اَجْزِیْ بِہٖ (بخاری)	روزہ میرے لئے ہے اور میں ہی اس کی جزا دوں گا۔ یا میں ہی اس کی جزا ہوں گا۔

اس لئے کہ روزہ باطنی عبادت ہے جس کا ظاہر سے کوئی تعلق نہیں اور کسی دوسرے کو یہ معلوم ہی نہیں ہوسکتا کہ یہ روزہ دار ہے۔ اس بنا پر اس کی جزا بھی بے حد و حساب ہے۔

علماء فرماتے ہیں کہ دخول جنت تو رحمت کے طفیل میں ہوگا۔ اور وہاں درجات عبادت کے صدقہ میں اور ہمیشہ رہنا روزے دار کے لئے ہوگا۔ کیونکہ حق تعالیٰ فرماتا ہے میں ہی اس کی جزا دوں گا۔ حضرت جنید بغدادی رحمتہ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ:

الصوم نصف الطریقة	روزہ آدھی طریقت ہے۔

بکثرت مشائخ کو دیکھا ہے کہ وہ ہمیشہ روزہ رکھتے تھے اور بعض مشائخ کو دیکھا کہ وہ صرف ماہِ رمضان المبارک کے روزے رکھتے تھے۔ ان کا یہ عمل اس لئے تھا کہ رمضان کے روزے سے ثواب حاصل ہو اور ماسوٰی دنوں میں روزہ نہ رکھ کر ریاکاری سے محفوظ رہیں۔ میں نے ایسے مشائخ کو بھی دیکھا ہے کہ جن کو روزہ دار ہوتے ہوئے بھی کوئی نہ جانتا تھا کہ وہ روزے سے ہیں۔ اگر کوئی کھانا سامنے لے آتا تو کھا بھی لیتے (اور نفل روزہ افطار کر لیتے تاکہ روزہ دار ہونا معلوم نہ ہو) یہ طریقت سنت کے زیادہ موافق ہے۔ کیونکہ حضرت عائشہ صدیقہ اور حضرت حفصہ رضی اللہ عنہما کی حدیث میں ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم جب ایک دن ان کے یہاں تشریف لائے تو دونوں نے عرض کیا:

اَنَا خَبَزْنَا لَکَ حَیْسًا قَالَ عَلَیْہِ السَّلَامُ اَمَّا اِنِّیْ کُنْتُ اُرِیْدُ الصَّوْمَ وَلٰکِنْ قَرِّبِیْہِ سَاَصُوْمُ یَوْمَ مَکَانِہٖ (بخاری)	یارسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہم نے آپ کے لئے گوشت پکایا ہے حضور نے فرمایا میں نے تو آج روزے کا ارادہ کیا تھا لیکن لاؤ میں اس کے بدلے کا روزہ رکھ لوں گا۔

میں نے احادیث میں دیکھا ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ایام بیض یعنی چاند کی

تیرہ، چودہ اور پندرہ تاریخوں میں اور محرم کے دس دنوں میں روزے رکھا کرتے اور ماہِ رمضان اور شعبان میں بھی روزے رکھتے تھے۔ حدیث میں یہ بھی وارد ہوا ہے کہ آپ داؤدی روزے رکھا کرتے اور اسے خیر الصیام فرمایا کرتے تھے۔ داؤدی روزہ یہ ہے کہ ایک دن روزہ رکھے اور دوسرے دن افطار کرے۔

ایک مرتبہ شیخ احمد بخاری رحمتہ اللہ علیہ کے پاس میں گیا تو ایک طباق حلوے کا ان کے پاس رکھا ہوا تھا اور وہ اس سے تناول کر رہے تھے مجھے اشارہ کر کے فرمایا کھاؤ۔ میں نے بچپن کی عادت کے مطابق کہہ دیا کہ میں روزے سے ہوں فرمایا کیوں روزہ رکھتے ہو؟ میں نے کہاں فلاں بزرگ کی موافقت میں روزے رکھتا ہوں۔ انہوں نے فرمایا کہ یہ بات درست نہیں ہے کہ کسی مخلوق کی کوئی مخلوق متابعت کرے۔ میں نے ارادہ کیا کہ روزہ افطار لوں۔ انہوں نے فرمایا جب تم نے فلاں بزرگ کی متابعت ترک کرنے کا ارادہ کیا ہے تو اب میری بھی موافقت نہ کرو۔ کیونکہ میں بھی ایک مخلوق ہوں۔

روزے کی حقیقت:

روزے کی حقیقت رکنا ہے، اور پوری طریقت اس میں پنہاں ہے۔ روزے میں ادنیٰ درجہ، بھوکے رہنا ہے کیونکہ "اَلْجُوْعُ طَعَامُ اللّٰہِ فِی الْاَرْضِ" بھوکا رہنا زمین پر خدا کا طعام ہے بھوکے رہنے کو شریعت اور عقل دونوں پسند کرتے ہیں۔

ہر مسلمان، عاقل، بالغ، تندرست و مقیم پر صرف ایک ماہ رمضان کے روزے فرض ہیں جو رمضان کا چاند دیکھنے سے شوال کا چاند دیکھنے تک ہیں۔ ہر روزے کے لئے نیت درست اور ادائیگی میں صدق و اخلاص ہونا چاہئے۔

رکے رہنے کے شرائط بہت ہیں۔ مثلاً معدے کو کھانے پینے سے روکے رکھا اور آنکھ کو شہوانی نظر، کان کو غیبت سننے، زبان کو بیہودہ اور فتنہ انگیز باتیں کرنے اور جسم کو دنیاوی اور مخالفت حکم الٰہی سے روکے رکھنا روزہ ہے جب بندہ ان تمام شرائط کی پیروی کرے گا تب وہ حقیقۃً روزے دار ہوگا۔

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ جب روزہ رکھے تو اپنے کان، آنکھ، زبان، ہاتھ اور جسم کے ہر عضو کا روزہ رکھے بہت سے روزے دار ایسے ہیں جن کا روزہ کچھ فائدہ مند نہیں ہوتا۔ بجز اس کے کہ وہ بھوکے اور پیاسے رہتے ہیں۔

حضور سیدنا داتا گنج بخش رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ میں نے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو خواب میں دیکھا تو عرض کیا یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مجھے کوئی نصیحت فرمائیے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''احبس حواسك'' اپنے حواس کو قابو میں رکھو۔ یہ مکمل مجاہدہ ہے۔ اس لئے کہ تمام علوم کا حصول انہی پانچ دروازوں سے ہوتا ہے دیکھنے سے، سونگھنے سے، چکھنے سے، سننے سے اور چھونے سے۔ یہ پانچوں حواس، علم و عقل کے سپہ سالار ہیں۔ اول چار کے لئے تو ایک مخصوص جگہ ہے۔ لیکن پانچواں تمام بدن کے حصہ میں پھیلا ہوا ہے۔ آنکھ جو دیکھنے کی جگہ ہے وہ رنگ و بشرے کو دیکھتی ہے اور کان جو سننے کی جگہ ہے وہ خبر اور آوازوں کو سنتا ہے اور زبان، ذائقہ اور چکھنے کا مقام ہے وہ مزہ اور بے مزہ کو پہچانتی ہے۔ ناک سونگھنے کا مقام ہے جو خوشبو و بدبو کا ادراک کرتی ہے اور لمس یعنی چھونے کے لئے کوئی مقام خاص نہیں ہے بلکہ تمام جسم میں اس کا ادراک پھیلا ہوا ہے۔ انسان کے تمام اعضا میں نرمی و گرمی، سختی و سردی کا احساس ہوتا ہے۔ کوئی علم ایسا نہیں ہے جسے انسان معلوم کرنا چاہے مگر وہ انہیں پانچ دروازوں سے ہی حاصل کرتا ہے۔ بجز بدیہی باتوں اور حق تعالیٰ کے الہام کے۔ کیونکہ نہ ان میں آفت جائز ہے اور نہ ان کے لئے پانچوں حواسوں کی ضرورت ہے۔ ان پانچوں حواس کے لئے صفائی اور کدروت دونوں صفتیں ہیں۔ جس طرح علم و عقل اور روح کے لئے قدرت اور دخل ہے اسی طرح نفس و ہوا کے لئے بھی ہے۔ کیونکہ یہ طاعت و معصیت اور سعادت و شقاوت کے درمیان سبب آلہ مشترک ہے۔ چنانچہ حق تعالیٰ کی ولایت و اختیار سمع و بصر میں یہ ہے کہ وہ سچی بات سنے اور دیکھے۔ اسی طرح نفس و ہوا کی ولایت و اختیار یہ ہے کہ وہ جھوٹی بات سننے اور شہوانی نظر سے دیکھنے کے خواستگار رہے اور ذائقہ و شامہ میں ولایت حق یہ ہے کہ وہ حکم الٰہی کی موافقت اور سنت مصطفوی صلی اللہ علیہ وسلم کی متابعت میں کارفرما ہو۔ اسی طرح نفس، فرمانِ حق کی مخالفت اور

شریعت سے منافرت کا طلب گار رہے۔ اس لئے روزے دار کو لازم ہے کہ اپنے حواسوں کو قابو میں رکھے تا کہ مخالفت کے مقابلہ میں موافقت کا ظہور ہو اور وہ صحیح معنی میں روزے دار ہو۔ ورنہ کھانے پینے کا روزہ تو بچے بھی رکھ لیتے ہیں اور بوڑھی عورتیں بھی رکھتی ہیں حالانکہ روزہ کا حقیقی مقصد نفسانی خواہش اور دنیاوی کھیل کود سے بچنا ہے۔ کیونکہ حق تعالیٰ فرماتا ہے "وَمَا جَعَلْنَا هُمْ جَسَدًا لَّا يَاْكُلُوْنَ الطَّعَامَ" (الانبیآء:۸) کیا ہم نے پیغمبروں کے جسموں کو ایسا نہیں بنایا کہ وہ کھانا نہ کھائیں اور فرمایا "اَفَحَسِبْتُمْ اَنَّمَا خَلَقْنٰكُمْ عَبَثًا" (النور:۱۱۵) کیا تم یہ گمان کرتے ہو کہ ہم نے تمہیں بیکار پیدا کیا۔ مطلب یہ ہے کہ ہم نے ہر طبیعت کو کھانے کا حاجت مند بنایا اور ہر مخلوق کے لئے اس کی خاطر حیلہ بہانا پیدا فرمایا۔ لہٰذا رکنا تو کھیل کود اور حرام چیزوں سے چاہئے نہ کہ حلال چیزوں کے کھانے سے۔ مجھے حیرت تو اس شخص پر ہوتی ہے جو کہتا ہے کہ میں نفلی روزہ رکھتا ہوں حالانکہ وہ فرائض کی ادائیگی سے غافل ہے۔ چونکہ معصیت نہ کرنا فرض ہے۔ اور نفلی روزہ، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت کے ساتھ متصل اور ملحق ہے "فَنَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنْ قَسْوَةِ الْقَلْبِ" لہٰذا جو شخص معصیت سے بچتا ہے وہ ہر حال میں روزے دار ہے۔

ارباب علم بیان کرتے ہیں کہ حضرت سہل بن عبد اللہ تستری رحمتہ اللہ علیہ جس روز پیدا ہوئے تو وہ روزے سے تھے۔ اور جس دن دنیا سے رحلت فرمائی اس دن بھی روزے دار تھے۔ کسی نے پوچھا یہ کس طرح؟ بیان کیا کہ ان کی پیدائش کا وقت صبح صادق تھا اور شام تک انہوں نے دودھ نہ پیا اور جب وہ دنیا سے رخصت ہوئے تو وہ روزے کی حالت میں تھے۔ یہ بات حضرت ابو طلحہ مالکی رحمتہ اللہ علیہ نے بیان فرمائی۔

صوم وصال کا مسئلہ:

صومِ وصال یعنی مسلسل اور پے در پے روزے رکھنے کے بارے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ممانعت مروی ہے۔ کیونکہ آپ نے جب صوم وصال رکھا تو صحابہ کرام نے بھی آپ کی موافقت میں روزے رکھنے شروع کر دیئے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے فرمایا تم

صوم وصال نہ رکھو کیونکہ ''اِنِّی لَسْتُ کَاَحَدِکُمْ اِنِّی اَبِیْتُ عِنْدَ رَبِّکُمْ یُطْعِمُنِیْ وَیَسْقِیْنِیْ'' (ابوداؤد) میں تم میں سے کسی کی مانند نہیں ہوں کیونکہ میں تمہارے رب کے حضور رات گزارتا ہوں وہ مجھے کھلاتا اور پلاتا ہے۔

ارباب مجاہدہ فرماتے ہیں کہ آپ کی یہ ممانعت، شفقت و مہربانی کے لئے ہے نہ کہ نہی و ممانعت یا حرام بنانے کے لئے۔ ایک جماعت یہ کہتی ہے کہ صوم وصال سنت قولی کے خلاف ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ وصال بذات خود ناممکن و محال ہے اس لئے کہ دن گزر جائے تو رات میں روزہ نہیں ہوتا اور رات کو روزے سے ملائے تو بھی وصال نہیں ہوتا۔

حضرت سہل بن عبداللہ تستری رحمتہ اللہ علیہ کی بابت منقول ہے کہ وہ ہر پندرہ دن کے بعد ایک مرتبہ کھانا کھاتے اور جب ماہِ رمضان آتا تو عید الفطر تک کچھ نہ کھاتے اس کے باوجود روزانہ رات میں چار سو رکعات نمازیں پڑھا کرتے تھے یہ حال، انسان کی امکانی طاقت سے باہر ہے۔ بجز مشرب الٰہی کے ایسا ہو نہیں سکتا ہے اسی کی تائید سے ممکن ہے اور وہی تائید الٰہی اس کی غذا بن جاتی ہے۔ کسی کے لئے دنیاوی نعمت غذا ہوتی ہے اور کسی کے لئے تائید الٰہی غذا۔

حضرت شیخ ابونصر سراج رحمتہ اللہ علیہ جن کو ''طاؤس الفقرا'' اور ''صاحب لمع'' کہا جاتا ہے جب ماہِ رمضان آیا تو بغداد پہنچے اور مسجد شعر نیزیہ میں اقامت فرمائی تو ان کو علیحدہ حجرہ دے دیا گیا اور درویشوں کی امامت ان کے سپرد کر دی گئی۔ چنانچہ عید تک انہوں نے ان کی امامت فرمائی اور تراویح میں پانچ ختم قرآن کئے۔ ہر رات خادم ایک روٹی ان کے حجرے میں آ کر انہیں دے جاتا جب عید کا دن آیا اور وہ نماز پڑھ کر چلے گئے تو خادم نے حجرے میں نظر ڈالی تو تیسوں روٹیاں یونہی اپنی جگہ پر موجود تھیں۔

حضرت علی بن بکار رحمتہ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ وہ حضرت حفص مصیصی کو میں نے دیکھا کہ وہ ماہِ رمضان میں پندرہ دن کے علاوہ کچھ نہ کھاتے تھے۔

حضرت ابراہیم ادہم رحمتہ اللہ علیہ کی بابت مروی ہے کہ وہ ماہ رمضان میں اول سے آخر تک کچھ نہ کھاتے تھے۔ حالانکہ شدید گرمی کا زمانہ تھا اور روزانہ گندم کی مزدوری کو جایا کرتے

تھے۔ جتنی مزدوری ملتی تھی وہ سب درویشوں میں تقسیم کر دیا کرتے تھے اور رات بھر عبادت کرتے تھے نمازیں پڑھتے یہاں تک کہ دن نکل آتا تھا وہ لوگوں کے ساتھ ان کی نظروں کے سامنے رہتے تھے لوگ دیکھا کرتے تھے کہ وہ نہ کچھ کھاتے ہیں اور نہ پیتے ہیں رات کو سوتے بھی نہیں۔

حضرت شیخ ابو عبداللہ خفیف رحمتہ اللہ علیہ کی بابت منقول ہے کہ جب وہ دنیا سے رخصت ہوئے تو انہوں نے مسلسل چالیس چلے کاٹے تھے۔

میں نے جنگل میں ایک بوڑھے کو دیکھا جو ہمیشہ ہر سال دو چلے کاٹتا تھا اور جب حضرت ابو محمد غزنوی رحمتہ اللہ علیہ دنیا سے رخصت ہوئے تو میں ان کے پاس موجود تھا انہوں نے اسی (۸۰) دن تک کچھ نہیں کھایا تھا اور کوئی نماز بغیر جماعت کے نہیں پڑھتی تھی۔ متاخرین کے ایک درویش نے اسی (۸۰) دن رات کچھ نہ کھایا اور نہ کوئی نماز بغیر جماعت کے پڑھی۔

مرو کی بستی میں دو بزرگ تھے ایک کا نام مسعود اور دوسرے کا نام شیخ بوعلی سیاہ تھا۔ لوگ بیان کرتے ہیں کہ شیخ مسعود نے دوسرے بزرگ کے پاس کہلا بھیجا کہ یہ دعوے کب تک رہیں گے آؤ ہم چالیس دن ایک جگہ بیٹھیں اور کچھ نہ کھائیں۔ انہوں نے جواب میں کہلوایا آؤ ہم روزانہ تین مرتبہ کھائیں اور چالیس دن تک ایک وضو سے رہیں۔

یہ مسئلہ اپنی جگہ دشوار ہے۔ جاہل لوگ اس سے تعلق رکھ کر کہتے ہیں کہ صوم وصال جائز ہے اور اطبا اس کا سرے سے انکار کرتے ہیں۔ اب میں اس کی مکمل وضاحت کرتا ہوں تاکہ یہ شبہات رفع ہو جائیں اور اس کی حقیقت واضح ہو جائے۔

صوم وصال کی وضاحت:

صوم وصال رکھنا بغیر اس کے کہ کسی فرمانِ الٰہی میں خلل واقع ہو کرامت ہے اور کرامت کا محل خاص ہوتا ہے نہ کہ عام۔ پھر جس کا حکم عام نہ ہو وہ معاملہ ہر جگہ درست نہیں ہوتا کیونکہ اگر کرامت کا اظہار عام ہوتا تو ایمان جبری ہوتا اور عارفوں کے لئے معرفت میں ثواب نہ ہوتا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم چونکہ صاحب معجزہ تھے تو آپ سے صوم وصال (بطور معجزہ)

ظاہر ہوا اور اہل کرامت کے لئے، کرامت کے اظہار کی ممانعت ہے اور یہ کہ کرامت میں اخفا شرط ہے جس طرح معجزے کے لئے اظہار شرط ہے۔ یہ فرق معجزہ اور کرامت کے درمیان واضح ہے۔ لہٰذا ہدایت یافتہ کے لئے اتنی ہی وضاحت کافی ہے۔

چلہ کشی کی اصل:

مشائخ طریقت کی چلہ کشی کی اصل، حضرت موسیٰ علیہ السلام کے حال سے متعلق ہے کیونکہ انہوں نے بوقت مکالمہ پہلے چلہ کشی کی اور یہ صحیح ہے کہ مشائخ جب چاہتے ہیں کہ باطن میں رب العزت سے ہم کلام ہوں تو وہ چالیس روز بھوکے رہتے ہیں اور جب تیس دن گزر جاتے ہیں تو مسواک کرتے ہیں اس کے بعد دس روز مزید گزارتے ہیں۔ بلاشک وشبہ اللہ تعالیٰ ان کے باطن کے ساتھ ہم کلام ہوتا ہے اس لئے انبیاء علیہم السلام کے لئے جو کچھ ظاہر طور پر جائز ہوتا ہے کوہ سب اولیاء پر باطنی طور پر جائز ہوتا ہے۔ لہٰذا حق تعالیٰ کے کلام کی سماعت، جب تک طبیعت اپنے حال پر ہے جائز نہیں ہوتی اس لئے چاروں طبائع کو چالیس دن تک کھانا پینا ترک کرکے مغلوب کرتے ہیں تاکہ لطائف روح اور محبت کی صفائی کے لئے کامل ولایت حاصل ہو جائے۔ اسی موافقت میں بھوکے رہنے اور اس کی حقیقت کے بیان میں کچھ وضاحت پیش کرتا ہوں۔ وباللہ التوفیق

فاقہ کشی اور اس کے متعلقات کا بیان

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ:

وَلَنَبْلُوَنَّكُمْ بِشَيْءٍ مِّنَ الْخَوْفِ وَالْجُوْعِ وَنَقْصٍ مِّنَ الْاَمْوَالِ وَالْاَنْفُسِ وَالثَّمَرَاتِ (البقرہ:۱۵۵)

ضرور بالضرور ہم تمہیں کچھ خوف اور بھوک اور مال و جان اور پھولوں کی کمی سے آزمائیں گے۔

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ:

بَطْنٌ جَائِعٌ اَحَبُّ اِلَی اللّٰہِ تَعَالٰی مِنْ سَبْعِیْنَ عَابِدٌ عَاقِلٍ

اللہ تعالیٰ کے نزدیک بھوکے کا شکم، ستر عاقل عابدوں سے زیادہ محبوب ہے۔

واضح رہنا چاہیئے کہ بھوکا رہنا، تمام امتوں اور ملتوں کے نزدیک قابل تعریف ہے اور بزرگی کی علامت۔ کیونکہ ظاہری لحاظ سے بھوکے کا دل زیادہ تیز اور اس کی طبیعت زیادہ پاکیزہ اور تندرست ہوتی ہے خاص کر وہ شخص جو زیادہ پانی تک نہ پئے اور مجاہدے کے ذریعہ تزکیۂ نفس کرے۔ ''لان الجوع للنفس خضوع وللقلب خشوع '' اس لئے کہ بھوکے کا جسم متواضع اور دل خشوع والا ہوتا ہے۔ کیونکہ بھوک نفسانی قوت کو فنا کر دیتی ہے۔ حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ:

اَجِیْعُوْا بُطُوْنَکُمْ وَاظْمَئُوْا اَکْبَادَکُمْ وَاَعَرُّوْا اَجْسَادَکُمْ لَعَلَّ قُلُوْبَکُمْ تَرَی اللّٰہَ عَیَانًا فِی الدُّنْیَا

تم اپنے شکموں کو بھوکا، اپنے جگروں کو پیاسا اور اپنے جسموں کو غیر آراستہ رکھو تا کہ تمہارے دل، اللہ تعالیٰ کو دنیا میں ظاہر طور پر دیکھ سکیں۔

اگرچہ بھوک جسم کے لئے بلا ہے مگر دل کے لئے جلا ہے۔ اور اپنے جسموں کو غیر آراستہ رکھنا باطن کے لئے بقا ہے۔ جب باطن، لِقا سے ہمکنار ہو کر جسم مصفا ہو جائے اور دل پر نور ہو تو کیا نقصان؟ شکم سیر ہو کر کھانے میں کوئی بلا نہیں ہے۔ اگر اس میں بلا ہوتی تو جانور شکم سیر ہو کر نہ کھاتے۔ معلوم ہوا کہ شکم سیر ہو کر کھانا جانوروں کا کھانا ہے اور بھوکا رہنا جانوں کا علاج اور یہ کہ بھوک میں باطن کی تعمیر اور شکم سیری میں پیٹ کی تعمیر ہے۔ جو شخص باطن کی تعمیر میں کوشاں رہتا ہے وہ حق تعالیٰ کے لئے خاص ہوتا ہے اور علائق دنیا سے یکسو ہو جاتا ہے۔ بھلا وہ شخص، اس شخص کے کیسے برابر ہو سکتا ہے جس کی زندگی بدن کی تعمیر اور جسم وخواہش کی خدمت میں گزرتی ہو، ایک کے لئے ساری دنیا کھانے کے لئے چاہیئے اور دوسرے کے لئے کھانا عبادت کے لئے۔ دونوں میں بہت بڑا فرق ہے۔

كـان الـمتـقـدمـون يـاكـلون ليعيشوا وانتم تعيشون لتاكلوا	متقدمین کھاتے تھے تاکہ زندہ رہیں اور تم زندہ رہتے تھے تاکہ خوب کھاؤ۔
الـجوع طـعـام الـصـديـقيـن و مسـلك الـمـريـديـن وقيـد الشياطين	بھوکا رہنا صدیقوں کی غذا، مریدوں کا مسلک اور شیاطین کی قید ہے۔

اللہ تعالیٰ کی قضاؤ قدر کے تحت حضرت آدم علیہ السلام کا جنت سے دنیا میں تشریف لانا اور قرب الٰہی سے ان کا دور ہونا ایک لقمہ سے تھا۔

فاقہ کشی کی حقیقت:

جو شخص بھوک سے بے قرار ہو درحقیقت وہ بھوکا نہیں ہے اس لئے کہ کھانے والے کی طلب غذا کے ساتھ ہے۔ لہٰذا جس کا درجہ بھوک ہے وہ غذا کے نہ پانے کی وجہ سے ہے نہ کہ غذا کو چھوڑنے کی وجہ سے اور جو شخص کھانا موجود ہوتے ہوئے نہ کھائے اور بھوک کی تکلیف اٹھائے درحقیقت وہی بھوکا ہے اور شیطان کی قید اور نفسانی خواہش کی بندش بھوکے رہنے ہی میں ہے۔ حضرت کتانی رحمتہ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ:

مـن حـكـم المريد ان يكون فيه ثـلـثة اشيـاء، نومه غلبة و كلامته ضرورة واكله فاقة	مرید کی شرط یہ ہے کہ اس میں تین چیزیں موجود ہوں۔ ایک یہ کہ اس کا سونا، غلبہ کے بغیر نہ ہو دوسرے یہ کہ اس کا کلام، ضرورت کے بغیر نہ ہو۔ تیسرے یہ کہ اس کا کھانا فاقہ کے بغیر نہ ہو۔

بعض مشائخ کے نزدیک کم از کم فاقہ دو دن اور دو راتوں کا ہونا چاہئے اور بعض کے نزدیک تین شبانہ روز اور بعض کے نزدیک ایک ہفتہ اور اور بعض کے نزدیک ایک چلہ کا ہوتا ہے۔ اس لئے کہ محققین کے نزدیک سچی بھوک ہر چالیس شبانہ روز کے بعد ایک مرتبہ ہوتی ہے اور یہ زندگی کے لئے ضروری ہے۔ اس دوران جو بے چینی و بے قراری ظاہر ہوتی ہے وہ طبیعت کی شرارت اور اس کا گھمنڈ ہے اللہ تعالیٰ اس سے محفوظ رکھے کیونکہ اہل معرفت

کی رگیں، سراسر اسرارِ الٰہی ہوتی ہیں اور ان کے قلوب حق تعالیٰ کی نظر کرم کی طرف ہوتے ہیں۔ان کے سینوں میں دلوں کے دروازے کھول دیئے جاتے ہیں اور عقل و ہوا، بارگاہِ الٰہی میں پژمردہ ہو چکی ہوتی ہیں۔ روح، عقل کی مدد کرتی ہے اور نفس ہوا کی۔ جن کی طبیعتیں کثرت غذا سے پرورش پاتی ہیں ان کا نفس قوی ہوتا ہے اور خواہش بڑھتی ہے اور اعضا میں اس کا غلبہ زیادہ پھیلتا ہے اور اس پھیلاؤ سے ہر رگ میں قسم قسم کے حجابات نمودار ہوتے ہیں۔

جب غذا کا طلبگار، نفس سے ہاتھ کھینچتا ہے تو نفس بہت کمزور ہو جاتا ہے اور عقل زیادہ قوی ہو جاتی ہے اور رگوں سے نفسانی قوتیں مضمحل ہو جاتی ہیں اور اس کے اسرار و براہین زیادہ ظاہر ہونے لگتے ہیں اور جب نفس اپنی حرکتوں سے بے بس ہوتا ہے تو اس کے وجود سے نفسانی خواہش فنا ہو جاتی ہے۔ باطل ارادے، اظہارِ حق میں گم ہو جاتے ہیں تو اس وقت مرید کی ہر مراد پوری ہو جاتی ہے۔

حضرت ابو العباس قصاب رحمتہ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ میری طاعت و معصیت دو شکلوں میں منقسم ہے جب میں کھاتا ہوں تو معاصی کا خمیر اپنے میں پاتا ہوں اور جب اس سے ہاتھ کھینچ لیتا ہوں تو تمام طاعتوں کی بنیاد اپنے اندر دیکھتا ہوں۔ بھوکے رہنے کا ثمرہ مشاہدہ ہے جس کا قائد و رہنما مجاہدہ ہے۔ لہٰذا مشاہدے کے ساتھ سیری، مجاہدے کے ساتھ بھوکے رہنے سے کہیں بہتر ہے۔ کیونکہ مشاہدہ جوانمردوں کی رزم گاہ ہے اور مجاہدہ بچوں کا کھیل۔ ''فالشبع بشاھدہ الحق خیر من الجوع بشاھد الخلق '' مشاہدۂ حق کے ساتھ سیری، لوگوں کے مشاہدہ کے ساتھ بھوکے رہنے سے بہتر ہے۔ اس بحث میں طویل گفتگو ہے طوالت کے خوف سے اسی پر اکتفا کرتا ہوں۔ واللہ اعلم بالصواب

آٹھواں کشف حجاب

حج کے بیان میں

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

وَلِلّٰہِ عَلَی النَّاسِ حِجُّ الْبَیْتِ مَنِ اسْتَطَاعَ اِلَیْہِ سَبِیْلًا

اور اللہ کے لئے لوگوں پر بیت اللہ کا حج فرض ہے جو وہاں تک پہنچنے کی استطاعت رکھیں۔

(آل عمران: ۹۷)

فرائض اسلام میں سے ایک مستقل فرض، بیت اللہ کا حج ہے جو بندے پر عقل و بلوغ اور اسلام کے بعد صحت قدرت کی حالت میں فرض ہوتا ہے۔ حج کے ارکان، میقات سے احرام باندھنا، عرفات میں ٹھہرنا، اور خانہ کعبہ کی زیارت وطواف وغیرہ اس پر سب کا اجماع ہے۔ صفاء و مروہ کی سعی کے رکن ہونے میں اختلاف ہے اور بغیر احرام کے حرم کے حدود میں داخل نہ ہونا چاہئے۔ حرم کو اس لئے حرم کہا جاتا ہے کہ یہ مقام ابراہیم علیہ السلام ہے اور امن وحرمت کی جگہ ہے۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام کے دو مقام ہیں۔ ایک مقام آپ کے جسم اقدس کا اور دوسرا مقام آپ کے قلب انور کا۔ جسم کا مقام مکہ مکرمہ ہے اور دل کا مقام، خلت ہے۔ لہٰذا جو شخص آپ کے جسم کے مقام کی زیارت کا ارادہ کرے اس پر لازم ہے کہ وہ تمام لذتوں اور شہوتوں سے منہ موڑ لے اور وہ محرم ہو یعنی ان چیزوں کو اپنے اوپر حرام کئے ہوئے ہو جن کو شریعت نے بیان کیا ہے۔ جسم پر کفن پہنے، حلال شکار سے ہاتھ کھینچے۔ حواس کے تمام دروازوں کو بند کرے۔ اس کے بعد عرفات میں حاضر ہو۔ وہاں سے مزدلفہ، مشعر الحرام جائے پھر وہاں سے سنگریزے چنے پھر مکہ مکرمہ پہنچ کر طواف کرے اس کے بعد منیٰ آکر تین روز قیام کرکے جمرات پر سنگریزے پھینکے۔ وہاں سر منڈانے اور قربانی دے کر جیسے چاہے کپڑے پہنے۔

جب بندہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے دل کے مقام، خلت و دوستی کا ارادہ کرے

اس پر لازم ہے کہ وہ تمام لذتوں اور رغبتوں سے منہ موڑ کر تمام راحتوں کو چھوڑ دے۔ اغیار کے کر سے کنارہ کش ہو جائے۔ کیونکہ دنیا کی طرف التفات کرنا خطرناک ہے پھر معرفت کے عرفات میں ٹھہرے اور وہاں سے محبت کے مزدلفہ میں آئے وہاں سے حق سبحانہ کے حرم کے طواف کے لئے سر کو بھیجے اور حرص و خواہش اور دل کے فاسد ارادوں سنگریزوں کو اس امن و سلامتی کی منیٰ میں پھینکے اور نفس کو مجاہدے کے مقام اور اس کی تسخیر گاہ میں قربان کرے تاکہ نام خلت حاصل ہو۔ لہٰذا مکہ مکرمہ میں داخل ہونا گویا دشمن اور اس کی تلوار کی زد سے جائے امن امان میں آ جانا ہے اور اس مقام خلت میں داخل ہونا گویا قطعیت اور اس کے متعلقات سے مون و محفوظ رہنا ہے۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ:

اَلْحَاجُّ وَفْدُ اللّٰہِ یُعْطِیھِمْ مَاسَأَلُوْا وَیَسْتَجِیْبُ لَھُمْ مَادَعُوْا

حج کرنے والے خدا کے قاصد ہیں۔ وہ جو مانگتے ہیں اللہ تعالیٰ انہیں عطا فرماتا ہے اور جو دعا کرتے ہیں اللہ تعالیٰ اسے قبول فرماتا ہے۔

لیکن جو مقام خلت کا طالب ہوتا ہے۔ وہ صرف پناہ چاہتا ہے نہ کچھ مانگتا ہے نہ کوئی اکرنا ہے بلکہ حالت تسلیم و رضا پر قائم رہتا ہے جیسا کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے کیا کہ:

اِذْ قَالَ لَہٗ رَبُّہٗٓ اَسْلِمْ قَالَ اَسْلَمْتُ لِرَبِّ الْعَالَمِیْنَ

جب خدا نے ان سے فرمایا کہ سر جھکاؤ تو عرض کیا میں نے رب العالمین کے حضور سر تسلیم خم کر دیا۔ (البقرہ:۱۳۱)

جب حضرت ابراہیم علیہ السلام مقام خلت پر فائز ہوئے تو انہوں نے تمام تعلقات سے منہ موڑ کر دل کو غیر سے خالی کر دیا۔ اس وقت اللہ تعالیٰ نے چاہا کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے جلوے کی برسرِ عام نمائش کر دے اس کے لئے حق تعالیٰ نے نمرود کو مقرر کیا اس نے چاہا کہ ان کے اور ان کے گھر والوں کے درمیان تفریق کرا دے۔ چنانچہ نمرود نے آگ جلوائی، ابلیس نے آ کر منجنیق بنا کر دی اور اس میں گائے کی کھال کو چلہ میں سیا گیا اور اس چلہ میں حضرت ابراہیم

علیہ السلام کو بٹھایا گیا اس وقت جبریل علیہ السلام آئے اور منجنیق کا چلہ پکڑ کر عرض کرنے لگے "هَلْ لَكَ الى من حاجة" کیا آپ کو مجھ سے کوئی حاجت ہے؟ حضرت خلیل اللہ نے فرمایا "اَمَّـا اِلَيْكَ فَلَا" حاجت تو ہے مگر تم سے نہیں۔ جبریل علیہ السلام نے عرض کیا پھر اللہ تعالیٰ ہی سے عرض کیجئے؟ فرمایا "حَسْبِی مِنْ سُوَّالِی عِلْمُهٗ بِحَالِی" اللہ تعالیٰ میری عرض سے بے نیاز ہے وہ میرے حال کو جانتا ہے۔ حضرت خلیل اللہ کے فرمانے کا مطلب یہ ہے کہ میرے لئے اتنا ہی کافی ہے کہ اللہ تعالیٰ جان لے کہ مجھے اسی کی راہ میں آگ میں ڈالا جا رہا ہے۔ میرے حال پر اس کا علم، میرے عرض وسوال کا محتاج نہیں ہے۔

حضرت محمد بن الفضل رحمتہ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ میں اس شخص پر تعجب کرتا ہوں جو دنیا میں اس کے گھر کو تلاش کرتا ہے وہ اپنے دل کے اندر اس کے مشاہدے کی خواہش کیوں نہیں کرتا۔ گھر کی طلب میں ممکن ہے کہ وہ گھر کو پا جائے اور ممکن ہے کہ وہ گھر کو نہ پا سکے۔ حالانکہ مشاہدے کی طلب تو ہر حال میں رہنی چاہئے۔ اگر اس پتھر کی عمارت کی زیارت، جس پر سال میں ایک مرتبہ نظر پڑتی ہے فرض کر دی گئی ہے تو وہ دل جس پر شبانہ روز تین سو ساٹھ مرتبہ نظر پڑتی ہے اس کی زیارت تو بدرجہ اولیٰ کرنی چاہئے۔ بایں ہمہ محققین کے نزدیک مکہ کے راستے میں ہر قدم پر نیکی ہے اور جب وہ حرم میں داخل ہو جاتا ہے تو وہ ہر قدم کے عوض ایک خلعت پاتا ہے۔

حضرت بایزید بسطامی رحمتہ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ جسے عبادت کا اجر وثواب دوسرے دن ملے تو اس سے کہہ دو کہ آج عبادت نہ کرے۔ حالانکہ عبادت ومجاہدے کے ہر سانس پر تو فی الحال ثواب ملتا ہے۔ وہ یہ بھی فرماتے ہیں کہ پہلے حج میں میں نے خانہ کعبہ کے سوا کچھ نہیں دیکھا اور دوسری مرتبہ میں نے خانہ کعبہ کے ساتھ اس کے مالک کو بھی دیکھا لیکن تیسری مرتبہ میں صرف خانہ کعبہ کے مالک ہی کو دیکھ سکا اور خانہ کعبہ نظر نہیں آیا۔

غرض یہ کہ جو حرم میں داخل ہو جاتا ہے وہ تعظیم کا مشاہدہ کرتا ہے اور جسے سارا جہان قربت کی میعاد، اور محبت کی خلوت گاہ نظر نہ آئے وہ ابھی محبت و دوستی کی منزل سے بہت دور ہے۔ چونکہ جب بندہ مشاہدہ میں ہوتا ہے تو اس کے لئے سارا جہان حرم ہو جاتا ہے اور جب

بندہ محجوب ہو تو اس کے لئے حرم بھی جہان میں تاریک تر جگہ معلوم ہوتی ہے:

اظلم الاشیاء دار الحبیب بلا حبیب — سب سے تاریک گھر وہ ہے جو گھر محبوب سے خالی ہو۔

لہٰذا مقام خلت میں مشاہدے کی قیمت، اپنے وجود کی فنا سے متعلق ہے۔ اس لئے کہ اللہ تعالیٰ نے کعبہ کی دید کو اس کا سبب بنایا ہے نہ کہ اس کی قیمت۔ بایں ہمہ مسبب کو ہر سبب کے ساتھ تعلق رکھنا چاہئے کیونکہ کسی کو پتہ نہیں کہ عنایت الٰہی کس مقام سے اس کی طرف توجہ فرمائے۔ کہاں سے اس کا ظہور ہو اور طالب کی مراد، کس جگہ سے نمودار ہو۔ لہٰذا جوانمردوں کی مراد، قطع بیابان اور صحرا نوردی سے ہی ہے۔ نہ کہ عین حرم۔ کیونکہ دوست کے لئے تو محبوب کے گھر یعنی حرم کا دیکھنا حرام ہے۔ بلکہ مجاہدے کا مطلب یہی ہے کہ اس کے ہر شوق میں بے قراری اور بے چینی ہمیشہ قائم رہے۔

ایک شخص حضرت جنید بغدادی رحمتہ اللہ علیہ کے پاس آیا۔ آپ نے اس سے پوچھا کہاں سے آئے ہو؟ اس نے کہا یہ حج کر کے آیا ہوں۔ آپ نے فرمایا حج کر لیا؟ اس نے کہا ہاں! آپ نے فرمایا جب تم اپنے مکان سے چلے، وطن سے کوچ کیا اس وقت کیا تم نے گناہوں سے بھی کوچ کر لیا تھا؟ اس نے کہا نہیں، فرمایا پھر تم نے کوچ ہی نہ کیا۔ اس کے بعد فرمایا جب تم گھر سے چلے اور ہر منزل میں رات کو قیام کیا تو کیا تم نے راہِ حق کا قیام بھی طے کیا؟ اس نے کہا نہیں، آپ نے فرمایا تم نے کوئی منزل طے نہیں کی۔

پھر فرمایا جب تم نے میقات سے احرام باندھا تو کیا تم بشری صفات سے جدا ہو گئے تھے؟ جیسے کہ تم کپڑوں سے جدا ہوئے تھے؟ اس نے کہا نہیں، فرمایا تو تم محرم بھی نہ ہوئے۔ پھر فرمایا جب تم نے عرفات میں وقوف کیا تھا تو کیا مجاہدے کے کشف میں بھی وقوف کیا تھا؟ اس نے کہا نہیں، فرمایا تمہیں عرفات کا وقوف بھی میسر نہ آیا پھر فرمایا جب تم مزدلفہ میں اترے تھے اور تمہاری مراد بر آئی تھی تو کیا تم نے تمام نفسانی خواہشوں کو چھوڑ دیا تھا؟ اس نے کہا نہیں، فرمایا بس تو مزدلفہ کا نزول بھی حاصل نہ ہوا۔ پھر فرمایا جب تم نے خانہ کعبہ کا طواف کیا تھا تو کیا تم نے

اپنے سر کی آنکھوں سے مقام تنزیہہ میں حق تعالیٰ کے جمال کے لطائف کو بھی دیکھا تھا؟ اس نے کہا نہیں، فرمایا بس تو طواف بھی حاصل نہیں ہوا۔ پھر فرمایا جب تم نے صفا و مروہ کے درمیان سعی کی تھی تو صفا کے مقام اور مروہ کے درجہ کا ادراک کیا تھا؟ اس نے کہا نہیں، فرمایا ابھی سعی بھی نصیب نہ ہوئی پھر فرمایا جب منیٰ میں آئے تھے تو کیا تمہاری ہستیاں تم سے جدا ہوگئی تھیں؟ اس نے کہا نہیں، فرمایا ابھی تم منیٰ بھی نہیں پہنچے۔ پھر فرمایا جب قربان گاہ میں تم نے قربانی کی تھی اس وقت نفسانی خواہشوں کی بھی تم نے قربانی کی تھی؟ اس نے کہا نہیں، فرمایا بس تو قربانی بھی نہیں ہوئی۔ پھر فرمایا جب تم نے جمرات پر سنگریزے پھینکے تھے اس وقت تمہارے ساتھ جو نفسانی تمنائیں تھیں کیا ان سب کو بھی پھینک دیا تھا۔ اس نے کہا نہیں، فرمایا تم نے سنگریزے بھی نہیں پھینکے اور حج بھی نہیں کیا۔ جاؤ ان صفات کے ساتھ پھر حج کرو۔ تاکہ مقام ابراہیم علیہ السلام تک رسائی ہو۔

میں نے سنا ہے کہ ایک بزرگ خانہ کعبہ کے سامنے بیٹھے ہوئے رو رہے تھے اور یہ اشعار وردِ زبان تھے:

واصبحت یوم النحر والعیر ترحل
وکان حدی الحادی ینادی و معجل

قربانی کے دن میں نے صبح کی جب کہ سفید اونٹ کوچ کر رہے تھے
اور حدی خوانوں کے ساتھ حدی تھی جو بلا رہے تھے اور جلدی کر رہے تھے

وانا سائل عن سلمٰی فھل من مخبر
بان لہ علماً بھا این تنزل

اور میں سلمٰی کے متعلق دریافت کر رہا تھا کہ کیا کوئی خبر دینے والا ہے
جسے معلوم کہ کہاں پر اترنا ہے

لقد افسدت حجی ونسکی وعمرتی
وفی البین لی شغل عن الحج مشغل

یقیناً میرا حج اور میری قربانی اور عمرہ برباد ہوگئے
چونکہ میرے لئے جدائی میں رکاوٹ ہے جو حج سے مجھے روکے ہوئے ہے

سارجع من عام لحجة قابل
فان الذی قد کان لا یتقبل

آئندہ سال دوبارہ حج کے لئے آؤں گا کیونکہ اس کی
حقیقت تو یہ ہے کہ یہ نامقبول ہوا

حضرت فضیل بن عیاض رحمتہ اللہ علیہ بیان کرتے ہیں کہ میں نے موقف میں ایک جوان کو سر جھکائے کھڑا دیکھا۔ تمام لوگ تو دعائیں مانگ رہے تھے مگر وہ خاموش کھڑا تھا۔ میں نے اس سے کہا اے نوجوان تم دعا کیوں نہیں مانگتے اور اظہارِ مسرت کیوں نہیں کرتے؟ اس نے کہا وحشت ہو رہی ہے کہ جو وقت میں رکھتا تھا وہ مجھ سے ضائع ہو گیا ہے اب میرا منہ دعا مانگنے کے قابل نہیں رہا۔ میں نے اس سے کہا کہ تمہیں دعا مانگنی چاہئے تھی ممکن ہے کہ حق تعالیٰ ان لوگوں کے مجمع کے طفیل تمہیں تمہاری مراد عطا فرما دے۔ وہ بیان کرتے ہیں کہ اس نوجوان نے ارادہ کیا کہ ہاتھ اٹھا کر دعا مانگے مگر اس کے منہ سے ایک چیخ نکلی اور وہ گر پڑا اور اس کی روح پرواز کر گئی۔

حضرت ذوالنون مصری رحمتہ اللہ علیہ بیان کرتے ہیں کہ میں نے ایک جوان کو منیٰ میں بیٹھے دیکھا۔ سب لوگ تو اپنی اپنی قربانیوں میں مشغول تھے مگر میں اس فکر میں تھا کہ وہ کون ہے اور کیا کرتا ہے؟ یہاں تک کہ اس نے کہا کہ اے خدا، تمام لوگ تو جانوروں کی قربانی دے رہے ہیں لیکن میں چاہتا ہوں کہ اپنے نفس کی قربانی تیرے حضور پیش کروں تو اسے قبول کر، یہ کہہ کر نوجوان نے انگشت شہادت کا اشارہ اپنے حلقوم پر کیا اور وہ گر پڑا۔ جب میں نے قریب جا کر دیکھا تو وہ فوت ہو چکا تھا۔

واضح رہنا چاہئے کہ حج کی دو قسمیں ہیں۔ ایک غیبت میں دوسرے حضور میں! چنانچہ مکہ کا حج غیبت میں ہے اور ایسا ہی ہے جیسا کہ اپنے گھر میں غیبت میں تھا۔ اس لئے کہ ایک

غیبت دوسری غیبت سے بہتر نہیں ہوتی اور جو اپنے گھر میں حضور میں ہو وہ ویسا ہی ہے جیسا کہ مکہ میں حاضر ہے۔ اس لئے کہ کوئی حضور دوسرے حضور سے بہتر نہیں اور حج، کشف مجاہدہ کے لئے ایک مجاہدہ ہے اور مجاہدہ، مشاہدے کی علت نہیں ہوتا بلکہ اس کا سبب ہوتا ہے۔ معانی کی حقیقت میں، سبب کچھ زیادہ موثر نہیں ہوتا۔ لہٰذا حج کا مقصود، خانہ کعبہ کا دیدار نہیں ہے بلکہ کشف کا مقصود، مشاہدہ ہے۔ اب میں مشاہدہ کا عنوان قائم کر کے اس کے معانی کو بیان کرتا ہوں تا کہ حصول مقصد میں آسانی ہو۔ واللہ اعلم بالصواب

مشاہدہ کا بیان

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ:

اَجِیۡعُوۡا بُطُوۡنَکُمۡ، دَعُوۡا الۡحِرۡصَ	اپنے شکموں کو بھوکا رکھو، لالچ کو چھوڑ دو،
وَاَعۡرُوۡا اَجۡسَادَکُمۡ وَاقۡصِرُوۡا	جسموں کی زیبائش نہ کرو، خواہشوں کو کم کرو
الۡاَمَلَ وَاَظۡمَاُوۡا اَکۡبَادَکُمۡ دَعُوۡا	دل و جگر کو پیاسا رکھو، دنیا سے کنارہ کشی کرو
الدُّنۡیَا لَعَلَّکُمۡ تَرَوۡنَ اللّٰہَ بِقُلُوۡبِکُمۡ	تا کہ تمہارے دل اللہ کا مشاہدہ کر سکیں۔

نیز حدیث جبریل میں ان کے سوال کے جواب میں فرمایا:

اَنۡ تَعۡبُدَ اللّٰہَ کَاَنَّکَ تَرَاہُ فَاِنۡ لَّمۡ تَکُنۡ تَرَاہُ فَاِنَّہٗ یَرَاکَ	تم خدا کی اس طرح عبادت کرو گویا تم اس کا مشاہدہ کر رہے ہو اگر ایسا نہ کر سکو تو یوں سمجھو کہ وہ تمہیں دیکھ رہا ہے۔

حضرت داؤد علیہ السلام پر اللہ تعالیٰ نے وحی نازل فرمائی کہ:

"یَادَاوٗدُ اَتَدۡرِیۡ مَامَعۡرِفَتِیۡ قَالَ لَاقَالَ ہِیَ حَیَاتُ الۡقَلۡبِ فِیۡ مُشَاہَدَتِیۡ"

"اے داؤد تم جانتے ہو کہ میری معرفت کیا ہے؟ عرض کیا نہیں۔ فرمایا وہ دل کی زندگی ہے جو میرے مشاہدے سے پیدا ہوتی ہے۔"

مشائخ طریقت کے نزدیک، عبادت سے مراد، چشم قلب سے مشاہدہ کرنا ہے گویا وہ بے کیف وکم، خلوت وجلوت میں چشم دل سے حق تعالیٰ کا مشاہدہ کرتے ہیں۔ حضرت ابو العباس بن عطاء رحمۃ اللہ علیہ آیہ کریمہ کی تفسیر میں کہتے ہیں کہ:

ان الذین قالوا ربنا اللہ بالمجاھدۃ ثم استقاموا علی بساط المشاھدۃ	جنہوں نے مجاہدے میں کہا ہمارا رب اللہ ہے تو وہ مشاہدے کے فرش پر استقامت رکھتے ہیں۔

مشاہدے کی حقیقت کی دو صورتیں ہیں۔ ایک صحت یقین دوسرے ایسا غلبہ محبت جس سے ایسا درجہ حاصل ہو جائے کہ مکمل طور پر دوست کی ہر بات میں وہی نظر آئے اور اس کے سوا کچھ نظر نہ آئے۔ حضرت محمد بن واسع رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ:

مارأیت شیئا قط الاورأیت اللہ فیہ ای بصحۃ الیقین	میں کسی چیز کو نہیں دیکھتا سوائے اس کے کہ اس میں اللہ تعالیٰ کا مشاہدہ صحت یقین کے ساتھ ہوتا ہے۔

ایک بزرگ فرماتے ہیں کہ:

مارأیت اللہ شیئا ورأیت اللہ فیہ	میں نے خدا کے سوا کچھ نہ دیکھا ہر شئی میں پہلے خدا کا جلوہ ہی نظر آتا ہے۔

یہ حالت اس مشاہدے کی ہے جن کو مخلوق میں خدا کا جلوہ نظر آتا ہے۔ حضرت شبلی علیہ الرحمۃ فرماتے ہیں کہ:

مارأیت اللہ شیئا قط الا اللہ یعنی بغلبات المحبتہ و غلیان المشاھدۃ	کوئی چیز اللہ کے سوا مجھے نظر آتی ہی نہیں یعنی یہ حالت غلبہ محبت اور مشاہدے کے جوش کی وجہ سے ہے۔

معلوم ہوا کہ کوئی فعل کو دیکھتا ہے اور اس فعل کی دید میں بچشم سر، فاعل کو دیکھتا ہے اور کوئی بچشم سر فعل کی رویت میں، فاعل کی محبت میں ایسا فنا ہوتا ہے کہ اسے تمام اشیاء حتیٰ کہ اپنے

وجود میں بھی فاعل ہی نظر آتا ہے۔ لہٰذا یہ پہلا طریقہ استدلال ہے اور دوسرا طریقہ جذباتی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ ایک استدلال کرتا ہے تا کہ اثبات دلائل سے حق اس پر عیاں ہو جائے اور دوسرا جذب وشوق میں مغلوب اور وارفتہ ہوتا ہے اور اسے دلائل وحقائق حجاب نظر آتے ہیں۔

لان من عرف شیئا لا یطمئن غیره ومن احب شیئا لا یطالع غیره فیترك المنازعة مع الله والاعتراض علیه فی احکامه وافعاله

اس لئے کہ جو کچھ معرفت رکھتا ہے وہ غیر سے چین نہیں پاتا اور جو محبت رکھتا ہے وہ غیر کو نہیں دیکھتا لہٰذا وہ فعل پر جھگڑتا نہیں کہ وہ جھگڑالو بنے اور نہ اس کے فعل وحکم پر اعتراض کرتا ہے کہ وہ متصرف بنے۔

اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول علیہ السلام کے ذریعہ ان کے معراج کی خبر ہمیں دی اور فرمایا:

مَازَاغَ الْبَصَرُ وَمَا طَغٰی مِنْ شِدَّةِ شَوْقِهٖ اِلَی اللهِ تَعَالٰی
(النجم:۱۷)

یعنی اللہ تعالیٰ کے دیدار کے شوق کی شدت میں آنکھ کو کسی چیز کی طرف نہ پھیرا۔

تا کہ جو لائق ہو دل کے یقین کے ساتھ دیکھیں۔ جب بھی محب اپنی آنکھ کو موجودات کے دیکھنے سے بند کرتا ہے وہ یقیناً اپنے دل میں موجودات کے خالق کا مشاہدہ کرتا ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

لَقَدْ رَاٰی مِنْ اٰیٰتِ رَبِّهِ الْکُبْرٰی
(النجم:۱۸)

بلاشبہ انہوں نے اپنے رب کی بڑی بڑی نشانیاں دیکھیں۔

رب العزت تبارک وتعالیٰ فرماتا ہے:

قُلْ لِّلْمُؤْمِنِیْنَ یَغُضُّوْا مِنْ اَبْصَارِهِمْ اَیْ اَبْصَارَ الْعُیُوْنِ مِنَ الشَّهَوَاتِ، وَاَبْصَارَ الْقُلُوْبِ مِنَ

اے محبوب! تم مسلمانوں سے فرما دو کہ وہ اپنی آنکھیں بند رکھیں۔ یعنی سر کی آنکھوں کو شہوتوں سے اور دل کی آنکھوں کو مخلوقات کی

الْمَخْلُوْقَاتِ (النور:۳۰) | طرف دیکھنے سے جو شخص چشم سر کو مجاہدے کے اندر شہوت سے بند رکھتا ہے یقیناً وہ باطنی آنکھ سے حق تعالیٰ کا مشاہدہ کرتا ہے۔

فمن اکثرا خلص مجاھدۃ کان اصدق مشاھدۃ | جو کثرت اخلاص کے ساتھ مجاہدہ کرتا ہے وہ مشاہدے میں سب سے زیادہ صادق ہوتا ہے۔

اسی بنا پر باطنی مشاہدہ، ظاہری مجاہدہ کے ساتھ وابستہ ہے۔ حضرت سہل بن عبداللہ تستری رحمتہ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ:

من غض بصرہ عن اللہ طرفۃ عین لایھتد طول عمرہ | جو شخص ایک لحہ کے لئے بھی حق تعالیٰ کی طرف سے آنکھیں بند رکھتا ہے تمام عمر وہ ہدایت نہیں پاتا۔

اس لئے کہ غیر کی طرف التفات، غیر حق سے تعلق رکھنا ہے اور جو غیر کے ساتھ ہوتا ہے وہ ہلاکت میں پڑ جاتا ہے۔ بایں وجہ اہل مشاہدہ کی وہی عمر قابل شمار ہوتی ہے جو مشاہدے میں صرف ہو اور جتنی عمر غیبت میں گزری وہ اسے شمار نہیں کرسکتا۔ درحقیقت یہ ان کی موت کا زمانہ ہے۔ چنانچہ حضرت بایزید بسطامی رحمتہ اللہ علیہ سے جب لوگوں نے عمر دریافت کی تو فرمایا چار سال۔ لوگوں نے پوچھا یہ کس طرح۔؟ فرمایا گزشتہ ستر (۷۰) سال کی عمر، حجاب وغیبت میں گزری ہے اور میں نے اس میں مشاہدہ نہیں کیا۔ صرف یہ چار سال ہیں جس میں مشاہدہ کیا ہے۔ زمانہ حجاب کی عمر قابل شمار نہیں ہے۔ حضرت شبلی علیہ الرحمۃ اپنی دعا میں کہا کرتے کہ:

اللھم اخبأء الجنۃ والنار فی جنا یاغیبک حتی نعبدک بغیر واسطۃ | اے خدا جنت و دوزخ کو اپنے غیب کے خزانوں میں پوشیدہ رکھ اور ان کی یاد لوگوں کے دلوں سے فراموش کردے تاکہ ہم بغیر کسی واسطہ کے خالص تیری عبادت کرسکیں۔

جب طبیعت کو حصول جنت کا لالچ ہوگا تو یقینی طور پر ہر عقل منداسی کے حصول کے لئے عبادت کرے گا اور جس دل میں محبت کا حصہ نہ ہو وہ غافل ہے یقیناً وہ مشاہدے سے حجاب میں ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے شب معراج کے سلسلہ میں حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کو خبر دی کہ میں نے خدا کو نہیں دیکھا اور حضرت ابن عباس روایت کرتے ہیں کہ آپ نے مجھے بتایا کہ میں نے خدا کو دیکھا۔ لوگ اس اختلاف میں پڑے ہوئے ہیں لیکن جس نے غور کیا وہ اس اختلاف سے نکل گیا۔ چنانچہ جس سے یہ فرمایا کہ میں نے دیکھا۔ اس نے چشم باطن سے دیکھنا مراد لیا اور جس سے یہ فرمایا کہ میں نے نہیں دیکھا اس نے چشم سر سے دیکھنا مراد لیا۔ کیونکہ ان دونوں میں ایک صاحب باطن ہے اور دوسرا اہل ظاہر۔ ہر ایک سے اس کے حالات کے بموجب کلام فرمایا، لہٰذا جب باطنی آنکھ سے دیکھا تو اگر سر کی آنکھ کا واسطہ نہ ہو تو کیا مضائقہ۔؟

حضرت جنید بغدادی رحمتہ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اگر حق تعالیٰ مجھ سے فرمائے کہ مجھے دیکھ، تو میں نے عرض کروں گا کہ میں نہیں دیکھتا کیونکہ آنکھ، محبت میں غیر اور بیگانہ ہے اور غیریت کی غیرت مجھے دیدار سے باز رکھتی ہے کہ میں دنیا میں اسے آنکھ کے واسطہ سے دیکھوں اور آخرت میں واسطہ کا کیا کروں گا خدا ہی ہدایت فرمانے والا ہے۔ واللہ اعلم بالصواب

وانی لاحسد ناظری علیك

فاغض طرفی اذا نظرت الیك

یقیناً میں تیری طرف نظر اٹھانے میں حسد کرتا ہوں

اور جب تیری طرف دیکھتا ہوں تو آنکھوں کو بند رکھتا ہوں

کیونکہ محبوب کو آنکھ سے چھپاتے ہیں۔ اس لئے کہ آنکھ بیگانہ اور غیر ہے۔ لوگوں نے حضرت شیخ سے دریافت کیا کہ کیا آپ چاہتے ہیں کہ خدا کا دیدار ہو؟ فرمایا نہیں۔ پوچھا کیوں؟ فرمایا جب حضرت موسیٰ علیہ السلام نے چاہا تو انہیں دیدار نہ ہوا اور حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے نہ چاہا تو دیدار ہوا؟ لہٰذا ہمارا چاہنا دیدارِ خداوندی میں ہمارے لئے بہت بڑا حجاب ہے

کیونکہ ارادہ کا وجود، محبت کے اندر مخالفت ہوتی ہے اور مخالفت حجاب ہے اور جب دنیا میں ارادہ فنا ہو جاتا ہے تب مشاہدہ حاصل ہوتا ہے اور جب مشاہدہ ثابت و برقرار ہو جائے تو دنیا آخرت کی مانند اور آخرت دنیا کی مانند ہو جاتی ہے۔ حضرت بایزید بسطامی رحمتہ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ:

ان لله عباد لو حجبوا عن الله فی الدنیا و الآخرہ لارتدوا

اللہ تعالیٰ کے کچھ بندے ایسے ہیں کہ اگر دنیا و آخرت میں وہ اللہ تعالیٰ سے ایک لمحہ کے لئے محجوب ہو جائیں تو وہ مرتد ہو جائیں۔

مطلب یہ کہ اللہ تعالیٰ ان کو دائمی مشاہدہ میں پرورش فرماتا اور اپنی محبت کی حیات میں ان کو زندہ رکھتا ہے۔ لامحالہ جب صاحب مشاہدہ محجوب ہو جائے تو وہ مردودِ بارگاہِ الٰہی ہو جاتا ہے۔

حضرت ذوالنون مصری رحمتہ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ ایک دن میں مصر کے بازار میں جا رہا تھا میں نے دیکھا کہ ایک جوان کو بچے پتھر مار رہے ہیں میں نے بچوں سے پوچھا تم اس سے کیا چاہتے ہو بچوں نے کہا کہ یہ دیوانہ ہے۔ میں نے پوچھا تم نے اس کے جنون کی کیا علامت دیکھی ہے؟ بچوں نے کہا۔ یہ کہتا ہے کہ میں خدا کو دیکھتا ہوں۔ اس کے بعد میں جوان کی متوجہ ہوا اس سے پوچھا کہ اے جوان کیا تم یہ کہتے ہو کہ یا یہ بچے تم پر الزام رکھتے ہیں؟ جوان نے کہا یہ الزام نہیں رکھ رہے بلکہ میں یہی کہتا ہوں۔ کیونکہ اگر ایک لمحہ کے لئے میں حق کو نہ دیکھوں اور محجوب رہوں تو میں اس کی برداشت نہیں رکھ سکتا۔

البتہ اس مقام میں بعض لوگوں کو اربابِ مشاہدہ کے بارے میں غلطی لاحق ہوئی ہے وہ یہ گمان رکھتے ہیں کہ دلوں کی رویت اور ان کا مشاہدہ، دل میں کوئی صورت بناتی ہے جسے ذکر یا فکر کی حالت میں وہم برقرار و قائم رکھتی ہے۔ حالانکہ یہ تشبیہ محض اور کھلی گمراہی ہے۔ اس لئے کہ حق تعالیٰ کے لئے کوئی اندازہ نہیں ہے۔ جس کا اندازہ دل کے وہم کو ہو سکے اور ہر عقل اس کی کیفیت سے باخبر ہو سکے۔ جو چیز موہوم ہوتی ہے وہ بھی وہم کے قبیل سے ہے اور جو چیز عقل میں سما سکے وہ بھی عقل ہی کی جنس سے تعلق رکھتی ہے حق تعالیٰ کے لئے کسی جنس کے لئے ہم جنسی نہیں ہے۔

لطافت و کثافت دونوں جنس کے قبیل سے ہیں جو محل میں ایک دوسرے کی ضد اور ایک دوسرے کی جنس ہیں۔ لہٰذا توحید کے تحقق میں اور قدیم کے پہلو میں ضد جنس ہے۔ کیونکہ تمام اضداد محدث و مخلوق ہیں اور تمام حوادث یک جنس ہیں۔ **تعالیٰ اللہ عن ذالك عما یصفه الملاحدة علوا کبیرا۔**

دنیا میں مشاہدہ آخرت میں دیدار کے مانند ہے اور جب تمام اہل علم کا اجماع اور اتفاق ہے کہ آخرت میں دیدار جائز ہے تو لامحالہ دنیا میں بھی مشاہدہ جائز ہے لہٰذا جو عقبیٰ میں مشاہدہ کی خبر دے اور جو دنیا میں مشاہدے کی خبر دے ان دونوں کے درمیان کوئی فرق نہیں ہے اور جو ان دونوں معنی کی خبر دیتا ہے وہ اجازت سے خبر دیتا ہے نہ کہ محض دعوٰی سے یعنی وہ یہ کہتا ہے کہ دیدار و مشاہدہ دونوں جائز ہیں لیکن وہ یہ نہیں کہتا کہ مجھے دیدار ہوا ہے یا اب یہ حاصل نہیں ہے۔ اس لئے کہ مشاہدہ باطن کی صفت ہے اور خبر دینا زبان کی تعبیر ہے اور جب زبان، باطن کی خبر دے تو یہ عبارت ہوتی ہے مشاہدہ نہیں ہوتا۔ بلکہ دعوٰی ہوتا ہے۔ اس لئے کہ جس چیز کی حقیقت، عقلوں میں نہ سما سکے اسے زبان کیسے تعبیر کر سکتی ہے۔ بجز مجازی معنی کے۔

لان المشاهدة قصر اللسان بحضور الجنان	مشاہدہ، زبان کی عاجزی کے ساتھ قلوب کا حضور ہے۔

اس کے معنی کی تعبیر میں زبان کو خاموش رکھنا اور بلند درجہ رکھنا ہے۔ کیونکہ خاموشی مشاہدے کی علامت ہے اور گویائی شہادت کی نشانی اور کسی چیز کی شہادت دینے اور کسی چیز کے مشاہدہ کرنے میں بہت بڑا فرق ہے۔

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس درجہ قرب اور مقام اعلیٰ پر فائز ہو کر جسے حق تعالیٰ نے آپ کے لئے مخصوص فرمایا تھا وہاں کہا:

لَا اُحْصِیْ ثَنَاءً عَلَیْكَ	میں تیری ثنا کو محدود نہیں کر سکتا۔

کیونکہ آپ مشاہدے میں تھے اور محبت و دوستی کے درجہ میں مشاہدہ کمال یگانگت رکھتا ہے اور یگانگی کی تعبیر کرنا بے گانگی اور غیریت ہوتی ہے اس وقت آپ نے کہا:

اَنْتَ كَمَا اَثْنَيْتَ عَلٰى نَفْسِكَ — تو وہی ہے جیسا کہ تو نے خود اپنی ثناء فرمائی ہے۔ (ابن ماجہ)

اس جگہ تیرا فرمایا ہوا میرا ہی عرض کرنا ہے۔ یعنی تیری ثناء کرنا میری ثناء ہے میں اپنی زبان کو اس کے لائق نہیں سمجھتا کہ وہ میری حالت کو بھی بیان کرے اور میں بیان کو بھی اس کا مستحق نہیں سمجھتا کہ وہ میرا حال ظاہر کرے اسی معنی میں کسی کہنے والے نے کہا ہے:

تمنیت من اهوی فلما رأیتهٗ
بهت فلم املك لسانا ولا طرفا

''جسے میں دوست رکھتا تھا میں نے اس کی تمنا کی۔ پھر جب میں نے اسے دیکھا تو حیرت زدہ ہو کر رہ گیا اور اپنی زبان اور اپنے کسی عضو کا مالک نہ رہا۔''

نواں کشفِ حجاب

صحبت اور اس کے آداب واحکام کے بیان میں

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

يَا اَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا قُوْٓا اَنْفُسَكُمْ وَاَهْلِيْكُمْ نَارًا ، اَىْ اَدِّبُوْهُمْ — اے ایمان والو اپنی جانوں اور اپنے گھر والوں کو آگ سے بچاؤ یعنی ان کی درستگی کرو۔

اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

حُسْنُ الْاَدْبِ مِنَ الْاِيْمَانِ — حسن ادب ایمان کا حصہ ہے۔

نیز فرمایا:

اَدَّبَنِىْ رَبِّىْ فَاَحْسَنَ تَادِيْبِىْ — میرے رب نے مجھے ادب سکھایا اور بہت اچھا ادب مجھے سکھایا۔

دین و دنیا کے تمام امور کی شائستگی، آداب سے وابستہ ہے اور ہر قسم کے لوگوں کے مقامات کے لئے ہر مقام کے آداب جداگانہ ہیں۔ تمام انسان، خواہ وہ کافر ہوں یا مسلمان، ملحد ہوں یا موحد، سنی ہوں یا مبتدع سب کا اس پر اتفاق ہے کہ معاملات میں حسن ادب، عمدہ چیز ہے اور جہان میں کوئی رسم و رواج، استعمالِ ادب کے بغیر ثابت نہیں ہو سکتی۔ لوگوں میں ادب ہی مروت کی حفاظت ہے اور دین میں سنت کی حفاظت اور دنیا میں عزت و احترام کی حفاظت بھی اسی ادب سے متعلق ہے کیونکہ یہ تینوں ایک دوسرے سے منسلک ہیں جس میں مروت نہ ہوگی وہ سنت کا متبع نہ ہوگا اور جس میں سنت کی حفاظت نہ ہوگی اس میں عزت و احترام کی رعایت بھی نہ ہوگی۔

معاملات یعنی طریقت کے سلوک میں حفظِ ادب، مطلوب کی تعظیم سے حاصل ہوتی ہے۔ یعنی دنوں میں حق تعالیٰ اور اس کے مغائرت کی عظمت و عزت ہر طریقت میں یہ تعظیم، تقوی ہی سے حاصل ہوتی ہے اور جو تعظیم کی بے حرمتی کرتا ہے اور مشاہدۂ حق کو پائمال کرتا ہے طریق تصوف میں اس کا کوئی مقام نہیں ہے۔ سکر و غلبہ یا کسی اور حال میں ہونا، طالب کو ادب کی حفاظت سے منع نہیں کرتا اس لئے کہ ادب ان کی عادت ہے اور عادت، طبیعت کی مانند ہوتی ہے۔ ہر جاندار سے کسی حالت میں طبائع کی جدائیگی کا تصور نہیں کیا جا سکتا ہے۔ جب تک کہ اس کی زندگی برقرار ہے اس کا افتراق اس سے محال ہے۔ لہٰذا جب تک انسان کا تشخص برقرار ہے ہر حال میں ادب کی پیروی لازم ہے۔ خواہ تکلف سے ہو یا بے تکلف! جب ان کا حال صحت مندی میں ہوتا ہے تو وہ بہ تکلف آداب کی رعایت برتتے ہیں اور جب ان کا حال سکر و مدہوشی میں ہوتا ہے اس وقت حق تعالیٰ انہیں ادب پر قائم رکھتا ہے غرض کہ کسی حالت میں بھی دل، ادب سے روگرداں نہیں ہوتا۔

لان المودة عند الادب وحسن الادب صفته الاحباب	کیونکہ محبت، بہترین ادب ہے اور حسن ادب محبت کرنے والوں کی خوبو ہے۔

اللہ تعالیٰ جس پر جتنی کرامت فرماتا ہے وہ اس کی دلیل ہوتی ہے۔ کیونکہ وہ دین کے

ادب کی حفاظت کرتا ہے۔ بخلاف ملحدوں کے اس گروہ کے خدا ان پر لعنت کرے جو یہ کہتے ہیں کہ بندہ محبت میں جب غالب ہو جاتا ہے تو حکم متابعت اس سے ساقط ہو جاتا ہے۔ یہ خالص بے دینی ہے۔

ادب کی قسمیں:

ادب کی تین قسمیں ہیں، ایک اللہ تعالیٰ کے ساتھ اس کی توحید میں اس طرح پر کہ جلوت وخلوت کی ہر حالت میں خود کو اس کی بے حرمتی سے بچائے اور وہ سلوک برتے جو بادشاہوں کے حضور کیا جاتا ہے۔ صحیح حدیث میں وارد ہے کہ ایک مرتبہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم چہار زانو تشریف فرما تھے کہ جبریل علیہ السلام نے حاضر ہو کر پیام پہنچایا:

يَا مُحَمَّدُ اِجْلِسْ جِلْسَةَ الْعَبْدِ شانِ بندگی کے ساتھ جلوس فرمائیں۔

آپ اللہ کے مقرب بندے ہیں اس کی بارگاہ میں اس کی شان کے لائق جلوس فرمائیں۔

مشائخ بیان کرتے ہیں کہ حضرت حارث محاسبی رحمتہ اللہ علیہ نے چالیس سال تک دن رات کے کسی حصہ میں دیوار سے ٹیک لگا کر کمر سیدھی نہیں کی اور دو زانو کے سوا کسی اور حالت میں نہ بیٹھے۔ لوگوں نے عرض کیا آپ اتنی تکلیف ومشقت کیوں برداشت کرتے ہیں؟ فرمایا مجھے شرم آتی ہے کہ میں حق تعالیٰ کے مشاہدے میں اس طرح نہ بیٹھوں جس طرح بندہ بیٹھتا ہے۔

حضور سیدنا داتا گنج بخش رحمتہ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ میں نے خراسان کے ایک شہر ملند نامی میں ایک شخص کو دیکھا جو بہت مشہور تھا اور لوگ اسے ملند ادیب کہتے تھے وہ بڑا صاحب فضیلت تھا اس نے بیس (۲۰) سال قدموں پر کھڑے گزار دیئے سوائے نماز میں تشہد کے کبھی نہ بیٹھا۔ میں نے اس سے اس کی وجہ دریافت کی تو اس نے کہا ابھی مجھے وہ درجہ حاصل نہیں ہوا ہے کہ مشاہدہ حق میں بیٹھ سکوں۔

حضرت بایزید بسطامی رحمتہ اللہ سے کسی نے دریافت کیا ''بما وجدت ما وجدت'' آپ نے جو کچھ پایا ہے وہ کس چیز کی بدولت پایا ''قال بحسن الصحبته مع الله'' فرمایا

اللہ تعالٰی کے ساتھ حسن صحبت کی وجہ سے؟ چنانچہ میں نے حق تعالٰی کے ساتھ اتنا ہی جلوت میں ادب اور حسن صحبت کو ملحوظ رکھا ہے جتنا خلوت میں ہے۔ اہل جہان کو چاہئے کہ اپنے معبود کے مشاہدہ میں ادب کی حفاظت کا سلیقہ زلیخا سے سیکھیں۔ جس وقت اس نے حضرت یوسف علیہ السلام کے ساتھ خلوت و تنہائی کی اور حضرت یوسف علیہ السلام سے اپنی خواہش کی تکمیل کی درخواست کی تو اس نے پہلے اپنے بت کے چہرے کو کسی چیز سے ڈھانپ دیا تھا۔ حضرت یوسف علیہ السلام نے اس سے پوچھا یہ کیا کر رہی ہو؟ اس نے کہا اپنے معبود کے چہرے کو چھپا رہی ہوں تا کہ وہ بے حرمتی میں مجھے آپ کے ساتھ نہ دیکھے۔ کیونکہ یہ شرائط ادب کے خلاف ہے اور جب حضرت یوسف علیہ السلام اور حضرت یعقوب علیہ السلام باہم ملے اور انہیں جمال یوسفی سے ہم آغوش کیا تو زلیخا کو جوان کر کے دین حق کی راہ دکھائی تب حضرت یوسف علیہ السلام کی زوجیت میں دیا۔ جب حضرت یوسف علیہ السلام نے ان کی طرف قصد فرمایا تو زلیخا آپ سے بھاگی۔ فرمایا اے زلیخا کیا میں تیرا دلربا نہیں ہوں؟ غالباً میری محبت تمہارے دل سے جاتی رہی ہے؟ زلیخا نے عرض کیا خدا کی قسم! یہ بات نہیں محبت اپنی جگہ برقرار ہے بلکہ زیادہ ہے لیکن میں نے ہمیشہ اپنے معبود کی بارگاہ کے ادب کو ملحوظ رکھا ہے اس دن جب کہ ہمارے تمہارے درمیان خلوت ہوئی تھی اس وقت میرا معبود ایک بت تھا جو قطعاً دیکھ نہیں سکتا تھا مگر اس کے باوجود اس کی بے نور دو آنکھیں تھیں اس پر میں نے پردہ ڈال دیا تھا تا کہ بے ادبی کی تہمت مجھ سے اٹھ جائے اب میرا معبود ایسا ہے جو دانا اور بینا ہے جس کے لئے دیکھنے کا نہ حلقہ ہے اور نہ کوئی آلہ؟ مگر میں جس حال میں بھی ہوں وہ مجھے دیکھتا ہے اس لئے میں نہیں چاہتی کہ اس کی بارگاہ میں ترک ادب کا الزام مجھ پر عائد ہو۔

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو شب معراج میں لے جایا گیا تو آپ نے حفظ ادب میں کونین کی طرف نظر نہیں اٹھائی یہاں تک کہ اللہ تعالٰی نے فرمایا:

مَازَاغَ الْبَصَرُ وَمَا طَغٰی (النجم:۱۷) نہ آنکھ جھپکی اور نہ بے راہ ہوئی۔

یعنی دنیا کی طرف نظر کرتے میں نہ آنکھ بھٹکی اور نہ آخرت کے دیکھنے میں آنکھ بے راہ

ہوئی۔

ادب کی دوسری قسم، معاملات میں اپنے ساتھ ہے۔ وہ اس طرح کہ ہر حال میں اپنے ساتھ مروت کو ملحوظ رکھے۔ یہاں تک کہ لوگوں کی صحبت ہو یا حق تعالیٰ کی بارگاہ کی حاضری خواہ جلوت ہو یا خلوت کسی حال میں بے ادبی کا ارتکاب نہ کرے۔ اس کی صورت یہ ہے کہ سچ کے سوا کلام نہ کرے جو بات اپنے دل کو جھوٹی معلوم ہو اسے زبان پر لانا کیسے درست ہو سکتا ہے کیونکہ اس میں بے مروتی ہے۔ دوسری صورت یہ ہے کہ کم کھائے تا کہ طہارت گاہ میں زیادہ نہ جانا پڑے۔ تیسری صورت یہ ہے کہ کسی کی شرمگاہ کو نہ دیکھے حتیٰ کہ اپنی شرم گاہ بھی مجبوری کے سوا نہ دیکھے۔ کیونکہ امیر المومنین حضرت علی مرتضیٰ کرم اللہ وجہہ کے بارے میں منقول ہے کہ انہوں نے کبھی اپنے پوشیدہ حصہ جسم کو نہیں دیکھا کسی نے اس کی وجہ دریافت کی تو فرمایا میں شرم کرتا ہوں کہ اس حصہ جسم کو دیکھوں جس کی جنس پر نظر ڈالنا حرام ہے۔

ادب کی تیسری قسم، لوگوں کے ساتھ صحبت کرنے میں ادب کا لحاظ رکھنا ہے صحبت کے آداب میں بہترین ادب یہ ہے کہ سفر و حضر میں حسن معاملہ اور سنت کی حفاظت کرے۔

آداب کی یہ تینوں قسمیں ایک دوسرے سے جدا نہیں ہو سکتیں اب میں حتی المقدور ترتیب وار آداب کو بیان کرتا ہوں تا کہ بآسانی سمجھ میں آسکے۔

آداب صحبت:

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

اِنَّ الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ سَیَجۡعَلُ لَہُمُ الرَّحۡمٰنُ وُدًّا،
اَیْ بِحُسْنِ رِعَایَتِھِمُ الْاَخْوَانِ۔" (طٰہٰ:۹٦)

جو ایمان لائے اور عمل صالح کئے اللہ ان کو محبوب بنا کر دوست بنا لے گا۔ یعنی انہوں نے اپنے دلوں کی حفاظت کی اور اپنے بھائیوں کے حقوق کو ادا کیا اور اپنے مقابلہ میں ان کی بزرگی و شرافت کو دیکھا۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ:

ثَلٰثٌ لَکَ وُدَّاَخِیْکَ لِتَسْلِمَ عَلَیْهِ اِنْ لَقِیْتَهٗ وَتَوَسَّعَ لَهٗ فِی الْمَجْلِسِ وَتَدْعُوْهُ بِاَحَبِّ اَسْمَائِهٖ

حسن رعایت اور حفظ مراتب کے سلسلہ میں مسلمان بھائیوں کی محبت کو تین چیزیں پاکیزہ بناتی ہیں ایک یہ کہ جب کسی سے ملاقات کرو تو اسے سلام کرو دوسرے یہ کہ اپنی مجلسوں میں اس کے لئے جگہ بناؤ تیسرے یہ کہ اسے اچھے القاب کے ساتھ یاد کرو۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ:

اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ اِخْوَةٌ فَاَصْلِحُوْا بَیْنَ اَخَوَیْکُمْ (الحجرات:۱۰)

تمام مسلمان ایک دوسرے کے بھائی ہیں لہٰذا اپنے بھائیوں سے صلح و آشتی رکھو۔

مطلب یہ کہ باہم لطف و مہربانی سے پیش آؤ کسی کی دل شکنی نہ کرو۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ:

اَکْثِرُوا مِنَ الْاَخْوَانِ فَاِنَّ رَبَّکُمْ حَیِیٌّ کَرِیْمٌ یَسْتَحْیِ اَنْ یُّعَذِّبَ عَبْدَهٗ بَیْنَ اِخْوَتِهٖ یَوْمَ الْقِیٰمَةِ

اپنے بھائی اور زیادہ بناؤ ...... اور ان کے حقوق میں حسن سلوک کر کے بھائی بناؤ کیونکہ تمہارا رب حی و کریم ہے وہ حیا فرماتا ہے کہ روز قیامت باہمی آداب و معاملات کی وجہ سے اپنے بندے پر اس کے بھائیوں کے درمیان عذاب فرمائے۔

لہٰذا یہی مناسب ہے کہ اپنے بھائی کے ساتھ صحبت لوجہ اللہ کی جا ئے نہ کہ نفسانی خواہش یا کسی غرض و مفاد کی خاطر، تا کہ وہ بندہ حفظ ادب کی وجہ سے ممنون و متشکر ہو۔

حضرت مالک بن دینار نے اپنے داماد حضرت مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہ سے فرمایا:

یا مغیرہ کل اخ وصاحب لم تفدمنه فی دینك خیرا فانبذ عن

اے مغیرہ جب بھائی یا ساتھی کی رفاقت تمہیں دینی فائدہ نہ پہنچائے تم اس جہان

صحبته حتی تسلم — میں اس کی صحبت سے بچو کہ تم محفوظ رہو۔

اس نصیحت کا مطلب یہ ہے کہ تمہاری صحبت یا تو اپنے سے بڑے اور اچھے کے ساتھ ہوگی یا اپنے سے کمتر کے ساتھ۔ اگر اپنے سے بڑے اور اچھے کی رفاقت اختیار کرو گے تو اس سے تمہیں دینی دینوی فائدہ پہنچے گا اور اگر اپنے سے کمتر کے ساتھ بیٹھو گے تو تم سے اس کو دین کا فائدہ پہنچے گا کیونکہ اگر وہ تم سے کچھ حاصل کرے گا تو وہ دینی فائدہ پہنچانا ہوگا اور جو تم اپنے بڑے سے حاصل کرو گے وہ بھی دینی فائدہ حاصل کرنا ہوگا۔ سید عالم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ:

ان من تمام التقوی تعلم من لا یعلم — کمالِ پرہیز گاری یہ ہے کہ بے علم کو علم سکھائے۔

حضرت یحییٰ بن معاذ رحمتہ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ:

بئس الصدیق تحتاج ان تقول له اذ کرنی فی دعائك وبئس الصدیق تحتاج ان تعیش معهٗ بالمدارات وبئس الصدیق صدیق یلحیك الی الاعتذار فی زلة کانت منك

یعنی وہ دوست بہت برا ہے جس کو دعا کرنے کی وصیت کرنی پڑے کیونکہ ایک لمحہ کی صحبت کا حق یہ ہے کہ اسے ہمیشہ دعائے خیر میں یاد رکھا جائے اور وہ دوست بہت برا ہے جس کی صحبت، خاطر تواضع کی محتاج ہو کیونکہ صحبت کا سرمایہ ہی یہ ہے کہ ہمیشہ باہمی خوشی و مسرت میں گزرے اور وہ دوست بہت برا ہے جس سے گناہ کی معافی مانگنے کی ضرورت پیش آئے اس لئے کہ عذر خواہی بیگانگی کی علامت ہے اور صحبت میں غیریت اور بیگانگی ظلم ہے۔

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ:

اَلْمَرْءُ عَلٰی دِیْنِ خَلِیْلِهٖ فَلْیَنْظُرْ اَحَدُکُمْ مَنْ یُّخَالِلُ (ترمذی)

آدمی اپنے دوست کے دین اور اس کے طور و طریق پر ہوتا ہے لہٰذا ضروری ہے کہ وہ دیکھے کہ کس سے دوستی رکھتا ہے۔؟

اگر اس کی صحبت نیکوں کے ساتھ ہے اگر چہ وہ خود نیک نہ ہو تو وہ صحبت نیک ہے۔ اس لئے کہ نیک کی صحبت اسے نیک بنا دے گی اور اگر اس کی صحبت بروں کے ساتھ ہے اگر چہ وہ نیک ہے تو یہ برا ہے کیونکہ وہ اس کی برائیوں پر راضی ہے اور جو برائیوں پر راضی ہوا اگر چہ وہ نیک ہو بہر حال برا ہے۔

ایک شخص دورانِ طواف خانہ کعبہ میں دعا مانگ رہا تھا کہ **"اللهم اصلح احوانی فقیل لہ لم تدع لك فی هٰذا المقام"** اے خدا میرے بھائیوں کی اصلاح فرما۔ لوگوں نے پوچھا اس مقام میں تم اپنے لئے دعا کیوں نہیں مانگتے بھائیوں کے لئے دعا کرتے ہو؟ اس نے جواب دیا **"ان لی اخوانا ارجع الیهم فان صلحوا صلحت معهم وان فسدوا فسدت معهم"** میں چونکہ انہیں بھائیوں کی طرف واپس جاؤں گا اگر وہ درست ہوئے تو میں بھی ان کے ساتھ درست رہوں گا اور اگر وہ خراب ہوئے تو میں بھی ان کے ساتھ خراب ہو جاؤں گا۔ کیونکہ قاعدہ ہے کہ اپنی درستگی، مصلحین کی درستگی پر موقوف ہے۔ لہٰذا میں اپنے بھائیوں کے لئے دعا کرتا ہوں تا کہ میرا مقصود ان سے حاصل ہو جائے۔

اس ارشاد و نصیحت کی بنیاد یہ ہے کہ نفس کی عادت ہے کہ وہ اپنے ساتھیوں سے راحت پاتا ہے اور جس قسم کے لوگوں کی صحبت اختیار کی جائے گی وہ انہیں کی خصلت و عادت اختیار کر لیتا ہے اس لئے کہ تمام معاملات، ارادۂ حق اور ارادۂ باطل سے مرکب ہیں۔ وہ جس ارادے کے معاملات کے ساتھ صحبت رکھے گا اس پر اسی کا غلبہ ہوگا۔ کیونکہ اپنی ارادت، دوسرے کے ارادوں پر مبنی ہے اور طبع و عادت پر ان کی صحبت کا بڑا اثر اور غلبہ ہے۔ یہاں تک کہ باز آدمی کی صحبت میں سدھ جاتا ہے، طوطی آدمی کے سکھانے سے بولنے لگتی ہے، گھوڑا اپنی بہیمانہ خصلت ترک کر کے مطیع بن جاتا ہے یہ مثالیں بتاتی ہیں کہ صحبت کا کتنا اثر و غلبہ ہوتا ہے

اور کس طرح وہ عادتوں کو بدل دیتی ہے۔ یہی حال تمام صحبتوں کا ہے۔ اسی بنا پر تمام مشائخ سب سے پہلے صحبت کے حقوق کے خواہاں رہتے ہیں اور اپنے مریدوں کو بھی اسی کی ترغیب دیتے ہیں۔ حتیٰ کہ ان کے نزدیک صحبت کے آداب، اور ان کی مراعات فرض کا درجہ رکھتی ہیں۔ گزشتہ مشائخ کی کثیر جماعت نے صحبت کے آداب میں مفصل کتابیں تحریر فرمائی ہیں چنانچہ حضرت جنید بغدادی رحمتہ اللہ علیہ نے ایک کتاب موسومہ ''تصحیح الارادہ'' اور حضرت احمد بن خضرویہ بلخی علیہ الرحمۃ نے ''الرعایتہ بحقوق اللہ'' اور حضرت محمد بن علی ترمذی رحمہ اللہ نے ''بیان آداب المریدین'' لکھی ہیں۔ ان کے علاوہ حضرت ابوالقاسم الحکیم، حضرت ابوبکر وراق، حضرت سہل بن عبداللہ تستری حضرت ابوعبدالرحمٰن سلمٰی اور حضرت استاذ ابوالقاسم قشیری رحمہم اللہ نے بھی اس موضوع پر بھرپور کتابیں لکھی ہیں۔ یہ تمام مشائخ اپنے فن کے امام گزرے ہیں اب تمام طالبان طریقت کے لئے اقسام آداب میں معاملات مشائخ پر مشتمل چند عنوانات پیش کرتا ہوں بیدہ التوفیق۔

صحبت کے حقوق:

واضح رہنا چاہئے کہ مریدوں کے لئے سب سے اہم ترین چیز صحبت ہے کیونکہ صحبت کے حق کی رعایت کرنا اہم فرض ہے چونکہ مریدوں کے لئے انفرادی اور علیحدگی کی زندگی گزارنا موجب ہلاکت ہے۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ:

اَلشَّیْطَانُ مَعَ الْوَاحِدِ وَهُوَ مِنَ الْاِثْنَیْنِ اَبْعَدُ (ترمذی)

اکیلے آدمی کے ساتھ شیطان ہوتا ہے اور جب دو ایک ساتھ ہوں گے تو دور رہے گا۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

مَا یَکُوْنُ مِنْ نَّجْوٰی ثَلٰثَةٍ اِلَّا هُوَ رَابِعُهُمْ (المجادلہ:۷)

تم میں جو تین آدمی راز کی باتیں کرتے ہیں ان میں چوتھا حق تعالیٰ ہوتا ہے۔

لہٰذا مرید کے لئے اکیلے رہنے سے بڑھ کر کوئی آفت نہیں ہے۔

صحبتِ شیخ سے انحراف کا وبال:

حضرت جنید بغدادی رحمتہ اللہ علیہ کے مریدوں میں سے ایک کو یہ خیال گزرا کہ میں درجہ کمال کو پہنچ گیا ہوں اب میرے لئے اکیلا رہنا صحبت سے بہتر ہے۔ چنانچہ وہ گوشہ نشین ہوگیا، اور مشائخ کی صحبت چھوڑ دی۔ ایک رات اس نے دیکھا کہ کچھ لوگ ایک اونٹ لے کر آئے ہیں۔ انہوں نے کہا کہ رات تمہیں جنت میں گزارنی چاہئے۔ یہ لوگ اسے اونٹ پر سوار کرکے لے گئے یہاں تک کہ ایسی جگہ لے گئے جو اچھی طرح نظر آتی ہے۔ وہاں حسین و خوبصورت چہروں میں نفیس طعام اور پانی کے چشمے رواں تھے۔ اسے صبح تک وہاں رکھا۔ حالانکہ یہ سب مرید کی خواب کی حالت تھی۔ جب صبح بیدار ہوا تو اپنے حجرے میں اپنے آپ کو پایا۔ یہ سلسلہ اسی طرح روزانہ جاری رہا یہاں تک کہ بشری غرور و رعونت نے غلبہ پایا اور اس کے دل میں جوانی کے گھمنڈ نے اپنا اثر جمایا اور اس کی زبان پر دعویٰ جاری ہوگیا اور کہنے لگا میری حالت اس کمال تک پہنچ گئی ہے اور میری راتیں اس طرح بسر ہوتی ہیں۔ لوگوں نے اس کی خبر حضرت جنید بغدادی رحمتہ اللہ علیہ کو پہنچائی آپ اٹھے اور اس کے حجرے میں تشریف لے گئے اسے اس حال میں پایا کہ اس کے سر میں خواہشیں بھری ہوئی تھیں اور تکبر سے اکڑا ہوا تھا۔ آپ نے اس سے حال دریافت کیا اس نے سارا حال بیان کر دیا حضرت جنید نے فرمایا یاد رکھ جب تو آج رات وہاں پہنچے تو تین مرتبہ "لَا حَوْلَ وَلَا قُوَّةَ اِلَّا بِاللّٰهِ الْعَلِیِّ الْعَظِیْمِ" پڑھنا، چنانچہ جب رات آئی اور اسے حسب سابق لے جایا گیا چونکہ وہ اپنے دل میں حضرت جنید رحمتہ اللہ علیہ کا انکاری تھا کامل اعتقاد جاتا رہا تھا کچھ عرصہ بعد محض تجربہ کے طور پر اس نے تین مرتبہ لاحول پڑھا تو اسے لے جانے والے تمام لوگ چیخ مار کر بھاگ گئے اور خود کو اس نے نجاست اور کوڑے کرکٹ کے ڈھیر پر پڑا پایا۔ چاروں طرف مردار ہڈیاں پڑی ہوئی ہیں اس وقت اسے اپنی غلطی کا احساس ہوا۔ دل سے توبہ کی اور ہمیشہ صحبت میں رہنے لگا۔ مرید کے لئے اکیلے رہنے سے بڑھ کر کوئی آفت نہیں۔

صحبت کے شرائط:

مشائخ طریقت کی صحبت کی شرط یہ ہے کہ ہر ایک کو ان کے درجہ کے مطابق پہچانے، بوڑھوں کا ادب کرے، ہم جنسوں کے ساتھ عمدہ سلوک سے پیش آئے اور بچوں کے ساتھ شفقت و محبت کا برتاؤ کرے۔ بوڑھوں کو باپ دادا کی طرح سمجھے۔ ہم جنسوں کو بھائیوں کی مانند اور بچوں کو اولاد کی مانند جانے۔ کینہ، حسد اور عداوت و دشمنی سے اجتناب کرے اور کسی کی نصیحت میں کوتاہی نہ کرے۔ صحبت میں کسی کی کوتاہی نہ کرے اور نہ ایک دوسرے کی قول و فعل میں کوتاہی کرے اس لئے کہ لوجہ اللہ صحبت کرنے والے پر لازم ہے کہ رفیق کے کسی قول و فعل پر کبیدہ اور آزردہ خاطر نہ ہو اور اسے اپنے سے اسی بناء پر جدا نہ کرے۔

حضور سیدنا داتا گنج بخش رحمتہ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ میں نے شیخ المشائخ حضرت ابوالقاسم گرگانی رحمتہ اللہ علیہ سے دریافت کیا کہ صحبت کی شرط کیا ہے؟ انہوں نے فرمایا یہ ہے کہ صحبت میں اپنی خوشی نہ چاہے کیونکہ صحبت کی سب سے بڑی آفت یہی ہے کہ ہر ایک سے اپنی خوشی کا خواہاں ہے۔ ایسے شخص کے لئے صحبت کے مقابلہ میں اکیلا رہنا بہتر ہے اور جب وہ اپنی خوشی کو ترک کردے تو پھر وہ اپنے مصاحب کی خوشیوں کا لحاظ رکھے تب وہ صحبت میں کامیابی حاصل کر سکے گا۔

ایک درویش بیان کرتے ہیں کہ ایک مرتبہ میں کوفہ سے مکہ مکرمہ کے ارادے سے چلا۔ راستہ میں حضرت ابراہیم خواص رحمتہ اللہ علیہ سے ملاقات ہوئی میں نے ان سے صحبت میں رہنے کی اجازت مانگی انہوں نے فرمایا صحبت میں ایک امیر ہوتا ہے اور دوسرا فرمانبردار، تم کیا منظور کرتے ہو؟ میں نے عرض کیا آپ امیر بنیں اور میں فرمانبردار، انہوں نے فرمایا اگر فرمانبردار بننا پسند کرتے ہو تو میرے کسی حکم سے باہر نہ ہونا میں نے کہا یہی ہوگا جب ہم منزل پہ پہنچے تو انہوں نے فرمایا بیٹھ جاؤ۔ میں بیٹھ گیا۔ انہوں نے کنویں سے پانی کھینچا جو بہت سرد تھا پھر لکڑیاں جمع کر کے ایک نشیبی جگہ پر آگ جلائی اور پانی گرم کیا میں جس کام کا ارادہ کرتا وہ فرماتے بیٹھ جاؤ فرمانبرداری کی شرط کو ملحوظ رکھو۔ جب رات ہوئی تو شدید بارش نے گھیر لیا۔ انہوں نے اپنی گدڑی

اتار کر کندھے پر ڈالی اور رات بھر میرے سر پر سایہ کئے کھڑے رہے۔ میں ندامت سے پانی پانی ہوا جا رہا تھا مگر شرط کے مطابق کچھ کر نہیں سکتا تھا۔ جب صبح ہوئی تو میں نے کہا اے شیخ! آج میں امیر بنوں گا۔ انہوں نے فرمایا ٹھیک ہے۔ جب ہم منزل پر پہنچے تو انہوں نے پھر وہی خدمت اختیار کی۔ میں نے کہا اب آپ میرے حکم سے باہر نہ ہو جائیے فرمایا فرمان سے وہ شخص باہر ہوتا ہے جو اپنے امیر سے اپنی خدمت کرائے۔ وہ مکہ مکرمہ تک اسی طرح میرے ہم سفر رہے۔ جب ہم مکہ مکرمہ پہنچے تو میں شرم کے مارے بھاگ کھڑا ہوا یہاں تک کہ انہوں نے مجھے منیٰ میں دیکھ کر فرمایا! اے فرزند! تم پر لازم ہے کہ درویشوں کے ساتھ ایسی صحبت کرنا جیسی کہ میں نے تمہارے ساتھ کی ہے۔

حضرت مالک بن انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دس سال خدمت کی ہے۔ خدا کی قسم، آپ نے کبھی بھی مجھ سے اف تک نہ فرمایا اور نہ میرے کسی کام پر یہ فرمایا کہ یہ کیوں کیا؟ اور نہ کسی کام کے نہ کرنے پر یہ فرمایا یہ کیوں نہیں کیا۔

ہر درویش یا تو مقیم ہوگا یا مسافر، مشائخ طریقت کا مشرب یہ ہے کہ مسافر درویش کو چاہئے کہ وہ مقیموں کی خدمت کو اپنے حق میں افضل جانے۔ اس لئے مسافر اپنی تقدیر پر رواں دواں ہے اور مقیم حق تعالیٰ کی خدمت میں بیٹھے ہوئے ہیں۔ کیونکہ مسافروں میں طلب کی علامت ہے اور مقیموں میں پانے کا اشارہ۔ لہٰذا جس نے پایا وہ بیٹھ گیا۔ وہ اس سے افضل ہے جو ابھی مسافرت اور طلب میں ہے۔ اسی طرح مقیموں پر فرض ہے کہ وہ مسافروں کو اپنے سے افضل جانیں۔ اس لئے کہ مقیم صاحب علائق ہیں اور مسافر علائق سے جدا اور اکیلے۔ وہ راہ طلب کے مسافر ہیں اور مقیم دنیا میں حالت وقوف میں ہیں۔ اسی طرح بزرگ حضرات کو چاہئے کہ جوانوں کو اپنے پر فوقیت دیں کیونکہ جوان دنیا میں نو وارد ہیں اور ان کے گناہ بہت کم ہیں اور جوانوں پر یہ لازم ہے کہ وہ بزرگوں کو اپنے پر فضیلت دیں کیونکہ وہ عبادت میں ان سے پہلے ہیں اور خدمت الٰہی میں مقدم۔ جب یہ سب ایک دوسرے کا اس طرح لحاظ و پاس کریں گے تو یہ سب نجات پا جائیں گے ورنہ ہلاک ہو جائیں گے۔

آداب کی حقیقت:

آداب کی حقیقت خصائل جمیلہ کا جمع کرنا ہے۔ادیب کوادیب اسی لئے کہا جاتا ہے کہ جو کچھ اس پر وارد ہوتا ہے وہ سب نیک ہوتا ہے:

فالذی اجتمع فیه خصال الخیر فهو ادیب جس میں نیک خصلتیں زیادہ ہوں وہ ادیب ہے۔

حالانکہ عرف و عادت میں ادیب وہ شخص کہلاتا ہے جو علم لغت اور صرف و نحو کے قواعد کا ماہر ہو۔

ادب کے معنی:

تصوف کے علم میں ادب کے معنی یہ ہیں کہ:

"الادب الوقوف مع المستحسنات ومعناه ان تفعل لله فی الادب سراً وعلانیته واذا کنت کذالك کنت ادیبا وان کنت اعجمیا وان لم تکن کذالك تکون علی ضده"

"ادب کے معنی نیک اعمال پر قائم رہنے کے ہیں مطلب یہ کہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ ظاہر و باطن میں باادب معاملات رکھے۔ جب تم ایسے بن جاؤ گے تو ادیب کہلاؤ گے۔ چاہے تم گونگے ہو اور اگر تم نہ بنے تو اس کے برخلاف ہو گے۔"

طریقت کے معاملات میں الفاظ و عبارت کی کوئی قدر و قیمت نہیں ہوتی اور ہر حال میں عاقل سے عالم افضل و بزرگ ہوتا ہے۔

کسی نے کسی بزرگ سے پوچھا کہ ادب کی کیا شرط ہے؟ انہوں نے فرمایا کہ اس کا جواب اس گفتگو میں موجود ہے جسے میں نے سنا ہے۔ادب یہ ہے کہ جو بات کہو وہ قول صادق ہو، جو معاملہ کرو وہ برحق ہو۔قول صادق اگر چہ سخت و درشت ہو مگر ملیح ہوتا ہے اور حق معاملہ

اگرچہ دشوار ہو مگر نیک ہوتا ہے۔ لہٰذا جب بات کرو تو تمہاری بات میں صداقت ہو اور جب خاموش رہو تو تمہاری خاموشی میں بھی حق و صداقت کارفرما ہو۔

حضرت شیخ ابو نصر سراج صاحب لمعہ رحمتہ اللہ علیہ نے اپنی کتاب میں آداب کا فرق بیان فرمایا ہے۔ "ادب میں لوگوں کے تین طبقے ہیں۔ ایک دنیا دار جو فصاحت و بلاغت، حفظ علوم اور بادشاہوں کے نام اور عرب کے اشعار کو ادب کے نام سے موسوم کرتے ہیں۔ دوسرا طبقہ اہل دین کا ہے جنہوں نے ریاضت نفس، تادیب اعضاء، حفظِ حدودِ الٰہی اور ترک شہوات کا نام "ادب" رکھا ہے اور تیسرا طبقہ اہل خصوصیت کا ہے جو دلوں کی طہارت باطن کا تزکیہ، اسرار کی مراعات، عہد و پیمان کا ایفاء، وقت کی حفاظت، پراگندہ خیالات اور موہوم خطرات کی طرف قلت توجہ، مقام طلب، اوقات حضور، اور مقاماتِ قرب میں حسن ادب کو ملحوظ رکھنے کو ادب کہتے ہیں۔" یہ تعریف جامع ہے اور اس کی تفصیل جگہ بجگہ موجود ہے۔ وباللہ التوفیق

اقامت کے آداب:

جب کوئی درویش سفر کے سوا اقامت اختیار کرے تو اس کے ادب کی شرط یہ ہے کہ جب کوئی مسافر اس کے پاس پہنچے تو وہ خوشی و احترام کے ساتھ پیش آئے اور عزت و تعظیم سے اس کا خیر مقدم کرے۔ گویا وہ سیدنا حضرت ابراہیم علیہ السلام کے معزز مہمانوں کا ایک مہمان ہے اور اس کے ساتھ ویسا ہی سلوک کرے، جیسا کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام اپنے مہمان کے ساتھ کرتے تھے۔ گھر میں جو کچھ موجود ہوتا مہمان کے روبرو لاکر رکھ دیتے تھے۔ چنانچہ حق تعالیٰ فرماتا ہے کہ:

فَجَآءَ بِعِجْلٍ سَمِينٍ (الذّٰریٰت: ۲۶) وہ ایک فربہ بچھڑا تیار کر کے لائے۔

اور مہمان سے اتنا بھی دریافت نہ فرمایا کہ کہاں سے آرہے ہو اور کہاں جارہے ہو۔ اور کیا نام ہے؟ مہمان کے ساتھ ان کا یہ ادب اور سلوک تھا انہوں نے مہمان کا آنا بھی حق تعالیٰ کی طرف سے جانا اور مہمان کی روانگی بھی حق تعالیٰ ہی کی طرف سمجھی اور اس کا نام بھی بندۂ حق خیال کیا۔

اس کے بعد درویش مقیم یہ دیکھے کہ مہمان خلوت کو پسند کرتا ہے یا صحبت کو۔ اگر وہ خلوت کو پسند کرتا ہے تو اس کے لئے تنہائی کر دے اور اگر وہ صحبت کو پسند کرتا ہے تو انس و محبت کے ساتھ بے تکلف پیش آئے اور جب رات کو بستر پر آرام کرنے لیٹے تو اس کے ہاتھ پاؤں دبائے اگر وہ ایسا نہ کرنے دے اور کہے کہ اس کی عادت نہیں ہے تو اس پر ضد اور اصرار نہ کرے تاکہ وہ دل گیر نہ ہو صبح کے وقت حمام کے لئے کہے تاکہ غسل کر کے صاف و ستھرا ہو جائے اور ضروریاتِ صفائی کا خیال رکھے۔ کسی دوسرے کو اس کی خدمت کرنے کا موقعہ نہ دے۔ مقیم کے لئے لازم ہے کہ حسن عقیدت کے ساتھ اس کی خدمت کرے اور اسے خوب صاف و ستھرا بنانے کی پوری کوشش کرے۔ یہاں تک کہ اس کی کمر ملے۔ ہاتھ پاؤں کی مالش کرے۔ مہمان نوازی کے یہ آداب ہیں۔ اگر مقیم اتنی استطاعت رکھتا ہو کہ اسے نیا کپڑا پہنا سکے تو اس میں کوتاہی نہ کرے اور اگر ایسا نہ کر سکے تو تکلف نہ برتے بلکہ اس کے لباس کو دھو کر صاف ستھرا کر دے تاکہ جب وہ حمام سے باہر آئے تو اسی لباس کو پہن لے۔ حمام سے فارغ ہونے کے بعد اگر تین دن سے زیادہ نہ گزرے ہوں تو اس شہر کے بزرگ، امام، یا بزرگوں کی جماعت سے ملنے کا اشتیاق دلائے اور اس سے کہے کہ آؤ ہم ان کی زیارت کو چلیں۔ اگر وہ آمادہ ہو تو ہمراہ جائے اور اگر وہ کہے کہ میرا دل نہیں چاہتا تو اصرار نہ کرے۔ کیونکہ بسا اوقات ایسا ہوتا ہے کہ طالبانِ حق کا دل اپنے اختیار میں نہیں ہوتا۔ کیا تم نے نہیں دیکھا کہ حضرت ابراہیم خواص رحمتہ اللہ علیہ سے لوگوں نے درخواست کی کہ آپ اپنے سفر کے عجائب و غرائب میں سے کوئی بات بیان فرمائیں تو انہوں نے فرمایا سب سے عجیب بات یہ ہے کہ حضرت خضر علیہ السلام نے مجھ سے ساتھ رہنے کی خواہش ظاہر کی مگر میں نے اسے قبول نہ کیا اور میرے دل نے نہ چاہا کہ حق تعالیٰ کے سوا میرا دل کسی اور کی قدر و منزلت کرے اور میں اس کے ادب و احترام کی رعایت میں مشغول ہوں۔

مقیم کے لئے یہ جائز نہیں ہے کہ مسافر سے پہلے سلام کرے یہی احکام ان دنیاداروں کے لئے بھی ہیں، جو بیمار پرسی، عیادت یا تعزیت وغیرہ کے لئے جایا کرتے ہیں اور

جس مقیم کو مسافروں سے یہ طمع ہو کہ ان کو وہ اپنی گدائی کا آلہ بنائے اور اپنے گھر سے دوسرے کے گھر لے جائے اس کے لئے یہی سزاوار اور بہتر ہے کہ وہ مہمانوں کی خدمت نہ کرے۔ کیونکہ وہ انہیں ذلیل کرتا ہے اور ان کے دل کو رنج پہنچاتا ہے۔

حضور سیدنا داتا گنج بخش رحمتہ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ مجھے اپنے سفروں میں یہی بات میرے لئے سب سے بڑھ کر تکلیف دہ ثابت ہوئی کہ جاہل خدام اور ناپاک مقیم لوگ کبھی کبھی ایک گھر سے اٹھا کر دوسرے گھر لے جاتے تھے۔ کبھی کسی امیر کے گھر کبھی کسی دہقانی کے گھر۔ حالانکہ میں دل میں اس سے متنفر ہوتا اور انہیں سخت وست کہتا تھا لیکن ظاہر داری میں درگزر اور مسامحت سے کام لیتا تھا اور یہ مقیم لوگ جو سلوک میرے ساتھ کرتے اور بے ڈھنگے طور پر میری نذر کرتے تھے اگر میں مقیم ہوتا تو ہرگز مسافروں کے ساتھ ایسا نہ کرتا۔ بے ادبوں کی صحبت کا فائدہ اس سے بڑھ کر اور نہیں ہو سکتا کہ جو بات تمہیں اچھی معلوم نہ ہو تو تم اپنے معاملات میں ہمیشہ ان سے اجتناب کرو۔

پھر اگر کوئی مسافر درویش خوش ہو اور کچھ دن رہنا چاہے اور دنیا طلبی کا اظہار کرے تو مقیم کے لئے اس کے سوا چارہ نہیں کہ وہ ہمیشہ اس کی ضرورت کے لئے اسے مقدم رکھے اور اگر یہ مسافر لالچی اور بے ہمت ہے تو مقیم کو نہ چاہئے کہ بے ہمتی کا مظاہرہ کرے اور ناممکن ضرورتوں میں اس کا پیرو ہو۔ کیونکہ جن لوگوں نے دنیا کو چھوڑ رکھا ہے۔ ان کا طریقہ یہ نہیں ہوتا کہ جب ضرورت ہوئی تو بازار آگئے اور لگے ضرورت جتانے یا امراء کے دروازے پر پہنچ گئے اور لگے ان سے مدد مانگنے۔ دنیا سے کنارہ کشوں کا ان کی صحبت سے کیا علاقہ۔؟

مشائخ طریقت بیان کرتے ہیں کہ ایک مرتبہ حضرت جنید بغدادی رحمتہ اللہ علیہ اپنے مریدوں کو ریاضت و مجاہدے کی تعلیم دے رہے تھے کہ ایک مسافر آگیا آپ اس کی خاطر مدارات میں مشغول ہو گئے اور کھانا لا کر اس کے سامنے رکھ دیا۔ مسافر نے کہا اس کے سوا، فلاں چیز کی بھی مجھے ضرورت ہے۔ انہوں نے فرمایا تجھے بازار جانا چاہئے تھا تُو تو بازاری شخص معلوم ہوتا ہے۔ مساجد و خانقاہ میں رہنے والا شخص معلوم نہیں ہوتا۔

ایک مرتبہ میں نے دمشق سے دو درویشوں کے ساتھ حضرت ابن العلاء رحمتہ اللہ علیہ کی زیارت کا قصد کیا۔ وہ مکہ مکرمہ کے ایک گاؤں میں رہتے تھے۔ ہم نے آپس میں طے کیا کہ ہر ایک اپنی آپ بیتی کا کوئی اہم واقعہ یاد کرے تا کہ وہ بزرگ ہمارے باطن کی ہمیں خبر دیں اور ہمارے اس واقعہ کی مشکلات کو حل کریں۔ چنانچہ میں نے دل میں خیال جمایا کہ میں حضرت حسین بن منصور حلاج رحمتہ اللہ علیہ کے اشعار کو حل کراؤں گا دوسرے درویش نے یہ خیال جمایا کہ میں اپنے مرض عظیم طحال کے لئے ان سے دعا کراؤں گا اور تیسرے نے یہ خیال جمایا کہ میں "صابونی حلوے" کی درخواست کروں گا۔ سوچتے ہوئے جب ہم سب ان کے پاس پہنچے تو انہوں نے حضرت حسین بن منصور حلاج کے اشعار کے حل پہلے ہی لکھوا رکھے تھے وہ میرے سامنے رکھ دیے اور اس درویش کے پیٹ پر دست مبارک پھیرا اور اس کی تلی جاتی رہی اور تیسرے درویش سے فرمایا چونکہ تم "صابونی حلوے" کی خواہش رکھتے ہو جو کہ عوام کی غذا ہے حالانکہ تم اولیاء کے لباس میں ملبوس ہو اور اولیاء کا لباس عوامی مطالبے اور خواہش کے ساتھ مطابقت نہیں رکھتا۔ لہٰذا تم دونوں میں سے ایک رخ اختیار کر لو۔

غرضکہ مقیم کو ایسے مسافر کی مدارات لازم نہیں جو حق تعالیٰ کے حقوق کی رعایت نہ کرے اور اپنی نفسانی لذتوں کو نہ چھوڑے۔ جب تک کوئی شخص اپنی لذت پر قائم ہے محال ہے کہ کوئی دوسرا شخص اس کی لذتوں کو پورا کرنے میں اس کی موافقت کرے۔ جب وہ اپنی لذتوں کو چھوڑ دے گا تب وہ اس لائق ہوگا کہ دوسرا اس کی لذت کو برقرار رکھے تا کہ دونوں اپنے اپنے حال میں راہ پر قائم رہیں اور راہزن نہ بنیں۔

احادیث میں مشہور واقعہ ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت سلمان فارسی اور حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ عنہما کے درمیان برادری قائم فرمائی تھی۔ یہ دونوں اصحابِ صفہ کے سرکردہ افراد میں سے تھے اور باطنی اسرار کے ائمہ و رؤساء میں سے تھے۔ ایک دن حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ، حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ کے گھر والوں کی مزاج پرسی کے لئے آئے تو گھر والوں نے حضرت سلمان رضی اللہ عنہ سے شکایت کی کہ یہ تمہارے بھائی ابوذر رضی اللہ

عنہ، نہ دن میں کچھ کھاتے ہیں اور نہ رات میں سوتے ہیں۔ حضرت سلمان رضی اللہ عنہ نے فرمایا کچھ کھانے کے لئے لاؤ۔ جب لایا گیا تو حضرت ابوذر سے کہا اے بھائی تمہیں زیبا یہ ہے کہ تم موافقت کرو اور میرے ساتھ کھانا کھاؤ۔ جب رات ہوئی تو کہا اے بھائی سونے میں بھی تم کو میرا ساتھ دینا چاہئے۔ ''اِنَّ لِجَسَدِكَ عَلَيْكَ حَقٌّ وَاِنَّ لِزَوْجِكَ عَلَيْكَ حَقٌّ وَاِنَّ لِرَبِّكَ عَلَيْكَ حَقٌّ'' کیونکہ تمہارے اوپر اپنے جسم کا بھی حق ہے تمہاری بیوی کا بھی حق ہے اور تمہارے رب کا بھی حق ہے۔ دوسرے دن حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ بارگاہ نبوی میں حاضر ہوئے تو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا میں بھی تم سے وہی کہتا ہوں جو کل سلمان نے تم سے کہا تھا کہ ''اِنَّ لِجَسَدِكَ عَلَيْكَ حَقٌّ، الخ''

حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ نے جب اپنی لذتوں کے چھوڑنے پر اقامت فرمائی تو حضرت سلمان نے انہیں ان کی لذتوں پر قائم کیا اور انہوں نے ان کی خاطر اپنے حق سے درگزر کیا۔ اسی اصل وقاعدے پر جو کچھ تم کرو گے صحیح و مستحکم ہوگا۔

مجھ پر ایک زمانہ ایسا گزرا ہے کہ میں ملک عراق میں دنیاوی مال کو جمع کرنے اور ان کو خرچ کرنے میں خوب اسراف کرتا تھا۔ جس کی وجہ سے مجھ پر قرض کا بار بہت زیادہ ہوگیا تھا۔ جسے جو ضرورت پیش آتی میرے پاس آجاتا اور میں اس کی ضرورتیں پوری کرنے میں تکلیفیں اٹھاتا تھا۔ اس زمانہ کے ایک بزرگ نے مجھے لکھا کہ اے فرزند! خیال رکھنا کہ تمہارا دل خدا سے غافل نہ ہو جائے۔ اپنے دل کو فارغ رکھنا۔ تم مشاغل میں پھنس گئے ہو۔ لہٰذا اگر کوئی دل اپنے سے زیادہ عزیز پاؤ تو جائز ہے کہ اس دل کی فراغت میں اپنے آپ کو مشغول کرلو ورنہ اس کام اور اس شغل سے دستکش ہو جاؤ۔ کیونکہ بندگان خدا کی کفالت خدا کے ذمہ ہے۔ اسی لمحہ میرے دل میں اس سے فراغت کا جذبہ پیدا ہوگیا۔

یہ مسافروں کے بارے میں مقیموں کے احکام تھے جو اختصاراً بیان کر دیئے ہیں۔

مسافرت کے آداب:

جب کوئی درویش اقامت چھوڑ کر سامان سفر اختیار کرے تو اس کے ادب کے احکام یہ

ہیں کہ اس کا سفر خدا کے لئے ہو نہ کہ نفسانی پیروی میں، جس طرح ظاہر میں سفر اختیار کیا ہے اسی طرح باطن میں بھی اپنی نفسانی خواہش کو ترک کر دے۔ ہمیشہ باوضو رہے اور اپنے اوراد و وظائف کو ترک نہ کرے۔ زیبا یہی ہے کہ اس کا سفر یا تو ادائے حج کے لئے ہو یا جہاد بالکفار کے لئے، یا کسی جگہ کی زیارت یا کہیں دینی فوائد کے حصول یا طلب علم یا کسی بزرگ یا شیخ کی ملاقات یا کسی شیخ کے مزار کی زیارت کے لئے ہو۔ ان کے سوا اگر کسی اور مقصد سے سفر ہوگا تو وہ سفر میں شمار نہ ہوگا۔

سامانِ سفر:

سفر کی حالت میں گدڑی، جانماز، لوٹا، جوتیاں اور عصا ضرور رکھنا چاہئے تاکہ گدڑی سے ستر پوشی کرے، مصلے پر نماز پڑھے، لوٹے سے طہارت و وضو کرے اور عصا سے مضر چیزوں کو دفع کرے۔ عصا کے فوائد اور بھی ہیں اور وضو کے بعد جوتیاں پہن کر جانماز تک آسکے۔ ان کے سوا سنت کی حفاظت کی خاطر دیگر چیزیں بھی سفر میں ساتھ رکھ سکتا ہے مثلاً کنگھا، ناخن تراش، سرمہ دانی وغیرہ، اور اگر ان کے سوا ایسا سامان بھی ساتھ رکھے جو زیب و زینت اور آرائش سے متعلق ہو تو وہ سوچے کہ کس مقام میں ہے اگر وہ منزل ارادت میں ہے تو اس کے لئے ان کے سوا سامان، قید، راہ کی بندش اور موجب حجاب ہوں گی اور اپنے نفس کی رعونت کے اظہار کا موجب بنے گی اور اگر وہ مقام تمکین و استقامت میں سے ہے تو اس کے لئے یہ سامان ہی نہیں بلکہ ہر چیز درست ہوگی۔

میں نے شیخ ابو مسلم فارس بن غالب فارسی رحمتہ اللہ علیہ سے سنا ہے کہ میں نے ایک دن حضرت شیخ ابو سعید ابوالخیر فضل اللہ بن محمد رحمتہ اللہ علیہ کی زیارت کو حاضر ہوا تو انہیں چار بالشت کے تختہ پر سوتا ہوا پایا اور ان کا پاؤں ایک دوسرے پر رکھا ہوا تھا وہ اس وقت مصری چادر اوڑھے ہوئے تھے اور میں ایسا لباس پہنے ہوئے تھا جو میلا ہو کر چمڑے کی مانند سخت ہو گیا تھا۔ جسم تھکن سے چور چور اور محنت و مشقت اور مجاہدے سے پیلا پڑ گیا تھا۔ میرے دل میں ان سے ملاقات نہ کرنے کا جذبہ ابھرا اور دل میں خیال گزرا کہ ایک درویش یہ ہیں جو اس طمطراق کے

ساتھ رہتے ہیں اور ایک میں درویش ہوں جو شکستہ حالی کے ساتھ بسر کر رہا ہوں یہ اتنے چین و راحت میں ہیں اور میں اس محنت و مشقت میں ہوں۔ وہ بیان کرتے ہیں کہ وہ بزرگ میری باطنی کیفیت سے باخبر ہو گئے اور میری نخوت کو انہوں نے ملاحظہ فرما لیا۔ مجھ سے فرمایا اے ابو مسلم! تم نے کون سی کتاب میں پڑھا ہے کہ اپنے کو دیکھنے والا درویش ہوتا ہے؟ جب میں نے ہر شئے میں جلوۂ الٰہی کا مشاہدہ کر لیا تو اسی نے مجھے تخت پر بٹھا دیا ہے اور جب کہ تم خود اپنے آپ کو دیکھنے ہی میں ابھی تک پڑے ہوئے ہو تو اس نے تمہیں محنت و مشقت میں ڈال رکھا ہے۔ میرے مقدر میں مشاہدہ ہے اور تمہارے مقدر میں مجاہدہ۔ یہ دونوں مقام راستہ کے مقامات میں سے ہیں۔ اللہ رب العزت اس سے پاک اور منزہ ہے۔ درویش وہی ہے جس کا مقام فنا ہو جائے اور وہ احوال سے گزر جائے شیخ ابو مسلم فرماتے ہیں کہ یہ سن کر میرے ہوش اڑ گئے اور سارا جہان مجھ پر تاریک ہو گیا۔ جب اپنے آپ میں آیا تو ان سے معذرت خواہی کی اور انہوں نے مجھے معاف فرما دیا۔ اس کے بعد میں نے عرض کیا اے شیخ! مجھے واپسی کی اجازت عطا فرمائیے۔ چونکہ آپ کے دیدار کی تابِ مقاومت نہیں رکھتا۔ انہوں نے فرمایا "صدقت یا ابا مسلم" ابو مسلم! تم نے ٹھیک کہا۔ اس کے بعد انہوں نے میری حالت کی تمثیل میں یہ شعر پڑھا۔

آنـــه پـوشـم نتو انست شنیدن بخبر هــمـه
چشـــم بـعـیـــان یـکـســره دیدآں بـبـصــر

"جو خبر میرے کان سن نہ سکے اسے میری آنکھ نے سر بسر ظاہر دیکھ لیا۔"

ہر مسافر پر لازم ہے کہ وہ ہمیشہ سنت کی حفاظت کرے اور جب وہ کسی مقیم کے یہاں پہنچے تو احترام کے ساتھ اس کے پاس جائے۔ اسے سلام کرے پھر بایاں قدم جوتی سے نکالے کیونکہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ایسا ہی کرتے تھے اور جب جوتی میں پاؤں ڈالے تو پہلے داہنا پاؤں ڈالے اس کے بعد دوسرا جب پاؤں دھوئے تو پہلے دایاں پھر بایاں، اور دو رکعت تحیۃ الوضوء کے پڑھے اس کے بعد درویشوں کے حقوق کی رعایت کی طرف متوجہ ہو۔

ایسا نہ چاہئے کہ مقیم کی کسی حالت پر اعتراض کرے یا کسی کے ساتھ زیادتی کرے خواہ معاملات سے متعلق ہو یا گفتگو سے اپنے سفر کی سختیوں کو بیان نہ کرے، نہ اپنے علم کو جتائے اور لوگوں کے سامنے حکایات و روایات بیان نہ کرے کیونکہ یہ باتیں اظہار رعونت کی موجب ہیں اور لازم ہے کہ جاہلوں کی باتوں کو برداشت کرے اور لوجہ اللہ ان کی زیادتیوں پر صبر کرے کیونکہ اس میں بڑی برکتیں ہیں اگر کوئی مقیم یا ان کا خادم اسے کوئی حکم دے یا ا سے کسی کو سلام کرنے یا کہیں کی زیارت کرنے کو کہا جائے تو جہاں تک ممکن ہو انکار نہ کرے۔ بایں ہمہ دنیا داری کی مروت نہ ہو۔

برادران طریقت کے افعال کی ہر ممکن تاویل و عذر کرے اور دل میں اپنی کسی حاجت کا رنج نہ آنے دے اور نہ مقیموں کو بادشاہوں کے دروازے پر لے جائے۔ مسافر و مقیم ہر حاجت اور اپنی تمام حالتوں میں رضائے الٰہی کا خواہاں رہے اور ایک دوسرے کے ساتھ حسن عقیدت رکھے۔ سب کو برابر جانے اور پیٹھ پیچھے کسی کی غیبت نہ کرے کیونکہ طالبانِ حق کے لئے فضول باتیں کرنا برا ہے اور بری بات کہنا تو بڑی بدنصیبی ہے۔ محققین فعل کی شکل میں فاعل کو دیکھتے ہیں۔ جب وہ مخلوق کو برا کہے گا تو اس سے خالق کی برائی لازم آئے گی۔ اگرچہ کوئی بندہ عیدار، محجوب اور بے مشاہدہ ہی کیوں نہ ہو۔ فعل پر جھگڑنا فاعل پر جھگڑنا ہوتا ہے۔ اگر انسانی آنکھ لوگوں پر پڑے تو وہ سب سے دور رہے اور جانے کہ ساری مخلوق مہجور و مجبور اور مغلوب و عاجز ہے کوئی شخص مشیت الٰہی کے بغیر کچھ نہیں کر سکتا اور جو کچھ وہ کرتا ہے وہ سب خدا کا ہی پیدا کردہ ہے۔ کسی مخلوق کو اس کی ملکیت میں تصرف کرنے کا حق نہیں ہے۔ کسی ذات پر خدا کے سوا کسی مخلوق کو مطلق تغیر و تبدل کی قدرت نہیں ہے۔

وباللہ التوفیق

آدابِ غذا:

واضح رہنا چاہئے کہ انسان کو غذا کے بغیر گزارہ نہیں کیونکہ بدن کا تقوم کھانے پینے کے بغیر ناممکن ہے۔ لیکن غذا کے استعمال کی شرط یہ ہے کہ اس میں مبالغہ نہ کرے اور نہ رات دن کھانے پینے کی فکر میں مشغول رہے۔ حضرت امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ:

من کان همته ما یدخل فی جوفه کان قیمة مایخرج منه
جو پیٹ میں داخل کرنے کی ہی فکر میں رہتا ہے اس کی قدر و قیمت وہ ہوتی ہے جو اس سے خارج ہوتا ہے۔

اسی لئے سالکانِ راہِ حق کے لئے بسیار خوری سے بڑھ کر کوئی چیز نقصان رساں نہیں۔ تفصیل بھوک کے باب میں گزر چکی ہے۔

حضرت بایزید بسطامی رحمتہ اللہ علیہ سے کسی نے پوچھا آپ بھوکے رہنے کی اتنی زیادہ تعریف کیوں فرماتے ہیں؟ آپ نے فرمایا اس لئے کہ اگر فرعون بھوکا رہتا تو ہر گز ''انا ربکم الاعلےٰ'' (میں تمہارا سب سے بڑا رب ہوں) نہ کہتا۔ اگر قارون بھوکا رہتا تو باغی نہ ہوتا۔ اور لومڑی چونکہ بھوکی رہتی ہے اس لئے ہر ایک اس کی تعریف کرتا ہے جب پیٹ بھر جاتا ہے تو نفاق پیدا ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کافروں کی حالت بیان کرتے ہوئے فرماتا ہے کہ:

ذَرْهُمْ يَاْكُلُوْا وَيَتَمَتَّعُوْا وَيُلْهِهِمُ الْاَمَلُ فَسَوْفَ يَعْلَمُوْنَ (الحجر:۳)
انہیں چھوڑ دو جو کھاتے اور عیش کرتے ہیں وہ اپنی خواہشوں میں مگن ہیں عنقریب وہ اپنا انجام جان لیں گے۔

نیز فرماتا ہے:

وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا يَتَمَتَّعُوْنَ يَاْكُلُوْنَ كَمَا تَاْكُلُ الْاَنْعَامُ وَالنَّارُ مَثْوًى لَّهُمْ (محمد:۱۲)
کافر لوگ عیش کرتے اور کھانے پینے میں ایسے ہی ہیں جیسے جانور کھاتے ہیں ان کا ٹھکانا جہنم ہے۔

حضرت سہل بن عبداللہ تستری رحمتہ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ میرے نزدیک پیٹ بھر کر حلال غذا کھانے کے مقابلہ میں شراب سے پیٹ کو پر کرنا زیادہ بہتر ہے۔ لوگوں نے پوچھا یہ کیسے؟ انہوں نے فرمایا اس لئے کہ شراب سے بھرا پیٹ، عقل کی طاقت سلب کر لیتا ہے شہوت کی آگ بجھا دیتا ہے اور بے ہوش ہو کر اس کی زبان و ہاتھ سے لوگ محفوظ ہو جاتے ہیں لیکن جب پیٹ حلال غذا سے پر ہو جاتا ہے تو بیہودہ تمنائیں، شہوت اور نفس اپنے مقدر کے حصول

میں سر اٹھاتے ہیں مشائخ طریقت نے ایسے ہی لوگوں کے بارے میں فرمایا ہے کہ:

اکلھم کا کل المرضٰی ونومھم کنوم الغرقی وکلامھم ککلام الشکلی	ان کا کھانا بیماروں کی طرح ان کی نیند گہری نیند والوں کے مانند ان کی گفتگو بچوں کی چیخ و پکار کے مانند ہوتی ہے۔

غذا کے شرط آداب میں سے یہ ہے کہ تنہا نہ کھائے اور جو کھائے دوسروں کو بھی اس میں شریک بنائے، کیونکہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ:

شَرُّالنَّاسِ مَنْ اَکَلَ وَحْدَهٗ وَضَرَبَ عَبْدَهٗ وَمَنَعَ وَفْدَهٗ	سب سے زیادہ برا شخص وہ ہے جو اکیلا کھائے۔ غلام کو مارے اور خیرات سے روکے رہے۔

جب دسترخوان پر بیٹھے تو خاموش نہ بیٹھے اور بسم اللہ پڑھ کر کھانا شروع کرے اور کوئی چیز اس طرح نہ رکھے اور نہ اٹھائے جسے لوگ ناپسند کریں، پہلا لقمہ نمکین غذا کا لے اور اپنے ساتھیوں کا لحاظ و پاس کرے۔ ایثار و انصاف سے کام لے۔

سہل بن عبداللہ رحمۃ اللہ علیہ سے کسی نے آیہ کریمہ "اِنَّ اللّٰہَ یَاْمُرُ بِالْعَدْلِ وَ الْاِحْسَانِ" (النحل: ۹۰) (اللہ تعالیٰ عدل و انصاف کا حکم دیتا ہے) کی تفسیر معلوم کی تو انہوں نے بتایا انصاف تو یہ ہے کہ اپنے ساتھی کو کھانے میں شریک کرے اور احسان یہ ہے ساتھی کے کھلانے کو خود پر افضل جانے۔

میرے شیخ و مرشد فرماتے ہیں کہ میں اس مدعی پر تعجب کرتا ہوں جو کہتا ہے کہ میں تارک دنیا ہوں اور حال یہ ہے کہ وہ کھانے کی فکر میں رہتا ہو۔

اس کے بعد لازم ہے کہ داہنے ہاتھ سے لقمہ لے اور اپنے لقمہ کے سوا کسی کی طرف نہ دیکھے۔ کھانے میں پانی کم پئے اور پانی اس وقت پئے جب سچی پیاس لگے اور اتنا پئے جس سے جگر تر ہو جائے اور لقمہ بہت بڑا نہ لے اور اسے خوب چبائے۔ کھانے میں جلدی نہ کرے کیونکہ ان باتوں سے بدہضمی پیدا ہوتی ہے اور سنت کے خلاف بھی ہے اور جب کھانے سے فارغ ہو

جائے تو حمد وشکر بجالائے اور ہاتھ دھوئے۔

اگر جماعت میں سے دو یا تین یا زیادہ افراد کو پوشیدہ طور پر کسی خاص چیز پر مدعو کریں اور چھپا کر کھلانا چاہیں تو بعض مشائخ فرماتے ہیں کہ یہ حرام ہے اور مصاحبوں کی خیانت ہے "اُولٰٓئِكَ مَا يَاكُلُوْنَ فِیْ بُطُوْنِهِمْ اِلَّا النَّارَ" (البقرہ:۱۷۴) یہی وہ لوگ ہیں جو اپنے پیٹوں میں آگ بھرتے ہیں اور بعض مشائخ فرماتے ہیں کہ جب سب اس پر متفق ہوں تو یہ جائز ہے اور بعض کہتے ہیں کہ اگر صرف ایک ہو تو جائز ہے کیونکہ اس کے لئے انصاف شرط نہیں ہے کیونکہ انصاف کی شرط تو ایک سے زیادہ افراد کے درمیان ہے اور جب وہ اکیلا ہو تو اس سے صحبت کے یہ آداب ساقط ہو جاتے ہیں اور بندہ اس میں ماخوذ نہیں ہوتا۔ اس میں مذہب کی سب سے بڑی بنیادی بات یہ ہے کہ کسی درویش کی دعوت کو رد نہ کرے اور کسی دنیادار کی دعوت کو قبول نہ کرے اور نہ ان کے گھر جائے اور نہ ان سے کچھ مانگے۔ کیونکہ اہل طریقت کے نزدیک یہ لعنت ہے، اس لئے کہ دنیا دار، درویش کے لئے محرم ہے اور وہ اس کا ہم جنس نہیں ہے۔ یہ یاد رکھنا چاہئے کہ انسان نہ تو سامان کی کثرت کی بناء پر دنیادار بنتا ہے اور نہ سامان کی قلت کی بناء پر درویش اور جو فقر کو تونگر پر فوقیت نہیں دیتا وہ دنیادار نہیں ہے اگرچہ بادشاہ ہو اور جو فقر کا منکر ہے وہ دنیادار ہے اگرچہ وہ مضطرب و بے قرار ہو اور جب کسی دعوت میں شریک ہو تو کسی چیز کے کھانے یا نہ کھانے میں تکلف نہ برتے اور وقت کے مطابق روش اختیار کرے۔ جب صاحب دعوت محرم ہو تو اسے جائز ہے کہ بچا ہوا کھانا گھر والوں کے لئے اٹھا لے اور اگر نامحرم ہے تو بچا ہوا کھانا گھر میں لے جانا جائز نہیں ہے۔ لیکن کسی حال میں پس خوردہ چھوڑنا بہتر نہیں ہے۔ کیونکہ حضرت سہل فرماتے ہیں کہ "الزلۃ ھی الذلۃ" پس خوردہ بچانا ذلت وکمینگی ہے۔ وباللہ التوفیق واللہ اعلم بالصواب۔

چلنے پھرنے کے آداب:

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: "وَعِبَادُ الرَّحْمٰنِ الَّذِيْنَ يَمْشُوْنَ عَلَى الْاَرْضِ هَوْنًا (الفرقان:۶۳)" رحمٰن کے بندے وہ ہیں جو زمین پر تواضع وانکسار سے چلتے ہیں طالب حق پر

لازم ہے کہ وہ رفتار میں ہمیشہ اس کا خیال رکھے کہ جو وہ قدم اٹھاتا ہے وہ اپنی طاقت سے اٹھاتا ہے یا خدا کی طاقت سے۔ اگر وہ یہ خیال کرے کہ اپنی طاقت سے ہے تو استغفار کرے۔ اور اگر اس پر یقین ہو کہ خدا کی دی ہوئی طاقت سے ہے تو اسے اس یقین پر مزید اضافہ کی کوشش کرنی چاہئے۔

حضرت داؤد طائی رحمتہ اللہ علیہ کا واقعہ ہے کہ ایک دن انہوں نے کوئی دوا کھائی لوگوں نے عرض کیا کہ کچھ دیر صحن میں تشریف رکھیں تا کہ دوا کا اثر و فائدہ ظاہر ہو آپ نے فرمایا خدا سے حیا کرتا ہوں کہ قیامت کے دن وہ مجھ سے پوچھے گا تو نے اپنے نفس کی خاطر چند قدم کیوں اٹھائے جیسا کہ اس کا ارشاد ہے "وَتَشْهَدُ اَرْجُلُهُمْ بِمَا كَانُوا يَكْسِبُوْنَ" (یٰسین: ۶۵) ان کے قدم گواہی دیں گے کہ وہ دنیا میں کیا کرتے تھے۔

درویش کو لازم ہے کہ بیداری میں سر جھکائے مراقبہ میں رہے اور کسی طرف نظر نہ اٹھائے۔ اگر راستہ میں کوئی شخص اس کے برابر سے گزرے تو بجز اپنے کپڑے بچانے کے کہ اس کے پاؤں کے نیچے نہ آئے (کیونکہ وہ ان کپڑوں سے نماز پڑھتا ہے) خود کو بچانے کی کوشش نہ کرے لیکن اگر یہ پتہ چل جائے کہ وہ شخص کافر ہے یا وہ نجاست میں آلودہ ہے تو اپنے آپ کو اس سے بچانا ضروری ہے۔

اور جب جماعت کے ساتھ چلے تو آگے بڑھنے کی کوشش نہ کرے۔ کیونکہ آگے بڑھ کر چلنا تکبر کی علامت ہے بہت پیچھے رہنے کی بھی کوشش نہ کرے کیونکہ اس میں تواضع کی زیادتی ہے۔ چونکہ زیادتی تواضع کو دیکھنا بھی عین تکبر ہے۔

کھڑاؤں اور جوتیوں کو جہاں تک ہو سکے ظاہری نجاست سے بچائے تا کہ اللہ تعالیٰ اس کی برکت سے رات میں اس کے کپڑوں کو محفوظ رکھے۔

جب کسی جماعت یا کسی ایک درویش کے ساتھ جا رہا ہو تو راستہ میں کسی اور سے بات کرنے کے لئے اسے محوِ انتظار نہ چھوڑ دے۔ رفتار میں میانہ روی کو ملحوظ رکھے نہ زیادہ آہستہ چلے اور نہ تیز دوڑ کر۔ آہستہ چلنا متکبروں کی علامت ہے۔ قدم پورا رکھے۔ غرضکہ ہر طالب حق کی

رفتار ایسی ہو کہ اگر کوئی اس سے پوچھے کہ کہاں جا رہے ہو تو وہ کامل دل جمعی کے ساتھ کہہ سکے کہ "انی ذاھب الی ربی سیھدین" میں خدا کی طرف جا رہا ہوں اسی نے میری رہنمائی فرمائی ہے۔ اگر اس کا چلنا ایسا نہ ہو تو یہ اس کے لئے موجب وبال ہوگا کیونکہ قدموں کی درستگی خطرات سے محفوظ رہنے کی نشانی ہے۔ جو اس درستگی کی فکر میں رہتا ہے حق تعالیٰ اس کے قدموں کو اس کے اندیشہ کا پیروکار بنا دیتا ہے۔

حضرت بایزید بسطامی رحمتہ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ بغیر مراقبہ کے درویش کا چلنا، غفلت کی نشانی ہے۔ کیونکہ وہ جس مقام پر ہوتا ہے دو قدم سے معلوم ہو جاتا ہے یعنی ایک اپنے نصیب پر قدم رکھتا ہے اور دوسرا فرمانِ الٰہی پر مطلب یہ ہے کہ وہ ایک مقام سے قدم اٹھاتا ہے اور دوسرے مقام پر قدم رکھتا ہے گویا طالب کی رفتار، مسافت کو طے کرنے کی علامت ہے اور قرب حق، مسافت نہیں ہے۔ جب اس کا قرب مسافت نہیں تو طالب کو محل سکون میں قدموں کے ذریعہ قطع مسافت کے بغیر کیا چارہ؟ واللہ ولی التوفیق

سفر و حضر میں سونے کے آداب:

واضح رہنا چاہئے کہ مشائخ طریقت کا اس معنی میں بہت اختلاف ہے۔ بایں ہمہ ہر گروہ کے نزدیک یہ بات مسلم ہے کہ غلبہ نیند کے بغیر سونا نہ چاہئے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ "النوم اخ الموت" نیند موت کی بہن ہے۔ لہٰذا زندگانی حق تعالیٰ کی نعمت ہے اور موت بلا۔ لامحالہ بلا کے مقابلہ میں نعمت اچھی چیز ہے۔ حضرت شبلی علیہ الرحمۃ فرماتے ہیں کہ:

اطلع الحق فقال علی من نام	اللہ تعالیٰ نے اپنی اطلاع میں مجھ سے فرمایا جو
غفل ومن غفل حجب	سویا وہ غافل ہوا اور جو غافل ہوا وہ محجوب رہا۔

ایک گروہ کے نزدیک جائز ہے کہ مرید بالقصد سوئے اور بجبر نیند کو لائے جبکہ وہ احکامِ الٰہی کو پورا کر چکا ہو۔ اس لئے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ:

رُفِعَ الْقَلَمُ عَنْ ثَلَاثٍ عَنِ النَّائِمِ حَتّٰى يَنْتَبِهَ وَعَنِ الصَّبِيِّ حَتّٰى يَحْتَلِمَ وَعَنِ الْمَجْنُوْنِ حَتّٰى يُفِيْقَ (دارمی)

تین شخصوں سے حکم الٰہی اٹھا لیا گیا ہے ایک سونے والے سے جب تک کہ وہ نہ جاگے۔ دوسرے بچے سے جب تک کہ وہ بالغ نہ ہو، تیسرے دیوانے سے جب تک اسے افاقہ نہ ہو۔

مطلب یہ کہ بندہ جب تک سوتا رہتا ہے بیدار ہونے تک قلم تقدیر اٹھا رہتا ہے۔ اور مخلوق اس کی برائی سے محفوظ رہتی ہے اور اس کے اختیارات معطل اور اس کا معزول نفس رہتا ہے اور کراماً کاتبین اس کا نامہ اعمال نہیں لکھتے۔ اس کی زبان دعوؤں، جھوٹ اور غیبت سے رکی رہتی ہے اور اس کا ارادہ عجب و ریا سے دور رہتا ہے۔ "لَا يَمْلِكُوْنَ لِاَنْفُسِهِمْ ضَرًّا وَّلَا نَفْعًا وَّلَا يَمْلِكُوْنَ مَوْتًا وَّلَا حَيٰوةً وَّلَا نُشُوْرًا" (الفرقان:۳) یعنی سونے والا اپنی جان کے نفع و نقصان، موت و حیات اور اٹھنے کا مالک نہیں رہتا۔ اسی بنا پر سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ:

لَا شَيْئَ اَشَدُّ عَلٰى اِبْلِيْسَ مِنْ نَوْمِ الْعَاصِيْ فَاِذَا نَامَ الْعَاصِيْ يَقُوْلُ مَتٰى يَنْتَبِهُ وَيَقُوْمُ حَتّٰى يَعْصِيَ اللّٰهَ

شیطان پر گنہگار کے سونے سے بڑھ کر کوئی چیز سخت نہیں۔ جب گنہگار سوتا ہے تو وہ کہتا ہے کب یہ اٹھے گا جو اٹھ کر خدا کی نافرمانی کرے گا۔

حضرت جنید بغدادی رحمتہ اللہ علیہ کو حضرت علی بن سہل اصفہانی سے اس مسئلہ میں اختلاف ہے۔ حضرت علی بن سہل نے حضرت جنید بغدادی رحمتہ اللہ علیہما کو ایک لطیف معنی کا خط لکھا۔ آپ نے اس سن کر اختلاف فرمایا۔ حضرت علی بن سہل نے اس خط میں اپنا مقصد اس طرح ظاہر فرمایا تھا کہ "نیند چونکہ غفلت و آرام کا موجب ہے لہٰذا اس سے بچنا ضروری ہے کیونکہ محب کو دن رات میں کبھی نیند و آرام کا ہوش نہیں ہوتا۔ اگر وہ سو جائے تو اپنے مقصود سے محروم رہ جاتا ہے۔ اس کی زندگانی غافل بن جاتی ہے اور حق تعالیٰ کے مشاہدے سے محروم رہ

جاتا ہے۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت داؤد علیہ السلام کو وحی فرمائی کہ "یَادَاوُدُ کَذَبَ مَنِ ادَّعٰی مَحَبَّتِی فَاِذَا جَنَّهُ اللَّیْلُ نَامَ عَنِّی" اے داؤد! وہ شخص میری محبت کے دعوے میں جھوٹا ہے جس پر رات کا اندھیرا چھا جائے اور وہ مجھ سے غافل ہو کر سو جائے اور میری محبت کو چھوڑ دے۔ حضرت جنید بغدادی رحمتہ اللہ علیہ نے اس خط کے جواب میں تحریر فرمایا کہ واضح رہنا چاہئے کہ ہماری بیداری، راہِ حق میں ہمارا معاملہ ہے اور ہماری نیند حق تعالیٰ کا ہم پر فعل ہے۔ لہٰذا ہماری بے اختیاری کی حالت میں جو کچھ ہم پر گزرتا ہے وہ سب ہم پر حق تعالیٰ کی طرف سے ہوتا ہے۔ ہماری طرف سے ہمارا اختیار حق تعالیٰ کے تحت تصرف میں ہے۔ "والنوم موهبة من الله تعالٰى علی المحبين" لہٰذا محبوبانِ خدا پر نیند کا غلبہ، حق تعالیٰ کا عطا کردہ ہے۔ اس مسئلہ کا تعلق صحو و سکر سے ہے اس جگہ یہ بات وضاحت سے کی جا چکی ہے۔ لیکن یہ بات حیرت کی ہے کہ حضرت جنید بغدادی رحمتہ اللہ علیہ جو کہ صاحب صحو مردِ خدا تھے اس جگہ انہوں نے سکر کی تقویت فرمائی۔ ممکن ہے کہ آپ اس وقت مغلوب الحال ہوں اور اسی حالت میں آپ نے یہ تحریر فرمایا ہو اور یہ بھی ممکن ہے کہ آپ کا مسلک اس کے برخلاف ہو کیونکہ نیند بنفسہٖ خود صحو ہے اور بیداری عین سکر۔ اس لئے کہ نیند آدمی کی صفت ہے اور جب تک آدمی اپنی صفتوں کے سایہ میں رہتا ہے تو وہ صحو کے ساتھ منسوب ہوتا ہے اور نہ سونا حق تعالیٰ کی صفت ہے۔ جب آدمی صفتِ حق کے سایہ میں ہوتا ہے تو وہ سکر کے ساتھ منسوب ہوتا ہے اور مغلوب الحال ہوتا ہے۔

میں نے مشائخ کی ایک جماعت دیکھی ہے جو نیند کو بیداری پر فضیلت دیتی ہے اور وہ حضرت جنید کے مسلک کی موافقت کرتی ہے کیونکہ بکثرت اولیاء، بزرگانِ دین اور انبیاء عظام علیہم السلام پر ہمیشہ نیند کا ظہور ہوتا تھا اور ہمارے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اللہ کا یہ ارشاد بیان فرمایا ہے کہ "اللہ تعالیٰ اس بندے پر اظہار خوشنودی فرماتا ہے جو بحالت سجدہ سو جاتا ہے۔ اور اپنے فرشتوں سے فرماتا ہے میرے بندے کی طرف دیکھو اس کی روح مجھ سے ہمراز ہے اور اس کا بدن عبادت کے فرش پر ہے۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ:

"مَنْ نَامَ عَلَى الطَّهَارَةِ يُوَذِّنُ لِرُوْحِهِ اَنْ يَّطُوْفَ بِالْعَرْشِ وَيَسْجُدُ اللّٰهَ تَعَالٰى"

"جو شخص باوضو سوئے اللہ تعالیٰ اس کی روح کو اجازت فرماتا ہے کہ وہ عرش کا طواف کرے اور وہاں اللہ تعالیٰ کو سجدہ کرے۔"

میں نے ایک حکایت میں دیکھا ہے کہ حضرت شاہ شجاع کرمانی رحمۃ اللہ علیہ چالیس سال بیدار رہے۔ پھر جب ایک رات سوئے تو خواب میں انہیں حق تعالیٰ کا دیدار ہوا۔ اس کے بعد وہ ہمیشہ اسی امید میں سوتے رہے۔ اسی معنی میں قیس عامری کا یہ شعر ہے:

وانی لا ستنعس وما لی نعیسة لعل خیالا منك یلقی خیالا

"میں بالقصد سوتا ہوں حالانکہ مجھے نیند نہیں آتی۔ شاید کہ خواب میں تیرے خیال سے ملاقات ہو جائے۔"

مشائخ کی ایک جماعت کو میں نے دیکھا ہے کہ وہ بیداری کو خواب پر فضیلت دیتے ہیں اور حضرت علی بن سہل کی موافقت کرتے ہیں۔ ان کی دلیل یہ ہے کہ انبیاء و مرسلین علیہم السلام کو وحی اور اولیاء کرام کو کرامتیں بیداری ہی میں ہوتی ہیں۔ ایک بزرگ فرماتے ہیں کہ:

لو کان فی النوم خیر الکان فی الجنة نوم — اگر نیند افضل ہوتی تو یقیناً جنت میں بھی سونا ہوتا۔

مطلب یہ کہ اگر نیند میں کوئی خوبی ہوتی تو جنت میں جو مقام قربت ہے وہاں نیند ضرور آتی۔ چونکہ جنت میں نہ حجاب ہے نہ نیند اس سے ظاہر ہے کہ نیند میں حجاب ہے۔

اربابِ لطائف فرماتے ہیں کہ حضرت آدم علیہ السلام کو جب نیند آئی تھی تو ان کے بائیں پہلو سے حوا کو پیدا فرمایا تھا اور ان کی تمام بلاؤں کا سرچشمہ یہی حوا تھیں، نیز فرماتے ہیں کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے جب حضرت اسمٰعیل علیہ السلام سے فرمایا "يٰبُنَيَّ اِنِّيْٓ اَرٰى فِي الْمَنَامِ اَنِّيْٓ اَذْبَحُكَ" (الصّٰفّٰت:۱۰۲) اے میرے فرزند میں نے خواب میں دیکھا ہے کہ میں تمہیں ذبح کر رہا ہوں تو حضرت اسمٰعیل علیہ السلام نے عرض کیا اے والد ماجد "ھٰذا

جزاء من نام عن حبيبه " یہ اپنے حبیب سے سو جانے کا بدلہ ہے۔ "لولم تنم لما امرت بذبح الولد " اگر آپ نہ سوتے تو آپ کو فرزند کے ذبح کرنے کا حکم نہ دیا جاتا۔ لہٰذا آپ کی نیند آپ کو بے اولاد اور مجھے بے جان بناتی ہے۔ اس کے سوا بوقت ذبح میری تکلیف تو ایک لحہ کے لئے ہوگی مگر بے اولاد ہونے کی تکلیف آپ کے لئے دائمی ہوگی۔

حضرت شبلی علیہ الرحمۃ کا واقعہ ہے کہ وہ ہر رات نمک کے پانی سے تر کر کے سلائی سامنے رکھ لیتے تھے جب نیند کا غلبہ ہوتا تو آنکھ میں وہ سلائی پھیر لیا کرتے تھے

حضور سیدنا داتا گنج بخش رحمتہ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ میں نے ایک بزرگ کو دیکھا کہ جب وہ فرائض کی ادائیگی سے فارغ ہوتے تو سو جاتے تھے۔ میں نے شیخ احمد سمرقندی کو بخارا میں دیکھا کہ وہ ایک سال تک رات بھر نہیں سوئے۔ دن میں کچھ دیر کے لئے سو جاتے تھے اس میں بھی اس سے رجوع ان کا مقصد تھا اس لئے کہ جسے زندگی کے مقابلہ میں موت زیادہ عزیز ہو تو ظاہر ہے کہ اسے بیداری کے مقابلہ میں نیند پیاری ہوگی اور جسے موت کے مقابلہ میں زندگی زیادہ عزیز ہو اس کے لئے زیبا ہے کہ وہ نیند کے مقابلہ میں بیداری کو زیادہ عزیز رکھے۔ لہٰذا جو تکلف سے بیدار رہے اس کی کوئی قدر و قیمت نہیں بلکہ قدر و قیمت تو اس کی ہے جو اسے بیدار رکھے جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے حبیب صلی اللہ علیہ وسلم کو برگزیدہ فرما کر بلند تر مقامات پر فائز فرمایا۔ آپ نے نہ نیند میں تکلف فرمایا اور نہ بیداری میں۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا "قُمِ الَّيْلَ اِلَّا قَلِيْلًا نِصْفَهٗ" (المزمل: ۲-۳) رات کو کم قیام فرمایئے بلکہ آدھی رات تک۔

اس کی کوئی قدر و قیمت نہیں ہے جو نیند میں تکلف برتے اور بیداری کی مشقت اٹھائے۔ اللہ تعالیٰ نے اصحاب کہف کو برگزیدہ فرمایا اور انہیں مقام اعلیٰ پر پہنچایا ان کی گردن سے کفر کا لباس اتار او وہ نہ نیند کا تکلف کرتے تھے نہ بیداری کا۔ یہاں تک کہ حق تعالیٰ نے ان پر ایسی نیند طاری فرمائی کہ ان کے اختیار کے بغیر اللہ تعالیٰ ان کی پرورش فرماتا ہے جیسا کہ ارشاد ہے:

وَتَحْسَبُهُمْ اَيْقَاظًا وَّهُمْ رُقُوْدٌ وَّنُقَلِّبُهُمْ ذَاتَ الْيَمِيْنِ وَذَاتَ الشِّمَالِ (الکہف: ۱۸)

تم گمان کرتے ہو کہ وہ جاگ رہے ہیں حالانکہ وہ سوئے ہوئے ہیں اور اللہ تعالیٰ ان کو داہنے اور بائیں پہلو بدلتا ہے (اور وہ خواب و بیداری دونوں حالتوں میں بے اختیار ہیں)۔

جب بندہ اس درجہ پر فائز ہو جائے کہ اس کا اختیار جاتا رہے اور اپنے کھانے پینے سے دست کش ہو جائے اور اس کی تمام ہمتیں غیر سے جدا ہو جائیں پھر اگر وہ سوئے یا جاگے ہر حال میں عزیز ہوتا ہے۔ لہٰذا مرید کے لئے نیند کی شرط یہ ہے کہ اپنی پہلی نیند کو اپنی عمر کی آخری نیند جانے۔ گناہوں سے بچے اور دشمنوں کو راضی کرے۔ طہارت کے ساتھ رہے داہنے پہلو پر قبلہ رو ہو کر سوئے۔ دنیاوی کام ٹھیک رکھے۔ نعمت اسلام کا شکر بجا لائے اور عہد کرے کہ اگر بیدار ہوا تو پھر گناہوں میں مبتلا نہ ہوگا۔ جو شخص اپنی بیداری میں کاموں کو درست رکھتا ہے اس کے لئے نیند ہو یا موت دونوں میں کوئی خطرہ نہیں ہے۔

ایک بزرگ ایک ایسے امام کے پاس جایا کرتے تھے جو مرتبہ وعزتِ نفس کی رعونت میں مبتلا تھا وہ بزرگ اس سے کہتے تھے اے فلاں شخص تجھے مرجانا چاہئے اس کلمہ سے اس امام کا دل رنجیدہ ہوا کرتا تھا اور کہا کرتا یہ گروہ ہمیشہ مجھ سے یہی کہتا رہتا ہے۔ کل میں اس کے کہنے سے پہلے یہ کلمہ اس سے کہوں گا۔ چنانچہ جب پھر وہ بزرگ اس کے پاس آئے تو اس امام نے کہا، تمہیں مرجانا چاہئے۔ اس بزرگ نے مصلّے کو بچھایا سر کو زمین پر رکھا اور کہا میں مرتا ہوں اور اسی وقت اس بزرگ کی روح پرواز کر گئی۔ اس واقعہ میں امام کو یہ تنبیہہ تھی کہ وہ جان لے کر یہ بزرگ جو مر جانے کو کہا کرتے تھے خود بھی مرنے سے نہیں ڈرتے۔

میرے شیخ رحمتہ اللہ علیہ اپنے مریدوں کو اس کی ہدایت فرمایا کرتے تھے کہ نیند کے غلبہ کے وقت سونا چاہئے اور جب بیدار ہو جائے تو دوبارہ سونا مریدوں کے لئے حرام ہے۔ چونکہ بندے کو نیند غفلت لاتی ہے۔ اس معنی میں بحث طویل ہے اسی پر اکتفا کرتا ہوں۔ واللہ اعلم

ہیں میں عالم الغیب ہوں۔

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ "من سکت نجی" جو خاموش رہا اس نے نجات پائی۔ لہٰذا خاموشی میں بہت فوائد ہیں اور اس میں بہت فتوحات ہیں اور بولنے میں بکثرت آفت۔

مشائخ طریقت کی ایک جماعت بولنے پر سکوت کو افضل سمجھتی ہے اور ایک جماعت خاموشی پر بولنے کو ترجیح دیتی ہے۔

حضرت جنید بغدادی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ الفاظ وعبارات سراسر دعاوی ہیں۔ جس وقت معانی کا اثبات ہو جاتا ہے تو الفاظ وعبارات والے دعاوی جاتے رہتے ہیں۔ ایک وقت ایسا بھی آتا ہے کہ انسان اختیاری حالت میں سقوط کلام میں معذور ہو جاتا ہے۔ یعنی بحالت بقا خوف کی وجہ سے۔ باوجود بولنے پر قادر ہونے کے وہ بول نہیں سکتا۔ اس کا نہ بولنا، معرفت حقیقت میں کوئی حرج پیدا نہیں کرتا۔ اور کسی وقت بندہ بے معنی محض خالی دعووں میں معذور نہیں ہوتا اس کا حکم منافقوں کی مانند ہو جاتا ہے۔ لہٰذا بے معنی دعوٰی نفاق ہے اور بے دعوٰی معنی اخلاص پر مبنی ہے۔ کیونکہ جس بندے کے لئے راستہ کھل جاتا ہے وہ گفتار سے بے نیاز ہو جاتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ جس معنی کی وہ خبر دے گا اس کے الفاظ وعبارت سب غیر ہوں گے اور حق تعالیٰ بے نیاز ہے کہ احوال کی تعبیر وتفسیر کسی غیر کے ذریعہ کرائے۔ اس کا غیر اس لائق نہیں کہ اس کی طرف التفات کیا جائے۔ حضرت جنید بغدادی رحمۃ اللہ علیہ اپنی تائید میں فرماتے ہیں کہ "من عرف اللہ کل لسانہٗ" جس نے حق تعالیٰ کو دل سے پہچان لیا اس کی زبان، بیان سے عاجز ہو گئی کیونکہ اظہار بیان میں حجاب دکھائی دیتا ہے۔

حضرت شبلی علیہ الرحمۃ کا واقعہ ہے کہ ایک مرتبہ انہوں نے حضرت جنید رحمۃ اللہ علیہ کی مجلس میں کھڑے ہو کر نعرہ مارا کہ "یا مرادی" اور حق تعالیٰ کی طرف اشارہ کیا حضرت جنید رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا اے ابوبکر اگر تمہاری مراد حق ہے تو یہ اشارہ کیوں ہے کیونکہ وہ اس سے بے نیاز ہے اور اگر تمہاری مراد حق نہیں ہے تو تم نے خلاف کیوں کیا۔ حق تعالیٰ تمہارے قول

کے بموجب علیم ہے۔ حضرت شبلی علیہ الرحمتہ نے اپنے کلام پر توبہ واستغفار کیا۔

وہ جماعت جو بولنے کو خاموشی پر ترجیح دیتی ہے ان کا کہنا ہے کہ حق تعالیٰ نے ہمیں اپنے احوال کو بیان کا حکم دیا ہے۔ کیونکہ دعویٰ معنی کے ساتھ قائم ہے مثلاً اگر کوئی حق تعالیٰ کی معرفت، عقل وخرد سے ہزار برس تک رکھے اور کوئی امر مانع بھی نہ ہو تو جب تک اپنی معرفت کا اقرار زبان سے نہ کرے اس کا حکم کافروں جیسا ہوگا۔ اللہ تعالیٰ تمام مسلمانوں کو حمد وثنا اور شکر خدا بجالانے کا حکم دیتا ہے اس نے اپنے حبیب صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم دیا ''وَاَمَّا بِنِعْمَتِهِ رَبِّكَ فَحَدِّثْ '' (الضحیٰ:۱۱) اپنے رب کی نعمتوں کو اچھی طرح بیان کرو۔ حمد وثنا اور بیانِ نعمت بندے کا کلام ہوتا ہے لہٰذا ہمارا ذکر کرنا حکم خدا کی تعظیم اور بجا آوری کے لئے ہے۔ اللہ تعالیٰ کا حکم ہے کہ ''اُدْعُوْنِیْٓ اَسْتَجِبْ لَكُمْ '' (المؤمن:۶۰) مجھ سے دعا مانگو میں قبول کروں گا۔ نیز فرمایا ''اُجِیْبُ دَعْوَةَ الدَّاعِ اِذَا دَعَانِ '' (البقرہ:۱۸۶) میں دعا مانگنے والے کی دعا قبول کرتا ہوں جب وہ مجھ سے دعا مانگے۔ ان کے سوا بے شمار آیات اس کی دلیل ہیں۔

ایک بزرگ فرماتے ہیں کہ جس کو اپنے حال کے بیان کی قدرت نہ ہو وہ بے حال ہے اس لئے کہ گویائی کا وقت بھی تو ایک وقت وصال ہوتا ہے جیسا کہ شاعر کہتا ہے:

لسان الحال افصح من لسانی
وصمتی عن سوالی ترجمانی

میری زبان سے زیادہ فصیح میرے حال کی زبان ہے
اور میرے سوال کی ترجمانی میری خاموشی کر رہی ہے

ایک مرتبہ حضرت ابوبکر شبلی علیہ الرحمتہ بغداد سے کرخ تشریف لے گئے انہوں نے ایک مدعی کو یہ کہتے سنا کہ ''السکوت خیر من الکلام'' خاموشی، بولنے سے بہتر ہے۔ اس پر حضرت شبلی نے فرمایا ''سکوتك خیر من کلامك و کلامی خیر من سکوتی '' تیرا خاموش رہنا تیرے بولنے سے بہتر ہے اور میرا بولنا میرے خاموش رہنے سے بہتر ہے ''لان کلامك لغو وسکوتك هزام و کلامی خیر من سکوتی لان سکوتی حلم

وکلامی علم " کیونکہ تیرا بولنا لغو ہے اور تیری خاموشی ٹھٹھا اور میرا بولنا خاموشی سے اس لئے بہتر ہے کہ میری خاموشی میں حلم و بردباری اور کلام میں علم و دانائی ہے۔

قولِ فیصل:

حضور سیدنا داتا گنج بخش رحمتہ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ کلام دو طرح کا ہوتا ہے اسی طرح خاموشی بھی دو طرح کی ہوتی ہے۔ ایک کلام حق اور ایک کلام باطل۔ اسی طرح ایک سکوت، مقصود و مشاہدہ کے حاصل ہونے کے بعد اور ایک غفلت و حجاب کی حالت میں۔ ہر شخص کو گفتار و سکوت کی حالت میں اپنے گریبان میں منہ ڈال کر دیکھنا چاہئے کہ اگر اسی کا بولنا حق ہے تو اس کا بولنا اس کی خاموشی سے بہتر ہے اور اگر اس کا بولنا باطل ہے تو اس کی خاموشی اس کے بولنے سے بہتر ہے اور اگر حجاب و غفلت کی بنا پر ہو تو بھی بولنا خاموشی سے بہتر ہے ایک جہان اس کے معنی میں حیران و سرگرداں ہے۔

کچھ لوگ ایسے ہیں جنہوں نے اپنی ہوس میں معانی سے خالی الفاو عبارت کو اپنا رکھا ہے اور کہتے پھرتے ہیں کہ بولنا خاموشی سے افضل ہے۔

اور کچھ لوگ ایسے ہیں جو گہرائی کے مقابلہ میں مینارہ تک کو نہیں جانتے اور اپنی جہالت کی وجہ سے خاموش رہتے ہیں ان کا کہنا ہے کہ خاموشی، بولنے سے بہتر ہے۔ یہ دونوں گروہ ایک دوسرے کی مانند ہیں کسے گویا کہیں اور کسے خاموش؟ "**من نطق اصاب او غلط ومن انطق عصم من الشطط** " جو بولتا ہے۔ یا تو وہ صحیح ہو گا یا غلط اور جو بولا جاتا ہے اسے خطا و خلل سے بچایا جاتا ہے۔ چنانچہ ابلیس علیہ اللعنۃ نے کہا "اَنَا خَيْرٌ مِّنْهُ" (الزمر:٧٦) میں آدم علیہ السلام سے بہتر ہوں (معاذ اللہ) اور حضرت آدم علیہ السلام سے یہ کہلوایا گیا کہ "رَبَّنَا ظَلَمْنَا اَنْفُسَنَا" (الاعراف:٢٣) اے ہمارے رب ہم نے اپنی جانوں پر ظلم کیا۔

لہذا مشائخِ طریقت، اپنی گویائی میں اجازت یافتہ اور بے قرار ہیں اور اپنی خاموشی میں شرم زدہ اور مجبور ہیں۔ "**من کان سکوته حیا کان کلامه حیوة** " جس کی خاموشی شرم سے ہو اس کا کلام دعویٰ کی زندگی ہے۔ ان کا کلام دیدار سے ہے اور جو کلام بغیر دیدار کے

ہو وہ موجب ذلت و رسوائی ہے۔ ایسے وقت نہ بولنا بولنے سے افضل ہے تا کہ اپنے آپ میں رہیں اور جب غائب ہو جاتے ہیں تو لوگ ان کے قول کو جان سے زیادہ عزیز رکھتے ہیں۔ ایک بزرگ فرماتے ہیں کہ:

من کان سکوته له ذهبا کان	جس کے لئے خاموشی سونا ہو تو اس کا کلام
کلامه لغیره مذهبا	دوسروں کے لئے مذہب ہوتا ہے۔

لہٰذا طالب حق پر لازم ہے کہ اگر اس کی فکر و غور بندگی میں ہو تو خاموش رہے تا کہ اس کی زبان جب بولے تو ربوبیت کے ساتھ بولے۔

اور اسی کی بات کہے اور اس کے الفاظ و عبارت مریدوں کے دلوں کو متاثر کر سکیں۔ بات کرنے کا ادب یہ ہے کہ بے حکم نہ بولے اور اتنا ہی جواب دے جو ضروری ہو خاموشی کا ادب یہ ہے کہ وہ جاہل نہ ہو اور نہ جہالت پر راضی ہو غفلت میں نہ رہے۔

مرید پر لازم ہے کہ مشائخ کے کلام میں دخل نہ دے اور نہ اس میں تصرف کرے اور سنسنی خیز باتیں نہ بیان کرے۔ اس زبان کو جس سے کلمہ شہادت پڑھا اور توحید کا اقرار کیا ہے اس کو غیبت اور جھوٹ سے پاک و صاف رکھے۔ مسلمانوں کو رنج نہ پہنچائے اور درویشوں کو صرف ان کے نام سے نہ پکارے اور جب تک کوئی ان سے معلوم نہ کرے خود کچھ نہ بولے۔ بات کرنے میں پہل نہ کرے اور اس درویش پر خاموشی لازم ہے جو باطل پر خاموش نہ رہ سکے۔ گفتگو کی شرط یہ ہے کہ حق کے سوا دوسری بات نہ کرے۔ اس کی اصل و فرع اور لطائف بہت ہیں بخوف طوالت اسی پر اکتفا کرتا ہوں۔ واللہ اعلم بالصواب۔

سوال کے آداب:

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے "لَا يَسْئَلُوْنَ النَّاسَ اِلْحَافًا" (البقرہ:۲۷۳) لوگوں سے گڑگڑا کر سوال نہ کرو۔ اور جب کوئی سوال کرے تو منع نہ کرو۔

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے اللہ تعالیٰ نے فرمایا "وَاَمَّا السَّآئِلَ فَلَا تَنْهَرْ" (الضحیٰ:۱۰) سائل کو نہ جھڑکو۔ جہاں تک ممکن ہو خدا کے سوا کسی سے سوال نہ کرو۔ اس لئے کہ غیر

خدا کو سوال کا محل نہیں بنایا گیا ہے۔ سوال سے غیر خدا کی طرف التفات پایا جاتا ہے۔ جب بندہ خدا سے روگرداں ہوتا ہے تو اس کا قوی اندیشہ ہوتا ہے کہ اسے محل اعراض میں نہ چھوڑ دیا جائے۔

کسی دنیا دار نے حضرت رابعہ عدویہ رحمتہ اللہ علیہا سے کہا اے رابعہ مجھ سے مانگو میں تمہیں دوں گا۔ انہوں نے جواب دیا اے شخص، جبکہ میں دنیا کے پیدا کرنے والے سے حیا کرتی ہوں کہ دُنیا اس سے مانگوں، تو کیا اپنے جیسے سے مانگنے میں مجھے شرم نہ آئے گی۔؟

منقول ہے کہ ابو مسلم کے زمانہ میں کسی صاحب دعوت نے ایک درویش کو بے گناہ چوری کے الزام میں پکڑوا دیا۔ چار راتیں اسے قید خانہ میں رہنا پڑا۔ ایک رات ابو مسلم نے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو خواب میں دیکھا۔ آپ نے فرمایا اے ابو مسلم! مجھے خدا نے تمہارے پاس بھیجا ہے کہ اس کے دوست کو بے جرم قید خانہ میں ڈلوا دیا ہے۔ جاؤ اسے آزاد کرو۔ ابو مسلم خواب سے بیدار ہوئے اور ننگے سر اور ننگے پاؤں قید خانہ دوڑتے ہوئے گئے حکم دیا کہ قید خانہ کا دروازہ کھول دیا جائے اور اس درویش کو باہر لے کر آئے اس سے معافی مانگی اور کہا کوئی حاجت ہو تو بیان کرو۔ درویش نے کہا اے امیر، جس خدا کی شان یہ ہو کہ وہ آدھی رات کے وقت ابو مسلم کو بستر سے جگا کر بھیجے اور بلا سے نجات دلائے کیا اس کے بندے کے لئے زیبا ہے کہ وہ دوسروں سے سوال کرے۔؟ ابو مسلم رونے لگے اور درویش کے سامنے سے ہٹ گئے۔

ایک جماعت کے نزدیک درویش کا سوال کرنا جائز ہے کیونکہ حق تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ لوگوں سے گڑگڑا کر سوال نہ کرو اس میں اشارہ ہے کہ سوال تو کرو مگر گڑگڑاؤ نہیں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے خود صحابہ کی ضروریات پوری کرنے کے لئے صاحب ہمت کو ترجیح دی ہے اور ہمیں بھی ارشاد فرمایا کہ:

اُطْلُبُوا الْحَوَائِجَ عِنْدَ حِسَانِ الْوُجُوْهِ — اپنی ضرورتوں کے لئے خوب صورت چہرہ والوں سے سوال کیا کرو۔

مشائخ طریقت فرماتے ہیں کہ تین باتوں کے لئے سوال جائز ہے ایک یہ کہ دل کی

فراغت کے لئے سوال ضروری ہے چنانچہ وہ کہتے ہیں کہ ہم دو روٹیوں کی قیمت بھی نہیں رکھتے اور دن رات اس کا انتظار کرتے ہیں اور ہماری اضطراری و بے قراری کی حالت میں اللہ تعالیٰ سے اس کے سوا کوئی حاجت نہیں ہوتی اس لئے کہ کھانے کے انتظار کی مشغولیت سے بڑھ کر اور کوئی مشغولیت نہیں ہوتی۔ اسی بنا پر جب حضرت بایزید بسطامی رحمتہ اللہ علیہ نے اپنے مرید شفیق کی بابت دریافت کیا جب کہ وہ مرید زیارت کے لئے آیا تھا۔ اس نے بتایا کہ شفیق کا حال یہ ہے کہ وہ لوگوں سے کنارہ کش ہو گئے ہیں اور توکل اختیار کر لیا ہے۔ حضرت بایزید رحمتہ اللہ علیہ نے فرمایا جب تم جاؤ تو شفیق سے کہنا کہ دیکھو دو روٹی کی خاطر خدا کو نہ آزمانا جب بھوکے ہو تو کسی ہم جنس سے دو روٹی مانگ لینا اور توکل کے نام کو ایک طرف رکھ دینا تا کہ تمہارے ولایت کا محل اپنے معاملہ کی بدبختی سے زمین پر نہ آجائے اور تباہ و برباد نہ ہو جائے۔

سوال کی دوسری غرض یہ ہے کہ نفس کی ریاضت کے لئے سوال کیا جائے تا کہ نفس ذلیل و خوار ہو سکے اور رنجیدہ ہو کر اپنی قدر و قیمت پہچانے کہ دوسروں کی نظر میں اس کی کیا منزلت ہے اور دوبارہ تکبر کر کے مصیبت میں نہ ڈالے۔

حضرت جنید بغدادی رحمتہ اللہ علیہ کے پاس جب حضرت ابوبکر شبلی رحمتہ اللہ علیہ آئے تو حضرت جنید نے فرمایا اے ابوبکر تمہارے دماغ میں ابھی تک یہ گھمنڈ ہے کہ میں خلیفہ کے خاص الخاص کا فرزند ہوں اور سامرہ کا امیر ہوں یہ تمہارے کام نہ آئے گا جب تک کہ تم بازار میں جا کر ہر ایک کے سامنے دست سوال نہ پھیلاؤ گے اس وقت تک اپنی قدر و قیمت نہ جان سکو گے چنانچہ انہوں نے ایسا ہی کیا روزانہ بازار میں ان کی قدر و قیمت گھٹتی گئی یہاں تک کہ چھ سال میں اس حال کو پہنچ گئے کہ انہیں بازار میں کسی نے کچھ نہ دیا۔ اس وقت حضرت جنید رحمتہ اللہ علیہ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور سارا حال بیان کیا۔ آپ نے فرمایا اے ابوبکر اب تم اپنی قدر و قیمت کو پہچانو کہ لوگوں کی نظر میں تمہاری کوئی قیمت نہیں ہے لہٰذا تم ان لوگوں کو دل میں جگہ نہ دو اور ان کی کچھ منزلت نہ سمجھو۔ یہ معنی ریاضت کے لئے تھے نہ کہ کسب کے لئے۔ کسب کے طریق پر سوال کسی طرح حلال نہیں ہے۔

حضرت ذوالنون مصری رحمتہ اللہ علیہ بیان کرتے ہیں کہ میرا ایک رفیق تھا، اللہ تعالیٰ نے اسے بلا لیا اور دنیاوی نعمت سے اخروی نعمتوں میں پہنچا دیا۔ میں نے اسے خواب میں دیکھا تو اس سے پوچھا کہ اللہ تعالیٰ نے تمہارے ساتھ کیا کیا؟ اس نے کہا مجھے بخش دیا ہے۔ میں نے پوچھا کس بنا پر؟ اس نے کہا اللہ تعالیٰ نے مجھے اٹھا کر فرمایا اے میرے بندے، تو نے بخیلوں اور کمینوں کی بڑی اذیتیں برداشت کیں ہیں۔ تو نے ان کے آگے ہاتھ پھیلایا پھر صبر سے کام لیا۔ اس لئے تجھے بخشتا ہوں۔

سوال کی تیسری غرض یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی حرمت میں لوگوں سے سوال کرے اور تمام دنیاوی اموال کو خدا ہی کا جانے اور ساری مخلوق کو اس کا وکیل سمجھے اور جو اپنے نصیب کی ہو اسے خدا کے وکیلوں سے حاصل کرے۔ سوال تو لوگوں سے ہو لیکن نظر حق تعالیٰ کی طرف، جب بندہ خود کو ایسا بنا لیتا ہے تو حرمت الٰہی میں وکیل سے جو مانگتا ہے وہ طاعت میں حق تعالیٰ سے زیادہ قریب ہو جاتا ہے لہٰذا ایسوں کا غیر سے سوال کرنا حق تعالیٰ سے اپنے حضور توجہ کی نشانی ہے نہ یہ غیبت ہے اور نہ حق تعالیٰ سے روگردانی۔

حضرت عیسیٰ بن معاذ رحمتہ اللہ علیہ کی ایک لڑکی تھی۔ ایک دن لڑکی نے اپنی ماں سے کہا مجھے فلاں چیز کھلایئے۔ اس کی والدہ نے کہا۔ خدا سے مانگو۔ لڑکی نے کہا مجھے شرم آتی ہے کہ میں اپنی نفسانی خواہش کے لئے خدا سے سوال کروں۔ تم جو کچھ دو گی وہ بھی اسی کی جانب سے ہوگا اور وہ میری تقدیر کا حصہ ہوگا۔

سوال کے آداب یہ ہیں کہ اگر سوال، پورا ہو جائے تو اس سے زیادہ کی خواہش نہ کرنی چاہئے۔ لوگوں کو حق تعالیٰ کے درمیان نہ دیکھے حق تعالیٰ ہی کی طرف نظر رکھے۔ عورتوں اور بازار والوں سے سوال نہ کرے۔ اپنا راز اسی سے کہے جس پر اعتماد ہو کہ اس کا مال حلال ہے کسی پر ظاہر نہ کرے۔ جہاں تک ہو سکے اپنے نصیب پر سوال نہ کرے وہ تو اسے پہنچنا ہی ہے۔ سوال کرتے وقت گھر کی آرائش کو ملحوظ نہ رکھے اور نہ اسے اپنی ملکیت جانے بلکہ ضرورت وقت کا تقاضہ سمجھے۔ کل کی فکر آج نہ کرے تاکہ دائمی ہلاکت میں نہ پڑے۔ حق تعالیٰ کو اپنی گدائی کا

ذریعہ نہ بنائے اور نہ ایسی پارسائی جتائے کہ پارسائی کی وجہ سے لوگ زیادہ دیں۔

ایک صاحب مرتبہ بزرگ کو میں نے دیکھا کہ وہ بیابان سے فاقہ زدہ اور سفر کی صعوبتیں اٹھائے ہوئے بازار کوفہ میں پہنچا۔ اس کے ہاتھ میں ایک چڑیا تھی اور آواز لگاتا تھا کہ مجھے اس چڑیا کی خاطر کچھ دے دو؟ لوگوں نے کہا، اے شخص یہ کیا کہتے ہو؟ اس نے کہا یہ محال ہے کہ میں یہ کہوں کہ مجھے خدا کی راہ پر کچھ دے دو۔ دنیا کے لئے ادنیٰ چیز ہی کا وسیلہ لایا جا سکتا ہے۔ چونکہ دنیا قلیل ہے۔ طوالت کی وجہ سے اسی پر اکتفا کرتا ہوں۔ واللہ اعلم

نکاح اور مجرّد رہنے کے آداب:

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ”هُنَّ لِبَاسٌ لَّكُمْ وَأَنْتُمْ لِبَاسٌ لَّهُنَّ“ (البقرہ:۱۸۷)

بیویاں تمہارے لباس ہیں اور تم بیویوں کے لباس ہو۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

تَنَاكَحُوْا تُكَثِّرُوْا فَإِنِّي اُبَاهِيْ بِكُمُ الْأُمَمَ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ وَلَوْ بِالسِّقْطِ

مسلمانو! نکاح کرو اور اولاد کی کثرت کرو کیونکہ روزِ قیامت تمہارے ذریعہ اپنی امت کی کثرت پر فخر کروں گا۔ اگرچہ حمل کا سقوط ہی کیوں نہ ہو۔

نیز فرمایا:

اِنَّ عَظَمَ النِّسَاءِ بَرَكَةً اَقَلُّهُنَّ مَئُوْنَةً وَّاَحْسَنُهُنَّ وُجُوْهًا وَاَحْصَنُهُنَّ فُرُوْجًا

سب سے بڑی برکت والی بیوی وہ ہے جس کا بوجھ کم ہو اور وہ حسین چہرے والی اور عصمت کی حفاظت کرنے والی ہو۔

احادیث صحیحہ میں وارد ہے کہ تمام مرد و عورت پر ہر حال میں نکاح ہے۔ ہر مرد و عورت پر فرض ہے کہ حرام سے بچے اور سنت یہ ہے کہ جہاں تک ہو سکے عیال کے حقوق کو پورا کرے۔

مشائخ کی ایک جماعت فرماتی ہے کہ شہوت کو دور کرنے اور دل کی فراغت حاصل کرنے کے لئے نکاح کرنا چاہئے اور ایک جماعت یہ کہتی ہے کہ نسل کو قائم رکھنے کے لئے نکاح کرنا ضروری ہے تاکہ اولاد ہو۔ اگر اولاد باپ کے سامنے فوت ہو جائے تو وہ قیامت کے دن اس کی شفاعت

کرے گی اور اگر اولاد کے سامنے باپ مرجائے تو اولاد اس کی مغفرت کے لئے دعا کرے گے۔

حدیث میں وارد ہوا ہے کہ حضرت عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ نے حضرت ام کلثوم دختر سیدہ فاطمۃ الزہراء بنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا پیام نکاح ان کے والد ماجد حضرت علی مرتضٰی کرم اللہ وجہہٗ کو دیا اور ان سے درخواست کی، حضرت علی مرتضٰی نے فرمایا وہ تو بہت کم عمر ہیں اور آپ بہت بزرگ ہیں۔ میری نیت تو یہ تھی کہ اسے اپنے چچا زاد بھائی حضرت عبداللہ بن جعفر رضی اللہ عنہما کو دوں۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے کہلوایا کہ اے ابوالحسن! بڑی عمر کی عورتیں تو جہان میں بہت ہیں میری مراد، ام کلثوم سے دفع شہوت نہیں ہے بلکہ اثبات نسل ہے کیونکہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے میں نے سنا ہے کہ "كُلُّ نَسَبٍ وَّحَسَبٍ يَنْقَطِعُ بِالْمَوْتِ اِلَّا نَسَبِيْ وَحَسَبِيْ" مرنے کے بعد ہر حسب ونسب منقطع ہو جاتا ہے مگر میرا حسب ونسب باقی رہتا ہے ایک روایت میں ہے کہ ہر سبب ونسب منقطع ہو جاتا ہے مگر میرا حسب ونسب باقی رہتا ہے۔ اس وقت سبب تو مجھے حاصل ہے مگر میں چاہتا ہوں کہ نسب بھی حاصل ہو جائے۔ تا کہ دونوں میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی متابعت میں مضبوط ہو جاؤں۔ اس کے بعد حضرت علی مرتضٰی رضی اللہ عنہ نے اپنی صاحبزادی سیدہ ام کلثوم رضی اللہ عنہا کو حضرت عمر فاروق رضی اللہ علی عنہ کے نکاح میں دے دیا اور ان سے حضرت زید ابن عمر رضی اللہ عنہ تولد ہوئے۔

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ:

تُنْكَحُ النِّسَاءُ عَلٰى اَرْبَعَةٍ عَلَى الْمَالِ وَالْحَسَبِ وَالْحُسْنِ وَالدِّيْنِ فَعَلَيْكُمْ بِذَاتِ الدِّيْنِ فَاِنَّهٗ مَا اسْتَفَادَ امْرُءٌ بَعْدَ الْاِسْلَامِ خَيْرًا مِّنْ زَوْجَةٍ مُؤْمِنَةٍ مُوَافِقَةٍ يَسُرُّبِهَا اِذَا نَظَرَ اِلَيْهَا (ابوداؤد)

چار وجہوں کی بنا پر عورتوں سے نکاح کیا جاتا ہے مال، حسب، حسن اور دین کے لئے۔ لیکن تم پر لازم ہے کہ دین والی عورتوں کو پسند کرو کیونکہ مسلمان ہونے کے بعد سب سے بہتر فائدہ جو حاصل ہو سکتا ہے وہ مومنہ اور موافقت کرنے والی بیوی ہے جس سے تمہارا دل خوش ہو جب تم اسے دیکھو۔

مرد مومن ایسی ہی بیوی سے انس و راحت پاتا ہے اس کی صحبت سے دین کو تقویت حاصل ہوتی ہے اور دونوں ایک دوسرے سے محبت کرتے ہیں۔ سب سے بڑی وحشت تنہائی کی ہے اور سب سے بڑی راحت صحبت۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہے کہ تنہائی کا ساتھی شیطان ہوتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ جب مرد یا عورت اکیلے رہتے ہوں تو ان کے ساتھ شیطان ہوتا ہے جو ان کے دل میں شہوات کو ابھارتا ہے اور امن وحرمت کے اعتبار سے کوئی صحبت، نکاح کرنے سے بہتر نہیں ہے۔ اگر یک جہتی اور موافقت ہے تو اس میں ذرا سختی و مشغولیت نہیں رہتی اور جب عورت میں یک جہتی نہ ہو اور غیر جنس سے ہو تو درویش کو چاہئے کہ پہلے اپنے دل میں غور کرے اور تنہائی کی آفتوں اور نکاح کے درمیان سوچے کہ ان دونوں میں سے کون سی آفت کو آسانی سے دور کر سکتا ہے پھر اس کے مطابق عمل کرے۔ کیونکہ مجرد و تنہا رہنے میں دو آفتیں ہیں ایک تو سنت کا ترک ہے دوسرے شہوت کی پرورش اور حرام میں مبتلا ہونے کا خطرہ بھی ہے۔ اسی طرح غیر جنس سے نکاح کرنے میں دو آفتیں ہیں ایک غیر خدا کے ساتھ دل کی مشغولیت دوسرے نفسانی لذت کے لئے تن کو مشغول کرنا۔ اس مسئلہ کی اصل، عزلت وصحبت یعنی خلوت وجلوت کے مسئلہ کی طرف راجع ہے۔ جو شخص خلق کی صحبت چاہتا ہے اس کے لئے نکاح کرنا ضروری ہے اور جو خلوت و گوشہ نشینی کا خواہاں ہے اسے مجرد رہنا مناسب ہے۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "سِیْرُوْا سَبَقَ الْمُفْرِدُوْنَ" دیکھو مجرد لوگ تم پر سبقت لے گئے۔ حضرت حسین بن ابی الحسن بصری رحمتہ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ:

نجا المخففون وهلك المثقلون — ہلکے لوگ نجات پا گئے اور بوجھ والے ہلاک ہو گئے۔

حضرت ابراہیم خواص رحمتہ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ میں ایک بزرگ سے ملنے ایک بستی میں گیا جب میں ان کے گھر پہنچا تو ان کا گھر نہایت پاکیزہ دیکھا جس طرح اولیاء کا عبادت خانہ ہوتا ہے اور اس مکان میں دو محرابیں تھیں، ایک محراب کے گوشہ میں وہ بزرگ تشریف فرما تھے اور دوسری محراب میں ایک بوڑھی عورت پاکیزہ اور روشن چہرے والی بیٹھی ہوئی تھی اور یہ دونوں

کثرتِ عبادت میں بوڑھے ہو چکے تھے۔ میرے آنے پر انہوں نے بڑی خوشی کا اظہار کیا تین دن ان کے یہاں رہا جب میں نے واپسی کا ارادہ کیا تو میں نے اس بزرگ سے پوچھا یہ پاک دامن عورت آپ کی کون ہے؟ انہوں نے فرمایا، یہ ایک رشتہ سے تو میری چچا زاد بہن ہے اور دوسرے رشتہ سے یہ میری بیوی، میں نے کہا ان تین دنوں میں میں نے تو آپ دونوں میں غیریت اور بے گانگی دیکھی ہے؟ انہوں نے کہا ٹھیک ہے، پینسٹھ سال گزر گئے ہیں اسی طرح رہتے ہوئے۔ میں نے عرض کیا اس کی وجہ بیان فرمایئے؟ انہوں نے جواب دیا بات یہ ہے کہ ہم بچپن میں ایک دوسرے پر عاشق ہو گئے تھے۔ اس کے والد نے اسے مجھے دینا منظور نہ کیا کیونکہ ہماری باہمی محبت اسے معلوم ہوگئی تھی۔ ایک عرصہ تک محبت کی آگ میں ہم دونوں جلتے رہے۔ یہاں تک کہ اس کا والد وفات پا گیا۔ میرے والد اس کے چچا تھے انہوں نے میرے ساتھ اس کا نکاح کر دیا جب پہلی رات ہم دونوں یکجا ہوئے تو اس نے مجھ سے کہا جانتے ہو کہ اللہ تعالیٰ نے ہمیں کیسی نعمت سے سرفراز کیا ہے کہ ہم دونوں ایک ہو گئے اس نے ہمارے دلوں کو ناخوش گوار ابتلا و آفت سے نجات دی۔ میں نے کہا ٹھیک کہتی ہو، اس نے کہا پھر ہمیں آج کی رات اپنے آپ کو نفسانی خواہش سے باز رکھنا چاہئے چہ جائیکہ ہم اپنی مراد کو پائمال کریں اور اس نعمت کے شکریہ میں ہم دونوں کو خدا کی عبادت کرنی چاہئے۔ میں نے کہا تم ٹھیک کہتی ہو۔ دوسری رات میں بھی یہی کہا اور تیسری رات میں نے کہا گزشتہ دو راتیں تو میں نے تمہارے شکر میں گزاری ہیں آج رات تم میرے شکر میں عبادت کرو۔ اس طرح ہمیں پینسٹھ (۶۵) سال گزر چکے ہیں اور ہم نے ایک دوسرے کو چھونا تو درکنار کبھی نگاہ اٹھا کر بھی نہیں دیکھا۔ ساری عمر نعماتِ الٰہی کے شکرانے میں گزار دی۔

معاشرت کے آداب:

جب درویش نکاح کے ذریعہ صحبت کا قصد کرے تو لازم ہے کہ بیوی کو حلال رزق مہیا کرے اور اس کے مہر کو حلال کمائی سے ادا کرے تاکہ حق تعالیٰ کے حقوق اور بیوی کے حقوق جو خدا نے فرض کئے ہیں اس کے ذمہ باقی نہ رہیں۔ لذتِ نفس کی خاطر اس سے مشغول نہ ہو۔

جب فرائض ادا کر چکے تب اس سے ہم بستر ہو اور اپنی مراد اس سے پوری کرے اور حق تعالیٰ سے دعا مانگے کہ اے خدا جہان کی آبادی کے لئے تو نے آدم کی سرشت میں شہوت پیدا کی اور تو نے چاہا کہ یہ باہم صحبت کریں۔ اے خدا مجھے اس کی صحبت سے دو چیزیں عطا فرما۔ ایک تو حرصِ حرام کو حلال سے بدل دے دوسرے مجھے فرزندِ صالح عطا فرما جو راضی برضا اور ولی ہو ایسا فرزند عطا نہ فرما جو میرے دل کو تجھ سے غافل کر دے۔

حضرت سہل بن عبد اللہ تستری رحمتہ اللہ علیہ کا واقعہ ہے کہ ان کے یہاں ایک فرزند پیدا ہوا وہ بچپن میں اپنی ماں سے کھانے کے لئے جو چیز مانگتا اس کی ماں کہتی خدا سے مانگ؟ وہ بچہ محراب میں چلا جاتا سجدہ کرتا اس کی ماں چھپا کر اس کی خواہشیں پوری کر دیتی۔ بچے کو معلوم تک نہ ہوتا کہ یہ ماں نے دیا ہے یہاں تک کہ یہ اس کی عادت بن گئی ایک دن بچہ مدرسہ سے آیا تو اس کی ماں گھر میں موجود نہ تھی۔ عادت کے مطابق سر سجدہ میں رکھ دیا۔ اللہ تعالیٰ نے جو اس کی خواہش تھی پوری کر دی۔ ماں جب آئی تو اس نے پوچھا اے بیٹے یہ چیز کہاں سے آئی؟ اس نے کہا وہیں سے جہاں سے روزانہ آتی ہے۔

حضرت زکریا علیہ السلام، حضرت مریم سلام اللہ علیہا کے پاس اگر گرمی میں تشریف لاتے تو سردی کے میوے اور اگر سردی میں تشریف لاتے تو گرمی کے میوے ان کے پاس موجود پاتے اور حیرت سے دریافت کرتے کہ ''اَنّٰی لَكِ هٰذَا قَالَتْ هُوَ مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ '' یہ کہاں سے آئے ہیں وہ کہتیں یہ میرے رب نے بھیجے ہیں۔

درویش کے لئے ضروری ہے کہ سنت کی اتباع کے وقت دل کو دنیا اور شغل حرام سے دور رکھے کیونکہ درویش کی ہلاکت اس کے دل کی خرابی میں ہے جس طرح کہ تونگر کی خرابی گھر اور خاندان کی خرابی میں مضمر ہے۔ مالدار کی خرابی کا تو بدل ممکن ہے لیکن درویش کی خرابی کا کوئی بدل ممکن نہیں۔

اس زمانہ میں ایسی بیوی ملنا ناممکن ہے جو حاجت سے زیادہ اور فضول و محال چیزوں کی طلب کے بغیر اچھی رفیقۂ حیات ثابت ہو۔ اسی بنا پر مشائخ کی ایک جماعت مجرد رہنے کو

پسند کرتی ہے ان کا عمل اس حدیث پر ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "خَیْرُ النَّاسِ فِیْ اٰخِرِ الزَّمَانِ خَفِیْفُ الْحَاذِ" آخر زمانہ میں وہ لوگ سب سے بہتر ہیں جو خفیف الحاذ ہوں۔ صحابہ نے عرض کیا یارسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم خفیف الحاذ کیا ہے؟ فرمایا "اَلَّذِیْ لَا اَھْلَ لَہٗ وَلَا وَلَدَ لَہٗ" وہ لوگ ہیں جن کی نہ بیوی ہوں نہ بچے نیز فرمایا "سِیْرُوْا سَبَقَ الْمُفْرِدُوْنَ" دیکھوا کیلے لوگ تم پر سبقت لے گئے۔

مشائخ طریقت کا اس پر اجماع ہے کہ جن کے دل آفت سے خالی ہوں اور ان کی طبیعت شہوت و معاصی کے ارتکاب کے ارادے سے پاک ہو۔ ان کا مجرد رہنا افضل و بہتر ہے اور عام لوگوں نے ارتکاب معاصی کے لئے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی اس حدیث کو (معاذ اللہ) سند بنالیا ہے کہ "حُبِّبَ اِلَیَّ مِنْ دُنْیَاکُمْ ثَلٰثٌ الطِّیْبُ وَالنِّسَاءُ وَجُعِلَتْ قُرَّۃُ عَیْنِیْ فِی الصَّلٰوۃِ" (نسائی) تمہاری دنیا کی تین چیزیں مجھے پسند و مرغوب ہیں ایک تو خوشبو، دوسری بیویاں، تیسری نماز کہ اس میں میری آنکھوں کی ٹھنڈک رکھی گئی ہے۔

مشائخ طریقت فرماتے ہیں کہ جسے عورت محبوب ہو اسے نکاح کرنا افضل ہے لیکن ہم کہتے ہیں کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ "لِیْ حِرْفَتَانَ اَلْفَقْرُ وَالْجِھَادُ" میرے دو کسب ہیں ایک فقر دوسرا جہاد۔ لہٰذا اس حرفت و کسب سے کیوں ہاتھ اٹھایا جائے؟ اگر عورت محبوب ہے تو یہ اس کی حرفت ہے۔ اپنی اس حرص کو، کہ عورت تمہیں زیادہ محبوب ہے، اس کی نسبت حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف کیوں منسوب کرتے ہو؟ یہ محال و باطل ہے کہ جو شخص پچاس سال تک اپنی حرص کا پیرو رہے اور وہ یہ گمان رکھے کہ یہ سنت کی پیروی ہے۔ وہ سخت غلطی میں مبتلا ہے۔ غرض کہ سب سے پہلا فتنہ جو حضرت آدم علیہ السلام کو جنت میں مقدر کیا گیا اس کی اصل یہی عورت ہے اور دنیا میں سب سے پہلے جو فتنہ ظاہر ہوا اس کا سبب بھی یہی عورت ہے۔ یعنی ہابیل و قابیل کا فتنہ اور آج تک بلکہ جب تک بھی اللہ تعالیٰ چاہے کسی کو عذاب دے ان کا سبب بھی عورت ہی ہے۔ گویا تمام دینی اور دنیاوی فتنوں کی جڑ یہی عورتیں ہیں۔ جیسا کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ "مَاتَرَکْتُ بَعْدِیْ فِتْنَۃً اَضَرَّ عَلَے

الرِّجَالِ مِنَ النِّسَآءِ'' (بخاری) مردوں کے لئے سب سے زیادہ نقصان پہنچانے والا فتنہ عورت سے بڑھ کر میں نے نہیں دیکھا۔ عورتوں کا فتنہ جب ظاہر میں اس قدر ہے تو باطن میں کتنا ہوگا؟

حضور سیدنا داتا گنج بخش رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ گیارہ سال نکاح کی آفت سے خدا نے محفوظ رکھنے کے بعد میری تقدیر نے مجھے اس فتنہ میں مبتلا کر دیا اور بے دیکھے میرا ظاہر و باطن، ایک پری صفت کا اسیر بن گیا۔ ایک سال اس میں ایسا غرق رہا کہ قریب تھا کہ میرا دین تباہ ہو جائے۔ یہاں تک کہ حق تعالیٰ نے اپنے کمالِ لطف و کرم سے عصمت کو میرے ناتواں دل کے استقبال کے لئے بھیجا اور اپنی رحمت سے مجھے نجات عطا فرمائی۔ وَالْحَمْدُ لِلّٰہِ عَلٰی جَزِیْلِ نَعْمَآئِہٖ۔

الحاصل طریقت کی بنیاد، مجرد رہنے پر ہے نکاح کے بعد حال دگرگوں ہو جاتا ہے۔ شہوت کے لشکر سے بڑھ کر کوئی لشکر غارت گر نہیں ہے۔ مگر شہوت کی آگ کو کوشش کر کے بجھانا چاہئے۔ اس لئے کہ جو آفت بھی انسان میں ابھرتی ہے اس کے ازالہ کا ذریعہ بھی انسان میں موجود ہونا چاہئے۔ کوئی اور اس آفت کو دور نہیں کر سکتا۔

شہوت کا دور ہونا دو چیزوں سے ہوتا ہے ایک یہ کہ تکلف کے تحت اسے دور کیا جائے۔ دوسرا یہ کہ ریاضت و مجاہدے کے کسب سے۔ لیکن جو تحتِ تکلف ہے وہ انسان کی طاقت ہے کہ وہ بھوکا رہے اور جو کسب و مجاہدے سے باہر ہے وہ یا تو بے چین کرنے والا خوف ہے یا سچی محبت، جو آہستہ آہستہ پیدا ہو کر محبت کے جسم کے تمام اجزاء میں سرائت کر جاتی اور غالب ہو جاتی ہے اور تمام حواس کو اس کے وصف سے نکال دیتی ہے اور بندے کو مکمل جدا کر کے اس سے بیہودگی کو فنا کر دیتی ہے۔

حضرت احمد حماد سرخسی، جو ماوراء النہر میں میرے رفیق تھے اور برگزیدہ بندے تھے ان سے لوگوں نے پوچھا کیا آپ کو نکاح کی ضرورت پیش آئی؟ فرمایا نہیں۔ پوچھا کیوں؟ فرمایا اس لئے کہ میں اپنے احوال میں یا تو اپنے سے غائب ہوتا ہوں یا اپنے سے حاضر، جب غائب

ہوتا ہوں تو مجھے دونوں جہان کی کوئی چیز یاد نہیں رہتی اور جب حاضر ہوتا ہوں تو میں اپنے نفس پر ایسا قابو رکھتا ہوں کہ جب ایک روٹی ملے تو وہ سمجھتا ہے کہ ہزار حوریں مل گئیں۔ دل کی مشغولیت بہت بڑا کام ہے جس طرح چاہو اسے رکھو۔

مشائخ طریقت کا ایک گروہ یہ کہتا ہے کہ ہم مجرد رہنے اور نکاح کرنے میں بھی اپنے اختیار کو دخیل نہیں ہونے دیتے۔ یہاں تک کہ پردۂ غیب سے تقدیر کا جو حکم بھی ظاہر ہو سر تسلیم خم کر دیتے ہیں۔ اگر ہماری تقدیر مجرد رہنے میں ہے تو ہم پارسائی کی کوشش کرتے ہیں اور اگر نکاح کرنے میں ہے تو ہم سنت کی پیروی کرتے ہیں۔ دل کو فارغ رکھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ کیونکہ اگر حق تعالیٰ کی حفاظت شامل حال ہے تو بندہ کا مجرد رہنا حضرت یوسف علیہ السلام کی مانند ہو گا کہ انہوں نے زلیخا کے ورغلانے پر باوجود طاقت وقوت رکھنے کے اس سے منہ پھیر لیا۔ اس وقت بھی اپنے نفس کے عیوب دیکھنے اور نفسانی خواہش پر غلبہ پانے میں مصروف ہو گئے اور جب نکاح کرنا تقدیر میں ہوتا ہے تو وہ حضرت خلیل اللہ علیہ السلام کے نکاح کرنے کی مانند ہو جاتا ہے۔ چونکہ حضرت خلیل علیہ السلام کو حق تعالیٰ پر کامل بھروسہ اور اعتماد تھا بیوی کی مشغولیت بھی انہیں مشغول نہ کر سکی۔ یہاں تک کہ حضرت سارہ نے جب رشک کا اظہار کیا اور غیرت پیدا ہوئی تو حضرت ابراہیم علیہ السلام نے حضرت ہاجرہ کو بے آب و گیاہ بیابان میں چھوڑ کر خدا کے حوالہ کر دیا اور خود ان سے رخ پھیر لیا تا کہ حق تعالیٰ اپنی صفات میں جس طرح چاہے ان کی پرورش فرمائے۔ بندے کی ہلاکت نہ نکاح کرنے میں ہے اور نہ مجرد رہنے میں کیونکہ اس کی ہلاکت تو اپنے اختیار کو قائم و برقرار رکھنے اور نفس کی پیروی کرنے میں ہے۔

آل واولاد کے آداب:

اہل وعیال کی موجودگی میں شرط ادب یہ ہے کہ اس کے کسی درد و دکھ سے غافل نہ رہے اور نہ اپنا حال ضائع اور اوقات پراگندہ ہونے دے۔ اپنے اہل وعیال کے ساتھ شفقت کا برتاؤ کرے اور انہیں حلال رزق مہیا کرے اور نفقہ کی ادائیگی میں ظالموں اور جابر بادشاہوں کی رعایت نہ کرے یہاں تک کہ اگر فرزند سے بھی ایسا ارتکاب ہو تو اس کا بھی لحاظ کرے۔

حضرت احمد بن حرب نیشاپوری رحمتہ اللہ علیہ ایک دن نیشاپور کے امراء ورؤساء کے ساتھ جو انہیں سلام کرنے آئے تھے تشریف فرما تھے ان کا ایک بیٹا شراب پیئے ہوئے گانے والیوں کے ساتھ جھومتا ہوا گزر گیا۔ جس نے بھی اسے دیکھا اس کا حال متغیر ہوگیا۔ حضرت احمد نے جب لوگوں کو دیکھا تو فرمایا تمہارا حال کیوں متغیر ہے۔ انہوں نے کہا یہ جوان اس بے باکی کے ساتھ آپ کے سامنے سے گزرا ہے جس سے پریشان ہوگئے اس نے آپ کا بھی لحاظ نہیں کیا آپ نے فرمایا وہ معذور ہے اس لئے کہ ایک رات ہم نے اپنے اور اپنی بیوی کے لئے ہمسایہ سے کوئی چیز لی تھی اور ہم دونوں نے اسے کھایا تھا اسی رات ہم بستری میں اُس جوان کا استقرار ہوا تھا۔ پھر ہم پر نیند کا غلبہ ہوا اور سو گئے اس رات ہمارے اوراد و وظائف بھی نہ ہو سکے۔ ہم نے صبح اس کھانے کی بابت تفتیش کی تو ہمسایہ نے بتایا جو چیز بھیجی تھی وہ ایک شادی کا کھانا تھا۔

مجرّد رہنے کے آداب:

مجرد رہنے یعنی غیر شادی شادہ رہنے کے آداب میں شرط یہ ہے کہ آنکھوں کو ناشائستہ باتوں سے محفوظ رکھے اور نہ دیکھنے کے لائق چیزوں کو نہ دیکھے اور ناجائز آوازوں کو نہ سنے۔ اور نامناسب باتوں کو نہ سوچے۔ شہوت کی آگ کو فاقہ اور بھوک سے بجھائے دل کو دنیا اور حوادث کی مشغولیت سے محفوظ رکھے اور نفسانی خواہش کا نام علم والہام نہ رکھے اور شیطان کے فریبوں کی تاویل نہ کرے تاکہ طریقت کی راہ میں مقبول ہو۔ صحبت اور اس کے معاملات کے آداب یہ تھے جن کو اختصار کے ساتھ بیان کردیا۔ واللہ اعلم۔

دسواں کشف حجاب

مشائخ کے کلام اور ان کے الفاظ و معانی کے حقائق کے بیان میں

واضح رہنا چاہئے کہ اللہ تعالیٰ تمہیں نیک بخت بنائے کہ ہر علم و ہنر اور ہر اہل معاملہ

کے لئے اپنے اسرار کے اظہار و بیان میں خاص اشارات وکلمات ہوتے ہیں اور جنہیں ان کے سوا کوئی دوسرا سمجھ نہیں سکتا۔ الفاظ و عبارات کی اصطلاح وضع کرنے سے ان کی دو چیزیں مراد ہوتی ہیں ایک یہ کہ بخوبی سمجھا جائے اور مشکلات کو آسان بنایا جائے تا کہ فہم مرید کے قریب ہو جائے۔ دوسرے یہ کہ ان اسرار کو ان لوگوں سے چھپایا جائے جو صاحبِ علم نہیں ہیں اس کے دلائل و شواہد واضح ہیں مثلاً اہل لغت کی خاص اصطلاحیں اور مخصوص الفاظ اور عبارات ہیں جن کو انہوں نے وضع کیا ہے جیسے فعل ماضی، حال مستقبل، صحیح و معتل وغیرہ اور اہل نحو کے بھی مخصوص الفاظ و عبارات ہیں۔ جن کو انہوں نے وضع کیا ہے جیسے رفع وضمہ (پیش) فتح و نصب (زبر) خفض و کسرہ (زیر) جزم، جر، متصرف، غیر متصرف وغیرہ۔ اہل عروض کے بھی اپنے وضع کردہ مخصوص الفاظ ہیں جیسے بحور، دوائر، سبب، وتد اور فاصلہ وغیرہ۔ اہل حساب و ہندسہ کے بھی مخصوص الفاظ ہیں۔ جیسے فرد، زوج، ضرب، قسمت، کعب، جذر، اضافت تضعیف، تنصیف، جمع اور تفرقہ وغیرہ۔ فقہا کے بھی مخصوص وضع کردہ اصطلاحیں ہیں جیسے علت، معلول، قیاس، اجتہاد، رفع اور الزام وغیرہ محدثین کی بھی مخصوص کردہ اصطلاحیں ہیں مثلاً مسند، مرسل، حاد، متواتر، جرح و تعدیل وغیرہ متکلمین کی بھی اپنی وضع کردہ مخصوص اصطلاحیں ہیں جیسے جوہر، کل، جزو، جسم، حدث، جبر، حیز اور ہیولیٰ وغیرہ۔

اسی طرح اہل طریقت کے بھی اپنے وضع کردہ الفاظ و عبارات ہیں جس سے اپنا مطلب و مقصود ظاہر کرتے ہیں تا کہ وہ علم تصوف میں ان کا استعمال کریں اور جسے چاہیں اپنے مقصود کی راہ دکھائیں اور جس سے چاہیں اسے چھپائیں۔ لہٰذا ان میں سے بعض الفاظ وکلمات کی تشریح بیان کرتا ہوں اور ان میں جو فرق و امتیاز ہے اس کی وضاحت کرتا ہوں تا کہ سمجھنے میں آسانی ہو۔ انشاءاللہ تعالیٰ

حال، وقت اور ان کا فرق

اہل طریقت مصطلحات میں سے ایک حال اور ایک وقت ہے ان کے بیان کے ساتھ ان کا فرق بھی ظاہر کیا جائے گا۔ وقت اہل طریقت کے درمیان بہت مشہور لفظ ہے اور اس میں ان

کی طویل بحثیں ہیں چونکہ میرا مقصود تحقیق و اثبات ہے نہ کہ طوالت اس لئے اختصار پر اکتفا کرتا ہوں۔

وقت اسے کہتے ہیں کہ بندہ اس کے سبب اپنے ماضی و مستقبل سے فارغ ہو جائے۔ بندے کے دل پر حق تعالیٰ کی طرف سے جو واردات طاری ہوتے ہیں ان کے اسرار کو دل میں اس طرح محفوظ رکھے جس طرح کشف و مجاہدہ میں ہوتا ہے۔ اس وقت اس کے دل میں نہ تو پہلے کی کوئی یاد رہے اور نہ آئندہ کی فکر اس حالت میں کسی مخلوق کی اس پر دسترس نہیں رہتی اور نہ اس کی کوئی یاد باقی رہتی ہے کہ ماضی میں اس پر کیا گزرا اور مستقبل میں کیا ہوگا۔؟

صاحبانِ وقت کہتے ہیں کہ ہمارا علم، ماضی و مستقبل کا ادراک نہیں کر سکتا۔ ہم تو اس وقت اللہ تعالیٰ کے ساتھ خوش ہوتے ہیں کیونکہ ہم اگر کل کی فکر میں مشغول اور دل میں آئندہ کے اندیشہ کو جگہ دیں تو ہم وقت سے محجوب ہو جائیں گے حجاب بہت بڑی پراگندگی اور موجب پریشانی ہے لہٰذا جس چیز پر دسترس نہ ہو اس کا اندیشہ باطل ہے۔

حضرت ابو سعید خرازی رحمتہ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اپنے عزیز وقت کو عزیز ترین چیزوں کے سوا کسی سے مشغول نہ کرو اور بندے کی عزیز ترین چیز ماضی و مستقبل کے درمیان وقت اور حال ہے۔ اسی میں مشغول رہنا چاہئے۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ:

لِیْ مَعَ اللّٰہِ وَقْتٌ لَا یَسَعُنِیْ فِیْہِ مَلَکٌ مُّقَرَّبٌ وَّلَا نَبِیٌّ مُّرْسَلٌ

اللہ تعالیٰ کے حضور میں میرا ایک وقت ایسا ہوتا ہے کہ اس وقت میرے دل میں اٹھارہ ہزار عالم میں سے کسی کا بھی گزر ممکن نہیں۔

اور نہ میری آنکھ میں کسی کی قدر و منزلت ہوتی ہے۔ اسی بنا پر شب معراج، جبکہ زمین و آسمان کے ملک کی زیب زینت آپ کو پیش کی گئی تو آپ نے کسی کی طرف التفات نہ فرمایا۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے "مَازَاغَ الْبَصَرُ وَمَا طَغٰی" (النجم:۱۷) نہ آنکھ جھپکی اور نہ ادھر ادھر ہوئی۔ اسی لئے حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم عزیز تھے اور عزیز کو بجز عزیز کے کسی سے شغل نہیں ہوتا۔

موحد کے دو وقت ہوتے ہیں۔ ایک گم ہونے کا دوسرا پانے کا۔ ایک وصال کا دوسرا فراق کا دونوں حالتوں میں اس کا وقت مغلوب ہوتا ہے۔ کیونکہ وصل میں اس کا وصل حق تعالیٰ سے ہے اور فراق میں اس کا فراق بھی حق تعالیٰ ہی سے ہے۔ بندے کا اختیار اور اس کا کسب دونوں وقت قائم نہیں رہتا۔ جس کے ساتھ بندے کی صفت کی جا سکے چونکہ بندے کا اختیار اس کے حالات سے جدا کر دیا جاتا ہے اس لئے وہ جو کچھ کرتا ہے وقت کی زیبائش کے لئے ہوتا ہے۔

حضرت جنید بغدادی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ بیابان میں ایک درویش کو دیکھ کر جو کیکر کے درخت کے نیچے سخت و دشوار جگہ میں بیٹھا ہوا تھا میں نے اس سے کہا اے بھائی کس چیز نے تمہیں یہاں بٹھایا ہے۔ یہ جگہ بڑی سخت و دشوار ہے اور یہاں تم بیٹھے ہو؟ اس نے کہا میرا ایک وقت اس جگہ ضائع ہوا ہے۔ میں اس کے غم میں اس جگہ بیٹھا ہوا ہوں۔ میں نے پوچھا کتنے عرصہ سے یہاں بیٹھے ہوئے ہو اس نے کہا بارہ (۱۲) سال اسے گزر چکے ہیں۔ اب میں اپنے شیخ سے استدعا کرتا ہوں میرے کام میں میری مدد فرمائیں تاکہ اپنے وقت اپنی مراد کو حاصل کر سکوں۔ حضرت جنید رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ میں وہاں سے چل دیا۔ حج کیا اور اس کے لئے دعا کی جو خدا نے قبول فرمائی اور وہ اپنی مراد کو پہنچ گیا جب واپس آیا تو اس درویش کو اس جگہ بیٹھا پایا میں نے اس سے کہا اے جوانمرد! اب جبکہ تم نے اپنا وقت پا لیا تو اب یہاں کیوں بیٹھے ہو؟ اس نے کہا اے میرے شیخ! یہ وہ جگہ ہے جہاں مجھے وحشت و پریشانی لاحق ہوئی تھی اور میرا سرمایا گم ہوا تھا اور اب بھی یہی وہ جگہ ہے جہاں سے میرا گم شدہ سرمایہ مجھے دوبارہ ملا ہے۔ میں نے اس جگہ کو پکڑ لیا ہے، مجھے اس جگہ سے محبت ہوگئی ہے۔ کیا اب میرے لئے جائز ہوگا کہ میں اس جگہ کو چھوڑ دوں اور کسی اور جگہ چلا جاؤں۔ میری تمنا ہے کہ مر کر میری مٹی بھی اسی جگہ مل جائے اور قیامت کے دن جب اٹھایا جاؤں تو میں اسی جگہ سے اٹھوں۔ یہ میرے انس و محبت کی جگہ ہے۔

فکل امرئی یولی الجمیل مجیب
وکل مکان ینبت العز اطیب
ہر انسان اچھے دوست کو قبول کرتا ہے
اور عزت والی جگہ کو وہ پسند کرتا ہے

جو چیز آدمی کے کسب و اختیار میں نہیں ہوتی کہ اسے بتکلف حاصل کرے وہ بازار میں فروخت نہیں ہوتی کہ اسے جان کے عوض حاصل کر سکے اور اس کے حاصل کرنے یا دور کرنے کی اس میں قدرت بھی نہ ہو تو اس کی یہ دونوں صورتیں رعایت میں برابر ہوتی ہیں اور اس کے تحقق میں بندہ کا اختیار باطل ہوتا ہے۔

مشائخ طریقت بیان کرتے ہیں کہ ''الوقت سیف قاطع'' وقت کاٹنے والی تلوار ہے۔ چونکہ تلوار کا کام کاٹنا ہے۔ اسی طرح وقت کا کام کاٹنا ہے اور وقت، ماضی و مستقبل کی جڑوں کو کاٹتا ہے اور اس کے غموں کو مٹاتا ہے۔ لہٰذا وقت کی صحبت خطرناک ہے یا تو وہ ہلاک کر دے گا یا مالک بنا دے گا۔ اگر کوئی شخص ہزار برس تک تلوار کی خدمت کرے اور اپنے کاندھوں پر لٹکائے پھرے لیکن جب اس کے کاٹنے کا وقت آئے گا تو تلوار نہ اپنے خدمت گزار مالکوں کو دیکھے گی نہ غیر کو دونوں کو یکساں کاٹ دے گی۔ کیونکہ اس کا کام ہی قہر و غلبہ ہے اس کے مالک کے اسے پسند کرنے کی وجہ سے اس کا قہر و غلبہ جاتا نہ رہے گا۔

حال:

حال، وقت پر ایک آنے والی چیز ہے جو وقت کو مزین کرتی ہے۔ جس طرح روح سے جسم مزین ہوتا ہے لامحالہ وقت، حال کا محتاج ہے کیونکہ وقت کی پاکیزگی حال سے ہوتی ہے اور اس کا قیام بھی اسی سے ہوتا ہے۔ لہٰذا جب صاحب وقت صاحب حال ہوتا ہے تو اس سے تغیر جاتا رہتا ہے اور وہ اپنے احوال میں مستحکم ہو جاتا ہے۔ کیونکہ بغیر حال کے وقت کا زوال ممکن نہیں۔ اور جب اس سے حال مل جاتا ہے اس کے تمام احوال وقت بن جاتے ہیں ان کے لئے وقت کا نزول تھا۔ چونکہ متمکن کے لئے غفلت جائز تھی۔ اور صاحب غفلت پر اب حال

نازل ہے اور وقت چونکہ متمکن ہے۔اس لئے صاحب وقت پر غفلت جائز تھی اور اب صاحب حال پر غفلت جائز نہیں ہے۔ واللہ اعلم

مشائخ طریقت فرماتے ہیں کہ "الحال سکوت اللسان فی فنون البیان" صاحب حال کی زبان اپنے حال کے بیان کرنے سے ساکت رہتی ہے اور اس کا معاملہ اس کے حال کے تحقق واثبات میں گویا ہوتا ہے۔

ایک بزرگ فرماتے ہیں کہ "السوال عن الحال محال" حال کے بارے میں پوچھنا محال ہے اس لئے کہ حال کی تعبیر ناممکن ہے۔حال ہوتا ہی وہ ہے جہاں حال فنا ہو جائے۔

استاد ابوعلی قاری رحمتہ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ دنیا وآخرت میں خوشی وغم وقت کا نصیبہ ہے اور حال ایسا نہیں ہوتا۔کیونکہ حال ایسی کیفیت ہے جو حق تعالیٰ کی جانب سے بندے پر وارد ہوتی ہے اور جب اس کا ورود ہوتا ہے تو دل سے سب کچھ فنا ہو جاتا ہے۔ جیسے کہ حضرت یعقوب علیہ السلام کا حال تھا وہ صاحب وقت تھے۔ایک وقت میں تو بحالت فراق آنکھوں کی بینائی جاتی رہی دوسرے وقت میں بحالت وصال بینائی لوٹ آئی۔کبھی گریہ وزاری سے ایسے ضعیف وناتواں ہوئے کہ بال سے باریک ہو گئے اور کبھی وصال سے تندرست وتوانا بن گئے۔ کبھی خوفزدہ ہوئے اور کبھی مسرت وخوشی پائی۔حضرت ابراہیم علیہ السلام صاحب حال تھے وہ نہ فراق سے مغموم ہوتے اور نہ وصال سے مسرور۔ چاند ستارے اور سورج ان کے حال کی مدد کرتے تھے۔اور خود ہر چیز کے دیکھنے سے فارغ تھے۔جو نظر آتا اس میں حق تعالیٰ کا جلوہ ہی نظر آتا تھا۔فرماتے تھے "لَاۤ اُحِبُّ الْاٰفِلِیْنَ" میں چھپنے والوں کو پسند نہیں کرتا۔

صاحب وقت کے لئے کبھی سارا جہان دوزخ ہو جاتا ہے جبکہ مشاہدہ میں غیبت ہو جاتی ہے اور دل سے حبیب کا روپوش ہو جانا موجب وحشت بن جاتا ہے اور کبھی اس کا دل خوشی ومسرت میں پھولا نہیں سماتا۔اور سارا جہان مانند جہالت بن جاتا ہے۔نعمتوں میں ہر آن وہ حق کا مشاہدہ کرتا ہے اور وہ نعمت اس کے لئے تحفہ اور بشارت بن جاتی ہے۔ پھر یہ کہ صاحب حال کے لئے حجاب ہو یا کشف ہو، نعمت ہو یا بلا سب یکساں ہوتا ہے کیونکہ وہ ہر مقام میں صاحب حال ہوتا

ہے۔لہٰذا حال مراد کی صفت ہے اور وقت مرید کا درجہ کوئی فی نفسہٖ وقت کی راحت میں ہوتا ہے اور کوئی حال کی مسرت میں خدا کے ساتھ ہوتا ہے۔ یہ دونوں منزلوں کے درمیان فرق و امتیاز ہے۔ واللہ اعلم بالصواب

مقام و تمکین اور ان کا فرق

مقام:

طالب کا صدقِ نیت اور ریاضت و مجاہدے کے ساتھ حق تعالیٰ کے حقوق کو ادا کرنے پر قائم رہنے کا نام مقام ہے۔ ہر ارادۂ حق والے کا ایک مقام ہوتا ہے جو بوقت طلب، بارگاہِ حق سے ابتداء میں اس کے حصول کا موجب بنتا ہے۔ جب بھی طالب کسی مقام کو عبور کرے گا اور پچھلے مقام کو چھوڑے گا تو وہ لازمی کسی ایک مقام پر قائم ہوگا جو اس کے واردات کا مقام ہے مرکب اور از قسم مخلوق ہے وہ سلوک اور معاملہ کی قسم سے نہیں ہے جیسا کہ قرآن کریم میں آیا ہے کہ ''وَمَا مِنَّا اِلَّا لَهٗ مَقَامٌ مَّعْلُوْمٌ '' ہم میں سے کوئی نہیں مگر یہ کہ اس کا کوئی مقام معین ہے۔ جیسے حضرت آدم علیہ اسلام کا مقام توبہ تھا، اور حضرت نوح علیہ السلام کا مقام زہد تھا، حضرت ابراہیم علیہ السلام کا مقام تسلیم و رضا تھا، حضرت موسیٰ علیہ السلام کا مقام انابت تھا، حضرت داؤد علیہ السلام کا مقام حزن و ملال تھا، حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا مقام امید و رجا تھا، حضرت یحییٰ علیہ السلام کا مقام خوف و خشیت تھا اور ہمارے آقا سید عالم صلی اللہ علیہ وسلم کا مقام ذکر تھا۔ ہر ایک کو ہر مقام میں خواہ کتنا ہی عبور ہو بہر طور اس کا رجوع اس کے اپنے اصلی مقام کی ہی طرف ہوگا میں نے اس کا تذکرہ محاسبیوں کے مذہب میں بیان کر دیا ہے اور حال و مقام کا فرق بھی واضح کر چکا ہوں۔

راہ حق کی قسمیں:

واضح رہنا چاہئے کہ راہِ حق کی تین قسمیں ہیں۔ ایک مقام دوسرا حال تیسرا تمکین۔ اللہ تعالیٰ نے تمام نبیوں کو اپنی راہ بتانے کے لئے بھیجا۔ تا کہ وہ مقامات کے احکامات بیان فرمائیں۔

ایک لاکھ چوبیس ہزار (کم وبیش) انبیاء علیہم السلام تشریف لائے اور وہ اتنے ہی مقامات کی تعلیم کے پیغام بر تھے۔ مگر ہمارے آقا سید عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی تشریف آوری سے ہر صاحب مقام کے لئے ایک حال ظاہر ہوا اور حال کو مقام سے ملا کر مخلوق سے اس کا کسب و اختیار جدا کیا گیا۔ یہاں تک کہ مخلوق پر دین کو تمام کیا اور نعمت کو انتہا تک پہنچایا گیا۔ ارشاد حق ہے کہ "اَلْیَوْمَ اَکْمَلْتُ لَکُمْ دِیْنَکُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَیْکُمْ نِعْمَتِیْ" (المائدہ:۳) آج میں نے تمہارے لئے تمہارا دین مکمل کر کے اپنی تمام نعمتیں تم پر ختم کر دیں۔ اس کے بعد اہل تمکین کے لئے قرار کا ظہور ہوا۔

درجہ تمکین:

محققین کا درجہ کمال کے اعلیٰ منزل میں اقامت گزیں ہونے کا نام تمکین ہے لہٰذا صاحبانِ مقامات کے لئے مقامات سے عبور ممکن ہے لیکن درجہ تمکین سے گزر جانا محال ہے۔ اس لئے کہ مقام مبتدیوں کا درجہ ہے۔ تمکین منتہیوں کی اقامت گاہ ہے۔ ابتداء سے انتہا کی طرف جانا تو ہے لیکن انتہا سے گزرنے کی کوئی صورت نہیں۔ کیونکہ مقامات منزلوں کی راہیں ہیں اور تمکین بارگاہِ قدس میں برقرار ہوتا ہے۔ محبوبانِ خدا راستہ میں عاریۃً ہوتے ہیں اور منزل میں بیگانے۔ ان کا باطن بارگاہِ قدس میں ہوتا ہے اور بارگاہِ قدس میں سبب و آلہ، آفت ہوتا ہے اور وہ غیبت و علت کے اوزار ہوتے ہیں۔ زمانہ جاہلیت میں شعراء اپنے ممدوحین کی تعریف، معاملہ سے کرتے تھے اور جب تک کچھ عرصہ نہ گزر جاتا شعر نہیں کہتے تھے۔

چنانچہ جب کوئی شاعر ممدوح کے حضور پہنچ جاتا تھا تو تلوار سونت کر سواری کے پاؤں کاٹ ڈالتا اور تلوار کو توڑ دیتا تھا۔ اس سے ان کا مقصد یہ ہوتا کہ مجھے سواری اس لئے درکار تھی کہ اس کے ذریعہ تیرے حضور تک پہنچنے کے لئے مسافت طے کروں اور تلوار رکھنا اس لئے ضروری تھا کہ حاسدوں کو تیرے حضور سے دور کر دوں اب چونکہ میں پہنچ گیا ہوں تو سامان سفر کی کیا حاجت؟ سواری کو اس لئے ہلاک کر دیا کیونکہ تیرے پاس سے مجھے جانا ہی نہیں ہے اور تلوار اس لئے توڑ ڈالی کہ تیرے حضور سے جدا ہونے کا دل میں کوئی اندیشہ نہیں ہے۔ پھر جب کچھ دن گزر جاتے تو شعر پڑھتا

تھا۔

حق تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی صفت بھی ایسی ہی بیان فرمائی کہ جب وہ منزلیں کر کے دشوار مقامات کو عبور کر کے محل تمکین میں پہنچے اور ان سے تمام اسبابِ تغیر جدا ہو گئے تو حق تعالیٰ نے فرمایا "فَاخْلَعْ نَعْلَيْكَ (طٰہٰ: ۱۲) وَأَلْقِ عَصَاكَ" (النمل: ۱۰) نعلین اتارو اور اپنا عصا ڈال دو۔ کیونکہ یہ سامانِ سفر تھا۔ بارگاہِ قدس میں حضوری کے بعد، سفر کا خطرہ ہی کیا محبت کی ابتداء طلب ہے اور اس کی انتہا قرار اور سکون پانا۔

پانی جب تک نہر و دریا میں رہے جاری رہتا ہے جب سمندر میں پہنچ جاتا ہے تو ٹھہر جاتا ہے اور جب پانی ٹھہر جاتا ہے تو اس کا مزہ بدل جاتا ہے۔ کیونکہ جسے پانی کی ضرورت ہوتی ہے وہ سمندر کی طرف مائل نہیں ہوتا۔ سمندر کی طرف وہی جاتا ہے جسے موتیوں کی تلاش ہوتی ہے۔ اسی لئے وہ سانس کو روکتا ہے اور گہر کی طلب میں پاؤں جوڑ کر سر کے بل سمندر کی تہ میں غوطہ لگاتا ہے۔ اس کے بعد یا تو وہ بہترین قیمتی موتی لے کر آتا ہے یا غرقِ دریا ہو جاتا ہے۔

ایک بزرگ فرماتے ہیں کہ "التمکین رفع التلوین" تغیر و تبدل ختم ہو جانے کا نام تمکین ہے۔ لفظ تلوین بھی حال و مقام کی مانند اہل طریقت کی اصطلاح میں ایک لفظ و عبارت ہے اور معنی میں ایک دوسرے کے قریب۔ لیکن اس جگہ تلوین کے معنی ایک حال سے دوسرے حال کی طرف بدلنے کے ہیں اس مقولہ کا مطلب یہ ہے کہ متمکن متردد نہیں ہوتا اور اپنا سارا سامان لے کر بارگاہِ قدس سے واصل ہو جاتا ہے۔ اس کے دل میں نہ غیر کا اندیشہ باقی رہتا ہے اور نہ اس پر کوئی معاملہ گزرتا ہے جس سے اس کے ظاہر کے بدل جانے کا امکان ہو اور نہ کوئی حال گزرتا ہے جس سے اس کا باطن متغیر ہو۔ چونکہ حضرت موسیٰ علیہ السلام مقام تلوین میں تھے۔ طور پر جب جلوۂ حق نے تجلی فرمائی تو ان کے ہوش جاتے رہے حق تعالیٰ نے فرمایا "وَخَرَّ مُوسٰى صَعِقًا" (الاعراف: ۱۴۳) موسیٰ علیہ السلام بے ہوش ہو کر زمین پر آ رہے اور ہمارے آقا سید عالم صلی اللہ علیہ وسلم محل تمکین میں تھے جب مکہ مکرمہ سے قاب قوسین تک عین تجلی میں رہے تب بھی آپ کا حال ایک رہا۔ اور کسی دوسرے حال کی طرف متغیر نہ ہوئے۔ یہ

درجہ اعلیٰ تھا۔ واللہ اعلم

محل تمکین کی قسمیں:

محل تمکین کی دو قسمیں ہیں ایک یہ کہ اس کی نسبت شہودِ حق کے ساتھ ہو، دوسرے یہ کہ اس کی نسبت اپنے شہود کے ساتھ ہو۔ جس کی نسبت اپنے شہود کے ساتھ ہے وہ باقی الصفت ہوتا ہے اور جس کی نسبت شہود حق کے ساتھ ہو وہ فانی الصفت ہوتا ہے۔ فانی الصفت کے لئے محو، صحو، محق، لحق، فنا و بقا اور وجود و عدم کا استعمال درست نہیں ہوتا۔ اس لئے کہ ان اوصاف کے قیام کے لئے موصوف کی ضرورت ہوتی ہے۔ جب موصوف شہود حق میں مستغرق ہوتا ہے تو اس سے وصف کا قیام ساقط ہو جاتا ہے اور بھی بکثرت لطائف ہیں۔ مختصراً اتنا ہی کافی ہے۔ وباللہ التوفیق

محاضرہ ومکاشفہ اوران کا فرق

واضح رہنا چاہئے کہ لفظ محاضرہ کا استعمال، حضور قلب پر بیان لطائف میں ہوتا ہے اور لفظ مکاشفہ کا استعمال، حضور تحریر پر جو دل میں خطرہ عیاں ہو اس وقت ہوتا ہے۔ گویا آیات کے شواہد کو محاضرہ اور مشاہدات کے شواہد کو مکاشفہ کہتے ہیں اور محاضرہ کی علامت، آیات کی دید میں ہمیشہ فکر مند رہنا ہے اور مکاشفہ کی علامت، عظمت کی تہ میں ہمیشہ حیرت زدہ رہنا ہے۔ جو افعال میں فکر مند ہو اور جو جلال میں حیرت زدہ ہو۔ ان میں فرق یہ ہے کہ ایک خلت کے ہم معنی ہوتا ہے اور دوسرا محبت کے قریب۔ چنانچہ حضرت خلیل علیہ السلام نے جب ملکوت سماوی پر نظر ڈالی تو اس کے وجود کی حقیقت میں تامل و تفکر کیا اور ان کا دل اس میں حاضر ہوا تو فعل کی دید میں فاعل کو دیکھا۔ یہاں تک کہ ان کے حضور نے فعل کو بھی فاعل کی دلیل بنا دیا اور کمالِ معرفت میں گویا ہوئے "اِنِّیْ وَجَّهْتُ وَجْهِیَ لِلَّذِیْ فَطَرَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ حَنِیْفًا (الانعام:۷۹)" یعنی میں اپنے چہرے کو اس ذات کی طرف یکسو ہو کر پھیرتا ہوں جس نے زمین و آسمان کو پیدا کیا ہے۔

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو جب ملکوتِ سماوی کی سیر کرائی گئی تو آپ نے سارے عالم کو دیکھنے سے آنکھیں بند کرلیں۔ نہ فعل کو دیکھا اور نہ مخلوق کو۔ حتیٰ کہ اپنے آپ کو بھی نہیں دیکھا صرف فاعل کے مکاشفہ میں رہے۔ اسی طرح کشف میں شوق پر شوق کا اضافہ ہوا اور بے قراری پر بے قراری بڑھی، دیدار کی طلب ہوئی تو رخ کی رویت نہ ہوئی۔ قرب کو چاہا تو قربت ممکن نہ ہوئی۔ وصل کا ارادہ کیا تو وصال کی صورت نہ بنی۔ قلب اطہر پر دوست کی تنزیہہ و تقدیس کا جتنا زیادہ ظہور ہوتا اتنا ہی شوق پر شوق بڑھتا جاتا، نہ اعراض کی ہی راہ تھی نہ اقبال و توجہ کا امکان، یعنی نہ ہٹ سکتے تھے نہ سامنے ہو سکتے تھے متحیر ہو کر رہ گئے۔ کیونکہ جہاں خلت تھی وہاں حیرت کفر معلوم ہوئی اور جہاں محبت تھی وہاں وصل شرک نظر آیا۔ حیرت ہی سرمایہ بن کے رہ گیا۔ اس لئے کہ مقام خلت میں حیرت زدہ ہونا اس کے وجود میں ہوتا ہے اور یہ شرک ہے اور مقام محبت میں حیرت زدہ ہونا کیفیت میں ہوتا ہے یہ توحید کا مقام ہے۔ اسی واسطے حضرت شبلی علیہ الرحمۃ کہا کرتے تھے کہ ''یادلیل المتحیرین زدنی تحیرا '' اے متحیروں کے رہنما! میری حیرت کو اور زیادہ کر۔ کیونکہ مشاہدے میں حیرت کی زیادتی سے درجہ بلند ہوتا ہے۔

حضرت ابوسعید خراز رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت ابراہیم سعد علوی کے ساتھ دریا کے کنارے ایک خدا کے دوست کو دیکھا تو اس سے دریافت کیا کہ حق کی راہ کس چیز میں ہے؟ انہوں نے کہا حق کی دو راہیں ہیں ایک عوام کی دوسرے خواص کی انہوں نے پوچھا اس کی تشریح فرمایئے؟ کہا عوام کی راہ وہ ہے جس پر تم ہو کیونکہ کسی علت کے ساتھ قبول کرتے ہو اور کسی علت کے سبب چھوڑتے ہو اور خواص کی راہ یہ ہے کہ نہ وہ معلل کو دیکھتے ہیں نہ علت کو۔ وباللہ التوفیق

قبض وبسط اور ان کا فرق

واضح رہنا چاہئے کہ قبض وبسط احوال کی دو حالتوں کا نام ہے جو بندے کی طاقت سے باہر ہے۔ وہ نہ اس کے آنے پر قادر ہے اور نہ اس کے جانے پر۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے ''وَاللّٰہُ یَقْبِضُ وَیَبْسُطُ'' (البقرہ: ۲۴۵) قبض وبسط میرے ہی قبضہ واختیار میں ہے۔

قبض اس حال کا نام ہے جو بحالتِ حجاب دل پر چھائے اور بسط اس کیفیت کا نام ہے جس کو دل پر چھائے ہوئے حجاب کا ارتفاع کہتے ہیں۔ یہ دونوں حق ہیں ان میں بندے کا اختیار نہیں ہے۔ عارفوں کے احوال میں قبض ایسا ہے جیسے کہ مریدوں کے احوال میں خوف اور اہل معرفت کے احوال میں بسط ایسا ہے جیسے مریدوں کے احوال میں رجا یعنی امید۔ یہ تعریف اس گروہ کے موافق جو اس طرح معنی بیان کرتے ہیں۔

مشائخ طریقت کی ایک جماعت کہتی ہے کہ قبض کا مرتبہ، بسط کے مرتبہ سے زیادہ بلند ہے۔ اس کی وجہ یہ بتاتے ہیں کہ قرآن کریم میں قبض کا ذکر، بسط سے پہلے آیا ہے۔ دوسرے یہ کہ قبض میں گداز اور قہر ہے اور بسط میں نوازش و مہربانی ہے۔ لامحالہ بشریت کے اوصاف کو فنا کرنا، اور نفس کو مغلوب کرنا، پرورش و مہربانی سے افضل ہے کیونکہ وہ بہت بڑا حجاب ہے۔

اور ایک جماعت یہ کہتی ہے کہ بسط کا مرتبہ، قبض کے مرتبہ سے بلند تر ہے۔ اس لئے کہ قرآن کریم میں قبض کا پہلے ذکر آنا بسط کی فضیلت کی علامت ہے کیونکہ اہل عرب کی عادت ہے کہ اس چیز کو پہلے بیان کرتے ہیں جو فضیلت میں بعد ہو۔ جیسا کہ ارشاد ہے:

فَمِنْهُمْ ظَالِمٌ لِّنَفْسِهٖ وَمِنْهُمْ مُّقْتَصِدٌ وَمِنْهُمْ سَابِقٌۢ بِالْخَيْرَاتِ بِاِذْنِ اللّٰهِ (فاطر:۳۲)

یعنی بعض بندے جانوں پر ظلم کرتے ہیں اور بعض بندے میانہ رو ہوتے ہیں اور بعض بندے حکم الٰہی سے نیکیوں میں سبقت لے جاتے ہیں۔

نیز فرمایا:

اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ التَّوَّابِيْنَ وَيُحِبُّ الْمُتَطَهِّرِيْنَ (البقرہ:۲۲۲)

اللہ تعالیٰ توبہ کرنے والوں کو پسند کرتا ہے اور خوب پاک و صاف رہنے والوں کو محبوب رکھتا ہے۔

اور فرمایا:

يَامَرْيَمُ اقْنُتِيْ لِرَبِّكِ وَاسْجُدِيْ وَارْكَعِيْ مَعَ الرَّاكِعِيْنَ (آل عمران:۴۳)	اے مریم اپنے رب کی فرمانبرداری کرو اور رکوع کرنے والوں کے ساتھ سجدہ و رکوع کرو۔

نیز مشائخ طریقت فرماتے ہیں کہ بسط میں سرور ہے اور قبض میں تکلیف اور عارفوں کا سرور، وصل معرفت کے بغیر نہیں ہوتا اور اپنی تکلیف، فصل کے بغیر دیکھے نہیں، لہٰذا وصل میں وقوف، فراق کے وقوف سے بہتر ہے۔

میرے شیخ و مرشد فرماتے ہیں کہ قبض و بسط دونوں معنی ایک ہی ہیں کیونکہ یہ دونوں حق تعالیٰ کی طرف سے بندے کے شامل حال ہوتے ہیں کیونکہ جب ان کے معانی دل پر اثر کرتے ہیں تو اس وقت بندے کا باطن یا تو مسرور ہوتا ہے اور نفس مغلوب یا پھر باطن مغلوب ہوتا ہے اور نفس مسرور۔ ایک سے دل کے قبض میں اس کے نفس کی کشادگی ہے اور دوسرے سے باطن کی کشادگی میں اس کے نفس کا قبض ہے۔ اس کے سوا جو بیان کرتا ہے وہ اپنے وقت کو ضائع کرتا ہے۔

حضرت بایزید بسطامی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ ''قبض القلوب فی بسط النفوس وبسط القلوب فی قبض النفوس '' دلوں کا قبض، نفسوں کی کشادگی میں ہے اور دلوں کی کشادگی، نفسوں کے قبض میں ہے۔ لہٰذا قبض شدہ نفس خلل سے محفوظ ہے اور بسط شدہ باطن، زوال سے مضبوط ہے۔ اس لئے کہ محبت میں غیرت بری ہے اور قبض میں غیرت الٰہی کی علامت ہے محبّ کو محبّ کے ساتھ عتاب کرنا شرط ہے۔ اور بسط معاتبت کی علامت ہے آثار میں مروی ہے کہ حضرت یحیٰ علیہ السلام تمام عمر روتے رہے اور حضرت عیسی علیہ السلام ہمیشہ ہنستے رہے کیونکہ حضرت یحیٰ قبض کو قبول کئے ہوئے تھے اور حضرت عیسیٰ بسط کو۔ جب ایک دوسرے سے ملاقات کرتے تو حضرت یحیٰ کہتے کہ اے عیسیٰ آپ قطعیت یعنی جدائیگی سے محفوظ ہیں اور حضرت عیسیٰ فرماتے ہیں کہ اے یحیٰ تم رحمت سے مایوس ہو، اس لئے کہ تمہارا رونا نہ تو ازلی حکم کو بدلتا ہے اور نہ میرا ہنسنا قضائے الٰہی کو پلٹتا ہے۔ لہٰذا ''لا قبض ولا بسط

ولا طمس ولا انس ولا محو ولا صحو ولا لحق ولا محق ولا عجز ولا جهل الا من اللہ تعالٰی" نہ قبض ہے نہ بسط، نہ رکنا ہے نہ محبت کرنا ہے، نہ مٹنا ہے نہ صحو، نہ حق ہے، نہ محق، نہ عجز اور نہ جہل، سب اللہ کی طرف سے ہے۔

انس و ہیبت اور ان کا فرق

واضح رہنا چاہئے کہ اللہ تعالٰی تمہیں سعید بنائے۔ ہیبت و انس، سالکانِ راہِ حق کے دو حال کا نام ہے۔ جب حق تعالٰی بندے کے دل پر مشاہدہ جلال سے تجلی فرماتا ہے تو اس وقت اس کے دل پر ہیبت طاری ہو جاتی ہے۔ پھر جب مشاہدۂ جمال سے تجلی فرماتا ہے تو اس کے دل پر محبت و انس کا غلبہ ہو جاتا ہے یہاں تک کہ اہل محبت اس کے جلال سے حیرت زدہ اور اہل انس و محبت اس کے جمال سے خوشی میں مگن ہو جاتے ہیں۔ لہٰذا جو دل جلال الٰہی کی محبت کی آگ میں جلتے ہیں اور وہ دل جو اس کے جمال کے نور کے مشاہدہ میں تاباں ہیں ان کے درمیان یہ فرق ہے۔

مشائخ کی ایک جماعت فرماتی ہے کہ ہیبت عارفوں کا درجہ ہے اور انس مریدوں کا مقام اس لئے کہ بارگاہِ قدس کی تنزیہہ اور اس کے قدیم اوصاف میں جتنا کمال حاصل ہوگا۔ اتنا ہی اس کے دل پر ہیبت کا غلبہ ہوگا اور انس سے اس کی طبیعت زیادہ دور ہوگی کیونکہ انس ہم جنسوں سے ہوتا ہے اور حق تعالٰی سے مجانست اور مشاکلت محال ہے لہٰذا وہاں انس کی کوئی صورت متصور نہیں ہو سکتی اسی طرح حق تعالٰی کا مخلوق سے انس کرنا بھی محال ہے۔ اگر انس کی کوئی صورت ممکن ہے تو اس کے ذکر اور اس کی یاد کے ساتھ انس کرنا ممکن ہو سکتا ہے کیونکہ اس کا ذکر غیر ہے اور وہ بندے کے صفات کے قبیل سے ہے۔ محبت میں غیروں کے ساتھ آرام پانا جھوٹ، ادعائے محض اور خالص گمان ہے اور ہیبت عظمت کے مشاہدے کی قبیل سے ہے اور عظمت، حق تعالٰی کی صفت ہے لہٰذا جس بندے کا کام اپنے فعل کے ساتھ ہو اور جس بندے کا کام اپنے افعال کو فنا کر کے بقائے حق کے ساتھ ہو اس کے اور اس کے درمیان بہت بڑا فرق

ہے۔

حضرت شبلی علیہ الرحمۃ فرماتے ہیں کہ میں عرصہ تک اس گمان میں رہا کہ محبت میں خوش رہتا ہوں اور مشاہدۂ الٰہی سے انس پاتا ہوں۔ اب میں نے جانا کہ انس اپنی ہی ہم جنس سے ہو سکتا ہے۔

ایک جماعت یہ کہتی ہے کہ ہیبت، فراق و عذاب کا ثمرہ ہے اور انس، رحمت و وصل کا نتیجہ ہے۔ اسی بنا پر دوستوں کے لئے لازم ہے کہ وہ ہیبت کے اقسام سے محفوظ رہیں اور انس و محبت کے قریب رہیں۔ یقیناً انس، محبت کا اقتضاء کرتی ہے جس طرح محبت کے لئے ہم جنسی محال ہے اسی طرح انس کے لئے بھی محال ہے۔

میرے شیخ و مرشد فرماتے ہیں کہ میں اس شخص پر تعجب کرتا ہوں جو یہ کہتا ہے کہ حق تعالیٰ کے لئے انس ممکن نہیں۔ باوجود یہ کہ یہ اس کا ارشاد ہے اس نے فرمایا ہے: "ان عبادی" یہ میرے بندے ہیں" یَا عِبَادِیْ لَا خَوْفٌ عَلَیْکُمُ الْیَوْمَ وَلَآ اَنْتُمْ تَحْزَنُوْنَ" (الزخرف: ٦٨) اے میرے بندو آج نہ تم پر خوف ہے اور نہ تم غمگین ہوگے لامحالہ جب بندہ حق تعالیٰ کے اس فضل کو دیکھتا ہے تو وہ اس سے محبت کرتا ہے اور جب محبت کرتا ہے تو انس بھی حاصل کرتا ہے کیونکہ دوست سے ہیبت، غیریت کی علامت ہے اور انس یگانگت کی نشانی ہے۔ آدمی کی یہ خصلت ہے کہ وہ نعمت عطا کرنے والے کے ساتھ انس رکھتا ہے اور حق تعالیٰ کی نعمتیں تو ہم پر بے شمار ہیں۔ اسی نے ہمیں اپنی معرفت سے نوازا ہے پھر ہم ہیبت کی بات کس طرح کر سکتے ہیں؟

حضور سیدنا داتا گنج بخش رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ دونوں گروہ اپنی اپنی تعریف میں اختلاف کے باوجود راہ یاب اور درست ہیں۔ اس لئے کہ ہیبت کا غلبہ نفس اور اس کی خواہش کے ساتھ ہوتا ہے اور اس ہیبت کے ذریعہ اپنے اوصاف بشریت کو فنا کرنے، باطن میں انس کو غالب کرنے اور باطن میں معرفت کی پرورش کرنے میں مدد ملتی ہے اور حق تعالیٰ کی تجلی جلال سے دوستوں کا نفس فنا ہو جاتا ہے اور تجلی جمال سے ان کا باطن باقی رہتا ہے لہٰذا جو اہل فنا ہیں وہ ہیبت کو

مقدم کہتے ہیں اور جوار بابِ بقا ہیں وہ انس کو فضیلت دیتے ہیں۔اس سے قبل فنا و بقا کی تشریح کی جا چکی ہے۔

قہر ولطف اور ان کا فرق

قہر ولطف یہ دو لفظ ایسے ہیں جن سے مشائخِ طریقت اپنے احوال کی تعبیر کرتے ہیں۔ قہر سے ان کی مراد یہ ہے کہ حق تعالیٰ کی تائید سے اپنی مرادوں کو فنا کریں اور اس کی خواہشوں سے نفس کو محفوظ رکھیں بغیر اس کے کہ اس میں ان کا کوئی مطلب ہو اور لطف سے ان کی مراد یہ ہے کہ حق تعالیٰ کی تائید سے باطن کو باقی رکھیں اور ہمیشہ مشاہدے میں مشغول رہیں اور درجہ استقامت میں حال انتہا تک برقرار رہے۔

ایک جماعت کہتی ہے کہ کرامت و اعزاز یہ ہے کہ حق تعالیٰ سے مراد حاصل کرلے۔ یہ اہل لطف ہیں اور ایک گروہ یہ کہتا ہے کہ کرامت یہ ہے کہ حق تعالیٰ بندے کو اپنی مراد اور اس کی مراد دونوں سے بچائے رکھے اور اسے نامرادی کے ساتھ مغلوب کرے مثلاً دریا میں جائے تو پیاس کی حالت میں دریا خشک ہو جائے۔ واللہ اعلم بالصواب

بغداد میں صاحب مرتبہ فقراء میں سے دو درویش تھے۔ ایک صاحب قہر و غلبہ تھے اور دوسرے صاحب لطف و کرم۔ ہمیشہ ایک دوسرے میں نوک جھونک رہا کرتی تھی۔ ہر ایک اپنے حال کو بہتر بتاتا تھا۔ ایک کہتا کہ حق تعالیٰ کا لطف و کرم بندے پر بہت بزرگ شی ہے کیونکہ اس کا ارشاد ہے کہ ''اَللّٰہُ لَطِیْفٌم بِعِبَادِہٖ'' (الشوریٰ:۱۹) اللہ اپنے بندوں پر مہربان ہے اور دوسرا کہتا کہ حق تعالیٰ کا قہر و غلبہ بندہ پر بہت زیادہ مکمل شی ہے چنانچہ وہ فرماتا ہے ''وَھُوَ الْقَاھِرُ فَوْقَ عِبَادِہٖ'' (الانعام:۶۱) اللہ اپنے بندوں پر غالب ہے۔ ان دونوں درویشوں کی نوک جھونک نے بہت طول پکڑا۔ یہاں تک کہ ایک وقت ایسا آیا کہ صاحب لطف درویش نے مکہ مکرمہ کا قصد کیا وہ بیابان میں ٹھہر گیا اور مکہ مکرمہ نہ پہنچ سکا برسوں تک کسی کو اس کی خبر تک نہ ہوئی یہاں تک کہ ایک شخص مکہ مکرمہ سے بغداد آ رہا تھا اس نے اس درویش کو دریا کے کنارے

دیکھا۔ درویش نے اس سے کہا کہ اے بھائی! جب تم عراق پہنچو تو کرخ میں میرے فلاں رفیق سے کہنا کہ اگر تم چاہتے ہو تو اس مشقت کے باوجود جنگل میں بغداد کے محلّہ کرخ کی مانند اس کے عجائبات کو دیکھنا چاہو تو آ جاؤ کیونکہ یہ جنگل میرے لئے حق تعالیٰ نے بغداد کی مانند بنا دیا ہے۔ جب یہ شخص کرخ پہنچا تو اس کے رفیق کو تلاش کر کے اس کا پیغام پہنچایا۔ اس کے جواب میں اس نے کہا۔ جب تم پھر جاؤ تو اس درویش سے کہنا کہ اس میں کوئی بزرگی نہیں ہے کہ مشقت کے ساتھ جنگل کو تمہارے لئے کرخ کی مانند بنا دیا گیا ہے۔ یہ اس لئے ہوا کہ ہو تم درگاہِ الٰہی سے بھاگ نہ اٹھو بزرگی تو یہ ہے کہ بغداد کے محلّہ کرخ کو اس کی نعمتوں اور اس کے عجائب کے باوجود مشقت کے ساتھ کسی کے لئے جنگل بنا دیا جائے اور وہ اس میں خوش و خرم رہے۔

حضرت شبلی علیہ الرحمۃ اپنی مناجات میں کہتے ہیں کہ اے خدا اگر تو آسمان کو میرے گلے کا طوق اور زمین کو میرے پاؤں کی زنجیر اور عالم کو میرے خون کا پیاسا بنا دے تب بھی میں تیری بارگاہ سے نہ ہٹوں گا۔

میرے مرشد رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ ایک سال جنگل میں اولیاء کا اجتماع ہوا۔ میرے مرشد حضرت حصری رحمۃ اللہ علیہ مجھے اپنے ہمراہ وہاں لے گئے۔ میں نے وہاں ایک جماعت دیکھی جو تخت کے نیچے تھی اور ایک جماعت دیکھی جو تخت پر بیٹھی تھی۔ کوئی اڑتا آ رہا تھا اور کوئی کسی طریق سے۔ میرے مرشد نے کسی کی طرف التفات نہ کیا یہاں تک کہ ایک جوان کو میں نے دیکھا جس کی جوتیاں پھٹی ہوئی تھیں اور عصا شکستہ تھا۔ پاؤں ننگے، بدن جھلسا ہوا، جسم کمزور و لاغر، جب وہ نمودار ہوا تو حضرت حصری رحمۃ اللہ علیہ دوڑ کر اس کے پاس پہنچے اور اسے بلند تر جگہ پر بٹھایا۔ فرماتے ہیں کہ میں یہ دیکھ کر حیرت میں پڑ گیا۔ اس کے بعد میں نے شیخ سے دریافت کیا تو انہوں نے فرمایا یہ بندہ ایسا صاحب ولی ہے کہ وہ ولایت کا تابع نہیں ہے بلکہ ولایت اس کے تابع ہے وہ کرامتوں کی طرف توجہ نہیں کرتا۔

غرضکہ جو کچھ ہم از خود اختیار کریں وہ ہمارے بلا ہوتی ہے۔ میں اس کے سوا کچھ نہیں

چاہتا کہ حق تعالیٰ مجھے اس منزل میں اس کی آفت سے محفوظ رکھے اور میرے نفس کی برائی سے بچائے۔ اگر وہ قہر وغلبہ میں رکھے تو میں لطف ومہربانی کی تمنا نہیں کروں گا اور اگر لطف وکرامت میں رکھے تو میں قہر وغلبہ کا آرزو مند نہ ہوں گا ہمیں اس کے اختیار کرنے میں کوئی اختیار نہیں ہے۔

نفی واثبات اوران کا فرق

مشائخ طریقت نے تائید حق کے ساتھ صفتِ بشریت کی محو کو فنا واثبات کے نام سے تعبیر کیا ہے۔ صفتِ بشیریت کی فنا کو نفی سے اور غلبہ حقیقت کے وجود کو اثبات کہا ہے۔ اس لئے کہ ''محو'' کل کے مٹ جانے کو کہتے ہیں اور کل کی نفی بجز صفات کے، ذات پر ممکن نہیں ہے کیونکہ جب تک بشریت باقی ہے اس وقت تک ذات سے کل کی نفی کی کوئی صورت ممکن ہی نہیں۔ لہٰذا ضروری ہے کہ مذموم صفات کی نفی، خصائل محمودہ کے اثبات کے ساتھ کی جائے مطلب یہ کہ معنی کے اثبات کے۔ لئے حق تعالیٰ سے معیت میں، دعوے کی نفی ہو کیونکہ دعوٰی کرنا، نفس کے غرور کی قسم سے ہے جو انسان کی عام عادت ہے جب غلبہ حقیقت میں اوصاف مغلوب ومقہور ہو جاتے ہیں اس وقت کہا جاتا ہے کہ صفات بشیریت کی نفی، حق کی بقا کے اثبات کے ساتھ ہوگی۔ قبل ازیں فقر وصفوت اور فنا وبقا کے باب میں بہت کچھ کہا جا چکا ہے فی الحال اسی پر اکتفا کیا جاتا ہے۔

مشائخ طریقت فرماتے ہیں کہ اسی نفی سے مراد، حق تعالیٰ کے اختیار کے اثبات میں بندے کے اختیار کی نفی ہے۔ اسی بنا پر ایک بزرگ فرماتے ہیں کہ ''**اختیار الحق لعبده مع علمه لعبده خير من اختيار عبده لنفسه مع جهله بربه**'' حق تعالیٰ کا اختیار اس کے بندے کے لئے اس کے اپنے علم سے بہتر ہے۔ اس سے جو بندے کو اپنے نفس کے لئے خدا سے غافل رہ کر اختیار پایا جائے۔ اس لئے کہ محبت میں محبّ کے اختیار کی نفی، محبوب کے اختیار کے اثبات سے وابستہ ہے یہ بات مسلم ہے۔

ایک درویش دریا میں غرق ہو رہا تھا۔ کسی نے اس سے کہا اے بھائی! کیا تو چاہتا ہے کہ نکال لیا جائے؟ اس نے کہا نہیں، پھر اس نے پوچھا کیا چاہتا ہے کہ غرق ہو جائے؟ درویش نے کہا نہیں، اس نے کہا عجیب بات ہے کہ نہ تو ہلاکت چاہتا ہے نہ نجات؟ درویش نے کہا مجھے ایسی نجات کی حاجت نہیں جس میں میرا اختیار شامل ہو۔ میرا اختیار تو وہ ہے جو میرے رب کے اختیار میں ہے۔

مشائخ طریقت فرماتے ہیں کہ محبت میں کم سے کم درجہ اپنے اختیار کی نفی ہے کیونکہ حق تعالیٰ کا اختیار ازلی ہے اس کی نفی ممکن نہیں اور بندے کا اختیار عارضی ہے اس کی نفی جائز ہے۔ لازم ہے کہ عارضی اختیار کو پائمال کیا جائے تا کہ ازلی اختیار قائم و باقی رہے جس طرح کہ موسیٰ علیہ السلام جب کوہِ طور پر مسرور ہوئے تو اپنے اختیار کو برقرار رکھتے ہوئے حق تعالیٰ کے دیدار کی تمنا کا اظہار کیا اور خدا سے عرض کیا کہ "رَبِّ اَرِنِیْ" اے رب مجھے اپنا جلوہ دکھا۔ حق تعالیٰ نے فرمایا "لَنْ تَرَانِیْ" تم مجھے ہرگز نہیں دیکھ سکو گے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے عرض کیا اے خدا دیدار تو حق ہے اور میں اس کا مستحق بھی ہوں پھر کیوں منع فرمایا جا رہا ہے؟ ارشاد ہوا کہ دیدار حق ہے لیکن محبت میں اپنا اختیار باقی رکھنا باطل ہے۔ اس مسئلہ میں گفتگو تو بہت ہے مگر میرا مقصود چونکہ اختصار ہے۔ بتوفیق الٰہی اس کا مختصر تذکرہ جمع و تفرقہ، فنا و بقا اور غیبت و حضور میں بھی گزر چکا ہے یہاں اسی پر اکتفا کیا جا رہا ہے۔

مسامرہ و محادثہ اور ان کا فرق

مسامرہ اور محادثہ کے دونوں لفظ، کاملانِ طریقت کے احوال کی دو حالتیں ہیں۔ محادثہ کی حقیقت باطنی کیفیت سے متعلق ہے جہاں زبان کو خاموش رکھا جاتا ہے اور مسامرہ کی حقیقت، باطنی واردات کے چھپانے پر ہمیشہ خوش رہنا ہے۔ ان کے تمام ظاہر معنی یہ ہیں کہ مسامرہ، ایک وقت ہے جبکہ بندہ رات میں حق تعالیٰ کے ساتھ ہو اور محادثہ وہ وقت ہے جو دن میں حق تعالیٰ کے ساتھ ہو۔ دن کے اس وقت میں بندہ حق تعالیٰ سے ظاہری و باطنی سوال و

جواب کرتا ہے۔ اسی بنا پر رات کی مناجات کو مسامرہ اور دن کی دعاؤں کو محادثہ کہتے ہیں گویا دن کا حال کشف پر مبنی ہے اور رات کا حال خفا پر اور محبت میں مسامرہ، محادثہ سے کامل تر ہوتا ہے۔ مسامرہ کا تعلق حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے حال سے وابستہ ہے۔ جب حق تعالیٰ نے چاہا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو قربِ خاص سے نوازے تو جبریل علیہ السلام کو براق دے کر آپ کے پاس بھیجا تا کہ وہ مکہ سے قاب قوسین تک لے جائے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم حق تعالیٰ سے ہمراز ہوں۔ چنانچہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم خدا سے ہم کلام ہوئے جب انتہا تک رسائی ہوئی تو آپ کی زبان مبارک ظہور جلال باری میں سرخ ہوگئی اور آپ کا دل عظمت کی تہ میں متحیر ہوگیا اور آپ کا علم ادراک سے رہ گیا۔ زبان مبارک عبارت سے عاجز ہوگئی۔ اس وقت عرض کیا "لَا اُحْصِیْ ثَنَآءً عَلَیْکَ" تیری حمد وثنا کرنے سے عاجز ہوں۔

محادثہ کا تعلق حضرت موسیٰ علیہ السلام کے حال سے ہے۔ جب چاہا کہ ان کا ایک وقت حق تعالیٰ کے ساتھ ہو تو چالیس دن وعدۂ انتظار کے بعد دن میں کوہِ طور پر آئے۔ خدا کا کلام سنا تو مسرور ہوئے۔ دیدار کی خواہش کی تو مراد سے رہ گئے اور ہوش سے جاتے رہے۔ جب ہوش آیا تو عرض کیا "تُبْتُ اِلَیْکَ" تیری طرف رجوع ہوتا ہوں۔ تاکہ فرق ہو جائے کہ ایک وہ ہے جو آتا ہے اور ایک وہ ہے جو لے جایا جاتا ہے۔ "سُبْحَانَ الَّذِیْٓ اَسْرٰی بِعَبْدِہٖ لَیْلًا" (بنی اسرائیل) پاک ہے وہ ذات جو راتوں رات بندے کے لے گیا۔ یہ وہ بندہ ہے جو لے جایا گیا اور وہ وہ بندہ ہے جو خود آتا ہے۔ اس بندے کے متعلق ارشاد ہے "وَلَمَّا جَآءَ مُوْسٰی لِمِیْقَاتِنَا" (الاعراف:۱۴۳) جب موسیٰ ہماری مقررہ جگہوں میں آئے۔ اس لئے رات دوستوں کی خلوت کا وقت ہے اور دن بندوں کی خدمت کرنے کا وقت۔ لامحالہ جب بندۂ محدود حد سے تجاوز کر جاتا ہے تو اسے تنبیہہ کی جاتی ہے۔ پھر دوست ومحبوب کی کوئی حد نہیں ہوتی جس سے تجاوز ممکن ہو اور وہ مستحق ملامت بنے۔ محبوب جو بھی کچھ کرے محب کا پسندیدہ ہوتا ہے۔

علم الیقین، عین الیقین، حق الیقین اوران کا فرق

واضح رہنا چاہئے کہ باعتبار اصول، یہ تینوں کلمے علم سے متعلق ہیں جو اپنے جاننے کے ساتھ ہیں اور اپنے جاننے کے بیان کی صحت پر غیر یقینی علم، علم نہیں ہوتا اور جب علم حاصل ہو جاتا ہے تو اس سے غیب و خفا مرتفع ہو کر مشاہدۂ عینی کی مانند بن جاتا ہے۔ اس لئے کہ کل روزِ قیامت جب ہر مسلمان دیدار باری تعالیٰ سے مشرف ہوگا تو وہ بھی اسی صفت پر دیکھے گا جس صفت میں آج جانتا ہے۔ اگر وہ دید اس کے خلاف ہوگی تو کل کی رویت یا تو صحیح نہ ہوگی یا اس کا علم درست نہ ہوگا۔ حالانکہ یہ دونوں صفتیں توحید کے منافی ہیں اس لئے کہ مخلوق کو اس کا علم جو آج حاصل ہے وہ اسی کی طرف سے درست ہے کل اس کی رویت بھی اسی کی طرف سے درست ہوگی۔ لہٰذا علم الیقین عین الیقین کی مانند اور حق الیقین، علم الیقین کی مانند ہوگا۔ وہ حضرات جو عین الیقین کے بارے میں کہتے ہیں کہ رویت میں علم کا استغراق ہوتا ہے۔ یہ محال ہے۔ اس لئے کہ رویت حصول علم کے لئے ایک ذریعہ اور آلہ ہے جیسے کہ سننا ایک ذریعہ ہے۔ جبکہ علم کا استغراق سننے میں محال ہے تو رویت میں بھی محال ہے۔ لہٰذا اہل طریقت کے نزدیک علم الیقین سے مراد، دنیاوی معاملات میں اوامر و احکام کا جاننا ہے اور عین الیقین سے مراد، جانکنی اور دنیا سے کوچ کرنے کے وقت کا علم ہے اور حق الیقین سے مراد، جنت میں رویت کا کشف اور اس کے احوال کے معائنہ کی کیفیت ہے۔ گویا علم الیقین علماء کا درجہ ہے کہ وہ احکام و اوامر پر استقامت رکھتے ہیں اور عین الیقین عارفوں کا مقام ہے کہ وہ موت کے لئے ہمیشہ تیار رہتے ہیں اور حق الیقین، محبوبانِ خدا کی فنا کا مقام ہے کہ وہ تمام موجودات سے کنارہ کش ہو جاتے ہیں۔ علم الیقین مجاہدے سے ہوتا ہے عین الیقین انس و محبت سے اور حق الیقین مشاہدے سے اور یہ کہ ایک عام ہے دوسرا خاص تیسرا خاص الخاص۔ واللہ اعلم۔

علم و معرفت اوران کا فرق

علماء اصول علم و معرفت کے درمیان فرق نہیں کرتے اور دونوں کو ایک ہی کہتے ہیں مگر عارف کہنا جائز نہیں ہے۔ چونکہ اس کے تمام اسماء توفیقی ہیں۔ لیکن مشائخ طریقت ایسے علم کو جو

معاملہ اور حال سے متعلق ہو اور اس کا عالم اپنے حال کو اس سے تعبیر کرے معرفت کہتے ہیں اور اس کے جاننے والے کو عارف اور جو علم ایسا ہو جس کے صرف معنی ہی ہوں اور وہ معاملہ سے خالی ہو اس کا نام علم رکھتے ہیں اور اس کے جاننے والے کو عالم کہتے ہیں لہٰذا وہ شخص جو کسی چیز کے معنی اور اس کی حقیقت کا عالم ہو اس کا نام عارف رکھا گیا ہے اور وہ شخص جو صرف عبارت جانتا ہو اور اس کی معنوی حقیقت سے آشنا ہو اس کا نام عالم رکھا گیا ہے۔ یہ طبقہ جب ان معنوں کو اپنے ہم زمانہ لوگوں پر بیان کرتا ہے تو ان کا استخفاف کرتا ہے ان کو دانش مند بناتا ہے اور عوام کو منکران کی مراد، ان کے حصول علم کی بناء پر ان کی مذمت کرنا نہیں ہوتی بلکہ ان کی مراد معاملہ کو ترک کرنے کی برائی ظاہر ہوتی ہے۔

''لان العالم قائم بنفسه والعارف قائم بربه'' اس لئے کہ عالم اپنی ذات کے ساتھ قائم ہوتا ہے اور عارف اپنے رب کے ساتھ ''معرفت سے حجاب کشف'' کے بیان میں بہت کچھ تشریح کی جا چکی ہے اس جگہ اتنا ہی کافی ہے۔

شریعت وحقیقت اور ان کا فرق

شریعت وحقیقت، مشائخ طریقت کے دو اصطلاحی کلمے ہیں۔ جن میں سے ایک ظاہر حال کی صحت کو واضح کرتا ہے اور دوسرا باطن کے حال کی اقامت کو بیان کرتا ہے ان کی تعریف میں دو طبقے غلطی میں مبتلا ہیں۔ ایک علماء ظاہر ہیں جو کہتے ہیں کہ ہم ان میں فرق نہیں کرتے کیونکہ شریعت، خود حقیقت ہے اور حقیقت خود شریعت ہے۔ دوسرا طبقہ ملحدوں و بے دینوں کا ہے جو ہر ایک کا قیام ایک دوسرے کے بغیر جانتے ہیں اور کہتے ہیں کہ جب حال حقیقت بن جائے تو شریعت اٹھ جاتی ہے۔ یہ نظریہ مشبّہ، قرامطہ، مشبعہ اور موسان کا ہے۔ شریعت وحقیقت کے جدا ہونے پر دلیل یہ دیتے ہیں کہ محض تصدیق جو بغیر اقرار کے ہو اسے ایماندار نہیں بناتی اور نہ صرف اقرار بغیر تصدیق کے اسے مومن بناتا ہے۔ قول وتصدیق کے درمیان فرق ظاہر ہے۔ لہٰذا حقیقت اسی معنی کی تعبیر ہے جس پر نسخ جائز نہیں ہے۔ حضرت آدم سے فنائے عالم تک اس کا حکم قائم و یکساں ہے۔ مثلاً معرفتِ حق، معاملہ میں خلوص نیت وغیرہ اور

شریعت اس معنی کی تعبیر ہے جس پر نسخ وتبدیل جائز ہے مثلاً احکام واوامر وغیرہ۔ شریعت بندہ کا فعل ہے اور حقیقت حق تعالٰی کی حفاظت اور اس کی عصمت وتنزیہہ۔ معلوم ہوا کہ شریعت کا قیام، حقیقت کے وجود کے بغیر محال ہے اور حقیقت کا قیام، شریعت کی حفاظت کے بغیر بھی محال ہے۔ اس کی مثال اس شخص کی مانند ہے جو روح کے ساتھ زندہ ہو۔ جب روح اس سے جدا ہو جاتی ہے تو وہ شخص مردہ ہو جاتا ہے اور روح جب تک رہتی ہے تو اس کی قدر و قیمت ایک دوسرے کے ساتھ رہنے تک ہے۔ اسی طرح شریعت بغیر حقیقت کے ریا ہے اور حقیقت بغیر شریعت کے نفاق۔ اللہ تعالٰی فرماتا ہے "وَالَّذِيْنَ جَاهَدُوْا فِيْنَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا" (العنکبوت:٦٩) جن لوگوں نے ہماری راہ میں کوشش کی یقیناً ہم نے ان کو اپنا راستہ دکھایا۔ مجاہدہ شریعت ہے اور ہدایت اس کی حقیقت۔ ایک بندہ کے ذمے ظاہری احکام کی حفاظت ہے دوسرے پر حق تعالٰی کی حفاظت جو بندے کے باطنی احوال سے تعلق رکھتی ہے لہٰذا شریعت از قسم کسب ہے اور حقیقت از قسم عطائے ربانی ہے۔

"آخری نوع، دیگر مصلحاتِ مشائخ کے بیان میں"

اس آخری نوع میں ان کلمات کی تعریف ہے جو مشائخ طریقت کے کلام میں بطور اصلاح و استعارہ مستعمل ہیں۔ جن کی تفصیل وشرح اور احکام زیادہ دشوار ہیں۔ اختصار کے ساتھ بیان کئے جاتے ہیں۔

الحق:

اس سے مشائخ طریقت کی مراد رب العزت کی ذات اقدس ہے اس لئے کہ اس کے اسماء میں سے حق بھی ایک نام ہے جیسا کہ "بِاَنَّ اللّٰهَ هُوَالْحَقُّ" (الحج:٦٢) یقیناً اللہ وہی حق ہے۔

الحقیقۃ:

اس سے مراد، وصل الٰہی کے محل میں بندے کا قیام ہے اور محل تنزیہہ میں بندے کے باطن کا وقوف ہے۔

الخطرات:

اس سے مراد طریقت کے وہ احکامات ہیں جو دل پر گزرتے ہیں۔

الوطنات:

اس سے مراد، وہ معانی ہیں جو متوطن کے باطن میں وارد ہوں۔

الطمس:

عین کی ایسی نفی کہ اس کا اثر بھی نہ رہے۔

الرمس:

عین کی ایسی نفی کہ دل پر اس کا اثر رہے۔

العلائق:

ایسے اسباب ہیں جن سے طالب تعلق رکھنے کی وجہ سے مراد و مقصود سے رہ جائے۔

الوسائط:

ایسے اسباب جن سے طالب تعلق رکھ کر مقصود و مراد کو حاصل کرلے۔

الزوائد:

دل میں انوار کی زیادتی۔

الفوائد:

اپنے ضروری اسرار کا ادراک کرنا۔

الملجا:

اپنی مراد کے حصول میں دل پر اعتماد کرنا۔

المنجا:

محل آفت سے دل کا نجات پا جانا۔

الکلیۃ:

پورے طور پر بشری اوصاف میں مستغرق ہونا۔

اللوائح:

اثبات مراد اور واردات کی نفی۔

اللوامع:

دل پر نور کا ظہور، اس کے فوائد کے باقی رہنے کے ساتھ۔

الطّوالع:

دل کا نورِ معرفت سے روشن ہونا۔

الطّوارق:

شب بیداری میں عبادت و مناجات کے دوران دل پر خوشخبری یا فتنہ کی حالت کا طاری ہونا۔

السر:

محبت و دوستی کے معاملہ کو پوشیدہ رکھنا۔

النجوٰی:

راز و نیاز کے ذریعہ تکالیف و مصائب سے تحفظ حاصل کرنا تا کہ غیر کو خبر نہ ہو۔

الاشارۃ:

بغیر الفاظ استعمال کئے اپنا مطلب اشارۃً بیان کرنا۔

الایما:

ظاہری اشارہ اور الفاظ کے بغیر کسی دوسری کیفیت کے ذریعہ کچھ بتانا۔

الوارد:

معانی کا دل نشین ہونا۔

الانتباہ:

دل کا ہوشیار ہونا اور غفلت سے بیدار ہونا۔

الاشتباہ:

کسی چیز کا حق و باطل کے درمیان اس طرح مخلوط ہونا کہ حقیقت کا امتیاز نہ ہو سکے۔

القرار:

کسی تردد کے بغیر معاملہ کی حقیقت پر سکون دل اور قرار قلب کا حاصل ہونا۔

الانزعاج:

راہ راست پر ہونے کے باوجود حالات اضطراب میں ہونا۔

مذکورہ اصطلاحات کا مطلب نہایت مختصر بیان کیا گیا ہے۔

توحید کی وضاحت کے لئے اہل طریقت کی اصطلاحات

یہ اصطلاحات اظہار اعتقاد کے لئے بغیر استعارہ کے استعمال ہوتی ہیں۔

العالَم:

عالم کا مطلب خدا کے علاوہ تمام موجودات ومخلوقات جن کی تعداد اٹھارہ ہزار اور بعض روایات کے مطابق پچاس ہزار ہے۔ فلسفیوں کے نزدیک عالم کی دو قسمیں بنیادی ہیں۔ (۱) عالَمِ علوی یا عالَمِ بالا۔ (۲) عالَمِ سفلی یا عالَمِ دنیا۔ حقیقت شناس کہتے ہیں کہ عرش سے تحت الثریٰ یعنی تمام مخلوق ایک ہی عالَم ہے دراصل ایک نوعیت کی مخلوق کے اجتماع کا نام عالم ہے جس طرح کہ اہل طریقت کے ہاں ایک عالَمِ ارواح ہے اور دوسرا عالَمِ نفوس، مگر ان دونوں کے ایک جگہ جمع ہونے کا نام عالم نہیں جیسا کہ فلاسفہ کہتے ہیں بلکہ عالَمِ دنیا میں عالَمِ ارواح الگ ہے اور عالَمِ اجسام یا نفوس الگ۔

المحدث:

جو عدم سے وجود میں آیا ہو۔

القدیم:

جو تمام موجودات سے پہلے ہمیشہ سے تھا اب بھی ہے اور آئندہ بھی رہے گا۔ خواہ دیگر موجودات رہیں یا نہ رہیں یہ صرف ذات باری تعالیٰ ہے جس کے سوا کوئی ہستی قدیم نہیں۔

الازل:

جو آغاز وابتداء سے ماوراء ہو۔

الابد:

جو انجام وانتہاء سے بے نیاز ہو۔

الذات:

اصلیت، حقیقت، ہستی اور وجود کا نام ذات ہے۔

الصفت:

کوئی خوبی جو بذات خود قائم نہ ہو مثلاً علم و حسن وغیرہ۔

الاسم:

کسی چیز کی اصلیت یا کیفیت کا تعارفی کلمہ یا اشارہ۔

التسمیہ:

ایسا تعارف جس میں عظمت کا پہلو پوشیدہ ہو یا نام رکھنا۔

النفی:

کسی فانی چیز کا نہ ہونا واضح کرنا۔

الاثبات:

ہو سکنے والی چیز کا وجود یا ہونا ثابت کرنا۔

الشیہان:

ایسی دو چیزیں جن کا وجود ایک دوسرے کی موجودگی میں جائز ہو۔

الضدان:

ایسی دو چیزیں جن میں سے ایک کا وجود دوسرے کی مؤجودگی میں کسی ایک حالت پر جائز نہ ہو البتہ مختلف حالتوں میں دونوں کا وجود الگ الگ جائز ہو۔

الغیر ان:

دو چیزوں میں سے ایک کا وجود دوسری کی فنا کے لئے جائز ہونا۔

الجوہر:

کسی چیز کا مادہ یا اصل جو بذاتِ خود قائم ہو۔

العرض:

ایسی صفت یا کیفیت جو جوہر کے ساتھ قائم ہو۔

الجسم:

ایسا مرکب جو مختلف اجزاء سے تیار کیا گیا ہو۔

السؤال:

اصلیت یا حقیقت معلوم کرنا۔

الجواب:

مطلوبہ معلومات مہیا کرنا۔

الحسن:

ایسی کیفیت جو متعلقہ چیز کے مناسب ہو اور امر حق کے موافق ہو۔

القبیح:

ایسی حالت جو متعلقہ چیز سے مناسبت نہ رکھتی ہو اور امر الٰہی کے مخالف ہو۔

السفہ:

حقیقی معاملہ کو چھوڑ دینا۔

الظلم:

کسی چیز کا مناسب استعمال نہ کرنا اور اسے موزوں مقام نہ دینا۔

العدل:

ہر معاملہ میں مناسب اور موزوں رویہ اختیار کرنا جس کے ذریعہ ہر چیز اپنا صحیح مقام حاصل کرے۔

الملک:

جس کے قول و فعل پر اعتراض نہ ہو سکے۔

یہ ایسی اصطلاحات ہیں جن سے حقیقت کے طلب گاروں کو واقف ہونا بڑا ضروری ہے۔

اصطلاحاتِ تصوف کی چوتھی اور آخری قسم

یہ اصطلاحات اہل لغت کے ظاہری معانی سے مختلف صرف صوفیا کے درمیان رائج ہیں جن کی وضاحت و تشریح ضروری ہے۔

الخاطر:

دل میں ایسے خیال و وسوسہ کا آنا جو کسی دوسرے خیال یا وسوسہ کے آنے پر زائل ہو جائے اور اس خیال کو دل سے نکالنے پر قدرت حاصل ہو۔ خیالات کی آمد کے وقت پہلے خیال کو خدا کی طرف سے سمجھ کر اہل معاملہ اپنا لیتے ہیں اور خیال اول کی پیروی کرتے ہیں:

مثلاً حضرت خیر النساج رحمتہ اللہ علیہ کے متعلق روایت ہے کہ ان کے دل میں یہ

خیال آیا کہ حضرت جنید بغدادی رحمتہ اللہ علیہ ان کے دروازے پر موجود ہیں مگر اسے وہم و وسوسہ سمجھ کر دل سے نکالنا چاہا تو عدم موجودگی کا خیال آیا، اسے دور کرنے کی کوشش کی تو تیسرا خیال پیدا ہوا کہ باہر ہی چل کر دیکھ لیں چنانچہ آپ باہر نکلے تو حضرت جنید رحمتہ اللہ علیہ دروازہ پر موجود تھے۔ انہوں نے فرمایا کہ اے خیر! اگر آپ سنتِ مشائخ پر عمل کرتے ہوئے خیال اول کی پیروی کرتے تو مجھے اتنی دیر انتظار نہ کرنا پڑتا۔ اس واقعہ کے متعلق مشائخ نے یہ سوال پیدا کیا کہ اگر حضرت خیر النساج رحمتہ اللہ علیہ کے دل میں آنے والا پہلا خیال ہی ''خاطر'' تھا تو حضرت جنید رحمتہ اللہ علیہ کس خیال میں دروازہ پر کھڑے ہوئے تھے؟ اس کا جواب بزرگوں نے خود دیا ہے کہ حضرت جنید رحمتہ اللہ علیہ چونکہ حضرت نساج رحمتہ اللہ علیہ کے پیر و مرشد تھے لہٰذا انہیں اپنے مرید کو راہ طریقت میں ''خاطر'' کا مسئلہ بتانا تھا جو آپ نے بتا دیا۔

الواقع:

واقع سے مراد دل میں پیدا ہونے والی وہ کیفیت جو ''خاطر'' کے بالعکس ہو یعنی مستقل دل نشین ہو کر نا قابل زوال ہو اور نہ اسے دور کرنے پر قدرت حاصل ہو چنانچہ ایک محاورہ ہے کہ ''**خطر علی قلبی ووقع فی قلبی** '' یعنی میرے دل پر ایک ''خیال'' گزرا اور ''واقعہ'' یا بات میرے دل میں بیٹھ گئی۔

خیالات تو تمام دلوں میں آتے ہیں مگر واقعات صرف حق تعالیٰ کے نور سے معمور دلوں میں واقع ہوتے ہیں اسی وجہ سے راہ حق میں رکاوٹ پیدا ہونے کا نام قید ہے جسے کہا جاتا ہے کہ ''ایک واقعہ ظاہر ہو گیا۔'' یعنی مشکل پیدا ہو گئی۔ اہل لغت واقعہ ایسی مشکل کو کہتے ہیں جو مسائل حل کرنے کے سلسلہ میں پیش آتی ہے جب وہ مسئلہ حل ہو جائے یا اس کا مکمل جواب مل جائے تو کہا جاتا ہے کہ واقعہ حل ہو گیا یعنی مشکل ختم ہو گئی اہل تحقیق کہتے ہیں کہ حل نہ ہونے والا معاملہ واقعہ ہوتا ہے اور اگر حل ہو جائے تو وہ خیال (خاطر) ہوتا ہے واقعہ نہیں کیونکہ اہل تحقیق کسی عظیم معاملہ ہی میں رک سکتے ہیں چھوٹی چھوٹی اور معمولی باتیں تو وہ اشاروں سے حل کر لیتے ہیں۔ خیال تو خود بخود بدلتے رہتے ہیں انہیں حل کرنے کی چنداں ضرورت ہی نہیں پڑتی۔

الاختیار:

اپنے اختیار پر اختیار مولیٰ کو ترجیح دے کر راضی برضا ہونا اور خیر و شر میں جو خدا نے ان کے لئے پسند فرمایا اسے قبول کرنا۔ اور یہ راضی برضا ہونا یا اختیار مولیٰ کو پسند کرنا بھی تو حق تعالیٰ کے اختیار اور مرضی سے ہوتا ہے اس میں بھی ذاتی اختیار کی نفی ہو جاتی ہے۔ اگر اختیار الٰہی کی برتری قبول نہ کی جاتی تو بندہ اپنے اختیار کو چھوڑنا کب گوارا کر سکتا تھا۔ حضرت بایزید رحمتہ اللہ علیہ سے پوچھا گیا کہ امین کون ہے؟ آپ نے فرمایا کہ جسے ذاتی اختیار حاصل نہ ہو اور اختیارِ مالک کو اس نے قبول کر لیا ہو۔ حضرت جنید رحمتہ اللہ علیہ سے روایت ہے کہ آپ نے بخار میں دعا فرمائی کہ خدایا! مجھے صحت عطا فرما۔ ضمیر سے آواز آئی کہ ہمارے ملک میں اپنی تدبیر اختیار کرنے والا تو کون ہوتا ہے میں اپنے ملک کے نام کو تجھ سے بہتر جانتا ہوں راضی برضا رہو اور اپنے آپ کو صاحب اختیار ظاہر نہ کرو۔ واللہ اعلم

الامتحان:

اس سے مراد اولیاء کرام کے دلوں کی آزمائش ہے یہ آزمائش بذریعہ خوف، غم، قبض اور ہیبت وغیرہ کی جاتی امتحان کے متعلق حق تعالیٰ نے یوں بیان فرمایا: "اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ امْتَحَنَ اللّٰهُ قُلُوْبَهُمْ لِلتَّقْوٰى ط لَهُمْ مَّغْفِرَةٌ وَّاَجْرٌ عَظِيْمٌ" (الحجرات:۳) یعنی یہی وہ لوگ ہیں جن کے دلوں کو اللہ نے تقویٰ (عطا کرنے) کے لئے امتحان و آزمائش میں ڈالا، ایسے پرہیز گاروں کے لئے بخشش اور اجر عظیم ہے اور یہ درجہ بہت بلند ہے۔

البلاء:

بیماریوں اور تکالیف کے ذریعہ اولیاء کے جسموں کی آزمائش جس میں دل بھی شریک ہوتے ہیں بلا کے ذریعہ جس قدر مصیبت اور پریشانی بڑھتی ہے اسی قدر قرب الٰہی میں اضافہ ہوتا ہے کیونکہ دکھ درد اولیاء کا لباس، بزرگوں کا مسکن اور انبیاء کی لازمی صفت ہے آپ کو یاد ہوگا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "نَحْنُ مَعَاشِرُ الْاَنْبِيَاءِ اَشَدُّ النَّاسِ بَلَاءً" ہم گروہ

انبیاء تمام لوگوں کی نسبت آزمائش میں زیادہ مبتلاء ہوتے ہیں اور مزید یہ فرمایا کہ "اَشَدُّ النَّاسِ بَلَاءً اَلْاَم نْبِیَاءُ ثُمَّ الْاَوْلِیَاءُ ثُمَّ الْاَمْثِلُ فَالْاَمْثِلُ" (بخاری) سب سے زیادہ مصیبت میں انبیاء ہوتے ہیں پھر اولیاء پھر وہ لوگ جو زیادہ بزرگ ہوتے ہیں پھر جوان کی طرح بزرگ ہوں مختصراً ابلاء دراصل جسم اور دل کی بیک وقت آزمائش ہوتی ہے جو خدا کی طرف سے بندہ مومن کے لئے ہوتی ہے اور امتحان صرف دل مومن کی آزمائش کا نام ہے۔ بلاء اور آزمائش مومن کے لئے ایک نعمت ہوتی ہے جس کا ظاہر تکلیف دہ اور اصل میٹھا پھل ہوتا ہے مگر کافر کے لئے وبال جسم وجان اور ذریعہ بدبختی ہے جس سے چھٹکارا ملنا مشکل ہے۔

التحلی:

کسی اچھی قوم کے اقوال کو اپنانا جس سے اچھائی پیدا ہو تحلی کہلاتا ہے جیسا کہ اقوال زریں جو مختلف قوموں کے دانا اور عقل مندوں نے بیان کئے ہیں صرف تحلی سے ایمان پیدا نہیں ہوتا جیسا کہ رہبر اعظم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "لَیْسَ الْاِیْمَانُ بِالتَّحَلِّیْ وَالتَّمَنِّیْ لٰکِنْ مَاوَقَرَ فِی الْقُلُوْبِ وَصَدَّقَهُ الْعَمَلُ" یعنی ایمان کسی طرح اچھی قوم کے اقوال قبول کرنے یا ان کی طرح بننے کی خواہش کا نام نہیں بلکہ جو کچھ دل میں بیٹھ جائے اور اس کی تصدیق عمل سے ہو جائے تو وہ حقیقت میں ایمان کہلاتا ہے چنانچہ کسی گروہ کی بغیر عمل کے باتوں میں مشابہت کرنا تحلی ہے اور یہ طریقہ رسوا کن ہے کیونکہ اصل کام عمل ہے اور بے عملی کی وجہ سے اہل تحقیق کی نظر میں وہ پہلے ہی سے ذلیل ہوتے ہیں اور ان کی حقیقت واضح ہوتی ہے۔

التجلی:

اولیاء کا دل کی آنکھ سے انوار الٰہی اور ذات حق کا اس طرح مشاہدہ کرنے کے قابل ہونا کہ وہ چاہیں تو دیکھیں اور نہ چاہیں تو نہ دیکھیں۔ تجلی کے مقابلہ میں رویت ہے جو سر کی آنکھوں سے دیکھنے کا عمل ہے یہ اہل جنت کو حاصل ہوگا اور وہاں رویت حق لازمی ہوگی کیونکہ تجلی کے لئے پردہ جائز ہے اور رویت کے لئے ناجائز رویت بہر صورت ہوتی ہے خواہ چاہیں یا

نہ چاہیں (جیسا کہ آنکھ کھولنے پر یہ ناممکن ہے کہ کچھ نہ دیکھا جائے)۔

التخلی:

قربِ الٰہی میں آڑ بننے والی مصروفیات سے کنارہ کش ہو جانا، اس سلسلہ کی ایک کڑی دنیا ہے اور دوسری آخرت ان دونوں سے دستبردار ہو کر تیسری کڑی خواہش نفس کی مخالفت اور لوگوں سے علیحدگی اختیار کرنا اور آخری کڑی دل سے دنیاوی، اخروی، نفسانی اور انسانی وسوسوں اور اندیشوں کو دور کرنے کا نام تخلی یا تخلیہ ہے۔

الشرود:

اس کا مطلب آفتوں، حجابوں اور بے قراری سے نجات طلب کرنا ہے کیونکہ طالب حق پر جو مصیبت آتی ہے وہ حجاب سے آتی ہے اس پردے اور حجاب کو کھولنے کے لئے تدبیر، تجویز اور کسی عمل کا نام شرود ہے۔ جس کا نتیجہ سکوں ہے کیونکہ طالبانِ حق کو شروع میں بے چینی ہوتی ہے اور آخر کار اطمینان و سکون۔

القصود:

مقصد حاصل کرنے کے لئے عزم صمیم اور صحیح ارادہ کرنا۔ اولیاء کا قصد و ارادہ حرکت اور سکون کے ساتھ مشروط نہیں کیونکہ دوست دوستی کے معاملہ میں ہر وقت پر عزم ہوتا ہے اور یہ عادت کے خلاف ہے کہ انسان خواہ متحرک ہو یا ساکن بغیر کسی ارادہ کے ہو کیونکہ اگر حرکت میں ہے تو ارادہ کا اظہار حرکت سے ہوتا ہے اور اگر سکون میں ہو تو اس کا ارادہ پوشیدہ ہوتا ہے اور اس کے آثار ظاہر ہوتے رہتے ہیں مگر اولیاء حق کو یہ مقام حاصل ہوتا ہے کہ ان کی حرکت و سکونت ہی قصد اور ارادہ کا لبادہ اوڑھ لیتی ہے اور تمام صفات قصد بن جاتی ہیں اور جب مقام محبت حاصل ہو جاتا ہے تو سراپا قصد و ارادہ بن جاتے ہیں۔

الاصطناع:

اس سے مراد اللہ تعالیٰ کا مومن کو تمام معاملات دنیوی سے مبرّا، لذتِ انسانی سے عاری اور خواہشات وصفات انسانی سے خالی کر کے مہذب بناتا ہے، اس طریقہ سے وہ ہوش و حواس کی گرفت سے آزاد ہو کر ماسوٰی اللہ سے بے نیاز ہو جاتا ہے یہ اصطلاح گروہِ انبیاء سے متعلق ہے۔ البتہ بعض مشائخ اولیاء کو بھی اس میں شامل کرتے ہیں۔

الاصطفاء:

اللہ تعالیٰ کا بندہ کے دل کو خاص اپنی معرفت کے لئے منتخب کرنا تاکہ اپنی معرفت کی جلا اس کے دل میں بھر دے۔ یہ درجہ انبیاء و اولیاء کے علاوہ ہر خاص و عام، فرمانبردار اور نافرمان سب کے لئے عام ہے۔ جیسا کہ حق تعالیٰ نے فرمایا: "ثُمَّ اَوْرَثْنَا الْكِتٰبَ الَّذِيْنَ اصْطَفَيْنَا مِنْ عِبَادِنَا ج فَمِنْهُمْ ظَالِمٌ لِّنَفْسِهٖ ج وَمِنْهُمْ مُّقْتَصِدٌ ج وَمِنْهُمْ سَابِقٌۢ بِالْخَيْرٰتِ" (فاطر:۳۲) یعنی ہم نے پھر ان لوگوں کو کتاب دی جنہیں ہم نے اپنے بندوں میں سے منتخب کیا، چنانچہ ان میں سے بعض تو اپنے آپ پر ظلم کرنے والے ہیں اور بعض میانہ رو ہیں اور بعض نیک کاموں میں سبقت کرنے والے ہیں۔

الاصطلام:

ایک لطیف آزمائش کے ذریعہ بندہ کے ارادہ کو زائل اور فنا کر کے غلبہ حق کا بندہ پر مسلط ہو کر دل کا امتحان لینا۔ قلب ممتحن آزمایا ہوا دل اور قلب مصطلم (جڑ سے اکھاڑا ہوا دل) دونوں ہم معنی ہیں البتہ امتحان کی نسبت اصطلام خاص اور لطیف ہے۔

الرین:

دل پر کفر و گمراہی کا ایسا پردہ جو صرف نورِ ایمان سے دور ہو سکتا ہے جیسا کہ کفار کے متعلق حق تعالیٰ نے فرمایا: "كَلَّا بَلْ رَانَ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ مَّا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ" (المطففین:

۱۴) ایسا ہرگز نہیں کہ وہ اپنی مرضی سے کفر کرتے ہیں بلکہ جو کچھ وہ کفر و شرک کیا کرتے تھے (اسی کی وجہ سے) ان کے دلوں پر ایک قسم کا زنگ یعنی پردہ پڑ گیا ہے۔ بعض کے نزدیک رین ایسا حجاب ہے جو کسی طرح زائل نہیں ہوتا کیونکہ کافروں کا دل اسلام قبول نہیں کرتا اور اگر وہ مسلمان ہو جاتے ہیں تو یہ علم الٰہی میں پہلے ہی ہوتا ہے۔

الغین:

غین اس پردہ کو کہتے ہیں جو بذریعہ استغفار زائل ہو جاتا ہے اس کی دو قسمیں ہیں خفیف اور غلیظ، حجاب غلیظ غافل اور کبیرہ گناہ کرنے والوں کے لئے ہوتا ہے اور خفیف حجاب سب کے لئے خواہ ولی ہوں یا نبی جس کی طرف اشارۂ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم بھی ہے کہ "اِنَّـــهٗ لَیُغَـانُ عَـلٰی قَلْبِیْ وَاِنِّیْ لَاَسْتَغْفِرُ اللّٰہَ فِیْ کُلِّ یَوْمٍ مِائَۃَ مَرَّۃٍ" (بخاری، ابن ماجہ) کبھی کبھی میرے دل پر ایک خفیف سا پردہ چھانے لگتا ہے تو میں اس کی مدافعت کے لئے روزانہ سو مرتبہ استغفار کرتا ہوں۔ چنانچہ خفیف پردہ کے لئے صرف رجوع الی اللہ کافی ہے اور حجاب غلیظ کے لئے توبہ شرط ہے توبہ کے معنی گناہ سے نیکی کی طرف لوٹنا ہیں اور رجوع کا مطلب اپنے ارادہ وہ اختیار سے دستبردار ہو کر اپنے آپ کو خدا کے سپرد کرنا ہے۔ نیز توبہ جرم سے کی جاتی ہے اور جرم عام بندوں کا خدا کی نافرمانی ہے اور خاص بندوں یعنی اولیاء کا اپنے آپ کو سمجھنا یا دیکھنا ہے۔ جو جرم سے توبہ کرتا ہے اسے تائب کہتے ہیں، جو غیروں سے الگ ہو کر خدا کی طرف لوٹے اسے انابت کہتے ہیں اور جو اپنے وجود سے بھی بے نیاز ہو کر راضی برضا ہو جائے اسے اواب کہتے ہیں۔ اس سلسلہ کی مفصل تشریح توبہ کے بیان میں کر دی گئی ہے۔

التلبیس:

کسی چیز کو اصلیت و حقیقت کے برعکس دکھا کر وہم میں مبتلا کرنا جیسا کہ بیان باری تعالیٰ ہے "وَلَلَبَسْنَـا عَـلَیْهِمْ مَّـایَلْبِسُوْنَ" (الانعام:۹) (جو کچھ وہ حق و باطل میں ملا کر معاملہ کو پیچیدہ کرتے ہیں تو ہم نے بھی انہیں شبہ میں ڈال دیا) یہ صفت اللہ تعالیٰ کے سوا کسی اور

میں نہیں ہو سکتی کیونکہ وہ کافر پر انعام کر کے مومن ظاہر کرتا ہے اور مومن کو نعمت سے مالا مال کر کے اسے کفر کرنے کا موقع دیتا ہے۔ جب ان میں سے کوئی شخص عمدہ عادتوں کو بری صفات سے تبدیل کر کے حقیقت کو چھپاتا ہے تو کہتے ہیں کہ وہ تلبیس کر رہا ہے۔ اس کے علاوہ کسی اور معنیٰ میں یہ اصطلاح استعمال نہیں ہوتی۔ نفاق وریا اگرچہ بظاہر تلبیس معلوم ہوتے ہیں مگر ہیں نہیں کیونکہ تلبیس صرف حق تعالیٰ کے کسی فعل پر بولا جا سکتا ہے۔

الشرب:

عبادت وطاعت کی مٹھاس، عظمت و بزرگی کا مزہ اور انس ومحبت کی خوشی کا نام شرب ہے۔ لذت شرب کے بغیر انسان کوئی کام نہیں کر سکتا جس طرح جسم کے لئے پانی اور غذا میں اور روح کے لئے ذکر و عبادت میں لذت ہے مگر یہ دونوں اسی وقت کام کرتے ہیں جب انہیں لذت حاصل ہوتی ہے۔ میرے شیخ رحمتہ اللہ علیہ فرماتے تھے کہ مرید اور عارف بغیر شرب کے معرفت اور ارادت سے بیگانہ ہوتے ہیں کیونکہ مرید کے لئے شرب ولذت حاصل ہونے سے ارادت اور طلب حق کی راہ ہموار ہوتی ہے اور عارف کو بھی خدا کی معرفت کی لذت حاصل ہو تو وہ آرام وسکون محسوس کرے گا جو مزید ترقی کا سبب ہوتا ہے۔ واللہ اعلم

الذوق:

ذوق بھی شرب کی طرح ہے البتہ شرب صرف آرام وراحت کے لئے استعمال ہوتا ہے اور ذوق رنج وراحت دونوں صورتوں میں مستعمل ہے چنانچہ ایک عارف نے کہا ہے کہ ''ذقت الحلاوۃ وذقت البلاء وذقت الراحۃ '' (میں نے حلاوت ومصیبت اور آرام کا مزہ چکھا) یہ درست جملے ہیں بعد میں شرب کے متعلق کہتے ہیں کہ شربت ''بکاس الوصل اور بکاس الود ''(میں نے وصل یا محبت کا پیالہ پیا) اس طرح کی اور بھی مثالیں ہیں۔ بقول ''کُلُوْا وَاشْرَبُوْا هَنِيْٓـًٔا'' (الطور:۱۹) یعنی مزے سے کھاؤ اور پیو اور جب ذوق کو استعمال کیا تو ''ذُقْ اِنَّكَ اَنْتَ الْعَزِيْزُ الْكَرِيْمُ'' (الدخان:۴۹) فرمایا یعنی اے معزز

مگر آپ چکھ لیں دوسری جگہ فرمایا کہ "ذُوْقُوْا مَسَّ سَقَرَ" (القمر:۴۸) یعنی دوزخ کی آگ لگنے کا مزہ چکھو۔

صوفیاء واہل طریقت کے ہاں جو اصطلاحات رائج ہیں ان کا مختصراً تذکرہ کر دیا ہے اگر تفصیل کی جاتی تو یہ کتاب طویل ہو جاتی۔ واللہ اعلم

گیارہواں کشف حجاب

بسلسلہ سماع اور اس کے اقسام وانواع

ثبوت سماع:

اے عزیز! خدا آپ کو سعادت مند بنائے آپ کو معلوم ہونا چاہئے کہ علم حاصل کرنے کے پانچ ذرائع ہیں جنہیں حواس خمسہ کہا جاتا ہے سننا، دیکھنا، چکھنا، سونگھنا، چھونا، انسان ہر قسم کا علم ان میں سے کسی ایک ذریعہ سے حاصل کر لیتا ہے مثلاً آوازوں کا علم قوت سماعت سے ہوتا ہے، دیکھنے کی صلاحیت آنکھ میں ہے، میٹھے کڑوے کا فرق زبان سے ہوتا ہے، اچھی بری بو کا پتہ ناک سے لگتا ہے اور کسی چیز کی سختی ونرمی، گرمی وسردی وغیرہ قوت حس یالمس یعنی چھونے سے معلوم ہوتی ہے۔ ان میں سے قوت حس یالمس پورے بدن میں پھیلی ہوئی ہے اور باقی حواس یا ذرائع خاص مقام سے متعلق ہیں کیونکہ انسان آنکھ کے بغیر دیکھ نہیں سکتا، کان کے علاوہ سن نہیں سکتا، زبان اور تالو کے سوا چکھ نہیں سکتا اور ناک نہ ہو تو سونگھ نہیں سکتا، کسی حد تک یہ کہنا جائز ہے کہ ہر ایک حس سارے جسم میں پھیلی ہوئی (جس طرح سانپ دیکھنے سے پورا جسم محتاط ہو جاتا ہے اور خوش الحانی سننے سے پورا جسم لطف اندوز ہوتا ہے) مگر معتزلہ کے نزدیک ہر ایک حس کا خاص مقام ہے تاہم قوت حس یالمس سے ان کی تردید ہو جاتی ہے کیونکہ یہ پورے بدن میں پھیلی ہوئی ہے۔ جس طرح ایک قوت پورے جسم میں پھیلی ہوئی ہے تو دوسری بھی اسی طرح سارے جسم میں پھیلی ہوئی ہو سکتی ہیں جیسا کہ اشارۃً پہلے ذکر کر دیا گیا ہے مگر یہاں اس کی

تفصیل مطلوب نہیں صرف تحقیق مقصود تھی۔ قوتِ سماعت کے علاوہ دیگر چار حواس یعنی نادراتِ عالم کو دیکھنا، خوشبو کو سونگھنا، عمدہ نعمتوں کو چکھنا اور نرم و گرم کو چھونا، عقل کے لئے رہنما بن سکتے ہیں اور یہ رہنمائی خدا کی طرف سے ہوتی ہے کیونکہ ان حواس کی بدولت عقل نے یہ معلوم کیا کہ مشاہدہ کرنے سے یہ عالم حادث معلوم ہوتا ہے خالق کائنات پر قدیم اور لامتناہی ہے جبکہ عالم حادث اور متناہی ہے نیز خالق پوری کائنات پر قادر ہے اور سب کائنات سے زیادہ طاقتور ہے وہ جسم و جان بنانے والا ہے مگر کائنات کی مثل جسم و جان رکھنے والا نہیں۔ چنانچہ ہر سو اس کی قدرت جاری ہے جو چاہے سو کرے، وہی ہے جس نے رسولوں کو صحیح اور سچی ہدایت دے کر کائنات کی رہنمائی کے لئے بھیجا۔ مگر ان رسولوں پر ایمان لانا اس وقت تک واجب نہیں ہوتا جب تک حق تعالیٰ کی معرفت حاصل نہ ہو اور رسول سے شرع و دین سے متعلق باتوں کو سن نہ لے کہ کون کون سی بات واجب (فرض) ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اہل سنت کے نزدیک سننا دیکھنے سے زیادہ قابل ترجیح اور فضیلت والا ہے۔ اگر کوئی سطح بین یہ کہے کہ سننا تو صرف خبر کی حد تک ہے جبکہ دیکھنا دیدار اور نظارہ کا سبب ہے۔ (اور شنیدہ کے بود مانند دیدہ) دیدار الٰہی کلامِ الٰہی سننے سے افضل ہے لہٰذا قوت بصارت کو سماعت پر افضل مانا جائے تو اس کا جواب یہ ہے کہ ہمیں یہ سن کر ہی تو معلوم ہوا کہ جنت میں دیدارِ خدا نصیب ہوگا اور عقل کے ذریعہ دیدار کے جائز ہونے میں جو حجاب واقع ہوتا ہے وہ بھی قوت سماعت کو استعمال کرنے سے دور ہو جاتا کیونکہ عقل نے رسول کی خبر سننے سے تسلیم کر لیا کہ دیدار نصیب ہوگا (ورنہ ظاہری طور پر کوئی دلیل نہیں) اور آنکھوں سے حجاب دور ہو جائے گا تاکہ وہ خدا کو دیکھ لیں اس لحاظ سے سننا دیکھنے سے افضل ہے۔ علاوہ ازیں احکام شریعت کا انحصار بھی سننے پر ہے۔ کیونکہ سننا نہ ہو تو اثبات یا نفی نہیں ہو سکتی، انبیاء پیغامِ حق سناتے اور لوگ سن کر قبول کرتے اور ان کے فرمانبردار و جاں نثار بن جاتے، معجزہ دکھانے کے لئے بھی اس کی حقیقت بتائی جاتی ہے اور لوگ سن کر حقیقت دیکھنے کی تمنا کرتے۔ ان دلائل کے باوجود اگر کوئی سننے یعنی سماع کی فضیلت سے انکار کرتا ہے تو اسرارِ شریعت اور حقائق کا انکار کرتا ہے اور سماع کے معاملہ میں وہ عمداً غفلت برتتا ہے اور اس کی

حقیقت پوشیدہ رکھتا ہے۔اب میں سماع کے متعلق احکام وامور کو بیان کرتا ہوں۔

قرآن مجید کا سننا اور اس کے متعلقات

تمام سنی جانے والی باتوں سے زیادہ اہم، دل کے لئے مفید، ظاہر و باطن کے لئے باعثِ ترقی اور کانوں کے لئے لذیذ کلامِ الٰہی ہے، سب ایمانداروں کو اس کے سننے کا حکم دیا گیا اور جنوں، انسانوں کو بشمول کفار کلام الٰہی سننے کا مکلف بنایا گیا ہے۔قرآن کے معجزات میں سے ایک معجزہ یہ بھی ہے کہ طبیعت اس کے سننے اور پڑھنے سے بے چین نہیں ہوتی کیونکہ اس میں بہت زیادہ رقت موجود ہے حتیٰ کہ کفارِ قریش رات کو چھپ کر حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی نماز میں قرأت وتلاوت شوق سے سنتے تھے اور قرآن کی لطافت ورقت پر حیران ہوتے تھے جن میں سے مشہور کفار یہ ہیں نضر بن حارث جو سب سے زیادہ فصیح تھا، عقبہ بن ربیع جو بلاغت کا جادو رکھتا تھا اور ابوجہل بن ہشام جو خطابت اور دلائل میں مانا ہوا شخص تھا ان کے علاوہ اور بھی بہت سے لوگ ہیں۔

ایک رات حضور علیہ السلام کی تلاوت سن کر عتبہ بے ہوش ہو گیا اور بعد میں ابوجہل کو بتایا کہ یہ انسانی کلام معلوم نہیں ہوتا انسانوں اور جنوں نے گروہ در گروہ ہو کر رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے قرآن سنا اور کہنے لگے کہ ''اِنَّا سَمِعْنَا قُرْاٰنًا عَجَبًا '' (الجن:۱) ہم نے عجیب کلام پڑھتے ہوئے سنا (یہ جملہ انہوں نے واپس جا کر اپنے دوسرے جنوں کو سنایا) اس کی خبر بھی ہمیں قرآن نے دی اور بتایا کہ ''یَّهْدِیْٓ اِلَى الرُّشْدِ فَاٰمَنَّا بِهٖ ط (الجن:۲) ولن نشرك بربنا احداً o'' یعنی یہ قرآن راہ راست اور ہدایت کی رہنمائی کرتا ہے لہٰذا ہم (سنکر) اس پر ایمان لائے اور (آئندہ) ہم اپنے رب کے ساتھ کسی کو شریک نہیں کریں گے۔چنانچہ قرآن کی نصیحت دوسری تمام نصیحتوں سے بہتر، اس کا ہر لفظ دوسرے تمام الفاظ سے واضح اس کا ہر حکم دوسرے احکامات سے لطیف، اس کا روکنا دوسری تمام رکاوٹوں سے زیادہ مناسب، اس کا وعدہ دیگر تمام وعدوں سے زیادہ دل کش، اس کی وعید (ڈانٹ) دوسری تمام وعیدوں سے زیادہ جامع

اور جانگداز، اس کا ہر قصہ دوسرے تمام قصوں سے زیادہ موثر، اس کی مثالیں دوسری تمام مثالوں سے زیادہ سبق آموز جس کی وجہ سے ہزاروں جانیں اس پر قربان ہوئیں اور ہزاروں دل اس کے گرویدہ ہوئے۔ (اس کی عجیب خاصیت ہے) کہ دنیا کے عزت والوں کو ذلیل کرتا ہے اور دنیا ہی کے دھتکارے ہوئے ذلیلوں کو باعزت بناتا ہے، حضرت عمر رضی اللہ عنہ اسلام قبول کرنے سے پہلے اپنی بہن اور اپنے بہنوئی کے مسلمان ہونے کی خبر کو سن کر تلوار سونت کر سلسلہ اسلام کو ختم کرنے چلتے ہیں مگر جب بہن کے گھر پہنچ کر کلام الٰہی میں سے سورہ طٰہٰ کے اثر انگیز الفاظ "طٰهٰ مَآ اَنْزَلْنَا عَلَيْكَ الْقُرْاٰنَ لِتَشْقٰى اِلَّا تَذْكِرَةً لِّمَنْ يَّخْشٰى" (طٰہٰ:۱،۲) یعنی یہ قرآن ہم نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر اس لئے نہیں اتارا کہ آپ مشقت و تکلیف میں پڑ جائیں یہ تو ڈرنے والوں کے لئے نصیحت اور یاد کرنے والوں کے لئے نصیحت اور یاددہانی ہے اور اسی طرح کے دوسرے الفاظ سنے تو آپ کی روح کو (کفر کی تاریکی میں) روشنی نظر آئی اور آپ کا دل قرآن کے لطیف حقائق سے مانوس ہو گیا، آپ صلح کے طریقے ڈھونڈنے لگے، لڑائی کا لباس اتار کر مخالفت سے موافقت کی طرف لوٹے اور اسلام قبول کر لیا (یہ صرف سننے، سماع کی برکت تھی) مشہور ہے کہ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے یہ آیات پڑھی گئیں "اِنَّ لَدَيْنَآ اَنْكَالًا وَّجَحِيْمًا ۝ وَّطَعَامًا ذَا غُصَّةٍ وَّعَذَابًا اَلِيْمًا ۝" (المزمل:۱۲،۱۳) یعنی بلاشبہ ہمارے پاس بیڑیاں اور دوزخ ہے اور گلے میں اٹکنے والا کھانا اور دردناک عذاب ہے۔ تو آپ پر غشی طاری ہو گئی۔ کہتے ہیں کہ ایک شخص نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے سامنے یہ آیت پڑھی "اِنَّ عَذَابَ رَبِّكَ لَوَاقِعٌ ۝ مَّا لَهٗ مِنْ دَافِعٍ" (الطور:۷،۸) (بے شک تیرے رب کا عذاب ضرور واقع ہونے والا ہے جسے ٹالنے والا نہیں) تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ بے ہوش ہو گئے اور ایک ماہ تک بیمار رہے۔ ایک شخص نے حضرت عبداللہ بن حنظلہ رضی اللہ عنہ کے سامنے یہ آیت پڑھی "لَهُمْ مِّنْ جَهَنَّمَ مِهَادٌ ۝ وَّمِنْ فَوْقِهِمْ غَوَاشٍ" (الاعراف:۴۱) (ان کفار کے لئے دوزخ کی آگ بطور بچھونا اور اوڑھنا ہو گی) تو وہ رونے لگ گئے اور اس قدر ساکت ہو گئے کہ ان کی موت کا اندیشہ ہوا، بعدہ آپ اٹھ کھڑے ہوئے تو لوگوں نے کہا کہ بیٹھ

جایئے تو آپ نے فرمایا کہ اس آیت کی ہیبت سے میں بیٹھ نہیں سکتا۔ جب حضرت جنید رحمۃ اللہ علیہ کے سامنے یہ آیت پڑھی گئی "يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لِمَ تَقُوْلُوْنَ مَا لَا تَفْعَلُوْنَ" (الصف:۲) (اے ایمان والو وہ بات کیوں کہتے ہو جس کے مطابق تم خود عمل نہیں کرتے) تو آپ نے فرمایا کہ اے خدا! "اِنْ قُلْنَا، قُلْنَا بِكَ وَاِنْ فَعَلْنَا، فَعَلْنَا بِتَوْفِيْقِكَ فَاَيْنَ لَنَا الْقَوْلُ وَالْفِعْلُ" (اگر ہم کچھ کہتے ہیں تو تیرے حکم سے کہتے ہیں اور اگر کوئی عمل کرتے ہیں تو تیری توفیق سے کرتے ہیں (ایسی صورت میں) ہمارا قول و فعل کہاں رہا؟) حضرت شبلی رحمۃ اللہ علیہ کے متعلق مشہور ہے کہ جب آپ کے سامنے یہ آیت پڑھی گئی "وَاذْكُرْ رَّبَّكَ اِذَا نَسِيْتَ" (الکہف:۲۴) (جب تو غافل ہو جائے تو خدا کو یاد کیا کر) تو آپ نے فرمایا کہ ذکر کی شرط بھول جانا ہے جبکہ سارا عالم اس کی یاد میں محو ہے (مگر انسان بھولا ہی رہتا ہے) یہ کہہ کر آپ بے ہوش ہو گئے، جب ہوش میں آئے تو کہا کہ اس دل پر تعجب ہے جو کلام الٰہی سن کر اپنی جگہ قائم رہے اور اس جان پر حیرانی ہے جو کلامِ خدا سن کر جسم سے نہ نکلے۔

ایک شیخ فرماتے ہیں کہ ایک دفعہ میں نے کلامِ الٰہی میں سے یہ آیت پڑھی "وَاتَّقُوْا يَوْمًا تُرْجَعُوْنَ فِيْهِ اِلَى اللّٰهِ" (البقرہ:۲۸۱) (اس دن سے ڈرو جس دن تم خدا کی طرف لوٹائے جاؤ گے) تو ہاتف نے آواز دی کے آہستہ پڑھو اس کی ہیبت سے چار جن فوت ہو گئے۔ ایک درویش نے بتایا کہ میں نے دس سال سے نماز میں پڑھنے کے علاوہ نہ تو قرآن خود پڑھا اور نہ دوسروں سے سنا، لوگوں نے پوچھا کیوں؟ فرمایا کہ اس اندیشہ سے کہ پڑھنے یا سننے سے اس پر عمل کرنا ضروری ہوگا اور حجت پوری ہو جائے گی۔ ایک دفعہ میں نے حضرت شیخ ابو العباس شقانی رحمۃ اللہ علیہ کو یہ آیت پڑھتے ہوئے پایا "ضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلًا عَبْدًا مَّمْلُوْكًا لَّا يَقْدِرُ عَلٰى شَيْءٍ" (النحل:۷۵) اللہ تعالیٰ نے ایک ایسے غلام کی مثال دی ہے جو کسی دوسرے کا مملوک ہے اور بذاتِ خود کسی کام کرنے کا مختار نہیں) تلاوت کے ساتھ ساتھ آپ رو رہے تھے حتیٰ کہ میں نے انہیں فوت شدہ خیال کیا، میں نے عرض کیا کہ حضرت یہ کیا معاملہ ہے؟ انہوں نے جواب دیا کہ تقریباً گیارہ سال سے میں صرف یہاں تک تلاوت کرتا ہوں آگے نہیں پڑھ

سکتا اور بڑھ سکتا۔ میں نے حضرت ابوالعباس سے پوچھا کہ آپ روزانہ کتنا قرآن پڑھتے ہیں انہوں نے فرمایا کہ آج سے چودہ سال پہلے تو ایک رات دن میں دو قرآن ختم کرتا تھا مگر بعد میں آج تک صرف سورۂ انفال تک پہنچا ہوں۔ ایک دفعہ حضرت ابوالعباس نے ایک قاری سے تلاوت کرنے کو کہا سو اس نے یہ آیت پڑھی "یٰٓاَیُّھَا الْعَزِیْزُ مَسَّنَا وَاَھْلَنَا الضُّرُّ وَجِئْنَا بِبِضَاعَۃٍ مُّزْجٰۃٍ" (یوسف:۸۸) (اے عزیز مصر! ہمیں اور ہمارے اہل وعیال کو فاقہ کی سخت تکلیف ہے اور ہمارے پاس سرمایہ بہت تھوڑا ہے) آپ نے فرمایا اور پڑھ تو قاری نے پڑھا "قَالُوْٓا اِنْ یَّسْرِقْ فَقَدْ سَرَقَ اَخٌ لَّہٗ مِنْ قَبْلُ" (یوسف:۷۷) (کہنے لگے اگر اس نے چوری کی ہے تو اس سے پہلے اس کے بھائی نے بھی چوری کی تھی) آپ نے پھر پڑھنے کا حکم دیا تو اس نے پڑھا "لَا تَثْرِیْبَ عَلَیْکُمُ الْیَوْمَ یَغْفِرُ اللّٰہُ لَکُمْ" (یوسف:۹۲) (آج کے دن تم پر کوئی ملامت نہیں خدا تمہیں معاف فرمائے) اس کے بعد حضرت ابوالعباس نے یوں دعا کی کہ اے خدا میں ظلم میں برادرانِ یوسف علیہ السلام سے بڑھ کر ہوں اور تو لطف وکرم میں یوسف علیہ السلام سے بڑھ کر ہے، میرے ساتھ وہ سلوک کر جو حضرت علیہ السلام نے اپنے ظالم بھائیوں کے ساتھ کیا۔

ان تمام باتوں کے باوجود متقی و گناہگار تمام مسلمان قرآن سننے کے لئے مکلف ہیں جیسا کہ حکم حق تعالیٰ ہے "وَاِذَا قُرِئَ الْقُرْاٰنُ فَاسْتَمِعُوْا لَہٗ وَاَنْصِتُوْا لَعَلَّکُمْ تُرْحَمُوْنَ" (الانفال:۲۰۴) (جس وقت قرآن پڑھا جائے تو آپ اسے سنیں اور خاموش رہیں تا کہ تم پر رحمت حق کا نزول ہو) اس سے سماع قرآن کا بہر صورت حکم ہے خواہ قاری کسی طرح پڑھ رہا ہو۔ علاوہ ازیں فرمایا "فَبَشِّرْ عِبَادِ الَّذِیْنَ یَسْتَمِعُوْنَ الْقَوْلَ فَیَتَّبِعُوْنَ اَحْسَنَہٗ" (الزمر:۱۷،۱۸) (میرے ان بندوں کو خوش خبری دے دیجئے جو قرآن سننے کے بعد اس بہتر کلام کی پیروی کرتے ہیں یعنی اس کے احکام پر عمل کرتے ہیں۔ نیز فرمایا "اَلَّذِیْنَ اِذَا ذُکِرَ اللّٰہُ وَجِلَتْ قُلُوْبُھُمْ" (الانفال:۲) (کئی لوگ ایسے بھی ہیں کہ جب ان کے سامنے خدا کا ذکر کیا جائے تو ان کے دل خوف الٰہی سے کانپ اٹھتے ہیں) اور "اَلَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَتَطْمَئِنُّ

قُلُوْبُهُمْ بِذِكْرِ اللّٰهِ اَلَا بِذِكْرِ اللّٰهِ تَطْمَئِنُّ الْقُلُوْبُ "(الرعد:۲۸)(ایسے لوگ بھی موجود ہیں جو ایمان لائے اور ان کے دل خدا کے ذکر سے مطمئن ہو جاتے ہیں اور حقیقت بھی یہ ہے کہ خدا کے ذکر سے دلوں کو اطمینان حاصل ہوتا ہے۔(اس طرح کی بہت سی آیات ہیں جو اس حقیقت کی تائید کرتی ہیں کہ اس کے برعکس ان لوگوں کی بدبختی کا ذکر بھی کیا جو قرآن سنتے ہیں مگر ان کے دل مطمئن نہیں ہوتے بلکہ فرمایا "خَتَمَ اللّٰهُ عَلٰی قُلُوْبِهِمْ وَعَلٰی سَمْعِهِمْ وَعَلٰٓی اَبْصَارِهِمْ غِشَاوَةٌ "(البقرہ:۷)اللہ نے ان کے دلوں پر مہر (بدبختی) لگادی اور ان کے کانوں اور ان کی آنکھوں پر پردے پڑے ہوئے ہیں یعنی کافروں کے تمام وہ ذرائع جن سے ہدایت حاصل ہوسکتی تھی بند کر دیئے گئے اور فرمایا کہ قیامت میں دوزخی کہیں گے کہ "لَوْ كُنَّا نَسْمَعُ اَوْ نَعْقِلُ مَا كُنَّا فِیْٓ اَصْحٰبِ السَّعِیْرِ "(الملک:۱۰) (اگر ہم حق کی بات کو سنتے یا اس کو سمجھتے تو ہم دوزخ میں گرفتار نہ ہوتے فرمایا "مِنْهُمْ مَّنْ یَّسْتَمِعُ اِلَیْكَ وَجَعَلْنَا عَلٰی قُلُوْبِهِمْ اَكِنَّةً اَنْ یَّفْقَهُوْهُ وَفِیْٓ اٰذَانِهِمْ وَقْرًا "(الانعام:۲۵)(ان میں سے کچھ لوگ ایسے ہیں جو آپ کی باتوں کو سنتے ہیں حالانکہ ان کے دلوں پر ہم نے پردے ڈال دیئے ہیں تاکہ وہ اس کلام حق کو سمجھ ہی نہ سکیں اور ان کے کانوں میں بہرہ پن رکھ دیا ہے فرمایا "وَلَا تَكُوْنُوْا كَالَّذِیْنَ قَالُوْا سَمِعْنَا وَهُمْ لَا یَسْمَعُوْنَ "(الانفال:۲۱) (اور ان لوگوں کی طرح نہ بنو جو زبان سے تو کہتے ہیں کہ ہم نے سن لیا اور حقیقت یہ ہے کہ وہ کچھ بھی نہیں سنتے) ان کے علاوہ کتاب الٰہی میں بہت سی آیات ہیں جو سماع قرآن کی حقیقت کو واضح کرتی ہیں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت ہے کہ آپ نے ایک دفعہ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے فرمایا "اِقْرَأْ عَلَیَّ فَقَالَ اَنَا اَقْرَأُهُ عَلَیْكَ وَعَلَیْكَ اُنْزِلَ فَقَالَ عَلَیْهِ السَّلَامُ اِنِّیْ اُحِبُّ اَنْ اَسْمَعَهُ مِنْ غَیْرِیْ " کہ تو مجھے کچھ پڑھ کر قرآن سنا، انہوں نے کہا کہ یا رسول اللہ میں آپ کو پڑھ کر سناؤں! حالانکہ یہ قرآن آپ پر نازل ہوا ہے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میں دوسروں سے قرآن سننا پسند کرتا ہوں۔ یہ بات اس کا واضح ثبوت ہے کہ سننے والا قاری کی نسبت زیادہ کامل ہوتا ہے کیونکہ پڑھنے والا سوچ سمجھ کر یا بے سوچے سمجھے دونوں طرح پڑھتا

ہے مگر سننے والا سوچ سمجھ کر سنتا ہے کیونکہ بولنے میں کسی حد تک تکبر پایا جاتا ہے اور سننے میں تواضع ظاہر ہوتی ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ سورۃ ہود نے مجھے بوڑھا کر دیا کیونکہ اس کے آخر میں یہ آیت ہے "فَاسْتَقِمْ كَمَآ اُمِرْتَ" (جس طرح آپ کو حکم دیا گیا اس پر ثابت قدم رہئے۔ حقیقت یہ ہے کہ انسان امرِ الٰہی پر قائم رہنے سے عاجز ہے کیونکہ بندہ توفیق حق کے بغیر کچھ نہیں کر سکتا چنانچہ جب آپ کو استقامت کا حکم ملا تو آپ نے فرمایا کہ یہ کیسے ممکن ہوگا کہ میں اللہ تعالیٰ کے احکام کو پوری طرح بجا لاؤں۔ دلی اضطراب کی وجہ سے آپ کمزور ہو گئے، رنج میں اضافہ ہوتا گیا حتیٰ کہ ایک دن کھڑے ہونے کے لئے زمین پر ہاتھ ٹیک کر سہارا لیا حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے عرض کیا حضرت یہ کیا حال ہے؟ آپ تو ابھی جوان اور صحت مند ہیں، فرمایا سورہ ہود نے مجھے بوڑھا کر دیا یعنی استقامت کے حکم سے میری ہمت کمزور ہو گئی۔

حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ "میں ضعفائے مہاجرین کی جماعت میں بیٹھا تھا جو پردہ پوشی کے لئے ایک دوسرے کے معاون تھے، قاری قرآن پڑھنے لگا اور رسول خدا اچانک ہمارے سروں پر آ کھڑے ہوئے، قاری آپ کو دیکھ کر خاموش ہو گیا آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے سلام کے بعد پوچھا کہ تم کیا کر رہے تھے ہم نے کہا یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہم قرآن سن رہے تھے آپ نے فرمایا خدا کا شکر ہے کہ اس نے میری امت میں ایسے لوگ پیدا کئے ہیں جن کے ساتھ بیٹھنے کے لئے مجھے ہدایت کی گئی ہے۔ پھر آپ ہمارے درمیان گھل مل کر بیٹھ گئے آپ نے ہاتھ کے اشارہ سے حلقہ باندھ کر بیٹھنے کا فرمایا جس کے بعد ہمارے اور رسول کے درمیان کوئی ظاہری امتیاز نہیں تھا گویا ہم سب مفلس مہاجرین تھے۔ اس کے بعد حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اے مفلس مہاجرو! قیامت میں تمہیں مکمل کامیابی کی خوشخبری ہے تم جنت میں اپنے دولت مند بھائیوں کی نسبت آدھ دن پہلے داخل ہو گے اور دن کی مقدار پانچ سو سال ہے اگر چہ اس روایت کے الفاظ مختلف ہیں مگر مطلب و معنی میں کوئی فرق نہیں۔

روایت ہے کہ زرارہ ابن ابی اوفی جو جلیل القدر صحابی تھے ایک مرتبہ لوگوں کی امامت

فرمارہے تھے، آپ نے ایک آیت پڑھی جس کی ہیبت سے آپ فوراً فوت ہوگئے حضرت صالح مری رحمتہ اللہ علیہ نے ایک بزرگ تابعی ابوجہمی (ابوجبیر) کے سامنے ایک آیت کریمہ پڑھی جس کی جلالت سے آپ فوت ہوگئے۔ حضرت ابراہیم فرماتے ہیں کہ میں نے کوفہ کے نواح میں ایک نیک صفت عورت کو نماز پڑھنے کے بعد بطور تبرک سلام کیا تو اس نے قرآن پڑھنے اور سنانے کی فرمائش کی میں نے قرآنی آیت پڑھی تو وہ بے ہوش ہوکر رحلت کر گئیں۔ احمد بن ابی الجواری روایت فرماتے ہیں کہ میں نے ایک شخص کو جنگل میں کنوئیں کے کنارے کھڑے دیکھا قریب ہوا تو اس نے سماع کی خواہش کی تاکہ وہ بآسانی جان دے سکے تو میں نے الہام کی مدد سے یہ آیت پڑھی ''اِنَّ الَّذِیْنَ قَالُوْا رَبُّنَا اللّٰهُ ثُمَّ اسْتَقَامُوْا'' (الاحقاف:۱۳) (بلاشبہ جن لوگوں نے خدا کو اپنا رب کہا اور ثابت قدم رہے) اس نے کہا کہ احمد! خدا کی قسم آپ نے وہی آیت تلاوت کی جسے میرے سامنے اس وقت فرشتے تلاوت کر رہے تھے یہ کہہ کر وہ فوت ہوگیا۔ اس سلسلہ میں بہت سی روایات و حکایات ہیں اگر ان کا ذکر کیا جائے تو کتاب ضخیم ہو جائے گی لہٰذا اب اسی پر اکتفا کرتا ہوں۔ وباللہ التوفیق

شعر کا سماع اور متعلقات

معلوم ہونا چاہئے کہ شعر سننا مباح ہے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام نے اشعار پڑھے اور سنے ہیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''اِنَّ مِنَ الشِّعْرِ لَحِکْمَةً'' (ابن ماجہ) بلاشبہ بعض اشعار میں حکمت ہے۔ نیز فرمایا ''اَلْحِکْمَةُ ضَالَّةُ الْمُؤْمِنِ حَیْثُ وَجَدَهَا فَهُوَا حَقُّ بِهَا'' (ابن ماجہ) یعنی حکمت مومن کی کھوئی ہوئی چیز ہے جہاں ملے وہ اس کا زیادہ مستحق ہے (کہ حاصل کرلے)۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''اصدق کلمة قالتها العرب قول لبید'' (سب سے زیادہ سچا کلام جو اہلِ عرب نے کہا وہ لبید شاعر کا ہے) جس نے کہا کہ:

الا کل شیءٍ ما خلا اللہ باطل

وکل نعیم لا محالۃ زائل

سنو! اللہ کے سوا ہر چیز باطل ہے اور ہر ایک نعمت ضرور زوال پذیر ہے۔ عمر بن الشرید رضی اللہ عنہ اپنے باپ سے روایت کرتے ہیں کہ ایک دن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے شعر پڑھنے کا فرمایا اور پوچھا کہ کیا تجھے امیہ بن ابی الصلت کے کچھ اشعار یاد ہیں؟ اور اگر ہیں تو ہمیں سناؤ، میں نے ایک سو اشعار سنائے۔ جب میں ایک شعر ختم کرتا تو آپ فرماتے کچھ اور سناؤ۔ آپ نے فرمایا کہ امیہ اپنے اشعار میں تو اسلام کو تسلیم کرتا ہے۔ اس کے علاوہ بہت سی روایت ہیں۔

کچھ لوگ اشعار سننے کو حرام کہتے ہیں اور رات دن غیبت میں مصروف رہتے ہیں۔ اور کچھ لوگ ہر قسم کے اشعار سننے کو حلال کہتے ہیں اور رات دن غزل میں حسن صورت اور زلف کی تعریف میں لگے رہتے ہیں اور سنتے رہتے ہیں دونوں فریق ایک دوسرے کے خلاف دلائل دیتے ہیں مگر میرا مقصد ان میں سے نہ کسی کی تردید ہے اور نہ کسی کی تائید۔ لہٰذا میں نے اتنے پر اکتفا کیا۔

مشائخ کا طریقہ یہ ہے کہ وہ فرمان رسول سے استفادہ کرتے ہیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''کَلَامٌ حَسَنُہٗ حَسَنٌ وَقَبِیْحُہٗ قَبِیْحٌ'' (شعر ایک ایسا کلام ہے کہ جس کا اچھا (حصہ) اچھا ہے اور برا (حصہ) برا ہے) جس بات کا سننا نثر میں حلال ہے مثلاً حکمت، نصائح، آیاتِ الٰہی میں استدلال اور حق کے دلائل میں غور کرنا وغیرہ وغیرہ تو اس کا نظم میں سننا بھی حلال اور جائز ہے۔ مختصر یہ کہ جس طرح فتنہ پھیلانے والے حسن پر نظر ڈالنا حرام ہے اسی طرح کی نظم ونثر کو بھی سننا حرام ہے اگر کوئی شخص سماع شعر کو مطلق حلال اور جائز سمجھتا ہے تو وہ کفر و بے دینی میں مبتلا ہے، اور جو شخص یہ کہے کہ میں حسن صورت میں حسن خدا کا جلوہ دیکھتا ہوں اور طلب حق کرتا ہوں کیونکہ آنکھ اور کان محل عبرت ہیں اور علم کا ذریعہ ہیں تو دوسرا شخص یہ بھی کہہ سکتا ہے کہ میں چھوتا ہوں اور چھونے سے بھی عبرت ونصیحت حاصل ہوتی ہے ایسی صورت میں تو شریعت کا

ظاہر بالکل باطل ہو جائے گا۔ حالانکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ "اَلْعَیْنَانِ تَزْنِیَانِ" یعنی دونوں آنکھیں (غیر محرم کو دیکھنے سے) زنا کرتی ہیں چنانچہ دیکھنے، چھونے سے شرعی حکم ساقط ہو جائے گا اور یہ ظاہر گمراہی ہے جاہل لوگوں نے صوفیا کو سماع کرتے دیکھا تو یہ سمجھا کہ یہ خواہش سے سماع کرتے ہیں حالانکہ وہ بے اختیار سماع کرتے ہیں جس سے یہ نتیجہ نکالا گیا کہ سماع حلال ہے اور اگر حلال نہ ہوتا تو یہ صوفی لوگ سماع نہ کرتے۔ چنانچہ جہلا نے ظاہر کو اختیار کر کے باطن اور اصل کو چھوڑ دیا (جو دراصل اصلاحِ نفس کا مقصد تھا) حتیٰ کہ خود بھی ہلاک ہوئے اور اپنے متبعین کے ایک پورے گروہ کو بھی برباد کر دیا۔ حالانکہ یہ زمانہ کی بہت بڑی آفت ہے۔ اپنی جگہ پر اس کی مفصل تشریح بیان کی جائے گی۔

خوش الحانی اور ترنم کا سماع

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ "زَیِّنُوْا اَصْوَاتَکُمْ بِالْقُرْاٰنِ" (دارمی) (قرآن پڑھنے میں اپنی آوازوں کو سنوارو) خدا تعالیٰ فرماتا ہے "یَزِیْدُ فِی الْخَلْقِ مَایَشَآءُ" (فاطر:۱) (وہ پیدائش میں جو چاہتا ہے زیادہ کرتا ہے) مفسرین کے مطابق اس سے مراد بہتر آواز اور ترنم ہے نیز پیغمبر علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا کہ جو شخص داؤد علیہ السلام کی آواز سننا چاہے وہ حضرت ابو موسیٰ اشعری کی آواز سنے۔ احادیث میں ہے کہ بہشت میں جنتیوں کو بھی سماع حاصل ہوگا۔ جس کا ذریعہ مختلف درختوں سے مختلف سریلی آوازیں ہیں جو جنت میں نکلیں گی۔ مختلف آوازوں کے سامنے جو کیفیت پیدا ہوتی ہے طبیعت کو اس سے لذت حاصل ہوتی ہے اس قسم کا سماع حیوانوں اور انسانوں میں عام ہے اس لئے کہ روح ایک لطیف چیز ہے اور آواز میں بھی ایک قسم کی لطافت ہے، جب ارواح ان آوازوں کو سنتی ہیں تو ہم جنسوں کی طرف مائل ہو جاتی ہیں یہ دراصل اطبا کا قول ہے۔

اہل علم محقق بھی بہت سے دعوے کرتے ہیں اور انہوں نے سریلی آوازوں کو باہم ملانے کے لئے کتابیں بھی تصنیف کی ہیں اور الحان و ترنم کو بڑی اہمیت دی ہے ان کے نظریات

کی ترجمانی آج مزامیر سے بھی ہوتی ہے جو خواہش نفس اور بیہودگی کے لئے تیار کئے گئے ہیں جن سے شیطان کی پیروی ہوتی ہے۔ حتیٰ کہ وہ کہتے ہیں کہ ایک دن اسحاق موصلی ایک باغ میں گا رہے تھے اور ایک بلبل بھی نغمہ سرائی کر رہا تھا وہ اسحاق کی خوش الحانی سن کر خاموش ہو گیا اور آخر کار گر کر مر گیا۔ اس قسم کی حکایات بہت ہیں مگر مقصد صرف یہ ہے کہ خوش الحانی سے حیوانات اور انسان دونوں لذت حاصل کرتے ہیں۔

حضرت ابراہیم خواص رحمتہ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ میں ایک عربی سردار کے ہاں پہنچا تو ایک حبشی غلام کو بیڑیوں اور زنجیروں میں قید دیکھا جو خیمہ کے دروازے پر دھوپ میں پڑا ہوا تھا۔ میں نے ازراہِ شفقت سفارش کا ارادہ کیا، عرب کے دستور کے مطابق امیر مہمان کے ساتھ کھانا کھاتا ہے تو جب کھانے کا وقت آیا میں نے امیر کے ساتھ کھانا کھانے سے انکار کر دیا جو عربوں کے نزدیک بہت نامناسب بات ہے کہ کوئی شخص مہمان ہوتے ہوئے کھانا نہ کھائے انہوں نے پوچھا کہ کیا وجہ ہے؟ جبکہ ہم سب آپ کی خدمت کے لئے حاضر ہیں میں نے جواب دیا کہ سب کچھ صحیح ہے مگر اس غلام کو میری خدمت کے لئے مقرر کر دیں۔ امیر نے کہا آپ پہلے اس کا جرم معلوم کر لیں پھر اسے چھڑائیں، تو میں نے پوچھا۔ اس نے کہا کہ یہ غلام حُدی خواں اور خوش الحان ہے میں نے اسے اونٹ دے کر اپنی زمین سے غلہ لانے کو کہا اس نے ان پر دوگنا بوجھ لاد دیا اور حدی خوانی سے ان کو مست کر کے دوڑاتا رہا حتیٰ کہ وہ پہنچنے پر ایک ایک دو دو کر کے سب ہلاک ہو گئے۔ حضرت ابراہیم فرماتے ہیں کہ مجھے سخت حیرانی ہوئی، میں نے کہا کہ آپ کی شرافت کے پیش نظر یہ سب کچھ سچ مانتا ہوں مگر دلیل چاہئے اسی دوران اونٹ پانی پینے کے لئے کنوئیں پر لائے گئے امیر نے شتربانوں سے پوچھا کہ اونٹ کتنے دن کے پیاسے ہیں، جواب ملا تین دن سے، پھر اس نے غلام کو حدی خوانی کرنے کو کہا تو اونٹ پانی پینا بھول کر حدی سننے میں مست اور مگن ہو گئے اور پانی کو کسی اونٹ نے منہ نہ لگایا۔ یہاں تک کہ اچانک ایک ایک کر کے سب بھاگ گئے اور جنگل میں اس کے بعد امیر نے غلام کو زنجیروں سے رہا کر کے میرے سپرد کر دیا۔

یہ حقیقت ہے کہ اونٹ اور گدھا گانا سننے سے مست ہو جاتے ہیں۔ ملک خراسان میں تو شکار کا یہ طریقہ ہے کہ شکاری طشت بجا کر اور گا کر ہرن کو مست بنا دیتے ہیں اور وہ اپنی جگہ پر کھڑا رہ جاتا ہے جسے بآسانی شکار کر لیا جاتا ہے۔ ہندوستان میں بھی کہیں کہیں یہی طریقہ ہے جس سے ہرن کی آنکھیں تک بند ہو جاتی ہیں اسی طرح چھوٹے بچوں کو لوری سے نیند آ جاتی ہے، طبیب ایسے بچوں کے متعلق بتاتے ہیں کہ وہ بڑا ہو کر عقل مند ہو گا۔

عجم کے ایک بادشاہ کی وفات پر اس کے دو سالہ بچہ کا معائنہ بھی حکیم بزرجمہر کی ہدایت کے مطابق خوش الحانی اور گانے سے کیا گیا جس کی وجہ سے وہ بچہ حرکت کرنے لگا اور ہاتھ پاؤں مارنے لگا تب بزرجمہر نے کہا کہ اس بچہ سے بھلائی کی امید کی جا سکتی ہے۔

غرضکہ خوش الحانی اور سریلی آواز کی تاثیر عقل مندوں کے نزدیک اس قدر مسلم ہے جس کی دلیل کی ضرورت نہیں اس کے برعکس جو شخص سریلی آواز اور خوش الحانی کو بے کار سمجھتا ہے اور بے اثر جانتا ہے وہ یا تو جھوٹ بولتا ہے اور نفاق اختیار کرتا ہے یا وہ حس ہی نہیں رکھتا جس سے وہ استفادہ کر سکے، وہ انسان اور صوفیوں کے طبقہ سے باہر ہے۔ جو گروہ اس سے روکتا ہے وہ حکم الٰہی کا پاس کرتا ہے۔ فقہا اس بات پر متفق ہیں کہ اگر کھیل کود کے اسباب نہ ہوں اور سماع سے دل میں بدکاری کا خیال پیدا نہ ہو تو اس کا سننا مباح ہے۔ جس کے متعلق بہت سی احادیث ہیں چنانچہ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ میرے پاس ایک لونڈی تھی جو گا رہی تھی کہ اتنے میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اندر آنے کی اجازت طلب کی جب اس لونڈی کو ان کے آنے کا علم ہوا تو وہ خاموش ہو گئی اور بھاگ گئی جب حضرت عمر رضی اللہ عنہ داخل ہوئے تو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے تبسم فرمایا حضرت عمر نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت فرمایا کہ یارسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! آپ تبسم کیوں فرما رہے ہیں؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ہماری ایک لونڈی کچھ گا رہی تھی جب اس نے تمہاری آواز سنی تو بھاگ گئی۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے عرض کیا کہ جب تک میں وہ بات نہ سن لوں جو آپ صلی اللہ علیہ وسلم سن رہے تھے تو میں یہاں سے نہیں ٹلوں گا۔ چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس لونڈی کو

بلوایا تو وہ گانے لگی اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم سنتے رہے۔ اس طرح بہت سے صحابہ سے ایسی ہی روایات ہیں شیخ عبدالرحمٰن سلمٰی رحمتہ اللہ علیہ نے ان سب کو اپنی کتاب "السّماع" میں جمع کر دیا ہے اور ان کے جواز کا فیصلہ دیا ہے مگر مشائخ صوفیہ کی مراد سماع سے اباحت فقہی نہیں کہ جس پر عمل کرنا نہ کرنا دونوں برابر ہوں بلکہ ان کی مراد اس سے وہ اباحت ہے جس سے اعمال میں فوائد حاصل ہوں ویسے صرف مباح کا خیال کرنا اور پیروی کرنا عوام کالانعام کا کام ہے سمجھدار لوگوں کو ایسے کام کرنا چاہئیں جن سے فوائد دارین حاصل ہوں۔

ایک دفعہ مرو میں ائمہ اہل حدیث میں سے ایک مشہور امام نے مجھ سے کہا کہ میں نے سماع کو مباح ثابت کرنے کے لئے ایک کتاب لکھی ہے تو میں نے کہا کہ دین میں ایک بہت بڑی مصیبت پیدا ہو گئی کیونکہ اس طرح آپ نے ایک لہو ولعب کو جو تمام برائیوں کی جڑ ہے حلال کر دیا تو انہوں نے کہا اگر آپ اسے حلال نہیں سمجھتے تو خود سماع کیوں کرتے ہیں میں نے جواب دیا کہ اس کا حکم کئی وجوہ پر ہے ایک چیز پر کوئی قطعی فیصلہ نہیں کرنا چاہئے کیونکہ اگر اس کی تاثیر دل میں بہتر اثر کرتی ہے تو یہ حلال ہے اور اگر حرام کی طرف مائل ہونے کا سبب ہے تو حرام ہے، اگر مباح اثر ہے تو سماع بھی مباح ہے۔ خلاصہ یہ ہے کہ جس چیز کا ظاہری معاملہ فسق پر ہے اور باطنی طور پر اس کی تاثیر مختلف طریقوں پر ہے تو ایسی چیز پر کوئی ایک حکم لگانا محال اور نامناسب ہے۔ واللہ اعلم

سماع کے احکام

اختلاف طبائع کے لحاظ سے احکام سماع بھی مختلف ہیں جس طرح کہ عزائم وارادے مختلف ہوتے ہیں ایسی صورت حال میں کسی ایک چیز پر ایک حکم لگانا ظلم ہے۔

سماع کرنے والے دو قسم کے لوگ ہیں۔ ایک فقط معنیٰ کو سننے والے، دوسرے جو آواز کو سنتے ہیں معانی سے کوئی مطلب نہیں رکھتے۔ ان دونوں طریقوں میں فوائد بھی ہیں اور نقصانات بھی۔ سریلی آوازوں کا سننا غلبہ معنیٰ کی وجہ سے ہوتا ہے جو فطرت انسانی میں داخل

ہے۔ چنانچہ اگر معانی حق ہیں تو سماع بھی حق ہے اور معنی باطل ہے تو سماع بھی باطل ہے اس بناء پر جس شخص کی طبیعت میں فساد ہوتا ہے وہ جو کچھ سنتا ہے وہ سب فساد بن جاتا ہے اور یہ سب معانی حضرت داؤد علیہ السلام کی حکایات میں آتے ہیں کہ جب خدا نے ان کو خلیفہ کائنات بنایا تو خوش الحانی دی، آپ کے گلے کو ساز بنا دیا پہاڑوں کو آپ کی خوش الحانی کا ذریعہ بنا دیا حتیٰ کہ وحشی جانور، پرندے پہاڑوں اور جنگلوں کو آپ کی خوش الحانی کا ذریعہ بنا دیا حتیٰ کہ وحشی جانور، پرندے پہاڑوں اور جنگلوں سے آپ کی خوش الحانی سننے کے لئے جمع ہو جاتے، بہتے ہوئے پانی رک جاتے، اڑتے ہوئے پرندے گر پڑتے، آثار و روایات میں ہے کہ حضرت داؤد جس جنگل میں خوش الحانی کرتے وہاں کے جانور ایک ماہ تک کچھ نہ کھاتے پیتے، بچے نہ دودھ مانگتے اور نہ روتے اکثر لوگ لحن داؤدی کی لذت میں فوت ہو جاتے، حتیٰ کہ ایک روایت کے مطابق سات سو جوان لونڈیاں اور بارہ ہزار بڈھے مر گئے۔ حق تعالیٰ نے حقیقت پسند اور خواہش نفس سے سماع کرنے والوں میں امتیاز کر دیا جس سے ابلیس کا حربہ شروع ہو گیا اور وسوسہ کے ذریعہ بہکانے کا پروگرام بنایا۔ اس نے اپنے حربوں کو استعمال کرنے کی اجازت مانگی۔ تو اس مل گئی اس بنا پر اس نے بانسری اور طنبورے بنائے اور حضرت داؤد علیہ السلام کے بالمقابل محفلِ سماع قائم کی حتیٰ کہ حضرت داؤد علیہ السلام کے سننے والے دو جماعتوں میں تقسیم ہو گئے اہل سعادت حضرت داؤد کے ساتھ اور اہل شقاوت شیطان کے پیرو بن گئے۔ اہل معنیٰ حضرت داؤد علیہ السلام کی ظاہری آواز پر مائل نہ تھے بلکہ حقیقت پسند تھے کیونکہ وہ سب حق شناس اور حق بین تھے وہ شیطان کی محفل کو آزمائش اور مجلس داؤدی کو ذریعہ ہدایت جانتے تھے حتیٰ کہ انہوں نے دونوں گروہوں کے اصل معاملات کو معلوم کر لیا صحیح کو صحیح اور غلط کو غلط دیکھ کر کنارہ کش ہو گئے اور سب تعلقات سے منہ موڑ کر حق تعالیٰ سے رشتہ جوڑ لیا۔ چنانچہ جس شخص کا حال سماع کے متعلق ایسا ہو وہ جو کچھ سنے حلال ہے۔

مدعیوں کی ایک جماعت یہ کہتی ہے کہ سماع حقیقت میں جو کچھ ہے وہ بظاہر برخلاف معلوم ہوتا ہے حالانکہ یہ مشکل ہے کیونکہ ولایت کا کمال یہ ہے کہ ہر چیز کو اس کی اصل کے

مطابق دیکھا جائے تا کہ مشاہدہ صحیح ہو اگر معاملہ اس کے برعکس ہوگا تو مشاہدہ مکمل نہ ہوگا۔ جبکہ حضرت رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ "اَللّٰھُمَّ اَرِنَا حَقَائِقَ کُلَّ الْاَشْیَاءِ کَمَا ھِیَ" "اے اللہ ہمیں تمام اشیاء کی حقیقت ایسی ہی دکھا جس صفت پر وہ اصل میں ہیں۔ جب چیزوں کا مشاہدہ صحیح وہی ہے جو حقیقت اور اصل کو ظاہر کرے تو صحیح سماع کا معاملہ بھی اسی طرح ہونا چاہئے کہ سننا وہی مناسب ہوگا جو حقائق کو واضح کرے اور جو لوگ ظاہری آواز اور مزامیر پر خواہش نفس سے فریفتہ ہوتے ہیں وہ دراصل ظاہری آواز کو سنتے ہیں اصل مطلب کو نہیں سن سکتے۔ اگر وہ سماع کی حقیقت کے مطابق سنتے تو وہ سماع کی تمام خرابیوں سے نجات پا جاتے مگر اس کے برعکس نقصان میں اضافہ ہوتا ہے۔ جس طرح کہ گمراہ لوگوں نے قرآن کو سنا مگر ان کی گمراہی میں اضافہ صرف اسی وجہ سے ہوا کہ وہ حقیقت کلام کو نہ سمجھ سکے بلکہ صرف ظاہری الفاظ کو سن کر کہنے لگے کہ یہ تو پرانے قصے اور مثالیں ہیں جیسا کہ نضر بن حارث نے قرآن کو سن کر کہا "ھٰذَآ اَسَاطِیْرُ الْاَوَّلِیْنَ" (الانعام:۲۵) یہ تو پہلے لوگوں کی کہانیاں ہیں۔ عبداللہ بن سعد بن ابی سرح جو کاتب وحی تھا اس نے تو یہاں تک کہہ دیا کہ "سَاُنْزِلُ مِثْلَ مَا اَنْزَلَ اللّٰہُ فَتَبَارَکَ اللّٰہُ اَحْسَنُ الْخَالِقِیْنَ" (المومنون:۱۴) (میں بھی ایسا کلام اتاروں گا جیسا اللہ نے قرآن اتارا ہے۔ پس وہ ذات بابرکات بہتر پیدا کرنے والا ہے ایک گروہ نے دیدار الٰہی کی نفی میں اس آیت کو دلیل بنالیا " لَاتُدْرِکُہُ الْاَبْصَارُ وَھُوَ یُدْرِکُ الْاَبْصَارَ "(الانعام:۱۰۳) (اس ذات کو آنکھیں نہیں دیکھ سکتیں اور وہ آنکھوں کو دیکھ سکتا ہے) ایک گروہ نے مکان اور جہت ثابت کرنے کے لئے اس آیت سے استدلال کیا "ثُمَّ اسْتَوٰی عَلَی الْعَرْشِ" (الاعراف:۵۴) (پھر عرش پر وہ اچھی طرح سے بیٹھ گیا) ایک گروہ نے اس آیت کو دیدار الٰہی کی دلیل بنالیا "وَّجَآءَ رَبُّکَ وَالْمَلَکُ صَفًّا صَفًّا" (البلد:۲۲) (اور آیا تیرا رب اور فرشتے صف در صف ہو کر) چونکہ ان کے دل محل گمراہی تھے لہٰذا کلام نے انہیں کوئی فائدہ نہ دیا۔ جب موحد نے کسی شعر کو دیکھ کر اس کے کہنے والے کے خالق کو دیکھا اور اس کے باطن کو آراستہ کرنے والے کا مطالعہ کیا تو بطور عبرت اس کے فعل کو فاعل پر دلیل بنالیا۔ غرض یہ کہ اس گمراہ گروہ نے

کلامِ حق سن کر بھی راہ حق نہ پایا اور گروہ صوفیا نے کلام باطل میں سماع کے ذریعہ راہ حق تلاش کرلی۔ یہ ایک حقیقت ہے جس کا انکار کھلا ہوا مکابرہ ہے۔ واللہ اعلم

سماع کے متعلق مشائخ کے اقوال

سماع کے متعلق مشائخ کے بہت سے اقوال ہیں مگر یہاں مختصراً لکھوں گا کیونکہ یہ کتاب ان سب کلمات کی متحمل نہیں ہوسکتی۔ انشاء اللہ ان سب سے آپ کو مکمل فائدہ ہوگا البتہ توفیق اللہ کے ہاتھ میں ہے۔

ذوالنون مصری رحمتہ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ سماع حق کا فیضان ہے جو دلوں کو حق کی طرف راغب کرتا ہے پس جس نے حقیقی معنوں میں سنا اس نے راہِ حق کو پالیا اور جس نے خواہش نفسی سے سنا وہ بے دین ہوگیا۔ اس سے مراد یہ نہیں کہ سماع وصل حق کا سبب ہوگا بلکہ سننے والے کو چاہئے کہ سماع طلب حق کے لئے کرے صرف آواز کی رنگینی کے لئے نہیں تا کہ اس کا دل فیضانِ حق کا محل بن جائے چنانچہ جب حق حاصل ہوگا اور جو نفس وخواہش کا تابع ہوگا وہ پردہ میں رہے گا اور تاویل سے تعلق پیدا کرے گا۔ سماع حق مکاشفہ الٰہی کا سبب ہے اور سماع نفس حجابِ حق کا ذریعہ۔ جو زندیقی کی طرف راغب کرتا ہے زندقہ فارسی زبان کا لفظ ہے جو معرب ہے فارسی میں اس کے معنی تاویل کرنے کے ہیں اسی وجہ سے وہ اپنی کتاب کو ژندو پاژند کہتے ہیں جب لغت والوں نے آتش پرستوں کا نام رکھنا چاہا تو ''زندیق'' رکھ دیا کیونکہ زندیق یہ کہتے ہیں کہ جو کچھ مسلمان کہتے ہیں اس کی تاویل ممکن ہے۔ تنزیل دیانت میں داخل کرتی ہے اور تاویل دیانت سے باہر نکالتی ہے۔ آج کل کے مصری شیعہ جو ان میں سے کچھ باقی ہیں وہی کہتے ہیں جو مجوسی کہتے تھے۔ چنانچہ زندیق کا نام ان کے لئے خاص ہوگیا ہے۔

حضرت ذوالنون مصری رحمتہ اللہ علیہ کی مراد یہ ہے کہ اہل تحقیق سماع میں تحقیق کرنے والے ہوتے ہیں اور اہل نفس تاویل کرنے والے اسی وجہ سے وہ فسق و فجور میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔

شبلی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں "سماع کا ظاہر فتنہ ہے اور باطن عبرت جو اہل اشارہ ہے اور اشارات کو پہچانتا ہے اس کے لئے سماع عبرت حلال ہے ورنہ طلب فتنہ ہے اور مصیبت کا سامنا کرنا ہے یعنی جس کا دل پوری طرح قولِ حق میں محو نہیں اس کے لئے سماع محل آفت اور آزمائش ہے۔

ابوعلی رود باری رحمۃ اللہ علیہ سماع کے متعلق ایک سوال کا جواب دیتے ہوئے یہ فرماتے ہیں کہ "لیتنا تخلصا منه راساً براس" (کاش کہ ہم اس سماع میں تحقیق کرنے والے ہوتے ہیں اور اہل نفس تاویل کرنے سے قاصر ہے جب کسی چیز کا حق فوت پا لیتے) اس لئے کہ آدمی ہر چیز کا حق کو دیکھتا ہے اور جب اپنی تقصیر کو دیکھتا ہے تو کہتا ہے کہ کاش ہم بالکل چھوٹ جاتے،

ایک بزرگ فرماتے ہیں "السماع تنبيه الاسرار لما فيه من المغيبات" (بھیدوں کے پیدا کرنے کا نام سماع ہے جو دراصل باطن میں پوشیدہ ہیں تا کہ ان کے ذریعہ سے حق تعالیٰ کی بارگاہ میں حاضر رہیں اس لئے کہ اسرار کا پوشیدہ رکھنا مریدوں کے لئے سخت قابل ملامت ہے اور ان کے سب سے برے صفات میں سے ہے کیونکہ گو دوست بظاہر دوست سے غائب ہو مگر دل سے حاضر ہوتا ہے اور جب غیبت آ گئی تو دوستی ختم ہو جاتی ہے۔

میرے شیخ نے فرمایا کہ "السماع زاد المضطرين فمن وصل استغنى عن السماع" (سماع عاجز لوگوں کا سفر خرچ ہے پس جو منزل پر پہنچ گئے انہیں سماع کی حاجت نہیں) کیونکہ وصل کی حالت میں سننے کا حکم باقی نہیں رہتا اس لئے کہ سننا خبر کا ہوتا ہے اور خبر غائب کے متعلق دی جاتی ہے جب آنکھوں سے مشاہدہ ہو گیا تو سننے کا معاملہ ختم ہو جاتا ہے۔

حضرت حضری رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں "تو اس سماع کو کیا کرے گا جو منقطع ہو جائے جب گانے والا رک جاتا ہے تو اس کا اثر بھی ختم ہو جاتا ہے چنانچہ مناسب یہ ہے کہ سماع متصل ہو جس کی تاثیر ختم نہیں ہوتی (یعنی ہر وقت ذکر حق کی آواز کانوں میں آتی رہے) اس بات سے یہ پتہ چلتا ہے کہ ہمت مجتمع رہے منقطع نہ ہو کیونکہ بندہ جب اس درجہ پر پہنچ جاتا ہے تو تمام عالم

جمادات وحیوانات اس کا سماع کرنے والے ہو جاتے ہیں اور یہ درجہ بہت بڑا ہے۔ اللہ توفیق دینے والا ہے۔

سماع میں صوفیوں کا اختلاف

سماع کے متعلق مشائخ و محققین صوفیاء کے درمیان اختلاف ہے ایک گروہ سماع کو غیبت کا آلہ بتاتا ہے اور یہ دلیل دیتا ہے کہ مشاہدہ میں سماع محال ہے اور دوست کے دیدار کے وقت سننے سے بے نیازی ہو جاتی ہے کیونکہ سماع خبر کا ہوتا ہے اور خبر مشاہدہ کی حالت میں دوری، حجاب اور مشغولی ہوتی ہے۔ پس سماع مبتدیوں کا آلہ ہوتا ہے تا کہ غفلت کی پراگندگیوں سے ان کو مجتمع کر سکیں اور جو پہلے سے مجتمع ہو وہ سماع کی وجہ سے پراگندہ ہو جاتا ہے۔ ایک گروہ سماع کو حاضری کا آلہ بتاتا ہے کیونکہ محبت کلی فنا اور محویت کو چاہتی ہے جب تک محبّ کا کل محبوب کے کل میں مستغرق نہ ہو جائے وہ محبت میں ناقص ہوتا ہے۔ پس جیسا کہ دل کا حصہ وصل کے مقام میں محبت ہے اور باطن کا مشاہدہ روح کا وصل اور جسم کی خدمت ہے اسی طرح ضروری ہے کہ کان کا بھی حصہ ہو جیسا کہ دیدار میں آنکھ کا حصہ ہے۔ کسی شاعر نے اپنے ہزلیہ اشعار میں بسلسلہ دوستی شراب کہا ہے کہ:

الا فاسقنی خمرا وقل لی ھی الخمر

ولا تسقنی سرا اذا امکن الجھر

"اے دوست مجھے شراب پلا اور مجھے کہہ دے کہ یہ شراب ہے اور مجھے شراب مخفی طور پر نہ پلا جبکہ ظاہر پلانا ممکن ہے۔"

یعنی اے دوست شراب اس صورت میں پلا کہ میری آنکھ دیکھ لے اور ہاتھ چھو لے، زبان چکھ لے، ناک سونگھ لے مگر اس وقت قوتِ سامعہ یعنی کان محروم رہے گا لہٰذا یہ کہہ دے کہ یہ شراب ہے تا کہ کان بھی اپنا حصہ پالے۔ حتیٰ کہ میرے تمام حواس اس سے مل جائیں اور لذت گیر ہو جائیں۔

یہ بھی کہتے ہیں کہ سماع حضوری کا آلہ ہے کیونکہ غائب، غائب ہوتا ہے اور منکر بھی انجان اس کا اہل نہیں ہوتا۔ سماع کی دو قسمیں ہیں۔(۱) بالواسطہ، (۲) بلاواسطہ، جو کسی گویے سے سنا جاتا ہے وہ غیبت کا آلہ ہوتا ہے اور جو خدا کی طرف سنا جاتا ہے وہ حضوری کا آلہ کہلاتا ہے اسی بنا پر یہ کہا گیا ہے کہ مخلوق اس لائق نہیں کہ ان کی کوئی بات سنی جائے یا ان کی بات بیان کی جائے سوائے بزرگان اور خاص لوگوں کے کسی سے سماع نہ کیا جائے۔ واللہ اعلم

بسلسلہ سماع صوفیا کے مراتب

صوفیوں میں سے ہر ایک کا سماع کے معاملہ میں ایک خاص مقام و مرتبہ ہے جس کے ذریعہ وہ سماع سے لطف اندوز ہوتا ہے جیسا کہ توبہ کرنے والے کے لئے سماع، معاون توبہ ہوتا ہے اور اس سے ندامت حاصل ہوتی ہے، مشتاق دیدار کے لئے سبب دیدار، یقین کرنے والے کے لئے تاکید، مرید کے لئے تحقیق کا ذریعہ، محبّ کے لئے تعلقات منقطع کرنے کا باعث اور فقیر کے لئے سماع ماسوٰی اللہ سے ناامیدی کی بنیاد بن جاتا ہے۔ دراصل سماع مثل آفتاب ہے جو تمام چیزوں پر روشنی ڈالتا ہے مگر اس روشنی سے استفادہ ہر چیز اپنی اپنی صلاحیت و اہلیت کے مطابق کرتی ہے۔ سورج کسی کو جلا دیتا ہے اور کسی کو جَلا دیتا ہے، کسی کو نوازتا ہے تو کسی کو بھسم کر دیتا ہے۔ سماع کے متعلق تین فرقے ہیں۔(۱) مبتدی، (۲) متوسط درجہ اور (۳) تیسرے نمبر پر کامل ہیں ان میں سے ہر ایک کا مفصل تذکرہ کیا جائے گا تاکہ حقیقت اچھی طرح سمجھ میں آجائے۔ انشاءاللہ تعالیٰ

سماع کے متعلق معاملات

معلوم ہونا چاہئے کہ سماع فیضانِ حق ہے اور انسانی جسم کی ساخت و ترکیب متضاد عناصر سے ہوئی ہے اس وجہ سے مبتدی کی طبیعت شروع میں خدا کے معاملات میں نہیں لگتی مگر جب امور الٰہی اور اسرار ربانی کا سلسلہ جاری ہوتا ہے تو طبیعت کو سوز و گداز حاصل ہو جاتا ہے۔ اسی وجہ سے ایک جماعت سماع سے بے ہوش ہو جاتی ہے اور ایک جماعت ہلاک ہو جاتی ہے

اور کوئی شخص ایسا نہیں رہتا جو حدِ اعتدال سے نہ گزر جائے۔ یہ حقیقت ہے اور ہمارا مشاہدہ ہے کہ ملک روم میں لوگوں نے ''انکلیون'' نامی ایک عجیب چیز تیار کی ہے جسے یونانی عجائب و غرائب کے مجموعہ والی چیز کو کہتے ہیں۔ یہ دراصل ایک باجہ ہے، جہاں ہفتہ میں دو دن بیماروں کو ان کی بیماری کے مطابق بجا کر سنایا جاتا ہے۔ اسی طرح اگر کسی کو مارنا مقصود ہوتا ہے تو اسے اس جگہ پر زیادہ دیر ٹھہرایا جاتا ہے تاکہ وہ ساز سن کر ہلاک ہو جائے۔ اگرچہ موت کا وقت معین ہے مگر اس کے اسباب تو برحق ہیں اگرچہ اس باجہ کو طبیب سنتے ہیں مگر ان کو کچھ نہیں ہوتا، کیونکہ وہ ان کی طبیعت کے بالکل موافق ہوتا اور مبتدیوں کے طبیعت کے مخالف ہے۔

میں نے ہندوستان میں ایک ایسا زہر دیکھا ہے جس میں ایک کیڑا پیدا ہوتا ہے جس کی غذا ہی وہ زہر ہے کیونکہ وہ ہمہ تن زہر ہی ہو جاتا ہے۔ ترکستان میں اسلامی سرحد پر واقع ایک شہر میں پہاڑ کو آگ لگ گئی اور وہاں سے نوشادر ابل رہا تھا اس آگ میں ایک چوہا تھا جو باہر نکلا تو فوراً مر گیا۔ ان مثالوں سے مراد یہ واضح کرنا ہے کہ مبتدیوں کی بے چینی فیضانِ الٰہی کے وارد ہونے کی صورت میں اس وجہ سے ہوتی ہے کہ ان کا جسم اس کے بالکل مخالف ہوتا ہے اور اس حالت کے متواتر قائم رہنے سے مبتدی کو سکون حاصل ہونے لگتا ہے۔ جیسا کہ جبرائیل علیہ السلام وحی لے کر آئے تو رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم کی شروع میں اضطراب ہوا مگر جب انتہاء پر پہنچ گئے تو جبرائیل علیہ السلام کے تاخیر کرنے پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم غمگین ہو جاتے جس کے بہت سے شواہد موجود ہیں۔ یہ حکایات بسلسلہ سماع مبتدیوں کے لئے دلیل راہ ہیں اور منتہیوں کے لئے باعثِ آرام وسکون۔

مشہور ہے کہ حضرت جنید رحمتہ اللہ علیہ کے ایک مرید کو سماع میں کافی اضطراب ہوتا اور دوسرے مرید اسے سنبھالتے۔ جب اس چیز کی شکایت کی گئی تو آپ نے مرید سے فرمایا اگر آئندہ تو نے سماع میں بے قراری کا مظاہرہ کیا تو میں تجھے ہم نشیں نہیں ہونے دوں گا۔

ابومحمد حریری رحمتہ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اس شخص کو میں نے سماع کی حالت میں دیکھا تو اس کے ہونٹ بند تھے اور ہر بال سے بے قراری کا چشمہ ابل رہا تھا ایک دن اس کے ہوش و

حواس معطل تھے مگر حقیقت معلوم نہ ہو سکی کہ آیا وہ دورانِ سماع اچھی حالت میں تھا یا مرشد کی حرمت اس پر غالب تھی۔

روایت ہے کہ ایک شخص نے سماع میں ایک نعرہ مارا تو مرشد نے کہا کہ خاموش رہ، اس نے سر اپنے زانوں پر رکھا، جب لوگوں نے دیکھا تو وہ مر چکا تھا۔ شیخ ابو مسلم فارس بن غالب فارسی سے میں نے سنا ہے کہ ایک درویش دورانِ سماع بہت بے چین ہو جاتا تھا، کسی شخص نے اس کے سر پر ہاتھ رکھ کر کہا کہ بیٹھ جاؤ! وہ بیٹھتے ہی فوت ہو گیا۔ حضرت دراج ابن القرطی کے ساتھ دجلہ کے کنارے بصرہ اور رملہ کے درمیان جا رہے تھے راستہ میں ایک محل کے نیچے پہنچے تو دیکھا کہ ایک شخص چھت پر بیٹھا ہوا سامنے لونڈی سے گانا سن رہا ہے لونڈی یہ شعر پڑھ رہی تھی:

فی سبیل اللہ ودکان منی لك یبدل

کل یوم تتلون غیر ھذا بك اجمل

”میں تو تجھ سے خدا کے لئے محبت کرتا تھا اور اس کے ساتھ تیرا ہر روز

ایک نئے انداز اور رنگ میں بدلنا کیا بھلا معلوم ہوتا ہے۔“

میں نے ایک جوان کو اس محل کے نیچے گدڑی اور لوٹا لئے کھڑا دیکھا اس نے کہا کہ اے لونڈی تجھے خدا کی قسم یہ شعر دوبارہ پڑھ کیونکہ میری زندگی صرف ایک سانس رہ گئی ہے اور اس کے سننے سے ختم ہو جائے گی۔ لونڈی نے جب دوبارہ پڑھا تو جوان نے نعرہ مارا اور مر گیا لونڈی کے مالک نے کہا تو آزاد ہے اور خود نیچے اتر کر جوان کے کفن دفن کی تیاری کرنے لگ گیا سب بصرہ والوں نے اس کی نمازِ جنازہ پڑھی۔ اس کے بعد وہ آدمی کھڑا ہوا اور کہا کہ اے اہل بصرہ! میں فلاں بن فلاں ہوں میں نے سب ملکیت راہِ خدا میں وقف کر دی ہیں اور غلاموں کو آزاد کر دیا ہے۔ یہ کہہ کر وہ وہاں سے چلا گیا اور کسی کو اس کا پتہ نہ چل سکا۔ اس حکایت سے مطلب یہ ہے کہ مرید کا سماع کے وقت ایسا حال ہونا چاہئے کہ وہ بدکاروں کو بدکاری سے نجات دے جبکہ آج گمراہوں کا ایک گروہ بدکاروں کے سماع میں حاضر ہوتا ہے اور کہتا ہے کہ ہم حق کی وجہ سے سماع کرتے ہیں فاسق لوگ ان کے ہم خیال ہو جاتے ہیں اور سماع کے سلسلہ میں فسق و

فجور میں زیادہ حریص بن جاتے ہیں حتیٰ کہ وہ خود بھی ہلاک ہو جاتے ہیں اور اپنے متعلقین کو بھی تباہ کر دیتے ہیں۔

حضرت جنید رحمتہ اللہ علیہ سے لوگوں نے پوچھا کہ اگر ہم بطور عبرت گرجا میں چلے جائیں اور صرف کافروں کی ذلت کا مشاہدہ کریں اور اسلام کی نعمت پر شکریہ کریں تو کیا جائز ہے؟ آپ نے فرمایا اگر تم گرجا میں اس انداز میں جاؤ کہ جب باہر نکلو تو کچھ کافروں کو مسلمان بنا کر اپنے ساتھ لے آؤ تو جاؤ ورنہ نہیں۔ پس عبادت خانہ والا اگر شراب خانہ میں چلا جائے تو شراب خانہ بھی اس کا عبادت خانہ بن جاتا ہے۔ ایک بزرگ فرماتے ہیں کہ میں بغداد میں ایک بزرگ کے ساتھ جا رہا تھا کہ ایک گویے کی آواز سنی جو یہ گا رہا تھا:

منٰی ان تکن حقا تکن احسن المنی

ولا فقد عشنا بھا زمنا وغدا

"آرزو اگر حق ہے تو بہتر آرزو ہے ورنہ ہم نے اس آرزو میں ایک زمانہ بسر کر لیا ہے جو گزر چکا ہے۔ اس درویش نے نعرہ مارا اور رحلت کر گیا۔"

ایسا ہی ایک واقعہ ابو علی رودباری رحمتہ اللہ علیہ بیان فرماتے ہیں کہ میں نے ایک درویش کو گویے کی آواز میں مصروف دیکھا میں نے بھی اس آواز پر کان لگائے کہ اس کا گانا سنوں تو وہ غمناک آواز میں یہ گا رہا تھا:

امد کفی بالخضوع

الی الذی جار بالاصغاء

"میں فروتنی سے اس شخص کی طرف ہاتھ بڑھاتا ہوں جو سننے کی سخاوت کرتا ہے"

اس درویش نے نعرہ مارا اور مر گیا۔ ایک بزرگ فرماتے ہیں کہ میں حضرت ابراہیم خواص رحمتہ اللہ علیہ کے ساتھ پہاڑی راستہ پر چل رہا تھا تو میں نے خوشی میں آ کر یہ شعر پڑھا:

صح عند الناس انی عاشق

غیر ان لم یعرفوا عشقی لمن

لیس فی الانسان شئ حسن
الا واحسن منہ صوت الحسن

"لوگوں کو یہ تو صحیح طور پر معلوم ہے کہ میں عاشق ہوں مگر انہیں یہ علم نہیں کہ میں کس کا عاشق ہوں انسان میں تو کوئی چیز اچھی نہیں سوائے اس کی اچھی آواز کے۔"

مجھ سے حضرت ابراہیم خواص رحمتہ اللہ علیہ نے کہا کہ دوبرہ پڑھو، میں نے دوبارہ پڑھے تو آپ نے وجد کی حالت میں زمین پر پاؤں مارے میں نے غور سے دیکھا تو آپ کے قدم پتھر میں اس طرح گڑے ہوئے تھے جیسے کہ موم میں ہوں پتھر میں نہیں آپ بے ہوش ہو کر گر پڑے، جب ہوش میں آئے تو فرمایا کہ میں باغِ بہشت میں تھا لیکن تو نے نہیں دیکھا۔ اس قسم کی بہت سی حکایات ہیں مگر یہ کتاب ان کی متحمل نہیں ہو سکتی۔ میں نے بچشم خود ایک درویش کو آذربائیجان کی پہاڑیوں میں چلتے ہوئے جلدی جلدی یہ اشعار پڑھتے دیکھا جو ساتھ ساتھ آہ وزاری بھی کرتا چلا جا رہا تھا۔

واللہ ماطلعت شمس ولا غربت
الا وانت فی قلبی ووسواسی
ولا جلست فی قوم احدثهم
الا وانت حدیثی بین اجلاسی
ولا ذکرتك محزونا ولا طربا
الا وحبك مفرون بانفاسی
ولا هممت بشرب الماء من عطش
الا رأیت خیالا من فی الکاس
فلو قدرت علی الاتیان زرتکم
مکبا علی الوجه ومشیا علی الراس

''خدا کی قسم مجھ پر کوئی دن ایسا نہیں گزرا مگر تو میرے دل میں اور میرے خیالات میں بسا ہوا ہوتا ہے میں نے کسی مجلس اور قوم میں تیری بات کے علاوہ کوئی اور بات نہیں کی، میں نے تیرا ذکر خوشی و غم کی حالت میں اس طرح کیا ہے کہ تیری محبت میرے ہر سانس میں ملی ہوئی ہوتی ہے۔ میں نے پیاس کی حالت میں ہمیشہ اس طرح پانی پیا ہے کہ پیالے میں تیرا تصور و خیال رہا اگر میں آپ کے پاس آنے کی طاقت رکھتا تو منہ اور سر کے بل چل کر تیری زیارت کے لئے حاضر خدمت ہوتا۔ ان اشعار کے سماع سے اس درویش کی حالت نازک ہوگئی تھوڑی دیر پتھر سے پشت لگا کر سہارا لیتے ہوئے بیٹھا اور فوت ہوگیا۔ خدا اس پر رحمت فرمائے۔''

ہوس انگیز اشعار کے سماع کی کراہت

مشائخ کا ایک گروہ قصائد، اشعار اور غنا کے ساتھ اس طرح پڑھنا کہ حروف ،مخارج کی حدود سے تجاوز کر جائیں سننا مکروہ سمجھتا ہے، یہ گروہ نہ صرف خود پرہیز کرتا رہا ہے بلکہ اپنے مریدوں کو بھی منع کرتا رہا ہے جس میں کافی حد تک مبالغہ ہے۔ ان کے چند گروہ ہیں اور ہر گروہ کے نزدیک ایک خاص علت ہے۔ ایک گروہ سماع کے حرام ہونے کے لئے کئی روایتیں پیش کرتا ہے، اس سلسلہ میں وہ سلف صالحین کے پیروکار ہیں جیسا کہ حضرت رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا حضرت حسان بن ثابت رضی اللہ عنہ کی لونڈی کو گانے سے ڈانٹ کر روکنا اور تنبیہہ کرنا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا ایک گانے والے صحابی کو کوڑے لگانا حضرت علی رضی اللہ عنہ کا حضرت معاویہ پر اس وجہ سے اعتراض کرنا کہ ان کے پاس گانے والی لونڈیاں تھیں اور حضرت حسن رضی اللہ عنہ کو اس حبشی عورت کے دیکھنے سے منع کرنا جو گانا گا رہی تھی اور فرمایا کہ وہ شیطان کی سہیلی ہے اس طرح کی اور بہت سی روایات ہیں نیز یہ گروہ کہتا ہے کہ موجودہ اور گزشتہ زمانہ کی تمام امت مسلمہ کا اس پر اجماع ہے کہ یہ مکروہ ہے حتیٰ کہ ایک گروہ تو اسے مطلقاً حرام کہتا ہے۔ اس معنی میں حضرت ابوالحارث بنانی رحمتہ

اللہ علیہ بیان کرتے ہیں کہ میں سماع کا بہت شوقین تھا ایک رات میرے حجرے میں ایک شخص آیا اس نے مجھ سے کہا کہ طالبانِ حق کی ایک جماعت مجتمع ہوئی ہے اور وہ آپ کے دیدار کی مشتاق ہے اگر آپ قدم رنجہ فرمائیں تو کرم ہوگا۔ میں نے کہا چلو میں آتا ہوں۔ پھر میں اس کے پیچھے چل دیا۔ وہ مجھے ایک ایسے گروہ کے پاس لے گیا جو حلقہ باندھے بیٹھا تھا اور ان کا شیخ ان کے درمیان تھا ان سب نے میری عزت کی اور ممتاز جگہ پر مجھے بٹھا دیا۔ اس شیخ نے مجھ سے کہا اگر اجازت ہو تو کچھ اشعار سنواؤں؟ میں نے اجازت دے دی۔ دو شخصوں نے خوش الحانی کے ساتھ ہم آواز ہو کر ایسے اشعار گائے جو شاعروں نے فراق میں کہے تھے وہ سب وجد میں کھڑے ہو گئے نعرے اور لطیف اشارے کرنے لگے میں ان کے حال پر حیرت زدہ ہو کر رہ گیا اور بڑا محظوظ ہوا یہاں تک کہ صبح نمودار ہو گئی اس وقت اس شیخ نے مجھ سے کہا، اے شیخ! آپ نے مجھ سے دریافت نہ فرمایا کہ میں کون ہوں؟ اور کس گروہ سے تعلق رکھتا ہوں؟ میں نے کہا تمہاری حشمت مجھے یہ دریافت کرنے میں مانع رہی۔ اس نے کہا میں عزازیل ہوں جسے اب ابلیس کہتے ہیں اور یہ سب میرے فرزند ہیں اس جگہ بیٹھنے اور گانے سے مجھے دو فائدے تھے ایک یہ کہ میں خود جدائی اور فراق کی مصیبت میں مبتلا ہوں اور نعمت کے دنوں کو یاد کرتا ہوں دوسرے یہ کہ متقی لوگوں کو راہ راست سے بھٹکا کر غلط راستہ پر ڈالتا ہوں۔ فرماتے ہیں کہ اس کے بعد میرے دل سے سماع کا ارادہ اور اس کا شوق جاتا رہا۔

حضور سیدنا داتا گنج بخش رحمتہ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ میں نے حضرت امام شیخ ابو العباس اشقانی رحمتہ اللہ علیہ سے سنا ہے کہ وہ فرماتے تھے کہ میں ایک دن ایسے اجتماع میں شریک تھا جس کے کچھ لوگ سماع میں مشغول تھے اور ان کا سردار ان کے درمیان رقص کر رہا تھا اور ان میں دوڑتا پھر رہا تھا۔ وہ اس سے محظوظ ہو رہے تھے اور کچھ لوگ ایسے تھے جو اس اندیشہ کے پیش نظر، کہ مریدین اس بلاؤ بیہودگی میں مبتلا نہ ہو جائیں ان کی تقلید نہ کرنے لگیں۔ معصیت کے کنارے پر کھڑے ہو کر توبہ کا دامن ہاتھ سے نہ چھوڑ دیں ان کی نفسانی خواہشات کی تقویت کا موجب نہ بنے ہوس کا ارادہ ان کی صلاحیتوں کو فسخ نہ کر دے کیونکہ یہ لوگ سماع نہیں کر رہے تھے بلکہ فتنہ و بلا کا سامان پیش کر رہے تھے، اس لئے وہ ان کے ساتھ شریک نہ تھے۔

حضرت جنید بغدادی رحمتہ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ انہوں نے اپنے ایک مرید سے ابتدائے توبہ کے وقت نصیحت فرمائی کہ اگر تم دین کی سلامتی اور توبہ پر استقامت چاہتے ہو تو اس سماع سے دور رہنا جو صوفی لوگ سنتے ہیں۔ نہ ان میں شریک ہونا اور نہ ان کے ساتھ بیٹھنا جب تک کہ تم جوان ہو۔ جب تم بوڑھے ہو جاؤ تو ایسے فعل سے باز رہنا جس سے لوگ گنہگار ہوتے ہیں۔

ایک گروہ کہتا ہے کہ سماع والوں کے دو گروہ ہیں۔ ایک لاہی، دوسرا الٰہی، لاہی سراسر فتنہ ہیں وہ خدا سے نہیں ڈرتے۔ دوسرا الٰہی وہ مجاہدہ وریاضت میں رہتے اور مخلوق سے کنارہ کش ہو کر اپنے آپ کو فتنوں سے بچاتے ہیں یہ لوگ خدا کی حفاظت میں ہوتے ہیں۔ مگر ہم نہ اس گروہ سے ہیں اور نہ اس گروہ سے، ہمارے لئے یہی بہتر ہے کہ ہم اسے چھوڑ دیں اور ایسی باتوں میں مشغول ہونا جو ہمارے وقت کے موافق ہو زیادہ بہتر ہے۔

ایک گروہ یہ کہتا ہے کہ جب عوام کے لئے سماع میں فتنہ ہے اور ہمارے سننے سے لوگوں کے اعتقاد میں تذبذب واقع ہوتا ہے اور ہمارے درجے سے لوگ غافل و محجوب ہیں اور وہ ہماری وجہ سے گناہ میں مبتلا ہوتے ہیں تو ہمیں لازم ہے کہ ہم عوام پر شفقت کریں اور خاص لوگوں کو نصیحت کریں کہ دوسروں کی خاطر وہ اس سے باز رہیں۔ یہ طریقہ بہت اچھا ہے۔

ایک گروہ یہ کہتا ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ "وَمِنْ حُسْنِ اِسْلَامِ الْمَرْءِ تَرْكُهُ مَالَا يَعْنِيْهِ" اسلام کے نیک خصائل میں سے یہ ہے کہ لایعنی اور بے کار چیزوں کو چھوڑ دے۔ لہٰذا ہم ایسی چیزوں سے ہاتھ اٹھاتے ہیں اور اس سے دور ہیں کیونکہ لایعنی چیزوں میں مشغول ہونے سے وقت ضائع ہوتا ہے۔ حالانکہ دوستوں کے نزدیک ان کا اپنا وقت بڑا عزیز ہوتا ہے اسے ضائع نہ کرنا چاہئے۔

خاص لوگوں کا ایک گروہ یہ کہتا ہے کہ سماع خبر ہے اور اس کی لذت مراد کو پانا ہے یہ بچوں کا کام ہے کیونکہ مشاہدے میں خبر کی کوئی حیثیت نہیں ہے۔ اس لئے مشاہدے سے ہی تعلق رکھنا چاہئے۔ لہٰذا سماع کے احکام یہ ہیں جسے میں نے اختصار سے بیان کر دیا ہے اب مشائخ کے وجد، وجود اور تواجد کو بیان کرتا ہوں۔ وباللہ التوفیق

وجد، وجود اور تواجد کے مراتب

واضح رہنا چاہئے کہ وجد و وجود، دونوں مصدر ہیں وجد کے معنی اندوہ و غم اور وجود کے معنی پانے کے ہیں۔ جب دونوں کا فاعل ایک ہو تو بجز مصدر کے فرق کے اور کوئی فرق نہیں باقی رہتا۔ جیسا کہ کہ جاتا ہے ''وجد، یجد، وجود اور وجدانا'' اور جیسے ''وجد، یجد، وجدا'' جس کے معنی اندوہگیں کے ہیں۔

نیز جب تونگری کے معنی میں ہوگا تو ''وجد، یجد، جدۃ'' مستعمل ہوگا اور غصہ کے معنی میں ہوگا تو ''وجد، یجد، موجدۃ'' مستعمل ہوگا۔ یہ سب مصادر ہیں نہ کہ افعال و مشتقات اور اہل طریقت کے نزدیک وجد اور وجود سے ان دو حالتوں کا اثبات ہے جو سماع میں ظاہر ہوتے ہیں۔ ایک غم و اندوہ اور دوسرا حصول مراد کی کامیابی کی حالت کا اظہار کرتا ہے۔ غم و اندوہ کی حقیقت، محبوب کا گم ہونا اور مراد کا نہ پانا ہے اور حصولِ مراد کی حقیقت، مراد کا پانا ہے۔ حزن و وجد کے درمیان فرق یہ ہے کہ حزن اس غم کو کہتے ہیں جو اپنے نصیب میں ہو اور وجد اس غم کو کہتے ہیں جو محبت کے طریقہ پر دوسروں کے نصیب میں ہو۔ یہ تمام تغیرات طالب کی صفت ہیں ''اَلْحَقُّ لَا یَتَغَیَّرُ'' حق تغیر پذیر نہیں ہوتا اور وجد کی کیفیت، لفظ و عبارت میں بیان نہیں کی جاتی کیونکہ وہ معائنہ میں غم و الم ہے اور غم والم کی کیفیت لکھی نہیں جا سکتی۔

وجد ایک باطنی کیفیت ہے جو طالب و مطلوب کے درمیان ہوتی ہے کیونکہ کشف میں باطنی حالت کا بیان اور اس کے وجود کی کیفیت و کمیت کا نشان و اشارہ صحیح نہیں ہو سکتا اس لئے کہ مشاہدہ میں یک گونہ خوشی ہے اور خوشی، طلب سے حاصل نہیں ہوتی ہے اور وجود ایک طلب ہے جو محبوب سے محبت کو ملتی ہے اور اس کی حقیقت کا اظہار و اشارہ ناممکن ہے۔ میرے نزدیک وجد، دل کو غم و الم پہنچنے کا نام ہے خواہ وہ خوشی سے ہو یا غم سے، تکلیف سے ہو یا راحت سے اور وجود دلی غم کا آلہ ہے۔ اس سے مراد سچی محبت ہے۔ واجد کی صفت بحالت جوش اور شوق، حرکت ہوگی یا بحالتِ کشف، مشاہدہ کی حالت کے موافق سکون ہوگی۔

لیکن آہ وفغاں کرنے، گریہ وزاری کرنے، غصہ کرنے راحت پانے، تکلیف اٹھانے اور خوش ہونے کی صورت میں مشائخ طریقت کا اختلاف ہے کہ آیا وجد مکمل ہوتا ہے یا وجود؟ مشائخ فرماتے ہیں کہ وجود مریدوں کی صفت ہے اور وجد عارفوں کی توصیف چونکہ عارفوں کا درجہ مریدوں سے بلند ہوتا ہے اس لئے ضروری ہے کہ ان کی صفت بھی ان سے بلند تر اور کامل تر ہو۔ جو چیز حاصل ہونے اور پانے کے تحت آتی ہے وہ مدرک ہوتی ہے، موصوف وصفت ایک ہی جنس کے ہوتے ہیں اور یہ کہ ادراک حد کا اقتضاء کرتی ہے اور حق تعالیٰ بے حد ہے لہٰذا بندہ کا پانا بجز مشرب وعمل کے نہ ہوگا اور جس نے نہ پایا ہو وہ طلب گار ہوتا ہے اور اس میں طلب منقطع ہوتی ہے اور وہ اس کی طلب سے عاجز ہوتا ہے اور وجدان حق کی حقیقت ہوتی ہے۔

ایک گروہ یہ کہتا ہے وجد، مریدوں کی سوزش ہے اور وجود محبوں کا تحفہ۔ مریدوں سے محبوں کے درجہ کی بلندی مقتضی ہے کہ طلب کی سوزش سے، تحفہ مکمل اور زیادہ آرام دہ ہے اس کی وضاحت اس حکایت میں ہے کہ:

ایک دن حضرت شبلی رحمتہ اللہ علیہ اپنے حال کے جوش میں حضرت جنید بغدادی رحمتہ اللہ علیہ کے پاس آئے انہوں نے ان کو غمگین دیکھا تو عرض کیا کہ اے شیخ! کیا بات ہے؟ حضرت جنید رحمتہ اللہ علیہ نے فرمایا "مَنْ طَلَبَ وَجَدَ" جس نے چاہا پالیا۔ حضرت شبلی رحمتہ اللہ علیہ نے عرض کیا "لَا بَلْ مَنْ وَجَدَ طَلَبَ" نہیں بلکہ جس نے پایا وہ طالب ہوا۔

اس کے معنی میں مشائخ فرماتے ہیں کہ ایک نے وجد کا پتہ دیا۔ دوسرے نے وجود کا اشارہ کیا۔ مگر میرے نزدیک حضرت جنید کا قول معتبر ہے اس لئے کہ بندہ جب جان لیتا ہے کہ اس کا معبود، اس کی جنس کا نہیں ہے تو اس کا غم طویل ہو جاتا ہے۔ اس کتاب میں اس بحث کا تذکرہ اس سے پہلے بھی کیا جا چکا ہے۔

مشائخ طریقت کا اس پر اتفاق ہے کہ غلبہ وجد سے غلبہ علم اقویٰ ہوتا ہے کیونکہ جب قوت وجد کے غلبہ کو ہوتی ہے تو واجد خطر کے محل میں ہوتا ہے اور جب قوت، علم کے غلبہ کو ہوتی ہے تو عالم امن کے محل میں ہوتا ہے۔

خلاصہ کلام یہ ہے کہ طالب حق، ہر حال میں علم وشریعت کا فرمانبردار رہے کیونکہ جب وجد سے مغلوب ہو جاتا ہے تو اس سے خطاب اٹھ جاتا ہے اور جب خطاب اٹھ جاتا ہے تو ثواب وعتاب بھی اٹھ جاتا ہے۔ جب ثواب وعتاب اٹھ جائے تو عزت وذلت بھی اٹھ جاتی ہے۔ اس وقت اس کا حکم دیوانوں اور پاگل جیسا ہوتا ہے نہ کہ اولیاء اور مقربین جیسا؟ جب بندے کے غلبہ حال پر، علم کا غلبہ ہو تو بندہ اوامر ونواہی کی پناہ گاہ میں ہوتا ہے اور عزت کے محل میں مقیم۔ اور وہ ہمیشہ صاحب شکر ہوتا ہے اور جب غلبہ علم پر حال کا غلبہ غالب ہو تو بندہ حدود سے خارج ہو کر اپنے نقص کے محل میں خطاب سے محروم ہو جاتا ہے اس وقت یا تو معذور ہوگا یا مغرور؟ بعینہ یہی معنی حضرت جنید رحمتہ اللہ علیہ کے قول کے ہیں اس لئے کہ دو ہی راستے ہیں ایک علم سے دوسرے عمل سے اور جو عمل، علم کے بغیر ہو اگرچہ بہتر ہو مگر وہ جہل ونقص ہے۔ اور وہ علم جو عمل کے بغیر ہو بہرطور موجب عزت وشرف۔ اسی بنا پر حضرت بایزید رحمتہ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ ''اہل ہمت کا کفر، آرزو رکھنے والے اسلام سے بزرگ تر ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اہل ہمت پر کفر کی کوئی صورت نہیں بنتی اگر غور کیا جائے تو اہل ہمت جو کفر کے ساتھ ہو آرزو والے ایماندار سے زیادہ کامل ہوتا ہے۔ حضرت جنید رحمتہ اللہ علیہ نے حضرت شبلی رحمتہ اللہ علیہ کے بارے میں فرمایا شبلی مست ہے اگر وہ مستی سے افاقہ پا جائیں تو ایسے ڈرانے والے ہوں کہ کوئی بھی ان سے فائدہ حاصل نہ کر سکے۔

ایک مرتبہ حضرت جنید، حضرت محمد بن سیرین اور حضرت ابوالعباس بن عطار رحمہم اللہ ایک جگہ جمع تھے قوال نے چند اشعار گائے دونوں باہم وجد کرنے لگے اور حضرت جنید ساکن بیٹھے رہے۔ وہ کہنے لگے اے شیخ! اس سماع میں آپ کا کوئی حصہ نہیں ہے؟ حضرت جنید نے اللہ تعالیٰ کا یہ قول پڑھا ''تَحْسَبُهَا جَامِدَةً وَّهِيَ تَمُرُّ مَرَّ السَّحَابِ'' (النمل:۸۸) تم ان کو جامد وساکن خیال کرتے ہو حالانکہ وہ گزرنے والے بادلوں کی مانند گزر جاتے ہیں۔

بحالت وجد، تواجد تکلف ہے تو اجد یہ ہے کہ حق کے انعام وشواہد کو دل پر پیش کرنا اور وصل وآواز کی فکر کرنا، یہ کام جوانمردوں کا ہے۔

ایک گروہ اس میں محض رسموں کا پابند بنا ہوا ہے جو ظاہری حرکتوں کی تقلید کرتا، با قاعدہ رقص کرتا اوران کے اشاروں کی نقل اتارتا ہے یہ حرام محض ہے۔ایک گروہ محقق وثابت قدم ہے اس میں محض مراد، مشائخ کے درجات اوران کے احوال کی طلب ہے نہ کہ خالی رسموں کی تقلیداورحرکتوں کی پیروی، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کاارشاد ہے کہ "مَنْ تَشَبَّهَ بِقَوْمٍ فَهُوَ مِنْهُمْ" (ابوداؤد) جس نے جس قوم کی مشابہت کی وہ انہیں میں سے ہے۔اور یہ بھی ارشاد ہے کہ "اِذَا قَرَأْتُمُ الْقُرْآنَ فَابْكُوْا فَاِنْ لَّمْ تَبْكُوْا فَتَبَاكَوْا" (ابن ماجہ) جب تم قرآن پڑھوتو رودٔ پھر اگر رونہ سکوتو رونے کی شکل بنالو یہ حدیث مبارک تواجد کی اباحت پر شاہد وناطق ہے۔اسی لئے ایک بزرگ فرماتے ہیں کہ میں ہزار میل جھوٹے قدم چلتا ہوں تا کہ ان میں سے کوئی ایک قدم تو سچا ہو جائے۔ واللہ اعلم بالصواب

رقص:

واضح ہو کہ شریعت وطریقت دونوں میں رقص کی کوئی اصل نہیں ہے اور تمام عقلاء کا اتفاق ہے کہ لہواور کھیل ہےخواہ بکوشش ہوخواہ بیہودگی سے ہولغو و باطل ہے۔کوئی ایک بزرگ بھی اسے پسند نہیں کرتا۔ نہ اس میں کسی نے غلو کیا ہے۔اس بارے میں اہل حشو کا ہر قدم یا ثبوت جو بھی ہے وہ سب بطلان پر مبنی ہوگا۔ مثلاً اگر وہ یہ کہیں کہ وجد کی حرکتیں اوراہل تواجد کے معاملات رقص کی مانند ہوتے ہیں۔ یہ باطل ہے بیہودہ لوگوں کا ایک گروہ اس میں ان کی تقلید کرتا اور غلو برتتا ہے۔انہوں نے اسے اپنا مذہب بنالیا ہے۔ میں نے عام لوگوں کو دیکھا ہے کہ وہ یہ خیال کرتے ہیں کہ مذہب تصوف اس کے سوا ہے ہی نہیں جسے وہ اختیار کئے ہوئے ہیں اور ایک گروہ تو اصلیت ہی کا منکر ہو گیا ہے۔ الغرض رقص، شرعاً اور عقلاً تمام لوگوں کے لئے برا ہے اور یہ محال ہے کہ بزرگ لوگ ایسا کریں۔ البتہ جب اہل دل میں کوئی سبکی یا خفت نمودار ہوتی ہے اور باطن پر اس کا غلبہ ہوتا ہے اور دقت میں تقویت پیدا ہو جاتی ہے تو حال اپنا اضطراب ظاہر کرتا ہے اس وقت ترتیب ورسوم اور با قاعدگی مفقود ہو جاتی ہے ایسے اضطراب میں جو کیفیت نظر آتی ہے نہ تو وہ رقص ہے نہ پاؤں کی جھنکار اور نہ اس میں طبع کی پرورش، بلکہ یہ اضطراب تو ایسا ہوتا ہے کہ جان کو

گھلا دیتا ہے۔ یہ بات سراسر بعید ہے کہ اس اضطراب کو رقص کہہ دیا جائے۔ حالانکہ اضطراب ایسا حال ہے جسے زبان و گفتار میں نہیں لایا جا سکتا۔ ''من لم یذق لایدری النظر فی الاحداث'' جس نے اس کا مزہ نہ چکھا وہ ظاہری اطوار کو نہیں جان سکتا۔

بہر حال نوعمروں کو دیکھنا اور ان کی صحبت کرنا منع ہے اور اسے جائز رکھنے والا کافر ہے۔ اس سلسلہ میں جو بھی دلیل دی جائے وہ بطالت و جہالت کا ثبوت ہے۔ میں نے جاہلوں کے ایک گروہ کو دیکھا۔ وہ اہل طریقت پر ایسی ہی تہمت دھرتے ہیں پھر ان کا انکار کرتے ہیں اور ایک گروہ ایسا بھی دیکھا ہے جس نے اسے اپنا مشرب بنا لیا ہے۔ تمام مشائخ نے اسے آفت جانا ہے۔ یہ اثر حلولیوں نے باقی رکھا ہے۔ اللہ تعالیٰ ان پر لعنت برسائے۔

کپڑے پھاڑنا:

واضح رہنا چاہئے کہ کپڑے پھاڑنا صوفیاء کرام کے درمیان مشہور عادت ہے۔ بڑے بڑے اجتماع میں جس میں مشائخ کبار موجود ہوتے صوفیوں نے کپڑے پھاڑے ہیں۔ میں نے علماء کے گروہ کو دیکھا ہے جو اس کے منکر ہیں اور کہتے ہیں کہ درست کپڑے کو پھاڑنا ناجائز ہے اور یہ محال ہے کہ کسی فساد سے جس سے ان کی مراد اصلاح ہو اسے درست کہا جائے۔ تمام لوگ درست کپڑے کو پھاڑتے اور کاٹتے ہیں پھر اسے سیتے ہیں۔ مثلاً آستین، دامن، چولی وغیرہ ہر ایک کو کاٹ کاٹ کر سیتے اور درست کراتے ہیں۔ اس میں کوئی فرق نہیں کہ کوئی کپڑے کو سو (۱۰۰) ٹکڑے کرکے پھر انہیں سئے اور کوئی پانچ ٹکڑے کرکے اور سئے۔ باوجودیکہ ہر وہ ٹکڑا جسے پھاڑا گیا اسے سی دیا جائے۔ اس سے ایک مومن کے دل کی راحت ہے اس سے جو گدڑی تیار ہوتی ہے وہ ان کی ضرورت کو پورا کراتی ہے۔ اگرچہ طریقت میں کپڑا پھاڑنے کی کوئی وجہ نہیں ہے۔ البتہ بحالت سماع، درست کپڑا نہیں پھاڑنا چاہئے کیونکہ یہ اسراف کے سوا کچھ بھی نہیں ہے۔ لیکن اگر سماع پر ایسا غلبہ طاری ہو جائے جس سے خطاب اٹھ جائے تو وہ بے خبر اور معذور ہے۔ جب کسی کا یہ حال ہو جائے اور کوئی اس کی وجہ سے کپڑے پھاڑے اس کو جائز ہے۔ اہل طریقت کے کپڑے پھاڑنے کے سلسلہ میں تین قسم کے لوگ ہیں۔ ایک وہ جو درویش خود اپنے کپڑے

پھاڑنے کے سلسلہ میں تین قسم کے لوگ ہیں۔ایک وہ درویش جو خود اپنے کپڑے پھاڑے یہ بحالت سماع، غلبہ حال کے حکم میں ہوگا۔ دوسرے وہ لوگ جو مرشد و مقتداء کے حکم سے کپڑے پھاڑیں مثلاً کوئی استغفار و توبہ کی حالت میں کسی جرم کے سبب کپڑے پھاڑے اور وجد و سکر کی حالت میں کپڑے پھاڑے ان میں سب سے مشکل تر وہ کپڑے پھاڑنا ہے جو سماع میں کرتے ہیں یہ دو قسم کے لوگ ہیں۔ایک مجروح و زخمی، دوسرے صحیح و درست۔ مجروح کی دو شرطیں ہیں۔یا کپڑے کو سی کر اسے دے دیں یا کسی اور درویش کو دے دیں۔یا تبرک کے طور پر پھاڑ کر تقسیم کر دیں، لیکن جب کپڑا درست ہو تو یہ دیکھنا چاہئے کہ کپڑا پھاڑنے والے یا اتار کر پھینک دینے والے سامع درویش کی کیا مراد ہے۔اگر قوال کو دینا مراد ہے تو اسے دے دیا جائے اور اگر مراد جماعت کو دینا ہے تو انہیں دے دیا جائے اور اگر کوئی مراد ظاہر نہ ہو بلکہ یونہی اتار کر پھینک دیا ہے تو مرشد کے حکم کے مطابق عمل کیا جائے اگر وہ جماعت کو دینے کا حکم دے تو پھاڑ کر ان میں تقسیم کر دیا جائے۔اگر کسی درویش یا قوال کو دینے کا حکم دے تو اسے دے دیا جائے۔لیکن اگر قوال کو دینا معروف ہو تو درویش یا اصحاب کے مراد کی موافقت شرط نہیں ہے۔لیکن اگر اتفاق مقصود ہو تو پھر درویش یا اصحاب کے مراد کی موافقت شرط نہیں ہے۔لیکن اگر اتفاق مقصود ہو تو پھر درویش کا کپڑا قوال کو نہ دیں کیونکہ یہ نا اہل کو دینا ہوگا اور جو کپڑا درویش نے یا تو حالت اختیار میں دیا ہوگا یا حالت اضطرار میں۔اس میں دوسروں کی موافقت کی کوئی شرط نہیں ہے اور اگر جماعت نے ارادے سے کپڑے کو علیحدہ کیا یا کسی مراد کے بغیر تو اس صورت میں مراد کی موافقت شرط ہے اور جب جماعت کپڑا پھینکنے میں متفق ہو تو مرشد کو لازم نہیں کہ وہ درویشوں کے کپڑے قوالوں کو دے۔لیکن یہ جائز ہے کہ کوئی محب اپنی طرف سے کوئی چیز قوال پر قربان کر دے اور ان کے کپڑے درویشوں کو لوٹا دے یا پھاڑ کر سب کو تقسیم کر دے۔اگر کپڑا مغلوبی کی حالت میں گر پڑا ہے تو اس میں مشائخ کا اختلاف ہے۔اکثر کے نزدیک اس حدیث کی موافقت میں قوال کو دے دیا جائے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ "مَنْ قَتَلَ قَتِيْلًا فَلَهُ سَلَبُهُ" جس نے قتل کیا وہی مقتول کے سامان کا حقدار ہے۔اگر قوال کو نہ دیں تو طریقت کے حکم سے باہر نکلتا ہے۔

ایک گروہ یہ کہتا ہے اور یہ بات میرے نزدیک بھی محمود ہے کیونکہ بعض فقہا کا یہی مشرب ہے کہ مقتول کا سامان بادشہ کی اجازت کے بغیر قاتل کو نہ دیا جائے یہی حکم طریقت میں مرشد کا ہے کہ بغیر مرشد کے حکم کے وہ کپڑا قوال کو نہ دیں۔ اگر مرشد چاہے کہ قوال کو نہ دیا جائے اور کسی کو دے دیا جائے تو کوئی حرج نہیں ہے۔ واللہ اعلم بالصواب

آداب سماع

واضح رہنا چاہئے کہ آدابِ سماع میں شرط یہ ہے کہ جب تک ضرورت نہ ہو سماع نہ کرے اور اسے اپنی عادت نہ بنائے۔ لیکن کبھی کبھی سماع کرے تا کہ اس کی عادت دل سے نہ جائے۔ لازم ہے کہ بوقت سماع، کوئی مرشد اس مجلس میں موجود ہو اور یہ کہ مقام سماع، عوام سے خالی ہو اور یہ کہ قوال صاحب عزت ہوں۔ اور دل مشاغل سے خالی طبیعت لہو و کھیل سے نفرت کرنے والی ہو تو یہ شرط ہے تکلف کو اٹھا دیا جائے اور جب تک سماع کی قوت ظاہر نہ ہو نہ سنے۔ اس میں مبالغہ شرط نہیں ہے اور جب سماع کی قوت ظاہر ہو تو یہ شرط نہیں ہے کہ اس قوت کو اپنے سے دور کرے بلکہ جیسا اقتضاء ہو ویسا کرے۔ اگر وہ ہلائے تو ہلے اور اگر ساکن رکھے تو ساکن رہے۔ طبعی قوت اور وجد کی سوزش کے درمیان فرق محسوس کرے۔ سامع پر لازم ہے کہ اس میں اتنی قوتِ دید ہو کہ وارِدِ حق کو قبول کر سکے اور اس کا حق ادا کر سکے اور جب وارِدِ حق کا غلبہ دل پر ظاہر ہو تو اسے بتکلف اپنے سے دور نہ کرے۔ جب سامع کی قوت برداشت جاتی رہے تو بتکلف جذب نہ کرے اور لازم ہے کہ بحالت حرکت کسی سے مدد کی توقع نہ رکھے اگر کوئی مدد کرے تو منع بھی نہ کرے اور اس کی مراد اور اس کی نیت کو نہ آزمائے۔ کیونکہ اس میں آزمانے والے کو بہت پریشانی اور بے برکتی کا سامنا کرنا پڑتا ہے کسی کے سماع میں دخل نہ دے اور اس کا وقت پراگندہ نہ کرے نہ اس کے حالات میں تصرف کرے۔ لازم ہے کہ اگر قوال اچھا کلام سنائے تو اس سے یہ نہ کہے کہ تم نے اچھا کلام سنایا اور اگر ناپسندیدہ ہو تو برا بھی نہ کہے اور اگر وہ ایسا ناموزوں شعر ہو جس سے طبیعت کو ناگواری ہو تو یہ نہ کہے کہ اچھا کہو اور دل میں اس سے

غصہ نہ کرے۔ اسے درمیان میں نہ دیکھے بلکہ سب حوالۂ حق کر دے اور درست ہو کر سنے۔ اگر کسی گروہ کو حالت سماع میں دیکھے اور اسے اس سے فائدہ نہ ہو تو یہ شرط نہیں ہے کہ اپنے صحو کے سبب ان کے سکر کا انکار کرے۔ لازم ہے کہ اپنے وقت کے ساتھ آرام سے رہے اس سے ان کو فائدہ ہوگا۔ صاحب وقت کی عزت کرے تا کہ اس کی برکتیں اسے بھی پہنچیں۔

حضور سیدنا داتا گنج بخش رحمتہ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ میں اسے زیادہ محبوب رکھتا ہوں کہ مبتدیوں کو سماع کی اجازت نہ دیں تا کہ ان کی طبیعت میں یکسوئی رہے کیونکہ پراگندگی میں بڑے خطرے اور بڑی آفتیں ہیں۔ اس لئے کہ چھتوں سے اور اونچی جگہوں سے عورتیں بحالت سماع ان کو دیکھتی ہیں۔ اسی سبب سے سامعین کو شدید حجابات کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔

لازم ہے کہ نوخیز لڑکوں کو بھی درمیان میں نہ بٹھائیں اور ایسا کبھی نہ ہونے دیں۔

اب میں ان جاہل صوفیوں سے جنہوں نے ان باتوں کو اپنا مذہب بنا رکھا ہے اور صداقت کو درمیان سے ہٹا دیا ہے خدا سے استغفار کرتا ہوں کیونکہ اس قسم کی آفتیں ہم جنسوں سے مجھ پر گزر چکی ہیں اور حق تعالیٰ سے توفیق و مدد کا خواستگار ہوں تا کہ میرا ظاہر و باطن ہر قسم کی آفتوں سے محفوظ رہے۔ میں اس کتاب کے پڑھنے والوں کو وصیت کرتا ہوں کہ اس کتاب کے احکام اور ان کے حقوق کی رعایت ملحوظ رکھیں۔

"وبیدہ التوفیق، والحمد للہ رب العالمین
والصلوٰۃ والسلام علٰی رسولہ محمد والہ
واصحابہ اجمعین وسلم تسلیما کثیراً کثیراً"

الحمد للہ علیٰ احسانہ کتاب مستطاب السلوک الی المحبوب ترجمہ کشف المحجوب، آج مؤرخہ 25 جون 1970ء بمطابق ۲ ربیع الاخر ۱۳۹۰ھ تمام ہوئی مولیٰ تعالیٰ مترجم، طابع و ناشر اور سب کے لئے توشہ آخرت بنائے۔ آمین بجاہ سید المرسلین صلوات اللہ وسلامہ علیہ وعلیہم اجمعین۔

غلام معین الدین نعیمی اشرفی

اللہ والے
پچاس بڑے مسلمان
قصص الانبیاء
قانونِ عشق
خواب نامہ یوسفی
تعبیر نامہ - فال نامہ